Title - TAREEKH ADAB URDU.

Creator - Ram Babu Saxena; Mutarjuma Mirza Mohd. Askari.

Publisher - Matba Munshi Nawal Kishore (Lucknow)

Date - N.A.

Pages - 531+217.

Subjects - Urdu Adab - Tareekh; Tareekh - Urdu Adab.

Date..........

تاریخ ادب اُردو (مصوّر)

(یعنی)

ہسٹری آف اُردو لٹریچر

مصنّفہٗ

عالی جناب رام بابو صاحب سکسینہ۔ ایم۔ اے۔ ایل ایل
بی۔ ایف۔ آر۔ ایس۔ اے (لندن) ایم۔ آر۔ اے۔ ایس ایم اے
ایس۔ بی۔ ممبر ہندوستانی اکیڈمی یو پی۔ ڈپٹی کلکٹر۔
مصنّف اُردو شعرائے زمانہ حال و اوراق پریشان

مترجمہ

جناب مرزا محمد عسکری صاحب بی۔ اے سابق ہیڈ ٹرانسلیٹر گورنمنٹ آف انڈیا

باہتمام کیسر بد اس سیٹھ سپرنٹنڈنٹ

مطبع منشی نول کشور واقع لکھنؤ میں طبع ہو کر شائع ہوئی

مسٹر رام بابو سکسینہ مصنف اصل کتاب (ہسٹری آف اُردو لٹریچر)

۳۲۷۵۶

A.LIBRARY, A.M.U.
U32756

فہرست مضامین

عطیہ رام بابو سکسینہ

باب ۵

اساتذۂ دہلی

حصۂ اول طبقۂ متقدمین

حاتم و آبرو کا زمانہ

باب ٦

اساتذۂ دہلی

حصۂ دوم طبقۂ متوسطین

میر و سودا کا زمانہ

باب ۸

اساتذۂ لکھنؤ

ناسخ و آتش کا زمانہ

باب ۱۳

دربار رام پور و حیدرآباد

امیر و داغ کا زمانہ

باب ۱۴

اُردو شاعری کا جدید رنگ

آزاد اور حالی کا زمانہ

فہرست تصاویر حصۂ نظم

(از مصنّف)

اس کتاب کی تصنیف کی اصلی غرض یہ ہے کہ ادب اُردو کی تدریجی ترقی کا خاکہ زمانۂ قدیم سے لیکر زمانۂ حال تک مع مشہور شعرا اور نثاروں کے مختصر حالات زندگی اُنکے کلام اور تصانیف پر ایک مختصر تنقید کے کھینچا جائے۔ یہ بھی کوشش کیگئی ہے کہ ایک طبقہ کے تعلقات دوسرے طبقہ کے ساتھ اور ایک فرد کے تعلقات دوسرے فرد کے ساتھ اسمیں وضاحت سے بیان کیے جائیں اور نیز مختلف تحریکوں اور طرزوں کی ابتدا اور ترقی اور زوال کے اسباب بتائے جائیں اور اُس دور کے تاریخی حالات و واقعات بھی نظرانداز نہ کیے جائیں جسمیں کہ وہ شعرا اور نثار گذرے۔ یہ کتاب محض کسی زمانہ کے واقعات کا ایک ذخیرہ نہیں بلکہ اُن خیالات اور خصوصیات کے دکھانے کی اسمیں پوری کوشش کیگئی ہے جن کا اثر اُس زمانہ پر تھا۔ اسکی تصنیف میں میرے پیش نظر یہ رہا ہے کہ یہ زمانۂ حال کے تنقیدی اصولوں کے مطابق بطور ٹکسٹ بک تیار کیجائے تاکہ انگریزی داں جماعت بھی ادب اُردو سے کماحقہٗ واقف ہوجائے۔

مصنف اپنی خامیوں سے بخوبی واقف ہے تقریبًا چار برس کا عرصہ گذرا کہ اُسنے باوجود اپنی سرکاری مشغولیتوں کے اس کتاب کو ختم کرلیا تھا مگر بعد کو کچھ ابواب میں رد و بدل کرنا پڑا تاکہ وہ زمانۂ موجودہ کی تحقیق و تنقید کے مطابق ہوجائیں یہی وجہ اُس ناہمواری کی ہے جو کتاب کے مختلف حصوں میں پائی جاتی ہے۔

ابتدائی قصد تو یہ تھا کہ ادب اردو کی ایک پرائمر (ابتدائی کتاب) کالج کے طلبا اور عام پبلک کے فائدہ کے لئے تیار کی جائے اسی وجہ سے فٹ نوٹ اور حوالوں سے کتاب کو وزنی کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ ہر چند کہ حسب ضرورت اصل کتابوں کا بخوبی مطالعہ کر لیا تھا مگر بالآخر یہ اپنے مقررہ حجم سے بڑھ گئی جسقدر یہ آگے بڑھتا گیا اور اسکی غرض بدلتی گئی حوالے دینے کی ضرورت بھی محسوس ہوتی گئی مگر بعد کو عملاً یہ کام مشکل معلوم ہوا۔ میں امید کرتا ہوں کہ یہ نقص آیندہ ایڈیشن میں دور کر دیا جائیگا۔

اس بات کی بھی شکایت کا موقع ہو سکتا ہے کہ تمثیلی اقتباسات دوسری کتابوں سے نہیں دیے گئے۔ میں نے یہ فرو گذاشت جان بوجھکر کی ہے اور سند میں پروفیسر سنٹسبری کی کتاب "مختصر تاریخ انگریزی علم ادب" کی مثال پیش کر سکتا ہوں جسکے طرز پر میں نے یہ کتاب ترتیب دی ہے۔ وجہ یہ تھی کہ مختصر اقتباسات میرے مفید مطلب نہ ہوتے اور طویل اقتباسات سے کتاب کا حجم بڑھ جاتا۔ اس کمی کے رفع کرنے کی یہ تدبیر مناسب معلوم ہوتی ہے کہ آیندہ کسی موقع پر ایک علیحدہ کتاب بطور ضمیمے کے مرتب کی جائے جسمیں ہر دور کے خاص خاص مصنفین کی کتابوں کے اقتباس معہ انکے انگریزی ترجمہ کے اور اگر ممکن ہوا تو منظوم ترجمے کے با تفصیل دیے جائیں۔ یہ نقص بھی ضرور رہ گیا ہے کہ ماخذ کے نام نہیں دیے جا سکے۔ اسکی تلافی انشاءاللہ یوں ہو جائیگی کہ ایک علیحدہ رسالہ تنقیدی نوٹوں کے ساتھ جس کا نام "ماخذ ادب اردو" ہوگا شائع کیا جائیگا۔

ایک دوسرا اہم فرو گذاشت قابل ذکر یہ ہے کہ دور موجودہ کے اردو شعرا کا اس کتاب میں ذکر نہیں ہے وجہ یہ ہے کہ ان کا حال ایک علیحدہ کتاب میں قلمبند کیا گیا ہے جو عنقریب شائع ہونے والی ہے۔ اس کتاب کے متعلق میں پروفیسر سنٹسبری کا یہ مذاقیہ مگر نہایت صحیح قول ضرور نقل کرونگا

"اگر کوئی یہ دعوے کرے کہ میں نے ایسی کتاب لکھی ہے جسمیں کوئی غلطی نہیں ہے تو وہ مسخرہ جھوٹا ہے اور جو شخص کسی دوسرے سے ایسی کتاب لکھنے کی امید رکھے جسمیں کوئی غلطی نہ ہو وہ اُس سے بڑھکر لغو ہے" مجکو اس کتاب میں بہت سی فروگذاشتوں کا اعتراف ہے جنکی اصلاح افسوس ہے کہ نہیں کیجا سکی۔

اب میں اپنی اس مختصر تالیف کو پبلک کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ مجکو اپنی محنت اور کاوش کی پوری داد مل جائیگی اگر میں اسکے ذریعہ سے لوگوں کے دلوں میں اس ادب لطیف یعنی ادب اُردو کا صحیح ذوق پیدا کروں جو میری رائے میں ہندو مسلم اتحاد کا بہترین ذریعہ ہے اور اُنکو شوق دلاؤں کہ وہ اس قصر عالی کو جسکی میں نے صرف بنیاد ڈالی ہے تکمیل تک پہونچا دیں۔

میں تہ دل سے ممنون ہوں (۱) ان تمام مصنفین کا جنکی کتابوں کو میں نے نہایت شوق سے پڑھا اور اُن سے فائدہ اُٹھایا گر اسکا اعتراف متن میں نہ کر سکا (۲) اُن تمام اصحاب کا جنھوں نے مجکو کتابیں پڑھنے کے لئے مرحمت فرمائیں اور میرے استفسارات کا جواب نہایت فراخدلی سے دیا (۳) اُن حضرات کا جنھوں نے مسودہ کتاب پڑھا اور تصحیح پروف میں میری مدد کی (۴) اُن کا جنھوں نے میرا دل بڑھایا اور نیک صلاح سے اپنی ہمدردی کا ثبوت دیا۔ مگر چونکہ میرے محسنوں کی فہرست طویل ہے اور ان میں سے بعض کا انتخاب کرنا ایک کو دوسرے پر بیجا ترجیح دینا ہے لہذا میں اُن سب کا مجموعی حیثیت سے تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

رام بابو سکسینہ

از بریلی (یوپی)

تقریظ

(از قلم عالیجناب فضیلت انتساب سر تیج بہادر سپرو صاحب ایم۔اے ال ال ڈی۔ کے سی ایس آئی)

لکھنؤ یونیورسٹی کے جلسۂ کانووکیشن کی تقریر میں میں نے اس بات پر اظہار افسوس کیا تھا کہ ہم لوگ زبان اُردو سے بے توجہی اور غفلت کر رہے ہیں۔ ہمارے صوبہ کے اکثر تعلیم یافتہ نوجوان اپنی اُس ذمہ داری کو محسوس نہیں کرتے جو کہ اُن پر اُنکی زبان اور ادب کی ترقی کی نسبت عائد ہوتی ہے۔ افسوس ہے مگر صفائی سے کہنا پڑتا ہے کہ شمالی ہند کی دیسی زبانوں کو جسقدر ہمارے نام نہاد نیشنلزم (قوم پرستی) کے غلط مفہوم نے جو در اصل کمیونلزم (فرقہ بندی) کا مرادف ہے نقصان پہونچایا اتنا اور کسی چیز نے نہیں پہونچایا۔ ہمارے صوبہ کے اکثر مقامات پر ایسے ہندو گریجوٹیوں اور انڈر گریجوٹیوں کو دیکھکر سخت افسوس آتا ہے جن کا یہ خیال ہے کہ ہندی کی ترقی کے لازمی طور پر یہ معنی ہیں کہ دلوں سے اُس زبان اور ادب کی محبت اور خیال بالکل نکال دیا جائے جسمیں خود اُن کے بزرگ ابھی دو ہی ایک نسل کا زمانہ گذرا کہ کمال رکھتے تھے۔ اسی طرح ایسے مسلمانوں سے ملکر بھی نہایت صدمہ پہونچتا ہے جو ہندوؤں کی زبان اُردو سے بے توجہی اور بے پروائی کی شکایت سے تو لبریز ہیں لیکن اپنا کوئی قابل تعریف کارنامہ اُس میدان ادب میں نہیں پیش کر سکتے جس کا محافظ خاص وہ اپنے تئیں سمجھتے ہیں تعلیم و تربیت اور علمی مذاقوں کے اختلاف نے جو گذشتہ بیس پچیس سال کے عرصہ میں بہت بڑھ گیا ہے، فرقہ بندی کے مضر اثرات کو اور قوی کر دیا ہے جس سے سر چشمۂ اتحاد

مسموم اور ایک دوسرے کے خیالات کو صحیح طور پر سمجھنا معدوم ہوتا جاتا ہے۔

میں اس سے بے خبر نہیں ہوں کہ زمانۂ حال میں لوگوں کو ایک قسم کا ادبی اشتغال ضرور ہے مگر ہمارے اس قسم کے کاموں سے ہماری زندگی کتنی مالا مال ہوگی یا کہ وہ کام کتنے دیرپا ہونگے یہ ایسے سوالات ہیں کہ جن کا جواب صرف مرور ایام سے ملیگا۔ جسقدر نظمیں فی زمانا لکھی جاتی ہیں اُن کا زیادہ تر حصہ ایک منظوم نثر سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا اُن میں کوئی الہامی اثر مطلق نہیں پایا جاتا اور نہ کوئی اعلیٰ آئیڈیل ہوتا ہے بلکہ بعض نظمیں تو میں نے ایسی دیکھیں جن پر "بدنام کنندۂ نکونامے چند" کی مثال پوری طرح صادق آتی تھی اور اُن کو ایک اعلیٰ درجہ کی بدمذاقی کا نمونہ پایا۔ ہماری نثر کی بھی یہی حالت سمجھنا چاہیئے چلتی ہوئی کتابیں اس صنف میں ہرگز ایسی نہیں ہوتیں جن سے ہمارے خیالات میں بلندی یا ہماری دلچسپیوں میں کوئی اضافہ ہو بلکہ وہی کمبخت پرانے عشق و عاشقی کے قصے ہیں جن میں یا تو کسی عورت کی بیوفائی اور مکاری اور یا ادنیٰ درجہ کی رکیک سازشوں اور چالاکیوں کا ذکر ہوتا ہے۔ میرے اس خیال میں تمام ادبا اردو بالکلیہ داخل نہیں ہیں لہذا میں اس بات کا اعتراف کرنے کو تیار ہوں کہ الحمدللہ ہم میں چند افراد ایسے ضرور ہیں جنکے ادبی کارنامے گو مقدار میں کم سہی مگر بلاشک نہایت اعلیٰ درجہ کے ہوتے ہیں۔ شعرا اردو کی پوری تعداد کا حال تو خدا ہی کو معلوم ہے مگر وہ جو اپنا نام صفحۂ ہستی پر چھوڑ جانے والے ہیں اُنکی تعداد فی الحقیقت بہت کم ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ اگر ہندوستان میں کسی مقام پر ادب اردو کی قرار واقعی دیرپا اور مفید خدمت انجام دیجاتی ہے تو وہ حیدرآباد دکن ہے۔

انھیں اسباب سے یہ میرے لئے خاص طور پر قابل مسرت ہے کہ ہمارے اسی صوبہ کے ایک گزیٹیڈ سوبیٹ کی یہ بڑی خوش قسمتی تھی کہ ان کو اتنا وقت ملا کہ باوجود اپنی سرکاری مصروفیتوں کے اُنھوں نے ایک کتاب زبان انگریزی میں زبان اور ادب اُردو کی تاریخ پر تیار کردی۔ مولانا آزاد کی مشہور و معروف کتاب "آبحیات" سے کون واقف نہیں لیکن وہ ضروریات زمانۂ حال کے مطابق نہیں ہے۔ اسکے علاوہ بعض اور کتابیں زمانۂ موجودہ میں بھی اسی مبحث پر بہت عمدہ تصنیف ہوئیں مگر اُن کے مصنفین مجھے معاف فرمائیں اگر میں یہ کہوں کہ اُن میں قوت امتیاز اور روشن خیالی کے ساتھ تنقید کی بھی کمی ہے اس کتاب کے مسودہ کو میں نے بڑی خوشی کے ساتھ پڑھا تھا اور ہر چند کہ بعض باتوں میں مصنف کی تجاویز سے اختلاف کیا جاسکتا ہے مگر قابل مصنف کی اس بارہ میں ضرور داد دینا پڑتی ہے کہ کیسے مسلسل اور مربوط طریقہ سے اُنھوں نے زبان اور ادب اُردو کی ترقی اور نشو و نما کا حال قدیم زمانہ سے لیکر زمانۂ حال تک کا لکھا ہے۔ ممکن ہے کہ اس کتاب کے آیندہ ایڈیشنوں میں وہ خود اس بات کی ضرورت محسوس کریں کہ اپنی تجاویز پر نظر ثانی کریں مگر جو بات مجھے اُن میں نہایت امید افزا معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ اپنی رائے قائم کرنے میں آزاد اور اپنے اظہار خیال میں بیباک ہیں۔ مثلاً میں اس کتاب کے باب ۳ کو پیش کرتا ہوں۔ اور بھی بہت سی مثالیں دیگر مقامات سے پیش کیجا سکتی ہیں مگر میں اسی پر اکتفا کرونگا۔ مختصر یہ کہ کتاب نہایت اعلیٰ درجہ کی ہے جسکے واسطے تمام بہی خواہان اُردو کو لائق مصنف یعنی رام بابو سکسینہ صاحب کا احسانمند ہونا چاہیے۔ یہ کتاب یقیناً اُن تمام اصحاب کو پسند آئیگی اور میری رائے میں ضرور آنا چاہیے، جو اس بات کی تحقیق چاہتے ہیں کہ زبان اُردو کس طرح عالم وجود میں آئی مختلف اُستادوں کے

ہاتھ سے اُنہیں کیا کیا تبدیلیاں واقع ہوئیں اور ترقی کے مختلف ادوار نے اُس پر کیا کیا اثرات کیے۔ آخر میں میں یہ ضرور کہونگا کہ سول سروس صوبہ کے حکام اتنے خوش نصیب نہیں ہیں کہ ان کو اپنے فرائض مذہبی کی انجام دہی میں اتنا وقت مل جائے کہ وہ اُسکو کسی ادبی خدمت میں صرف کر سکیں مگر رام بابو صاحب نے اس کلیہ کو توڑ دیا اور دُنیا کو دکھلا دیا کہ ڈپٹی کلکٹر ایک مصنف بھی ہو سکتا ہے اور قانون و انتظام کے فرائض کے ساتھ ساتھ ادبی فرائض کو بھی بخوبی انجام دے سکتا ہے

(ڈاکٹر سر) تیج بہادر سپرو

میرزا محمد عسکری بی—اے مترجم کتاب ہذا

التماسِ مترجم

ادب اُردو تشنہ تھا کہ اُسکی قدیم تاریخ یعنی اُسکی ابتدا اُسکی نشو و نما، اُسکی تدریجی ترقیاں اور وہ تغیرات جو اُسمیں وقتاً فوقتاً ہوتے رہے ہیں ان سب چیزوں کے حالات کسی ایسے شخص کی بھی زبان سے سُنے جائیں جو اُن لوگون سے بالکل مختلف ہو جنھوں نے اب سے پہلے اس قسم کے حالات و واقعات پر بہت کافی روشنی ڈالی ہے۔ اسمیں کوئی شک نہیں کہ اس مضمون پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور بہت خوب لکھا جا چکا ہے صدہا نہیں تو بیسیون تذکرے ایسے موجود ہیں جن سے مذکورہ امور بہت وضاحت سے معلوم ہو جاتے ہیں۔ اگر ہم تذکرہ نویسی کو تین دوروں پر تقسیم کریں تو قدما میں میر تقی اور میر حسن کے تذکرے ہمارے واسطے شمعِ ہدایت کا کام دیتے ہیں متاخرین میں آب حیات اور جلوۂ خضر کو ہم لے سکتے ہیں جن سے ہمکو بہت کچھ معلومات حاصل ہوتی ہیں اور ہو سکتی ہیں۔ اور اول الذکر تو باوجود سخت تنقیدات کے جو اُسکی نسبت وقتاً فوقتاً ہوتی رہتی ہیں جن سے بعض واقعات فی الحقیقت معرضِ شک میں ضرور پڑ گئے ہیں پھر بھی اپنی صنف میں ایک لاجواب اور انتخاب کتاب ہے جسکا نظیر علی الخصوص اس زمانہ میں جبکہ ہم اپنی زبان کی طرف سے اتنی بے پروائی برتتے ہیں محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ قدیم تذکرہ نویسوں نے بس اسی پر اکتفا کی ہے کہ اپنے معاصرین اور بعض قدیم شاعروں کے وہ حالات جو اُن کو بآسانی معلوم ہو سکے قلمبند کر دیے اور کچھ نمونے اُنکے کلام کے پیش کر دیے اور مختصر طور پر اپنی رائے اُنکے کلام کی نسبت ظاہر کر دی اور بس۔ زبان کی تدریجی ترقیوں کا حال اور وہ تغیرات جو اُنکے عہد تک رونما ہو چکے تھے اسکے بیان کرنے کے نہ وہ شائق تھے اور نہ اسکو وہ ضروری سمجھتے تھے میری رائے میں اسکا سہرا مولانا آزاد کے سر ہے کہ اُنھوں نے اُردو زبان کی ابتدا و ارتقا اور اسکے مختلف ادوار کی تاریخ زمانہ حال کی روش کے مطابق سب سے پہلے قلمبند کی۔ مگر میری ناچیز رائے میں

اتنی بات اُن سے ضرور رہ گئی کہ اس قسم کی کتاب میں اپنی عبارت کا طرز ادا بجائے سادہ اور سائنٹفک رکھنے کے اُنھوں نے نہایت رنگین اور پر تصنع رکھا جیسا کہ اُنکی دیگر تصانیف کا ہے اور اس کا خیال نہیں کیا کہ یہ تصنیف ایک خاص انداز کی ادا کی دیگر تصانیف سے مختلف ہے۔ اس سے اتنا فائدہ تو ضرور ہوا کہ اُنکی کتاب اسقدر دلچسپ ہو گئی کہ اگر ایک مرتبہ اُس کو شروع کیجئے تو پھر ہاتھ سے رکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ اور ایک دفعہ کے پڑھ لینے کے بعد طبیعت اُس سے اُکتاتی نہیں۔ اور یہ بات گلستان سعدی کے سوا کسی دوسری کتاب میں نہیں پائی جاتی۔ مگر حق یہ ہے کہ جو اعتراضات فی زماننا اُسپر سیدردی سے کیے جارہے ہیں یہ بھی اُسی عبارت کی رنگینی کا نتیجہ ہے کہ کتاب کو پر لطف بنانے کی غرض سے اور دل کو خوش کرنے کے لئے اظہار واقعات میں ایک مورخ کی نہیں بلکہ ایک افسانہ گو کی حیثیت اختیار کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر ایسے واقعات خلط ملط ہو گئے جن کا سرے سے وجود ہی نہیں ہے۔ یا ایسے پر زور اور رنگین الفاظ استعمال کیے گئے جو اُس موقع کے حسب حال نہ تھے تنقید کی گہری نگاہیں جو اس کتاب پر بالفعل پڑ رہی ہیں اور اعتراضات کی بوچھاڑ جو اُس پر ہو رہی ہے میری رائے میں ایک نتیجہ لازمی بلکہ خمیازہ اُس غلطی کا سمجھنا چاہیے جو مصنف مرحوم نے اپنی عبارت اور طرز ادا کے اختیار کرنے میں شروع میں کی تھی۔

تذکرہ نویسی کا تیسرا دور ہم کو اپنے ہی زمانہ میں ملتا ہے حسین لالہ سری رام صاحب کی مشہور و معروف تصنیف خمخانۂ جاوید ہے جسمیں سلاست عبارت، روانی بیان اور متانت کے ساتھ سعی کوشش کی گئی ہے کہ ہندوستان کے نامی گرامی شعرا کے ساتھ اُن لوگوں کا بھی تذکرہ کیا جائے جو گوشۂ گمنامی میں زندگی گزار رہے ہیں مگر افسوس ہے

کہ اس تذکرہ کی اب تک صرف چار جلدیں چھپی ہیں اور شین منقوطہ سے آگے نہیں بڑھا اسکے ساتھ ہی تذکرہ گل رعنا مولوی حکیم عبدالحی صاحب مرحوم کا اور شعرالہند مولوی عبدالسلام صاحب ندوی اور سیرالمصنفین جناب تنہا (نثارون کا تذکرہ) بھی ہرگز نظرانداز کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ بلکہ ان تذکروں کے شائع ہونے سے بہت سی وہ باتیں جو ابتک پردۂ خفا میں تھیں معرض ظہور میں آگئیں۔

مگر غالباً غلط نہو گا اگر ہم یہ کہیں کہ ان سب میں کوئی نہ کوئی مخصوص انداز رکھا گیا ہے اور انھیں وجوہات سے اُن تذکروں کو مکمل کہنا ایک حدتک غیر ذمہ دارانہ حیثیت رکھتا ہے چنانچہ تذکرہ خمخانۂ جاوید میں صرف اس بات کا التزام کیا گیا ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ شاعر بھی چھوٹ نہ جائے۔ اسی طرح تذکرہ گل رعنا کی بنیاد آزاد کی غلط بیانیوں کے ازالہ پر ہے اسکے ساتھ ہی یہ کسی طرح سے مکمل نہیں اور بہت سی باتوں اور بہت سے باکمالوں کو اسمیں نظرانداز کر دیا گیا ہے یا نظرانداز ہو گئے ہیں شعرالہند بحیثیت مجموعی شعراُردو کی ایک تاریخ ہے مگر ژولیدہ بیانی نے اسکو بھی حدودمعین سے نکالدیا ہے سیرالمصنفین انشرنگاروں کا تذکرہ یہ مخصوص نثر کے لئے ہے۔ اگرچہ یہ بھی ادب اُردو کے واسطے نہایت قابل قدر اور گرانبہا اضافے ہیں مگر سب میں ایک نہ ایک انفرادی خصوصیت موجود ہے۔

"ہسٹری آف اُردو لٹریچر" جناب رام بابو صاحب سکسینہ کے دل ودماغ کا نتیجہ ہے جو اُنھوں نے انگریزی میں تصنیف فرمائی ہے اور اس سے زیادہ تر یہ غرض تھی کہ انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ اس سے مستفیض ہو۔ مگر اول سے آخر تک اس کتاب کے دیکھنے والے جانتے ہیں کہ مصنف موصوف نے جس کاوش جس کوشش زور مطالعہ اور وسعت نظر سے اسمیں کام لیا ہے اور سلوب بیان وتنقید وغیرہ میں جو صفائی مدنظر رکھی ہے شعرا اور

نثاروں کے کلام کا توازن کرکے اُن پر جیسی صحیح بیباکانہ اور بے لاگ رائیں قائم کی ہیں وہ
اس کتاب کو ہر حیثیت سے منفرد صورت میں پیش کرتی ہیں تلاش و تجسس کا یہ عالم ہے کہ اُن
واقعات کو اظہر من الشمس کر دیا ہے جن سے ابھی تک لوگ ناآشنا تھے۔ ایک ایک لفظ سے
ایک ضخیم دفتر کا فائدہ اُٹھایا ہے اسکے ساتھ کہیں توازن و انصاف کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔
قدما اور متاخرین کو تو بالکل نظر انداز کیجیے زمانہ حال میں جسقدر کتابیں زبان اُردو کی تحقیق یا اُسکی
نظم و نثر کے متعلق یا بطور تذکرہ وغیرہ کے نکلتی ہیں اُنکے مصنفین زبان انگریزی سے کما حقہ
واقفیت تقریباً پندرہ بیس فیصدی سے زیادہ نہیں رکھتے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو طریقہ تحقیق و
تدقیق (ریسرچ) اور علی الخصوص ترتیب مضامین کا مطبوعات یورپ میں اختیار کیا جاتا ہے
اس سے ہماری اکثر ادبی تصانیف بالکل خالی ہوتی ہیں۔ اور شاید اسی وجہ سے وہ پرانے
رنگ کی کتابیں جن میں فہرست مضامین و انڈکس تک کا پتہ نہیں ہوتا موجودہ انگریزی داں
طبقہ کو مطلق پسند نہیں آتیں اور اُنکی آنکھیں اُنھیں باتوں کو ڈھونڈھتی ہیں جو زبان انگریزی اور
دیگر یورپین زبانوں میں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ اور جن سے اور کچھ نہیں تو کتاب کی سہولت
اور دلچسپی میں ضرور ترقی ہو جاتی ہے اور پڑھنے والے کا بہت سا ضروری وقت فضول اور
غیر ضروری باتوں سے بچ جاتا ہے۔ فاضل مصنف نے اصل کتاب کی ترتیب میں اُسی
روش کا خیال رکھا ہے جو ادب انگریزی کے مشہور مورخین پروفیسر سینٹس بری اور گاس وغیرہ
نے اپنی تصانیف میں اختیار کی ہے جس سے علاوہ جدت ترتیب اور مخصوص اسلوب بیان کے
یہ فائدہ بھی ضرور ہوا کہ کتاب اُن اصحاب کے واسطے بہت مفید ہوگی جنھوں نے بی۔اے یا ایم۔اے
کی ڈگری یا آئی۔سی۔ایس کیواسطے ادب اردو لیا ہو جسقدر سوالات کہ امتحان مذکور میں پوچھے جا سکتے
ہیں وہ سب اس کتاب کے مطالعہ سے بخوبی اور بآسانی حل ہو سکتے ہیں اور ترتیب مضامین خود

سوالات بنانے میں بھی بہت معین ہوگی۔ مگر چونکہ اردو دان طبقہ اس سے محروم تھا۔ نیز یہ کہ ایسی کتاب کو عام ہونا چاہیے اور اس سے ہر شخص کو مستفیض ہونا چاہیے اور موجودہ صورت میں وہ محض ایک فرقہ کے لیے مخصوص تھی اسوجہ سے ضرورت محسوس ہوئی کہ اسکا ترجمہ کر دیا جائے۔ مگر ترجمہ جسکو حقیقی ترجمہ کہہ سکیں اُسکے لیے میرے نزدیک اُسی مطالعہ اُسی تعمق نظر اُسی وسعت معلومات کی ضرورت ہے جو مصنف کی نظر اور عبارت میں ہے۔ دوسرے یہ کہ ایک زبان کے خیالات کو دوسری زبان میں لانا اور پھر انکی وہی خوبیاں قائم رکھنا محال نہیں تو دشوار ضرور ہے مگر چونکہ اصل خیالات کا ماخذ اردو ہے اور اردو ہی کے جامہ میں اُسکو پھر منتقل کرنا تھا اس لیے بہت ممکن ہے کہ باوجود ان مشکلات کے میں کچھ اس فرض سے عہدہ برآ ہوا ہوں۔ اس موقع پر میں اپنے قدیم عنایت فرما اور مخلص دوست رائے بہادر کنور بم بہادر شاہ صاحب بالقابہ کا ممنون ہوں کہ انھیں کے اصرار سے مجھ کو موقع ملا کہ اس کتاب کے ذریعہ سے کچھ ادب اُردو کی خدمت کر سکوں۔

ترجمہ کی مشکلات کے علاوہ بعض دوسری مشکلوں سے بھی دوچار ہونا پڑا۔ بعض باتیں ایسی تھیں کہ وہ اگرچہ اول اُردو ہی میں تھیں مگر قدیم تذکرہ نویسوں نے اُسکو فارسی میں بیان کیا ہے پھر اُنھیں کو اُردو میں بیان کیا اور پھر اُردو سے انگریزی میں بیان کی گئیں اس لیے ان میں کچھ نہ کچھ تباین ہو گیا۔ اسمیں مصنف ایک حد تک معذور تھے مگر اُن کو اُردو میں دوبارہ پھر اُسی حیثیت سے لانا مشکل تر تھا جسکی زیادہ سے زیادہ کوشش کیگئی ہے۔ اور جہاں انھیں مضامین ماخوذہ کا اعادہ کرنا پڑا ہے تو اُن کے الفاظ کو نیا جامہ پہنا دیا گیا ہے بعض واقعات ایسے تھے جنھیں شاید مصلحتاً اصل کتاب میں مجملاً بیان کیا گیا تھا مگر اُردو میں اُنکی کسیقدر تفصیل ضروری تھی۔ اُن کو بھی اسمیں بیان کیا گیا۔ اور اسمیں تحقیق و تنقیح

کما ینبغی کی گئی۔

چونکہ انگریزی میں نمونۂ کلام دینا کچھ زیادہ ضروری اور وقیع نہ تھا اس لئے اصل کتاب میں اسطرف توجہ نہیں کی گئی لیکن اس میں سب کا نہیں مگر اکثر کا نمونہ کلام دیا گیا ہے۔

کسی دوسری زبان میں اگر یہ بات ضروری نہ بھی ہو تب بھی اُردو کے لیے نقد و تبصرہ میں مسامحت اور ملائمت کی ضرورت ہے اسی لیے اکثر اس بات کو نظر انداز نہیں کیا گیا ورنہ ظاہر ہے کہ گلشن بیخار میں نظیر اکبرآبادی پر کوئی بڑا اعتراض نہیں کیا گیا تھا بلکہ مصنف نے اپنی رائے کو بے لوث ظاہر کر دیا تھا۔ اسی پر قطب الدین باطن کا پورا تذکرہ لکھا گیا جسمیں وہ سب اساتذۂ دہلی معرضِ تحقیر میں لائے گئے جنھیں مصنف گلشن بیخار یعنی نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ اسے برائے نام بھی تعلق تھا۔ اسی طرح سے برہانِ قاطع دکھنی اور قاطعِ برہان مرزا غالب نے اپنے زمانہ میں جو بے پایان طوفان برپا کیا تھا اُسکی مہیب آوازیں آجتک کانوں میں آرہی ہیں۔

اکثر جگہ ترجمہ میں کوہ کندن وکاہ برآوردن کا معاملہ پیش آیا ہے یعنی بعض معمولی اور ادنیٰ باتوں کے لیے پوری پوری کتابیں اور تاریخیں پڑھنی پڑی ہیں جسکے بعد کوئی صحیح نتیجہ نکالا جاسکا ہے یا کوئی رائے قائم کی ہے۔ اصل کتاب کے علاوہ مصنف صاحب بھی اکثر جگہ حذف و اضافہ کرتے رہے اس لئے اسمیں وہ بہت سی باتیں دوسری شکل میں نظر آئینگی جو اصل کتاب میں تھیں کہیں کہیں مترجم اور مصنف کی رائے میں اختلاف تھا جس کو فٹ نوٹ کے تحت میں ظاہر کر دیا گیا ہے۔ غرضکہ یہ ایک کوشش وکاوش ہے جو ارباب نظر کی خدمت میں ہدیۂ ناز بنا کر پیش کیجاتی ہے اور نگاہ منتظر طغرائے قبول کی متمنی ہے۔

مجموعی حیثیت سے آج جب اس کتاب کو دیکھا جاتا ہے تو تنہا اسکے اندر وہ تمام ذخیرے

نظر آتی ہیں جو ایک ادیب کی معلومات کے لئے سرمایۂ ناز ہیں یعنی زبان اُردو کی پیدائش ہندی بھاشا اور دوسری زبانوں سے اُسکا ارتباط و اتحاد۔ دوسری زبانوں کا اُس سے سرنگوں ہونا اور مٹ جانا نظم کے ادوار مختلفہ اُن کے مشہور و معروف افراد۔ اُن پر تنقیدیں۔ موجودہ اساتذہ کے حال۔ تمام صناف نظم پر روشنی۔ انکی ابتداء و انتہا کے تاریخی نقطۂ نظر سے انکشافات نثر اُردو کے مشہور مصنفین اُسکی عہد بعہد کی ترقیاں اُنکی تصانیف پر نقد و تبصرہ مشہور نثاروں کا ذکر اور نثر کے صناف وغیرہ پر بسیط رائیں غرضکہ سبھی کچھ ان اوراق پریشان میں موجود ہے۔ اُردوے جدید کی جو روش بعض ناعاقبت اندیشوں نے نکالی ہے۔ اصولی طریقہ پر خواہ اُسکا کوئی بھی موجد اور ذمہ دار ہو۔ مگر موجودہ صورت اس بات کی معین معلوم ہوتی ہے کہ وہ سلاست شیرینی روانی بیان کا خاتمہ کر کے چند ہی روز میں زبان کو ایک خارزار بنا دیگی میں نے اس بات کی خصوصیت سے کوشش کی ہے کہ نہ تو استعارات و تشبیہات اغراق و غلو سے مطلب کا خاتمہ ہو جائے اور نہ وہ اسقدر دشوار ہو جائے کہ قدم قدم پر لغت دیکھنا پڑے۔ بلکہ عبارت سلیس اور سادہ رہے اور کہیں سے گنجلک نہ ہو۔

کتاب کا فائدہ اور دلچسپی بڑھانے کے لیے اسکے آخر میں ایک مفصل انڈکس شامل کیا گیا ہے تاکہ ہر اُس چیز کو جسکا اسمیں ذکر ہے بآسانی ڈھونڈھ سکیں۔

ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اسمیں بعض مشہور شعراء اور نثاروں کی تصاویر بھی دیدی گئی ہیں جس سے کتاب کی دلچسپی بڑھ گئی ہے۔ ہر چند کہ یہ ضروری نہیں کہ تصاویر کے شمول سے کسی کتاب کی اصلی قدر و قیمت میں کوئی معتدبہ اضافہ ہو۔ مگر جبکہ فی زمانا دوسری کتابوں کے ادبی تذکرے اور انسائیکلوپیڈیا اپنے مشاہیر کی تصویروں سے خالی نہیں ہوتے تو ہمکو بھی مناسب معلوم ہوا کہ اسطرح ہم اپنے ادبی پیشواؤں کے روحانی اور باطنی فیوض سے اپنے دل و دماغ کو مسرور و منور کرتے ہیں

اُسی طرح اُنکے خد وخال اور ظاہری جمال سے اپنی آنکھوں کو بھی روشن کریں۔ جی چاہتا تھا کہ تمام مشہور مشہور بااکمالوں کی تصاویر دیجاتیں مگر افسوس ہے کہ قدما کی تصویریں دستیاب نہیں ہوئیں اور جو ایک آدھ ملی بھی اُسکا بھی اعتبار نہیں علی الخصوص سودا کی تصویر جو ابھی تھوڑا عرصہ ہوا رسالہ میں شائع ہوئی تھی اور اس کتاب میں بھی اُسی سے لی گئی ہے نہایت بھدی اور بھونڈی تصویر ہے اور میرا دل ہرگز نہیں مانتا کہ میرزا رفیع سودا کی شبیہ ہوگی۔ بہرطور جسقدر عمدہ اور معتبر تصاویر ہم پہونچ سکیں اس کتاب میں دی گئیں۔ اور اسکے واسطے ہم اپنے مکرم و محترم دوست منشی دیا نرائن صاحب نگم کے ممنون ہیں کہ اُنھوں نے بعض تصاویر کے بلاک فراہم کئے اور خود مصنف صاحب اور مولوی عبد الباری صاحب آسی کے بھی شکرگزار ہیں جنکی کوشش سے بعض دیگر تصاویر دستیاب ہوئیں۔ اول الذکر نے ایک بہت بڑا ذخیرہ تصاویر کا بھیجدیا جسمیں سے اکثر کام آئیں۔

آخر میں بہت ضروری معلوم ہوتا ہے کہ میں بعض حضرات کا جن سے اس کتاب کی تیاری میں بہت کچھ مدد ملی دلی شکریہ ادا کروں۔ سب سے پہلے میں اپنے مددگار اور دوست مولوی عبد الباری آسی کا نام اس فہرست میں لینا ضروری سمجھتا ہوں کہ جنھوں نے مجھکو اسکی تکمیل و تیاری میں بڑی مدد دی۔ مجھمیں ایک سخت عیب ہے کہ اپنے ہاتھ سے لکھنے سے قاصر ہوں بلکہ اپنے ڈکٹیشن سے کسی دوسرے شخص سے لکھواتا جاتا ہوں۔ یہ کتاب تمام و کمال مولوی صاحب موصوف کی اس اعانت قلمی کا نتیجہ ہے۔ اور اسمیں کوئی شک نہیں کہ اگر اُن کا سا کاتب مجھے نہ ملتا تو اسکا اتمام و اختتام دشوار تھا۔ مولوی جعفر علی صاحب مصحح مطبع کا بھی میں متشکر ہوں کہ اُنھوں نے نہایت مستعدی اور ہوشیاری سے میرے ساتھ پروف پڑھے۔ اور سپرنٹنڈنٹ مطبع یعنی بابو کیسر داس صاحب سیٹھ کا بھی شکریہ میں نہیں بھول سکتا جنھوں نے اس کتاب کی طباعت و اشاعت میں دلچسپی لیکر کافی مدد دی۔

مرزا محمد عسکری۔ لکھنؤ۔ ۱۵ فروری ۱۹۲۹ء

باب ۱

زبانِ اُردو اور اُسکی اصل

اُردو سے کیا مراد ہے

عام طور پر لوگ اُردو کو فارسی کی ایک شاخ خیال کرتے ہیں۔ اس وجہ سے کہ اسکی ابتدا مسلمان حملہ آوروں کی فوج میں اور مسلمان سلاطین ہند کی دارالسلطنتوں میں پڑتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اُردو کے فارسی نژاد ہونے کی غلطی عام لوگوں کو تو اِس وجہ سے بھی محسوس ہوتی ہے کہ اُسمیں فارسی لفظ بکثرت ہیں اور اُسکی شاعری کی بحریں اور اُس کا رسم الخط بھی مثل فارسی کے ہے۔ اسی غلطی کی بناپر عام لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ اُردو مسلمانوں کی زبان ہے بمقابلہ ہندی کے جو ہندوؤں کی مخصوص زبان سمجھی جاتی ہے اور اسی غلط فہمی سے ایک عرصۂ دراز سے سخت مقابلہ اور مباحثہ درمیان معاونین اُردو اور طرفداران ہندی کے ان دونوں زبانوں کی عمدگی اور خوبی اور نیز اُنکی استعداد قبولیت عامّہ کی نسبت چلا آتا ہے اور اس بحث میں لوگ ایک معمولی بات یعنی زبان اُردو کی اصل کو نظر انداز کر جاتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ زبان اُردو اُس ہندی یا بھاشا کی ایک شاخ ہے جو صدیوں سے نواح دہلی اور میرٹھ کے اطراف میں بولی جاتی تھی اور جسکا تعلق شورسینی پراکرت سے بلاواسطہ تھا۔ یہ بھاشا جسکو مغربی ہندی کہنا بجا ہے زبان اُردو کی اصل اور ماں سمجھی جاسکتی ہے

گو کہ "اُردو" کا نام اُس زبان کو ایک عرصۂ دراز کے بعد دیا گیا۔ زبان اُردو کی صرف و نحو محاورات اور کثرت سے ہندی الفاظ کا اُسمیں استعمال ہونا اِس بات کی بیّن دلیل ہے کہ اُس کی ابتدا ہندی سے ہوئی اور محض اتفاق تھا کہ وہ ہندوستان کی زبان عام بن گئی جسکی وجہ یہ ہوئی کہ دہلی جو اس زبان کا ابتدائی مرکز تھا مسلمان حملہ آوروں اور بادشاہوں کی جاے ورود اور ان کا دار السلطنت بنا ہوا تھا۔ پس یہ خیال کرنا جیسا کہ میر امّن اور بعض اور قدیم اُردو نثّاروں کا خیال معلوم ہوتا ہے کہ اُردو ایک مخلوط زبان ہے جس میں وہ سب زبانیں داخل ہیں جو کسی زمانے میں دلی کے بازاروں میں بولی جاتی تھیں صحیح نہیں ہے۔ یہ ضرور سچ ہے کہ لشکر یا بازار سے اس زبان کی نشو و نما اور ترقی کو اِس قدر تعلق ضرور تھا کہ اس کا نام ہی "اُردو" ہو گیا جسکو زبان ترکی میں "لشکر" کہتے ہیں۔ زبان میں ہنوز پختگی نہیں آئی تھی اور وہ بحالت تشکیل تھی اور اجنبی الفاظ اور جملوں کے قبول کر لینے کا مادّہ اُس میں بہت تھا جیسا کہ اب بھی ہے۔

اِس زمانہ میں انگریزی تقلید میں اُردو کو "ہندوستانی" کہتے ہیں مگر یہ لفظ ہماری راے میں گو باعتبار لفظ صحیح ہو مگر حقیقت میں صحیح نہیں ہے کیونکہ اس لفظ میں مشرقی ہندی اور مغربی ہندی اور راجستانی سب شامل ہیں۔ اسی طرح ہمارے خیال میں برج بھاشا کو اُردو کا ماخذ قرار دینا جو کہ مغربی ہندی کی ایک شاخ ہے، اور جیسا کہ مولانا محمد حسین آزاد نے بھی سمجھا ہے صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ اس وجہ سے کہ برج بھاشا جو متھرا اور اُس کے جوانب میں بولی جاتی تھی۔ گو اُس بھاشا سے جو اطراف دہلی میں بولی جاتی تھی بہت مشابہت رکھتی ہے مگر پراکرت کی ایک علیحدہ شاخ ہے اور یہی شاخ یعنی دِلّی بھاشا ہمارے خیال میں زبان اُردو کی اصل سمجھی جا سکتی ہے۔

اُردو اور ہندی کا تعلق

جیساکہ اوپر بیان کیا گیا اُردو کا اصلی ماخذ وہ زبان ہے جو دلّی اور میرٹھ کے اطراف میں بولی جاتی تھی جسکو مغربی ہندی کی ایک شاخ سمجھنا چاہیے اور مغربی ہندی اپنی جگہ پر شورسینی پراکرت سے پیدا ہوئی اور مندرجہ ذیل زبانیں اُسکی شاخیں ہیں یعنی بنگارو، برج بھاشا، قنوجی، اور وہ زبان جو دہلی کے اطراف میں مروج تھی مگر زمانہ حال کی اعلی ہندی اُردو سے پیدا ہوئی اس طرح کہ فارسی الفاظ نکال کر اُنکی جگہ سنسکرت لفظ رکھدیے گئے۔ اسی اعلی ہندی میں نثر کی کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں کہ مصنفین نے سنسکرت کے بڑے بڑے الفاظ استعمال کیے ہیں مگر سچ پوچھیے تو اُردو اور ہندی اپنے ماخذ اور نیز اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک ہی زبان ہیں اور ان دونوں میں کچھ فرق نہیں ہے اگر کچھ ہے بھی تو نشوونما اور ترقی کے طریقے میں ہے۔ اُردو چونکہ مسلمانوں کے سایہ عاطفت میں پلی اس لیے اُسمیں فارسی الفاظ کی کثرت ہو گئی برخلاف ہندی کے کہ جو اپنے اصلی ماخذ یعنی سنسکرت کی طرف عود کر گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ موجودہ زمانے کی ادبی اُردو اور ادبی ہندی میں زمین آسمان کا فرق ہو گیا یعنی اول الذکر میں فارسی اور عربی الفاظ کی کثرت ہے اور آخر الذکر غیر مانوس سنسکرت الفاظ سے بھری ہوئی ہے۔

زبان اور ادب اُردو فارسی کا احسان مند ہے

شروع میں زبان نہایت سادہ اور بے تکلف تھی اور عوام الناس کی معمولی ضروریات کے پورا کرنے کے واسطے بالکل کافی تھی۔ جوں جوں اُسمیں ترقی ہوتی گئی اور وہ ایک ادبی زبان بنتی گئی اُسی قدر اُس میں فارسی اور عربی اور ترکی الفاظ شامل ہوتے گئے۔ فارسی الفاظ سننے میں بہت بھلے معلوم ہوتے تھے اس وجہ سے مصنفین نے اپنی کتابوں میں جدت کی چاشنی دینے کے لئے اُن کو بے تکلف استعمال کرنا شروع کیا اور اس طرح فارسی ترکیبیں جو اصلی زبان سے بالکل اجنبی تھیں

اور اُس کے ساتھ میل نہیں کھاتی تھیں زبان میں داخل ہونے لگیں۔ اسی کے ساتھ فارسی رسم الخط بھی کچھ تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ ہندی کی جگہ پر رائج ہو چلا اس وجہ سے کہ فارسی الفاظ فارسی خط میں بہ نسبت ہندی کے زیادہ آسانی سے اور صحت کے ساتھ لکھے جا سکتے تھے۔ اُردو شاعری پر بھی فارسی کا بڑا اثر پڑا اور وہ بھی فارسی شاعری کے قدم بقدم چلنے لگی۔ فارسی بحریں استعمال ہونے لگیں۔ ان کے علاوہ مضامین، طرزِ بیان، تخئیل، تلمیحات، خاص خاص محاورے اور مثلیں یہ سب کچھ زبان فارسی سے لیا گیا۔ اُردو کا علم عروض بھی فارسی عروض کے تابع اور زیرِ اثر ہو گیا۔ نثر کا بھی یہی حال تھا۔ وہی عبارت کی رنگینی، الفاظ کا توازن اور قافیہ بندی جو قدیم فارسی نثر کی جان تھی اُردو میں اُن کی پوری نقل کی جاتی تھی۔ الغرض زبان فارسی اردو پر اسقدر حاوی اور غالب ہو گئی کہ دونوں ایک ہو گئیں، اظہارِ خیالات، مضامین اور طرزِ ادا میں فارسی اُردو پر اتنی غالب ہو گئی کہ اُردو کی ابتدائی شان اُس سے بالکل غائب ہو گئی یہاں تک کہ اکثر لوگوں نے اُردو کی صرف و نحو کی کتابیں تک فارسی کے طرز پر لکھنا شروع کر دیں۔

اُردو میں فارسی الفاظ اور فارسی ترکیبوں کی کثرت کے اسباب

مسلمان بحیثیت فاتح ہندوستان میں آئے اور قدرتاً زبان فارسی جو اُن کی مادری زبان تھی ہندوستان کی "درشاہی" زبان بن گئی جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ دیسی زبان مثل خادمہ کے دب کر اور مغلوب ہو کر اپنی مالکہ زبان فارسی کی خدمت کرنے لگی اور اُسی کے طرزِ ادا اور محاورات وغیرہ کی متبع اور ناقل ہو گئی۔ لوگوں کو نئی زبان سیکھنے کا شوق ہوا کرتا ہے اسی وجہ سے اُسوقت کے لوگ بھی پرانا طرز چھوڑنے اور نئے الفاظ اور جدید محاورات اختیار کرنے لگے۔ دیسی زبان میں جواب تمسخر اور مبتذل شہری لوگوں سے چھوٹتی جاتی تھی اور اطراف شہر

دیہات میں محدود ہوتی جاتی تھی اب لوگوں کو کوئی مزا نہیں آتا تھا لہذا جدت پسند طبیعتوں نے نئی زبان کی طرف رُخ کیا اور اُسکو نہایت شوق و ذوق اور انہماک سے سیکھنے لگے۔ اسی وجہ سے قدیم ہندی شعرا کی تصانیف میں فارسی الفاظ کی کثرت تعجب خیز معلوم ہوتی ہے مثلاً چندکوی کی "پرتھی راج راسو" کو دیکھیے جو فارسی الفاظ سے بھری ہوئی ہے دیسی زبان کی تنگی اور کم وسعتی بھی اسکا باعث ہوئی کہ نئے نئے الفاظ اور خیالات کے اظہار کے لیے اُسکو اصلی لفظ اور طرز ادا جذب کر لینا پڑا شروع میں دیسی زبان میں ایسے الفاظ بکثرت شامل تھے جو یا تو سنسکرت کے لفظ تھے یا انھیں سے بگڑ کر کسی دوسری صورت میں زبان پر چڑھ گئے تھے جب مسلمان آئے تو زبان میں بھی ایک بڑا انقلاب ہوا۔ مسلمان حملہ آور بادشاہ بن گئے اور دہلی اُن کا پایۂ تخت ہو گیا۔ اب وہ یہاں بسنے اور آباد ہونے کے لئے آئے نہ کہ جس طرح سابق میں وہ سال بسال آتے تھے اور مال غنیمت لیکر واپس چلے جاتے تھے۔

جب دہلی پایۂ تخت ہو گیا اور بادشاہ مع لاؤ لشکر کے وہاں رہنے لگا تو باشندوں اور غیر ملکی سپاہیوں میں میل جول اور ربط وضبط بڑھنے لگا۔ ایک دوسرے کی زبان اور خیالات کو سمجھنے کے لئے ضروری ہوا کہ ایک گروہ دوسرے گروہ کے الفاظ سیکھے اور اُن کو اپنے طرز پر استعمال کرے اور ظاہر ہے کہ فاتح کا اثر مفتوح پر زیادہ ہوا کرتا ہے پس مفتوح قوم کی دیسی زبان یعنی ہندی پر فارسی کا بہت بڑا اثر پڑنے لگا۔ اسی وجہ سے اُردو میں فارسی الفاظ اور ترکیبیں بکثرت شامل ہو گئیں مگر ہندی نے اپنا اثر فارسی پر کم ڈالا کیونکہ فارسی کے زباں داں اپنی زبان کو اس قسم کی آمیزش سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ یہ تغیر گو کہ ابتدا میں بہت غیر محسوس طریقے سے شروع ہوا تھا مگر جوں جوں مسلمانوں کی جڑ مضبوط

ہوتی گئی اور وہ اس ملک میں آباد ہوتے گئے یہ زبانی تغیر برابر ترقی کرتا گیا اور یہ ترقی کی رفتار برابر قائم رہی یہاں تک کہ اکبر کے زمانہ میں ایک ہندو وزیر مال کی تاکید سے ایک حکم جاری کیا گیا کہ ہر سرکاری ملازم کو فارسی سیکھنا ضروری ہے جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ زبان کی جڑ مضبوط ہوگئی اور اسکی عظمت و اہمیت بڑھ گئی۔ لوگ فارسی، عربی، ترکی الفاظ بڑے شوق سے بولنے لگے کیونکہ وہ سننے میں اچھے معلوم ہوتے تھے اور زوردار تھے اور انکے بولنے والے خواہ مخواہ تعلیم یافتہ سمجھے جاتے تھے، اسکے علاوہ فارسی دانی سے سرکاری ملازمتیں بھی آسانی سے ملتیں اور تقرب شاہی کا بھی یہ ایک اچھا ذریعہ تھا۔ ایسی حالتوں میں ابتدائً ہر زبان کا یہی حال ہوا کرتا ہے جب قدیم اہل انگلستان کو نارمن لوگوں نے فتح کیا تو انگریزوں کی قدیم زبان "اینگلو سیکسن" کی بھی "نارمن فرینچ" کے ہاتھوں یہی حالت ہوئی تھی پس جس طرح زبان انگریزی میں دو طرح کی زبانیں یا بولیاں پائی جاتی ہیں وہی صورت اُردو کی بھی سمجھنا چاہیئے۔

اُردو میں فارسی الفاظ کی کثرت کے کئی اسباب ہیں مسلمان جب بحیثیت فاتح اِس ملک میں آئے تو اپنے ساتھ بہت سی نئی چیزوں کے نام لائے جن کے مرادف سنسکرت یا دیسی بھاشا میں نہیں مل سکتے تھے، چونکہ ایسے نام کسی شرح یا گھوم پھیر سے بتائے نہیں جا سکتے تھے اس لیے بجنسہٖ وہی فارسی الفاظ جن سے وہ چیز ظاہر ہوتی تھی زبان میں داخل کرنا پڑے مثلاً ایسے نام جو لباس، طعام، مذہب اور بعض اسی قسم کی دوسری چیزوں سے تعلق رکھتے ہیں پھر چونکہ فارسی فاتح قوم کی زبان تھی اور ایک ایسی زبان تھی جو رزم، بزم، حسن و عشق کے افسانوں کے لئے نہایت موزوں تھی اس لیے لوگ ایسے موقعوں پر فارسی الفاظ ہی بولنا پسند کرتے تھے اس وجہ سے کہ وہ نہایت شیریں اور شاندار معلوم ہوتے تھے، ایسے پُر زور لفظوں کے سامنے پرانے دیسی الفاظ اور محاوروں کو خواہ مخواہ پیچھے ہٹنا پڑا اس لیے کہ زمانہ

اُن کو پسند ہی نہیں کرتا تھا زبان انگریزی کی بھی یہی داستان ہے۔ جب یونانی اور لاطینی علوم کا احیا اور دوبارہ ترقی ہوئی تو اُس زمانہ میں بھی موٹے موٹے عالمانہ لفظ بولنے کا فیشن ہو گیا تھا بہرحال جب فاتح اور مفتوح دونوں قوموں کا میل جول بڑھا تو ایک ایسی مخلوط زبان یا بولی کی سخت ضرورت محسوس ہوئی کہ جو دونوں قوموں کے اچھی طرح سمجھ میں آسکے اور چونکہ مفتوح اپنے مالکوں کو زیادہ خوش رکھنا چاہتے تھے لہذا اُنھوں نے اُن کو خوش کرنے کے لیے اُنکی زبان سے زیادہ اخذ کیا۔ بہ نسبت اسکے کہ اُن کے مالکوں نے اُنکی زبان سے فائدہ اُٹھایا۔

اظہار قابلیت کے لیے بھی عربی فارسی الفاظ کثرت سے بولے جانے لگے۔ اُردو ادب کی ابتدا شاعری سے ہوئی اور شاعری فارسی داں لوگوں کے ہاتھ میں گویا ایک کھلونا تھی۔ جس کو وہ فارسی الفاظ و محاورات ہی کے لباس میں آراستہ کرنا چاہتے تھے۔ یہ لوگ زبان ہندی بہت کم جانتے تھے اور سنسکرت سے بالکل ناواقف تھے۔ اسی وجہ سے یہ ہونہار بچہ اپنے حقیقی والدین سے جُدا ہو کر اپنے مصنوعی والدین کی آغوش محبت میں تربیت پاتا رہا جنھوں نے بلاشک اُسکے ساتھ بہت کچھ کیا۔ اُنکی آغوش تربیت میں رہ کر اُردو کا نشوونما بالکل فارسی کی روش پر ہوتا رہا۔ نہ صرف فارسی الفاظ کا ایک کافی ذخیرہ زبان میں جمع ہو گیا بلکہ فارسی ترکیبیں بھی کثرت سے شامل ہونے لگیں مثلاً جار مجرور، صفت موصوف کی ترتیب بدل گئی ایسے سیکڑوں فقرے جو حرف ربط "بہ" سے معمولاً شروع ہوتے ہیں اُردو میں بے تکلف استعمال ہونے لگے جو دیسی مرجہ قواعد صرف و نحو سے بالکل خلاف تھا آج بھی ہماری ادبی دیسی زبان میں اسی قسم کی فارسی ترکیبیں کثرت سے موجود ہیں یہ ضرور ہوا کہ فارسی کے اثر سے اُردو ایک مستقل زبان کی شکل میں آج ہمارے سامنے موجود ہے لیکن اسکا افسوس بھی ہوتا ہے کہ اصل زبان کی خوبیاں جن سے اُردو کی ابتدا ہوئی تھی

بہت کچھ فنا ہوگئیں۔

یورپ کی زبانوں کا اُردو پر اثر

فارسی زبان اور فارسی ادب کا تو اُردو پر بہت گہرا اثر پڑا ہی تھا لیکن پرتگالی اور انگریزی کا بھی کچھ کم اثر نہیں پڑا البتہ زبان ڈچ اور فرینچ کے جمائے ہوئے نقوش یا تو مٹ گئے یا ہیں بھی تو اسقدر دُھندلے کہ معلوم نہیں ہوتے۔ پرتگالی اور انگریزی دونوں نے اُردو لغات میں معتدبہ اضافہ کیا۔ سنہ ۱۵۴۰ء میں ہندوستان کے مشہور بندرگاہوں پر اہل پرتگال قابض تھے اور ممالک مشرق میں گویا تجارت اُنھیں کے ہاتھ میں تھی۔ اُنکی آبادیاں ہندوستان کے سواحل پر اور اندرون ملک میں بھی تھیں اُن کا تعلق ہندوستان سے عارضی نہ تھا بلکہ وہ بحیثیت تاجر و حاکم اور مبلغ کے یہاں رہتے تھے اُنھوں نے بہت ترقی کی تھی اور سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں اُنکی زبان ہندوستان کے ایک بڑے حصے کی زبان عام ہوگئی تھی جو محض ہندوستانیوں اور اہل یورپ کے درمیان تبادلۂ خیالات کا ذریعہ ہی نہ تھی بلکہ خود یورپ کے سوداگر بھی آپس میں اسی زبان میں گفتگو کرتے تھے۔ اِسی میں عیسائی پادری اپنے مذہب کی اشاعت اور تبلیغ کرتے تھے چنانچہ اسی وجہ سے اُس کو بہت ایسے موقع ملے کہ وہ اپنا اثر یہاں کی دیسی زبانوں پر ڈال سکی سب سے زیادہ اثر بنگلہ زبان پر پڑا۔ اسی طرح دراوڑی زبانیں مثلاً مرہٹی، اسامی، اور اڑیا بھی اُس سے بہت کچھ متاثر ہوئیں۔ اُردو بھی اُس کے لغات سے بہت متمتع ہوئی۔ یہ اثر اتفاق سے شمالی ہندوستان میں اُسوقت پڑ رہا تھا جب دکھنی زبان جو پرتگالی کے اثر سے بسبب قربت کے بہت کچھ متاثر ہو چکی تھی اور نیز اسی طرح کی دوسری زبانیں اُردو پر اپنا اثر اچھی طرح ڈال رہی تھیں۔ پرتگالی الفاظ دیسی زبانوں میں اصلی حالت پر باقی نہیں رہے بلکہ جس بگڑی ہوئی شکل میں وہ ہندوستان میں بولے جاتے تھے اور ہندوستانی زبانیں اُن کو قبول

کر سکتی تھیں اُسی ہیئت پر وہ اب بھی بکثرت موجود ہیں۔ اہل پرتگال نے محض اپنی زبان کے الفاظ ہندوستانی زبانوں میں داخل نہیں کیئے بلکہ بہت سے عربی، فارسی اور ہندی الفاظ بھی اکثر یورپی زبانوں میں پہنچا دیے۔ اس کے علاوہ اکثر عربی اور فارسی لفظ پرتگالی سے مسخ ہو کر داخل ہوے مثلاً وہ الفاظ جو عربوں کے فتح اندلس کے زمانے میں اُن ممالک میں رائج ہو گئے تھے، پرتگالی الفاظ ہماری زبان میں بکثرت بولے جاتے ہیں مثلاً از قسم میوہ جات و اشیاے طعام۔ اچار۔ اناس۔ افوس (قسم انبہ) بسکٹ۔ کاجو۔ پمفرے۔ (قسم مچھلی) پپیتا۔ تمباکو، ترنج، چاء۔ ساگو۔ گوبھی وغیرہ

از قسم سامان آرائش و آلات و اسلحہ۔ الپین، الماری، ارغنون، بجرا، بالٹی، بوتل، پیپا، پستول، پریگ، چاپی، صابون، کوچ، کپتان، کاربین، کارتوس، میز، تولیہ، گارد وغیرہ۔

مذہبی الفاظ۔ پادری۔ گرجا، کراس وغیرہ

لباس میں۔ سایہ، قمیص، کاج، اسپیٹ وغیرہ

متفرق الفاظ۔ مثلاً انگریز، آیا، بما، پاگر (تنخواہ) باوردی، چھاپہ، نیلام، مستری، کمرہ، روپیہ وغیرہ

اہل پرتگال ہی نے سب سے پہلے یورپ کی اکثر چیزوں کی اشاعت ہندوستان میں کی لہذا اُن کے نام بھی اُسی طرح رائج ہو گئے جس طرح کہ وہ لوگ اپنی زبان میں بولتے تھے مرزا غالب "شراب پرتگالی" کا اکثر ذکر کرتے ہیں۔ زبان انگریزی ایک زندہ اور حاکموں کی زبان ہے اس نے اپنا اثر بہت کچھ ڈالا ہے اور ڈالتی رہیگی۔ انگریزی علم ادب نے اُردو نظم و نثر کو بہت کچھ فائدہ پہنچایا جسکا ذکر مفصل طور پر آیندہ کسی باب میں کیا جائیگا۔

لیکن اتنا اس موقع پر ضرور بتا دینا چاہیے کہ زبان انگریزی نے وہ الفاظ اُردو میں داخل کیے جنکی جگہ پر کوئی دوسرا لفظ موجود نہ تھا اور وہ الفاظ اب زبان زد ہو گئے۔ ترجمہ کا بھی یہ نتیجہ ہوا کہ اکثر انگریزی الفاظ اُنکی بدولت اُردو میں شامل ہو گئے۔ اُردو میں انگریزی الفاظ بکثرت داخل کرنے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے اسی طرح وہ انگریزی الفاظ جو بضرورت اُردو میں داخل اور مستحکم ہو گئے ہیں خارج کرنا بھی اندیشہ سے خالی نہیں ہے۔ اُردو کو مالدار ہونا چاہیے اور ہر طرح کے الفاظ جو اُسکی اصل سے میل کھاتے ہوں اسمیں ضرور داخل ہونے چاہییں خواہ وہ انگریزی ہوں یا فارسی ہوں یا سنسکرت صرف یہی ایک طریقہ زبان اُردو کی تکمیل اور اُسکی ترقی کا ہے اور اسی طرح وہ ایک اعلیٰ درجہ کی زبان اور ہندوستان کی عام زبان بن سکے گی۔

نثر اور نظم کی زبان ہر زبان میں نظم و نثر کی عبارت میں فرق ہوتا ہے۔ عبارت میں متانت اور سنجیدگی پیدا کرنے کے لیے اور نیز اس خیال سے کہ نثر اور نظم میں فرق معلوم ہو نظم کی عبارت بہ نسبت نثر کے زیادہ شاندار ہوتی ہے اسی درجہ سے وہ معمولی اور سادہ الفاظ اور معمولی بول چال کی ترکیبیں جو نثر میں عام طور پر پائی جاتی ہیں نظم میں ناجائز سمجھی جاتی ہیں۔ یہی درجہ تھی کہ فارسی محاورات اُردو نظم میں بکثرت شامل کر دیے گئے۔ اگر اُردو نثر کی ابتدائی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہو گا کہ شروع میں مقفّٰی عبارت بہت پسند کیجاتی تھی جس میں بیجد تکلف اور تصنع ہوتا تھا۔ بہترین طرز وہ تھا جسمیں ظہوری اور بیدل کی مُرصّع نگاری کی تقلید کی جاتی تھی۔ ہماری پُرانی نثر نگاری کی مثال باعتبار عبارت کی رنگینی اور قافیہ بندی کے بعینہ وہی ہے جو انگلستان میں ملکہ الزبتھ کے زمانہ میں انگریزی نثر کی تھی۔

مرزا غالب بلکہ سرسید احمد خاں کے زمانے سے ایک نیا دَور شروع ہوا جبکہ مغربی

تعلیم کے اثر سے وہ پرانا رنگ بدل گیا اور مقفی عبارت اور فارسی کی رنگینیت کی جگہ اب بے تکلف اور سادہ عبارت پسند کی جانے لگی۔ دور جدید میں نثرنگاری کی وہ شان باقی بھی نہیں رہ سکتی تھی کیونکہ عملی دُنیا میں سیدھے سادے صاف اور زوردار الفاظ کی ضرورت ہے۔ اب بھی فارسی الفاظ کی کثرت ضرور ہے لیکن اس سے عبارت کی خوبی پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور نہ کسی قسم کا تصنع پیدا ہوتا ہے۔ ہندی محاورات خوبصورتی کے ساتھ استعمال کیے جاتے ہیں اور پیچیدہ بندشوں سے گریز کیا جاتا ہے لیکن گلستان نظم کی آبپاشی اب بھی چشمۂ فارسی ہی سے ہوتی ہے اور اس کا چمن اب بھی انھیں صنعتوں سے آراستہ کیا جاتا ہے۔ ہندی الفاظ و محاورات استعمال ہوتے ہیں مگر کمی کے ساتھ اور صرف اُسی وقت جب وہ فارسی الفاظ کے ساتھ میل کھاتے ہیں۔

نثر کی طرح نظم میں بھی کچھ تغیر ہو چلا ہے اور موجودہ رنگ میں بجائے پُرانی لفاظی اور تصنع کے سادگی اور بے تکلفی بہت پسند کیجاتی ہے لیکن باوجود اس کے اکثر اہل ادب اب بھی فارسی الفاظ اور ترکیبوں کے دلدادہ ہیں مگر اُنکی کثرت اور جا و بیجا استعمال کو جہاں تک ممکن ہو کم کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ ہماری رائے میں نظم اور نثر کی عبارت اور انشاپردازی میں کوئی اصولی اور اہم اختلاف نہیں ہے۔

ادبی اُردو تقریری زبان تحریری زبان سے بالکل علیحدہ ہے۔ سادہ اور روزمرہ کے جملے جو ہر وقت زبان پر چڑھے ہوتے ہیں تحریر میں آتے وقت فارسی الفاظ سے بدل جاتے ہیں جسکی وجہ اُنکی جدت عظمت اور شانداری ہے۔ ابتدا میں بیشک زبان کا دائرہ بہت تنگ اور الفاظ کا ذخیرہ کم تھا اور وہ ایک مستقل زبان کہلانے کی مستحق نہ تھی کیونکہ اُسوقت تک اس میں بھونڈاپن تھا۔ نہ اُس پر جلا ہوئی تھی اور نہ اتنی صلاحیت اُس میں تھی کہ

اُس کے ذریعہ سے باریک اور نازک خیالات ادا ہوسکیں یا مختلف خیالات کا اظہار اچھی طرح
کیا جاسکے۔ اُسمیں ایک قسم کا لوچ اور الفاظ اور بندشوں کے جذب کرنے کا مادہ ضرور تھا۔
جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو جو الفاظ اور بندشیں اُسکو ملتی گئیں وہ سب اُس میں شامل ہوتی رہیں۔
رفتہ رفتہ زبان میں پختگی اور صفائی آتی گئی۔ دور اول کے شاعر ایسی زبان میں لکھتے تھے
جس میں آدھی اُردو اور آدھی فارسی ہوتی تھی رفتہ رفتہ اُردو کا عنصر غالب ہوگیا اور غالب نے
مغلوب کو جذب کرلیا۔ فارسی الفاظ اور غیر مانوس فارسی ترکیبیں اس طرح اردو میں ملگئیں کہ
اب وہ ہماری زبان کا جزو بن گئیں جن کو اب ہم نکال نہیں سکتے۔ بعض حضرات جو اس زمانہ
میں سنسکرت الفاظ کے دلدادہ ہیں وہ فارسی الفاظ اور ترکیبوں کو زبان سے نکالنے کی
کوشش میں ہیں۔ ہماری رائے میں یہ ایک فضول اور عبث کوشش ہے کیونکہ یہی
کثرت الفاظ جو اُردو کا مایۂ ناز ہیں اُسکو اتنا لوچدار اور مضبوط بنائے ہوئے ہیں کہ ہر ادبی کام
اُس کے ذریعہ سے نکل سکتا ہے۔

زبان اُردو کے قدیم نام | قدیم انگریز مؤرخ جنھوں نے ہندوستان کے حالات لکھے ہیں اُردو
کو لفظ "اندوستان" سے تعبیر کرتے تھے شروع اٹھارھویں صدی کے مصنفوں نے زبان
لاطینی میں اُس کو "لنگوا اندوستانی کا" لکھا ہے۔ اس سے بھی پہلے کے انگریز مورخین
اُس کو "مورز" کہتے تھے۔ جان گلکرسٹ نے ۱۷۸۷ء میں سب سے پہلے لفظ
"ہندوستانی" زبان اُردو کے واسطے استعمال کیا اور جبھی سے یہ لفظ مروّج ہوگیا۔
گو کہ اس کا پتہ بعض قدیم کتابوں میں ۱۶۱۶ء تک ملتا ہے جبکہ مسٹر ٹیری نے سب سے
پہلے اس کو استعمال کیا تھا۔ "اُردوئے معلّٰی" کا معزز خطاب شاہجہاں نے اُس کو دیا
جب کہ زبان ادبی خدمات انجام دینے کے قابل اچھی طرح ہوگئی تھی۔

لفظ "ریختہ" (یعنی وہ زبان جسمیں دیسی الفاظ کے ساتھ فارسی الفاظ بھی بکثرت استعمال ہوں) بعد کے مصنفین نے اس غرض سے استعمال کیا کہ ادبی زبان ریختہ اور بول چال کی زبان (اُردو) میں جو بازاروں اور جاہل فوجی سپاہیوں میں مروج تھی فرق ہو جائے۔ لفظ ریختہ زبان کے متعلق اب بہت کم استعمال ہوتا ہے ابتدا میں نظم کے واسطے یہی لفظ استعمال کیا جاتا تھا اس وجہ سے کہ نثر کا رواج اُس زمانے میں بہت کم تھا میر اور مصحفی تک کے زمانے میں اُردو کو بمقابلہ فارسی کے "ہندی" کہتے تھے جس سے مُلک کی دیسی زبان مراد تھی۔

اُردو کا رسم الخط اُردو کے حروف تہجی بالکل وہی ہیں جو فارسی اور عربی کے ہیں۔ البتہ بعض مخصوص حروف جن سے ہندوستانی زبان کی خاص خاص آوازیں ظاہر ہوتی ہیں جو فارسی اور عربی میں نہیں پائی جاتیں اضافہ کر دیے گئے ہیں مثلاً ٹ۔ ٹھ ڈ۔ ڈھ۔ ڑ۔ ڑھ۔ ان حروف کے لکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ ت۔ د۔ ر پر یا تو چھوٹی سی (ط) بنا دیتے ہیں یا چار نقطے دیدیتے ہیں۔

نظم اُردو نظم اُردو کا عروض فارسی اور عربی کے عروض کا تابع ہے لفظ کے کسی جزو پر زور دے کے پڑھنا جس کو انگریزی میں "ایکسینٹ" کہتے ہیں اُردو میں نہیں ہے البتہ قدیم یونانی اور رومی شاعری کی طرح اُردو میں بھی حروف علت کی آوازیں کھنچکر بڑھی جاتی ہیں اور اُس کو "اشباع" کہتے ہیں۔ نظم اُردو میں ردیف اور قافیہ بہت ضروری چیز ہے مروجہ بحریں اُنیس ہیں جن میں سے بعض عربی کے لیئے مخصوص ہیں اور بعض میں اتنی ترمیم ہو گئی ہے اور اُن کی صورت ایسی بدل گئی ہے کہ وہ بالکل نئی معلوم ہوتی ہیں۔ وزن شعر کے لیے خاص ارکان جو قدما نے مقرر کر دیے تھے اُن کی تکرار یا

تغیر تبدل سے مختلف بحریں قائم ہو گئی ہیں۔ یہ الفاظ عموماً عربی افعال کے مادے ہوتے ہیں اور انھیں سے اشعار کی تقطیع کی جاتی ہے اور بڑی یا چھوٹی بحریں انھیں سے قائم ہیں تقطیع کا طریقہ یہ ہے کہ یا تو وہی رکن بار بار دہرایا جاتا ہے مثلاً فعولن فعولن فعولن فعولن ہے۔ بار بار رکنوں میں رد و بدل ہوتا ہے جیسے مفعول فاعلات مفاعیل فاعلن تقطیع کے خاص قواعد مقرر ہیں تحریر شدہ حروف کے ساتھ اُن حرفوں کا بھی شمار ہوتا ہے جو پڑھے جاتے ہیں گو تحریر میں نہیں آتے۔ وہ حروف جو پڑھے نہیں جاتے بلکہ محض تحریر میں آتے ہیں تقطیع میں شمار نہیں کیے جاتے۔ الف ممدودہ شروع لفظ میں جب آتا ہے دو حرف کے برابر اور اضافت جو کھینچ کے پڑھی جائے ایک حرف کے برابر سمجھی جاتی ہے۔ اُن الفاظ کو جن سے تقطیع کیجاتی ہے "رکن" کہتے ہیں جسکے معنی ستون کے ہیں جسپر عمارت یا خیمہ قائم ہوتا ہے۔ پورے شعر کو "بیت" اور نصف شعر کو "مصرع" کہتے ہیں مصرع کے لغوی معنی "دروازے کا ایک پٹ" ہیں نظم کی مختلف قسمیں جو فارسی میں متداول ہیں اور جو اُردو میں اختیار کی گئی ہیں حسب ذیل ہیں۔

غزل اور قصیدہ یہ سب سے زیادہ مشہور اصناف نظم ہیں۔ ان دونوں میں فرق صرف مضمون اور طول کا ہوتا ہے مگر بحور اور ردیف و قافیہ کی پابندی دونوں میں یکساں طور پر ہوتی ہے۔ غزل کا رنگ عموماً عاشقانہ یا صوفیانہ ہوتا ہے اور تعداد اشعار عموماً ۵ سے ۱۲ تک گو کہ اسکی پابندی بہت کم کی جاتی ہے۔ قصیدہ میں عموماً کسیکی مدح یا ہجو ہوتی ہے اور نصیحت آمیز یا فلسفیانہ رنگ کا بھی ہو سکتا ہے۔ تعداد اشعار عموماً کم از کم ۲۵۔ اور زیادہ سے زیادہ ۱۷۰ تک مگر اسکی بھی پابندی کون کر سکتا ہے۔

قطعہ جس کے لغوی معنی ٹکڑے کے ہیں اور اُس کو قصیدے یا غزل کا ایک حصّہ

سمجھنا چاہیے۔ تعداد اشعار کم سے کم دو اور زیادہ کی کوئی حد مقرر نہیں۔ پہلے دو مصرعوں کے لیئے ہم قافیہ ہونا ضروری نہیں لیکن اشعار میں قافیہ کی پابندی لازمی ہے قطعات میں اکثر پند و نصائح کے مضمون بیان کیے جاتے ہیں اور مطلب پورا ہو جاتا ہے۔

رُباعی۔ اس میں دو شعر یا بیت ہوتے ہیں اسی وجہ سے انکو دوبیتی بھی کہتے ہیں پہلا، دوسرا، اور چوتھا مصرع ہم قافیہ ہوتے ہیں اور زیادہ تر ایک ہی سی بحروں میں کہی جاتی ہے۔ رُباعی کے لیئے خاص کسی مضمون کی تخصیص نہیں لیکن چوتھے مصرع کو عموماً مؤثر معنی خیز اور زوردار ہونا چاہیئے۔

مثنوی۔ یہ صنف رزم و بزم حُسن و عشق، قصے اور افسانہ نگاری کے لیے مخصوص ہے۔ اسمیں ہر شعر کے دونوں مصرعوں کو ہم قافیہ ہونا چاہیئے۔ ردیف ہو یا نہ ہو تعداد محدود نہیں ہے مثنوی کے لیے عموماً پانچ بحریں مروج ہیں مگر بعض کے نزدیک سات ہیں ۔ مستزاد اُس کو کہتے ہیں کہ جب ہر مصرع کے آخر میں کچھ زائد لفظ بڑھائے جائیں یہ زائد لفظ اُسی بحر میں ہوتے ہیں جو اصلی مصرع کے دو آخری رکنوں کی ہوتی ہے مگر اِن کا قافیہ کہیں علیحدہ بھی ہوتا ہے۔ ترجیع بند اور ترکیب بند، یہ بھی نظم کی قسمیں ہیں ان میں بہت سے بند ہوتے ہیں اور ہر بند میں برابر یا بعض وقت مختلف تعداد ابیات کی ہوتی ہے جو ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ ہر بند کے آخر میں ایک بیت ہوتا ہے جو اوپر کے بند کو نیچے کے بند سے جُدا کرتا ہے اور قافیہ میں بھی اُن سے علیحدہ ہوتا ہے اگر ہر بند کے بعد ایک ہی بیت بار بار آئے تو ایسی نظم کو ترجیع بند کہتے ہیں، ورنہ اگر بیت بدلتا جائے تو ترکیب بند کہلاتی ہے۔ ترجیع بند یا ترکیب بند میں تمام اشعار ایک ہی بحر میں ہوتے ہیں۔ مربع چو مصرعی نظم کو کہتے ہیں جسمیں سب مصرع ہم قافیہ ہوں،

مخمس میں بجائے چار کے پانچ مصرع ہوتے ہیں پانچویں مصرع کا قافیہ بدلا ہوتا ہے
اور باقی صورت مربع کی سی ہے مسدس کی شکل بھی قریب قریب ایسی ہی ہے فرق اتنا ہے
کہ پہلے چار مصرع یا دو بیت ہم قافیہ اور باقی دو مصرع علیحدہ ہوتے ہیں۔ان کے علاوہ
دیگر اصناف سخن مسبع وغیرہ بھی اسی طرز کے ہیں۔

واسوخت نظم کی وہ قسم ہے جس میں عاشق اپنے معشوق کی بے وفائی ظلم و ستم
رقیب کے ساتھ بیجا محبت اور جدائی کی مصیبت و تکلیف کی شکایتیں کرتا ہے۔
گویا معشوق کو دھمکاتا ہے کہ اگر اُس کا طرز تغافل اور ستم شعاریاں اسی طرح باقی رہیں
تو پھر اُس کے ہاتھ سے عنان صبر چھوٹ جائے گی اور وہ معشوق سے علیحدگی اختیار
کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔

تاریخ نظم کی وہ قسم ہے جس میں کسی واقعہ کے اعداد سنہ حروف ابجد کے حساب
سے نکالے جاتے ہیں۔

فرد کسی نظم یا تمام غزل کے کسی ایک شعر کو کہہ سکتے ہیں جو کبھی مثالاً پیش کیا جاتا ہے۔
قصیدہ اور غزل کا پہلا شعر مطلع اور آخری شعر مقطع کہلاتا ہے جس میں شاعر اپنا
تخلص نظم کرتا ہے۔نظم کی کتابوں میں اکثر پہلے حمد و نعت پھر بادشاہ یا ممدوح کی تعریف
اس کے بعد سبب تالیف اور کچھ فخریہ اشعار آخر میں مناجات و خاتمہ ہوتا ہے مجموعہ نظم
کو کلیات کہتے ہیں جس کی ترتیب عموماً اس طور پر ہوتی ہے۔قصائد۔غزلیات۔قطعات
رباعیات۔مثنویات۔وغیرہ

نثر کی تین قسمیں ہیں۔(١) عاری جو بالکل سادہ اور بے تکلف ہوتی ہے۔
(٢) مرجز جس میں بحر ہوتی ہے مگر قافیہ نہیں ہوتا (٣) مسجع جس میں بحر نہیں ہوتی مگر

قافیہ کی پابندی ہوتی ہے۔ نثر مسجع کی بھی تین قسمیں ہیں (۱) متوازی (۲) مطرف (۳) متوازن۔ نثر متوازی میں دو فقروں کے آخری الفاظ ہموزن اور ہم قافیہ ہونے چاہئیں مطرف میں آخری الفاظ کے ہموزن اور ہم قافیہ ہونے کی ضرورت نہیں متوازن میں ہموزن ہوتے ہیں مگر ہم قافیہ نہیں ہوتے۔ یہ تمام قسمیں اب متروک ہیں کیونکہ اُنیسویں صدی کے آخر میں اس قسم کی مصنوعی عبارت اور قافیہ پیمائی کا بالکل خاتمہ ہو گیا۔ "تذکرہ" میں شعراٗ کے سوانح و حالات مختصراً بیان کیے جاتے ہیں اور "گلدستہ" مجموعۂ نظم کا نام ہے۔

باب ۲

ادب اردو کی ترقی کے ابتدائی دور

نظم کا تقدم نثر پر اس کے وجوہ اور اس کا تعلق خاص اُردو کے ساتھ

دنیا کے تمام ادبوں کی ابتدا شاعری سے ہوئی۔ شعر ایک زندہ قوت ہے جس کا وجود نثر سے بہت پیشتر معلوم ہوتا ہے۔ قافیہ پیمائی اور تک بندی انسان میں ایک فطری چیز ہے۔ انسان کو پہلے جذبات کا حس ہوتا ہے پھر وہ دماغ کو کام میں لاتا ہے اور سوچتا ہے اسی وجہ سے ارتقاے تہذیب انسانی میں جو مظہر جذبات ہے نثر پر مقدم ہے جو فکر دماغی کا نتیجہ ہے۔ سب سے پہلے جب کہ فن تحریر کی ایجاد نہیں ہوئی تھی شعر ہی اپنے زبردست اثر سے دماغ میں محفوظ رہ سکتے تھے اور قوت حافظہ کی مدد سے مجمع میں سُنانے (انشاد) کے قابل بھی شعر ہی ہو سکتے تھے گو کہ ظاہراً نثر ہمارے اظہار خیالات اور گفتگو کا آسان ترین اور فطری ذریعہ معلوم ہوتی ہے مگر غور کرنے کے بعد اور تجربہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف ضبط خیالات اور رسمی تحریروں کیواسطے موزوں ہے

زبان اُردو کی دیوی اپنے سازِ طرب سے آراستہ و پیراستہ اس طرح نمودار ہوئی کہ[1] ادب اُردو جو دراصل فارسی کا متبع اور ناقل ہے اسکو اپنے پیشرو کی تقلید بہ نسبت نثر کے نظم میں زیادہ آسان اور دلچسپ معلوم ہوئی کیونکہ نقل و ترجمہ ایک زبان سے دوسری زبان میں نثر میں اتنا آسان نہیں ہوتا جتنا کہ فی الحقیقت نظم میں ہوتا ہے۔ اور چونکہ اُردو اپنی ارتقائی منزلوں میں جبکہ اُسکا ادب ہنوز عالمِ طفلی میں تھا قوت تخییل اور اظہار جذبات کے واسطے ایک زبردست سرمایہ الفاظ کا اپنے پاس محفوظ رکھتی تھی لہذا جب اُسکی پیدائش کا وقت آیا تو وہ اپنے استادوں کے دماغوں سے منروا کی طرح دفعتہً نکل آئی اور اظہار خیالات و جذبات کے لیے چونکہ نثر عام طور پر نہیں پسند کیجاتی ہے - لہذا متقدمین اُردو نگار بھی اس صنف کے استعمال سے شروع میں پرہیز کرتے رہے -

سب سے پہلا اُردو شاعر امیر خسرو دہلوی

زبان اُردو کی ترقی کا ابتدائی زمانہ اتنا دھندلا نظر آتا ہے کہ اُس کے خط و خال صاف طور پر نمایاں نہیں مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ سب سے پہلا شاعر زبان اُردو کا اس دھندلکے میں جو صاف طور پر نمایاں نظر آتا ہے وہ حضرت امیر خسرو دہلوی ہیں جنکی شہرت بحیثیت ایک فارسی شاعر کے کسی تعریف و توصیف کی محتاج نہیں - ان کا لقب اسی شاعری کی مناسبت سے "طوطی ہند" ہے اُنھوں نے سب سے پہلے اردو الفاظ ادبی اغراض سے استعمال کیے اور سب سے پہلے اُردو میں شعر کہا۔ سب سے پہلی غزل اردو بھی امیر خسرو ہی کی طرف منسوب ہے مگر اُسکی ترکیب اس طرح ہے کہ اس کا ایک مصرع فارسی اور

---

[1] یہ یونانی دیوانی کی طرف اشارہ ہے جسمیں مرقوم ہے کہ منروا جو یونانیوں میں عقل و علم اور جنگ کی دیوی مانی جاتی تھی جیوپیٹر کے سر سے نہایت مکمل اور آراستہ دفعتاً پیدا ہوئی تھی -

ایک اُردو ہے اور بحر فارسی ہے۔ اس کے علاوہ اکثر پہیلیاں، مکریاں۔ انملیاں۔ دوسخنے دوہرے وغیرہ جو آج تک مشہور ہیں اُنکی طرف منسوب ہیں۔ بعض شعر ایسے بھی ہیں جس میں ٹھیٹھ ہندی الفاظ جو بمشکل اُردو کہے جاسکتے ہیں سنسکرت بحروں میں بندھے ہیں، گو فارسی الفاظ بھی کہیں کہیں استعمال[1] ہوئے ہیں۔ حضرت امیر خسرو تیرھویں صدی عیسوی میں ضلع ایٹہ (ممالک متحدہ آگرہ و اودھ) میں پیدا ہوئے[2] اور متعدد شاہان دہلی مثلاً غیاث الدین بلبن، معزالدین کیقباد وغیرہ کے درباروں میں مختلف عہدوں پر ممتاز رہے۔ وہ مشہور صوفی و مرشد حضرت نظام الدین اولیا کے مرید و محبوب خاص تھے جن سے اُن کو اتنی محبت و عقیدت تھی کہ جب پیر کے انتقال کا حال سُنا تو اسی غم میں چند روز کے بعد ۱۳۲۵ء میں سفر آخرت اختیار کیا۔ بلبن اُن کی بڑی قدر کرتا تھا اور اُن کے کلام کا دلدادہ تھا۔ امیر خسرو فن موسیقی میں بھی کمال رکھتے تھے۔ انھوں نے سب سے پہلے فارسی بحور اُردو میں استعمال کیں اور اُن کی کتاب "خالق باری" جس کے مطلع کے ابتدائی الفاظ یہی دو لفظ "خالق" اور "باری" ہیں اب تک ہمارے یہاں ایک مشہور درسی کتاب سمجھی جاتی ہے۔ جس کو بچے بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔ امیر خسرو کی شہرت زبان اُردو کے شاعر یا ادیب ہی کی حیثیت سے نہیں ہے بلکہ وہ اُسکے موجد و مخترع کہے جاسکتے ہیں۔ اُن کے زمانہ میں زبان میں روانی پیدا ہو چلی تھی مگر پختگی ہنوز نہیں آئی تھی اور متانت الفاظ بھی بہت محدود تھی۔ مختصر یہ کہ اُن کا دور ابتدائی دور ہے اور گو اُسوقت تک زبان میں کوئی ترقی نہیں ہوئی مگر آیندہ ترقیوں کی

[1] فارسی میں ایک نئی صنعت ایجاد کی ہے جسکا نام ترجمۃ اللفظ رکھا ہے یعنی فارسی لفظ کا ترجمہ اُردو میں کردیا ہے مثلاً "رسو داسے رُخ تو کشت مارا" کشت کے معنی اُردو میں مارا کے ہیں۔

[2] مقام ولادت پٹیالی ضلع ایٹہ ہے اور سنہ ولادت ۶۰۵ھ ہے۔

داغ بیل اسی زمانہ میں پڑ گئی تھی ۔

اُردو کی پختگی کا زمانہ امیر خسرو کے زمانہ سے لیکر دکن کے شعرائے اُردو کے عہد تک بڑا
فصل ہے مگر زبان نے گو اس طویل عرصہ میں جو تین صدیوں سے کم نہ تھا کوئی نمایاں
ترقی نہیں کی پھر بھی یہی مدت اُس کے حقیقی نشو ونما اور مضبوطی کی کہی جا سکتی ہے ۔
زبان اب تک غیر منظم حالت میں تھی اور قوت، لوچ، اور وسعت کی اُسکو سخت ضرورت
تھی سب سے بڑی بات یہ تھی کہ بلند انشا پردازی کی اغراض کے لئے اُسکے لغات
میں معتد بہ اضافہ ہونا چاہیے تھا اسی وجہ سے مناسب فارسی الفاظ کو اُس نے اپنے
آغوش محبت میں بے تکلف اور بڑے شوق سے جگہ دی ۔ چنانچہ ملک محمد جائسی (۱۵۴۰ء)
کی پدماوت جو فارسی حروف میں تحریر ہوئی تھی کبیر (۱۴۴۰ء لغایت ۱۵۱۸ء) کے
بھجن اور باتُلسی داس (۱۵۳۲ء لغایت ۱۶۲۴ء) کی تصانیف میں ایسے
الفاظ کا بخوبی پتہ چلتا ہے ۔

زریں عہد اکبری زبان اُردو کی توسیع کے جو لوگ شائق تھے انھیں اس زبان کو مختلف
طبقوں کے لوگوں تک پہونچانے اور اُس کو پھیلانے کے لیے دونوں قسموں کے
الفاظ یعنی ملکی اور غیر ملکی دونوں کے استعمال کرنے کی ضرورت تھی ۔ اس کوشش
کی رفتار عہد اکبری میں بہت تیز تھی شہنشاہ اکبر کا دل چاہتا تھا کہ ملک کی مفتوح
رعایا اور باہر کے فاتح زبان کے ذریعہ سے شیر و شکر ہو جائیں ۔ چنانچہ وہ خود بھی کبھی کبھی
دیسی زبان یعنی ہندی میں شعر کہتا تھا اور اُس کے اہل دربار بھی اُسکی تتبع میں ہندی
میں کہتے تھے اور ہندی شاعروں کی بڑی قدر کرتے تھے ۔ اُس کے درباری شاعر
سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کرتے تھے فیضی نے اکثر ہندی دوہرے کہے اور

عبدالرحیم خاں خانخاناں دربار اکبری کا رُکن عظم اور فارسی کا مشہور شاعر ہندی کا بھی اچھا خاصہ شاعر تھا۔ چونکہ فاتح اور مفتوح دونوں قوموں میں دلی محبت اور اتحاد تھا اسوجہ سے زبانوں میں بھی اتحاد پیدا ہوا اور کئی زبانوں سے مِل کر ایک نئی زبان پیدا ہو گئی۔ اُسی زمانہ میں راجہ ٹوڈرمل نے ایک بڑا کام کیا جو اُردو کی اشاعت کے لئے بہت مفید ثابت ہوا۔ ملک کے مالی حسابات پہلے دیسی زبان میں لکھے جاتے تھے جن کو مسلمان افسران صیغۂ مال اچھی طرح نہیں سمجھتے تھے اور حساب کی جانچ پڑتال میں اُن کو مجبوراً مترجم سے مدد لینا پڑتی تھی اور اس طرح دیسی حساب نویسوں اور غیر ملکی حساب فہموں میں ایک بُعد رہتا تھا جس کو راجہ ٹوڈرمل نے اس طرح رفع کیا کہ مسلمان افسروں کو ہندی زبان اور ہندو محاسبوں کو زبان فارسی سیکھنے کی سخت تاکید کی اور اسکا حکم دیدیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زبان فارسی کی تعلیم حصول ملازمت اور ترقی کی منزلیں طے کرنے کے واسطے بہت ضروری قرار پا گئی۔ کسی قسم کی ترقی اور دربار رسی بغیر بادشاہ کی زبان جانے ہوئے ممکن نہ تھی۔ ٹوڈرمل نے حکم دیدیا کہ صیغۂ مال میں جو لوگ ملازمت کرنا چاہیں اُن کے لئے زبان فارسی کی تحصیل لازمی ہے پس جس چیز کی ابتدا اکبر کے زمانہ میں شروع ہوئی تھی وہ شاہجہاں کے عہد میں درجۂ تکمیل کو پہونچی اور اب زبان اس قابل ہو گئی کہ وہ ادبی اغراض میں کام آسکے۔ ترقی اور درستی اور اصلاح کا کام بیشک زبان میں برابر جاری رہا بلکہ ہمارے نزدیک اب تک جاری ہے۔

قدیم شعرائے دکن اور دربار شاہان گولکنڈہ و بیجاپور	امیر خسرو کے زمانہ کو زبان اُردو کی نمود کیواسطے صبح کاذب کہنا بجا ہے جسکی صُبحِ صادق ہمارے نزدیک مُلکِ دکن

کے مطلع پر مسلمان شاہان بیجاپور و گول کنڈہ کے عہد میں نمودار ہوئی جسکے اسباب کو ہم نے اس کتاب میں آگے چل کے وضاحت سے لکھا ہے۔ بادشاہان مذکور خود صاحبان علم و فضل اور اہل علم کے بڑے قدردان تھے۔ محمد قلی قطب شاہ (۱۵۸۱-۱۶۱۱ء) سلطان محمد قطب شاہ (۱۶۱۱-۱۶۲۵ء)، عبداللہ قطب شاہ (۱۶۲۵-۱۶۷۲ء)، ابوالحسن قطب شاہ (۱۶۷۲-۱۶۸۲ء) جو ۱۷۰۰ء میں قید میں مرا) یہ سب خود بھی شاعر اور شاعروں کے بڑے مُربّی اور قدردان تھے۔ محمد قطب شاہ عبداللہ قطب شاہ اور ابوالحسن زبان دکھنی میں شعر کہتے تھے جو اُردو ہی کی ایک شاخ ہے جسکی تفصیل آگے آئیگی ان سب نے غزل، رباعی، مثنوی، قصیدے اور مرثیے لکھے جو اس زمانہ میں موجود مگر بہت کمیاب ہیں۔ اسی طرح بیجاپور کے ابراہیم عادل شاہ ثانی (۱۵۸۰-۱۶۲۶ء) اور علی عادل شاہ اول (۱۵۵۸-۱۵۸۰ء) خود بھی قابل بادشاہ تھے اور اہل فن کے بڑے قدردان تھے۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی نے فن موسیقی پر زبان ہندی میں ایک مشہور کتاب لکھی ہے جس کا دیباچہ بزبان فارسی اُس کے دربار کے مشہور شاعر و نثار ملا ظہوری ترشیزی متوفی ۱۶۱۶ء کا لکھا ہوا زبان فارسی کی ایک بے مثال تحریر سمجھا جاتا ہے اور آگے چل کر اکثر اُردو نثاروں نے اسکی نقل کی بڑی کوشش کی ہے۔ اسی طرح علی عادل شاہ اول بھی بڑا قابل بادشاہ تھا جسکے دربار کے مشہور شاعر نصرتی کی اکثر تصانیف موجود ہیں جن میں مثنوی گلشن عشق اور علی نامہ زیادہ مشہور ہیں۔ ان میں کوئی خاص بات قابل ذکر نہیں ہے بلکہ کثرت سے زبان دکھنی کے الفاظ اور قدیم متروک الفاظ کے خلط ملط سے اکثر جگہ مطلب سمجھ میں نہیں آتا۔ ان کتابوں کی وقعت اسقدر ضرور ہے کہ وہ زبان و ادب اُردو کی تدریجی ترقی کی قابل قدر مثالیں ہیں۔

نواب خان خاناں

ولی دکھنی سنہ ۱۶۶۸ء تا سنہ ۱۷۴۴ء

جب ولی کا نیّر اقبال چمکا تو چھوٹے چھوٹے تارے جو افق شاعری پر اُسوقت ضیا فگن تھے سب ماند پڑ گئے۔ ولی کو ریختہ کا موجد۔ گویا اُردو کا چاسر[1] خیال کرنا چاہیے۔ اسی زمانہ میں اُردو شاعری کا سنگ بنیاد باقاعدہ طور سے رکھا گیا۔ ولی کا کلام شمالی ہند کے تمام نظم نگاروں کے واسطے نمونہ بن گیا اور اُسی کو دیکھکر اور اپنے سامنے رکھکر اُسوقت کے تمام شعراے دہلی نے ترقی کرنا شروع کی۔ ولی کا کلام نہایت صاف سادہ فصیح اور پیچیدہ استعارات اور دور از کار تشبیہوں سے پاک ہے۔ تصوف کا بھی رنگ جھلکتا ہے۔ فارسی الفاظ اور خیالات کی کثرت ضرور ہے مگر غلبہ نہیں ہے۔ ہندی لفظ بھی فارسی الفاظ کے ساتھ جابجا مِلے جُلے ہیں جو بعد کو متروک ہو گئے۔

قدیم شعراے دہلی حاتم، آبرو، آرزو

دیوان ولی کی اشاعت کے ساتھ ہی مرکز شاعری گویا دکھن سے منتقل ہوکر دہلی میں آگیا اس وجہ سے کہ یہاں کے لوگوں کو ایک خاص دلچسپی شعر و شاعری کے ساتھ پیدا ہوگئی۔ سیکڑوں متبع ولی کے پیدا ہو گئے جو اُن کے کلام کی بڑی قدر کرتے تھے اور اُسی طرز پر کہتے تھے۔ اب اُردو شاعری فارسی کے دوش بدوش ترقی کرنے لگی گویا اُسکی مدمقابل اور حریف بنگئی گو ابھی تک اُس میں وہ کُہنگی اور پختگی نہیں پیدا ہوئی تھی جس سے اُسکی حریف زبان فارسی کو کوئی اندیشہ ہوتا۔ نظم اُردو اب تک ایک کھلونا سمجھی جاتی تھی جس کو لوگ پسند ضرور کرتے تھے اور فارسی کلام کی محنت و دماغ سوزی کے بعد اُسی سے دل بہلاتے تھے سلطنت مغلیہ گو بہت کمزور ہوگئی تھی مگر اب تک اُس میں جان باقی تھی اور درباری

---

[1] چاسر زبان انگریزی کا بہت قدیم شاعر (سنہ ۱۳۴۰ تا سنہ ۱۴۰۰) اسکی مشہور تصنیف کنٹربری ٹیلیس (کنٹربری کے قصے) کی زبان قدیم ہے اور مروجہ زبان سے بہت مختلف ہے۔

زبان اب تک فارسی ہی تھی۔ اُردو کے کمزور اور نوخیز بچہ کو اتنی قوت کہاں تھی کہ فارسی کے شہ زور ریختہ کار پہلوان سے مقابلہ کر سکے۔ اس لیئے اُسے مقابلہ کی جراُت نہ ہوتی تھی۔ قدیم شعرائے اُردو سب بڑے بڑے فارسی داں اور فارسی کے کہنہ مشق شاعر تھے۔

ولی کے متبع ظہور الدین حاتم (سنہ ۱۶۹۹ء تا سنہ ۱۷۹۲ء) خان آرزو (سنہ ۱۶۸۹ء تا سنہ ۱۷۵۶ء) ناجی مضمون، آبرو اور بہت سے اور شعرا پیدا ہوئے جن کو اُردو شاعری کے آباء سمجھنا چاہیئے۔ ان کا کلام تصوف کے رنگ میں ڈوبا ہوا بہت صاف و سادہ اور تصنع و تکلف سے بہت کچھ پاک و صاف ہے نشست الفاظ میں بہت زور طبع دکھایا گیا ہے اور فارسی الفاظ اور ترکیبیں بکثرت ملتی ہیں۔ ولی کے یہاں جو ہندی الفاظ تھے وہ ان لوگوں کے یہاں نہیں یا بہت کم ہیں اُن کی جگہ فارسی لفظوں نے لے لی ہے۔ فارسی بحریں اُردو نظم میں بہت بھلی معلوم ہوتی ہیں اور بہت خوبی سے بندھی ہیں۔ اُن کے زور طبیعت اور قدرت کلام میں کسی کو کلام نہیں اور اُنکی مشاقی سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا اور نقش اول سے نقش ثانی یقیناً بہتر ہے گو فارسیت کا رنگ اور تصنع بہ نسبت دکھنی شعرا کے ان میں زیادہ ہے مقامی رنگ گو بالکل غائب نہیں مگر رفتہ رفتہ کم ہوتا جاتا ہے۔ ہندی دوہروں کا بھی کچھ اثر اشعار میں پایا جاتا ہے۔ قدیم شعرائے دہلی کا کلام اُردو کی تدریجی ترقیوں کی منزل میں ایک نمایاں نشان ہے۔

میر و سودا کا زمانہ، اس زمانہ کی ترقیاں، زبان اور شاعری میں اصلاحیں،

یہ زمانہ اردو شاعری کی سب سے بڑی ترقی کا زمانہ ہے۔ اس میں محبوبۂ شاعری مع اپنی تمام کرشمہ سازیوں کے زینتِ الفاظ اور جدتِ خیال سے آراستہ و پیراستہ ہو کر

دُنیا کے سامنے نمودار ہوئی ۔ یہ میر اور سودا کا زمانہ ہے جو اُردو شاعری کے رکن رکین اور اُستادِ اعظم مانے جاتے ہیں یہ دونوں بزرگ اپنے حسن ادا حلاوت زبان قدرت الفاظ اور نزاکت زبان کی وجہ سے اپنے تمام ہمعصر اور پیش رو سابق حریفوں پر گوے سبقت لیگئے ان کے مبارک زمانہ میں غزل اور قصیدہ دونوں معراج ترقی پر پہونچ گئے ۔

مرزا مظہر جانجاناں، میر درد، سوز، قائم، یقین، بیان، ہدایت، قدرت اور ضیا ان کے ہمعصر ہیں جو سب علاوہ اُردو کے نظم فارسی کے بھی اُستاد تھے ۔ چونکہ ان سب پر فارسی کا رنگ غالب تھا لہذا وہ قدرتاً ہندی الفاظ پر فارسی کو ترجیح دیتے تھے کیونکہ وہی اُن کو اچھے معلوم ہوتے تھے ۔ اسی زمانہ میں زبان بہت کچھ ایسے الفاظ اور بندشوں سے پاک ہوگئی جو ولی اور اُن کے ہمعصر شعرائے دہلی کے یہاں بکثرت پائے جاتے ہیں ۔ اُنھوں نے نہ صرف زبان کو صاف کیا بلکہ بہت سے خوبصورت اور مناسب فارسی لفظ اور محاورے خواہ بجنسہ یا بصورت ترجمہ زبان میں داخل کرلیے ۔ ان کا کلام اُردو اور فارسی کی آمیزش سے گنگا جمنی ہے حسن و عشق کے معاملات جس خوبصورتی اور مؤثر طریقہ سے ان حضرات نے باندھے اس سے بیشتر کسی نے نہیں باندھے تھے ۔ اِن کے کلام کو دیکھ کے تعجب ہوتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ فارسی لغات کا خزانہ انھوں نے کھنگال ڈالا جسمیں سے صدہا جواہر ریزے منتخب کرکے زبان میں داخل کئے گئے ہیں ۔ گل و بلبل اور قمری و شمشاد کے عشق کے افسانے جس کو فارسی شعرا مدت سے باندھتے چلے آتے تھے اب اُردو میں بھی داخل ہوے اور جدید خیالات اور نئی ترکیبوں کے ساتھ بڑے حسن و خوبی سے برتے گئے ۔ فن شعر میں بھی ایک نمایاں ترقی ہوئی نقائص اور معائب

سے کلام پاک ہونے لگا۔ غزلیں ایسی بحروں میں کہی جانے لگیں جو اس سے بیشتر مروج نہ تھیں اور کانوں کو بہت اچھی معلوم ہوتی تھیں۔ نئی نئی تشبیہیں اور استعارے اور صنائع بدائع جن کو اب تک کلام میں جگہ نہیں ملی تھی بکثرت استعمال ہونے لگے مگر اسی حد تک کہ اُن سے شعر کے حسن اور ادائے مطلب میں کوئی فرق نہیں آتا تھا۔ وہ کلام میں گھُل مِل جاتے تھے اور بدنما نہیں معلوم ہوتے تھے۔ نئے نئے اصناف شعر بھی اسی عہد میں رائج ہوئے مثلاً واسوخت، مرثیہ، مخمس، ہجو، مثلث، مربع، مستزاد وغیرہ اور یہ سب فارسی سے لئے گئے اور خوب خوب کہے گئے۔ جو اصناف سخن بیشتر سے مروّج تھے اُن میں بھی ترقی ہوئی صنعت ایہام جو قدما میں جاری تھی اس زمانہ میں کم ہوگئی گو بعد کو پھر رائج ہوگئی۔ میر کو یہ صنعت کم پسند تھی مگر اگر بلا تکلف اور کسی دوسری صنعت کے ساتھ بندھتی اور کلام کا حُسن بڑھتا تو مضائقہ بھی نہ تھا۔ مظہر اور اُن کے اکثر معاصرین و متبعین نے بھی اس معاملہ میں میر ہی کا مسلک اختیار کیا۔ اس زمانہ کے شعرا بعض اصناف سخن کے محض موجد ہی نہ تھے بلکہ اُنھوں نے اُس میں بڑی بڑی ترقیاں کیں اور آیندہ ترقی کی راہ بتا گئے۔ اس میں شک نہیں کہ اُن کی ایجادیں فارسی ترکیبوں سے ماخوذ تھیں اور اُنھیں پر مبنی تھیں۔ اس عہد میں زبان اُردو نے علی العموم زبردست ترقی کی اُس میں قوت، وسعت اور لوچ بااحسن وجوہ پیدا ہوا اور نئے نئے لفظ اور محاورے اور ترکیبیں زبان میں داخل ہوئیں جن سے آیندہ ترقی کا دروازہ کھُل گیا۔

انشا اور مصحفی کا دور
اُن کی خدمات زبان اور شاعری کے ساتھ

ایک دوسرا دور بعد کے شعرائے دہلی سے شروع ہوا۔ جس میں اثر، میر حسن، جرأت، انشا، مصحفی، راسخ، بقا، حسرت، رنگین اور فراق مشہور زمانہ ہوے۔ اس زمانہ میں بھی وہی پرانی ترکیب ہندی الفاظ خارج کرنے اور اُن کی جگہ فارسی اور عربی الفاظ داخل کرنے کی برابر جاری رہی۔ اس میں شک نہیں کہ بعض ہندی اور بھاشا لفظ جو خارج کیے گئے بدنما اور ثقیل ضرور تھے اور نظم کی صنف نازک اُن کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی مگر اُن کے یک قلم نکالدیے جانے سے دیسی زبان کی ترقیوں کو سخت نقصان پہونچا ایسے جواہر ریزے جو سنسکرت اور پراکرت کے خزانوں سے زبان اُردو کے قبضے میں ایک عرصۂ دراز سے چلے آتے تھے فارسیت کے غلبہ سے اب خارج ہو گئے۔ قدیم اُردو شاعر سنسکرت اور ہندی سے ناواقف تھے اسی لیے اُنھوں نے ہندی الفاظ کی کوئی قدر نہیں کی اُن کو زبان سے خارج کردیا اور اُن کی جگہ پر فارسی اور عربی الفاظ رکھ دیے۔ اِس کارروائی کو وہ لوگ اور نیز اُس زمانے کے مُسلمان مصنفین جو فارسی کا ذوق رکھتے تھے "زبان کی اصلاح اور پختگی" سے تعبیر کرتے ہیں اسی عہد میں ایک اور ترقی یہ بھی ہوئی کہ پُرانے متروکات جو میر و سودا کے زمانہ میں باقی رہ گئے تھے نکال دیے گئے اور اُن کی جگہ جدید خوبصورت لفظ اور ترکیبیں داخل کی گئیں۔ ہندی اور فارسی محاورے اور ترکیبیں باہم ملادی گئیں۔ طرز عبارت میں کچھ فرق نہیں ہوا۔ مضامین میں بھی کوئی خاص جدّت نہیں ہوئی البتہ ابتذال اور شہوت پرستی کا رنگ پیدا ہوگیا۔ اس دور کی شاعری اُس زمانہ کی اخلاقی حالت اور دہلی کی بگڑی ہوئی سوسائٹی کا پورا نمونہ ہے۔ معشوق کے حسن ظاہری کی تو عام طور پر

تعریف کی جاتی تھی مگر بعض شعرا نے کھلم کھلا ایک اور رنگ اختیار کیا جس کو اصطلاح میں "معاملات" یا "معاملہ بندی" کہتے ہیں۔ جرأت، انشا اور رنگین اس خاص رنگ کے بادشاہ تھے۔

ریختی یہ حسن پرستی اور شہوت پرستی بعد کو ایک خاص طرز میں ظاہر ہوئی جس کا نام "ریختی" یعنی عورتوں کی زبان رکھا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ ریختہ سے نکلا ہے اور اسکا مؤنث ہے عورتوں کی زبان بالذات کوئی مذموم بات نہیں مگر خرابی یہ ہوئی کہ اس قسم کے اشعار جذبات نفسانی برانگیختہ کرنے کی غرض سے کہے جاتے تھے اور اسی وجہ سے وہ نہایت فحش اور مخرب اخلاق اور شرفا کے کانوں تک کو ناگوار ہوتے تھے۔ ایسی کل چیزیں جو عورتوں کے پڑھانے کے قابل نہیں ہوتیں غیر مہذب اور فحش ہوتی ہیں۔ عورتوں کی تعلیمی ترقی ہر ملک اور ہر قوم میں زبان کی اصلاح اور ترقی کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہوتی ہے۔ ریختی کی مثالیں پرانے شعرا کے کلام میں بھی کہیں کہیں ملتی ہیں مثلاً مولانا ہاشمی بیجاپوری اور سید محمد قادری ہمعصر ولی کے کلام میں بھی اس رنگ کا کچھ پتہ چلتا ہے مگر معلوم ہوتا ہے کہ بعد کو یہ بالکل متروک ہو گیا تھا۔ اس کو دوبارہ سعادت یار خان رنگین اور اُن کے دوست انشا نے زندہ کیا۔ سب سے بڑے ریختی گو میر یار علی خاں متخلص بہ جان صاحب سمجھے جاتے ہیں انشا مختلف طرز کے شعر کہتے تھے۔ کبھی ریختی بھی کہہ جاتے تھے مگر جان صاحب نے اس کو ایک فن قرار دیا اور سوائے اس رنگ کے کچھ نہیں کہا۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ صنف شاعری زمانہ کے ساتھ بہت کچھ بدل گئی ہے

اور اب تقریباً متروک ہے۔

اس دور کے شاعر غزل کے اُستاد تھے اور مثنوی اور قصیدہ بھی خوب کہتے تھے۔ لوگوں میں شعر و شاعری کا چرچا تھا۔ بزم مشاعرہ اکثر گرم ہوتی تھی۔ اس عہد کے اکثر شاعر اپنا وطن مالوف دہلی چھوڑ کر ادھر اُدھر نکل گئے اکثر لکھنؤ پہونچے جہاں دربار شاہی میں شعرا کی بڑی قدر کی جاتی تھی۔ اس زمانہ کی مشہور یادگاریں میر حسن اور خواجہ میر درد کے بھائی میر اثر کی مثنویاں ہیں۔ علی الخصوص میر حسن کی مشہور آفاق مثنوی "سحر البیان" جسکی روانی، سادگی، شیرینی اور رنگینی کا جواب نہیں۔

غالب اور ذوق کا زمانہ اور اُس کے خصوصیات

اِس دور کی ابتدا شاہ نصیر، ذوق، غالب، مومن، اور ظفر سے ہوتی ہے۔ اس میں وہ رہے سہے ہندی الفاظ بھی جو قدما سے باقی رہ گئے تھے نکل گئے اور فارسیت کو اور ترقی ہوئی۔ غالب اور مومن فارسی میں بھی خوب کہتے تھے۔ چنانچہ اُن کی اکثر تصانیف اِس زبان میں موجود ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہوگی کہ اس زمانہ میں زبان میں فارسی الفاظ کی بھرمار ہوگئی جس کا نتیجہ اچھا نہیں ہوا۔ شاہ نصیر کو دور سابق (مصحفی و انشا) اور دور حال (ذوق و غالب) کے بیچ کی کڑی سمجھنا چاہیئے۔ یہی زمانہ نظیر اکبر آبادی کا بھی ہے جن کا رنگ سب سے علیحدہ ہے اور ادب اُردو میں ایک نہایت نمایاں اور خاص رنگ ہے۔ غالب و مومن کے یہاں ہم کو ان مشکل اور دقیق فارسی ترکیبوں اور محاوروں کی ابتدا ملتی ہے جو اُستادوں کے قلم سے تو بُرے نہیں معلوم ہوتے مگر معمولی قابلیت والوں کے ہاتھ میں وہ بالکل غارت ہو جاتے ہیں۔ اچھا ہوا کہ اِس قسم کی زبان جس پہ فارسی کا اتنا رنگ غالب تھا زیادہ رواج پذیر نہیں ہوئی

ورنہ پھر اُردو اور فارسی میں فرق ہی کیا رہ جاتا۔ اِسی فارسیت کے غلبہ کی وجہ سے مومن اور غالب کا اکثر کلام سمجھ میں نہیں آتا۔ ذوق گو بلحاظ شاعری غالب سے ذہانت وطباعی میں کم ہیں مگر زبان پر اُن کی قدرت مُسلّم ہے اور محاورات والمثال میں تو ضرب المثل ہیں۔ اُن کا کلام نہایت صاف اور بہت مزے کا ہوتا ہے۔ ظفر کے یہاں کچھ خاص خوبیاں ہیں وہ غالب و ذوق کے ہم پلہ نہیں بلکہ اُن سے اصلاح لیتے تھے۔ ظفر اور ذوق کے کلام میں بہت مشابہت ہے جس سے بعض لوگوں کو شبہہ ہوتا ہے کہ یہ ظفر کا کلام ہی نہیں بلکہ اُن کے اُستاد ذوق کا کہا ہوا ہے۔ اِس زمانے میں غزل اور قصیدے میں بڑی ترقی ہوئی۔ چنانچہ ذوق اور غالب کی غزلیں اور قصیدے اُردو شاعری میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ سنگلاخ زمینوں میں اشعار کہے گئے اور جدید اور مشکل بحریں جواب تک رائج نہیں ہوئی تھیں استعمال ہونے لگیں۔ شعرا اپنا کمال فن دکھانے کے لیے مشکل قافیے اور ردیفیں باندھتے اور غیر معمولی بحریں اختیار کرتے اور ایک دوسرے پر سبقت لیجانے کی کوشش کرتے تھے۔ مگر اس قسم کا کلام حقیقی شاعری کی لطافت ومعنویت سے خالی ہوتا تھا۔ الغرض اس زمانہ میں ہندی الفاظ زبان سے اکثر نکل گئے۔ فارسی ترکیبیں کثرت داخل ہوگئیں خیالات میں جدت اور مضامین میں ندرت پیدا ہوئی جسکا بہترین نمونہ غالب کے کلام کو سمجھنا چاہیئے۔

شعرائے لکھنؤ کا نیا دور اور اُس کے خصوصیات ناسخ اور آتش کا زمانہ۔ اُن کی خدمات زبان کے ساتھ۔

ناسخ اور آتش کے زمانہ سے لکھنؤ میں ایک جدید دَور شروع ہوتا ہے۔ دہلی پر جب زوال آیا تو وہاں کے اکثر اہل کمال نے لکھنؤ کا رُخ کیا اور

یہاں آکر پناہ لی۔ دہلی کی شمع سخن سے لکھنؤ کی شاعری کا چراغ جلا اور وہاں بھی بکثرت شاعر پیدا ہونے لگے۔ ناسخ اور آتش کا تعلق بالکل لکھنؤ سے تھا وہاں کے شاہی دربار میں شاعری کی اتنی عزت اور ایسی قدر ہوئی کہ اس سے پیشتر کبھی نہ ہوئی تھی۔ لوگ شاعری کے پیچھے دیوانے ہو رہے تھے۔ مشاعرے گھر گھر ہوا کرتے تھے۔ قدردانوں کی تعریفیں دل بڑھاتی اور نئی اُمنگیں پیدا کرتی تھیں۔ مشاعرے ماہوار و ہفتہ وار کیا بلکہ اکثر روزمرّہ ہوتے تھے۔ اسی کثرت اور مشاقی نے شاعری کو درجۂ کمال تک پہونچا دیا اور اس میں طرح طرح کی جدّتیں اور رنگینیاں پیدا کیں۔ مختلف اصنافِ سخن پر قدرت حاصل ہو گئی۔ شاعری کے ساتھ ظاہر ہے کہ زبان بھی صاف ہوتی گئی اور ترقی کرتی گئی۔ جو ہندی الفاظ پیشتر کی تراش خراش اور قطع و برید سے بچ گئے تھے وہ بھی اب نکل گئے اور اُن کی جگہ فارسی و عربی الفاظ نے لی۔ اسی طرح پُرانی بندشیں اور ترکیبیں بھی جو زبانوں پر جاری تھیں ترک کی گئیں۔

ناسخ کو یہ فخر حاصل ہے کہ تکمیل زبان کے آخری مدارج اُنھی کے مبارک ہاتھوں سے پورے ہوئے واقعی اُن کو متروکات کا "ناسخ" کہنا بالکل بجا ہے۔ اُن کے زمانہ سے ایک نیا رنگِ شاعری شروع ہوا جسکی خصوصیات یہ ہیں۔ الفاظ شان دار۔ عبارت میں تعقید و تکلّف۔ صنائع و بدائع اور دور از کار تشبیہوں اور استعاروں کی کثرت۔ فضول مبالغے۔ فرسودہ تشبیہیں۔ جذبات اور اثر کی بہت کمی۔ مگر باوجود اسکے اس رنگ کے بھی بعض شعر مزے کے ہوتے ہیں۔ یہ رنگ بھی اپنے زمانہ میں بہت مقبول ہوا۔ علاوہ ناسخ کے بحر، وزیر، صبا، سحر، رشک وغیرہ اپنے زمانہ کے

اُستاد مانے جاتے تھے قبولیت کا سہرا اسی رنگ کے سر رہا یہاں تک کہ یہ رنگ ایک مرتبہ پھر بدلا اور اشعار میں بے تکلفی، سادگی، نیچر کی جھلک، سوز و گداز اور اثر پسند کیے جانے لگے۔

ناسخ ہی کے ہمعصر آتش بھی تھے جن کا رنگ بالکل علیحدہ تھا۔ وہ غزل کے مسلم الثبوت اُستاد مانے جاتے ہیں، ہرچند اُن کی درسی تعلیم اور وسعت معلومات ناسخ سے کم کہی جاتی ہے مگر اُن کا کلام ناسخ کے کلام سے کہیں زیادہ شیریں اور مؤثر ہے۔ وہ اپنے خاص رنگ یعنی شستگی الفاظ، چستی بندش، بلندی مضامین میں قدما کے متبع کہے جاسکتے ہیں۔ اُن کے اشعار سوز و گداز اور اثر سے مملو ہیں۔ بلحاظ علمیت وہ ناسخ سے کم ہوں مگر شاید یہ کمی علم ہی زیادتی اثر و کیفیت کا باعث ہے۔ صفائی زبان پر اُن کا بھی بہت بڑا احسان ہے مگر حق یہ ہے کہ اس معاملہ میں ہم کو ناسخ کا زیادہ ممنون احسان ہونا چاہیے۔ اِن دونوں پہلوانان سخن کے شاگردوں اور پیرووں میں بھی اکثر زور آزمائیاں اور مقابلے ہوا کرتے تھے جو ترقی زبان کے حق میں نہایت مفید ثابت ہوئے۔

مراثی اور اُن کا تعلق زبان کے ساتھ۔

مرثیہ ایک قدیم صنف شاعری ہے۔ اُردو مرثیہ گوئی کو قدما نے نظر استحسان سے نہیں دیکھا اس وجہ سے وہ عرصہ تک ایک کس مپرسی کی حالت میں پڑی رہی یہاں تک کہ میر خلیق اور اُن کے لائق فرزند میر انیس اور انیس کے معاصر دبیر کے زمانہ میں وہ از سر نو زندہ ہوئی اور اُن کے بعد سے تو مرثیہ گو کثرت سے پیدا ہونے لگے۔ مرثیہ بہت پُرانی چیز ہے عربوں میں یہ پیشتر سے موجود تھی وہاں سے یہ اہل فارس میں آئی اور فارسی سے

اُردو میں اُس نے رواج پایا۔ قدیم شعرائے دکن نے بھی اُردو میں مرثیے کہے مگر اُن کی زبان کچی اور ابتدائی حالت میں تھی۔ مرثیہ گوئی کی اصلی ترقی لکھنؤ میں ہوئی جہاں اُسمیں ایک نئی روح پھونکی گئی۔ لکھنؤ کے اکثر امرا اور رؤسا شیعہ مذہب رکھتے تھے جو اعتقادًا شہدائے کربلا کے مصائب پر گریہ و بکا اور اظہار غم و الم کرنا اپنا مذہبی فرض سمجھتے تھے۔ زمانۂ عزاداری اب بجائے دس دن (عشرہ) کے چالیس دن (اربعین) ہوگیا تھا اور اس زمانہ میں پورا لکھنؤ رنج و غم اور حسرت و ماتم کی ایک زندہ تصویر بن جاتا تھا۔ اِس غم و الم اور حسرت و ماتم کے اظہار کا بہترین ذریعہ شعرا کے پُرزور اور درد انگیز مراثی کے سوا اور کیا ہوسکتا تھا۔ اسی وجہ سے فن مرثیہ گوئی نے جو ترقی اس دور میں کی وہ اس سے پیشتر کبھی نہیں ہوئی تھی خود بادشاہ بھی مرثیے کہتے تھے اور مجلسوں میں اپنا پُراثر اور رقت خیز کلام سُناتے تھے۔ فلک مرثیہ گوئی کے سب سے درخشاں تارے میر انیس اور مرزا دبیر تھے جن کا کلام نہایت مؤثر اور قدرتی شاعری کا پرتو ہے۔ اِن دونوں بزرگواروں کا کلام اُردو شاعری کے سر کا تاج ہے۔ اُنکی چند خصوصیتیں یہ ہیں۔ کلام میں اخلاقی تعلیم کوٹ کوٹ کے بھری ہے۔ ناسخ اور اُن کے زمانہ کی بداخلاقیوں سے بالکل پاک ہے۔ قصائد کی سی بیکار لفاظی اور دور از کار مبالغے اُس میں مطلق نہیں۔ مناظر قدرت جس کو سماں باندھنا کہتے ہیں اور جذبات قلبی کے سچے فوٹو مؤثر الفاظ میں کھینچے گئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مرثیہ نگاری کو اُردو شاعری کا ایک نیا دور سمجھنا چاہیے۔

مابعد کے شعرا امیر و داغ کا زمانہ۔

معزولی سلطان عالم واجد علی شاہ اور زمانۂ غدر کے بعد اکثر نامور شاعر مثل امیرؔ، داغؔ، جلالؔ اور تسلیمؔ وغیرہ کے اپنا وطن چھوڑ چھوڑ کر

اسلامی ریاستوں میں چلے گئے۔ بعض نے رامپور اور حیدرآباد کا رُخ کیا۔ اس وجہ سے کہ وہ زبان اُردو کے قدرداں سمجھے جاتے تھے۔ اس زمانہ کے شعرا کا کوئی خاص رنگ نہیں بلکہ قدما کے متبع تھے۔ درباریں اور رؤسا کے گھروں پر مشاعرے بکثرت ہوتے تھے۔ غزلیں، رباعیاں، قصیدے، قطعات اس زمانہ میں اکثر کہے گئے۔ امیر مینائی اپنے پیش روؤں کے مقلد تھے اُن کا کلام ناسخ کے زمانہ کی کثرتِ ابتذالیوں سے پاک ہے۔ داغ کے یہاں طباعی، بیساختگی اور روزمرہ بہت ہے مگر متانت اور بلندی مضامین کم ہے۔ جلال کا کوئی خاص رنگ نہیں مگر وہ فن عروض کے اُستاد اور صحت الفاظ کا بہت خیال رکھتے تھے اور قدما کے پیرو تھے۔ اس دور میں اُردو شاعری نے بحیثیت شاعری کوئی نمایاں ترقی نہیں کی۔

جدید رنگ۔ آزاد اور حالی کا زمانہ۔ اُن کی خدمات زبان کے ساتھ۔

زمانہ حال میں نظم اُردو نے ایک نیا رنگ اختیار کیا۔ اس کے رُکن رکین آزاد، سرور، اور حالی ہیں۔ نئے مضامین اور نیا طرز انشا زبان میں داخل ہوا۔ قومی نظمیں، خیالی نظمیں اور بیانیہ نظمیں لکھی گئیں جو پُرانی قیود اور قواعد کی جکڑ بندیوں سے آزاد ہیں۔ نظم کا دائرہ وسیع ہوا میدان شاعری کو وسعت دی گئی۔ سادگی، بےتکلفی اثر اور جذبات اس رنگ کی نظموں کے خاص جوہر ہیں۔ نئی چیزوں پر طبع آزمائی کی جانے لگی۔ ہمارے نزدیک اس تغیر کا بڑا سبب انگریزی تعلیم اور انگریزی علم ادب کا شوق نقل ہے۔ حالی قومی شاعر ہیں۔ آزاد نیچرل شاعری کے موجد ہیں۔ سرور کا تخیل اور طرز بیان بہت اعلیٰ درجہ کا ہے۔ اکبر کا رنگ خاص ہے جس کو اُنھوں نے شروع کیا اور اُنہی پر ختم ہو گیا۔ اقبال کے کلام میں فلسفہ

اور نیچرل مضامین کا لطف ہے۔ حسرت میں زمانۂ حال کی بہت سی خوبیاں ہیں اس جدید دور میں غزل گوئی میں بھی بہت کچھ اصلاح ہوئی۔ مختصر یہ کہ اس رنگ نے نظم اُردو کو پُرانی قیدوں اور پابندیوں سے بہت کچھ آزاد کر دیا اور آیندہ ترقی کے واسطے نئے راستے کھول دیے۔

نثر اُردو
فورٹ ولیم کالج کلکتہ

جدید نثر اُردو کی ابتدا اُنیسویں صدی عیسوی سے شروع ہوتی ہے۔ اس نئی تعمیر کا سنگ بنیاد ڈاکٹر جان گلکرسٹ کے اہتمام سے فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں رکھا گیا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف اُس وقت فورٹ ولیم کالج کے افسر اعلیٰ تھے۔ اُنھوں نے شمالی ہند سے قابل قابل لوگوں کو اس غرض سے اپنے یہاں جمع کیا تھا کہ انگریزی افسروں کے واسطے جو تازہ وارد ہوتے تھے ایسی کتابیں تیار کی جائیں جن سے انتظام ملکی اور ہندوستانیوں کے ساتھ میل جول اور ربط وضبط بڑھانے میں آسانی ہو۔ اس مشہور کالج کے قیام کے پیشتر بھی نثر اُردو کی بعض کتابیں موجود تھیں مگر وہ مذہبی رنگ کی یا قصّے کہانیاں تھیں اور کچی اور ابتدائی زبان میں فارسی سے ترجمہ کی گئی تھیں۔ عبارت کی درستی اور قواعد صرف ونحو کا ان میں کچھ خیال نہ تھا۔ "دہ مجلس" اور "نوطرز مرصّع" اسی عہد کی یادگاریں ہیں۔ وہ خاص لوگ جو انگریزوں کے واسطے سنسکرت اور فارسی سے ترجمہ کرنے یا نئی کتابیں سادہ اور بے تکلّف زبان میں لکھنے کی غرض سے جمع کیے گئے تھے سید محمد حیدر بخش حیدری، بہادر علی حسینی، میر امّن، حفیظ الدین احمد، مظہر علی ولا، اکرام علی، اور مرزا علی لُطف وغیرہ ہیں جنکی تصانیف نہایت صاف سادہ اور دلکش عبارت میں ہیں۔ ان کتابوں سے اکثر ثقیل اور غیر مانوس فارسی

اور سنسکرت الفاظ ان کا لدیے گئے ہیں یہی کتابیں نصف صدی تک نثر اُردو کا بہترین نمونہ سمجھی جاتی تھیں اور زمانۂ حال کی جو ترقیاں زبان میں ہو رہی ہیں اُن کا بھی زیادہ تر دار و مدار اُنھیں پر ہے" ڈاکٹر گلکرسٹ ہی کی کوششوں کا یہ نتیجہ ہے کہ دیسی زبان (اُردو) سرکاری زبان ہوگئی اور یہ استعداد اُس کو حاصل ہوگئی کہ بجائے مروّجہ فارسی کے وہ عدالتوں اور گورنمنٹ کی زبان قرار دی جائے"۔ ڈاکٹر گلکرسٹ کو یہ فخر بھی حاصل ہے کہ اُردو لغات اور صرف و نحو کی کتابیں بھی اِن کے زمانہ میں تیار ہوئیں۔

نثر مقفّٰی — رجب علی بیگ سرور

سادہ نثر کے مقابلہ میں جسکی ابتدا کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج سے ہوئی تھی وہ نثر مقفّٰی ہے جو ظہوری اور بیدل کی فارسی نثر کے طرز پر لکھی جاتی تھی۔ اسکی عبارت مقفّٰی اور جملے بالکل نپے تُلے ہوتے تھے صنائع بدائع استعاروں اور تشبیہوں سے بہت کچھ کام لیا جاتا تھا۔ جملے طولانی پیچیدہ اور قافیہ بندی کی رعایت کی وجہ سے اکثر جگہ مطلب سمجھنے میں دقّت واقع ہوتی تھی اسی وجہ سے پوری عبارت کے پڑھنے اور مطلب سمجھنے میں بھی دقت ہوتی تھی۔ عرصہ تک اسی قسم کی رنگین اور مقفّٰی عبارت لکھنؤ اور دہلی میں مقبول عام رہی۔ خطوط تک اِسی قسم کی مرصّع اور باتکلف عبارت میں لکھے جاتے تھے۔ کتابوں کے دیباچے، تمہیدیں، تقریظیں، خواہ بزبانِ فارسی یا اُردو سب اسی قسم کی رنگین عبارت میں لکھنے کا دستور تھا۔ اِس عبارت کے بہترین نمونے مرزا رجب علی بیگ سرور کے یہاں ملتے ہیں۔ اُن کی مشہور تصنیف "فسانۂ عجائب" جس طرح اپنی انشاپردازی میں مشہور ہے اُسی طرح لکھنؤ کی اُس زمانہ کی معاشرت کی بھی ہو بہو تصویر ہے۔

دریائے لطافت

انشا اور قتیل کی "دریائے لطافت" کو گویا فارسی اور اُردو کا مجموعہ کہنا چاہیئے۔ وہ ایک تاریخی اہمیت رکھتی ہے کیونکہ وہ نہ صرف صرف و نحو اُردو کی پہلی کتاب ہے جو ایک ہندوستانی کے قلم سے نکلی ہے بلکہ اُس میں یہ بھی خوبی ہے کہ مختلف قسم کی زبانیں اور بولیاں جو اُس وقت ملک میں رائج تھیں اور جن کا اثر زبان اُردو پر پڑ رہا تھا اور نیز وہ محاورے اور اصطلاحیں جو بعض مخصوص طبقوں اور جماعتوں میں مروج تھیں ان سب کے نمونے بھی اُس میں بکثرت موجود ہیں۔

اُردوئے معلّٰی اور عودِ ہندی

ایک بہت بڑی شخصیت نثر اُردو کی تاریخ میں مرزا غالب کی ہے ان کی مشہور تصانیف "اُردوئے معلّٰی" اور "عودِ ہندی" ایک دلچسپ مجموعہ اُردو خطوط کا ہیں۔ جنکی عبارت نہایت سادہ سلیس، بے تکلف اور نہایت دلآویز ہے اِن میں ایک خاص قسم کی پُر لطف ظرافت اور عبارت میں شگفتگی ہے دونوں کتابیں نثر اُردو کی سادگی و سلاست کا بہترین نمونہ ہیں۔ مُصنّف کے ذاتی حالات کی طرف جابجا جو اشارے ہیں اُن کو پڑھ کر دل بہت محظوظ ہوتا ہے غالب کے طرز نے اُردو کی نثر نگاری میں ایک انقلاب عظیم پیدا کیا اور ایک نئی روح پھونکی جس کا اثر زمانۂ مابعد کے نثر نگاروں پر بھی بہت کچھ پڑا۔ غالب بھی اپنے زمانہ کے مروجہ رنگ سے نہ بچ سکے کیونکہ انکی اکثر تحریروں میں وہی پُرانے رنگ کی مُقفّٰی اور مسجّع عبارت پائی جاتی ہے جو اُن کے زمانہ میں عام تھی۔

عیسائی پادریوں کی تحریروں کا اثر۔

عیسائی پادریوں کی تصانیف نے بھی نثر اُردو پر ایک خاص اثر ڈالا۔ ان لوگوں نے عموماً اور خاص کر اُن پادریوں نے جو سیرام پور واقع بنگال میں قیام گزیں تھے بائبل کا ترجمہ مُلک کی دیسی زبانوں میں

کرکے اُنکی اشاعت عوام الناس میں بکثرت کی۔ اس کے علاوہ صدہا مذہبی چھوٹے چھوٹے رسالے اور کتابیں اُردو میں شایع کیں۔ ہمارا خیال ہے کہ دیسی زبان میں اخبار نویسی کی ابتدا بھی اسی زمانہ سے ہوئی۔ سب سے قدیم ترجمے بائبل کے جو ۱۸۰۵ء سے ۱۸۱۲ء تک شایع ہوے وہ زیادہ تر اُردو ہی میں ہوے تھے۔

سر سید اور اُن کے رفقاے کار کا زرین عہد

نثر اُردو کی ترقی کا زریں عہد اُنیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر کو سمجھنا چاہیے جس میں سر سید اور اُن کی جماعت کے لوگوں نے اُردو نثر نگاری میں ایک خاص رنگ پیدا کیا۔ اِس زمانے میں جسقدر مذہبی مناظرے خواہ مسلمانوں کے آپس میں یا مُسلمانوں اور عیسائیوں اور ہندؤں کے درمیان ہوتے تھے اُن سے بھی اُردو کو ترقی اور ایک خاص قسم کی تقویت حاصل ہوئی۔ ایسی جملہ کتابیں اور رسائل علی العموم نہایت سادہ اور پرزور عبارت میں لکھے جاتے تھے اور گو کہ وہ ایک عارضی اور وقتی اثر اور دلچسپی رکھتے تھے مگر پھر بھی اُس سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ اُردو نثر نویسی میں سادگی اور پختگی پیدا ہوگئی۔ مولوی سید احمد شہید بریلوی کی مذہبی اصلاحیں از ۱۸۲۰ء لغایت ۱۸۳۱ء اور وہ مختلف فیہ مسائل جن کو وہ ملک میں پھیلانا چاہتے تھے اُن کے اوپر متعدد رسالے اور کتابیں لکھی گئیں۔ قرآن مجید کا سب سے پہلا ترجمہ زبان اُردو میں ۱۸۳۰ء میں شایع ہوا۔ جو اصلاحیں کہ مولوی سید احمد شہید بریلوی کے زمانہ سے شروع ہوئی تھیں اُن کی ترقی نمایاں طور پر سر سید احمد خاں کے ہاتھوں ہوئی جنکی متعدد تصانیف سے جو تعلیمی، اخلاقی، معاشرتی، فلسفیانہ، مذہبی، سیاسی، جریدہ نگاری، غرضکہ ہر صنف و قسم کی تحریر سے تعلق رکھتی تھیں

زبان اُردو کو اتنا فائدہ پہونچا اور وہ اسقدر مالا مال ہوئی کہ اور کسی چیز سے نہیں ہوئی تھی۔ سرسید مرحوم ایک ایسے طرز تحریر کے موجد ہوئے جو جامع تھا اور جمیع اقسام مذکورۂ بالا کے بخوبی کام آسکتا تھا۔ اُن کی تمام تصانیف اور علی الخصوص وہ بیش بہا مضامین جو تہذیب الاخلاق اور اُس وقت کے دیگر مشہور جرائد میں چھپے ہیں ہزارہا تعریف و توصیف کے مستحق ہیں۔

سرسید مرحوم کے رفقائے کار نے، جن کو زبان اُردو کا نورتن سمجھنا چاہیئے زبان اور ادب اُردو کے ساتھ احسان عظیم کئے اور بیش بہا خدمتیں انجام دیں۔ مولانا حالی کی قومی نظمیں اور تنقیدی مضامین، علامہ شبلی اور مولوی ذکاء اللہ کی تاریخی تصانیف، مولوی چراغ علی اور نواب محسن الملک کے اخلاقی اور پولیٹکل مضامین و لکچر، مولانا نذیر احمد کے اخلاقی ناول اور دیگر تصانیف جنمیں ادب آموزی کے ساتھ ایک لطیف ظرافت کا بھی رنگ ہے، ان سب سے نہ صرف لائق مصنفین کے اہل قوم و مذہب ہی کو فائدہ پہونچا بلکہ وہ تمام ملک کے واسطے یکساں طور پر مفید ثابت ہوئے۔ اسی طرح مولانا محمد حسین آزاد کی جادو نگاری جس کا انداز سب سے جُدا اور ایک خاص رنگ ہے، درحقیقت نہایت ہی لطیف اور دل آویز ہے۔ ان کی تصانیف کو خزانۂ اُردو کے بیش بہا جواہر سمجھنا چاہیئے۔

تعلیم انگریزی کا اثر اُردو پر۔ چھاپہ کی ابتدا۔ اُردو سرکاری زبان قرار دی گئی۔

اُنیسویں صدی کے نصف آخر سے انگریزی تعلیم کا نمایاں اثر زبان اُردو پر پڑنے لگا۔ اس سے ادب اُردو کی وسعت اور معلومات اور بڑھ گئی اور مختلف اصناف سخن اُس میں داخل ہونے لگے۔ چھاپہ کی وجہ سے اشاعت کتب کو بہت مدد ملی۔ قدیم و جدید

ہر قسم کی کتابیں چھپنے لگیں اور اُن کی نشر و اشاعت آسان ہوگئی۔ سنہ ۱۸۳۲ء میں بجائے فارسی کے اُردو سرکاری دفاتر کی زبان قرار دی گئی جس سے اُس کا پایۂ اعتبار اور بلند ہوا اور عدالتی دفاتر کی نئی نئی اصطلاحات کے شمول سے اُس کے لغات اور معلومات میں بہت کچھ اضافہ ہوا۔

ناول نویسی کی ابتدا افسانہ نویسی، تاریخی ناول اور اخبار و جرائد کو تعلیم انگریزی کا لازمی نتیجہ سمجھنا چاہیئے۔ یہ مضمون ضروری اور اہم ہے چنانچہ اسکی تفصیل آئندہ ابواب میں مناسب مقامات پر کی گئی ہے۔ زمانۂ حال میں عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد جس نے زبان اُردو کو ذریعۂ تعلیم قرار دیا ہے اور مولانا شبلی مرحوم کے دارالعلوم ندوہ کا قیام اس امر کی بیّن مثالیں ہیں کہ زبان کس قدر ترقی کر رہی ہے۔ نیز یہ کہ اُردو کو ہندوستان کی ادبی زبان بننے کا فخر باحسن وجوہ حاصل ہوگیا۔

اُردو ڈراما یہ بالکل نئی اور مقامی چیز ہے اس وجہ سے کہ فارسی میں اسکا وجود ہی نہ تھا۔ اس صنف جدید کا ابھی بچپن ہے۔ ہنوز اس کو پختگی اور کمال حاصل نہیں ہوا۔ ہمارے ملکی ڈراما نگاروں میں ابھی پختہ کاری نہیں آئی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اُن کے کریکٹر نامکمل اُن کے پلاٹ اکثر ناقص اور ناتمام ہوتے ہیں۔ اُن کی تحریروں میں صرف لفاظی اور سطحی باتیں ہوتی ہیں۔ شیکسپیر اور دیگر یورپی جادو نگاروں کے ڈراما البتہ ترجمہ ہوگئے ہیں اور ہندوستانی اسٹیج کے حسب حال اُن میں کچھ تغیر و تبدل بھی ہوگیا ہے۔ اُردو ڈراما نویسی کے سامنے ایک درخشاں مستقبل ضرور ہے۔

باب ۳

اُردو شاعری کی عام خصوصیات

اُردو شاعری فارسی شاعری کی نقل ہے

اُردو شاعری دیسی پیداوار نہیں ہے وہ فارسی سے پیدا ہوئی اور فارسی کے نمونے اُس کے پیش نظر تھے۔ فارسی علم عروض نے جو عربوں کی ایجاد تھا اُردو شاعری پر بہت بڑا اثر کیا۔ اسی طرح فارسی بحور اور قواعد عروض میں بھی فارسی کا اتباع کیا گیا۔ رفتہ رفتہ یہ غیر ملکی پودھا جڑ پکڑ گیا اور اس کو اس ملک کی آب و ہوا راس آئی۔ بحروں کے علاوہ شعرائے اُردو نے فارسی ہی تشبیہیں اور وہی مضامین اخذ کیے اور یہ سب چیزیں لالحاظ ملکی ضروریات کے اور بلا امتیاز اس کے کہ اُردو زبان کی اصل کیا تھی اور اس میں استعداد کس قدر تھی داخل زبان ہوگئیں اور ہمارے شعرائے اُردو کا مایہ ناز بن گئیں۔ اس تتبع میں فائدہ اور نقصان دونوں مضمر تھے۔ نقصان یہ کہ اُردو شاعری کو وہ مدارج ارتقا طے کرنا نہیں پڑے جنکی رفتار تو ضرور سست تھی مگر ایک نئی زبان کی ترقی کے واسطے وہ ازبس ضروری تھے۔ مثال کے لیے انگریزی شاعری کو دیکھو کہ جس نے یہ منازل ارتقا بتدریج طے کر کے معراج ترقی حاصل کی۔ اُردو میں اسی کمی کی وجہ سے وہی پُرانی فرسودہ باتیں اور وہی مضامین جو فارسی شاعری میں کثرت پائے جاتے تھے اور جن کو کوئی تعلق اس ملک سے نہ تھا دفعتاً سنگ بنیاد بن گئے۔ شروع میں تو اکثر اُردو اشعار فارسی اشعار کا لفظی ترجمہ

ہوتے تھے اور اب بھی ہمارے شعرا صائبؔ حافظؔ نظیریؔ اور بیدلؔ وغیرہ کی تقلید کو اپنا فخر سمجھتے ہیں۔

تقلید کے بُرے نتائج

اس حریصانہ جذب اور کورانہ تقلید سے یہ بُرا نتیجہ پیدا ہوا کہ اردو شاعری سے اصلیت مفقود ہو گئی اور بسا اوقات ابتذال پیدا ہو گیا۔ سرزمین ہندوستان ان مضامین سے نا آشنا ہے۔ لیلیٰ مجنوں کا عشق، شیریں فرہاد کی محبت رستم و اسفندیار کی بہادری، مانی اور بہزاد کی نقاشی، جیحوں و سیحون کی طغیانی، بیستون اور الوند کی بلندی وغیرہ وغیرہ یا جانوروں میں بلبل، درختوں میں سنبل وغیرہ یہ سب غیر ملکی چیزیں ہیں جنکو یہاں کے لوگوں نے کبھی دیکھا بھی نہیں۔ اسی تتبع کی وجہ سے شاعری

اردو شاعری محض نقالی ہے

واقعیت سے ہٹ کر صرف نقالی رہ گئی۔ ہندوستانی بادشاہوں کے عدل کی جب تعریف کی جاتی ہے تو اُن کا مقابلہ نوشیرواں سے کیا جاتا ہے سخاوت میں وہ حاتم بتائے جاتے ہیں۔ حرماں نصیب عاشقوں کی مثال کے واسطے سوائے مجنوں کے کوئی نہیں ملتا اور اُنکی معشوقہ ہمیشہ لیلیٰ ہوتی ہے ایک حسین آدمی کی تعریف یہی ہو سکتی ہے کہ وہ یوسف کی طرح ماہ کنعاں ہو۔ اور معشوق کے سخت احکام کی تعمیل کرنے والا کوہکن خطاب پاتا ہے۔ قد کی تشبیہ کے لئے سرو و شمشاد، آنکھوں کے واسطے نرگس، زلف کے لئے سنبل۔ بیرحمی اور سفاکی کے لئے ترک، گُل کی عاشق بلبل، سرو کی دلدادہ فاختہ، بادصبا کی اٹھکیلیاں، چاند کو دیکھکر کتاں کا پارہ پارہ ہونا یہ سب فارسی سرمایہ اُردو کے واسطے مخصوص بلکہ اُسکی مِلک ہو گیا اور ان کی وہ بھرمار ہوئی کہ شاعری اپنی اصلیت کو بھول گئی اُس کو اپنے مُلک کی تشبیہات سے نفرت پیدا ہو گئی اور اپنے وطن کی حسین سے حسین چیزوں کی

قدر کرنے کا احساس تک اُس سے فنا ہو گیا۔ مثلاً ہندوستان کی بہار اسکا موسم برسات ہے مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہماری اُردو شاعری میں اُس کے صحیح اور دلکش مناظر کا کہیں پتا نہیں' ایسے ہی ہندوستان کا موسم گرما، موسم بہار، ہمالیہ کی سر بفلک برف زار چوٹیاں' گنگا اور جمنا کے خوبصورت گھاٹ' ان کا ہمارے قدیم شاعروں نے کوئی خیال نہیں کیا۔ زبان بھاشا کی خوبصورتی اور شیرینی کو دوسری زبان کی دلفریبیوں پر قربان کر دیا۔ مختصر یہ کہ اُردو شاعری نے فارسی شاعری کی تقلید آنکھ بند کر کے جزئیات تک میں کی سر جارس لائل اسی تقلید کی نسبت لکھتے ہیں "اُردو شاعری فارسی شاعری کا کامل اتباع کرتی ہے اور وہی مضمون بار بار دُہراتی ہے جن کو خود اساتذۂ فارس نے بارہا پامال کیا ہے۔ مضامین اور الفاظ دونوں ابتدا سے آج تک جیسے تھے ویسے ہیں۔ اُن میں کوئی جدت یا اصلیت نہیں پائی جاتی۔ اور اسی کمی کی وجہ سے اُن کو ایک نہایت مہتم بالشان اور مستقل علم معنی و بیان کی بُنیاد رکھنا پڑی۔ جبکہ کوئی چیز جو کسی شاعر کو کہنا ہو اور اُس کو اُس سے پیشتر سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں کہہ گئے ہوں تو ظاہر ہے کہ اُس کے واسطے یہ بہت ضروری ہے کہ اُس چیز کے کہنے کا اپنے واسطے ایک خاص اسلوب مقرر کرے۔ پس یہی اسلوب یا بالفاظ دیگر علم معنی و بیان نہ کہ جذبات شعر اُردو شاعری کا مایۂ ناز ہو گئے۔ اسی وجہ سے نہایت دلچسپ دلچسپ مبالغے نئی نئی بندشیں اور ترکیبیں، صنعت تضاد اور اسی قبیل سے دیگر صنائع و بدائع اُردو شاعری کی روح رواں بن گئیں۔"

اُردو شاعری صرف رسمی رہ گئی اُردو شاعری میں نہ صرف تکلفات ظاہری ہی کی

کثرت ہے بلکہ وہ محض رسمی اور لکیر کی فقیر ہے۔ وہی استعارے وہی تشبیہیں جو بارہا لکھی جا چکی ہیں پھر دُہرائی جاتی ہیں۔ آئینۂ فطرت کے مشاہدہ کا کہیں پتہ نہیں اسی وجہ سے مضامین میں کسی قسم کی تازگی نہیں اور نہ کوئی نیا پیام ہوتا ہے۔ پرانے شعرا کی کشکولیں مضامین کی تلاش میں بار بار ڈھونڈھی جاتی ہیں۔ اور مقررہ قواعد کے بموجب پھر انھیں باتوں کا اعادہ کیا جاتا ہے شاعری محض نپی تلی چیز ہو گئی نہ کبھی کم ہوتی ہے نہ زیادہ۔ ہر شاعر اپنے کلام میں اُسی آموختہ کو رٹتا ہے اور اسی وجہ سے اُردو شاعری کا بازار تصنعات اور بے مزگی سے بھرا ہوا ہے۔

قافیہ پیمائی فارسی کی تتبع میں اُردو میں بھی ایک قافیہ اور بعض اوقات دو قافیوں کی پابندی لازمی ہے۔ قافیہ گو کہ کانوں کو اچھا معلوم ہوتا ہے مگر اظہار خیال میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔ اسی وجہ سے مدت ہوئی کہ یورپ کی شاعری اس بار گراں سے سبکدوشی حاصل کر کے آزاد ہو گئی۔ بسا اوقات یہ ہوتا ہے کہ قافیہ پہلے ذہن میں آتا ہے جو مضمون کی طرف رہبری کرتا ہے۔ حالانکہ ہونا یہ چاہیے کہ مضمون خود قافیہ پیدا کرے۔ غرضکہ انھیں قیود سے اُردو شعرا کے تمام دواوین بھرے پڑے ہیں اب اس بدمزگی کا احساس خود ہمارے شعرا کو پیدا ہو چلا ہے۔

خلاف نیچر مضامین علاوہ نقائص مذکورۂ بالا کے سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ اُردو شاعری میں اکثر مضامین فطرت کے خلاف باندھے جاتے ہیں مثلاً مرد کا عشق مرد کے ساتھ جس کے لیے کوئی معقول وجہ یا عذر بھی نہیں پیش کیا جاتا۔ ایک لڑکے کو معشوق تصور کر کے اُس کے گھونگروالے بال اُسکی زلفیں اُسکا سبزۂ خط اُسکی بھیگی مسیں اُس کے خد و خال اس لطف سے بیان کیے جاتے ہیں

کہ جسکی تہذیب حال کبھی متحمل نہیں ہوسکتی۔ اس رنگ کو ہمارے قدیم شعرائے اُردو نے شروع کیا جس کا تتبع آجتک کیا جاتا ہے۔ ہمارے خیال میں تہذیب اور متانت کے اعتبار سے بھاشا کو اُردو پر اس معاملہ میں فوقیت حاصل ہے بھاشا میں شاعر اپنے کلام میں عشق اسطرح ظاہر کرتا ہے جیسے ایک عورت اپنے شوہر یا عاشق کے فراق میں گریہ کرتی ہے یا جیسے اُس کا خیالی معشوق اُس کے جذبات کا احترام نہیں کرتا برخلاف اس کے ہمارے اُردو شعرا بسا اوقات عشق کا اظہار اپنے ہمجنس کے لیے کرتے ہیں اسی اختلاف کی وجہ سے بھاشا کی شاعری حقیقی اور موافق فطرت ہے اور دل میں گھر کرتی ہے اور خیالات میں بلندی اور رفعت پیدا کرتی ہے۔ بخلاف اسکے اُردو کے اکثر عاشقانہ اشعار میں زنان بازاری کے حسن و دلفریبی کا ذکر ہوتا ہے جس سے خیالات میں پستی اور عبارت میں ابتذال پیدا ہوجاتا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہی ایک چیز اس امر کے ثبوت کے لیے کافی ہے کہ اُردو شاعری فارسی کی سراسر پیرو ہے یہی وجہ ہے کہ اُردو شاعری اور زبان کو پھیلنے اور ترقی کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ یہ وجہ بھی ہوئی کہ لوگوں نے اُردو شاعری کو محض تفننِ طبع سمجھا اور جب کبھی فارسی شعرگوئی سے اُن کو فرصت ہوئی تو تھوڑا سا وقت دل بہلانے کے لئے اس میں بھی صرف کردیا۔ بڑی قباحت یہ ہوئی کہ وہ لوگ عموماً ہندی اور سنسکرت سے ناواقف تھے جس کی وجہ سے وہ اِن دونوں زبانوں کی برکتوں سے منتفع نہو سکے۔ فارسی چونکہ سرکاری اور درباری زبان تھی اور اُس وقت کے بڑے بڑے رئیس و امیر عالم و فاضل اور شاعر سب اسی کو پسند کرتے تھے اور یہی زبان رائج تھی لہذا قدرتی طور پر ہندی الفاظ

اُس کے مقابلہ میں اُن کو بھدّے اور اجنبی معلوم ہوئے اور اسی وجہ سے وہ ترک
کر دیے گئے۔ ہمارے ذہن میں فارسی تتبع کی بڑی وجہیں صرف دو ہو سکتی ہیں۔
ایک یہ کہ زبان فارسی کا بازار اُس وقت گرم تھا دوسرے یہ کہ وہ لوگ سنسکرت
اور بھاشا سے ناواقف تھے انھیں وجوہ سے زمانۂ قدیم میں اُردو کی بیقدری تھی۔
چنانچہ متقدمین اساتذۂ اُردو سب فارسی گو شاعر تھے یہاں تک کہ مرزا غالب بھی
فارسی کے مقابلہ میں اپنے اُردو کلام کو ہیچ سمجھتے ہیں اور فرماتے ہیں ؎

فارسی بین تا ببینی نقشہائے رنگ رنگ — بگذر از مجموعۂ اُردو کہ بیرنگ من است

گزشتہ زمانہ کے عربوں میں یہ دستور تھا کہ عاشق اپنی معشوقہ کو بنت العم کے
خطاب سے یاد کرتا تھا اور اپنے عشقیہ اشعار اُسکی شان میں نظم کرتا تھا اور بالآخر
اُسی کے ساتھ اس کا عقد ہو جاتا تھا۔ اس رسم کا ایک بُرا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض اوقات
معشوقہ کا نام ظاہر ہو جانے سے جھگڑا اور فساد برپا ہوا اور کبھی کشت و خون تک
نوبت پہونچی، لہذا اس خرابی کے دُور کرنے کے لیے محض فرضی اور خیالی عورتوں کے
نام تجویز کیے گئے۔ پردہ کے رواج نے عورتوں کے کھلّم کھلا نام لینے کو ممنوع
قرار دیا جسکی وجہ سے یا تو اُن کے واسطے کسی مشہور معشوقۂ سلف کا نام لیا جانے لگا
اور یا وہ صیغۂ تذکیر کے ساتھ یاد کی جانے لگیں۔ فارسی میں صیغۂ تذکیر و تانیث میں
فرق نہ تھا اسی وجہ سے شاید یہ صورت ابتری ظاہر ہوئی۔ یہ عذر بارد
فارسی میں جہاں تذکیر و تانیث کا کوئی امتیاز نہیں ہے مقبول ہو سکتا ہے۔
مگر اُردو میں جس میں کہ افعال و اسما سب میں تذکیر و تانیث کی تفریق موجود ہے
اور پورا لحاظ رکھا جاتا ہے یہ عذر لنگ قبول نہیں کیا جا سکتا۔ دُنیا کے

ہر ملک کا ادب وہاں کی سوسائٹی کے اخلاق کا آئینہ ہوتا ہے یعنی سوسائٹی کی اخلاقی خرابیاں کسی ملک کے ادب سے بخوبی ظاہر ہوتی ہیں۔ ان سب باتوں کے جواب میں یہ عذر پیش کیا جاسکتا ہے کہ اگرچہ بظاہر تذکیر کے صیغے استعمال کیے جاتے ہیں مگر حقیقتاً ان سے مراد وہی فرقۂ اناث ہوتا ہے جس میں حقیقی معشوقہ بننے کی قابلیت موجود ہے مگر سچ پوچھیئے تو تہذیبی و اخلاقی نقطۂ نظر سے یہ جواب بھی ٹھیک نہیں ہے اس لیے کہ پردہ کی وجہ سے شریف عورتیں سامنے نہیں آسکتیں پس لامحالہ جس حُسن کا ذکر ہوگا وہ بازاری عورتوں کا شمار کیا جائے گا

اصناف سخن اردو شاعری میں اصناف ذیل پر طبع آزمائی کی جاتی ہے :-
غزل، قصیدہ، رباعی، قطعہ، مثنوی، مرثیہ، وغیرہ۔

غزل اور اسکا رنگ ان میں سب سے مشہور صنف شاعری غزل ہے جسکا رنگ زیادہ تر عاشقانہ یا صوفیانہ ہوتا ہے۔ اساتذۂ متقدمین کے کلام میں تصوف کا رنگ سب رنگوں پر غالب تھا قرون وسطیٰ میں مذہبی بیداری کی ایک لہر تمام ہندوستان میں دوڑ گئی تھی۔ بھگتی کا عقیدہ اور رام و کرشن کے روایات جنھوں نے ادب ہندی پر بہت بڑا اثر ڈالا اسی مذہبی بیداری کے علامات ہیں -

تصوف تمام قدیمی شعرائے اُردو صوفی تھے اور اُن بزرگوں کی اولاد میں تھے جو مجاہدین اسلام کی فوجوں کے ہمراہ خود آئے تھے یا اس زمانہ کے چند روز بعد ہندوستان میں داخل ہوئے۔ ان میں مذاق تصوف اُن کے اسلاف سے وراثتاً چلا آتا تھا۔ اور لوگ اُن کی تعظیم و تکریم کرتے تھے۔ چنانچہ اُردو کا سب سے پہلا شاعر ولی دکنی ایک بہت بڑا صوفی تھا اور دلی کے ایک مشہور بزرگ شاہ سعد اللہ گلشن کے

حلقۂ ارادت میں داخل تھا۔ اسی طرح شاہ مبارک آبرو شاہ محمد غوث گوالیاری کی اولاد میں تھے جو ہندوستان میں ایک بہت مقدس بزرگ گزرے ہیں۔ شیخ شرف الدین مضمون گو ایک سپاہی پیشہ شخص تھے مگر آخر میں دُنیا چھوڑ کر فقیر ہو گئے تھے۔ شاہ حاتم اور مرزا مظہر جان جاناں بھی مشہور صوفیائے کرام سے گزرے ہیں خواجہ میر درد جو کہ خواجہ بہاءالدین نقشبند کی اولاد میں تھے علاوہ شاعری کے دولت فقر سے بھی مالا مال تھے۔ ان کے علاوہ مشہور پہلوانان سخن میر۔ سودا اور اسی طرح ان کے ہمعصروں کے کلام میں بھی تصوف کا رنگ نمایاں ہے۔

فارسی شاعری چونکہ مضامین تصوف سے مملو تھی لہذا یہ بہت قدرتی بات تھی کہ اُردو نے منجملہ اور چیزوں کے اس میں بھی اُنکی پیروی کی۔ تقدس، ریاضت نفس، ترک ماسوی اللہ، دنیاوی نمائش اور ریاکاری سے اجتناب، تعیش اور حصول دولت و اقتدار سے بیزاری کہ ان چیزوں کے لیئے اہل دنیا ساعی رہتے ہیں۔ عزلت گزینی اور اپنی ہستی کو عبادت الٰہی کے لیے وقف کر دینا۔ ان کو تصوف کا بنیادی اصول سمجھنا چاہیے شعرائے صوفیہ حُسن مجازی کی تعریف اس لیئے کرتے ہیں کہ وہ اُسکو حُسن حقیقی کا زینہ سمجھتے ہیں اور عشق حقیقی کا ذوق لوگوں کے دلوں میں پیدا کرنے کے واسطے انھیں ظاہری نقوش و علامات سے کام لیتے ہیں۔ اُن کا مقولہ ہے

متاب از عشق رو گرچہ مجازی است کہ آن بہر حقیقت کارسازی است

ایران اور ہندوستان کی عاشقانہ شاعری میں روحانی اور شہوانی جذبات کی عجیب آمیزش انھیں نکات تصوف کی بدولت ہے۔

عاشقانہ غزل میں عاشقانہ رنگ کی بنیاد تصوف اور اہل دربار کی عیش پرستی

اور فارسی شاعری کے تتبع پر پڑی۔ غزل اُردو شاعری کی جان ہے انگریزی میں اگر اُس کے مقابل کوئی چیز ہے تو سانٹ ہے۔ غزل کے لغوی معنے عورتوں سے باتیں کرنا ہیں۔ غزل میں چند اشعار ہوتے ہیں اور ہر شعر بہ اعتبار مطلب کے مکمل ہوتا ہے یہی چیز غزل اور سانٹ میں ما بہ الامتیاز ہے یعنی غزل میں ہر شعر بجائے خود مکمل اور ایک دوسرے سے بے نیاز ہوتا ہے اور سانٹ میں سب اشعار مربوط و مسلسل کسی ایک مضمون پر ہوتے ہیں۔ اصناف شاعری میں سب سے سہل اور اسی وجہ سے سب سے زیادہ برتے جانے والی چیز غزل ہے۔ غزل میں تسلسل کا لحاظ کم رکھا جاتا ہے۔ مضامین غزل محدود ہیں اور اسی وجہ سے شاعر کو ایک شعر پر اپنی پوری قوت صرف کرکے طبع آزمائی کا موقع ملتا ہے اگرچہ بلحاظ مضامین تنوع بھی ہوتا ہے۔ جن مضامین میں غزلیں عام طور پر کہی جاتی ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔ عاشق کی حرماں نصیبی، وصل کی جستجو، معشوق کے جور و جفا، گل و بلبل کے راز و نیاز، وحشت و جنون، عشق کی بلا انگیزی، معشوق کے سراپا کی تعریف، باغ و بہار کے مناظر، بادۂ گلفام کی تعریف و طلب، رقیبوں کے شکوے؛ عاشقانہ شاعری دنیا کی تمام ادبی تصانیف میں موجود ہے۔ کیونکہ عشق ایک فطرتی جذبہ ہے جس کا اظہار ہر زبان سے ہوتا ہے تصوف حسن مجازی کو عشق حقیقی کی اول منزل سمجھتا ہے جیسا کہ چند سطریں پیشتر بیان کیا گیا۔

اہل دربار کا اثر اُردو شاعری پر

اُردو شاعری اہل دربار میں ہمیشہ مرغوب اور ہر دلعزیز رہی اور اُمرا اور رؤسا کے درباروں میں اُسکی ترقی اور نشو و نما ہوئی۔ دلّی، حیدر آباد، لکھنؤ، اور رامپور شاعری کے مرکز رہے ہیں اور یہیں کے فرمانرواؤں نے

اُردو شاعری کو پروان چڑھایا۔ مگر درباری اثر شاعری پر دو حیثیت یعنی نفع اور نقصان کی صورت میں مترتب ہوا۔ نفع اس معنی میں کہ شعرا کو اُن کی جانکاہی کے صلہ میں انعام و اکرام خوب دیا گیا اور اُن کی محنت ٹھکانے لگی۔ نقصان اس صورت میں کہ مضامین شاعری محدود ہو کر رہ گئے۔ کیونکہ شعرا کو رئیس و اہل دربار کے مذاق کی پیروی کرنا پڑی۔ دلّی اور لکھنؤ کی سلطنت کا مِٹ جانا اُردو شاعری کے زوال یا کم از کم اُس کے ضعف کا خاص باعث ہوا۔ عاشقانہ رنگ فرمانروایان اودھ کے دربار میں خصوصیت کے ساتھ مقبول تھا اس وجہ سے کہ اُن لوگوں کے دلوں میں خود تعیّش کے جذبات موجود تھے۔ اس لئے کوئی تعجب نہیں اگر اُس زمانہ کے شاعروں کے کلام کا بیشتر حصّہ اس رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ قصائد اور غزل دونوں بکثرت کہے جاتے تھے ایک میں کسی نواب یا وزیر کی تعریف تو دوسرے میں کسی اصلی یا فرضی معشوق کا ذکر ہوتا تھا۔ چونکہ اُن لوگوں کو خوش کرکے شعرا کو اپنی کاربرآری کرنا ہوتی تھی اسی لئے وہ اِن دونوں رنگوں میں مشغول رہتے تھے۔ انگریزی شاعر اسکاٹ[1] کے یہ دونوں شعر اسی حالت کا ایک نقشہ پیش کرتے ہیں۔ ؎

اپنے رنگ عیش و عشرت کے لیے سب بادشاہ ❊ شاعرانِ نکتہ رس سے لیتے ہیں محنت مدام

تھوڑی سی تنخواہ کے لالچ میں کرتے ہیں مدح ❊ لیکن اپنی روح کو کر لیتے ہیں پابندِ دام

---

[1] سر والٹر اسکاٹ گزشتہ صدی کا نہایت نامور انگریزی شاعر اور ناول نگار گزرا ہے اُس کے اکثر ناول اور نظمیں داخل درس ہیں اور اُن کا ترجمہ بھی مختلف زبانوں میں ہو گیا ہے۔ اُسکی نیچرل بیانیہ شاعری زبان انگریزی میں بہت پسند کی جاتی ہے۔ اُس کے وطن اصلی یعنی اسکاٹ لینڈ میں اُسکی اسقدر شہرت اور قدر ہے کہ وہاں کے بڑے بڑے شہروں میں اُس کے کسی ناول یا کیرکٹر کے نام سے کوئی چیز بطور یادگار منسوب ہے ۱۲

اسی درباری وابستگی اور ہم آہنگی کا یہ بُرا نتیجہ ہوا کہ ہماری اُردو شاعری سے وہ تنوع پرکاری، وسعت، اور جدت مفقود ہوگئی جو دُنیائے شاعری کی جان ہے۔

دیہاتی اور قدرتی مناظر کی اُردو شاعری میں کمی:

اُردو شاعری کا دائرہ محدود ہے قدرتی مناظر جو شعرائے مغرب کے دلوں میں عجب عجب اُمنگیں پیدا کرتے ہیں ہمارے اُردو شاعروں پر وہ اثر نہیں کرتے۔ اُردو میں برائنٹ[1] ہوٹیر[2] اور ٹامسن[3] کی طرح کے شعرا کا پتہ نہیں اور نہ ورڈسورتھ[4] کا ایسا کوئی نیچر کا عاشق ہے۔ اُردو شاعری میں

[1] برائنٹ امریکہ کا شاعر اور اخبار نویس تھا اکثر مشہور اخباروں اور رسالوں کا ایڈیٹر رہا ہومر کی الیڈ اور اڈیسی کا منظوم ترجمہ اس نے کیا ہے۔

[2] ہوٹیر یہ بھی امریکن شاعر اور جریدہ نگار ہے اسکا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اسنے اپنی پرزور نظموں کے ذریعہ سے انسداد غلامی میں بڑی مدد کی چنانچہ اس کو وہاں انسداد غلامی کا ملک الشعراء کہتے ہیں۔

[3] ٹامسن (۱۷۰۰ء لغایت ۱۷۴۸ء) انگلستان کا خوشگو نیچرل شاعر ہے اسکا مجموعۂ نظم موسوم بہ سیزنس (موسم) مشہور ہے جسمیں زمستان تابستان بہار خزاں چاروں فصلوں کا حال نہایت شاعرانہ پیرایہ میں لکھا ہے۔ چند ڈرامے بھی لکھے مگر وہ مقبول نہیں ہوئے اُسکی دیگر تصانیف میں رُول برطانیہ اور کیسل آف انڈولنس بہت مشہور ہیں۔

[4] ولیم ورڈسورتھ (۱۷۷۰ء لغایت ۱۸۵۰ء) نہایت مقبول انگریزی شاعر ہے اس کا اُن لوگوں میں شمار ہے جنکو زبان انگریزی میں "لیک پوئٹ" یعنی جھیل کے شعرا کہتے ہیں اس وجہ سے کہ ورڈسورتھ اور اسکی بہن ڈارو تھی اور کولرج وغیرہ ایک ایسے مقام پر رہتے تھے جس کا نام گراسمیر ہے اور جو اپنے نام کی ایک جھیل کے پاس واقع ہے۔ ورڈسورتھ کو انقلاب فرانس کے زمانہ میں آزادی پسند جماعت سے جو "جائرانڈسٹ" کہلاتے تھے بہت ہمدردی تھی مگر جب نپولین نے اصول جمہوریت کو توڑ کر جبر و استبداد شروع کیا تو اسکی ہمدردی اُس جماعت سے بالکل منقطع ہوگئی۔ ورڈسورتھ کی تصانیف کثرت سے ہیں منجملہ جن کے اُسکی فلسفیانہ نظم رکلوس (راہب) بڑی اعلیٰ پیمانہ کی ہے اُس کے علاوہ ایکسکرشن (گلگشت) اوڈ ٹو ڈیوٹی (غزل بر فرائض انسانی) وڈ انٹمیشنس آف امارٹلٹی (ازل کی یاد) وغیرہ حال کی انگریزی شاعری میں اپنا ثانی نہیں رکھتیں۔ کولرج کا قول ہے کہ ورڈسورتھ نے خاص کام یہ کیا کہ دنیا کی معمولی چیزوں کو ایک فلسفی شاعر کی نظر سے دیکھا اور اُن میں وہ وہ باتیں پیدا کیں جو ہر شخص کو نہیں سوجھتیں، دوسری بڑی خصوصیت اُسکی یہ ہے کہ وہ عالم نباتات میں ایک روح کا قائل تھا اور اُن کو ذی حیات تصور کرتا تھا۔ ورڈسورتھ علاوہ شاعری کے فن تنقید کا بھی اُستاد تھا۔ سودے کے بعد خطاب ملک الشعرائی اسی کو ملا تھا۔

اصلی قدرتی مناظر مثلاً بہتا ہوا دریا لہلہاتے کھیت - گاتی ہوئی چڑیاں - اس قسم کی چیزوں کا ذکر بہت کم ہوتا ہے گو کہ مصنوعی اور فرضی مناظر باغوں چشموں بلبل و گل قمری و سرو وغیرہ کا ذکر کثرت سے ہے۔ شعراے اُردو کے سرود میں صرف ایک ہی تار ہے اور وہی بار بار بجایا جاتا ہے یہانتک کہ بے سُرا ہو جاتا ہے - سمندر کی نظمیں آزادی کے راگ حسن کی صحیح تصویریں، اُردو شاعری میں نہیں ہیں - وہی پامال مضامین جن کو بادشاہ اور اہل دربار پسند کرتے تھے مثلاً شراب و کباب، رقیبوں کے شکوہ و شکایات، عاشقوں کی حرماں نصیبی، فلک کے جور و ستم، تقدیر کی گردشیں کثرت ہیں - البتہ تھوڑے دنوں سے جب سے کہ انگریزی تہذیب و تعلیم کا چرچا پھیلا نیچرل مضامین پر بھی طبع آزمائی کی جانے لگی اور اُن کی مقبولیت سے اُمید ہے کہ اس صنف جدید میں بہت جلد ترقی ہوگی -

اُردو شاعری حزن و یاس کی شاعری ہے -

کُل مشرقی شاعری جس میں اُردو کی شاعری بھی داخل ہے - حزن و یاس کے مضامین سے مملو ہے ایک یوروپین نقاد کی راے ہے کہ اہل مشرق اپنی طبیعت کی اُفتاد سے افسردہ خاطر، پُر اسرار سوچ بچار میں وقت گزارنے والے اور تقدیر کے قائل واقع ہوے ہیں - دُنیاے عمل میں وہ بہت کم حصہ لیتے ہیں انکی زندگی میں زیادہ تر حُزن و یاس درماندگی و بیچارگی زندگی سے تنفر دنیا کی بے ثباتی کا ہر دم تصور دنیاوی ترقی اور مرفہ الحالی سے اجتناب شامل ہے اسی دُنیا کی بیزاری کی وجہ سے وہ اکثر اوقات باوجود اپنے ارادوں کے بھی مذہب اور تصوف کی طرف کھنچ جاتے ہیں - بارگاہ ایزدی میں گڑگڑا گڑگڑا کر دُعائیں مانگنا تقدیر سے مقابلہ کرنے کو بیکار سمجھنا انسانی قوت ارادی کو بالکل معطل

و بیکار سمجھنا زمانہ اور آسمان کی شکوہ و شکایات یہ سب باتیں اہل مشرق کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے ہیں۔ علاوہ مذکورۂ بالا باتوں کے جو تمام مشرقی مصنّفین کے یہاں بالعموم پائی جاتی ہیں، ہندوستان میں اس پابندی قسمت اور مجبوری کا ایک اور بھی سبب ہے جو اُن کی فطری حُزن و یاس کی رنگ کو اور گہرا کر دیتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اُنیسویں صدی کے شروع میں مسلمانوں کا اختر سعادت و اقبال غروب ہوگیا۔ اور اُن کی گزشتہ عظمت و جبروت کے واقعات خواب و خیال ہو گئے" اُردو میں خوشی اور مسرّت کے نغمہ سرائی کرنے والے مثل براؤننگ[1] بہت کم ہیں مگر کہا جا سکتا ہے کہ اسی مایوسی اور مجبوری کی وجہ سے مشرقی شعرا کے کلام میں ایک خاص قسم کا درد و اثر پیدا ہو گیا ہے جسکی وجہ سے اُن کا کلام مقبول خاص و عام ہے۔

قصائد — قصائد نویسی میں بڑے بڑے اساتذۂ فارس مثلاً انوری و خاقانی، عرفی و قاآنی اور ظہیر فاریابی وغیرہ کی پیروی کی گئی۔ اُردو کے مشہور قصیدہ گو سودا ذوق اور امیر وغیرہ ہیں۔ قصیدہ کے انداز میں بھی فارسی کا تتبع کیا جاتا ہے۔ چنانچہ

---

[1] رابرٹ براؤننگ (۱۸۱۲ء لغایت ۱۸۸۹ء) دورِ وکٹوریہ کا نہایت نامور شاعر تھا۔ اُنیسویں صدی یعنے کوئن وکٹوریہ کے عہد میں جسکو انگریزی شاعری کا دور متاخرین بلکہ آخری دور کہنا چاہیئے تین نامور شاعر گزرے ہیں ورڈسورتھ ٹینیسن اور براؤننگ اور ان تینوں کا انداز بیان ایک دوسرے سے الگ ہے براؤننگ کے یہاں روحانیت کا عنصر غالب ہے مضامین نہایت بلند خیالات نہایت پاکیزہ۔ گو عبارت میں کسیقدر پیچیدگی ہوتی ہے جیسے فارسی میں مرزا بیدل کے کلام میں۔ ایک قابل ذکر بات اسمیں یہ تھی کہ اُسکی بیوی بھی نہایت مشہور و صاحب تصنیف شاعرہ تھی۔ تمام قوموں میں دستور ہے کہ ہمعصر شعرا ایک دوسرے کے کلام کے متعلق مذاق و طنز آمیز باتیں کرتے ہیں چنانچہ براؤننگ کی مشہور کتاب سارڈلو جب نکلی تو اُس کے دوست ٹینیسن نے دیکھ کر کہا کہ میں اُسکے صرف دو شعر سمجھ سکا ہوں یعنی پہلا اور آخری اور وہ بھی صحیح نہیں ہیں اور کارلائل نے جب یہ کتاب اپنی بیوی کی زبان سے سنی تو کہا کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ سارڈلو کسی آدمی کا نام ہے یا کسی شہر کا یا کتاب کا ۱۲

اسی وجہ سے اسمیں شکوہ الفاظ اور علو مضامین کا زیادہ خیال کیا جاتا ہے - وہی فارسی ترکیبیں اور استعارے تشبیہیں مبالغے وغیرہ عام طریقہ سے برتے جاتے ہیں چونکہ قصیدہ کسی خاص شخص کی تعریف میں کہا جاتا ہے لہذا ممدوح کی صفات کو نہایت مبالغہ کے ساتھ ہر ممکن طریقہ سے بیان کرتے ہیں - اِس میں کوئی شک نہیں کہ بعض قصائد بہ لحاظ مضمون و زبان اپنا جواب نہیں رکھتے - مشکل بحریں - سخت قوافی قصیدہ گو کی قابلیت پر دال ہوتے ہیں - اکثر قصاید صنائع بدائع سے بھرے ہوئے ہیں -

مثنوی شعرائے اُردو میں یہ صنف بہت مقبول رہی ہے اسمیں بھی بحروں اور فارسی قواعد نظم وغیرہ کی پابندی کیجاتی ہے کہا جاتا ہے کہ انگریزی شاعری میں جو دو مشہور صنفیں معروف بہ ایپک اور ڈراما ہیں اُردو میں صنف مثنوی اُن کا جواب ہے مگر ہماری رائے میں مثنوی اور اصناف مذکورہ میں فرق ہے اُردو کے مشہور مثنوی نویس میر تقی میر حسن - مومن خاں نسیم - قلق نواب مرزا شوق اور شوق قدوائی ہیں اور سب سے زیادہ مشہور مثنویاں سحر البیان اور گلزار نسیم سمجھی جاتی ہیں - وہی یورپین نقاد مثنوی کے بارہ میں یوں رقمطراز ہے "مثنوی یا بیانیہ نظموں میں بھی نفس قصہ دوسرے درجہ پر اور الفاظ کے ماتحت ہوتا ہے اکثر صورتوں میں قصہ کی روش ایک ہی ہوتی ہے اور پڑھنے والا اُس کے جزئیات تک سے واقف ہوتا ہے ہر چند کہ اشخاص قصہ کے نام بدل دیے جاتے ہیں مگر اصل قصہ پرانا ہوتا ہے - جدت صرف وہیں ہوتی ہے جہاں ختم قصہ کے قریب افشائے راز ہوتا ہے - واقعات جو ایک محدود دائرہ میں بیان کیے جاتے ہیں بدمزگی کے ساتھ بار بار دُہرائے جاتے ہیں "

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اُردو میں ڈراما کی کمی کو مثنوی پورا کرتی ہے مگر حق یہ ہے کہ جو لوگ ڈراما کے فن سے واقف ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ مثنوی اور ڈراما میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اس وجہ سے کہ مثنوی میں نہ تو کیرکٹر نویسی ہے نہ پلاٹ قائم کیا جاتا ہے عمدہ مواقع جو ڈراما میں پیدا کیے جاتے ہیں اُن کا مثنوی میں کہیں پتہ نہیں اور نہ وہ دلچسپ مکالمے ہیں جو ڈراما کی جان ہیں۔ واقعات کی حرکت نہایت آہستہ اور عمل معدوم ہوتا ہے۔ اُردو مثنویاں محض رسمی اور قواعد قدیمہ کی پابند ہیں۔ شاہنامہ فردوسی اور سکندرنامہ نظامی کی اُن کو ہوا بھی نہیں لگی۔ البتہ جیسا کہ بیان کیا گیا مثنوی میرحسن اور گلزار نسیم بہ اعتبار فصاحت و بلاغت روانی اور سلاست چُستی بندش وغیرہ کے بے نظیر ہیں۔

مراثی مراثی ادب اُردو کی ایک نمایاں صنف ہے ان میں مناظر خوب خوب دکھائے جاتے ہیں۔ ہر چند کہ پیروی فطرت پوری طرح نہیں کیجاتی پھر بھی معرکۂ کارزار، مبارزین کی جانبازی، صبح اور شام کا سماں، جنگلوں اور میدانوں کے منظر دھوپ اور گرمی کی شدت وغیرہ کے مکمل نقشے الفاظ میں بے مثل طریقہ سے کھینچ دیے گئے ہیں۔ پُرزور اور فصیح بیانیہ نظموں کی یہ بہترین صنف ہے اسکا حال کسی قدر تفصیل کے ساتھ ایک آئندہ باب میں بیان کیا جائے گا۔

قطعہ اور رباعی ان اصناف سخن کی طرف لوگوں کی توجہ کم ہے ان میں نصیحت آمیز خیالات اور عمدہ عمدہ مضامین نظم کیے جاتے ہیں۔ تمام بڑے بڑے شاعروں نے رُباعیاں کہی ہیں جن میں انیسؔ اور دبیرؔ اور حالیؔ کی رباعیاں بہت مشہور ہیں۔

اُستاد و شاگرد کا تعلق اُستاد اور شاگرد کا تعلق ادب اُردو میں ایک خاص درجہ رکھتا ہے ابتدائی کلام اُستاد کو دکھالیا جاتا ہے اور شعراسے اس فن میں ایک باقاعدہ تواعد لی جاتی ہے۔ چنانچہ شعرائے اُردو ایک بڑے سلسلہ میں وابستہ ہیں شاگرد عموماً اپنے اُستاد کا تتبع کرتے ہیں اُستاد سے انحراف کرنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ اس اتباع کی وجہ سے قدرتی ذہانت اور طبّاعی کا خون ناحق ہوتا ہے اور شاعری وہی رسمی رہ جاتی ہے کبھی کبھی البتہ کوئی خاص آدمی اس دائرۂ اتباع سے علیحدہ ہوکر شہرت حاصل کرلیتا ہے۔

مشاعرے مشاعرے میں سخن گو اور سخن سنج سب جمع ہوتے ہیں اور کسی طرح پر طبع آزمائی کی جاتی ہے اس میں شک نہیں کہ اس سے اُردو شاعری کو بہت ترقی ہوتی ہے اس قسم کی کوئی چیز یورپ میں نہیں ہے۔

تخلص شاعر اپنے کلام میں اپنے واسطے اپنے نام کے علاوہ ایک خاص نام اختیار کرلیتا ہے جس کو تخلص کہتے ہیں بعض اوقات اُستاد شاگرد کے واسطے تخلص کا انتخاب کرتا ہے کبھی کبھی اپنے مختصر نام سے تخلص کا کام لیا جاتا ہے۔

اُردو شاعری کے خصوصیات باوجود اُن نقائص کے جو اوپر بیان ہوئے اُردو شاعری جذباتی شاعری ہے اور ہمارے فطری جذبات میں کشش پیدا کرتی ہے۔ ماسوا اسکے شیریں اور لطیف اور اپنے طرز خاص میں بے مثل ہے وہ عشق میں شرابور ہے نغمہائے غم عشق کی ناکامیاں حسرت و ارمان۔ ہجر کا قلق یہ اور اس قسم کے بیسیوں مضامین جو اُردو شاعری کی جان ہیں ہمارے قلب پر ایک خاص اثر کرتے ہیں۔ اس میں ایسے جواہر بے بہا شامل ہیں جو اپنی آب و تاب سے انگریزی کیا بلکہ دُنیا کے علم ادب کے

علو خیال، نزاکت الفاظ، موسیقیت، حسن تخیل، محویت وغیرہ میں بے تکلف مقابلہ
کر سکتے ہیں۔ اس میں بھی کوئی کلام نہیں کہ بہت سا کلام ناقص اور بے مزہ ہے
مگر یہی حال دنیا بھر کی شاعری کا ہے اُردو کی نظم و نثر کو وجود میں آئے ہوئے
ابھی بہت عرصہ نہیں گذرا مگر زمانۂ حال کی تہذیب و تعلیم کا اثر اس پر اچھا پڑ رہا
ہے اس وجہ سے کہ اب اس میں قومی ترانے اور جوشیلی اور نیچرل نظمیں اور انگریزی
نظموں کے ترجمے بہ کثرت ہونے لگے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اب طبائع
پُرانی لکیر کے فقیر رہنے کو پسند نہیں کرتیں اور جدید راہیں نکالتی ہیں۔ بہرحال
اُردو کا مستقبل بہت درخشاں نظر آتا ہے کیونکہ مشرق و مغرب دونوں کے
قابل اور با اثر لوگ اُس کی فلاح و ترقی میں دل سے کوشاں ہیں۔

باب ۴

قدیم شعرائے دکن

یہ امر حیرت انگیز ہے کہ اُردو شاعری کی ابتدا مسلمان فرمانروایان دکن کے
درباریں دکھنی زبان میں ہوئی۔ اس معاملہ کو زیادہ تفصیل سے لکھنے سے پہلے
بہتر ہو گا کہ یہ دریافت کیا جائے کہ دکھنی سے کیا مُراد ہے اور اُس میں اور زبان
اُردو میں کیا فرق ہے۔

دکھنی کیا چیز ہے

دکھنی زبان ہندوستانی کی ایک شاخ ہے جس کو مسلمانان
دکن بولتے ہیں۔ اُردو کے مانند وہ بھی فارسی نستعلیق خط میں لکھی جاتی ہے مگر

اُس میں فارسی الفاظ کی کثرت نہیں ہے اُس میں بعض خصوصیتیں ہیں۔ جب مسلمان فوجیں اپنے ساتھ اپنی زبان کو ملک دکن میں لے گئیں اُسوقت اُس میں بہت سے ایسے محاورے داخل ہوگئے جو اب ادب اُردو سے متروک ہوگئے ہیں جب اس نئی زبان کا میل اطراف و جوانب کی زبانوں یعنی مرہٹی۔ ٹامل؛ اور تلنگی سے ہوا تو اُس کے محاورے اور ساخت میں کسی قدر فرق آگیا مثلاً حالت فاعلیت میں اسم یا ضمیر کے بعد اور فعل ماضی کے قبل حرف (نے) استعمال نہیں کیا جاتا جیسے کہ مغربی ہندی کی شاخوں میں قاعدہ ہے۔ اسی طرح بجائے "مجھ کو" کے "میرے کو" بولتے ہیں یہ اور اسی قسم کی چند خصوصیتیں شمالی ہندوستان میں بھی پہونچیں جہاں صفائی زبان کی تدریجی رفتار میں اُن میں سے اکثر متروک ہوگئیں۔ بنظر بریں دکھنی کو ایک خراب قسم کی ادبی اُردو خیال کرنا صحیح نہیں ہے بلکہ اُس کو اُردو کی ایک شاخ سمجھنا چاہیے جس نے بیجا پور اور گولکنڈہ کے درباروں میں نشو و نما پائی اور ولی اور اُس زمانہ کے مشہور شعرا کی کوشش سے اُس کو ایک ادبی زبان کی حیثیت حاصل ہوئی۔

زبان دکھنی کی ابتدا ملک دکن کی فتح خلجیوں کے زمانہ سے شروع ہوئی۔ سب سے پہلا مسلمان بادشاہ جس نے ملک دکن پر حملہ کیا اور اُس کو فتح کرکے سلطنت دہلی کا ماتحت بنایا سلطان علاء الدین خلجی ہے۔ اس کے بعد سلطان محمد تغلق کا دو مرتبہ دکن جانا بھی اہمیت سے خالی نہیں۔ کیونکہ سلطانی حکم کے بموجب اکثر باشندگان دہلی کو اپنا وطن چھوڑنا پڑا۔ بڑے بڑے علمائے کبار اور صوفیائے عظام معمولی لوگوں کے ساتھ بادشاہ کے ہمرکاب تھے۔ اس کے بعد بھی سلسلۂ آمد و رفت

جاری رہا۔ مگر اس سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ دہلی تباہ ہوگئی چنانچہ تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے "چوں مردم اطراف کہ در دولت آباد بہ تکلیف ساکن شدہ بودند پراگندہ گشتند۔ پادشاہ مدت دو سال در انجا ماندہ ہمت بر تعمیر دولت آباد بگماشت و مادر خود مخدومۂ جہاں را با سائر حرم ہائے امرا و سپاہی روانہ دولت آباد گردانید۔ واحدے از مردم دہلی را کہ بآب و ہوائے آنجا خو گرفتہ بودند بحال خود نگزاشتہ طرا بدولت آباد فرستاد و دہلی بنوعی ویران گشت کہ آواز ہیچ متنفسے بجز شغال و روباہ و جانوران صحرائی بگوش نمی رسید"۔ مختصر یہ کہ دہلی کے باشندے اب دکن کے باشندے ہوگئے۔ اور دلّی کا نقصان دولت آباد کا فائدہ ہوا۔ امتداد زمانہ کے باعث آب و ہوا کے اثرات، زبانوں کے اختلاط، اور مقامی باشندوں کے ساتھ ربط و ضبط نے یہ نتیجہ پیدا کیا کہ جو زبان دلّی والے اپنے ساتھ لے گئے تھے اُس میں نمایاں تغیر ہوگیا۔ اور آخر ان دونوں زبانوں میں معتد بہ فرق معلوم ہونے لگا۔

دکن میں اُردو شاعری کی ابتدا کے اسباب

اِس امر کی تحقیقات کہ دکن میں اُردو شاعری کی ابتدا کے کیا اسباب ہوئے بہت دلچسپ ہے قرین قیاس یہ تھا کہ اُسکی نشو و نما دلّی میں ہوتی جو اس کا اصلی گھر تھا۔ مگر بجائے اس کے ہم دیکھتے ہیں کہ قدیم شعر اُردو کا گہوارہ دلّی سے اتنا دور دراز مقام یعنی دکن ہے۔ اسکی کیا وجہ ہے۔ اس ضروری سوال کا جواب دینے کی بہت کم کوشش کیگئی ہے اس کے صحیح جواب کے لئے ایک اہم واقعۂ تاریخی کی طرف حوالہ دینا ضروری ہے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ مشہور خاندان بہمنی کا بانی ایک برہمن گنگو نامی کا ایک چیلا تھا

جب کہ انقلاب زمانہ سے وہ تخت نشین ہوا تو اُس نے نہ صرف شگون نیک کے واسطے
اپنے گرو کا نام تعظیماً اپنے خاندان کے نام میں شامل کیا بلکہ اُس کو اپنا وزیر مال بھی
مقرر کیا۔ تاریخ[1] فرشتہ میں لکھا ہے کہ یہ عام طور پر یقین کیا جاتا ہے کہ گنگو پہلا برہمن
ہے جس نے ایک مسلمان بادشاہ کی ملازمت اختیار کی اُس سے قبل برہمن لوگ
معاملات ملکی میں کوئی حصہ نہیں لیتے تھے بلکہ اُن کی زندگی امور مذہبی کی خدمت
کے واسطے وقف تھی۔ گنگو کے زمانہ سے یہ رسم نکل آیا کہ وزارت مال تمام فرمانروایان
دکن کی مملکت میں برہمنوں کو تفویض ہوتی ہے۔" ہندوؤں کے صیغۂ مال میں
تقرر سے یہ نتیجہ ہوا کہ زبان ہندی نے جلد ترقی کرنا شروع کی اور نیز ان دو بڑی
جماعتوں یعنی ہندو اور مسلمانوں کے درمیان ارتباط بڑھ گیا۔ ابراہیم عادل شاہ
نے بجائے دوسرے ممالک کے لوگوں کے دکھنیوں کو اپنی ملازمت میں رکھنا
شروع کیا اور اُس کے حکم سے ملکی حسابات جو اب تک فارسی میں لکھے جاتے تھے
وہ برہمنوں کے زیر نگرانی ہندوی یعنی ہندی میں لکھے جانے لگے[2] اس سے
دیسی زبان کو بڑی تقویت پہونچی۔ کیونکہ اب وہ سرکاری اور درباری زبان ہو گئی
اور اُس نے بڑی ترقی کرنا شروع کی۔ ہندوؤں کی تعداد ملک دکن میں کم نہ تھی
یہ جماعت اپنی کثرت تعداد ہی کی بدولت مسلمان بادشاہوں کی خانہ جنگیوں
میں فاتح اور برسر اقتدار شخص کو بہت مدد دیتی تھی۔ کبھی ایک مسلمان حاکم
اُن سے میل کرنا چاہتا تھا اور کبھی اُس کا حریف۔ بعض اوقات چند

---

[1] دیکھو تاریخ فرشتہ ترجمہ مسٹر برگ جلد ۲ صفحہ ۲۹۲

[2] تاریخ فرشتہ جلد ۳ صفحہ ۸۰

مسلمان حکمراں کسی ہندو راجہ کے خلاف بھی آپس میں میل کر لیتے تھے مگر اس ارتباط اور میل جول کا یہ نتیجہ ضرور ہوا کہ باہمی معاملات سے زبان فائدہ اُٹھاتی رہی"۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس تین سو برس کے عرصہ میں یعنی جب تک بیجاپور اور گولکنڈہ خودمختار سلطنتیں رہیں ان دونوں قوموں یعنی ہندو اور مسلمانوں میں اتنا میل جول تھا کہ ہندوستان میں کسی دوسری جگہ نہیں پایا جاتا تھا۔ ہندو اور مسلمانوں کے درمیان محض معمولی برتاؤ اور رواداری نہ تھی بلکہ ہندو رعایا اپنے مسلمان بادشاہوں کے ساتھ دلی محبت اور خلوص سے پیش آتی تھی اور یہ حالت برابر قائم رہی یہاں تک کہ زوال سلطنت بیجاپور کے بعد مرہٹوں کے ساتھ ظلم و تعدی نے اُس کا خاتمہ کر دیا[1]" باہمی ارتباط اور محبت و یگانگت کی حد یہ تھی کہ مسلمان بادشاہ اور اُمرا ہندو عورتوں سے شادی کرتے تھے اور اسی طرح ہندوؤں کو بھی مُسلمان عورتوں سے شادی کرنے میں کوئی باک نہ تھا۔ انتظامُ ملکی میں بہ کثرت ہندوؤں کا دخیل ہونا رواداری کی پالسی کا بہت بڑا ثبوت تھا۔ گو کہ باہمی خانہ جنگیاں کبھی کبھی ہوتی تھیں مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ سلاطین گجرات اور بہمنی بادشاہوں کو امن و امان سے سلطنت کرنے اور انتظام ملکی کو قائم رکھنے کے لئے سلاطین دہلی کی بہ نسبت زیادہ موقعے حاصل تھے جہاں کہ شمال سے برابر حملے ہوا کرتے تھے اور رعایا کی فلاح اور بہبود مفقود تھی پس مختصراً ہندو مسلمانوں کا باہمی ارتباط، مسلمان فرمانروایان دکن کی سلطنت میں ہندوؤں کا عروج، حساب کتاب کا زبان ملکی میں تبدیل کر دیا جانا،

---

[1] دیکھو تاریخ دکن مصنفہ مسٹر گریبل جلد ۱ صفحہ ۲۹۴ -

یہ سب اسباب مل کر اس کا باعث ہوئے کہ دیسی زبان جو دکھنی کے نام سے مشہور تھی وہ ترقی کر کے ایک ادبی زبان بننے کے قابل ہو گئی۔ اس کے علاوہ مُلکِ دکن میں اکثر بزرگان دین اور اولیاء اللہ بھی رہتے تھے جو ہندو اور مسلمانوں کی زبان اور مذہب میں کوئی فرق نہیں کرتے تھے۔ یہ لوگ عوام الناس کے ساتھ میل جول کے خیال سے دیسی ہی زبان کو پسند کرتے تھے۔ چنانچہ اکثر قدمائے اُردو صوفی منش اشخاص تھے اور اُن سب کے اشعار بہت صاف اور عام فہم زبان میں ہوتے تھے۔ اس مختصر بیان سے اُردو شاعری کی نشو و نما کا کچھ حال تو معلوم ہو گیا مگر اُس زمانہ کے شعراء کے حالات مکمل اور یکجا کسی معاصر تذکرہ میں نہیں دیکھے گئے تذکروں میں صرف بعض شعراء کے نام ملتے ہیں اور اُن کے کلام کا بھی کچھ نہ کچھ نمونہ موجود ہے مگر یہ تذکرے بہت بعد کی تصنیف ہیں غنیمت ہے کہ اس زمانہ میں اس مسئلہ خاص میں کافی دلچسپی لی جا رہی ہے۔ اور ہم کو امید ہے کہ قابل لوگوں کی توجہ سے اس پر کافی روشنی پڑے گی۔

شاہانِ بہمنی کا زمانہ ۷۴۸ھ لغایت ۹۳۲ھ

آٹھویں صدی ہجری سے دکن میں علم و ادب کی ابتدا ہوتی ہے اُس زمانہ کی تصانیف کے جو نمونے اس وقت موجود ہیں وہ زیادہ تر مذہبی کتابوں کی صورت میں ہیں۔ اور اُن کے مؤلف اُس وقت کے صوفی مشرب لوگ تھے جن میں سے بعض مشہور لوگوں کے نام حسب ذیل ہیں۔ گنج الاسلام شیخ عین الدین (متوفی ۷۹۵ھ) خواجہ سید گیسو دراز۔ شاہ میرانجی، مولانا وجہی۔ اور سید شاہ میر وغیرہ۔ یہ لوگ زیادہ تر نثار تھے۔ ان کا کچھ مختصر حال ہم اس کتاب کے حصۂ نثر میں بیان کریں گے۔

قطب شاہیوں کا عہد
۹۱۶ھ تا ۱۰۹۸ھ

سلطنت بہمنی کے زوال کے بعد بیجاپور گولکنڈہ اور احمد نگر کی چھوٹی چھوٹی سلطنتیں قائم ہوئیں اس زمانہ میں دکھنی زبان کو بہت ترقی ہوئی۔ ہندو رانیوں کیوجہ سے جو شاہی محلوں میں تھیں دیسی زبان کو اور بھی تقویت پہونچی۔ یوسف عادل شاہ کی بیوی جو بوبوجی کے نام سے مشہور تھیں مکند راؤ مرہٹہ کی بہن تھیں۔ بھاگ متی سلطان محمد قلی شاہ کی محبوب بیوی تھیں احمد نظام شاہ والی احمد نگر کی ماں بھی ہندو تھیں۔

شاہان گولکنڈہ و بیجاپور نہایت قدردان فن مہذب اور قابل بادشاہ تھے شعرا کی قدردانی کے ساتھ خود بھی فارسی اور دکھنی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے اُردو کو دکن میں دکھنی کہتے ہیں اُن کے دربار میں ایسے لوگوں کا مجمع تھا جو فارسی اور عربی کے عالم تھے۔ اس نئی زبان کے اطراف وجوانب میں تلنگی مرہٹی اور کنڑی زبانیں بولی جاتی تھیں مگر بے میل ہونے کی وجہ سے اُن سے اُردو کو کوئی فائدہ نہیں پہونچ سکتا تھا۔ اس کے علاوہ نئی زبان کے ترویج و اشاعت کا انحصار ایسے لوگوں پر تھا جو فارسی کے علاوہ دیگر زبانوں سے ناواقف تھے اسی وجہ سے اس نئی زبان یعنی دکھنی کی ترکیب زبان فارسی کے مطابق ہوئی دربار گولکنڈہ اُس وقت کے شعرا اور اُدبا کا مجمع تھا جن میں مندرجۂ ذیل شعرا کے نام تذکروں میں ملتے ہیں مگر حالات دستیاب نہیں ہوتے۔ غواصی، ملا قطبی، ابن نشاطی، جنیدی، طبعی، نوری، فائز، شاہی، مرزا، شعور، بیچارہ، طالب، مومن،

سلطان محمد قلی قطب شاہ
۱۵۸۰ء لغایت ۱۶۱۱ء

یہ سلطنت ۱۵۱۸ء میں قائم ہوئی اور ترقی کی معراج پر پہونچ گئی سلطان قلی قطب شاہ اپنے والد ابراہیم قطب شاہ

کی وفات پر جو ۱۵۸۰ء میں واقع ہوئی بارہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا ۱۵۸۶ء
میں سلطان مذکور نے ابراہیم عادل شاہ فرمانروائے بیجا پور کے ساتھ صلح کی اور
اپنی بہن کا نکاح اُن کے ساتھ کر دیا۔ وہ شہنشاہ اکبر اور شاہ عباس صفوی کا ہمعصر
تھا۔ گولکنڈہ سے کچھ فاصلہ پر اپنی معشوقہ بھاگ متی کے نام سے ایک شہر بھاگ نگر
آباد کیا۔ مگر تھوڑے عرصے کے بعد اس نسبت کو بدل کر اسی شہر کو حیدر آباد کے نام
سے موسوم کیا جو موجودہ فرمانروائے دکن کا مشہور دارالسلطنت ہے۔ قطب شاہ
کو علاوہ شعر و شاعری کے دیگر فنون لطیفہ کا بھی بہت شوق تھا چنانچہ فن تعمیر سے
بھی اُن کو دلچسپی تھی دو مشہور عمارتیں مشہور بہ خداداد محل اور بارگاہ خسروی
تعمیر کرائیں۔ اُن کے دربار میں بڑے بڑے صاحب کمال اور اُستادان فن عرب
و ایران سے اُن کی داد و دہش اور قدر دانی کا حال سُنکر آتے تھے اور اُن کی فیاضی
سے مستفیض ہوتے تھے۔ بادشاہ نے ایک خاص وقت مقرر کیا تھا جبکہ علما و شعرا
میں مناظرے اور مشاعرے ہوتے تھے۔ خوشنویسی کا بھی اُن کو بہت ذوق تھا
چنانچہ مشہور خطاط ایران و عراق کے اُن کے دربار میں جمع ہو گئے تھے علاوہ
دیگر باکمالوں کے دو مشہور عالم اُن کے دربار میں میر محمد مومن استر آبادی اور میر جملہ
تھے۔ قطب شاہ کا مذہب شیعہ تھا اور وہ اکثر مناظرے اپنے مذہب کی حمایت
میں اہل دربار میں منعقد کراتے تھے۔ اسی مذہبی شوق کی وجہ سے بہت سے مرثیے
اس عہد میں کہے گئے۔ علاوہ قدر دان فن ہونے کے خود بھی ایک اچھے شاعر
تھے۔ چنانچہ اُن کا کلام بزبان دکھنی و تلنگی و فارسی ایک ضخیم کلیات کی صورت میں
جس کے اٹھارہ سو صفحے ہیں موجود اور محفوظ ہے۔ اشعار فارسی میں قطب شاہ

اور دکھنی میں معانی تخلص کرتے تھے ان کی کلیات میں حسب ذیل اصناف سخن موجود ہیں مثنویاں قصیدے۔ ترجیع بند مراثی بزبان فارسی و دکھنی اور رباعیات۔ دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے پچاس ہزار سے زیادہ شعر کہے تھے۔ سادگی اور شیرینی ان کے کلام کا جوہر ہے۔ تصوف اور عاشقانہ رنگ بھی ان کے اشعار میں پایا جاتا ہے۔ مرقع نگاری اور مناظر قدرت کی بنیاد انھیں کی رکھی ہوئی ہے جو سودا اور نظیر اکبر آبادی کے زمانہ میں تکمیل کو پہونچی۔ اکثر مثنویاں خاص ہندوستانی پھلوں اور ایک ہندوستانی ترکاریوں اور ایک شکاری چڑیوں کے متعلق ہے بعض نظموں میں شادی بیاہ اور ولادت کے رسم و رواج ہندو اور مسلمانوں کے مذہبی تہوار مثلاً ہولی دوالی عید بقر عید بسنت وغیرہ بعض میں ہندوستان کے موسم برسات کا ذکر نہایت دلچسپی سے کیا گیا ہے۔ اسی طرح ایک دلچسپ مکالمہ صراحی و ساغر کا منظوم کیا ہے۔ ایک قصیدہ باغ محمد شاہی کی تعریف میں اور اکثر قصائد حمد و نعت اور منقبت میں ہیں۔ معرکہ کربلا کے مؤثر مراثی بھی لکھے ہیں۔

قلی قطب شاہ پہلے شخص ہیں جن کا کلام اُردو مجموعی صورت میں موجود ہے۔ اُن کی زبان میں کافی پختگی اور ترقی پائی جاتی ہے۔ ممکن ہے ان سے بھی پیشتر کچھ لوگ گزرے ہوں جنھوں نے شعر کہا ہو مگر اُن کے کلام کا اس وقت تک کہیں پتہ نہیں ملا۔ کچھ مذہبی مثنویاں قطب شاہ سے پیشتر کی موجود ہیں مگر وہ کسی معنی میں ادبی تصنیفات نہیں کہی جاسکتیں۔ قطب شاہ ہی کا کلام اب تک ایسا کلام کہا جاسکتا ہے کہ جس میں ایک ادبی شان موجود ہے۔ اُنھوں نے سب سے پیشتر فارسی کے تتبع میں شعر کہے اور ایک دیوان بہ ترتیب حروف تہجی جمع کیا

اور یہ سہرا اب تک عدم تحقیق کی وجہ سے دلی کے سر تھا۔ علاوہ متعارف مضامین کے اُن کے کلام میں قابل تعریف بات یہ ہے کہ اصلیت اور جدت ہے اور بعض مقامی دلچسپیوں کو بھی اُنھوں نے قلمبند کیا ہے۔ فارسی کے وہ پورے متبع نہیں ہیں کیونکہ ان کے کلام میں ہندی کا بھی بہت بڑا اثر پایا جاتا ہے ہندی الفاظ اور ترکیبیں، ہندی استعارے اور تشبیہیں، مہند فارسی الفاظ، خدا کی تعریف ٹھیٹ بھاشا میں، ہندو سورماؤں اور بہادروں، درہندستان کی روایات کا ذکر، اظہار عشق عورت کی جانب سے مرد کے واسطے، جو ہندی شاعری کے لیے مخصوص ہے۔ یہ سب باتیں اُن کے کلام کی خصوصیات ہیں معشوق سے طریقہ خطاب جو بعد میں اُلٹ گیا اُن کے یہاں صحیح طریق پر پایا جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ فارسی کا اتباع بھی نظر انداز نہیں کیا گیا، کیونکہ قواعد نظم الفاظ، محاورات، ترکیبیں، مضامین، تشبیہات اکثر اُن کے کلام میں موجود ہیں۔ وہ اپنی قابلیت کا اظہار نہیں کرتے اور فارسی عربی الفاظ کو اُسی طرح استعمال کرتے ہیں جیسے روزمرہ میں مشہور ہیں، عام اس سے کہ وہ لغوی طریق پر صحیح ہوں یا غلط۔ فی الحال چونکہ وہ قدیم زبان متروک ہوگئی ہے اور لوگوں کو اُس میں کوئی لطف نہیں آتا اس لئے ان کا کلام دلچسپی سے نہیں پڑھا جاتا مگر جب نظر تحقیق وسیع ہوگی تو اُن کے کلام کی قدر کیجائیگی مختصر یہ کہ قلی قطب شاہ اُن لوگوں میں ہیں جنھوں نے سب سے پہلے اپنے کلام کی تدوین کی اور اُردو کو ایسا وسیع کیا کہ آیندہ وہ ایک ادبی زبان بننے کے قابل ہوگئی۔ اُنھوں نے ایک ایسے ادب شعر کی بنیاد رکھی جس کے پیرو اور مختتم میر و سودا انیس و دبیر ذوق و

غالب وغیرہ ہوئے۔ نمونۂ کلام یہ ہے ۔

دل نہ مانگ خدا کن کہ خدا کام دوے گا	تمنن کی مرادن کے بھرے جام دوے گا
کرتے ہیں دعوے شعر کا سب اپنی طبع سوں	بخشا فصیح شعر معانی کے تئیں خدا

سلطان محمد قطب شاہ
۱۶۱۱ء لغایت ۱۶۲۵ء

سلطان محمد قطب شاہ سلطان قلی قطب شاہ کے بھتیجے اور جانشین تھے اُن کی ولادت گولکنڈہ میں ۱۵۹۱ء میں ہوئی اور اُن کی شادی اپنی چچا زاد بہن یعنی سلطان قلی قطب شاہ کی لڑکی سے ہوئی تھی۔ نہایت متشرع اور پابند مذہب سخی اور فن تعمیر کے دلدادہ تھے۔ منجملہ دیگر تعمیرات کے آہنی محل۔ جامع مسجد معروف بہ مکہ مسجد۔ محمدی محل دال محل مشہور ہیں۔ نظم و نثر فارسی و اُردو دونوں خوب لکھتے تھے۔ اُن کے دو دیوان ہیں ایک فارسی اور ایک دکنی۔ جن میں اکثر اصناف سخن موجود ہیں۔ فارسی میں **ظل اللہ** اور اُردو میں **قطب شاہ** تخلص کرتے ہیں۔ اِسی توافق تخلص کی وجہ سے ان دونوں بادشاہوں کے کلام میں خلط ملط ہو گیا ہے۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ انکا تخلص اُردو کلام کیواسطے اور سلطان قلی قطب شاہ کا فارسی کے واسطے مخصوص تھا۔ اِن کے دونوں دیوان حیدرآباد میں نواب سرسالار جنگ کے کتب خانہ میں موجود ہیں۔ اِن کے کلام میں بھی شیرینی، صفائی، لطافت پائی جاتی ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے ۔

سکھی تو ہر گھڑی مجھ پر نہ کر غیظ	محبت پر نظر رکھ کر بسر غیظ

دو لب ترے رنگیلے یاقوت کو دیے رنگ
لے بھیک رنگ عقیقاں رنگیں ہوئے یمن ہیں

سلطان عبداللہ قطب شاہ
سنہ ۱۶۲۵ء لغایت سنہ ۱۶۷۲ء

عبداللہ قطب شاہ سلطان محمد قطب شاہ کے بیٹے اور سلاطین قطب شاہی میں چھٹے بادشاہ تھے سنہ ۱۶۱۴ء میں پیدا ہوئے اور اپنے باپ کی وفات کے بعد سنہ ۱۶۲۵ء میں تخت نشین ہوئے اُنھوں نے شاہ جہاں کے سامنے گردن اطاعت خم کی اور ایک سالانہ رقم بطور خراج کے دینا منظور کیا۔ سنہ ۱۶۵۶ء میں جب شاہجہاں اُن سے ناراض ہوئے تو شاہزادہ اورنگ زیب نے جو اُس وقت ممالک محروسۂ دکن کے صوبہ دار تھے حیدرآباد پر چڑھائی کرکے اُس شہر کو تہ و بالا کردیا۔ عبداللہ نے اپنی شکست قبول کرکے تمام شرائط صلح منظور کرلئے اور اس وقت سے وہ سلطنت مغلیہ کے ایک باجگزار کی حیثیت سے ہوگئے۔ یہ بھی مثل اپنے باپ کے شعر و شاعری کے دلدادہ تھے اور اُنھیں کی طرح ان کو بھی فن تعمیر کا بڑا شوق تھا ان کا دربار بھی فارس اور عرب کے عالموں فاضلوں سے بھرا رہتا تھا اور وہ سب اُن کی فیاضی سے بہرہ یاب ہوتے تھے۔ اکثر کتابیں اس عہد میں ان کے نام سے لکھی گئیں مثلاً برہان قاطع اور ایک لغت موسوم بہ لغات فارسی یہ فارسی اور دکھنی دونوں میں شعر کہتے تھے اور تخلص عبداللہ تھا۔ ان کے دیوان فارسی اُردو دونوں میں موجود ہیں۔ ان کے اشعار بہت صاف و شیریں ہوتے ہیں۔ آصفی ملکاپوری نے اپنے تذکرۂ شعرائے دکن میں ان کے اکثر اُردو اشعار بطور نمونہ پیش کیے ہیں کلام کا نمونہ یہ ہے۔

تری پیشانی پر ٹیکا جھمکت	تماشا ہے اُجالے میں اُجالا
آب حیات سے ہے زیادہ یہ لب ترا	کرتے ہیں مجھ سے خضر علیہ السلام بحث

جو کچھ راز پردہ میں ہیں ہیں غیب کے		سو مخفی نہیں اُس پہ ہیں آشکارا

ابن نشاطی اس زمانہ کے شعرائے دکن میں ابن نشاطی بہت مشہور ہوے ہیں۔ یہ گولکنڈہ کے رہنے والے اور سلطان عبداللہ قطب شاہ کے درباری شاعر تھے ان کے حالات زندگی کچھ معلوم نہیں۔ بجز اس کے کہ وہ ایک مثنوی موسوم بہ "پھول بن" کے مصنف ہیں جو زبان دکنی میں ہے اور عشق و عاشقی کا قصہ ہے اس کا نام اسکی ہیروئن کے نام پر رکھا گیا ہے اور خیال کیا جاتا ہے کہ یہ ایک فارسی کتاب بساتین کا ترجمہ ہے جسمیں سکندر اور لقمان وغیرہ کی حکایات بھی ہیں اور ایک فرضی شہر مشہور بہ کنچن پاٹن کا حال ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ تقریباً ۱۳۰ صفحہ کا ایسٹ انڈیا ہاؤس کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ معمولاً حمد و نعت و منقبت سے ابتدا ہوئی ہے۔ اس کے بعد سلطان عبداللہ قطب شاہ کی تعریف ہے پھر اصل قصہ شروع ہوتا ہے۔ قصہ میں انسانوں کے قالب بدلنے اور جانوروں کے قالب میں آجانے کا ذکر ہے۔ کوئی تعجب نہیں کہ سرور نے اسی کے مطالعہ کے بعد فسانہ عجائب لکھی ہو۔ اسکی تصنیف ۱۰۶۶ھ میں ہوئی۔

غواصی کا قصہ "سیف الملوک" غواصی نے بزبان دکھنی ایک مثنوی لکھی ہے جس میں سیف الملوک شاہزادۂ مصر اور بدیع الجمال شاہزادی چین کے عشق کا حال ہے۔ اس کا سن تصنیف ۱۰۳۵ھ ہے۔ غواصی مذہب کا شیعہ تھا۔ اور عبداللہ قطب شاہ کے دربار کا شاعر تھا۔ قصہ سیف الملوک غالباً الف لیلہ سے ماخوذ ہے۔ شروع میں حمد و نعت اور منقبت کے بعد بادشاہ کی تعریف ہے

ما ۵ "دکن میں اُردو" ۱۲۴

جس کا ذکر کتاب کے اٹھارھویں شعر میں ہے۔ انھوں نے ایک اور مثنوی بھی لکھی ہے جس کا نام طوطی نامہ ہے اور یہ سنہ ۱۰۴۹ھ میں تمام ہوئی اور جس کو سر چارلس لائل غلطی سے ابن نشاطی کیطرف منسوب کرتے ہیں۔ دراصل یہ قصہ ضیا نخشبی کے فارسی طوطی نامہ سے سلطان عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں اردو میں ترجمہ ہوا تھا اس وجہ سے کہ دیباچہ میں انھیں کی بہت زیادہ تعریف ہے۔ اس کا ماخذ اصلی سنسکرت کی کتاب "سوگا شبتتی" بتایا جاتا ہے۔ غواصی کے اس قصہ سے مولوی حیدر بخش نے جو فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے مدرس تھے اپنا مشہور طوطی نامہ سنہ ۱۸۰۱ء میں تیار کیا۔ غواصی نے اپنا تخلص ایک ترجیع بند میں ظاہر کیا ہے۔ اور سنِ تصنیف دیباچہ سے سنہ ۱۶۳۹ء (مطابق یکم رجب سنہ ۱۰۴۹ھ) پایا جاتا ہے۔ ملا غواصی گولکنڈے کے باشندے اور سلطان عبداللہ قطب شاہ کے معاصر ہیں۔ نصرتی نے گلشن عشق میں ان کا تذکرہ کیا ہے؂

پڑھی کچھ غواصی تنی کر خیال	کیا تازہ باغ بدیع الجمال

میر حسن اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں "غواصی تخلص در وقت جہانگیر سنہ ۱۰۲۷ھ بود۔ طوطی نامۂ نخشبی را نظم نمودہ است، بزبان قدیم نصفے فارسی نصفے ہندی بطور بکٹ کہانی سرسری دیدہ بودم شعر آن نظم یاد نیست"

سب رس مصنفہ مولانا وجہی ایک ضروری کتاب موسوم بہ سب رس کا ذکر بھی یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے جس کو نثر دکنی میں مولانا وجہی نے تصنیف کیا تھا مولانا موصوف سلطان عبداللہ قطب شاہ کے درباری شاعر اور غواصی کے معاصر تھے۔ یہ کتاب سلطان عبداللہ قطب شاہ کے حکم سے سنہ ۱۰۴۰ء یا سنہ ۱۰۴۵ء میں

تصنیف ہوئی۔ قدیم نثر دکنی کے نمونے سبرس سے پیشتر کے بھی موجود ہیں مگر وہ سب مذہبی رنگ یا تصوف میں ہیں۔ سب سے بڑی خوبی اس کتاب کی جیساکہ مولوی عبدالحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی اردو نے بتلایا ہے کہ جنکی کوششوں سے یہ کتاب پبلک کی نظروں میں آئی یہ ہے کہ ایک مسلسل قصہ ہے نیز یہ کہ اسکی عبارت ادبی شان رکھتی ہے اور نثر مقفٰے ہے جیساکہ فارسی میں ظہوری کا رنگ ہے۔ زبان بہت صاف اور سادہ ہے اور قصہ میں روانی پائی جاتی ہے۔ نفس قصہ مختصر ہے جس میں جابجا اشعار حسب موقع عشق، عقل، شجاعت، حرص وغیرہ کے موضوع پر لائے گئے ہیں۔ اسکی زبان بھی ویسی ہی ہے جیسی کہ قطب شاہیوں کے کُلیات کی ہے۔

تحسین الدین ممکن ہے کہ یہ نام ہو یا کوئی خطاب۔ غرضکہ ان بزرگ نے ایک مثنوی لکھی جسکا نام "کامروپ کلا" ہے۔ کلا شاہ لنکا کی بیٹی قصہ کی ہیروئن ہے اور کامروپ، شاہ اودھ کا بیٹا ہیرو ہے۔ قصہ یہ ہے کہ یہ دونوں خواب میں ایک دوسرے پر عاشق ہوگئے جیساکہ الف لیلہ میں چین والی شہزادی کی نسبت لکھا ہے۔ کامروپ اپنی نادیدہ بلکہ خواب دیدہ معشوقہ کی تلاش میں ملکوں ملکوں پھرتا ہے جہاں اُسکو عجب عجب واقعات پیش آتے ہیں اور بالآخر اُسکی شادی کلا کے ساتھ ہوجاتی ہے۔ اس میں قابل غور بات یہ ہے کہ مصنف مسلمان ہے اور اشخاص قصہ سب ہندو ہیں۔ اسی مثنوی کو گارسن ڈیٹاسی نے ۱۸۳۶ء میں قصہ "کامروپ" کے نام سے شائع کیا تھا۔ یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ مشہور جرمن شاعر گیٹے نے اس نظم کو ترجمہ کراکے سُنا اور اُس سے بہت محظوظ ہوا۔

ملا قطبی اُنھوں نے سنہ ۱۰۲۶ھ میں تحفۃ النصائح کا ترجمہ زبان فارسی سے دکھنی میں کیا۔ یہ کتاب شیخ یوسف دہلوی نے سنہ ۷۹۵ھ میں اپنے بیٹے کی تعلیم کے واسطے تصنیف کی تھی۔ یہ ۷۸۶ بند کا ایک قصیدہ ہے جسے ملا قطبی نے اُسی بحر اور اُسی ردیف و قافیہ میں ترجمہ کیا ہے۔

جنیدی اِن کی نسبت کچھ اور معلوم نہیں سوائے اس کے کہ وہ ایک مثنوی ماہ پیکر کے مؤلف ہیں جس کا سنہ تصنیف سنہ ۱۰۶۴ھ ہے۔

طبعی گولکنڈہ کے رہنے والے سلطان عبداللہ قطب شاہ کے معاصر تھے۔ ان کی ایک مثنوی "بہرام و گل اندام" ہے جس کا مضمون ہفت پیکر نظامی سے ماخوذ ہے سنہ تصنیف سنہ ۱۰۸۱ھ ہے۔ دیباچہ شاہ راجو حسینی کے نام سے ہے جو گولکنڈہ کے ایک بہت بڑے بزرگ اور اولیا اللہ سے تھے اور خاتمہ پر ابوالحسن تانا شاہ کی تعریف ہے۔ یہ تقریباً تیرہ چودہ سو شعر کی مثنوی ہے۔

ابوالحسن قطب شاہ سنہ ۱۶۷۲ء لغایت سنہ ۱۶۸۷ء متوفی سنہ ۱۷۰۴ء ابوالحسن قطب شاہ مشہور بہ تانا شاہ گولکنڈہ کا سب سے آخری تاجدار نہایت عیش پسند اور نازک دماغ تھا یہ خود بھی نہایت قابل اور قابلوں کا قدردان تھا۔ ایک شعر تذکرہ گلشن ہند میں اُسکی طرف منسوب ہے۔ یہ عبداللہ قطب شاہ کا داماد تھا اور اُسکی وفات پر تخت نشین ہوا جب گولکنڈہ سات ماہ کے محاصرہ کے بعد سنہ ۱۶۸۷ء میں فتح ہو گیا اور سلطنت مغلیہ کا ایک صوبہ قرار پایا تو ابوالحسن قید کر لیا گیا اور اُسکی باقی عمر قید میں گزری۔ مشہور ہے کہ اُس کو حقہ کا بہت شوق تھا۔ چنانچہ اُس نے حقہ پینے کی اجازت قید خانہ میں بھی طلب کی تھی۔

شعرائے ذیل ابوالحسن تاناشاہ کے زمانہ میں یا اُن کے دربار کے شاعر تھے ۔

نوری — سید شجاع الدین نوری گجرات کے معزز خاندان سادات سے تھے وہ سلطان ابوالحسن تاناشاہ کے وزیر کے بیٹے کو پڑھاتے تھے ۔ میرحسن نے اپنے تذکرہ میں اُن کا ذکر کیا ہے ۔ اِن کو اُن ملّا نوری سے نہ ملانا چاہیئے جو فیضی کے دوست تھے اور جن کا ایک شعر قائم نے اپنے تذکرہ میں نقل کیا ہے ۔ گارسن ڈیٹاسی اور سر چارلس لائل نے نام کے التباس کی وجہ سے دھوکہ کھایا ہے اور دونوں کو ایک سمجھا ہے ۔

فائز — یہ گولکنڈہ کے رہنے والے تاناشاہ کے عہد کے شاعر تھے ۱۰۹۴ھ میں انھوں نے قصۂ رضوان شاہ و روح افزا کا ترجمہ نثر فارسی سے نظم دکنی میں کیا یہ مثنوی قصۂ رضوان شاہ کے نام سے مشہور ہے مگر کتب خانۂ آصفیہ میں مثنوی روح افزا کے نام سے ہے

شاہی — شاہ قلی خاں نام اور بھاگ نگر (موجودہ حیدرآباد دکن) کے رہنے والے تھے شاہی ملازمت کرتے تھے رفتہ رفتہ تاناشاہ کے ندیم خاص ہوگئے ۔ شمالی ہند کی بھی سیر کی تھی تذکرۂ میرحسن میں اِن کا ذِکر ہے ۔

مرزا — ابوالقاسم متخلص بمرزا حیدرآباد کے رہنے والے تاناشاہ کے مصاحب تھے ۔ تاناشاہ کے انتزاع سلطنت کے بعد یہ فقیر ہوگئے اور حیدرآباد میں بقیہ عمر بسر کی اور وہیں انتقال کیا ۔ تذکرۂ میرحسن میں اِن کا ذکر ہے ۔

عادل شاہیوں کا زمانہ ۸۹۵ھ لغایت ۱۰۹۷ھ — سلطنت عادل شاہی کی بنیاد پڑنے سے مدتوں پیشتر بیجاپور میں اُردو زبان عام ہوگئی تھی امیر غریب ادنےٰ اعلیٰ

سب اسی زبان میں بات چیت کرتے تھے سلاطین بہمنیہ نے یہاں کے شاہی دفتر کو بھی اسی زبان میں کر دیا تھا۔ لیکن یوسف عادل شاہ اور اس کے فرزند اسمٰعیل عادل شاہ نے اپنے زمانہ میں شاہی دفتر کو فارسی میں منتقل کر دیا۔ کم و بیش پچاس سال فارسی عروج پر رہی ابراہیم عادل شاہ اول نے جب تاج و تخت حاصل کیا تو اس نے حسب سابق فارسی کے عوض شاہی دفاتر میں زبان اُردو کو رواج دیا اور یہ زبان سلطنت کی زبان قرار پائی۔ مورخ خافی خاں نے بھی اس واقعہ کو بیان کیا ہے۔ علی عادل شاہ اول نے اپنے زمانے میں فارسی زبان کو مروج کیا لیکن جب ابراہیم عادل شاہ ثانی حکمراں ہوا تو شاہی دفاتر میں پھر اُردو زبان جاری ہو گئی اور سلطنت عادل شاہیہ کی تباہی تک برابر جاری رہی۔

ابراہیم عادل شاہ ثانی
۱۵۸۰ء لغایت ۱۶۲۶ء

مثل بادشاہان گولکنڈہ کے سلاطین بیجاپور بھی نہایت تعلیم یافتہ روشن خیال علم دوست بادشاہ تھے چنانچہ ابراہیم عادل شاہ کو بھی شعر و شاعری اور فن تعمیر سے بڑا شوق تھا۔ فارسی کا مستند شاعر ظہوری جو سنہ ۱۵۸۰ء میں ہندوستان آیا اور ۱۶۱۶ء میں وفات پائی اسی دربار کا بڑا مشہور شاعر تھا۔ ظہوری کی دو کتابیں "خوان خلیل" اور "گلزار ابراہیم" اسی ابراہیم عادل شاہ کے نام پر ہیں اور اسکی تین مشہور فارسی نثریں جو سہ نثر ظہوری کے نام سے مشہور ہیں ابراہیم عادل شاہ کی تصنیف نورس کا دیباچہ ہیں جو ہندی نظم میں فن موسیقی کی ایک مشہور کتاب ہے۔ میر سنجر اور ملک قمی بھی اسی دربار کے بڑے شاعر تھے۔ سید شمس اللہ صاحب قادری لکھتے ہیں "ابراہیم عادل شاہ کو

موسیقی میں بے حد مہارت حاصل تھی۔ خاص کر سرود ہندی میں ایسا کمال پیدا کیا تھا کہ اُس عہد کے تمام گوییّے اُسے جگت گرو کہا کرتے تھے۔ اُس نے علم موسیقی میں (دھرپد) ایک کتاب لکھی تھی جس میں سرود ہندی کے قواعد و ضوابط قلمبند کئے تھے اور اُس کا نام نورس نامہ رکھا تھا۔ یہ کتاب نظم دکھنی میں ہے۔ ملا ظہوری نے اس پر دیباچہ لکھا تھا جو اس وقت سہ نثر ظہوری کے نام سے مشہور ہے۔"

مصنف گل رعنا رقمطراز ہیں "کہ موسیقی کا شوق ایسا بڑھا کہ اطراف ہندوستان سے بلا کر تین چار ہزار گوییّے بیجاپور میں جمع کئے اور سنہ ۱۰۰۸ھ میں بیجاپور کے قریب نورسپور کے نام سے ایک بڑا شہر آباد کیا جس میں گروا اور چیلیوں کے لئے بڑی بڑی محلسرائیں بن کر طیار ہو گئیں۔ شاہی محلسرا کا نام نورس محل۔ شاہی مُہر پر نورسی سکہ پر نورس علم و نشان کے نام نورسی۔ بعض شاعروں نے اپنا تخلص بدل کر نورسی قرار دیا۔"

علی عادل شاہ ثانی
۱۶۵۶ء لغایت ۱۶۷۲ء

اس بادشاہ کے دربار میں بھی مشہور شاعر اور ادیب جمع تھے۔ ملک کا امن و سکون شیواجی مشہور سردار مرہٹہ کے متواتر حملوں سے درہم برہم ہو گیا تھا۔ شیواجی نے اکثر قلعے فتح کر لئے اور افضل خاں کو جو بیجاپور کا سردار تھا قتل کر دیا۔ اسی علی عادل شاہ کے زمانہ کا مشہور شاعر نصرتی جس کا نام محمد نصرت اور فرمانروائے کرناٹک کا رشتہ دار تھا۔ کرناٹک سے بیجاپور آیا جہاں علی عادل شاہ نے اُس کو عہدۂ منصب داری عطا کیا اور اپنا رفیق اور مصاحب بنایا۔ علی عادل شاہ ثانی کو دکھنی سے نہایت دلچسپی تھی اور وہ دکھنی شعرا کی نہایت قدر کرتا تھا بقول خافی خاں

"بادشاہے بود باہوش سپاہ دوست و در سخاوت و شجاعت و وسعت خلق مشہور در حق شاعران ہندی زیادہ مراعات می فرمود۔ در عہد او ترجمۂ یوسف زلیخا تالیف ملا جامی و ترجمۂ روضۃ الشہدا و قصۂ منوہر و مدمالت کہ عاقل خان خوانی بہ نظم در آوردہ ملا نصرتی و دیگر شاعران بیجاپور بہ زبان دکنی تالیف نمودہ از نقد و جنس صلہ وافر در خور سلاطین یافتند۔" اس عہد کے مشہور شعرا یہ ہیں۔ رستمی۔ نصرتی شاہ ملک۔ امین۔ سیوا۔ مومن۔ ہاشم۔ مرزا۔

رستمی رستمی کا نام کمال خاں ولد اسمعیل خاں۔ دربار بیجاپور سے اس کا تعلق تھا۔ رستمی نے خدیجۂ سلطانہ شہربانو بیگم کی فرمایش سے ۱۰۵۹ھ میں خاور نامہ کا فارسی سے نظم دکنی میں ترجمہ کیا۔ خاور نامہ میں جناب امیر علیہ السلام کے محاربات مذکور ہیں اور فردوسی کے شاہنامہ کے طرز پر لکھا ہے۔ شہربانو بیگم کا عقد سلطان محمد بن ابراہیم عادل شاہ کے ساتھ ہوا تھا۔

نصرتی اس کے حالات تحقیق سے معلوم نہیں ہیں بقول سید شمس اللہ قادری "نصرتی کا نام شیخ نصرت اور وطن بیجاپور ہے۔ ان کے آبا و اجداد بیجاپور میں فوجی ملازم اور والد رکاب شاہی کے سلح دار تھے چنانچہ خود نصرتی نے اس کا ذکر کیا ہے۔ نصرتی کے بھائی شیخ منصور ایک اہل دل اور خدا رسیدہ بزرگ تھے بیجاپور کے مشاہیر فقرا میں اُن کا شمار ہوتا ہے گلشن عشق کے دیباچے سے ظاہر ہوتا ہے کہ نصرتی نے محمد عادل شاہ کے زمانہ میں دربار میں رسائی حاصل کی اور علی عادل شاہ کے دَور میں عروج پایا اور ملک الشعرا کا خطاب حاصل کیا۔"[1]

[1] ماخوذ از اُردوئے قدیم ۱۲

عبدالجبار خاں ملکاپوری نے اپنے تذکرہ شعرائے دکن میں نصرتی کا اس طرح ذکر کیا ہے "نصرتی تخلص، محمد نصرت نام دکنی المولد ہے۔ حاکم کرناٹک کے قرابت داروں سے تھا۔ آپ کی گذر اوقات توکل و قناعت پر تھی۔ مدت تک کرناٹک میں رہا۔ پھر سیر کرتا ہوا بیجاپور میں آیا سنہ ۱۰۶۶ عیسوی میں دکنی زبان میں علی نامہ لکھا۔ اس پر ملک الشعرائی کا خطاب عطا ہوا ۱۰۹۵ھ میں فوت ہوا۔ نصرتی سنی المذہب تھا۔ بندہ نواز گیسو دراز کے خاندان کا مرید و معتقد تھا جیسا کہ شعر سے عیاں ہے"۔ یہ نہیں معلوم کہ مؤلف تذکرہ شعرائے دکن نے یہ مواد کہاں سے فراہم کیا۔ نصرتی کی تصنیفات حسب ذیل ہیں :-

مثنویاں

(۱) علی نامہ ۱۰۷۶ھ مطابق ۱۶۶۵ء میں نصرتی نے ایک طویل مثنوی لکھی جسکا نام علی نامہ ہے جس میں اپنے محسن علی عادل شاہ کے اکثر واقعات نظم کئے ہیں۔ اس میں علی عادل شاہ کے سوانحات و فتوحات اور مجالس عیش و طرب کے واقعات کا بھی ذکر ہے۔ ان کے ضمن میں مختلف مواقع پر قصائد مدحیہ بھی درج ہیں اس کتاب کو زبان دکنی میں سب سے پہلی کتاب سمجھنا چاہیئے جو ایک بادشاہ کی تعریف میں بصورت قصیدہ لکھی گئی۔

(۲) گلشن عشق۔ دوسری مثنوی کا نام گلشن عشق ہے اور یہ ۱۰۶۸ھ ہجری مطابق ۱۶۵۷ء میں تحریر ہوئی تھی۔ اس میں ایک شخص مسمی بہ کنور منوہر پسر سورج بھان اور مدھ مالتی کے عشق کا ذکر ہے۔ اس قصہ کو مختلف لوگوں نے مختلف انداز سے لکھا ہے۔ عاقل خاں رازی نے اسی قصہ کو فارسی میں نظم کیا ہے اور

شمع و پروانہ اُس کا نام رکھا ہے۔ یہ مثنوی اپنی رنگین تشبیہوں اور استعارات کے لحاظ سے آپ اپنی نظیر ہے۔ گلشن عشق کے اشعار بعض تو نہایت صاف ہیں اور بعض نہایت ادق۔ کہیں عربی و فارسی کی آمیزش نظر آتی ہے تو کہیں بھاشا کی بھتات ہے۔ اس کے دیباچہ میں حسب معمول اپنے محسن علی عادل شاہ کی تعریف کی ہے۔

(۳) گلدستۂ عشق مصنفہ ۱۰۶۸ء لغایت ۱۰۷۱ء

بقول سید شمس اللہ صاحب قادری یہ تیسری مثنوی ہے مگر بقول ڈیٹاسی یہ عاشقانہ غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ہے۔ نصرتی کا ایک قصائد کا مجموعہ اور ایک غزلیات کا دیوان ہے۔ مؤلف گل رعنا نے نصرتی کا معراج نامہ بھی دیکھا ہے یہ بزمانہ محمد عادل شاہ لکھا گیا تھا ایک سو کتنیس شعر اس میں ہیں۔ بحر ایسی ہے جو فارسی اور ہندی میں مشترک ہے ابراہیم زبیری نے نصرتی کے کلام کی بڑی تعریف کی ہے اور اُن کی مضمون آفرینی زور طبع اور اوج تخیل کو خاقانی کے ہم پایہ قرار دیا ہے۔ سر چارلس لائل کا خیال ہے کہ یہ برہمن تھے مگر یہ صحیح نہیں ہے۔

ہاشمی

سید میراں نام اور بیجاپوران کا وطن تھا۔ ہاشمی تخلص تھا۔ سید شاہ ہاشم علوی کے مرید تھے اور اسی مناسبت سے ہاشمی تخلص کرتے تھے۔ ہاشمی مادر زاد اندھے تھے مگر نہایت طباع اور ذہین آدمی تھے۔ ہندی اشعار مزے کے کہتے تھے۔ اپنے مرشد کی فرمائش سے یوسف زلیخا نام ایک مثنوی دکنی میں لکھی اور یہ سنہ ۱۰۹۹ھ میں تمام ہوئی۔ اسمیں چھ ہزار سے زیادہ ابیات ہیں اور دکنی لٹریچر میں ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ شمس اللہ صاحب لکھتے ہیں کہ ہاشمی نے

اپنا دیوان بھی مرتب کیا تھا جسمیں قصائد و غزلیات کے علاوہ مرثیے اور قطعات اور رباعیات بھی تھے۔ یہ مجموعہ اسوقت نایاب ہے لیکن جن لوگوں نے اسے دیکھا ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ اس میں جسقدر غزلیات ہیں اُن کا بیشتر حصّہ ریختہ کے بجائے ریختی میں ہے" قدیم بھاشا کا رنگ اُن کے کلام میں بہت ہے اکثر جگہ صنعت ایہام سے کام لیتے ہیں اور ہندی شاعری کی متابعت میں عورت کا عشق مرد کے ساتھ ظاہر کرتے ہیں۔ ہاشمی نے بقول قادری ۱۱۰۹ھ میں انتقال کیا۔

دولت — یہ بھی ایک دکنی شاعر ہیں۔ انھوں نے ۱۰۴۶ء میں ایک قصّہ موسوم بہ شاہ بہرام و بانوے حُسن تصنیف کیا۔ جس میں بہرام گور اور ایک پری موسوم بہ بانوے حُسن کے عشق کا ذِکر ہے اور شہر دیو سپید میں بہرام گور کو جو عجیب واقعات پیش آئے تھے اُن کا بھی ذکر ہے۔

شاہ ملک — ان کا ذکر اُردوے قدیم میں ہے۔ شاہ ملک بیجاپور کے باشندے اور علی عادل شاہ کے معاصر تھے اُنھوں نے ایک رسالہ احکام الصلوۃ کے نام سے نظم دکنی میں لکھا ہے اور اُس میں نماز کے فرائض و احکام بیان کیے ہیں یہ رسالہ کسی فارسی کتاب کا ترجمہ ہے اور ۱۰۸۰ھ میں تمام ہوا۔

شاہ امین — شیخ امین الدین اعلی کا تخلص ہے۔ آپ بیجاپور کے اولیاے کبار سے ہیں اور علی عادل شاہ کے زمانہ میں تھے۔ ۱۰۸۵ھ میں آپ کا انتقال ہوا آپ پر شب و روز محویت و استغراق کی کیفیت طاری رہتی تھی اور اسی حالت میں آپ نظم ارشاد فرماتے تھے۔ مریدوں نے ان کے عرفان حقایق کو جمع کیا اور

اس مجموعہ کا نام جواہر الاسرار رکھا۔ دو رسالے ان سے اور یادگار ہیں۔ رسالۂ قربیہ۔ رسالۂ وجودیہ۔

دکن میں مرثیہ کی ابتدا

مرثیہ نویسوں میں سب سے پہلے شیخ شجاع الدین نوری بیجاپوری تھے۔ یہ اکبری دور کے شاعر تھے۔ آگرہ گئے اور ایک زمانہ تک ابوالفضل و فیضی کا ساتھ رہا۔ ان کے بعد اور بھی مشہور مرثیہ گو گذرے جن کا ذکر ایک دوسرے باب میں ہوگا۔ یہاں پر صرف اُن کے نام لکھے جاتے ہیں۔ ہاشم علی برہان پوری۔ قطب شاہی دور کے کاظم علی۔ رام راو دسیوا۔ سیوا نے روضۃ الشہدا و قانون اسلام لکھیں۔

شعرائے دکن مغلوں کے عہد حکومت میں

بیجاپور و گولکنڈہ کو مغل بادشاہوں نے فتح کر لیا اور ان سلطنتوں کا خاتمہ ہوگیا۔ لیکن شعرائے اُردو کی قدر و مراعات میں کوئی فرق نہیں ہوا۔ زبان اُردو کے عام ہونے کی وجہ سے تمام ملک میں اُردو شعر و شاعری پھیل گئی۔ اس زمانہ کے مشہور اُردو شعرا ذیل میں درج ہیں۔

عاجز

محمد علی تخلص عاجز۔ اورنگ زیب کی فتوحات دکن کے زمانہ میں موجود تھے۔ ان کی تصنیفات سے قصۂ فیروز شاہ ہے جو اُردو میں محبوب القلوب کا ترجمہ ہے دوسری تصنیف قصۂ لال و گوہر ہے اسمیں لال زمرد بادشاہ بنگال کے فرزند اور گوہر جواہر شاہ بنگال کی دختر کے عشق و محبت کا افسانہ مذکور ہے قصۂ ملکۂ مصر بھی عاجز نے فارسی سے دکھنی میں نظم کیا۔ عاجز کا ذکر مشرح طور پر اُردوئے قدیم و تاریخ شعرائے دکن میں درج ہے۔

بحری — قاضی محمود متخلص بہ بحری ولد بحرالدین دکن کے ایک صوفی مشرب بزرگ تھے ۱۰۹۵ھ کے قریب اپنے وطن سے بیجاپور چلے گئے اور وہاں سکندر عادل شاہ کے دربار میں دو سال رہے اور جب ۱۰۹۷ھ میں سلطنت تباہ ہوگئی تو حیدرآباد چلے آئے۔ فارسی اور دکنی زبانوں میں مثنویات۔ غزلیات۔ رباعیات اور قصائد لکھے جن کے اشعار کی تعداد پچاس ہزار کے قریب تھی مگر یہ سب ذخیرہ راستہ میں تلف ہوگیا۔ آپ کی تصنیف "من لگن" تصوف میں ایک مثنوی ہے اور یہ بزبان دکنی ۱۱۱۲ھ ہجری میں تمام ہوئی۔ زبان اسکی مشکل اور الفاظ سخت ہیں۔

امین — شیخ محمد امین متخلص بہ امین عہد اورنگ زیب میں گزرے۔ انھوں نے یوسف زلیخا کے فسانہ کو دکنی میں ۱۱۰۹ھ میں منظوم کیا۔

ولی دکھنی — سید محمد فیاض نام۔ ملا محمد باقر آگاہ نے مراۃ الجنان کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ ویلوران کا وطن تھا۔ عالمگیر کے زمانہ میں گذرے ہیں۔ دکن میں سات گڑھ ایک تاریخی مقام ہے وہاں حراست خاں نام ایک امیر رہتا تھا۔ ولی عرصہ تک اسکی رفاقت میں رہے پھر وہاں سے نکل کر کڑپہ میں چلے آئے۔ یہ واقعات ولی نے "رتن پدم" کے دیباچے میں بیان کیے ہیں اسکو ولی نے سدھوٹ میں لکھا تھا۔ یہ مثنوی ضخیم ہے۔ دوسری تصنیف "روضۃ الشہدا" ہے اسمیں کربلا کے واقعات منظوم کیے ہیں اور یہ ۱۱۱۹ھ میں لکھی گئی تھی۔ ان کے علاوہ ایک مناجات بھی لکھی[۱] ہے۔

وجدی — بقول نصیرالدین ہاشمی مؤلف اُردوے دکن " اس تخلص سے کے

[۱] ماخوذ از اُردوے قدیم ۱۲

دکن میں دو شاعر ہوے ہیں ایک وجدی سلطان محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں تھا جس نے تحفۂ عاشقاں ۱۰۱۵ھ میں لکھی اور دوسرے وجدی جنھوں نے بارھویں صدی میں کئی ایک مثنویاں لکھیں اُس میں سے ایک پنچھی نامہ ہے جو شیخ فریدالدین عطار کے منطق الطیر کا ترجمہ ہے۔ جس کو وجدی نے ۱۱۵۵ھ میں ترتیب دیا۔ بقول مؤلف اُردوے قدیم مثنوی تحفۂ عاشقاں شیخ فریدالدین عطار کی مثنوی گل و ہُرمز کا ترجمہ ہے جو خسرو نامہ یا خسرو و گل بھی کہلاتی ہے یہ مثنوی ۱۱۵۳ھ میں ختم ہوئی اور خاتمہ میں اسکی تعریف اس طرح مذکور ہے۔

دسے اسکی تاریخ مجھکوں عیاں	پچھانو اسے تحفۂ عاشقاں ۱۱۵۳

غالباً مؤلف اُردوے قدیم کا قول صحیح معلوم ہوتا ہے اِن سے ایک اور ضخیم مثنوی یادگار ہے۔ اُس کا نام مثنوی باغ جانفزا ہے ۱۱۴۵ھ میں تصنیف ہوئی اور "باغ جانفزا" سے اسکی تاریخ نکالی ہے[1]

آزاد فقیراللہ متخلص بہ آزاد حیدرآباد کے باشندے اور ولی اورنگ آبادی کے معاصر تھے اِن کا ذکر تذکرۂ شعرا میر حسن و نکات الشعرا میں درج ہے۔

شعراے اورنگ آباد اورنگ زیب جب دکن کا صوبہ دار مقرر ہوا تو اُس نے کھرکی کو اپنا صدر مقام قرار دیا اور اُس کا نام اورنگ آباد رکھا۔ اس کے بعد اورنگ زیب کی عمر کا بیشتر حصہ اسی شہر میں بسر ہوا اور ایک عرصہ تک یہ شہر سلطنت مغلیہ کا مرکز رہا۔ اس تقریب سے ہندوستان اور دہلی کے بڑے بڑے امرا و علما و مشائخین جن کو شاہی دربار سے کسی قسم کا بھی واسطہ تھا اورنگ آباد

[1] ماخوذ از اُردوے قدیم ۱۲

چلے آئے اور حیدرآباد و بیجاپور کی تباہی کے بعد یہاں کے باشندے بھی اورنگ آباد کی جانب متوجہ ہوے۔ اس دور میں بہت سے شاعر گزرے جن کے حالات سید عبدالولی عزلت کی بیاض۔ لچھمی نرائن شفیق کے چمنستان شعرا۔ میر بہاءالدین عروج کے بہار و خزاں اور محمد افضل کے تحفۃ الشعراء و تذکرۂ موسوی خاں میں تحریر ہیں۔ میر حسن نے بھی اپنے تذکرہ میں لکھا ہے۔

ولی ۱۶۶۸ء عیسوی لغایت ۱۷۴۴ء

ولی کو اُردو شاعری کے ساتھ وہی نسبت ہے جو چاسر کو انگریزی کے ساتھ اور رودکی کو فارسی شاعری کے ساتھ ہے۔ یہی وہ بزرگ ہستی ہیں جن سے موجودہ اُردو شاعری کی بنیاد پڑی۔ آزاد مرحوم کے دعوے کے مطابق اب تک سب کا یہی خیال تھا کہ سب سے پہلے اُردو میں دیوان جمع کرنے والے ولی ہیں۔ مگر جب سے کہ قطب شاہیوں کے دواوین دستیاب ہوگئے اُس وقت سے اس خیال کی تردید ہوگئی مگر اس واقعہ سے ولی کے کمال میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اُردو شاعری کو ان کی وجہ سے جو تقویت پہونچی وہ کبھی زائل نہیں ہوسکتی۔ اِن کو اِن کے معاصرین اور مابعد کے قریب العہد شعرا مثلاً شاہ حاتم وغیرہ سب نے اُستاد مانا ہے اور اُن کے کلام کی بڑی قدر کی ہے۔

نام کے متعلق اختلاف

ولی کے نام میں اختلاف ہے۔ بعضوں کے نزدیک اُن کا نام شمس الدین اور تخلص ولی ہے اور بعض محمد ولی نام۔ شمس الدین لقب اور ولی تخلص بتاتے ہیں۔ میر حسن دہلوی۔ مرزا علی لطف و نساخ و بلوم ہارٹ کے نزدیک شاہ ولی اللہ نام ہے۔ اور نواب علی ابراہیم اور یوسف علی و آزاد شمس ولی اللہ

کہتے ہیں۔ ہمارے نزدیک اس اختلاف کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اسی عہد میں شمس ولی اللہ نام ایک صوفی احمد آباد میں رہتے تھے جن کے توافق نام کی وجہ سے یہ خلط ملط واقع ہوگیا۔

مقام پیدائش اور خاندان کے متعلق اختلاف + بک

گارسن ڈیٹاسی۔ بلوم ہارٹ۔ اور میر حسن کا یہ خیال ہے کہ ولی احمد آباد میں پیدا ہوئے مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ اُن کی ولادت اورنگ آباد میں ۱۰۸۰ھ مطابق ۱۶۶۸ء میں ہوئی جسکی تصدیق میر تقی میر کے تذکرۂ نکات الشعرا سے بھی ہوتی ہے ولی کا تعلق خاندانی شاہ وجیہ الدین علوی کے ساتھ صحیح نہیں معلوم ہوتا بلکہ وہ اورنگ آباد کے شیوخ قادریہ میں سے تھے۔ البتہ وہ شاہ وجیہ الدین کے خاندان میں بعیت رکھتے تھے۔ کیونکہ جو قصائد اور ترجیع بند وغیرہ اُنھوں نے ان بزرگ کی شان میں لکھے ہیں اُن سے اُن کے حسن عقیدت کا اظہار ہوتا ہے مگر شجرۂ اولاد شاہ وجیہ الدین علوی میں اُن کا نام کہیں نہیں پایا جاتا اُن کے کلام سے پایا جاتا ہے کہ وہ گجراتی نہ تھے بلکہ دکنی تھے اور دکنی الفاظ بھی بہ کثرت استعمال کیے ہیں۔ جو لوگ اُن کے گجراتی ہونے کے مدعی ہیں وہ اپنے دعوے کی تائید میں اُن کا ایک قصیدہ پیش کرتے ہیں جس میں اُنھوں نے گجرات سے مفارقت پر اظہار ملال کیا ہے مگر ہماری رائے میں یہ کافی ثبوت اس امر کا نہیں ہوسکتا کہ گجرات اُنکا مولد و مسکن تھا۔ اسی طرح اُس مثنوی سے بھی جو شہر سورت کی تعریف میں لکھی ہے اُن کا گجراتی الاصل ہونا پایا نہیں جاتا۔

حالات زندگی

اورنگ آباد میں پیدا ہوے جہاں بیس برس تک تحصیل علوم

کرتے رہے بعدازاں احمد آباد گئے جو اُس زمانہ میں علوم و فنون کا مرکز تھا۔ اور شاہ وجیہ الدین علوی کے مدرسہ میں جہاں لوگ مختلف مقامات دور و دراز سے تحصیل علوم کے لیے آتے تھے داخل ہوے اور تھوڑے عرصہ کے بعد اس خاندان کے مُرید ہو گئے۔ کچھ دنوں بعد اپنے وطن آکر شعر و شاعری شروع کی اور اُس میں اُنھیں پورا انہماک ہو گیا۔ ان کا کلام تقریبًا سب اصناف سخن میں موجود ہے۔ یعنی غزل، قصیدہ، مثنوی، مستزاد، رباعیات، ترجیع بند وغیرہ۔ پھر احمد آباد گئے۔ جہاں اُنھوں نے اپنے احباب کو اپنا کلام سُنایا اور اُنھوں نے اُس کو بہت پسند کیا۔

دلی کے دو سفر تذکروں میں ہے کہ ولی دو مرتبہ دلّی آئے ایک مرتبہ شہنشاہ اورنگ زیب کے عہد یعنی ۱۷۰۰ء میں۔ اس مرتبہ شاہ سعد اللہ گلشن سے ملاقات ہوئی جنھوں نے فرمایا کہ "یہ سب مضامین جو بیکار فارسی میں بھرے پڑے ہیں ان کو زبان ریختہ میں کام میں لاؤ تم سے کون محاسبہ کریگا" اس واقعہ سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ولی میاں گلشن کے شاگرد ہوے تھے۔ البتہ اُن سے عقیدت رکھتے تھے اور مذاق تصوف بھی انھیں کی صحبت میں حاصل کیا تھا۔ دوسری مرتبہ سید ابوالمعالی کے ساتھ سفر کیا جسمیں دلّی اور سرہند کے مزارات کی زیارت کی۔ سید ابوالمعالی سے ان کو کمال محبت تھی جو درجۂ عشق کو پہونچ گئی تھی۔ ولی کا یہ دوسرا سفر محمد شاہ کے عہد سلطنت میں ۱۱۳۴ھ مطابق ۱۷۲۲ء میں ہوا اس سفر میں ولی اپنے ساتھ اپنا دیوان ریختہ لائے تھے جسکی نہایت قدردانی کی گئی اور جو بہت مقبول اور ہر دلعزیز ہوا۔ اور یہاں تک اُسکی شہرت ہوئی کہ

امرا کی محفلوں اور جلسوں اور کوچہ و بازار میں اُسکے اشعار لوگوں کی زبان پر تھے اُن کے اشعار کو سُن کر لوگوں کو شعر گوئی کا شوق پیدا ہو گیا۔

دہ مجلس — ۱۱۲۱ھ میں دلّی سے اورنگ آباد واپس آئے جہاں شہدائے کربلا کی شان میں ایک مثنوی موسوم بہ دہ مجلس تصنیف کی جسکے اِن دو آخری شعروں سے اُس کا سنہ تصنیف اور اُس کی زبان کا حال معلوم ہو جاتا ہے :-

ہوا ہے ختم جب یو درد کا حال	تھا گیارہ سو پہ اکتالیسواں سال
کہا ہاتف نے یو تاریخ معقول	ولی کا ہے سخن حق پاس مقبول

اس مثنوی کو فضلی نے نثر کے قالب میں ڈھالا۔ جو اصل کتاب سے بھی زیادہ مقبول ہے۔ صاحب گلشن ہند لکھتے ہیں کہ ولی کا ایک ہندی دیوان بھی ہے مولانا آزاد اور مصنف گل رعنا کا بیان ہے کہ ولی نے دیوان کے علاوہ تصوف میں بھی ایک رسالہ نور المعرفت لکھا ہے لیکن وہ ناپید ہو گیا ہے۔

وفات — ولی کو گجرات سے ایسی دلچسپی ہو گئی تھی کہ اورنگ آباد میں کچھ دنوں رہ کر پھر احمد آباد چلے گئے جہاں بقول تذکرہ شعرائے دکن ۱۱۵۵ھ مطابق ۱۷۴۲ء میں انتقال کیا اور وہیں مدفون ہوئے۔

ولی کے بہت سے دوست تھے جن سے ان کو خاص محبت اور خلوص تھا مثلاً لالہ کھیم داس اورنگ آبادی۔ امرت لال۔ گوہر لال۔ اور محمد یار خاں دہلوی وغیرہ۔ ان سب کا ذکر مناسب مقام پر اُن کے اشعار میں موجود ہے وہ گو کہ حنفی المذہب تھے جیسا کہ صحابہ کبار کی تعریف سے ظاہر ہے جو اُن کے اشعار میں موجود ہے مگر ساتھ ہی کسی مذہب و ملت سے اُن کو کوئی تعصّب تھا

کیونکہ وہ ایک صوفی منش فقیر مشرب شخص تھے۔ انھوں نے بہت سیر و سیاحت کی تھی اور اکثر مقامات دور و دراز کو دیکھا تھا۔ بنگال میں اُن کا جانا پایۂ ثبوت کو نہیں پہونچتا۔ مگر گارسن ڈیتاسی اُن کے کسی شعر سے جس میں حسن بنگالہ کی تعریف ہے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ وہ بنگال بھی گئے تھے البتہ ستارا۔ دلّی۔ اور سورت کا سفر یقینی ہے اس وجہ سے کہ ان تمام مقامات کی تعریف اُن کے اشعار میں موجود ہے مثلاً سورت کی تعریف میں ایک مثنوی میں کہتے ہیں :۔

عجب شہروں میں ہے پر نور اک شہر	بلا شک ہے وہ جگ میں مقصد دہر
کہ ہے مشہور اس کا نام سورت	کہ جاوے جسکے دیکھے سب کدورت
بھری ہے سیرت و صورت سوں سورت	ہر اک صورت ہے واں انمول صورت

دلّی نے کسی امیر یا بادشاہ کی تعریف میں اشعار نہیں کہے مگر فارسی کے تتبع میں اپنی شان میں اکثر فخریہ اشعار کہے ہیں جن میں جا بجا معاصرین پر چوٹیں ہیں۔

کلام پر رائے — اُن کی تصانیف بہ اعتبار قدامت اور نیز بہ اعتبار زبان بہت دلچسپ ہیں عبارت آسان اور سہل ہے۔ شعرائے مابعد نے اِن کا تتبع کیا ہے اور انھیں کی شاعری سے شمالی ہند میں شعر کی بنیاد مضبوط ہوئی۔ سادگی سلاست اور ترنم اِن کے کلام کے جوہر ہیں۔ اشعار میں روانی بے تکلفی اور آمد ہے اور صنائع بدائع بکثرت نہیں ہیں۔ بعض شعر تو ایسے صاف ہیں کہ بالکل زمانۂ حال کے معلوم ہوتے ہیں مثلاً :۔

دل چھوڑ کے یار کیونکہ جاوے	زخمی ہے شکار کیونکہ جاوے
دشمن دیں کا دین دشمن ہے	راہزن کا چراغ رہزن ہے

آغوش میں آنے کی کہاں تاب ہے اُسکو
کرتی ہے نگہ جس قدِ نازک پہ گرانی

عجب کچھ لطف رکھتا ہے شب خلوت میں دلبر سے
سوال آہستہ آہستہ جواب آہستہ آہستہ

گناہوں کی سیہ نامی سے کیا غم اُس پریشاں کو
جسے وہ زلف دستاویز ہو روز قیامت میں

خوبرو خوب کام کرتے ہیں
اک نگہ میں غلام کرتے ہیں

دِل ہوا ہے مرا خراب سخن
دیکھکر حسن بے حجاب سخن

بزم معنی میں سرخوشی ہے اُسے
جس کو ہے نشۂ شراب سخن

راہ مضمون تازہ بند نہیں
تا قیامت کھلا ہے باب سخن

گوہر اُسکی نظر میں جا نہ کرے
جس نے دیکھا ہے آب و تاب سخن

ہے سخن جگ منے عدیم المثل
جز سخن نہیں دوجا جواب سخن

شعر فہموں کی دیکھ کر گرمی
دِل ہوا ہے مرا کباب سخن

عرفی و انوری و خاقانی
مجھکو دیتے ہیں سب حساب سخن

اے وَلی دردِ سر کبھو نہ رہے
جب ملے صندل و گلاب سخن

داؤد مرزا داؤد نام داؤد تخلص وطن اورنگ آباد ولی کے معاصر تھے اور ۱۱۶۸؁ء میں انتقال کیا۔ ایک چھوٹا سا دیوان اِن سے یادگار ہے۔

سراج سید سراج الدین نام آپ سادات حسینی خاندان مشائخ سے تھے اورنگ آباد کے رہنے والے تھے اور وہیں تربیت و تعلیم پائی۔ غالباً آپ ۱۱۲۷؁ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ نے اپنا حال منتخب دداوین کے دیباچے میں لکھا ہے[1]

[1] ماخوذ از اردوے قدیم ۱۲

اس منتخب کا تاریخی نام "منتخب دیوانہا" سنہ ۱۱۶۹ ہجری ہے۔ سراج نے اس میں متقدمین و معاصرین شعراء کے فارسی کلام کا انتخاب کیا ہے۔ مجموعہ ضخیم ہے اور اسمیں کئی ہزار اشعار ہیں۔ دواوین فارسی کا اس طور پر انتخاب کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نقاد سخن تھے۔ سراج خود لکھتے ہیں "یہ فقیر بارہ برس کی عمر میں جوش جذبہ و غلبۂ شوق سے سات برس تک برہنہ تن و برہنہ سر رہا۔ اکثر اوقات عالم بیخودی میں حضرت شاہ برہان الدین غریب دولت آبادی کے روضہ کے اطراف میں گھومتا تھا۔ اسی حالت مستی میں اکثر اشعار فارسی زبان سے برآمد ہوتے۔ مگر تحریر کے دائرہ میں نہیں آئے اگر وہ تمام اشعار موجود ہوتے تو ایک ضخیم و بزرگ دیوان مرتب ہوجاتا۔ پھر مدت مذکورہ کے بعد حضرت خواجہ سید شاہ عبدالرحمٰن چشتی المتوفی سنہ ۱۱۶۱ھ کی خدمت میں پہونچا۔ حسن ارادت سے مرید ہوا۔ اُن دنوں میں بپاس خاطر عزیزی عبدالرسول خاں جو فقیر کے برادر طریقت تھے اکثر اشعار ریختہ زبان میں لکھے گئے خاں صاحب نے جواہر متفرق کو جو تخمیناً پانچ ہزار اشعار تھے حرف تہجی میں ترتیب دیا اور کامل دیوان شائقین کی خدمت میں بھیجا۔ پھر فقیری اختیار کی اور مرشد کے حکم سے شعر گوئی ترک کی"۔ سراج ایک درویش منش پاکباز بزرگ تھے۔ مسافر دوست و غریب نواز۔ گوشہ نشین و پاکیزہ دل۔ ہفتہ میں ایک روز محفل سماع منعقد فرماتے تھے اُسمیں شہر کے اکثر عمائد و مشائخ جمع ہوتے تھے قوال دگویے آپ کی غزلیں سناتے تھے۔ مجلس میں آپکا وہ رعب وداب تھا کہ اہل مجلس باادب عالم سکوت میں ہوتے تھے۔ اُس وقت دکن میں آپ کے معاصرین میں سے میر غلام علی آزاد بلگرامی۔ عبدالوہاب افتخار

دولت آبادی۔ ظفر بیگ ظفر اورنگ آبادی۔ محمد نقیہ دردمند۔ مرزا محمد باقر شہید۔
و جان مرزا رسا۔ موسوی خاں جرأت اورنگ آبادی و عبدالقادر سامی اورنگ آبادی
عارف الدین خاں عاجز موسوی خان فطرت۔ خانی خاں۔ لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی
اور میر اولاد محمد ذکا بلگرامی وغیرہ شعرا و علما و مشائخ تھے خوب مشاعرے ہوتے تھے اور سراج
باوجود گوشہ نشینی مشاعروں میں شریک ہوتے اور کبھی کبھی اصرار سے شعر کہتے۔

میر نے نکات الشعرا میں اور حسن نے اپنے تذکرہ میں تحریر کیا ہے کہ سراج کو
سید حمزہ دکنی سے تلمذ حاصل تھا۔ مگر دکن میں کسی شاعر کا نام سید حمزہ یا سید حمزہ علی
نہیں تھا۔ گمان غالب یہ ہے کہ سراج نے کسی کی شاگردی نہیں کی۔ سراج نے
ایک دیوان فارسی کا اور ایک ریختہ کا جس میں پانچ ہزار اشعار ہیں اپنی یادگار چھوڑے
منتخب دیوانہا کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ ایک مثنوی بوستان خیال بھی لکھی جس میں
ایک ہزار سات ابیات ہیں اور گل و بلبل کے افسانے میں جذبات معرفت کی
ترجمانی کی ہے۔ یہ مثنوی ۱۱۶۰ھ ہجری میں تمام ہوئی۔

آپ کا کلام بھی ولی کی طرح ایہام و ذومعانی الفاظ سے پاک و صاف
ہے۔ سیدھا سادہ بیان ہے تکلف و بناوٹ کا نشان نہیں۔ اکثر غزلوں
میں حُسن و عشق کے کرشمے۔ بعض اشعار میں توحید و معرفت کا نقشہ مضامین میں
شگفتگی خیالات میں بلندی اور پھر کلام میں صفائی اور سادگی موجود ہے۔
ریختہ گوئی میں ولی کے قائم مقام تھے۔ دکن میں اُستادی کے رتبہ کو پہونچے ولی نے
اس زمین میں جو کچھ پودے جمائے تھے اور جو کچھ سبزے لگائے تھے سراج نے
اُن کو اپنی توجہ کے پانی سے سیراب و شاداب کیا۔ آپ نے چوتھی شوال

یوم جمعہ ۱۱۷۷ھ میں انتقال فرمایا۔ یہ غزل سراج کی بہت مشہور ہے۔

خبر تحیرِ عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بے خبری رہی

شہِ بیخودی نے عطا کیا مجھے اب لباس برہنگی
نہ خرد کی بخیہ گری رہی نہ جنوں کی پردہ دری رہی

چلی سمت غیب سے اک ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا
مگر ایک شاخ نہال غم جسے دل کہیں سو ہری رہی

نظر تغافلِ یار کا گلہ کس زباں سیں بیاں کروں
کہ شراب صد قدح آرزو خم دل میں تھی سو بھری رہی

وہ عجب گھڑی تھی کہ جس گھڑی لیا درس نسخۂ عشق کا
کہ کتاب عقل کی طاق پر جیوں دھری تھی یونہی دھری رہی

ترے جوش حیرت حُسن کا اثر اسقدر سیں عیاں ہوا
کہ نہ آئینہ میں جِلا رہی نہ پری کی جلوہ گری رہی

کیا خاک آتش عشق نے دل بینوائے سراج کوں
نہ خطر رہا نہ حذر رہا مگر ایک بے خطری رہی

دیگر شعرا اس دور کے

اِس دور میں بہت سے شاعر گذرے ہیں۔ جن کا ذکر بوجہ طوالت نظر انداز کیا جاتا ہے۔ ان کے نام و حالات تذکرۂ لچھمی نرائن و تذکرۂ موسوی خاں و نکات الشعرا میر۔ تذکرہ شعرائے اُردو میر حسن۔ تذکرہ شعرائے دکن مؤلفۂ عبدالجبار خاں ملکاپوری۔ "دکن میں اُردو" مؤلفۂ نصیر الدین ہاشمی سے

معلوم ہو سکتے ہیں بعض مشہور شعرا اس زمانہ کے حسب ذیل ہیں :- عارف الدین عاجز - سید عبدالولی عزلت - یار - محرم - آیما - داغ - رنگین - مہدی - عزیز - صارم - مہر - پناہ - رضا - عراقی - مہتاب - شرافت - شہید - ضیا - کاظم - مبتلا - نجم - ہمدم - درد - حشمت - حاجی - قادر - فخر - فتوت - قدر - ان میں عزلت اور عاجز زیادہ مشہور و نامآور ہیں اور جو حالات کہ مصنف گل رعنا نے ان شعرا کے درج کیے ہیں وہ زیادہ تر تذکرۂ شعرائے دکن سے ماخوذ ہیں -

احاطۂ مدراس و ارکاٹ کے شعرا

مولوی محمد باقر متخلص بہ آگاہ ویلور میں پیدا ہوئے اور انھوں نے اردو زبان میں سیر، عقاید، فقہ کی متعدد کتابیں لکھیں ۱۱۸۵ھ سے انھوں نے تصنیف کا کام شروع کیا ۱۲۲۰ھ میں انتقال فرمایا۔ ان کے بزرگان سلف وطناً بیجاپوری تھے مؤلف شمع انجمن لکھتے ہیں کہ "در خیابان کرناٹک ہیچو او نہالے سر بالا نکردہ و از گل زمین مدراس مثل او گل خوش رنگ نہ دمیدہ" اردو تصنیفات کی فہرست حسب ذیل ہے۔ ہشت بہشت - تحفۃ الاحباب - تحفۃ النساء - فرائد در عقائد - ریاض الجنان - محبوب القلوب - روضۃ السلام - گلزار عشق - قصہ رضوان شاہ - روح افزا - خمسہ متحیرہ - مثنوی روپ سنگار - ارکاٹ کے دربار کے مدار المہام شرف الملک مولانا محمد غوث - اور ان کے خلف مولانا قاضی بدر الدولہ نے بھی کئی کتابیں اردو میں لکھیں۔ اس وقت کے شعرا کے نام ذیل میں رقم ہیں - محمود - صبائی - احمد - اعظم [1]

---

[1] ماخوذ از اردوئے قدیم ۱۲

باب ۵

اساتذۂ دہلی

حصّہ اوّل۔ طبقۂ متقدمین

حاتم و آبرو کا زمانہ

دلّی میں اُردو زبان کی ابتدا و ترقی۔

اُردو زبان دکن میں نویں صدی سے پہلے ادبی صورت حاصل کر چکی تھی اور اُس میں اُس زمانہ سے تصنیف و تالیف کا آغاز ہو گیا تھا۔ برخلاف اسکے جہانتک معلوم ہوا ہندوستان میں بارھویں صدی کے آغاز تک یہ زبان محض بات چیت اور لین دین تک محدود رہی۔ مولانا جمالی جو شہنشاہ بابر کے معاصر تھے اور ۹۴۲ھ ہجری میں فوت ہوئے۔ ملا نوری جو اعظم پور کے باشندے تھے اور اکبر کے زمانہ میں گذرے مُلا فیضی سے نہایت اتحاد رکھتے تھے اُن کا ذکر میر حسن نے اپنے تذکرہ میں کیا ہے اور شیخ سعدی نے اگرچہ ایسے اشعار کہے ہیں جو آدھے فارسی اور آدھے اُردو ہیں لیکن یہ باقاعدہ اور علمی شاعری نہ تھی۔ بابر۔ اکبر و جہانگیر۔ شاہ جہاں اور اورنگ زیب کی اور اُن کے عہد کی تحریرات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ہندوؤں کی زبان پر عربی و فارسی کے الفاظ چڑھ رہے تھے اور اسی طرح

مسلمانوں کی زبانیں بھی ملکی زبانوں کے زیر اثر تھیں۔اس کے نمونے اُردوے قدیم اور تذکرۂ گل رعنا میں موجود ہیں۔شاہ جہاں کا اُردو میں شقہ لکھنا اور اورنگ زیب کا اپنے رقعات میں اردو الفاظ استعمال کرنا اس بات کی بیّن دلیل ہے کہ اُردو زبان اس زمانہ میں ملک کی عام زبان ہوگئی تھی۔بازار سے شاہی محلات تک خاص و عام اس کو بولتے اور سمجھتے تھے[1]

عالمگیر کے زمانہ سے دلی میں اُردو شعرگوئی نے رواج پایا اور اس جانب سب سے پہلے فارسی شعرا نے توجہ کی۔موسوی خاں فطرت۔مرزا عبدالقادر بیدل۔مرزا عبدالغنی قبول وغیرہ فارسی کے نامور شاعر تھے لیکن تفریح خاطر کے لئے اُردو میں بھی دو چار شعر کہہ لیا کرتے تھے۔محمد شاہ کے عہد سے پہلے لوگ خانہ جنگیوں میں مبتلا اور مرہٹوں کے حملوں سے پریشان تھے۔محمد شاہ کے زمانہ میں سادات کی قوت ٹوٹ جانے پر کچھ عافیت نصیب ہوئی اُس وقت اِدھر اُدھر سے سمٹ کر دلی میں سب لوگ مجتمع ہوگئے۔محمد شاہ کی رنگیلی طبیعت نے رنگ دکھایا۔قزلباش خاں اُمید۔سلیمان قلی خاں وداد۔علی قلی خاں ندیم شیخ سعداللہ گلشن۔مرتضیٰ قلی خاں فراق۔میر شمس الدین فقیر۔مرزا عبدالقادر بیدل سراج الدین علی خاں آرزو ایسے بڑے بڑے صاحب فضل و کمال دِلّی میں جمع تھے۔شمس ولی اللہ دکن سے آگئے۔فراقی۔فخری۔آرزو وغیرہ بھی دکن سے آئے۔ولی کچھ دنوں کو رہ گئے اور اُن کا رنگ دلی میں خوب چمکا ہر طرف سے قدردانی کیگئی۔جو شعرا صرف فارسی میں اظہار کمال کرتے تھے اُنکو اُردو میں بھی

[1] اُردوے قدیم ۱۲

شعر کہنے کا شوق ہوا۔ اُمید۔ بیدل۔ فراق۔ آرزو نے اُردو میں طبع آزمائی کی اور یہ زبان دلی سے اُردوے معلّی کا خطاب پاکر ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئی۔[1]

اُردو لغات کی ترتیب

قریب قریب عالمگیر کے زمانہ میں اہل ہندوستان کو اُردو لغات کی ترتیب و تدوین کا خیال پیدا ہوا۔ ملا عبدالواسع ہانسوی نے (جنکی قواعد فارسی اور گلستاں بوستاں کی شرحیں نہایت مشہور ہیں) عالمگیر کے زمانہ میں اُردو و ہندی الفاظ کا ایک لغت مدون کیا اور اُس کا نام "غرائب اللغات" رکھا اُردو الفاظ کے معنی فارسی میں لکھے۔ ایک عرصہ کے بعد سراج الدین علیخاں آرزو نے اس کی نظر ثانی کی۔ بہت سے الفاظ اور معنی اضافہ کیے۔ غلطیاں درست کیں اور اُسے "نوادر الالفاظ" کے نام سے موسوم کیا[2]۔

دلّی کے پُرانے شاعر

جو شاہراہ ولی نے دکھلائی تھی اُس کے پیرو دہلی میں بہت پیدا ہو گئے۔ آبرو۔ حاتم۔ ناجی۔ مضمون۔ مرزا مظہر جان جاناں کو جو ولی کے ہمعصر تھے اور فارسی میں خوب کہتے تھے، ریختہ کا آباے قدیم سمجھنا چاہیے یہی وہ بزرگ ہستیاں ہیں جن کی آغوش تربیت میں نونہال اُردو نے پرورش پائی اس مبارک عہد میں زبان نے بہت کچھ پختگی حاصل کی شاعری کے واسطے کوئی خاص طرز ابتک مقرر نہیں ہوا تھا اور نہ اغراض شاعری کے واسطے کوئی خاص مناسبت زبان میں پیدا ہوئی تھی۔ بہت سے سخت اور بھدے دکنی لفظ و

زبان کے ساتھ اُن کی خدمات

محاورات جو دیوان ولی کی بدولت زبان میں داخل ہو گئے تھے چھانٹنا اور نکالنا پڑے۔ اِسی وجہ سے ان حضرات کی خدمات

---

[1] گل رعنا ۱۲ [2] اُردوے قدیم ۱۲

تصفیۂ زبان کے متعلق بہت لائق تحسین ہیں۔ اُنھوں نے یہ مشکل کام بہت حسن و خوبی اور بڑی محنت و جانفشانی سے انجام دیا اسی لئے اُن کی قابلیت اور خوش مذاقی کی داد دینا چاہیئے۔ یہ سچ ہے کہ بھاشا الفاظ کی خوبصورتی اُن کی نظر میں نہ جچی ورنہ اپنے ملک کے دیسی الفاظ کے بدلے غیر ملکی الفاظ کم لیے جاتے مگر اس میں شک نہیں کہ ان لوگوں نے اس کاٹ چھانٹ اور متروکات کے خارج کرنے میں بڑی قابلیت اور دقّت نظر سے کام لیا۔ اور بھدے ناتراشیدہ محاورات اور تراکیب کی جگہ خوشنما محاورے اور دلکش ترکیبیں داخل کیں جو کہ عموماً فارسی سے لی گئیں کیونکہ اسی کے وہ مشتاق تھے۔ زبان میں چونکہ لوچ اور قوت جذب پہلے ہی سے موجود تھی اس لیے یہ سب جدید تصرفات اُس نے آسانی سے قبول کر لئے ۔

صنعت ایہام ولی کے معاصرین صنعت ایہام کے بہت شائق تھے جسکا ذکر پیشتر کیا گیا یہ صنعت بھاشا کی شاعری میں بہت مقبول ہوئی اور دوہروں کی جان ہے قدما کے کلام میں ایسے ذو معنی اشعار بہ کثرت ہوتے ہیں یہ محمد شاہی دور کی خصوصیت ہے۔ شاہ مبارک آبرو۔ یک رنگ۔ شاکر ناجی و شاہ حاتم وغیرہ نے اس رنگ کو خوب برتا اور اُس کو اپنا مستقل فن بنا لیا تھا۔ مگر شاہ عالم کے زمانہ میں اس میں ترمیم و اصلاح ہوئی اور مظہر۔ سودا۔ میر۔ قائم نے اس کا رواج بہت کم کر دیا اور میر درد۔ فقیر دہلوی اور میر حسن کے عہد میں یہ رنگ قریب قریب خارج ہو گیا میر فرماتے ہیں ؎

کیا جانے دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر میر کے	کچھ طرز ایسی بھی نہیں ایہام بھی نہیں

سودا فرماتے ہیں ؎

یکرنگ ہوں آتی نہیں خوش مجھکو دورنگی	منکر سخن و شعر میں ایہام کا ہوں میں

قائم چاند پوری ؎

ہو وے دم زدم مراکیوں نہ خوش کہ وہ بت چیں	یہ کہہ گیا ہے کہ آؤنگا آج میں سرِ شام
بطور ہزل ہے قائم یہ گفتگو ورنہ	تلاش ہے یہ مجھے ہو نہ شعر میں ایہام

تصوف ایک دوسری خصوصیت اُس زمانے کی یہ تھی کہ شاعری پر تصوف کا رنگ بہت غالب تھا۔ یہ رنگ اُس زمانے میں عالمگیر تھا۔ وجہ یہ تھی کہ شعرا اکثر صوفی مشرب ہوتے۔ یا کم از کم آخر عمر میں ہو جایا کرتے تھے پیری مریدی کا بازار گرم تھا۔ فارسی شاعری متاخرین کے کلام میں تصوف میں ڈوبی ہوئی تھی اور اُردو شاعری اُسی کی ناقل تھی۔ دکن میں شاعری کی ابتدا مذہب سے ہوئی اور تصوف شاعری کا جزو اعظم تھا۔ انھیں اسباب سے اُردو شاعری پر بھی تصوف کا رنگ اچھا خاصہ چڑھ گیا۔

سپاہی پیشہ شعرا اس زمانہ کے شعرا اکثر سپاہی پیشہ ہوتے اس وجہ سے کہ زمانہ بہت پر آشوب تھا۔ بیرونی حملوں کی کثرت۔ ملک میں بدامنی سلطنت کی کمزوری۔ ان سب وجوہ سے کسی کا جان و مال محفوظ نہ تھا۔ اور پھر سپہگری کا پیشہ نہایت عزت اور منفعت کا پیشہ خیال کیا جاتا تھا۔

کلام میں یکرنگی کی کمی اور سبک و مبتذل الفاظ ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس عہد کے اکثر شعرا کا کلام یکرنگ نہیں مثلاً کسی غزل کو لیجئے تو اُس کے بعض شعر تو بہت اچھے ہوں گے۔ مگر بعض شعر نہایت معمولی اور اعلیٰ مذاق سے گرے ہوئے

اس زمانہ میں معمولی اور سوقیانہ الفاظ لکھنے میں مطلق عار نہ تھا جسکی وجہ شاید یہ ہو کہ ریختہ اُس وقت تک تفنن طبع اور تبدیل ذائقہ کے طور پر لکھی جاتی تھی نہ کہ اُس میں مزاولت اور مشق مدنظر تھی۔ اسی نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو آبرو۔ حاتم۔ ناجی مظہر کے یہاں عمدہ کلام کے ساتھ ساتھ بہت سے اشعار ایسے بھی ملیں گے جو ذوق صحیح اور طبع سلیم پر ناگوار ہیں۔ میر اور سودا نے بھی کبھی کبھی ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں خاص کر جہاں شیخ اور زاہد وغیرہ کا خاکہ اُڑایا گیا ہے۔ جواب کسی مہذب صحبت میں شاید ہی استعمال کیئے جائیں۔

اس عہد کے شعرا کا طرز بیان اور اُن کے کلام کی خامیاں

نظم ابھی پختگی اور کمال کے درجہ پر نہیں پہونچی تھی۔ قواعد عروض کی پابندی بھی مشکل سے ہوتی تھی۔ قافیہ ایسی ضروری چیز اور ردیف تک کے قواعد پوری طرح برتے نہیں جاتے تھے۔ اشعار کی بندش ڈھیلی۔ زوائد کی کثرت جن سے آجکل ہمارے کانوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ البتہ زبان میں سادگی اور شیرینی غضب کی ہے۔

عربی و فارسی الفاظ و خیالات کا داخلہ اور سنسکرت و بھاشا و قدیم دکنی الفاظ کا اخراج

اس دور میں سنسکرت و بھاشا و قدیم دکنی الفاظ کا اخراج ہوا جو کہ میر و سودا کے زمانہ میں جاری رہا اور شیخ ناسخ کے عہد تک جسکی تکمیل ہوئی۔ مورخین اِن کو مصلحین زبان کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ بہت سے بھونڈے الفاظ خارج کردیے گئے مگر اُس کے ساتھ ہی بھاشا کے بہت سے شیریں۔ خوبصورت اور خوش آہنگ الفاظ بھی نکال دیے گئے عربی و فارسی کے مترادف قبول کیے گئے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ عربی و فارسی

الفاظ میں صحت کا خیال ہونے لگا قدیم محاورات والفاظ جو دلی کے زمانے میں مستعمل تھے اُن میں تغیرات پیدا ہونا شروع ہوے اور جدید محاورے بنانے کی کوشش کی گئی تاریخ شعراے اُردو میں درج ہے کہ "ترک استعمال الفاظ مکروہ کا اور نہ پروا کرنا باریک باتوں کا یعنی جائز رکھنا قافیہ سین اور صاد کا اُس کے کلام سے دریافت ہوتا ہے، نہ صرف اُسی کے کلام میں بلکہ اُس کے ہم عہدوں کے کلام میں اُس سے زیادہ ہے۔ شاہ حاتم نے اس طرف توجہ کی اور بہت سے الفاظ کی اصلاح کی جیسا کہ اُن کے "دیوان زادہ" کے دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے۔"

شاہ مبارک آبرو متوفی ۱۷۵۰ء

شاہ نجم الدین دہلوی عرف شاہ مبارک متخلص بہ آبرو محمد شاہ کے زمانہ میں تھے۔ پیدائش کی تاریخ معلوم نہیں مشہور صوفی شیخ محمد غوث گوالیاری کی اولاد میں تھے۔ گوالیار میں پیدا ہوے اور بچپن ہی میں دہلی آئے جہاں شعر کہنا سیکھا۔ سراج الدین علی خاں آرزو کے رشتہ دار تھے اور انھیں سے مشورہ سخن کرتے تھے صاحب دیوان ہیں مگر افسوس کہ دیوان زمانہ غدر میں تلف ہو گیا اور اب نایاب ہے۔ ایک مثنوی موسوم بہ "آرائش معشوق" بھی لکھی ہے۔ تھوڑے عرصہ تک نارنول میں بھی رہے۔ نہایت خلیق اور متواضع آدمی تھے۔ ایک آنکھ کی بینائی جاتی رہی تھی جسکی وجہ سے مرزا جان جاناں مظہر سے اکثر چشمک چلتی تھی۔ شاہ آبرو ایک شخص میر مکھن خلف شاہ کمال الدین بخاری سے جو خود بھی شاعر تھے بہت محبت رکھتے تھے جس کا حوالہ اکثر اُن کے شعروں میں ہے۔ اکثر تذکرہ نویس مثلاً میر حسن مصحفی شیفتہ علی-

اور لطف وغیرہ اُن کے مداح ہیں اور اُن کے کلام کی تعریفوں سے اُن کی آبرو بڑھاتے ہیں۔ شاہ آبرو متقدمین شعرائیں ہیں اور استعارات وایہام کے بادشاہ ہیں۔ اِسی وجہ سے کبھی کبھی کلام سبک اور مبتذل ہو جاتا ہے۔ گو وسعت معلومات محدود ہے مگر درسیات سے فارغ معلوم ہوتے ہیں سنہ ۱۱۶۱ھ مطابق سنہ ۱۷۴۸ع میں پچاس برس کی عمر سے متجاوز ہو کر وفات پائی۔

خان آرزو ۱۶۸۹ع تا ۱۷۵۶ع

سراج الدین علی خان متخلص بہ آرزو معروف بہ خان آرزو۔ شیخ حسام الدین حسام کے صاحبزادے ہندوستان کے مشہور شعرا اور ناقدان فن میں سے تھے۔ میر تقی میر کا قول ہے کہ "ان کے زمانہ میں ان سے بڑھ کر کوئی محقق اور شاعر شیریں زبان نہ تھا" میر حسن ان کو امیر خسرو دہلوی کے بعد سب سے بڑا شاعر ہندوستان کا خیال کرتے ہیں۔ لطف بھی ان پر اپنی مرح سرائی سے لطف کرتے ہیں اور فتح علی ان کو اُن کے نام کی مناسبت سے "چراغ محفل فصاحت" کے معزز لقب سے یاد کرتے ہیں۔ مولانا آزاد انکی نسبت لکھتے ہیں کہ ان کو زبان اُردو کے ساتھ وہی مناسبت ہے جو ارسطو کو فلسفہ کے ساتھ ہے۔ میر تقی میر ان کا ذکر نہایت ادب سے کرتے ہیں اور اپنا اور اُس زمانہ کے شعرا کا جگت استاد مانتے ہیں۔ خان آرزو اُردو اور فارسی دونوں کے اُستاد تھے۔ گو اُردو کم کہتے تھے مگر اُن کے استاذ الاساتذہ ہونے میں کسی کو کیا کلام ہو سکتا ہے اس وجہ سے کہ میر۔ سودا۔ مظہر۔ درد۔ ایسے قادر الکلام اُن کو اُستاد مانتے تھے۔ آگرہ کے رہنے والے شاہ محمد غوث گوالیاری کی اولاد میں سے تھے شعر کہنا ابتدائے عمر میں شروع کیا۔ اور مختلف علوم وفنون میں بصیرت کاملہ

حاصل کی۔ جوانی میں بمقام گوالیار منصبدار مقرر ہوئے۔ مگر فرخ سیر کے عہد میں ۱۱۳۰ھ میں دہلی واپس آئے۔ ۱۱۴۷ھ مطابق ۱۷۳۴ء میں شیخ علی حزیں ایران سے ہندوستان آئے جہاں اُن کے کمال کی بے انتہا شہرت ہوئی ہر شخص ایسے صاحب کمال سے ملنے کا مشتاق تھا۔ مگر آرزو کو کمال فن اور استغنا اسکی اجازت نہ دیتا تھا۔ اتفاقاً کسی موقع پر ان دونوں باکمالوں کا سامنا ہوگیا۔ شیخ کی متکبرانہ باتیں اُن کو بُری معلوم ہوئیں جس سے متاثر ہوکر انھوں نے شیخ کے کلام پر اعتراض وارد کرنا شروع کئے اور اُن کو ایک رسالہ مسمی بہ تنبیہ الغافلین[۱] کی صورت میں شائع کیا۔ نادر شاہ کے حملۂ دہلی اور تباہی شہر کے بعد نواب سالار جنگ کے مشورہ سے وطن چھوڑ کر لکھنؤ آئے جہاں ۱۱۶۹ھ مطابق ۱۷۵۶ء میں انتقال کیا۔ مگر لاش کو حسب وصیت نواب موصوف دہلی لے گئے اور وہیں پیوند زمین کیا۔ خان آرزو بڑے صاحب کمال اور شاعر شیریں مقال تھے۔ انکی قابلیت طباعی، ذہانت، قوت اختراع، فصاحت و بلاغت سب کو مسلم ہے۔ تصانیف بہ کثرت ہیں منجملہ اُن کے کتب ذیل موجود ہیں ایک فارسی دیوان تقریباً تیس ہزار شعر کا۔ شرح سکندرنامہ و قصائد عرفی۔ و گلستان سعدی۔ لغت فارسی موسوم بہ "سراج اللغات"، لُغت اُردو موسوم بہ "غرائب اللغات" جو صطلاحات صوفیہ کی ایک لغت مسمّٰی بہ نوادر الالفاظ کی شرح ہے۔

رسائل "موہبت عظمیٰ" اور "عطیۂ کبریٰ" فن بلاغت و معانی و بیان ہیں۔ تذکرۂ "مجمع النفائس" جس کو تذکرۂ آرزو بھی کہتے ہیں جس میں اُن ہندوستانی اور

---

[۱] اسی نام کا ایک رسالہ سودا کا بھی ہے جسمیں فاخر مکین کا خاکہ اُڑایا گیا ہے۔

دکنی شعرا کا ذکر ہے جنھوں نے بزبان فارسی شعر کہے ہیں۔ انہیں سے میر تقی میر نے
اپنے تذکرہ "نکات الشعرا" میں کچھ نقل کیا ہے۔ تقریبًا پندرہ تصانیف خان آرزو
کی کہی جاتی ہیں۔ مشہور اُستاد تھے۔ اور بعض شاگرد اپنے سے بھی زیادہ نامور
چھوڑ گئے۔ زبان اُردو ایسے محقق کامل اور ناقد فاضل کے احسانات سے کبھی
عہدہ برآ نہیں ہو سکتی۔

شاہ حاتم ۱۶۹۹ء تا ۱۷۹۱ عیسوی

شاہ حاتم مشاہیر قدما میں ہیں۔ ان کو دہلی کے رنگ کا
موجد خیال کرنا چاہیے۔ ریختہ بہ طرز ولی و مضمون و ناجی
و آبرو لکھتے تھے۔ ظہور الدین نام۔ حاتم تخلص۔ شیخ فتح الدین کے بیٹے تھے۔
دہلی میں پیدا ہوئے۔ تاریخ ولادت ۱۱۱۱ھ لفظ ظہور سے نکلتی ہے۔ جو
۱۷ ۔ ۱۶۹۹ء کے مطابق ہے سپاہی پیشہ تھے۔ تھوڑے عرصے تک
نواب امیر خاں صوبہ الہ آباد کی رفاقت میں رہے۔ ۱۷۲۲ء میں جب دیوان
ولی دہلی میں آیا اور اُس کے اشعار کو لوگوں نے بہت پسند کیا تو حاتم نے
بھی طبع آزمائی کی اور ریختہ میں شعر کہنا شروع کیا۔ رفتہ رفتہ کمال کو پہونچ گئے
خواجہ میر درد میر تقی میر اور بعد کو مصحفی کے مشاعروں میں بھی شریک ہوتے
تھے۔ اپنے زمانہ میں ریختہ کے استاد مانے گئے ہیں۔ دو دیوان اُنکی طرف
منسوب ہیں۔ ایک قدیم رنگ میں جسمیں صنعت ایہام بہت ہے اور اکثر کلام فحش
ہے۔ دوسرا جدید رنگ میں۔ پہلے رمز تخلص کرتے تھے۔ عالمگیر ثانی کے زمانے
میں ایک دیوان کلیات سے منتخب کر کے مرتب کیا۔ اُس کا نام دیوان زادہ
رکھا کلیات کی نسبت جو آبرو و ناجی کے طرز میں لکھا تھا تذکرہ قدرت میں

لکھا ہے کہ "فاما زعم شاعری بسیار دارد، دیوان قدیم او از نظر ایں مؤلف گذشتہ بطرز آبرو و ناجی حرف می زند اکثر اشعارش از لطف خالی یافتم"، محمد شاہ بادشاہ کے حکم سے ایک مثنوی حقہ پر لکھی جو زیادہ دلچسپ نہیں۔ ان کے علاوہ ایک دیوان فارسی بھی ہے۔ نہایت متین و مہذب بزرگ تھے اپنے دیوان کے دیباچہ میں ۴۵ شاگردوں کے نام دیے ہیں جسمیں سب سے پہلے مرزا رفیع سودا کا نام نامی ہے یہ ایسے شاگرد تھے جن پر اُستاد کو بھی فخر تھا۔ اور مشہور شاگردوں میں۔ رنگین۔ بشارت۔ تاباں۔ فارغ بھی ہیں شاہ صاحب کے مزاج میں ظرافت اور بذلہ سنجی بہت تھی تصفیۂ زبان کی طرف بھی متوجہ ہوے اور بہت سے غیر مانوس اور غیر فصیح الفاظ ترک کردیے۔ درستی زبان کے لحاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ جو کام ذوق اور آتش و ناسخ کے زمانہ میں ایک سو برس بعد پورا ہوا اُس کی داغ بیل شاہ حاتم نے ڈال دی تھی۔ افسوس ہے اُن کے معاصرین نے اُسکی طرف زیادہ توجہ نہیں کی ورنہ اُسی زمانہ میں بہت کچھ تکمیل ہوجاتی۔ شاہ صاحب اس کے متعلق خود فرماتے ہیں۔ "خوشہ چین خرمن سخنوران عالم بصورت محتاج و بمعنی حاتم کہ از ۱۱۲۹ھ تا ۱۱۶۹ھ کہ چہل سال باشد عمر دریں فن صرف کردہ در شعر فارسی پیرو مرزا صائب و در ریختہ ولی را اُستاد می داند۔ اول کسے کہ دریں فن دیوان ترتیب نمودہ او بود و معاصرین فقیر شاہ مبارک آبرو۔ و شرف الدین مضمون و مرزا جان جانان مظہر۔ و شیخ احسن اللہ احسن۔ و مرزا شاکر ناجی۔ و غلام مصطفےٰ یکرنگ ست۔ و لفظ در و بر و از و الفاظ و افعال دیگر کہ در دیوان قدیم خود تقید دارد۔ دریں ولا

از دہ دوازدہ سال اکثر الفاظ را از نظر انداختہ و الفاظ عربی و فارسی کہ قریب الفہم وکثیر الاستعمال باشد و روزمرۂ دہلی کہ میرزایان ہند و فصیحان رند در محاورہ آرند منظور داردو زبان ہندی بھاکا را موقوف کردہ محض روزمرہ کہ عام فہم و خاص پسند باشد اختیار نمود...... مختصر کہ لفظے غیر فصیح انشاء اللہ نخواہد بود" اس کے پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ درستی اور اصلاح زبان کا خیال سب سے پہلے شاہ حاتم کے دل میں پیدا ہوا تھا۔ کلام صاف عاشقانہ اور کہیں کہیں عارفانہ ہے۔ شعر آپس کی باتیں۔ زبان صاف سلیس۔ البتہ زبان کی ابتدائی حالت ہونے کی وجہ سے اکثر زائد الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ دہلی میں ۱۷۹۱ء یا ۱۷۹۲ء میں انتقال کیا[1]۔ مگر مصحفی کا قول ہے کہ ۸۳ برس کی عمر میں ۱۱۹۶ھ میں فوت ہوئے۔ میر تقی کو شاہ حاتم کے ساتھ حسن عقیدت نہیں ہے۔ اپنے تذکرے میں "مرد جاہل و متمکن" اُن کی نسبت لکھا ہے۔ مگر میر حسن اُن کو صاحب کمال و پسندیدہ افعال۔ عالی فطرت و بلند ہمت کے معزز القاب سے یاد کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اُن کی غزلوں کو نغمہ سرایان ہند محفلوں میں گاتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ شاہ حاتم کا مرتبہ ادب اُردو میں منفرد اور ممتاز ہے وہ سودا اور دوسرے بڑے بڑے شاعروں کے اُستاد تھے۔ اور اصلاح شعر اور درستی زبان میں اُنھوں نے بہت نمایاں حصّہ لیا۔

[1] مصنف خمخانۂ جاوید کی تحقیق کے موافق ۹۶ برس کی عمر میں ۱۲۰۷ہجری میں انتقال کیا ۱۲

میاں مضمون متوفی سنہ ۱۷۴۵ء

شیخ شرف الدین متخلص بہ مضمون حضرت شیخ فرید الدین شکر گنج کی اولاد میں تھے جیسا کہ خود کہتے ہیں ؎

کریں کیوں نہ شکّر لبوں کو مرید	کہ دادا ہمارا ہے بابا فرید

جاجمؤ صوبۂ اکبر آباد کے رہنے والے سپاہی پیشہ تھے پھر تلوار کو قلم سے بدل لیا بچپن میں دلّی گئے اور زینۃ المساجد میں قیام کیا۔ درویشانہ زندگی بسر کرتے تھے مگر بڑے ظریف بامذاق اور بذلہ سنج تھے۔ میر اُن کو "ہنگامہ گرم کن مجلسہا" لکھتے ہیں۔ اپنے زمانہ کے اُستاد فن اور اُسی زمانہ کی روش کے مطابق خوب کہتے تھے۔ ایک دیوان دو سو ابیات کا چھوڑا۔ کلام پاکیزہ اور پر لُطف ہے مگر اکثر جگہ فحش اور استعارات و ایہام وغیرہ سے جو زمانہ کا رنگ ہے مملو ہے۔ گو کہ سن میں آرزو سے بڑے تھے۔ مگر شعر میں اُن سے مشورہ کر لیتے تھے میر اُن کو خوش فکر اور تلاش الفاظ تازہ کا بہت مشاق لکھتے ہیں۔ سودا اور میر حسن بھی اُنکے بہت معترف ہیں۔ خان آرزو اُن کو "شاعر بیدانہ" کہتے تھے۔ اس وجہ سے کہ نزلہ کے سبب سے سب دانت اُن کے گر گئے تھے سنہ ۱۱۵۸ھ مطابق سنہ ۱۷۴۵ء میں انتقال کیا۔

مرزا مظہر جانجاناں سنہ ۱۶۹۸ء تا سنہ ۱۷۸۱ء

شمس الدین نام جانجاناں عرف مظہر تخلص۔ والد کا نام مرزا جان تھا جو عالمگیر کے دربار میں صاحب منصب تھے۔ "نسب اُن کا باپ کی طرف سے محمد بن حنفیہ سے مِلتا ہے۔ ماں بیجاپور کے شریف گھرانے سے تھیں۔ دادا بھی دربار شاہی میں صاحب منصب تھے۔ پردادا سے اکبر شاہ کی بیٹی منسوب ہوئی تھیں۔ ان رشتوں سے تیموری خاندان کے

نواسے تھے۔ صوفی باصفا اور شاعر یکتا تھے۔ کلام میں جسقدر متانت اور تاثیر ہے
اُسی قدر توحید اور روحانیت بھی جلوہ گر ہے۔ مسٹر بیل اور فرانسیسی محقق گارسن
ڈیتاسی کی تحریر کے موافق بمقام آگرہ سنہ ۱۱۰۱ھ مطابق ۱۶۹۰ء میں۔ مگر مولانا
آزاد کی تحقیق کے بموجب سنہ ۱۱۱۳ھ میں بمقام کالا باغ صوبہ مالوہ میں پیدا ہوئے
آپ کے والد ماجد عہد عالمگیری میں منصب دار اور نسباً علوی تھے اور خاندان
شاہی سے بھی دور کا پیوند تھا۔ جب آپ کی عمر سولہ برس کی ہوئی تو سایۂ پدری
سر سے اُٹھ گیا۔ مرزا صاحب کو صوفیائے کرام اور اہل دل کی صحبت کا بچپن سے
شوق تھا شیخ محمد فضل سیالکوٹی سے باقاعدہ حدیث پڑھی اور تیس برس تک مشائخ
نقشبندیہ سے کمال حاصل کیا۔ خود بھی وہ درویش کامل اور صوفی صاحبدل تھے
سیکڑوں ہندو اور مسلمان آپ سے بیعت اور حسن عقیدت رکھتے تھے۔ میر تقی میر
اپنے تذکرہ میں آپ کا ذکر ادب و احترام کے ساتھ کرتے ہیں فرماتے ہیں "مرد یست
مقدس، مطہر، درویش، عالم، صاحب کمال، شہرۂ عالم، بینظیر، معزز، مکرم،
اکثر اوقات در یاد الٰہی صرف می کند خوش تقریر بمرتبہ ایست کہ در تحریر نمی گنجد"
حسن صوری و معنوی دونوں سے عشق کامل رکھتے تھے۔ میر عبدالحی تاباں سے
جو اُس زمانہ کے شہرۂ آفاق حسین و خوب رو شاعر تھے۔ بہت محبت اور اختلاط
تھا۔ عالم متبحر، فقیہ کامل حنفی المذہب اور نقشبندی طریقت تھے۔ عالم باعمل
احکام قرآن کے پیرو۔ اکثر وقت اوراد و وظائف یا دلچسپ علمی گفتگو اور شعر و شاعری
میں صرف کرتے تھے۔ آپ کی تہذیب و متانت و قناعت اور پابندی وضع
ضرب المثل تھی۔ استغنا و بے تعلقی کی حکایات گل رعنا میں درج ہیں محمد شاہ نے

ایک دفعہ کہلا بھیجا کہ ملک میں سے جو حصہ چاہئے قبول فرمائیے۔ انکار کر دیا۔ نواب فیروز جنگ نے گاؤں پیشکش کیے قبول نہ ہوے۔ آصف جاہ نے تین ہزار روپیہ نذر کیا منظور نہ ہوا۔ استغنا کی یہ شان تھی کہ کھانا تک بازار سے منگواتے تھے۔ نذر و نیاز شاید ہی لیتے ہوں علم و فضل اور شعر و شاعری کے ساتھ آپکا اخلاق شگفتہ روئی اور لطافت مزاج بھی مشہور تھی حسن معنی کے ساتھ حسن صورت بھی اللہ تعالیٰ نے بدرجۂ اتم عنایت فرمایا تھا۔ اکثر کرامات بھی آپ کی طرف منسوب کی جاتی ہیں۔

آپ کا کلام زبان اُردو کی تاریخ ارتقا میں ایک خاص درجہ اور اہمیت رکھتا ہے۔ اس وجہ سے کہ آپ نے نہ صرف زبان کو صاف کیا بلکہ اُس میں فارسی کی نئی نئی ترکیبیں اور خیالات پیدا کیے اور قدیم طرز ایہام گوئی کو ترک کیا زبان میں یہ جدید رنگ آپ ہی کا پیدا کیا ہوا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ بہت کم لوگوں نے اسکا اعتراف کیا ہے۔ مصحفی اور شوق اپنے اپنے تذکروں میں اس خدمت کا ضرور اعتراف کرتے ہیں[1]۔ آپ کا کلام نظم و نثر دونوں میں نہایت سادہ

[1] مصحفی اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں "در ابتدائے شوق شعر کہ ہنوز از میر و مرزا کسے در عرصہ نیامدہ بود و زور دور ایہام گویاں بود اول کسیکہ شعر ریختہ بہ تتبع فارسی گفتہ او ست .... در تمام دیوانش فصاحت و بلاغت لے بان آستاد جلوۂ ظہور می دہد فی التحقیقت نقاش اول الہ بان ریختہ باعتقاد فقیر مرزا ست بعدہ تتبعش بدیگراں رسیدہ ۱۲ قدرت اللہ شوق لکھتے ہیں "میگویند اول کسیکہ طرز ایہام گوئی ترک نمودہ در ریختہ را در زبان اردوئے معلی شاہجہان آباد کہ الحال پسند خاطر عوام و خواص وقت گردیدہ و مروج ساختہ زبدۃ العارفین قدوۃ الواصلین واقف رموز جناب اکبر کاشف کنوز طریقہ پیغمبر مرزا جانجاناں متخلص بمظہر مرد بیست فرشتہ صفت" ۱۲ انشاء اللہ خاں دریائے لطافت میں لکھتے ہیں "از بسکہ آوازۂ فصاحت و بلاغت جناب فیضمآب مرزا جانجاناں مظہر علیہ الرحمہ گوش راقم را مقر خود میداشت دل با دیدہ مستعد ستیزہ شد کہ چرا از دیدار مرزا صاحب خود را ایں ہمہ محروم می پسندی و مرا از لذت جاودانی و عیش روحانی کہ در کلام معجز نظام آں حضرت ست باز میداری ۱۲ میر صاحب لکھتے ہیں " دیوان مختصر شعر فارسی او بنظر فقیر مؤلف آمدہ است از سلیم و کلیم پایہ کمی ندارد ۱۲ میر حسن لکھتے ہیں " از فصحائے زماں و بلغائے دوراں ۱۲

سلیس اور فصیح ہوتا ہے اور جیسا ہم اوپر لکھ آئے ہیں جذبات اور تاثیر کے ساتھ
تصوف کے خیالات سے بھی مالا مال ہے۔ اکثر اشعار کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ
مضمون خیالی نہیں بلکہ واردات قلبیہ کا صحیح اور من وعن اظہار ہے۔ ایک دیوان فارسی
ایک ہزار ابیات کا جو ۱۱۷۰ھ میں مرتب کیا اور ایک قدیم دیوان کا انتخاب ہے
جسمیں بیس ہزار شعر تھے۔ ایک ناتمام دیوان اُردو اور ایک بیاض "خریطۂ جواہر"
فارسی شعراء کے منتخب کلام کی آپکی تصانیف سے یادگار رہیں۔ وفات نہایت
افسوسناک طریقہ سے ہوئی۔ اس طرح کہ عشرۂ محرم تھا تعزیے نکل رہے تھے
مرزا صاحب اپنے کوٹھے پر بیٹھے اُن کی سیر کر رہے تھے مشہور ہے کہ اُن کی زبان سے
نکلا۔ کہ بارہ سو برس بعد اس قدر شور وغل اور ماتم کرنا اور کاغذ اور بانس کے
ڈھانچوں کا اسقدر ادب و احترام کرنا خلاف عقل ہے۔ یہ جملہ تعزیہ لیجانے والوں
نے سُن لیا اور برسر پرخاش ہوگئے۔ نویں تاریخ کی رات کو دو آدمی مرزا صاحب
کے مکان پر وارد ہوئے اور آواز دی۔ مرزا صاحب کو کچھ خیال نہوا باہر نکل آئے۔
ایک آدمی نے دیکھتے ہی فوراً قرابین ماری۔ مرزا صاحب زخمی ہوئے اور یہی ہلاکت
کا سبب ہوا۔ یہ واقعہ ۱۱۹۴ھ مطابق ۱۷۸۰ء کا ہے۔ آپ کے شاگردوں میں
انعام اللہ خاں یقین۔ میر محمد باقر حزیں۔ خواجہ احسان اللہ خاں بیان۔ مصطفےٰ خاں
یکرنگ۔ بساون لال بیدار۔ اور محمد نقیہ دردمند مشہور شاعر صاحب دیوان
ہوئے ہیں۔

ناجی سید محمد شاکر نام ناجی تخلص۔ مرد سپاہی پیشہ نواب امیر خاں کے
نعمتخانہ کے داروغہ تھے۔ شاہ آبرو حاتم اور دلی کے معاصر عہد محمد شاہی کے

شعرا میں ہیں جب نادر شاہ نے دلی پر حملہ کیا ہے تو یہ موجود تھے۔ شہر کی تباہی و بربادی اپنی آنکھ سے دیکھی جس کے پُر درد حالات ایک مخمس میں بیان کیے ہیں۔ عنفوان شباب میں انتقال کیا۔ آرزو اُن کے کمال کے قائل اور اپنے برابر بلکہ اپنے سے بہتر سمجھتے ہیں۔ نہایت تیز شوخ طبع ظریف اور ہر شخص کے کلام میں عیب نکالا کرتے تھے۔ میر صاحب کا قول ہے کہ "مزاج میں ہزل بہت تھا۔ اپنے مذاق آمیز کلام سے لوگوں کو ہنساتے اور خود منھ بنائے رہتے"

اِن کا کلام بصورت دیوان موجود ہے اور سلاست زبان اور نزاکت خیالات کی وجہ سے اہل دہلی میں مقبول ہے۔ اشعار میں استعارات وایہام کی کثرت ہے بعض اشعار فحش بھی ہیں جو اُس زمانہ کا رنگ ہے۔

تاباں — میر عبدالحی تاباں تخلص۔ نہایت خوبصورت خوشرو جوان تھے۔ اُن کے غیر معمولی حسن کا شہرہ لوگوں کے زباں زد تھا یوسف ثانی کہلاتے تھے اِن کے حُسن کی تعریف میں شعر کہے جاتے تھے۔ اُسی حُسن کو دوبالا کرنے کے لئے وہ عموماً سیاہ کپڑے پہنتے تھے۔ اُن کے حُسن کا شہرہ یہاں تک پھیلا کہ ایک مرتبہ شاہ عالم اُن کے روئے صبیح کی زیارت کے لئے خود گئے۔ عورتوں کی طرف اِن کو زیادہ توجہ نہ تھی مگر ایک شخص پر جن کا نام شاہ سلیمان تھا عاشق تھے۔ مرزا مظہر جان جاناں کو اِن کے ساتھ ایک خاص محبت اور ارتباط تھا۔ جیسا کہ اُن کے حال میں لکھا گیا ہے۔ اکثر تذکرہ نویسوں کا قول ہے کہ جوانی میں مرے اور موت کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ مئے نوشی کثرت سے کرتے تھے۔ جسکی وجہ سے استسقاء ہو گیا تھا۔ مگر صاحب تذکرہ گلشن ہند کا بیان ہے کہ

اُنھوں نے اُن کو ۱۲۱۰ھ میں لکھنؤ میں دیکھا تھا اور جب بھی وہ نہایت حسین وجمیل تھے۔ فیلن صاحب لکھتے ہیں کہ ۱۷۹۶ء یعنی ۱۲۱۱ھ تک وہ زندہ تھے۔ میر صاحب اپنے تذکرہ میں ان کا ذکر غیر معمولی تعریفوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں "نوجوان بامزہ بود۔ سید نجیب الطرفین۔ مولداو شاہجہاں آباد است بسیار خوش فکر و خوب صورت خوشخلق و پاکیزہ سیرت۔ معشوق عاشق مزاج۔ تاحال در فرقۂ شعرا ہمچو او شاعر خوش ظاہر از کمن بطون عدم بعرصۂ ظہور جلوہ گر نشدہ بود" آگے اُن کی مے نوشی کی نسبت لکھتے ہیں کہ "آخر آخر کہ اوائل جوانی او بود۔ ایں قدر مداومت شراب کردہ کہ ملاقات ہمہ یاراں موقوف شد اکثرے از دوستانش کہ بہ خانۂ اومی رفتند او راست طالع می یافتند" اسی شراب کی کثرت سے دوستوں نے ملنا جلنا چھوڑ دیا تھا۔ اُنھوں نے بھی مجبور ہو کر آخر کار شراب سے کنارہ کشی کی مگر چند ہی دن کے بعد سفر آخرت اختیار کیا۔ ان کا کلام عاشقانہ شیریں و نمکیں ہے۔ خیالات نہایت نازک۔ زبان بہت سلیس۔ شاگردی میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ حاتم اور بعض کے نزدیک محمد علی حشمت سے اصلاح لیتے تھے۔ لطف کا قول ہے کہ سودا کو اپنا کلام دکھلاتے تھے۔ مگر میر صاحب نے اپنے تذکرہ میں حشمت ہی کو اُن کا اُستاد مانا ہے اور یہی صحیح ہے۔

یکرنگ مصطفٰے خاں یکرنگ خان جہاں لودی کے احفاد سے تھے۔ امرائے محمد شاہی میں تھے اور بڑی عزت و آبرو سے زندگی بسر کرتے تھے۔ باکمال سخنوران دہلی میں شمار کئے گئے ہیں۔ کلام بلند اور استعارات سے مملو۔ شاہ مبارک آبرو اور میاں مضمون کے طرز کا ہے بعض لوگ اُن کو شاہ آبرو کا

اور بعض خان آرزو کا شاگرد بتاتے ہیں مگر خود اُن کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا مظہر کے شاگرد تھے۔ ایک دیوان یادگار ہے جو قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے اور عاشقانہ اور عارفانہ دونوں رنگ میں ہے۔ اکثر اشعار کو دنیادار عشق مجازی کا مگر عرفا اُنکو عشقِ حقیقی کا پرتو سمجھتے ہیں۔ تاریخ پیدائش و وفات کا پتہ نہ چلا۔ ایک مرثیہ بھی امام حسین علیہ السلام کی شان میں لکھا ہے جس کے کچھ اشعار میر صاحب نے اپنے تذکرہ میں نقل کیے ہیں۔

فغاں متوفی ۱۷۷۲ء

اشرف علی خان متخلص بہ فغاں خلف مرزا علی خان نکستہ احمد شاہ بادشاہ دہلی کے کوکہ یعنی رضاعی بھائی تھے۔ نہایت ظریف الطبع اور بذلہ سنج تھے۔ اسی وجہ سے ظریف الملک کو کہ خان بہادر کا خطاب دربارِ دہلی سے عنایت ہوا تھا۔ باتوں میں مزاح اور ظرافت بہت تھی پھبتی کہنے کے مشتاق[1] تھے۔ جب احمد شاہ ابدالی نے دہلی کو تباہ کیا تو فغاں مرشد آباد چلے گئے جہاں اُن کے چچا ایرج خاں برسرِ اقتدار تھے۔ مرشد آباد سے نواب شجاع الدولہ بہادر کے پاس فیض آباد آئے۔ اور نواب نے اُن کی بڑی خاطر و مدارات کی۔ چونکہ نازک مزاج واقع ہوے تھے کوئی بات ناگوار گزری یہاں سے پٹنہ چلے گئے (بقول مصحفی، نواب نے جوشِ اختلاط میں گرم پیسے سے ان کا ہاتھ داغ دیا تھا) جہاں مہاراج شتاب رائے نے اُن کی بڑی قدر و منزلت کی۔ یہاں کی صحبت سے بھی دل بھر گیا اور بالآخر گوشہ نشینی اختیار کی ۱۱۸۶ھ مطابق ۱۷۷۲ء میں

---

[1] ۔ میر اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ ایک درباری امیر ناگر مل کو "گھی کی منڈی کا ساٹڈ" اور ایک شخص مسمّی بہ حکیم معصوم کو "گاو گجراتی" کہا کرتے تھے ۱۲

پٹنہ میں انتقال کیا اور وہیں دفن ہوے۔ ایک عمدہ دیوان ریختہ یادگار چھوڑا جسمیں تقریباً دو ہزار اشعار ہونگے۔ میر تقی اور میر حسن کی تحقیق کے بموجب ایک دیوان فارسی کا بھی ہے۔ سودا اور میر دونو باکمال ان کے معرف ہیں۔ سودا نے ان کے بعض اشعار کی تضمین بھی کی ہے۔ میر صاحب ان کو قزلباش خاں امید کا شاگرد بتاتے ہیں۔ مگر مصحفی علی قلی ندیم سے نسبت دیتے ہیں۔ فغاں فارسی اور ہندی کے محاورات خوبی کے ساتھ ایک ساتھ نظم کرتے ہیں۔ کلام نہایت پاکیزہ۔ خیالات نازک اور بلند۔ ایہام گوئی ترک کردی تھی۔ مبتذل اور فحش الفاظ و خیالات سے احتراز تھا۔ کلام میں صفائی اور روانی بہت ہے قطعات مسلسل خوب لکھتے ہیں۔ میر صاحب اُن کو "جوان قابل و ہنگامہ آرا" کہتے ہیں۔ دیوان میں غزلیات۔ قصائد۔ قطعات۔ رباعیاں۔ مخمس سبھی کچھ ہیں۔

باقی اور شعرا

اس عہد میں شاعری کا رواج بہت پھیل گیا تھا۔ اس وجہ سے شعرا بھی کثرت سے پیدا ہوے۔ قدیم تذکروں میں مثلاً میر تقی اور میر حسن کے تذکروں میں چھوٹے بڑے مشہور و غیر مشہور ہر قسم کے شاعروں کے نام اور اُن کے کلام کے نمونے بہ کثرت دیے ہوے ہیں۔ ہم اس مختصر کتاب میں اُن سب کا ذکر بالاستیعاب کرنے سے قاصر ہیں۔ میر محمد حسین کلیم جو دلی کے رہنے والے تھے وہ قابل ذکر ہیں۔ میر حسن کا بیان ہے کہ فصوص کا اُنھوں نے عربی سے اُردو میں ترجمہ کیا تھا اور ایک رسالہ عروض و قافیہ میں بھی لکھا تھا میر صاحب کے رشتہ دار تھے اور صاحب کمال تھے۔

باب ۶

اساتذۂ دہلی

حصۂ دوم طبقۂ متوسطین

میر اور سودا کا زمانہ

اُردو شاعری کا زریں عہد

یہ دَور اُردو شاعری کی سب سے بڑی ترقی کا دور ہے - اسی میں شاعری کو معراج ترقی حاصل ہوئی - اسی میں میر حسن، درد، سودا اور میر ایسے صاحب کمال پیدا ہوے - جن کے نام اس وقت تک روشن ہیں - بلکہ جب تک زبان اُردو دنیا میں رہیگی وہ کبھی نہیں مٹ سکتے - تمام اصناف سخن اس عہد میں انتہائے کمال پر پہونچے - مثنوی میں میر حسن کی مثنوی "سحر البیان" قصیدہ میں سودا کے قصائد غزل میں میر اور درد کی غزلیں اپنا جواب نہیں رکھتیں - یہ کامل اُستاد اپنے فن میں بےنظیر اور بے مثال گزرے ہیں اور اپنا کلام آیندہ نسلوں کے واسطے ایک بے مثل کسوٹی چھوڑ گئے ہیں - یہی وہ بزرگ ہستیاں ہیں جن کا ادب و احترام مرور ایام سے کم نہیں ہو سکتا - تمام اساتذہ مابعد مثلاً ذوق - غالب ناسخ - آتش سب اِن کا لوہا مانتے تھے - اور انکی اُستادی اور قادر الکلامی کے دل سے قائل تھے ؎

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب		ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں
ریختہ کے تمھیں اُستاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانہ میں کوئی میر بھی تھا
کب ہماری فکر سے ہوتا ہے سودا کا جواب
ہاں تتبع کرتے ہیں ناسخ ہم اُس مغفور کا

زبان میں فارسیت کا غلبہ

اس عہد میں فارسیت کا بہت غلبہ تھا۔میر، سودا اور دیگر استادان فن اپنے پیش رو وں کی نقل کرتے رہے۔شاہ حاتم کے ساتھ خواجہ میر درد و میر ضیا، کین نے اپنے کلام سے ہندی کے لفظ نکال ڈالے۔ان تغیرات کی فہرست صفیر بلگرامی نے تذکرۂ جلوۂ خضر کی جلد اول میں درج کی ہے جسکو شعر الہند میں نقل کیا ہے۔مولوی عبدالسلام صاحب لکھتے ہیں کہ "ان اصلاحات کے بعد اُردو شاعری بالکل فارسی کے قالب میں ڈھل گئی اور ہمارے شعرا نے بالکل ایرانی شعر کے طرز میں کہنا شروع کیا چنانچہ میر صاحب فرماتے ہیں۔

تبعیت سے جو فارسی کے میں نے ہندی شعر کہے
سارے ترک بچے ظالم اب پڑھتے ہیں ایران کے بیچ

سودا و میر نے سعدی و حافظ سے استفادہ کیا اور اُنکے اشعار کا ترجمہ بھی کیا۔اس زمانہ میں کچھ لوگوں نے متاخرین شعرائے فارسی ناصر علی۔جلال اسیر، کلیم اور بیدل کے رنگ میں کہنا شروع کیا۔لیکن خوش مذاق شعرا نے طالب آملی اور شفائی وغیرہ کی روش اختیار کی۔ان تصریحات کے علاوہ خود ان شعراء کے کلام کی اندرونی شہادت

سے ثابت ہوتا ہے کہ اُنھوں نے متاخرین شعرأ فارسی کے کلام کو پیش نظر رکھ کر شاعری شروع کی ہے۔ چنانچہ سودا و میر و درد وغیرہ نے اس دور کے متعدد شعرائے فارسی مثل صائب۔ بیدل۔ نظیری۔ عرفی کی غزلوں پر غزلیں لکھیں اور اُن کے عمدہ اشعار کا ترجمہ کیا۔ اور اس دور کے شعرا کے کلام میں فارسی ترکیبوں اور فارسی محاوروں کی ترجمہ کی جو بہتات ہے وہ اسی تقلید و تتبع کا اثر ہے"

سودا نے علی الخصوص ایسی نئی نئی ترکیبیں اور محاورے زبان میں داخل کئے جو مستقل طور پر اُسی کے ہو گئے۔ میر نے بھی خزانۂ فارسی سے زبان کو بہت کچھ مالا مال کیا۔ البتہ میر حسن نے متاع موجودہ پر قناعت کی۔

الفاظ میں تذکیر و تانیث

الفاظ میں تذکیر و تانیث کی پابندی نہ تھی۔ مصنف کی خواہش اور خوشی کے موافق الفاظ مذکر اور مؤنث لکھے جاتے تھے۔ نئی بحریں جو اس سے پیشتر نہیں کہی گئی تھیں اب داخل شعر ہوئیں۔ نئے اصناف سخن بھی اسی زمانہ میں داخل ہوئے۔ مثلاً میر صاحب نے واسوخت مثلث، مربع، کی ایجاد کی۔ فارسی میں البتہ واسوخت کی ابتداء فغانی اور وحشی نے کی تھی۔ قصائد اور اہاجی کی تکمیل سودا کے ہاتھوں ہوئی اور قصائد تو یقیناً اُسی وقت درجۂ کمال کو پہونچ گئے تھے۔ مشکل مشکل بحریں اور قافیے اور دوہرے قافیوں کا رواج ہوا تاکہ زبان پر قدرت ثابت ہو۔ زوائد اور بھرتی کے الفاظ جن کا رواج عہد سابق میں بہت تھا اب کم ہو گئے۔

شعرا دہلی چھوڑ کر لکھنؤ آتے ہیں

افغانوں کے پیہم حملوں اور مرہٹوں کی لوٹ مار کے خوف سے اکثر نامور شعرائے دہلی نے ترک وطن اختیار کیا۔

چنانچہ میرؔ، سوداؔ، میر حسنؔ، سوزؔ وغیرہ اس پرآشوب زمانہ میں اپنے وطن کو خیرباد کہہ کے لکھنؤ چلے آئے جو اُس وقت شعرا و کملا کا ملجا و ماوا تھا اور ہر فن کے اُستاد وہاں ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے تھے۔ صرف میر دردؔ ہی ایک ایسے قانع اور وطن پرست بزرگ تھے جنھوں نے خاک وطن کی محبت نہ چھوڑی اور وہیں جمے رہے۔

کلام کی خصوصیت اس عہد کے شعرا کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اُن کے کلام میں پست خیالات کے ساتھ بلند خیال اور سخیف الفاظ کے ساتھ شاندار اور فصیح الفاظ ملے جلے ہیں غزلوں میں شتر گربگی و ناہمواری میر تقی میر کی نسبت ایک قدیم تذکرہ نویس کا قول ہے کہ اُن کے معمولی اشعار نہایت معمولی اور اعلیٰ اشعار نہایت اعلیٰ ہوتے ہیں۔ انگریزی میں یہی حالت ورڈسورتھ[1] شاعر کی ہے۔ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ اپنے تذکرہ گلشن بیخار میں یہی اعتراض مرزا سودا پر بھی وارد کرتے ہیں حقیقت میں یہ ناہمواری کلام ایک معقول سزا ہے جو ان لوگوں کو ملتی ہے جن کا کلام موقع بےموقع اور بکثرت ہوتا ہے۔ سودا اور میر سے زیادہ پرگو کون ہوگا پس اُن کے تمام اشعار یکساں کیسے ہو سکتے ہیں۔ خواجہ میر درد چونکہ کم کہتے تھے یعنی اُسیوقت کہتے تھے جب طبیعت مُلہم ہوتی تھی اسی وجہ سے اُن کا بیشتر کلام اس عیب سے پاک ہے۔

تذکرے متعدد تذکرے یعنی شعرا کے مختصر حالات اور اُن کے کلام کا انتخاب بھی اسی عہد میں قلمبند کیا گیا۔ یہ کام بہت مفید ہوا کیونکہ اس سے اُس زمانہ کے حالات پر بہت کافی روشنی پڑتی ہے۔ میر تقی میر کا تذکرہ "نکات الشعرا" اور

---

[1] دیکھو فٹ نوٹ صفحہ ۷۱

میر حسن کا تذکرہ "شعرائے اُردو" اب چھپ گئے ہیں اور ہر جگہ ملتے ہیں۔ انہیں گو کہ حالات بہت مختصر لکھے ہیں مگر پھر بھی شعرا اردو کے مورخ کے لئے بہت مفید چیز ہیں اور نہایت دلچسپ باتیں ان میں ملتی ہیں۔

خواجہ میر درد ۱۱۳۳ھ تا ۱۱۹۹ھ ہجری ÷

سید خواجہ میر نام۔ درد تخلص۔ خواجہ محمد ناصر عندلیب کے خلف الصدق تھے۔ ان کے پدر بزرگوار کا بھی ایک ضخیم دیوان "نالۂ عندلیب" کے نام سے مشہور ہے۔ سلسلۂ نسب خواجہ بہاء الدین نقشبند سے ملتا ہے اور ماں کی طرف سے حضرت غوث الاعظم رحمتہ اللہ علیہ تک پہونچتا ہے ان کے نانا میر سید محمد حسنی نواب میر احمد علی خاں کے صاحبزادہ تھے جنکی تعریف میں سودا نے قصیدہ لکھا ہے۔ اور جو جنگ پانی پت میں شہید ہوئے تھے۔ خواجہ صاحب کے جد امجد بخارا سے ہندوستان آئے مگر اُن کے والد خواجہ ناصر کی ولادت ہندوستان ہی میں ہوئی۔ خواجہ ناصر جب جوان ہوئے تو شاہی منصب دار مقرر ہوئے۔ مگر تھوڑے دنوں میں تعلقات دنیاوی ترک کر کے گوشہ نشین اور حضرت شاہ خواجہ محمد زبیر کے مرید ہو گئے۔ اسی عرصہ میں مشہور صوفی شاہ گلشن کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے۔ خواجہ صاحب نے اپنے پدر بزرگوار کے علم و فضل اور کمالات ظاہری و باطنی کے حالات نہایت پر اثر طریقہ سے بیان کیے ہیں۔ خواجہ صاحب کا سنہ ولادت ۱۱۳۳ھ ہے۔ اُنھوں نے اپنے والد ہی کی آغوش تربیت میں تحصیل علوم سے فراغت حاصل کی۔ قرآن۔ حدیث۔ تفسیر۔ فقہ اور تصوف میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ جوانی میں دنیاوی معاملات میں حصہ لیتے اور اپنی جاگیر کے کاموں کو بھی دیکھتے تھے۔ مصحفی اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں

کہ سپاہی پیشہ تھے۔ مگر والد کے حکم سے نوکری چھوڑ کر فقر اختیار کیا۔ اُٹھائیس برس کی عمر میں دُنیا چھوڑ کر گوشہ نشین ہو گئے۔ اور جب باپ نے سفر آخرت اختیار کیا۔ تو اُنتالیس برس کے سن میں اُن کے سجادہ نشین اور قائم مقام ہوئے۔ خواجہ صاحب کا خاندانی اثر اور نواب ظفر خاں رئیس عہد جہانگیری سے اُن کا انتساب اور سلسلۂ نقشبندیہ میں اُن کا شیخ وقت ہونا۔ یہ سب باتیں اُن کو مرجع خاص و عام بنائے ہوئے تھیں۔ پھر اُن کے ذاتی تقدس اور مراتب عرفان و تصوف سے کماحقہ واقف ہونے کی وجہ سے لوگ اُن کے دل سے گرویدہ تھے۔ غریب سے لیکر امیر اور بادشاہ سے لیکر فقیر تک اُن کی بے انتہا عظمت کرتے اور اُن کے ساتھ دلی عقیدت رکھتے تھے معاصر تذکرہ نویس اُن کے اس خاص امتیاز اور اُن کی بزرگی اور خدارسی کی شہادت نہایت زوردار الفاظ میں دیتے ہیں اور یہ لکھتے ہیں کہ وہ مجسّم تہذیب و متانت اور پیکر آداب و اخلاق تھے جو اولیاء اللہ کا نشان امتیاز ہے قناعت و توکل اور رضا و تسلیم اُن میں کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے جب دہلی پر احمد شاہ ابدالی کا حملہ ہوا اور اُس کے بعد مرہٹوں کی لوٹ مار شروع ہوئی تو ہر شخص جو اپنی ناموس و آبرو کا تحفظ چاہتا تھا شہر چھوڑ کر نکل کھڑا ہوا۔ بڑے بڑے نامی شاعر دلی سے نکل کر لکھنؤ پہونچے مگر اس مرد راہ خدا کو جنبش بھی نہوئی۔ وہ اللہ پر توکل کیے اپنے بزرگوں کے سجادہ پر بیٹھا رہا۔ اور اسکی قناعت و استقلال اور توکل علی اللہ میں ذرہ بھر فرق نہ آیا۔ طبیعت میں آزادی۔ خودداری اور استغنا اس درجہ تھا کہ کسی کی مدح و ثنا سے اپنے قلم کو آلودہ نہیں کیا۔ ایسی خوددار طبیعت بھلا خوشامد

اور بھٹی کیونکر گوارا کر سکتی تھی۔ دنیا داروں کے سامنے زانوے ادب تہ کرنا اُن کو بعید شاق تھا۔ استغنا کا یہ حال تھا کہ بادشاہ وقت تک سے ملنے میں عار تھا۔ ایک مرتبہ شاہ عالم اُن کی بزم سماع میں چلے آئے جسکی شرکت کو وہ اپنا فخر جانتے تھے اتفاق سے پاؤں پھیلا دیے۔ خواجہ صاحب کو نہایت ناگوار ہوا۔ بادشاہ اُن کے چشم و ابرو سے سمجھ گئے۔ فوراً عذر کیا کہ مجبور ہوں۔ پاؤں میں درد ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ اگر تکلیف تھی تو تکلیف کیوں کی۔ حضرت کو موسیقی سے بھی بڑا ذوق تھا۔ خود اس فن میں صاحب کمال تھے۔ بڑے بڑے کلاونت اور گویے حاضر خدمت ہوتے اور متاع کمال پیش کرتے۔ آپ کے دولت خانہ پر ہر مہینہ کی دوسری اور چوبیسویں کو محفل سماع منعقد ہوتی۔ جس میں بڑے بڑے قوال اور ماہران فن جمع ہوتے۔ اور اپنا کمال دکھلاتے۔ میاں فیروز جو اُس زمانہ کا مشہور قوال تھا اکثر حاضر خدمت ہوتا اور اپنے کمال سے حضرت کو محظوظ کرتا۔ محرم میں مجالس منعقد ہوتیں جس میں سوز خوانی اور مرثیہ خوانی کے جوہر دکھائے جاتے۔ اسی طرح ارباب تصوف اور اصحاب سلوک کے بھی جلسے دولت کدہ پر اکثر منعقد ہوتے جنکی شرکت کو بڑے بڑے رئیس و امیر اپنی سعادت و فخر سمجھتے۔

تصانیف خواجہ صاحب کو تصنیف و تالیف کا شوق بچپن ہی سے تھا کتب ذیل جو چھپ چکی ہیں اُن کی تصنیفات سے ہیں۔

(۱)۔ رسالۂ اسرار الصلوۃ جو پندرہ برس کے سن میں بہ حالت اعتکاف لکھا۔

(۲)۔ واردات درد اُنتیس برس کی عمر میں لکھی اور اُس کی شرح میں

(۳) علم الکتاب - ایک بڑا نسخہ تحریر کیا جسمیں ایک سو گیارہ رسالے ہیں -
(۴) نالۂ درد (۵) آہ سرد (۶) دردِ دل (۷) شمع محفل (۸)
واقعات درد وغیرہ (۹) حرمت غنا (۱۰) دیوانِ فارسی (۱۱) دیوانِ اُردو -
رسالہ اسرار الصلوٰۃ اسم بامسمّٰی ہے اس میں نماز کی فضیلتوں اور پوشیدہ اسرار کا
بیان ہے - رسالۂ واردات اُنتیس برس کی عمر میں ۱۱۷۲ھ میں تصنیف فرمایا -
اس میں مسائل تصوف نظم و نثر میں بیان کیے گئے ہیں علم الکتاب اسی رسالۂ واردات
کی شرح ہے جسکو اپنے عزیز بھائی اور شاگرد خواجہ میر اثر کی فرمائش سے تصنیف
کیا - اس میں مسائل تصوف کو زبردست دلائل کے ساتھ آیات قرآنی - احادیث
نبوی اور اقوال سلف سے ثابت کیا ہے - اپنی زندگی کے بھی اکثر واقعات کا
اس میں بیان ہے - نالۂ درد ۱۱۹۰ھ میں اور آہ سرد ۱۱۹۳ھ میں تصنیف ہوئیں
یہ رسالے بھی روحانیات اور مسائل تصوف پر ہیں شمع محفل اور صحیفۂ واردات،
یہ دونوں کبرسنی کی تصنیفات ہیں جبکہ آپ کی عمر باسٹھ برس کی تھی - حرمت غنا اور
واقعات درد میں بھی دقیق مسائل تصوف کا ذکر ہے - اول الذکر میں غنا کی حلت و
حرمت سے بحث کی ہے - دیوان فارسی فارسی کلام کا ایک مختصر دیوان ہے
جس میں غزلوں کے علاوہ رباعیات اور مخمسات وغیرہ بھی ہیں - آخری چیز
دیوان اُردو ہے جسکو اُردو شاعری کے تاج کا سب سے بڑا ہیرا سمجھنا چاہیے
دیوان اُردو کے علاوہ جملہ تصانیف مذکورۂ بالا فارسی میں ہیں - دیوان کا ایک
نہایت صحیح اور عمدہ نسخہ مطبع نظامی نے چھاپا ہے جس پر محترم نواب حبیب الرحمٰن خاں صاحب
شروانی نے نہایت قابلیت سے ایک دیباچہ لکھا ہے - خواجہ صاحب کی زبان

اور طرز ادا وہی ہے جو میر کی ہے۔ عبارت صاف سلیس فصیح ہر شخص کی سمجھ میں آسانی سے آتی ہے۔ درد و اثر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ تصوف کو ان سے بہتر کسی نے نہیں کہا۔ عرفان اور تصوف کے پیچیدہ اور مشکل مضامین اس خوبصورتی اور صفائی سے بیان کیے ہیں کہ دل وجد کرتا ہے۔ غزلیں زبان کی سادگی اور صفائی میں میر کے کلام کا مزا دیتی ہیں اور تصوف کی چاشنی اور درد و اثر کے اعتبار سے اُن سے بڑھی ہوئی ہیں۔ مثل میر صاحب کے خواجہ صاحب کی بھی وہ غزلیں جو چھوٹی بحروں میں ہیں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ بقول مصنف "آبِ حیات" تلواروں کی آبداری نشتروں میں بھر دی ہے۔ یا بقول امیر مینائی مرحوم پسی ہوئی بجلیاں معلوم ہوتی ہیں۔ بیہودہ مذاق اور ہجو سے کبھی زبان کو آلودہ نہیں کیا۔ کہیں کہیں پرانے الفاظ اور محاورے بھی استعمال کر جاتے ہیں مگر اس خوبصورتی سے کہ اُن سے شعر کی خوبی بڑھ جاتی ہے۔ عاشقانہ رنگ نہایت اعلیٰ اور بلند ہے۔ اس زمانہ کا عشق مجازی جس کو وہ بوالہوسی سے تعبیر کرتے تھے اُن کے کلام میں نہیں پایا جاتا۔ مثل خواجہ حافظ اور اساتذۂ سلف کے اُن کا معشوق بھی کوئی بازاری اور ہرجائی نہیں بلکہ اُس سے معشوق حقیقی یا مرشد مراد ہے۔ ایسے بزرگوں کی نظر میں شاعری کا پایہ نہایت بلند اور اُس کا مقصد نہایت اعلیٰ ہوتا ہے۔ وہ لوگ کسب مال و جاہ کی غرض سے شعر کہنا گناہ سمجھتے تھے۔ اسی وجہ سے اُن کا کلام سوز و گداز اور تاثیر سے مملو ہوتا ہے۔ زبان اور ادب اُردو کے لحاظ سے خواجہ صاحب ایک نہایت نمایاں اور ممتاز درجہ رکھتے ہیں بقول مصنف آبحیات "چار رکنوں سے ایک رکن یہ ہیں" باقی رکن۔ میر۔ سودا۔ اور مظہر ہیں۔ حقیقت میں انھیں عناصر اربعہ کی

ترکیب سے زبان کا قوام درست ہوا۔ قدیم ایہام گوئی اور ہندی دوہروں کی تقلید گئی۔ زبان صاف ہوئی اور منجھی۔ اور بالآخر ترقی کی معراج تک پہونچ گئی خواجہ صاحب کے کلام نے یہ اور اضافہ کیا کہ تصوف اور روحانیت کی چاشنی سے اُسمیں چار چاند لگا دیے۔ خواجہ صاحب کا یہ اثر اُن کے معاصرین اور بعد کے آنے والوں پر بھی بہت تھا۔ اُن کے معاصر شعرا اُن کا بہت ادب واحترام کرتے تھے۔ خدائے سخن میر تقی میر اپنے تذکرہ میں کس رنگینی اور جوش کے ساتھ اُن کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں "جوش بہار گلستان سخن۔ عندلیب خوشخوان چمن ابن فن زبان گفتگوش گرہ کشائے زلف شاہد مدعا مصرعہ نوشتہ اش بر صفحۂ کاغذ از کاکل صبح خوشنما .... خلیق متواضع آشنائے درست شعر فارسی ہم میگوید اما بیشتر رباعی۔ گرمی بازار وسعت مشرب دست غرض از آشنائی مطلب اوست متوطن شاہجہان آباد بزرگ و بزرگزادہ جوان صالح از درویشی بہرۂ وافی دارد فقیر را بخدمت او بندگی خاص است اگرچہ حسن سلوک عام حسن سلوک بہاے خود گرفتہ اعتراز را از گوشۂ دل نہادہ خلف الصدق حضرت خواجہ ناصر صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ است کہ مقتدائے عالم است۔ ایامی کہ فقیر بخدمت آن بزرگوار شرف اندوز می شد۔ از زبان مبارکش سیفرمود کہ میر محمد تقی تو میر مجلس خواہی شد .... مجلس ریختہ کہ بخانۂ بندہ بتاریخ پانزدہم ہر ماہ مقرر است والعہدہ ہایں بزرگ است۔ زیراکہ پیش ازیں مجلس بخانہ اش مقرر بود۔ از گردش روزگار بیمدار برہم خورد از بسکہ بایں احقر اخلاص دلی داشت گفت کہ ایں مجمع را شما اگر بخانۂ خود معین بکنید بہتر است۔ نظر بر اخلاص آں مشفق عمل کردہ آمد۔ خدایش ابدالآباد سلامت دارد" میر صاحب خواجہ صاحب کا ذکر ایسے الفاظ میں کرتے ہیں کہ لوگوں کو دھوکا ہوتا ہے کہ اُن کے شاگرد تھے

چنانچہ فرنچ مستشرق اور زبان اُردو کے دلدادہ گارسن ڈیٹاسی کو بھی یہی دھوکا ہوا کہ وہ میر کو درد کا شاگرد بتاتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ میر صاحب اُن کے تقدس اور کمال عرفان اور نیز اُن کی ذاتی قابلیت کے دل سے قائل تھے اور یہی حال میر حسن کا بھی ہے۔ وہ بھی اُن کی بزرگی کے قائل اور اُن کے کلام کے معرف اور دلدادہ تھے۔ کلام کی نسبت لکھتے ہیں کہ "اگرچہ مختصر مگر مثل کلام حافظ شیرازی انتخاب ہے" ہماری رائے میں میر انیس کے کلام میں جو سادگی اور اثر پایا جاتا ہے وہ بواسطہ میر حسن خواجہ صاحب کے کلام کا ایک نمایاں اثر ہے۔

شاگرد خواجہ صاحب کے بہت سے شاگرد تھے۔ جن میں قائم۔ ہدایت۔ فراق اور اثر مشہور ہیں علی الخصوص قائم اور اثر اعلیٰ درجہ کے شاعر اور صاحب دیوان ہیں۔ خواجہ صاحب کے صاحبزادہ کا نام صاحب میر اور الم تخلص تھا۔ سنہ وفات اور عمر کے متعلق اختلاف ہے۔ بیل صاحب لکھتے ہیں کہ ۱۱۹۹ھ مطابق ۱۷۸۵ء میں وفات پائی۔ مرزا علی لطف ۱۲۰۲ھ اور مصحفی ۱۲۰۹ھ لکھتے ہیں جو ۹۳-۱۷۹۲ء کے مطابق ہے۔ یہی وہ سن ہے جسمیں مصحفی نے اپنا تذکرہ لکھا تھا۔ گارسن ڈیٹاسی اور لائل صاحب مصحفی کی پیروی کرتے ہیں۔ مصنف آبحیات لکھتے ہیں ۱۱۹۹ھ میں بمقام دہلی چھاسٹھ برس کی عمر میں انتقال کیا۔ علامہ شروانی نے اپنے مقدمہ میں ایک معاصر شاعر بیدار کی تاریخ لکھی ہے ع حیف دنیا سے سدھارا وہ خدا کا محبوب جس سے سن وفات ۱۱۹۹ھ اور عمر اسٹھ کی نکلتی ہے خود خواجہ صاحب شمع محفل میں فرماتے ہیں کہ کشف کے طور پر مجھکو معلوم ہوا کہ میری عمر چھاسٹھ کی ہوگی سب کا خلاصہ یہ ہے اور صحیح بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ عمر چھاسٹھ سال اور سنہ وفات ۱۱۹۹ھ ہے۔

درد کی شخصیت اُردو شاعری میں ایک خاص شخصیت ہے اپنے معاصرین پر اور نیز بعد کی نسلوں پر اُن کی شاعری کا ایک گہرا اثر پڑا تصوف کے رنگ میں وہ بے نظیر اور بےمثال ہیں۔

میر سوز
سنہ ۱۱۳۳ تا سنہ ۱۲۱۳ھ

سید محمد میر نام میر ضیاءالدین کے صاحبزادہ شاہ قطب عالم گجراتی کی اولاد میں تھے آباؤ اجداد بخارا کے رہنے والے تھے۔ مگر خود میر سوز کی ولادت دہلی میں ہوئی تیر اندازی اور شہسواری میں مشاق۔ شہزور اور ورزش کے بڑے شائق تھے۔ فنون سپہ گری کے علاوہ خوشنویسی میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔ نسخ، نستعلیق، شفیعا وغیرہ تمام خطوط مروجہ خوب لکھتے تھے۔ جوانی میں رنگین طبع اور عاشق مزاج تھے۔ شاہ عالم کے زمانہ میں جب دلی پر تباہی آئی اور لوگ بےحال تھے تو یہ دولت فقر سے الامال صوفی باکمال تھے۔ وطن کی تباہی و بربادی سے افسردہ خاطر ہو کر نکل کھڑے ہوئے پہلے فرخ آباد گئے جہاں نواب مہربان خاں رند دیوان نواب احمد خاں غالب جنگ کی چند دن ملازمت در رفاقت کی۔ اُس کے بعد لکھنؤ آئے۔ یہ نواب آصف الدولہ کا زمانہ تھا۔ نواب بڑی مہربانی سے پیش آئے۔ مگر ان کا جی نہ لگا۔ چند دن ٹھہر کر مرشد آباد کا رُخ کیا۔ جہاں نوابان بنگالہ کا دَور دَورہ تھا وہاں سے بھی جی گھبرایا تو آخرکار اُسی سال پھر لکھنؤ واپس آئے اور اب کی مرتبہ آصف الدولہ اُن کے شاگرد ہوئے مگر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اُستاد نے انتقال کیا۔ بیل صاحب لکھتے ہیں کہ سنہ ۱۲۱۰ھ میں بعمر ۸۰ سال رحلت کی۔ مگر لطف سنہ وفات سنہ ۱۲۱۳ھ بتاتے ہیں اور مصحفی بوقت وفات ستر برس کا سِن لکھتے ہیں۔ نساخ اپنے تذکرہ سخن شعرا میں عمر اسّی سال اور مقام وفات

ٹھہر جاتے ہیں۔ فیروز تذکرۃ الشعرا میں سنہ ۱۲۱۲ھ وفات اور عمر ۷۰ سال لکھتے ہیں۔ ہمارے خیال میں عمر ۸۰ سال اور سنہ ۱۲۱۳ھ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ میر سوز نہایت خوش طبع ظریف۔ شیریں زباں خلیق ملنسار اور بڑے پابند وضع تھے۔

طرز کلام

کلام میں ایک دیوان یادگار چھوڑا ہے جسمیں غزلوں کے علاوہ مثنوی رباعیاں اور مخمس بھی ہیں۔ انداز کلام نہایت صاف سادہ اور بے تکلف۔ زبان میٹھی غزل کے واسطے نہایت موزوں ہے۔ لطف زبان صفائی محاورہ اور بیساختہ پن میں ان کا کلام اپنا آپ نظیر ہے تکلف و آورد فضول مبالغے تشبیہات اور استعاروں سے پاک و صاف۔ لفظی صنائع بدائع بھی بہت کم پائے جاتے ہیں۔ ان کا شاہد کلام حسن طبیعی سے آراستہ کسی مصنوعی زیب و زینت کا محتاج نہیں۔ سادگی اور صفائی میں میر تقی میر البتہ اُن کے مقابل ہیں مگر سودا بہت پیچھے ہیں۔ مگر میر صاحب کے یہاں لطف زبان کے ساتھ جو لطف مضامین اور جذبات کا ہے وہ سوز کے یہاں بہت کم ہے اُن کے کلام میں میر اور سودا کی طرح فارسی الفاظ اور فارسی ترکیبوں کی بھی کثرت نہیں سیدھے سادھے ہندی لفظ بیساختگی سے باندھتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ باتیں کر رہے ہیں۔ شعر کو اتنا ہلکا پھلکا کر دیتے ہیں کہ اکثر اُس پر ردیف کا بھی بوجھ نہیں ڈالتے اسی سادگی کی وجہ سے ایک دور پہلے کے شاعر معلوم ہوتے ہیں۔ زبان کی اصلاح یا توسیع کی کوئی خدمت اُن سے انجام نہ ہو سکی بلکہ سچ پوچھو تو غزل کے سوا اور کچھ نہیں کہا۔ ان کے اشعار کی سادگی اور بے تکلفی سے معلوم ہوتا ہے کہ جو طرز ریختی کے نام سے بعد کو سعادت یار خاں رنگین نے ایجاد کیا۔ اُسکی ابتدا سوز ہی کے زمانہ میں ہو گئی تھی۔ شعر پڑھنے کا طریقہ بھی ان کا

سب سے علیحدہ تھا۔ ترنم اور خاص درد و اثر کے ساتھ شعر پڑھتے اور اظہار مطلب میں آنکھ ناک ہاتھ گردن غرض ہر عضو سے کام لیتے اور خود مضمون کی صورت بن جاتے آبحیات میں لکھا ہے کہ جب یہ قطعہ پڑھا ؎

گئے گھر سے جو ہم اپنے سویرے		سلام اللہ خاں صاحب کے ڈیرے
وہاں دیکھے کئی طفل پری رو		ارے رے رے ارے رے رے ارے رے

تو چوتھا مصرعہ پڑھتے پڑھتے زمین پر گر پڑے۔ گویا پریزادوں کو دیکھکر دل بے قابو ہو گیا۔ میر حسن اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں "در عہد خود از جملہ اوابنداں ممتاز طرز ادائیلک اوست۔ وخواندن اشعارش از زبان او نیکو از خواندش چناں خوب مینماید کہ در گفتن نمی آید" مرزا علی لطف لکھتے ہیں کہ عاشقانہ رنگ کے بادشاہ میر سوز کا کلام سوز و گداز میں ڈوبا ہوا ہے۔

نام کی مناسبت سے پہلے میر تخلص کرتے تھے پھر سوز اختیار کیا۔ چنانچہ اس شعر میں دونوں تخلصوں کی طرف اشارہ ہے ؎

کہتے تھے پہلے میر میر تب نہ موئے ہزار حیف
اب جو کہیں ہیں سوز سوز یعنی سدا جلا کرو

میر تقی میر اسی اشتراک تخلص کی وجہ سے اُن سے کچھ ناراض ہیں فرماتے ہیں "ہر چند طرز علیحدہ دارد لیکن از عوض کردن تخلص من لفصت دلم از دخوش است"

سوز کا مرتبہ شاعری میں

سوز کا مرتبہ اُردو شاعری میں بہت بلند ہے گو وہ میر و سودا کے مقابل نہیں سمجھے جا سکتے مگر پھر بھی غزل گوئی کے استاد اور صفائی کلام، محاورہ بندی، اور سوز و گداز کے بادشاہ تھے، کلام نہایت صاف، سلیس، پُر اثر، تکلف اور بناوٹ سے بالکل خالی ہوتا ہے۔

سودا
سنہ ۱۱۲۵ھ تا سنہ ۱۱۹۵ھ
سنہ ۱۷۱۳ء ۔ سنہ ۱۷۸۱ء

مرزا محمد رفیع متخلص بہ سودا اقلیم سخنوری کے شہنشاہ۔ اُردو کے خاقانی و انوری۔ سپہر شاعری کے درخشندہ تارے۔ بلکہ آفتاب۔ اور بقول اپنے حریف اور معاصر خدائے سخن میر کے ریختہ گویوں کے انتخاب تھے۔

ان کے آبا و اجداد معزز خاندان کے لوگ کابل کے باشندے تھے۔ مرزا صاحب کے والد مرزا محمد شفیع ایک تجارت پیشہ بزرگ تھے جو کابل سے ہندوستان آئے اور دہلی میں قیام کیا۔ خاک دہلی ہی کو یہ فخر حاصل ہے کہ سرآمد شعرائے ہندوستان مرزا رفیع السودا وہاں پیدا ہوئے۔ آزاد تذکرۂ آبحیات میں تاریخ ولادت سنہ ۱۱۲۵ھ لکھتے ہیں۔ مگر یقین کے ساتھ اس کی صحت کا اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ اس وجہ سے کہ نہ تو معاصرین نے لکھا ہے اور نہ مابعد کے تذکروں میں مرزا صاحب کی عمر یا سنہ ولادت کی تصریح ہے۔ تخلص کے انتخاب کی وجہ بھی آبحیات میں دلچسپ لکھی ہے۔ فرماتے ہیں "کہ تخلص سودا اس واسطے رکھا گیا کہ سودا یا جنون تمغائے عشق ہے جس پر ایشیائی شاعری کا دارو مدار ہے۔ اور یا پھر باپ کی سوداگری کی رعایت سے رکھا گیا۔ کہ اُس کے جزء اول میں لفظ سودا داخل ہے۔" اور آخر میں یہ خوب فرمایا کہ سوداگری کی بدولت ایہام کی صنعت گھاتے میں آئی۔

مرزا صاحب کی پرورش اور تعلیم دہلی میں ہوئی۔ پہلے سلیمان قلی خاں وداد کے پھر شاہ حاتم کے شاگرد ہوئے۔ شاہ صاحب نے جو فہرست اپنے شاگردوں کی اپنے دیوان کے دیباچہ میں لکھی ہے اُس سے مرزا کی اُستادی پر فخر و مباہات

ثابت ہوتا ہے۔ لائق شاگرد کا نام نہایت محبت اور عزت کے ساتھ لیتے ہیں۔
مرزا کو خان آرزو کے ساتھ شرف تلمذ نہ تھا مگر اُن کی صحبت سے بہت فیضیاب ہوئے اور شعر گوئی میں بہت کچھ فائدہ اُٹھایا۔ اُنھیں کی ہدایت کے موافق فارسی کو ترک کیا اور ریختہ کہنا شروع کیا۔ مگر فارسی کا شوق اُن میں اسقدر سرایت کئے ہوئے تھا کہ اُس سے بالکل علیحدگی محال تھی۔ کچھ نہ کچھ ضرور کہتے تھے۔ چنانچہ اُن کا مکمل دیوان فارسی دیوان ریختہ کے شروع میں موجود ہے۔ مرزا کا کلام اسقدر مقبول در ہر دلعزیز ہوا کہ گھر گھر اور کوچۂ و بازار تک میں پھیل گیا۔ مرزا کو اس بات کا فخر حاصل ہے کہ اُن کا کلام اُن کی زندگی ہی میں مشہور ہوگیا تھا۔ اور وہ مُسلّم الثبوت شاعر اُسی وقت مانے جاتے تھے۔ اُن کی اُستادی کا چرچا اسقدر پھیلا کہ بادشاہ وقت شاہ عالم کو بھی اُن کی شاگردی کا شوق ہوا۔ وہ اُردو اور فارسی خوب کہتے تھے اور آفتاب تخلص کرتے تھے۔ آخر کار مرزا کے شاگرد ہوئے اور اپنا کلام اصلاح کے لئے دکھانے لگے۔ کچھ عرصہ کے بعد مرزا کو اُن سے کسی خاص بات پر رنجش ہوگئی اور دربار آنا جانا چھوڑ دیا۔ مگر دہلی میں بہت سے ایسے قدردان رئیس و امیر موجود تھے جنھوں نے استاد زمانہ کی دلجوئی اور خدمت کو اپنا فخر سمجھا اور اُن کے ساتھ بڑی مہربانی اور عالی حوصلگی سے پیش آتے تھے۔ ایسے قدرشناسوں کی دریا دلی اور قدردانی نے مرزا کو ایسا مستغنی اور فارغ البال کر دیا تھا کہ جب نواب شجاع الدولہ نے مرزا کے کمال کا شہرہ سن کر اُن کو نہایت شفقت و محبت سے بلاوے کا خط لکھا اور زادِ راہ بھی بھیجا تو مرزا نے ٹال دیا اور کمال استغنا سے یہ رباعی جواب میں لکھ بھیجی ؎

سودا

سوداپئے دُنیا تو بہر سو کب تک	آوارہ ازیں کوچہ بآں کو کب تک
حاصل یہی اس سے نہ کہ دنیا ہووے	بالفرض ہوا یوں بھی تو پھر تو کب تک

تھوڑے دنوں کے بعد زمانہ نے پلٹا کھایا۔ دلی کی حالت بدل گئی۔ وہ پُرانا وقت نہ رہا۔ پُرانے قدردان یکے بعد دیگرے مرتے گئے۔ پُرانے شرفا کے گھرانے آئے دن کے بیرونی حملوں اور مرہٹوں کی قتل دغارت سے برخاستہ خاطر اور پریشاں ہو گئے اسی کے ساتھ لوگوں کی جان و مال اور عزت و آبرو بھی خطرہ میں تھی اور وہ قدرداں اور فن کے جوہری بھی باقی نہیں رہے تھے اس وجہ سے شعراے باکمال نے دلی کو خیرباد کہا مرزا بھی اُسی نازک وقت میں اُس تباہ قافلے کے ساتھ دہلی سے نکلے۔ اُس وقت اُن کی عمر تقریباً ساٹھ برس کی تھی۔ فرخ آباد پہونچے۔ نواب احمد خاں بنگش غالب جنگ برسر حکومت تھے۔ مہربان خاں رندؔ اُن کے دیوان تھے جو اہل علم وکمال کے قدرداں خود بھی شاعر تھے اور بقول میر حسن میر سوز و میرزا سودا سے تلمذ تھا۔ چند سال تک مرزا فرخ آباد رہے۔ اُنھوں نے مہربان خاں کی تعریف میں قصیدے لکھے ہیں ۱۱۸۵ھ میں نواب احمد خاں مرگئے تو سودا بھی فیض آباد چلے گئے اور نواب شجاع الدولہ کے زمرۂ ملازمین میں داخل ہو گئے۔ جب سلطنت کا مرکز لکھنؤ قرار پایا تو سودا بھی لکھنؤ آ گئے۔

تھوڑے دنوں کے بعد نواب شجاع الدولہ کا انتقال ہو گیا اور نواب آصف الدولہ سریر آراے سلطنت ہوے تو اس زمانہ میں مرزا سے اور ایک فارسی شاعر فاخر مکین سے شعر و شاعری کے معاملہ میں کچھ نزاع ہو گئی جس نے طول پکڑ کر ایک سخت جھگڑے اور باہمی جنگ کی صورت اختیار کی اُس کا تصفیہ نواب سعادت علیخاں نے

جو اُس وقت ولیعہد سلطنت تھے نواب سے روبرو مرزا کی موافقت میں کرادیا سابق کی شکر رنجی جاتی رہی۔ خطاب ملک الشعرائی اور چھ ہزار سالانہ کا وظیفہ عطا ہوا پھر تو نواب آصف الدولہ مرزا پر نہایت شفقت اور عنایت کی نظر فرمانے لگے اور اتنا ارتباط بڑھ گیا کہ اکثر اوقات مرزا کی پرلطف صحبت اور اُن کی بذلہ سنجیوں کو جملہ کاموں پر یہاں تک کہ بسا اوقات محل کے عیش و آرام پر ترجیح دیتے تھے۔ مرزا کا انتقال لکھنؤ میں ۱۱۹۵ھ مطابق ۱۷۸۱ء میں ہوا۔ بہت سے معاصرین اور نیز مابعد کے شاعروں نے وفات کی تاریخیں کہی ہیں۔ مصحفی، منت، ناسخ، نساخ کی تاریخیں مشہور ہیں[۱]

تصانیف — مرزا کی تصانیف جمیع اقسام سخن میں بکثرت حسب ذیل ہیں۔

(۱) ایک مختصر دیوان فارسی جسمیں ردیف وار غزلیں ہیں۔

(۲) چند فارسی قصائد۔

(۳) دیوان اُردو مکمل جس میں علاوہ غزلوں کے رباعیات، قطعے، تاریخیں، مخمس، ترجیع بند، واسوخت، مستزاد، تضمین، غرض ہر قسم کا کلام ہے۔

(۴) چوبیس مثنویاں یعنی مختلف منظوم حکایتیں اور لطائف جن میں اُنکی دلچسپ اور مشہور ہجویں اور پہیلیاں ہیں۔

(۵) تضمین بر کلام میر۔ اور دو خط بنام میر ایک نظم اور ایک نثر میں (اُن کے کلیات میں نہیں ہیں)

(۶) قصائد اُمرائے دہلی و لکھنؤ وغیرہ اور نواب آصف الدولہ کی تعریف میں۔

(۷) سلام اور مرثیہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی شان میں۔

---

[۱] ایک تاریخ یہ ہے سے ۵ فلک کو جب حضرت سودا گئے ÷ فکر میں تاریخ کی ماہر ہوا ÷ بُوئے مُصحف دُور کر پاسے عناد ÷ شاعرانِ ہند کا سردار گیا ÷

(۸) قصائد ائمہ معصومین علیہم السلام کی منقبت میں۔

(۹) ایک رسالہ نثر میں موسوم لعبرۃ الغافلین۔ مرزا فاخر مکین کے اعتراضوں کا جواب ہے جو انھوں نے فارسی کے شعرائے سلف پر کیے تھے۔

(۱۰) میر تقی میر کی مشہور مثنوی شعلۂ عشق کا ترجمہ نثر میں (اُن کے کلیات میں نہیں ہے)۔

(۱۱) ایک تذکرہ شعرائے اُردو کا جواب نہیں ملتا۔

سودا کا مرتبہ شاعری میں

سودا اپنے زمانہ کے بہت بڑے اُستاد مانے گئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ میر اور سودا دونوں زبان اُردو کے سب سے بڑے شاعر گزرے ہیں۔ اپنے زمانہ میں بھی بے نظیر اور بے عدیل تھے اور اُنکے بعد بھی اُن کا ایسا کوئی نہیں ہوا۔ اُن کی خدمات زبان اور شاعری اور فن نظم کے ساتھ بہت قابل قدر ہیں اُن کی اصلاح زبان کا اثر بہت گہرا اور دیرپا ہے۔

اُن کی خدمات زبان کے ساتھ

مرزا نے اکثر ہندی الفاظ کی درشتی کو دور کر کے فارسی کی آمیزش سے زبان میں شیرینی اور حلاوت پیدا کی۔ میر اور سودا ہی نے زبان کو ادبی زبان بنایا اُس کو ریختہ کا مرتبہ بخشا چنانچہ خود فرماتے ہیں ؎

کہے تھا ریختہ کہنے کو عیب ناداں بھی		سو یوں کہا میں کہ دانا ہنر لگا کہنے
بسان مہر یہ روشن ہے سارے عالم پر		جہاں میں جیسے کہ میں شعر تر لگا کہنے

ولہ

سخن کو ریختے کے پوچھے تھا کوئی سودا		پسند خاطر دلہا ہوا یہ فن مجھ سے
کب اسکو گوش کرے تھا جہاں میں اہل کمال		یہ سنگریزہ ہوا ہے دُر عدن مجھ سے

شاعری کی صناعیوں سے اُس میں طرح طرح کی لطافتیں اور نزاکتیں پیدا کیں۔ فارسی سے بکثرت الفاظ و محاورات، استعارے اور تشبیہیں، طرز تخیل، اور تلمیحات زبان اُردو میں داخل کیے اور اس اُستادی سے داخل کیے کہ اُس کے جزو ہو گئے اور اُسکی وسعت اور لوچداری اتنی بڑھ گئی اور وہ اس قابل ہو گئی کہ ہر ادبی کام اُس سے لیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ نئی نئی ترکیبیں اور محاورے فارسی کی روش پر ایجاد کیے جس میں سے بعض تو مقبول ہوے اور بعض کو آیندہ نسلوں نے ناپسند اور متروک کیا۔ کیا اچھا ہوتا اور ہماری زبان کی کتنی خوش نصیبی ہوتی اگر ان خدایان سخن کو وہی توجہ جو فارسی کے ساتھ تھی بھاشا کے ساتھ بھی رہی ہوتی جس کا نتیجہ لازمی یہ ہوتا کہ دیسی زبان کے لفظ بجاے اجنبی الفاظ کے کثرت سے داخل ہوے ہوتے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مرزا کی قوت ایجاد و انتخاب اور قابلیت اس اعلیٰ درجہ کی تھی کہ جو چیزیں داخل کیں اُن پر طغراے قبول فوراً ثبت ہو گیا اور اب وہ ہماری زبان کا جزو لاینفک بن گئیں۔

یہ بات بھی قابل داد ہے کہ فارسی روایات اور تلمیحات کے ساتھ ہندوستان کی قدیم روایات والفاظ بھی بُھلائے نہیں گئے۔ مثلاً الفاظ جھجل۔ پربت۔ رائی وغیرہ اور ہندی علم الاصنام میں ارجن کی بہادری۔ کنھیا کا عشق وغیرہ جو اُن کے کلام میں بڑا لطف دیتے ہیں[1]۔ یہ سب اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ کم سے کم

محبت[1] کے کرون جھجبل کی میں تعریف کیا یارو	ستم پربت ہو تو اُسکو اُٹھا لیتا ہے جوں رائی
نہیں ہے گھر کوئی ایسا جہاں اُسکو نہ دیکھا ہو	کنھیا سے نہیں کچھ کم صنم میرا ہے ہرجائی
ترکش الفینڈ سینہ عالم کا چھان مارا	مژگاں نے تیرے پیارے ارجن کا بان مارا

اُس زمانہ میں مادر وطن کے ساتھ تعلقات کو پختہ کرنے کا خیال ہمارے شعرائے اُردو کے دل میں بہت کچھ تھا۔ جو افسوس ہے کہ متاخرین نے حقارت کے ساتھ دل سے فراموش کر دیا۔ مرزا کو اکثر مناسب ہندی الفاظ بھی ہندی خیالات کے اظہار کے لئے اختراع کرنا پڑے۔ اور اس کوشش میں اُن کو اپنے معاصرین سے سخت مخالفتیں اور دقتیں اُٹھانا پڑیں۔ مرزا کے عہد میں قدیم ایہام گوئی اور دوہروں کا رواج جو متقدمین کی یادگار میں سے کچھ باقی رہ گیا تھا وہ بالکل متروک ہو گیا تھا چنانچہ سودا خود فرماتے ہیں ؎

یک رنگ ہوں آتی نہیں خوش مجھ کو دورنگی
منکر سخن و شعر میں ایہام کا ہوں میں

اور اُن کے ہمعصر میر کہتے ہیں۔

کیا جانوں دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر میر کے
کچھ طرز ایسی بھی نہیں ایہام بھی نہیں

مگر فارسی اور ہندی الفاظ کو ملانے کی دقت رفع نہیں ہوئی تھی۔ اور آخری منازل ترقی اُردو شاعری کے واسطے ہنوز باقی تھے۔ مرزا کے کلام کو اس نقطۂ نظر سے جانچنا بہت ضروری بات ہے۔ جو خدمات زبان کے ساتھ اُنھوں نے انجام دیں اور جو قوت زبان پر اُنھیں حاصل تھی اُس کا اعتراف اُن کے معاصرین مثلاً میر، و میر حسن مصحفی، وغیرہ نے بخوبی کیا ہے اور ان کی قابلیت و کمال کی دل سے داد دی ہے۔

اُن کی خدمات شاعری کے ساتھ — جو بنیادیں ولی اور شاہ حاتم نے قائم کی تھیں اُنھیں پر سودا نے

اپنا رفیع اور شاندار ایوان شاعری تیار کیا۔ علاوہ کمال فن کے وہ دو چیزوں کے موجد بھی تھے یعنی قصیدہ اور ہجو۔ ہر چند کہ یہ دونوں صنعتیں فارسی میں نہایت مکمل اور باقاعدہ صورت میں اور اُردو میں بھی ایک ابتدائی اور نامکمل حالت میں موجود تھیں مگر اُنھوں نے یہ کمال کیا کہ اُن کو اُردو میں درجۂ کمال تک پہونچا دیا۔ اور ایسا کر دیا کہ اُن کی برابری اور ہمسری کا خیال تک بعد کے شاعروں کے لیے محال ہو گیا۔ ہر چند کہ اکثر شعرا نے اُن کی پیروی کی اور اُن کے قدم بقدم چلنا چاہا مگر کامیاب نہ ہو سکے اور مرزا دونوں اصناف سخن میں متفرد ہی رہے۔

قصیدہ و مرثیہ — اُن کے اُردو قصائد بڑے بڑے فارسی اُستادوں کے قصائد کے ٹکر کے ہیں اور بعض تو عرفی و خاقانی کے معرکۃ الآرا قصیدوں کو بھلا دیتے ہیں۔ نزاکت خیال اور طرفگی مضامین میں وہ اکثر اہل عجم سے گوے سبقت لیگئے ہیں۔ یہی حالت اُن کے مراثی کی بھی سمجھنی چاہیئے۔ مرزا سے پہلے گو مرثیہ گو اُردو میں بہت گزرے ہیں مگر اُن کے کلام میں سواے مذہبیت کے کوئی شاعرانہ رنگ، کوئی جدّت اسلوب، کوئی نئی بات نہ تھی جو زمانۂ موجودہ کے ترقی یافتہ مذاق کو بھلی معلوم ہو۔ مرزا ہی وہ صاحب ایجاد ہیں جنھوں نے اس فن خاص میں بھی اپنے زمانہ کے اعتبار سے کمال حاصل کر لیا بلکہ سچ پوچھو تو اپنے بعد آنے والوں کے واسطے ترقی کی راہیں کھول گئے۔

ہجو — مرزا صاحب نے ہجوؤں کے دفتر کے دفتر لکھکر رکھدیے ہیں۔ اُن لوگوں کو تو ضرور افسوس ہوتا ہے جن کے دلوں پر یہ آرے چلے ہونگے مگر ہمارے واسطے وہ ایک زعفران زار چھوڑ گئے ہیں جو ابدالآباد تک شاداب و سرسبز رہیگا۔ اُن کے

اہاجی میں وہ گرمیٔ کلام اور تیزی ہے جس سے وہ ظرافت و مذاق کا ایک دائمی ذخیرہ بن گئی ہیں معلوم ہوتا ہے اس صنف سے اُن کو خلقی مناسبت بلکہ قدرتی خصوصیت تھی جیساکہ اُن کے خود ایک شاگرد نے اس طرف اشارہ کیا ہے ۱؎

کی ہجو ہر اک شخص کی ہر چند کہ اُس نے — پر اُس سے طرف اُس کے نہ عائد ہوئی تقصیر
ہے ایک سبب یہ کہ وہ خود آپ مُغل تھا — اور جتنے بزرگ اُسکے تھے مغلوں کے تھے وہ پیر

بڑھاپے میں بھی اُن کی زندہ دلی اور مزاج کی شگفتگی ایسی تھی کہ جو بات دل میں آجاتی تھی اُس کے اظہار سے کبھی نہ چوکتے تھے کسی انعام کا لالچ یا انتقام کا خوف اُن کو اپنے دِل کی بھڑاس نکالنے سے رُوک نہ سکتا تھا۔ جہاں کسی سے آن بن ہوئی فوراً اُن کا غلام "غنچہ" قلمدان و کاغذ کا سامان گل تراشی لیے ہر وقت موجود تھا اور پھر وہ وہ گل بوٹے تراشے جاتے تھے کہ جن کو دیکھکر لوگ اپنی آنکھیں اور سُن کر اپنے کان بند کر لیتے تھے۔ اُنھوں نے اپنی تحریروں سے اس مبتذل صنف کو بھی ایک باقاعدہ اور مکمل فن بنا دیا۔ وہ زمانہ کی خرابی اور گمراہیوں کی پردہ دری میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھتے۔ ایک انگریز نقاد کا قول ہے کہ "جس طرح رومۃ الکبریٰ کے زوال کی تصویروں کے واسطے ہم جو ڈنیال[1] ایسے مرقع نگاروں کی صفحہ گردانی کرتے ہیں اُسی طرح ہم کو اگر زوال دولت مغلیہ کی سچی تصویریں دیکھنا ہیں تو ہم کو چاہیے کہ سودا کی اُن پُرآشوب نظموں کا مطالعہ کریں جس میں اُنھوں نے مرہٹہ سواروں کی عین قلعۂ دہلی کی دیواروں کے نیچے قتل و غارتگری کا سچا فوٹو اُتارا ہے یا جس میں زمانہ کی پُرآشوب حالت اور اُمراے دہلی کی

۱؎ دیکھو فٹ نوٹ صفحہ (۱۳۷)

تباہی و بربادی اور کس مپرسی کا بیان نہایت پُرزور اور دردناک طریقہ سے کیا ہے۔ یا مثلاً وہ نظم جو ہجو شیدی فولاد خاں کوتوال شاہجہاں آباد کے نام سے مشہور ہے جس میں چوری کی کثرت شہر کی بدامنی اور کوتوال شہر کی کم زوری کس پُر مذاق اور مؤثر طریقہ سے بیان کی ہے" یہ سچ ہے کہ مرزا سے پہلے بھی بعضوں نے ہجویں کہی ہیں مگر بہت کم اور بے قاعدہ۔ میرزا کے یہاں وہ ایک صنعت کلام اور مقابلہ کا ایک زبردست ہتھیار بنگئی۔ میرحسن کے پدر بزرگوار میر ضاحک، فدوی پنجابی، مرزا فاخر مکین، بقا اور اِن کے علاوہ اور لوگ بھی باری باری سب مرزا کی زد میں آئے اور اُن بیچاروں نے حرکت مذبوحی میں کچھ ہاتھ پاؤں ہلائے اور اپنی بساط کے موافق کہا مگر اُن کا کہا کسی نے نہ سُنا۔ مرزا کا کہا بچے بچے کی زبان پر ہے۔ کثرت اہاجی سے پتہ چلتا ہے کہ مرزا کو اس چیز سے خاص اُنس تھا اور اِس میں اُن کو بڑا مزا آتا تھا۔ اِن کی ہجویں کچھ معمولی نظمیں نہیں ہیں بلکہ اُن سے اُن کی قوت بیان، قدرت زبان، اور معاملات دُنیاوی میں اُن کی وسیع معلومات کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔ وہ جب کسی کی ہجو لکھتے ہیں تو اُس چیز کی جزئیات کو کبھی نظرانداز نہیں کرتے۔ اور حیرت ہوتی ہے کہ دو متضاد چیزیں درد و اثر اور تمسخر و مذاق کو یکجا کر دیتے ہیں اور سُننے والے پر غضب کا اثر پڑتا ہے۔ جس چیز کا خاکہ اُڑاتے ہیں اُس میں فارسی وغیرہ کی تقلید نہیں ہوتی۔ مضمون اچھوتے اور پھڑکا دینے والے ہوتے ہیں۔

مزا میں جووینال[1] والٹیر[2] اور سویفٹ[3] تینوں کا مزا ہے۔ ایڈیسن[4] کی متانت اُن میں مطلق نہیں۔ اُن کی ہجو میں پھکڑپن کے ساتھ طعن و تشنیع بھی بہت ہے۔ اُن کے الفاظ میں دل لگی اور مذاق کی تہ میں ایسی کاٹ اور تُرشی ہے جو دل کے اندر

---

[1] "جولیس جووینالس" روما کا مشہور ہجو نگار شاعر تھا۔ سنہ پیدائش تقریباً ۷۰ عیسوی اور سنہ وفات ۱۲۸ عیسوی۔ ایک امیر آدمی کا لڑکا فن شعر اور انشاء میں کمال رکھتا تھا۔ اسکی سولہ کتابیں مختلف مضامین پر موجود ہیں جن میں ہجو کا نمبر سب سے بڑھا ہوا ہے۔ زمانہ کی سوسائٹی کی بداخلاقی اور خرابی پر شہر آشوب کی صورت پر جو مضمون لکھے ہیں وہ نہایت سخت اور زور دار زبان میں ہیں جسکے بعض جملے ضرب المثل ہو گئے ہیں۔

[2] پورا نام "فرانسوے ماری والٹیر" فرانس کا مشہور شاعر ڈراما نویس اور ناقد گزرا ہے ۱۶۹۴ء سن ولادت اور ۱۷۷۸ء سنہ وفات۔ فن شعر اور تنقید میں یکتائے زمانہ تھا۔ مرزا غالب کی طرح اُس کے بھی خطوط نہایت دلچسپ اور انشا پردازی کے بہترین نمونے ہیں اُسکے کلام میں ذہانت و طباعی اور انتہا درجہ کی طعن آمیز شوخی اور ظرافت پائی جاتی ہے نہایت آزاد خیال واقع ہوا تھا۔ مذہب کے ساتھ اُسکی بے پروائی، شوخی اور طعن آمیز جملے مشہور ہیں۔ اُسکا ڈراما موسوم بہ "محمد" ایک مشہور کتاب ہے۔

[3] "جانتھن سویفٹ" والٹیر کا معاصر ہے۔ مشہور آیرش افسانہ نویس اور ہجو نگار تھا۔ برخلاف والٹیر کے یہ مذہب کا پابند بلکہ پادری تھا "بیٹل آف دی بکس" (کتابوں کی جنگ) اور "گلیور کے سفر" اُس کی مشہور تصانیف ہیں۔ ملکی سیاسیات میں بھی بہت حصہ لیتا تھا۔ اُسکی تصانیف میں بے انتہا شوخی، مذاق اور طنز ہے مثلاً جب آئرلینڈ کے قصابوں کا جھگڑا پارلیمنٹ میں پیش ہوا تو اُس نے ایک رسالہ لکھا جس کا نام "معقول تجویز" رکھا جسمیں تجویز تھا کہ آئرلینڈ کی مصیبت دور کرنے کی سب سے بہتر ترکیب یہ ہے کہ اس ملک کے بچے حلال کر کے اُن کا گوشت بازار میں بیچا جائے یہ مضمون نہایت پُر مذاق اور طنز آمیز ہے عبارت نہایت صاف سادہ بلا کسی تصنع کے لکھتا تھا جسکی وجہ سے اُس کی تمام تصانیف مقبول عام ہیں ۱۲

[4] جوزف ایڈیسن انگلستان کا سب سے بڑا مشہور مضمون نگار اور نثار گزرا ہے اُسکی مشہور کتاب "اسپکٹیٹر" بہترین ذخیرہ اخلاقی سیاسی۔ اور معاشرتی مضامین کا ہے جسکی سلاست اور شیرینی زبان انگریزی میں مشہور ہے۔ وہ بھی اپنے کلام میں ایک خاص قسم کی ظرافت اور مذاق سے کام لیتا ہے مگر اُس سے کسی کا دل نہیں دکھتا۔ اُس کے کلام میں نہایت متانت اور سنجیدگی ہے برخلاف سویفٹ کے جسکے یہاں طعن و تشنیع بہت ہے ۱۲

اُتر جاتی ہے۔ آزاد نے سچ کہا ہے کہ "جس کے پیچھے پڑتے تھے اُس کو پیچھا چھڑانا مشکل ہوتا تھا"۔

کلام پر رائے

مرزا کو زبان پر پوری قدرت اور شعر پر پوری حکومت حاصل تھی۔ مشکل سے مشکل زمینیں اُن کے سامنے پانی اور ادق مضامین اُن کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے۔ اشعار سب کیل کانٹے سے درست، بندش چست، زوائد و بھرتی کا نام نہیں۔ کلام سانچے میں ڈھلا معلوم ہوتا ہے۔ الفاظ کو اپنے مقام پر ایسا رکھتے تھے جیسے انگوٹھی میں نگینے جڑے جاتے ہیں۔ اگر کوئی لفظ بھول جائے تو دوسرا لفظ اُسکی جگہ پر نہیں رکھ سکتے۔ اگر لفظ اِدھر سے اُدھر رکھ دو تو شعر کا لُطف اور مزا جاتا رہے گا۔ کلام ٹھوس اور زور فصاحت سے بھرا ہوا ہے۔ نئی نئی بحریں اور شگفتہ زمینیں نئے نئے ردیف اور قافیے ایسے کہہ گئے ہیں کہ اب تک دل مزے لیتا ہے۔ سنگلاخ زمینوں میں بھی ایسے ایسے شعر نکالے ہیں جس طرح پتھر سے چشمہ نکلتا ہے۔

سودا کا اثر بعد کے شعرا پر

مرزا کا اثر اپنے زمانے کے اور نیز بعد کے شعرا پر بہت کچھ پڑا۔ اُن کے اشعار پڑھ کر بہت سی منچلی طبیعتوں میں شعر گوئی کا شوق اور مادّہ پیدا ہوگیا۔ اِس خاص صفت کے اعتبار سے اُن کو اُردو شاعری میں وہی مرتبہ حاصل ہے جو اسپنسر[1] کو انگریزی میں ہے جو شاعروں کا شاعر کہلاتا ہے۔ معاصرین سے قطع نظر غالب اور ذوق وغیرہ بھی سب اُن کو مانتے تھے اور اُن کے کلام سے مستفیض ہوتے تھے۔

---

[1] اڈمنڈ سپنسر سولھویں صدی عیسوی کا نامور انگریزی صاحب تصنیف شاعر ہے۔ اُسکی کتاب فری کوئن (پری ملکہ) ایک مشہور نظم ہے۔ اُس نے قدیم لاطینی و یونانی بحر پر نظم انگریزی میں رواج دیکر انگریزی شاعری کا پایہ بلند کیا۔

ناسخ کا قول اوپر نقل ہو چکا ہے۔ غالب ایسا جادو نگار سودا کا قائل ہے اور اُستاد ذوق کا تو پورا کلام مرزا کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے علی الخصوص اُن کے قصائد میں معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کے قصائد سامنے رکھ کر کہے گئے تھے۔ مرزا کے کلام میں بسبب تنوع کے اسقدر مقبولیت اور دلچسپی ہے کہ ہر شخص خواہ وہ شاعر ہو یا غیر شاعر اُس کو پڑھتا ہے اور اُس پر وجد کرتا ہے۔ بعض اشعار میں تو حقیقی شاعری کے ایسے سچے جذبات دکھائے ہیں جو دیگر شعراے اُردو کے کلام میں کمیاب ہیں۔ البتہ انگریزی میں شیلی[1] اور کیٹس[2] کے یہاں بہت کچھ ہیں۔ غرض کہ میر و مرزا دونوں ایسے صاحب کمال تھے جن کا کلام بعض اُس زمانہ کے الفاظ و محاورات کو چھوڑ کر زبان کی صفائی اور شیرینی اور خیالات کی بلندی اور پاکیزگی دونوں اعتبار سے اُردو شاعری کا بہترین نمونہ کہا جا سکتا ہے اور اس زمانہ میں بھی کسی شعر کی سب سے بڑی تعریف یہی ہو سکتی ہے کہ ان قادر الکلاموں کے کسی شعر کے قریب پہونچ جائے۔ سودا کی اُستادی اور ملک سخنوری کی بادشاہت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے وہ قدرتی شاعر تھے اور جذبات شاعری اُن کے خمیر میں پڑے تھے میر ایسا نازک دماغ اور دنیا کو بے حقیقت سمجھنے والا شخص اُن کو پورا شاعر مانتا ہے

---

[1] سو برس اُدھر کا ایک مشہور رنگین طبیعت اور عاشق مزاج انگریزی شاعر تھا۔ تیس برس کے سن میں جوانا مرگ مرا نہایت آشفتہ مزاج اور آزاد خیال آدمی تھا جو اسکی بدنامی کا بھی باعث ہوا۔ اُسکی تصانیف میں کوئن میب (ملکۂ میب) الاسٹر (کُنج تنہائی) اور ریوولٹ آف اسلام مشہور ہیں اُس کے خیالات نہایت شاعرانہ اور بلند ہوتے تھے ۱۲

[2] شیلی کا معاصر تھا اور مثل اُسی کے نوجوان مرا۔ اُسکی کتاب 'انڈائمین' نہایت دلچسپ ہے۔ نازک خیال اور رنگین طبیعت شاعر تھا۔ خود نہایت حسین اور حُسن کا عاشق تھا ۱۲

اور اُن کو ملک الشعرائی کا مستحق قرار دیتا ہے۔ مرزا کے کلام سے ظاہر ہو رہا ہے کہ اُن کا دل جذبات سے کس درجہ متاثر ہوتا ہے۔ اُن کے اشعار میں ترشے ہوئے نگینوں کی سی آبداری اور انعکاس اور اُن کا دماغ اعلیٰ تخئیل سے روشن ہے۔ مرزا میں چند خاص باتیں ہیں جو اُن کے کلام کو جملہ شعرائے ماضی و حال سے ممتاز کر دیتی ہیں۔

(۱) زبان پر کامل قدرت جس سے کلام کا زور مضمون کی لطافت اور نزاکت سے مل کر عجب لطف و اثر پیدا کر دیتا ہے۔

(۲) بندش کی چستی اور الفاظ کی نشست و ترکیب جس سے شعر میں ڈھیلا پن اور سستی مطلق باقی نہیں رہتی بلکہ اُنمیں تلوار صفاہانی کی سی آبداری پیدا ہوجاتی ہے نشست الفاظ کی یہ صفت ہے کہ اگر کوئی لفظ اِدھر اُدھر ہو جائے تو شعر بیمزہ بلکہ مہمل ہوجائے گا صنعت کی خوبی سے صناع کی قابلیت کا پتہ چلتا ہے۔

(۳) خیالات کی بلندی اور نزاکت ہے۔ البتہ کچھ استعاروں اور تشبیہوں سے کام لیتے ہیں مگر صرف اسی قدر کہ شعر کا حسن بڑھ جائے اور سامع کو مطلب ٹٹولنا نہ پڑے۔ اُن کا سامان زینت شعر کے حقیقی حسن کو کبھی نہیں چھپاتا۔ ان کی طبیعت ایک رنگ کی پابند نہ تھی۔ جو بات اور لوگوں کو سخت کاوش اور محنت سے میسر ہوتی تھی وہ اُن کو ایک جنبش قلم سے حاصل ہو جاتی تھی۔ یہ تخیل اور قدرت زبان کا اثر تھا۔

(۴) چوتھی چیز اُن میں تصفیۂ زبان ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ جن لوگوں نے زبان کو پاک صاف اور نیز وسیع کیا اُن سب میں مرزا کا نمبر اول ہے۔ بقول مصنف آبحیات جس طرح کیمیا داں دو مادوں سے تیسرا مادہ تیار کرتے ہیں انھوں نے فارسی اور ہندی کے امتزاج سے ایک تیسری زبان پیدا کی جسے

مقبولیت عام حاصل ہوئی۔

مرزا کے کلام پر شعرا کی رائیں۔

اب بے موقع نہ ہوگا کہ مرزا صاحب سے متعلق اُن کی اور نیز اُن کے بعد کے شعرا اور تذکرہ نویسوں کی بھی قیمتی اور قابل قدر رائیں بلکہ اُن کا اقتباس یہاں تحریر کیا جائے۔ میر تقی میر اپنے تذکرہ نکات الشعراء میں اُن کی نسبت فرماتے ہیں۔ خود اُنھیں کی زبان سے سُنیے "مرزا رفیع متخلص بہ سودا جوانے است خوش خلق و خوشخو، گرم جوش، یار باش، شگفتہ رو۔۔۔۔۔ غزل و قصیدہ و مثنوی و قطعہ و مخمس و رباعی ہمہ را خوب می گوید۔ سرآمد شعرائے ہندی اوست۔ بسیار خوش گوست۔ ہر شعرش طرف لطف رستہ رستہ۔ در چمن بندی الفاظش گل معنی دستہ دستہ۔ ہر مصرعہ برجستہ اش را سرو آزاد بندہ۔ پیش طبع عالیش فکر عالی شرمندہ۔ شاعر ریختہ چنانچہ ملک الشعرائی ریختہ او را شاید قصیدہ در ہجو اسپ گفتہ موسوم بہ تضحیک روزگار دور از حد مقدور در صنعتہا بکار بردہ۔ اکثر اتفاق طرح غزل باہم می افتد۔ غرض از مغتنمات روزگار است حق تعالیٰ سلامتش دارد"۔

اسی طرح مرزا قتیل چار شربت میں مرزا کے قصائد کی نسبت لکھتے ہیں کہ "سودا کا مرتبہ قصائد میں ظہوری کے برابر ہے۔ سوائے اِس کے کہ دونوں کا طرز الگ الگ ہے۔ اور کوئی فرق نہیں ہے" اس تنقید پر مصنف آبحیات کی رائے ہے۔ کہ "مرزا قتیل جو چاہیں کہیں مجھ بے کمال نے ظہوری کی غزلیں اور قصائد تھوڑے بہت پڑھے ہیں دونوں استعاروں اور تشبیہوں کے پھندوں سے اُلجھا ہوا ریشم معلوم ہوتے ہیں۔ مرزا کی مشابہت ہے تو انوری سے ہے جو قصائد اور ہجو

اور نیز محاورے اور زبان دونوں کا بادشاہ ہے۔" اسی طرح صاحب طبقات الشعرا مرزا کے قصائد کو عرفی اور خاقانی کے قصائد سے اور اُن کی غزلوں کو سلیم و کلیم کی غزلوں سے بڑھ کر سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ پُرگو بھی تھے اور خوش گو بھی تھے میر حسن اپنے تذکرہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ "مرزا سودا کے مقابلہ میں ابتک کوئی شخص ہندوستان سے نہیں اُٹھا اور وہ موسیقی کے بھی ماہر تھے اور فقیر اُن کی خدمت میں اکثر حاضر ہوتا ہے اور وہ میرے اوپر کرم فرماتے ہیں۔" حکیم قدرت اللہ خاں بقا اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں "مرزا محمد رفیع سرآمد شعراے فصاحت ہیں بعض کے نزدیک وہ غزل گوئی میں میر تقی میر کو نہیں پہونچتے۔ سچ یہ ہے کہ ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است۔ مرزا ایک بے کنار سمندر اور میر ایک عظیم الشان دریا ہیں۔ قواعد کی معلومات میں میر صاحب کو مرزا صاحب پر برتری ہے اور قوت شاعری میں مرزا صاحب کو میر صاحب پر فوقیت ہے۔" تذکرہ گلشن بیخار میں ہے کہ "فقیر کی دانست میں اُن کی غزلیں اُن کے قصیدوں سے اور اُن کے قصیدے اُن کی غزلوں سے بہتر ہیں۔ اگر کوئی یہ کہے کہ غزلوں میں بھرتی کے اشعار ہیں اور قصائد ان سے خالی ہیں تو میں کہوں گا کہ اُن کے دیوان کو سمجھ کر پڑھنے والوں پر اس راے کی قباحت ظاہر ہو جائے گی۔" پروفیسر شہباز شمس العلما نواب امداد امام صاحب اثر کا قول نقل کرتے ہیں کہ سودا اُردو کے شکسپیر تھے۔ اسی طرح سر الفرڈ لائل سودا کو زبان اُردو کا سب سے بڑا شاعر تسلیم کرتے ہیں۔

کلام میں کمی مرزا میں دو تین کمیاں بھی ہیں (۱) اُن کا کلام کم و بیش تصوف کی چاشنی سے خالی ہے جس کا اُن کے اکثر ہمعصروں میں بہت زور تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مطالعہ اور ذوق معاملات دنیاوی تک محدود ہے (۲) دوسرے لطف غزل اُن میں کم ہے یعنی اُن کی غزلوں میں وہ سوز و گداز اور سُبکی اور سادگی نہیں جو غزل کی جان ہے۔ اس کا مُفصل ذکر انشاء اللہ میر تقی میر کے حالات میں آئے گا جہاں ان دونوں کی شاعری کا مقابلہ کیا گیا ہے۔

میر حسن متوفی ۱۲۰۱ھ مطابق ۱۷۸۶ء

میر غلام حسن متخلص بہ حسن معروف بہ میر حسن میر غلام حسین ضاحک کے وہ بلند اقبال صاحبزادے تھے جن کے بیٹے خلیق اور پوتے میر انیس ہوئے جو فلاک شاعری پر آفتاب بن کے چمکے۔ ان کے اجداد شہر ہرات کے مشہور خانوادۂ سادات سے تھے۔ جدّ اعلیٰ میر امامی نام ہندوستان آئے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کی۔

میر حسن اپنے زمانہ کے نامی گرامی شاعر جیّد فاضل اور مشہور خوشنویس تھے۔ اور ان کمالات کی وجہ سے اپنے ہمچشموں اور ہمعصروں میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے اُن کے والد میر ضاحک نہایت زندہ دل ظریف اور باغ و بہار آدمی تھے۔ جیسا کہ اُن کے تخلص سے ظاہر ہے۔ میر حسن کی ولادت پُرانی دِلّی کے محلہ سیّد واڑہ میں ۱۱۴۰ھ میں ہوئی اور بچپن میں درسی تعلیم اپنے والد ہی سے حاصل کی اور کلام بھی اُنھیں کو دکھایا اُس کے بعد خواجہ میر درد کے شاگرد ہوئے۔ دہلی کی تباہی کے بعد اپنے والد کے ہمراہ فیض آباد آئے۔ راستہ میں تھوڑے عرصہ تک ڈیگ میں قیام کیا۔ ایک مرتبہ شاہ مدار کی چھڑیوں کے ساتھ سفر کیا جس کا مفصل حال اپنی مثنوی گلزار ارم میں قلمبند کیا ہے[۱]۔

[۱] گلزار ارم میں لکھنؤ کی ہجو اور فیض آباد کی بہت تعریف ہے۔ اس مثنوی کا ایک نہایت صحیح اور خوشخط نسخہ کتبخانہ ندوہ میں ہے۔ (دیکھو تذکرہ گل رعنا)

فیض آباد میں پہونچ کر نواب سالار جنگ بہادر برادر بہو بیگم صاحبہ کی ملازمت اختیار کی اور اُن کے بیٹے مرزا نوازش علی خاں کی مصاحبت میں بھی چند دن رہے۔ جب نواب آصف الدولہ ۱۷۷۵ء میں تخت سلطنت پر بیٹھے۔ اور فیض آباد بدل کر لکھنؤ دارالسلطنت ہوگیا تو میر حسن بھی لکھنؤ چلے آئے اور تھوڑے دن قیام کر کے یہیں ماہ محرم ۱۲۰۱ھ میں انتقال[1] کیا۔ بروقت وفات عمر پچاس سال سے متجاوز تھی۔ مصحفی نے تاریخ کہی "شاعر شیریں بیاں" جس سے تاریخ ۱۲۰۱ھ نکلتی ہے۔ مرزا علی لطف ۱۲۰۵ھ لکھتے ہیں جو زیادہ قابل اعتبار نہیں ہے۔

تعلیم اور شاگردی میر حسن عربی کم جانتے تھے۔ مگر فارسی میں کمال حاصل تھا۔ اور اس زبان میں کمال بے تکلفی اور سادگی سے لکھتے تھے چنانچہ اُن کا تذکرہ "شعرائے اُردو" جو نہایت اعلیٰ درجہ کی فارسی میں ہے اس کا شاہد ہے۔ شاگردی کی نسبت تذکرہ نویسوں میں اختلاف ہے مصنف آبحیات لکھتے ہیں کہ سودا کے شاگرد تھے۔ میر تقی لکھتے ہیں "جوان اہلے ست نوکر پیشہ اکثر در بندہ خانہ در تقریب مجلس تشریف می آرد وضع مرد آدمیانہ می دارد مشق شعر از مرزا رفیع می کند" میر حسن خود اپنی نسبت لکھتے ہیں "اصلاح سخن از میر ضیا سلمہ اللہ گرفتہ ام لیکن طرز او شاں از من کما حقہ سر انجام نیافت۔ بر قدم دیگر بزرگان مثل خواجہ میر درد و مرزا رفیع سودا و میر تقی پیروی نمودہ ام" اس سے ظاہر ہے کہ وہ رسمی طور پر میر ضیاء الدین ضیا کے شاگرد تھے اور تینوں اصحاب مذکورۂ بالا کی پیروی کرتے تھے۔

---

[1] عقب باغ نواب سرفراز خان محلہ مفتی گنج لکھنؤ میں مدفون ہیں (تذکرہ خمخانہ جاوید جلد ۲)

اور ممکن ہے مشورۂ سخن بھی کرتے ہوں۔ فطرتاً نہایت خوش مزاج ہشاش بشاش ظریف اور بذلہ سنج تھے۔ ہزل اور فحش سے کبھی زبان کو آلودہ نہیں کیا۔ نہایت شیریں زبان، خلیق اور قابل تھے۔ کسی شخص کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ اور نہ کسی تذکرہ نویس نے ایک حرف اُن کے خلاف لکھا ہے۔

طرزِ کلام کلام نہایت سلیس اور صاف ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے منھ سے پھول جھڑتے ہیں۔ غزل، رباعی۔ مثنوی۔ مرثیہ سب خوب کہتے تھے۔ البتہ قصیدہ زوردار نہ تھا۔ مثنوی میں کمال حاصل تھا۔ چنانچہ ان کی مشہور مثنوی "سحر البیان" معروف بہ "مثنوی میر حسن" اُردو میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ اُن کی غزلیں میر سودا اور میر تقی میر کی غزلوں کا لطف دیتی ہیں۔ وہی عاشقانہ رنگ، وہی سادگی، وہی دلفریبی۔

میر حسن کے صاحبزادے میر حسن کے چار بیٹے تھے جن میں سے تین شاعر تھے۔ میر مستحسن خلیق جو مصحفی کے شاگرد تھے میر محسن محسن۔ یہ دونوں نواب آصف الدولہ کی والدہ نواب بہو بیگم صاحبہ کے داماد مرزا محمد تقی کی سرکار سے تعلق رکھتے تھے۔ تیسرے بیٹے میر احسن خُلق نواب ناظر داراب علی خاں کی خدمت میں رہتے تھے۔ یہ سب اچھے شاعر تھے اور اپنے پدر بزرگوار کے رنگ میں کہتے تھے خلیق اور خلق کے دیوان بھی ہیں۔

تصانیف حسب ذیل ہیں

(۱) ایک دیوان غزلوں کا مشتمل بر جملہ اقسام سخن۔ ترکیب بند۔

مخمس، واسوخت، مثلث وغیرہ جس میں فارسی شعر پر تیسرا مصرع خواہ فارسی میں یا اُردو میں لگایا ہے -

(۲) گیارہ مثنویاں جس میں سے حسب ذیل نہایت مشہور ہیں -

(۱) مثنوی سحر البیان یا قصۂ بے نظیر و بدر منیر۔ لاجواب اور بے عدیل و بے نظیر مثنوی ہے ۱۱۹۹ھ مطابق ۱۷۸۵ء میں تحریر ہوئی۔ جیسا کہ قتیل اور مصحفی کی تاریخوں سے ثابت ہوتا ہے۔ اور نواب آصف الدولہ بہادر کے نام پر معنون ہوئی۔ اس میں شاہزادہ بے نظیر اور شاہزادی بدر منیر کے عشق کا فسانہ ہے جس میں ضمناً نہایت دلچسپ جزئیات مثلاً قدیم زمانہ کا لباس، زیور، شادی بیاہ کے رسوم، برات کا سامان وغیرہ وغیرہ نہایت خوبی سے بیان کیے ہیں۔ عبارت اسقدر صاف اور با محاورہ ہے کہ صدہا شعر محاورہ کی صورت میں زبانوں پر چڑھ گئے ہیں۔ اُس کا ہر مصرع لاجواب اور ہر شعر انتخاب ہے۔ صفائی بیان، لطف محاورہ، شوخی مضمون، قابل دید ہے سوال جواب کی نوک جھونک، پر لطف مذاق کی باتیں ایسی ہیں جنکو پڑھ کے دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ اور ان سب پر طرہ یہ کہ کتاب کو لکھے ڈیڑھ سو برس ہو گئے۔ زبان وہی ہے جو ہم آپ بولتے ہیں۔ مولانا آزاد حیرت سے پوچھتے ہیں "کیا اُسے سو برس آگے والوں کی باتیں سنائی دیتی تھیں کہ جو کچھ کہا صاف وہی محاورہ اور وہی گفتگو ہے جو اب ہم تم بول رہے ہیں" قصہ پُرانے رنگ کا ہے۔ اس کا ترجمہ نثر میں ایک شخص مسمٰی میر بہادر علی نے ۱۲۱۷ھ میں کیا تھا جس کا نام نثر بے نظیر رکھا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر

ہم اصل مثنوی سے ایسے اشعار منتخب کر کے لکھیں جس سے قصہ کی تمام کڑیاں مل جائیں اور پورا قصہ بآسانی سمجھ میں آجائے

اختصار مثنوی میر حسن مسلسل بصورت افسانہ

کسی شہر میں تھا کوئی بادشاہ
کہ تھا وہ شہنشاہِ گیتی پناہ

کسی طرح کا وہ نہ رکھتا تھا غم
مگر ایک اولاد کا تھا اَلَم

وزیروں کو اِک روز اُس نے بُلا
جو کچھ دل کا احوال تھا سو کہا

کہ میں کیا کروں گا یہ مال و منال
فقیری کا ہے میرے دِل کو خیال

وزیروں نے کی عرض کاے آفتاب
نہ ہو ذرہ تجھ کو کبھی اضطراب

یہ دُنیا جو ہے مزرعِ آخرت
فقیری میں ضائع کرو اُس کو مت

مگر ہاں جو اولاد کا ہے یہ غم
سو اِس کا تردّد بھی کرتے ہیں ہم

بُلاتے ہیں ہم اہلِ تنجیم کو
نصیبوں کو اپنے ذرا دیکھ لو

بُلا کر اُنھیں شہ کنے لے گئے
جونہی روبرو سب وہ شہ کے گئے

کہا رام جی کی ہے تجھ پر دَیا
چندرماں سا بالک ترے ہوئیگا

یہ لڑکا تو ہوگا و لے کیا کہیں
خطر ہے اسے بارھویں سال میں

نہ آئے یہ خورشید بالائے بام
بلندی سے خطرہ ہے اس کو تمام

نہ نکلے یہ بارہ برس رشک مہ
رہے بُرج میں یہ مہِ چاردہ

گئے نو مہینے جب اُس پر گذر
ہوا گھر میں شہ کے تولّد پسر

ہوا وہ جو اس شکل سے دلپذیر
رکھا نام اُس کا شہِ بےنظیر

پڑی جب گرہ بارھویں سال کی — کھلی گلجھڑی غم کے جنجال کی
کہا شہ نے بلوا نقیبوں کو شام — کہ ہوں صبح حاضر سبھی خاص و عام
رعیّت کے خوش ہوں صغیر و کبیر — کہ نکلے گا کل شہر میں بے نظیر
کہا شاہ نے اپنے فرزند کو — کہ بابا نہا دھو کے تیّار ہو
نہا دھو کے نکلا وہ گُل اس طرح — کہ بدلی سے نکلے ہے مہ جس طرح
غرض ہو کے اس طرح آراستہ — خراماں ہوا سروِ نو خاستہ
گھڑی چار تک خوب سی سیر کر — رعیت کو دکھلا کے اپنا پسر
اُسی کثرتِ فوج سے ہو سوار — پھرا شہر کی طرف وہ شہریار
قضارا وہ شب تھی شب چاردہ — پڑا جلوہ لیتا تھا ہر طرف مہ
کچھ آئی جو اُس مہ کے جی میں ترنگ — کہا آج کوٹھے پہ بچھّے پلنگ
خواصوں نے جا شاہ سے عرض کی — کہ شہزادے کی آج یوں ہے خوشی
ارادہ ہے کوٹھے پہ آرام کا — کہ بھایا ہے عالم لبِ بام کا
کہا شہ نے اب تو گئے دِن نکل — اگر یوں ہے مرضی تو کیا ہے خلل
قضارا وہ دِن تھا اُسی سال کا — غلط وہم ماضی میں تھا حال کا
زبس نیند میں تھا جو وہ ہو رہا — بچھونے پہ آتے ہی وہ سو رہا
قضارا ہوا اِک پری کا گذر — پڑی شاہزادے پر اُسکی نظر
ہوئی لاکھ جی سے وہ اُس پر نثار — وہ تخت اپنا لائی ہوا سے اُتار
محبت کی آئی جو دل میں ہوا — وہاں سے اُسے لے اُڑی دلربا
قضارا کھلی آنکھ اُس گل کی جو — نہ پائی وہاں شہر کی اپنے بُو

نہ وہ لوگ دیکھے نہ وہ اپنی جا تعجب سے اِک اِک کو تکتا رہا

اچنبھے کا یہ خواب دیکھا جو واں لگا کہنے یارب میں آیا کہاں

سرہانے جو دیکھی مہ چار دہ کہ ہے اجنبی سی وہ اک رشک مہ

کہا کون ہے تو یہ کس کا ہے گھر لے آیا مجھے کون گھر سے اِدھر

پھرا منہ کو لے اور اُدھر سے نقاب دیا اُس پری نے یہ ہنس کر جواب

خُدا جانے تو کون ہیں ہوں کہاں مجھے بھی تعجب ہے میں ہوں جہاں

یہ گھر گو کہ میرا ہے تیرا نہیں پر اب گھر یہ تیرا ہے میرا نہیں

چُھڑا کر ترا تجھ سے شہر و دیار یہ بندی ہی لائی ہے تقصیر وار

پری ہوں میں اور یہ پرستان ہے یہاں سب یہ قوم بنی جان ہے

غرض دل کو جوں توں لگایا وہاں کہا اُس نے جو کچھ کہا اُس کو ہاں

ولیکن نہ عقل و نہ ہوش و حواس رہے وحشیوں کی طرح وہ اُداس

وہ تھی نازنیں بھی بہت عقلمند نہ کھُلنے سے کچھ اُسکے ہوتی تھی بند

غرض ماہ رُخ اُس پری کا تھا نام پدر سے کیا تھا یہ پوشیدہ کام

کہا ایک دِن اُس نے اے بےنظیر مرے دام میں تو ہوا ہے اسیر

تو رُک رُک کے کر اپنے جی کو نہ بند نہ پہنچے کہیں تیرے جی کو گزند

یہ گھوڑا تو کل دونگی کل کا تجھے ولیکن یہ دے تو مُچلکا مجھے

کہ گر شہر کی طرف جائے کہیں دیا دِل کسی سے لگائے کہیں

تو پھر حال ہو جو گنہگار کا وہی حال ہو تجھ سے دلدار کا

کہا کیونکہ میں تم کو جاؤں گا بھول مجھے جو کہا تم نے سب ہے قبول

یہ گھوڑا جو اُس گل کے تھا نجش کا ۔۔۔ فلک سیر تھا نام اُس رخش کا
سرِ شام وہ بے نظیرِ جہاں ۔۔۔ اُسی رخش پر ہو کے جلوہ کناں
ہر اک طرف سے ہو گزرتا تھا وہ ۔۔۔ وہی اک پہر سیر کرتا تھا وہ
پہر جبکہ بجتا تو پھرتا شتاب ۔۔۔ کہ پھر قہر تھا ماہرخ کا عتاب
سنو ایک دن کی یہ تم واردات ۔۔۔ اُٹھا سیر کو بے نظیر ایک رات
ہوا ناگہاں اُس کا اک جا گزر ۔۔۔ سہانا سا اک باغ آیا نظر
سفید ایک دیکھی عمارت بلند ۔۔۔ کہ تھی نور میں چاندنی سے دوچند
یہ عالم جو بھایا تو کوٹھے پہ آ ۔۔۔ اُترا اپنے گھوڑے سے اور سر جھکا
لگا جھانکنے اُس مکاں کے تئیں ۔۔۔ کہ دیکھوں یہاں کوئی ہے یا نہیں
جو دیکھا تو ایسا کچھ آیا نظر ۔۔۔ کہ سب کچھ گیا اُس کے جی سے اُتر
کہا جی سے اب تو جو کچھ ہو سو ہو ۔۔۔ ذرا چل کے اس سیر کو دیکھ لو
یہ کہہ نیچے اُترا دبے پاؤں وہ ۔۔۔ نظر سے بچائے ہوئے چھاؤں وہ
الگ کھول ہاتھوں سے واں کے کواڑ ۔۔۔ چلا سائے سائے درختوں کی آڑ
تھے اک طرف گنجان باہم درخت ۔۔۔ کہ لپٹے ہوں جس طرح مشتاق سخت
لگا واں سے چھپ چھپ کے کرنے نظر ۔۔۔ درختوں سے جوں ماہ ہو جلوہ گر
جو دیکھی تو صحبت عجب ہے وہاں ۔۔۔ عجب چاندنی ہے عجب ہے سماں
ملی جنس کی اپنے جو اُس کو بُو ۔۔۔ لگا تکنے حیرت سے ہر ایک سو
عجب صورتیں اور طرفہ محل ۔۔۔ چلا دیکھتے ہی دل اُس کا نکل
گئی اُس کے عالم پہ جب دم نگاہ ۔۔۔ اور آئی نظر اُس میں اک رشک ماہ

برس پندرہ ایک کا سن و سال — نہایت حسیں اور صاحب جمال
دیے کہنی تکیے پہ اک ناز سے — سرِ نہر بیٹھی تھی انداز سے
خواصیں کھڑی ایدھر اودھر تمام — ستاروں کا جوں ماہ پر اژدہام
قد و قامت آفت کا ٹکڑا اتمام — قیامت کرے جس کو جھک کر سلام
یہ قدرت کا دیکھا جو اُسنے کمال — کہا شاہزادے نے یا ذا الجلال
درختوں سے وہ دیکھتا تھا نہاں — کسی کی نظر جا پڑی ناگہاں
جو دیکھے تو ہے اک جوانِ حسیں — درختوں کی ہے اوٹ میں مہ جبیں
کسی نے کہا ہے پری یا کہ جن — کسی نے کہا ہے قیامت کا دن
یہ آپس میں باتیں جو ہونے لگیں — اشاروں سے گھاتیں جو ہونے لگیں
گئے بات پر شاہزادی کے گوش — یہ سنتے ہی جاتا رہا اُس کا ہوش
کہا میں تو دیکھوں یہ کہہ کر اُٹھی — گیا سنسنا جی تو رہ کر اُٹھی
خواصوں کے کاندھے پہ رکھ اپنا ہاتھ — عجب اک ادا سے چلی ساتھ ساتھ
جو دیکھیں تو ہے اِک جوانِ حسیں — کھڑا ہے وہ آئینہ ساں مہ جبیں
برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن — جوانی کی راتیں مرادوں کے دِن
ولے عشق کی تیغ کھائے ہوئے — کڑا دل کسی پہ لگائے ہوئے
گئی اُس جگہ جب کہ بدرِ منیر — اور اُس نے جو دیکھا شہِ بے نظیر
گئے دیکھتے ہی سب آپس میں مِل — نظر سے نظر جی سے جی دل سے دِل
غرض بے نظیر اور بدرِ منیر — گرے دونوں آپس میں ہو کر اسیر
تھی ہمراہ اِک اُس کی دختِ وزیر — نہایت حسیں اور قیامت شریر

شتابی سے لا اُس نے چھڑکا گلاب
تب آئی تنوں میں ذرا اُن کے تاب

وہ اُٹھنے تو اُٹھی پہ حیران سی
گل شبنم آلودہ گریان سی

چلی اُس کے آگے سے مُنہ موڑ کر
وہیں نیم بسمل اُسے چھوڑ کر

غضب مُنھ پہ ظاہر نہاں دل میں چاہ
نہاں آہ آہ اور عیاں واہ واہ

یہ ہے کون کم بخت آیا یہاں
میں اب چھوڑ گھر اپنا جاؤں کہاں

یہ کہتی ہوئی آن کی آن میں
چھپی اپنے جا کر وہ دالان میں

کہ اتنے میں آئی وہ دخترِ وزیر
لگی ہنس کے کہنے کہ بدرِ منیر

مری طرف ٹک دیکھ تو ہائے ہائے
مثل ہے کہ من بھائے مُنڈیا ہلائے

ترے گھر میں آیا ہے مہماں غریب
یہ ہے وارداتِ غریب و عجیب

شتابی سے مجلس کو تیار کر
تو اِس گل سے گھر رشکِ گلزار کر

بُلا لائی جا اُس جواں کے تئیں
کیا میزباں میہماں کے تئیں

بلا اک مکاں میں بٹھایا اُسے
محل کا سماں سب دکھایا اُسے

کھلا بند جس دم درِ گفتگو
جواں نے حقیقت کہی مو بمو

پری کا بھی احوال ظاہر کیا
چھپے راز سے اُس کو ماہر کیا

کہا اک پہر کی ہے رخصت مجھے
زیادہ نہیں اِس سے فرصت مجھے

رہی دل ہی دل میں غرض دل کی بات
پہر بھر گئی اتنے عرصے میں رات

خبر رات کی سن اُٹھا بینظیر
کہا اب میں جاتا ہوں بدرِ منیر

اگر قید سے چھوٹنے پاؤں گا
تو پھر آج کے وقت کل آؤں گا

بندھا پھر تو معمول اُس کا مدام ۔۔۔ کہ ہر روز آتا اُدھر وقت شام

پھر رات تک ہنسنا اور بولنا ۔۔۔ درِ عشق اور حُسن کو کھولنا

کبھی ہجر سے اُن کو ہونا ملول ۔۔۔ کبھی وصل میں بیٹھنا پھول پھول

کسی دیو نے دی پری کو خبر ۔۔۔ کہ معشوق عاشق ہوا اور پر

یہ سُن کر وہ شعلہ بھبوکا ہوئی ۔۔۔ لگی کہنے ایں یہ بلا کیا ہوئی

قسم مجھ کو حضرت سلیمانؑ کی ۔۔۔ ہوئی دشمن اب اُسکی میں جان کی

کہا دیو سے تو مجھے دے پتا ۔۔۔ کہا وہ کسی باغ میں تھا کھڑا

کوئی نازنیں سی تھی اِک اُسکے ساتھ ۔۔۔ کھڑی تھی دیے ہاتھ میں اُسکے ہاتھ

قضارا اُڑا میں جو ہوکر اُدھر ۔۔۔ یہ دونوں مجھے واں پڑے تھے نظر

یہ اُڑتی سی سُن کر خبر وہ پری ۔۔۔ کہا دیکھنے پاؤں اُس کو ذری

غضب ناک بیٹھی تھی یہ تو اِدھر ۔۔۔ کہ اِتنے میں آیا وہ رشکِ قمر

بلا سی وہ دیکھ اُس کے پیچھے پڑی ۔۔۔ کہا سُن تو اے موذی و مدّعی

تجھے سیر کو میں نے گھوڑا دیا ۔۔۔ کہ اُس مال زادی کو جوڑا دیا

مزا چاہ کا دیکھ اپنی ذرا ۔۔۔ جھنکاتی ہوں کیسے کنویں رہ بھلا

یہ کہہ اور بُلا اِک پریزاد کو ۔۔۔ کہا سُننا اِس کی نہ فریاد کو

اِسے کھینچتا یاں سے لیجا شتاب ۔۔۔ وہ صحرا جو ہے درد و محنت کا باب

کنواں اُس میں جو ہے مصیبت بھرا ۔۔۔ کئی من کا پتھر ہے واں پر دھرا

اِسے جاکے اُس چاہ میں بند کر ۔۔۔ وہی سنگ پھر اُسکے مُنھ پر تو دھر

سرِ شام کھانا کِھلانا اُسے ۔۔۔ اور اِک جام پانی پلانا اُسے

نہ دیکھو سوا اِس کے گر کچھ کہے ‌ ‌ یہی اُس کا معمول دائم رہے
کیا بند پھر جا کے اُس چاہ میں ‌ ‌ کنواں وہ جو تھا قاف کی راہ میں
پھنسا اس طرح سے جو وہ بےنظیر ‌ ‌ پڑی بے قراری میں بدرِ منیر
کئی دن نہ آیا جو وہ رشکِ ماہ ‌ ‌ نظر میں ہوا اُس کے عالم سیاہ
لگی کہنے نجم النسا سے بُوا ‌ ‌ خدا جانے اُس شخص کو کیا ہوا
کہا اُس نے بی تم کو سودا ہے کچھ ‌ ‌ وہ معشوق ہے اُس کو پروا ہے کچھ
خدا جانے کس شغل میں لگ گیا ‌ ‌ مری چڑ ہے اتنا بھی ہونا فدا
لگی کہنے تب اُس کو بدرِ منیر ‌ ‌ کہ سُنتی ہے اے میری دخترِ وزیر
مجھے رات دن اس کا رہتا ہے ڈر ‌ ‌ پری نے سُنی ہو نہ یاں کی خبر
نہ باندھا ہو اُس کو کسی قید میں ‌ ‌ کیا ہو نہ اُس کے تئیں قید میں
گئی منڈکری مار آخر کو لیٹ ‌ ‌ چھپر کھٹ کے کونے میں مُنہ کو لپیٹ
ذرا آنکھ لگ گئی جو اس حال میں ‌ ‌ تو دیکھا بہت اُس کو جنجال میں
قضا نے دکھایا عجب اُس کو خواب ‌ ‌ کہ دشمن نہ دیکھے یہ حالِ خراب
جو دیکھے تو صحرا ہے اک لق و دق ‌ ‌ کہ رستم جسے دیکھ ہو جائے فق
نہ انسان ہے واں نہ حیوان ہے ‌ ‌ فقط اک کفِ دست میدان ہے
مگر بیچ میں اُس کے ہے اک کنواں ‌ ‌ کہ اُٹھتا ہے آہوں کا وانسے دھواں
کنوئیں کا ہے منہ بند اُس سے اڑی ‌ ‌ کئی لاکھ من کی سِل اُس پر پڑی
صدا واں سے آتی ہے بدرِ منیر ‌ ‌ ترے چاہ غم میں ہوا ہوں اسیر
میں بھولا نہیں تجھ کو اے میری جان ‌ ‌ کروں کیا کہ ہے مجھ پہ قیدِ گراں

یکایک گئی آنکھ اتنے میں کھل
پڑے اشک رخسار پر اُس کے ڈھل

سُنا جب کہ نجم النسا نے یہ حال
ہوئی بیقراری تب اُس کو کمال

لگی کہنے وہ یوں نہ آنسو بہا
ترے واسطے میں نے یہ دُکھ سہا

بس اب سر بصحرا نکلتی ہوں میں
اُسے ڈھونڈھ لانے کو چلتی ہوں میں

کہا شاہزادی نے سن اے رفیق
ہوئی میں تو اس چاہ غم میں غریق

بھلی چنگی اپنی نہ کھو جان تو
کہ وہ ہے پری اور انسان تو

کہا اُس نے کیا کیجئے اب بھلا
پڑی اب تو ہے اپنے سر پہ بلا

تجھے دیکھنا یوں گوارا نہیں
اس اندوہ کا مجھ کو یارا نہیں

یہ کہہ اُس نے رُو رُو اُتارا سنگار
کیا اپنی پشواز کو تار تار

پھر آئے جو کچھ اُس کے ہوش و حواس
سجا تن پہ جوگن کا اُسنے لباس

چلی بن کے جوگن وہ باہر کے تئیں
دکھاتی ہوئی چال ہر ہر کے تئیں

جُدا ہو کے القصہ روتوں کو چھوڑ
چلی اپنے گھر بار سے مُنھ کو موڑ

نہ سُدھ بُدھ کی لی اور نہ منگل کی لی
نکل شہر سے راہ جنگل کی لی

لئے بین پھرتی تھی صحرا نورد
تنِ چاک چاک اور رُخِ زرد زرد

قضارا اُٹھانا سا اِک دشت تھا
کہ اِک شب ہوا اُسکا واں بسترا

وہ تھی اتفاقاً شبِ چاردہ
ادا سے وہ بیٹھی تھی واں رشکِ مہ

بچھا مرگ چھالے کو اور لیکے بین
دوزانو سنبھل کر وہ زہرہ جبین

کِدارا بجانے لگی شوق میں
لگی دست و پا مارنے ذوق میں

بندھا اُس جگہ اس طرح کا سماں
صبا بھی لگی رقص کرنے وہاں

یہاں تو یہ عالم تھا اور طور یہ / اُس اوپر مزا تم سنو اور یہ
کہ تھا اک پری زاد فرخ سیر / جنوں کے وہ تھا بادشہ کا پسر
ہوا پر اُڑائے ہوئے اپنا تخت / کسی طرف جاتا تھا فیروز بخت
وہ جاتا تھا کرتا ہوا سیر ماہ / اُسے لوگ کہتے تھے فیروز شاہ
یکایک سُنی بین کی جو صدا / وہاں تخت لا اپنا اُس نے رکھا
جو دیکھے تو جوگن ہے اک رشکِ حور / کہ چشمِ فلک نے نہ دیکھا یہ نور
نظر کر کے حُسن اُس کا غش کر گیا / تعشق کے عالم میں بس مر گیا
یہ سمجھا بنا دے کا کچھ بھیس ہے / لگا کہنے جوگی جی آدیس ہے
پڑا تم پہ ایسا کہو کیا بجوگ / لیا واسطے جس کے تم نے یہ جوگ
وہ سمجھی کہ دل اُس کا آیا اِدھر / کہ دل بھی تو رکھتا ہے دِل کی خبر
کہا ہنس کے جوگن نے ہر بول ہر / جہاں سے تو آیا چلا جا اُدھر
گیا بیٹھ آ سامنے رِیت میں / ہوا کھیت یہ تو اُسی کھیت میں
بجاتی رہی بین وہ صبح تک / یہ رویا کیا سامنے بے دھڑک
دھری اپنے کاندھے پہ جب اُسنے بین / اُٹھی لے کے انگڑائی زہرہ جبین
پریزاد نے تب پکڑ اُس کا ہاتھ / شتابی بٹھا تخت پر اپنے ساتھ
زمیں سے اُڑا آسماں کے تئیں / وہ کِتنی کہا کی نہیں رے نہیں
نہ مانا اور اُس نے اُٹھایا اُسے / پرستان میں لا بٹھایا اُسے
یہ مژدہ گیا باپ پاس اپنے لے / کہا عرض رکھتا ہوں میں آپ سے
یہ جوگن جو ہے ایک صاحب کمال / ذرا بین سُنیے اور اُس کے خیال

بہت آپ اُس سے اُٹھا دینگے حظ ۔۔۔ بہت بین میں اُسکی پا دینگے حظ

کہا اُس نے بابا بہت خوب ہے ۔۔۔ ہمیشہ سے راگ اپنے مرغوب ہے

کہا آؤ جوگی جی بیٹھو ادھر ۔۔۔ کرو رَوشن اپنے قدم سے یہ گھر

بہت اُس کی تعظیم و تکریم کی ۔۔۔ جگہ ایک پاکیزہ رہنے کو دی

غرض اِس طرح اُس کا معمول تھا ۔۔۔ کہ اُس شاہ پریوں کی خدمت میں جا

بجا بین سب کو رجھاتی تھی وہ ۔۔۔ پہر کے بجے گھر کو آتی تھی وہ

دلے کیا کہوں حال فیروز شاہ ۔۔۔ کہ تھی دن بدن اُسکی حالت تباہ

نہ دُنیا کی اُس کو نہ دیں کی خبر ۔۔۔ اُسی کے تصوّر میں آٹھوں پہر

غرض ایک دن بات یہ جان کر ۔۔۔ لگا گھات پر اپنی وہ آن کر

نہ تھا اُس گھڑی کوئی ایدھر اُدھر ۔۔۔ اکیلی پڑی جوگن اُس کو نظر

اکیلے اُسے دیکھ ہو بے قرار ۔۔۔ گرا پاؤں پر اُسکے بے اختیار

گرا اس طرح سے قدم پر جو وہ ۔۔۔ تو کہنے لگی مُسکرا اُس کو وہ

کہ ہے آج کیا یہ خلافِ قیاس ۔۔۔ گرا اِتنا کیوں ہوکے تو بے حواس

لگا کہنے رُو رُو کے فیروز شاہ ۔۔۔ کہ بس بس یہی تو کہو گی نہ واہ

تمھاری سمجھ نے تو مارا ہمیں ۔۔۔ یہ باتیں نہیں ہیں گوارا ہمیں

کہا اُس نے کہہ تو شتاب اپنا حال ۔۔۔ کہ تو کیوں گرا سر کو پاؤں پہ ڈال

کہا تب پریزاد نے میری جاں ۔۔۔ کہاں تک کروں راز اپنا نہاں

بھلا ہجر میں کب تلک ہوں ملول ۔۔۔ غلامی میں اپنی مجھے کر قبول

لگی ہنس کے کہنے کہ اِک طور سے ۔۔۔ جو میری کہانی سُنے غور سے

مطالب اگر میرے بر لائے تو — تو شاید مُراد اپنی بھی پائے تو

کہا اُس نے پھر جلد فرمائیے — جو کچھ آپ سے ہو بجا لائیے

کہا اُس نے یہ ہے مری داستاں — کہ شہرِ سراندیپ ہے اِک مکاں

مَلِک اک وہاں کا ہے مسعود شاہ — کہ بیٹی ہے اِک اُس کی مانند ماہ

جہاں میں ہے بدرِ مُنیر اُس کا نام — میں رہتی تھی خدمت میں اُسکی مُدام

بنایا ہے اُسنے الگ ایک باغ — کہ فردوس کا ہے وہ چشم و چراغ

جُدا باپ سے تھی وہ اُس جا مقیم — سدا سیر کرتی تھی بے خوف و بیم

میں نجم النّسا اُس کی دُختِ وزیر — ہمیشہ سے ہمراز تھی اور مشیر

ہوئی ایک دِن یہ عجب واردات — کہ اک شخص وارد ہوا ایک رات

کہاں تک کہوں اُسکا قصہ ہے دُور — نہ تھا آدمی نور کا تھا ظہور

گیا اُس پہ اِس شاہزادی کا دِل — گئے کچھ دنوں میں وہ آپس میں مِل

وِلے اُس پہ عاشق ہوئی تھی پری — محبت میں تھی اُسکے وہ بھی بھری

کہیں اُسکے آنے کی سُن کر خبر — خدا جانے پھینکا ہے اُسکو کدھر

دیا قید میں اُس کو ڈالا کہیں — کہ مدت سے اُس کی خبر کچھ نہیں

سو میں کھوج میں اُس کے جوگن ہوئی — یہاں تک تو پہونچی بروگن ہوئی

پریزاد آپس میں تم ایک ہو — اگر تم ذرا کھوج اِس کا کرو

تو شاید مدد سے تمھاری مِلے — تو پھر آرزو بھی ہماری مِلے

دِل آباد ہو جی کو آرام ہو — تمھارا اسی کام میں کام ہو

کہا تب پریزاد نے ہاتھ لا + — انگوٹھا دکھایا کہ اِترا نہ جا

یہ سُن قوم کو اُس نے اپنی بُلا ‎ ‎ تقید سے سب کو سُنا کر کہا
کہ جاؤ تو ڈھونڈو کرومت کمی ‎ ‎ کہ ہے اِک پرستان میں آدمی
جو تم میں سے لادے گا اُس کی خبر ‎ ‎ جواہر کے دوں گا لگا اُس کو پر
ہوا ناگہاں ایک کا واں گزُر ‎ ‎ جہاں قید میں تھا وہ خستہ جگر
وہ روتا جو تھا نالۂ و آہ سے ‎ ‎ تو کچھ اُس کو آئی صدا چاہ سے
وہ چوکی پہ جو دیو تھے جابجا ‎ ‎ لگا پوچھنے کس کی ہے یہ صدا
کہا ماہ رُخ کا ہے قیدی یہاں ‎ ‎ کنوئیں میں تڑپتا ہے اِک نوجواں
وہ تحقیق کر اور لے اُس کا بھید ‎ ‎ اُڑا شہر کو اپنے دیوِ سفید
گیا جاکے فیروز شہ کو سلام ‎ ‎ سُن آیا جو کچھ تھا سُنایا تمام
یہ بھیجا پھر اُس ماہرخ کو پیام ‎ ‎ کہ کیوں زیست کرتی ہے اپنی حرام
بنی آدموں کو تو چوری سے لا ‎ ‎ بٹھاتی ہے گھر میں تعشق جتا
بھلا چاہتی ہے تو اُس کو نکال ‎ ‎ کنوئیں میں جسے تو نے رکھا ہے ڈال
گیا ماہرخ کو یہ پیغام جب ‎ ‎ ہوئی خوف سے وہ پریشان تب
کہا مجھ سے تقصیر اب تو ہوئی ‎ ‎ کہو اُس کو لیجائے یاں سے کوئی
پر اتنا یہ احسان مجھ پر کرو ‎ ‎ کہ اُس کا پرستاں میں چرچا نہو
یہ سُن کر جواب اُس کا فیروز شاہ ‎ ‎ چلا اپنے گھر سے جہاں تھا وہ چاہ
الگ یوں لے آیا کنوئیں سے نکال ‎ ‎ کہ فوّارہ جوں آب کو دے اُچھال
وہ جیتا تو نکلا و لے اس طرح ‎ ‎ کہ بیمار ہو نزع میں جس طرح
یہ دیکھا جو احوال اُس کا تباہ ‎ ‎ تو روتا ہوا جلد فیروز شاہ

بٹھا تخت پر اپنے اُس کو وہاں
لے آیا وہ بیٹھی تھی جوگن جہاں

رکھا تخت اِک جا پہ اُس کا چُھپا
کہا پھر یہ جا کر کہ نجم النسا

چل اب تو کہ میں اُس کو لایا یہاں
یہ سُنتے ہی گھبرا کے بولی کہاں

کہا چل کہاں ہے بتا تو مجھے
ذرا اُس کی صورت دکھا تو مجھے

کہا رہ کے چلیو ذرا تھم رہو
کہ شادی بڑی ہے کہیں غم نہ ہو

یہ کہہ اور لے ہاتھ میں اُس کا ہاتھ
لے آیا وہ جوگن کو واں ساتھ ساتھ

گیا آپ اُس تخت پر بیٹھ اور
دکھایا اُسے اور کہا کر تو غور

جسے ڈھونڈتی تھی سو یہ ہے وہی
کہا ہاں رے ہاں یہ وہی ہے وہی

یہ اُس تخت کے گرد پھرنے لگی
بلا اُس کی لے لے کے گرنے لگی

وہ دیکھے جو ٹک آنکھ اُٹھا بے نظیر
تو نجم النسا ہے یہ دخت وزیر

کہا تو کہاں اور کس کا یہ جوگ
کہاں یہ لباس اور کہاں تم یہ لوگ

کہا تیرے غم نے دِوانا کیا
کہ عالم سے اپنے بگانا کیا

کہی سرگذشت اُس نے اسدم تلک
کہ اس طرح پہونچے ہو تم ہم تلک

کیا ایک دن تو اُنھوں نے مقام
چلے دوسرے دن وہ نزدیک شام

وہ جوگن وہ فیروز شہ اور وہ ماہ
چلے تخت پر بیٹھ اوپر کی راہ

مُربع نشیں تھی جو بدرِ منیر
وہاں اُس کو لائی وہ دخت وزیر

بلائیں لگی لینے نجم النسا
لگی گرد پھرنے برنگِ صبا

گئی جب کہ خلوت میں بدرِ منیر
کہا میں لے آئی ترا بے نظیر

کہا کیونکہ لائی کہا اِس طرح
وہ سب کہدیا حال تھا جس طرح

ترا قیدی جا کر چھڑا لائی ہوں
اور اک اور بندھوا اُڑا لائی ہوں

کہا پھر وہ دونوں کہاں ہیں کہا
درختوں میں اُن کو رکھا ہے چھپا

سو اب ایک کو جا کے لاتی ہوں میں
ہوا دوسرے کو بتاتی ہوں میں

یہ سُن شاہزادی ہنسی کھِل کھِلا
کہا کیوں اُڑاتی ہے نجمُ النسا

یہ سُن کر شتابی گئی وہ نگار
لیا جا کے آہستہ اُن کو پکار

چھپائے ہوئے لا بٹھایا وہاں
وہ خلوت کا جو تھا قدیمی مکاں

غرض دیر تک مِل کے روتے رہے
جدائی کے داغوں کو دھوتے رہے

کہا شاہزادے نے احوال سب
کنویں میں جو گذرا تھا اُس پر تعب

اگرچہ ہر اِک وصل سے شاد تھا
ولے ہجر کا غم اُنھیں یاد تھا

یہ ٹھہرا کے نِکلے وہ دو ماہرو
کہ اس بات کو کیجئے ایک سو

وہ نجم النّسا اور وہ بدرِ مُنیر
کچھ اک کر بہانا وہ دونوں شریر

رہیں گھر میں پھر جا کے ماں باپ کے
کہ دیکھیں گے اب ہم قدم آپ کے

نِکل بےنظیر اور وہ فیروز شاہ
کسی شہر میں رکھ کے فوج و سپاہ

کر اسباب سب سلطنت کا درست
پھر آئے اُسی جا پہ چالاک و چُست

وہاں کا جو تھا شاہ انجم سپاہ
جسے لوگ کہتے تھے مسعود شاہ

کیا نامہ یوں ایک اُس کو رقم
کہ اے شاہ شاہاں والے فخرِ جم

فریدوں مثال و سکندر نژاد
مُرادِ جہان و جہان مُراد

میں وارد ہوں یاں ایک مہمان غریب
لے آئے ہیں مجھکو مرے یاں نصیب

نوازش سے اپنی کرم کیجئے
غلامی میں اپنی مجھے لیجئے

گیا یہ جو مسعود شہ کو پیام | سُنا اور پڑھا خط کا مضموں تمام
لکھا نامہ اُسکے یہ اک در جواب | کہ عاقل کو نکتہ لگے ہے کتاب
کہ نامہ تمھارا جو سربستہ تھا | وہ راز نہاں اپنے ہاتھوں کھُلا
اگر ہم کہیں اپنے دعوے پہ آئیں | تمھارے فلک کو نہ خاطر میں لائیں
ولے ہم کو ہے پاس شرعِ رسول | سو اس واسطے کرتے ہیں ہم قبول
سُنی یہ جو نامہ کی گفت و شنید | ہوئی شاہزادہ کو گویا کہ عید
بُلا سنتکوں کو بتا سال و سن | مقرر کیا نیک ساعت کا دِن
بڑی خواہشوں سے جب آیا وہ روز | چڑھا بیاہنے وہ مہ دلفروز
ہوا جب نکاح اور بٹے ہار پان | پلا سب کو شربت دیے خاصدان
اُٹھا پھر تو نوشاہ بعد از نکاح | محل میں بُلانے کی ٹھہری صلاح
ہوا لیکن اُس وقت دُونا مزا | کہ دُولھا دُلھن جب ہوے ایک جا
غرض اس طرح جب وہ دلھن کو بیاہ | لے آیا جہاں اُسکی تھی عیش گاہ
وہ نجم النسا تھی جو دختِ وزیر | گیا اُس کے والد کنے بینظیر
کہا باپ کو اُس کے اے خیر خواہ | مِرا بھائی ہے ایک فیروز شاہ
سو میں تجھ سے رکھتا ہوں اک اِلتجا | کہ تو اُسکو فرزندی میں اپنی لا
غرض ہر طرح کر رضامند اُسے | کیا حال پر اپنے پابند اُسے
پریزاد تھا وہ جو فیروز شاہ | دِیا اُس کو نجم النسا سے بیاہ
پھرے دن تو اپنے وطن کو پھرے | وہ آشفتہ بلبل چمن کو پھرے
خوشی سے لئے حرمت و جان و مال | چلے شہر کو اپنے وہ حال حال

زبس باپ ماں کو تھی سہرے کی چاہ
دوبارہ اُنھوں نے کیا اُن کا بیاہ

لکھوں گر میں اِس بیاہ کی دھوم دھام
تو پھر یہ کہانی نہ ہووے تمام

ہوا شہر پر فضل پروردگار
وہی شاہزادہ وہی شہریار

مرے ایک مشفق ہیں مرزا قتیل
کہ ہیں شاہراہِ سخن کے دلیل

اُنھوں نے شتابی اُٹھا کر قلم
یہ تاریخ کی فارسی میں رقم

بگوشم زہاتف رسید ایں ندا
برین مثنوی باد ہر دل فدا ۱۱۹۹

میاں مصحفی کو جو بھایا یہ طور
اُنھوں نے بھی کی فکر از راہِ غور

کہی اُس کی تاریخ یوں برمحل
یہ تنجانۂ چین ہے بے بدل

(۲) دوسری مثنوی گلزارِ ارم[1] ہے جس کو گارسن ڈیٹاسی اور بلومہارڈ نے غلطی سے مثنوی سحر البیان کے ساتھ خلط ملط کر دیا ہے یہ بالکل دوسری چیز ہے اور سنہ ۱۱۹۲ھ مطابق ۱۷۷۸ء میں تصنیف ہوئی اِس میں جیسا کہ اوپر لکھا گیا شاہ مدار کے میلہ کی چھڑیوں کا مفصل حال لکھا ہے اور مثل مثنوی سحر البیان کے اس میں بھی اُس زمانہ کے مختلف رسم و رواج زنانہ لباس شادی بیاہ ناچ رنگ وغیرہ کے دلچسپ حالات موجود ہیں اِس میں لکھنؤ کی ہجو اور فیض آباد کی بہت تعریف کی ہے نمونہ آخر میں موجود ہے۔

(۳) رموز العارفین اس کا ذکر کسی تذکرہ نویس نے نہیں کیا مگر خود میر حسن نے اپنے تذکرۃ الشعرا میں کیا ہے۔

اِن کے علاوہ اور بھی بعض مثنویاں بتائی جاتی ہیں جو اب ناپید ہیں

[1] گلزار ارم تاریخی نام ہے ۱۲

انھوں نے کئی ہجویں بھی لکھیں مثلاً ہجو عظیم کشمیری - ہجو قصاب - نقل کلاونت ہجو مکان وغیرہ یہ سب ہجویں نہایت پُرلطف اور مہذب زبان میں لکھی گئی ہیں
میر حسن نے مختلف اشخاص کی تعریف میں قصائد بھی لکھے جنہیں سے سات قصیدے موجود ہیں میر صاحب موصوف قصیدہ کے مرد میدان نہ تھے مگر پھر بھی کچھ قصائد ملتے ہیں -

مراثی | چند مرثیے اور سلام بھی انھوں نے تحریر فرمائے جیسا کہ اُن کے تذکرہ سے پایا جاتا ہے - اس صنف کی تکمیل و ترقی اُن کے پوتے کے زمانہ میں بخوبی ہوئی -

تذکرۃ الشعراء | یہ تذکرہ فارسی میں ہے اور اس میں تقریباً تین سو شاعروں کا ذکر ہے اس کا سال تصنیف کہیں مذکور نہیں مگر اُن تاریخوں سے جو خود تذکرہ میں موجود ہیں ۱۱۹۴ھ بہت قرین قیاس معلوم ہوتا ہے[۱] اور یہ وہ سن تھا جبکہ مرزا رفیع سودا کی عمر ۷۰ برس کی تھی مصنف نے اِس کو تین دوروں پر تقسیم کیا ہے - پہلا دَور اُن شعرا کا جو فرخ سیر سے پیشتر گزرے - دوسرا اُن کا جو فرخ سیر کے بعد محمد شاہ کے زمانہ تک ہوئے اور تیسرا خود اپنے معاصروں کا - بڑی خوبی اس تذکرہ کی یہی ہے کہ اکثر ہمعصر شعرا کا اس میں حال ملتا ہے جو گو کہ بہت مفصّل نہیں مگر پھر بھی نہایت دلچسپ اور کار آمد ہے - مختصر یہ کہ میر حسن ایک شاعر شیریں بیان تھے اُن کا کلام نہایت سادہ فصیح اور عاشقانہ ہوتا تھا اور اُن کی مثنوی سحر البیان تو ایک معرکۃ الآرا

[۱] مولانا حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی تذکرہ شعرائے اُردو کے فاضلانہ مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ واضح رہے کہ یہ تذکرہ ۱۱۸۸ھ اور ۱۱۹۲ھ کے مابین لکھا گیا -

اور بےنظیر تصنیف ہے جس سے اُن کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔

آخر میں کچھ اشعار مثنوی گلزار ارم سے اور کچھ متفرق اشعار قصائد و ہجو وغیرہ کے بطور نمونہ پیش کیے جاتے ہیں۔

مثنوی گلزار ارم سے

لکھنؤ کی مذمّت

جب آیا میں دیارِ لکھنؤ میں
نہ دیکھا کچھ بہارِ لکھنؤ میں

کیا تھا غم نے ازبس دِل پہ ڈیرا
لگا اس جا پہ ہرگز دِل نہ میرا

بہت ہیں گرچہ اہل اللہ اس جا
دلے جاگہ جو بد ہو تو کریں کیا

زبس یہ ملک ہے بیہڑ پہ بستا
کہیں اونچا کہیں نیچا ہے رستا

کسی کا آسماں پر گھر ہوا میں
کسی کا جھوپڑا تحت الثرےٰ میں

نہیں ہے لکھنؤ یہ ہے زمانا
زمانے پر عبث رکھنا بہانا

عجب ہے یاں کی رسم و راہ گندی
گہے پستی ہے اور گاہے بلندی

زبس گنجان ہے یہ شہر باہم
سما سکتا نہیں یاں غیر کا دم

ہر اِک کوچہ یہاں کا تنگ تر ہے
ہوا کا بھی بہ مشکل یاں گزر ہے

فیض آباد کی تعریف

یہ دیکھی میں نے جب کیفیت شہر
مرے اک روز جی میں آئی یوں لہر

کہ کیجیے سیر فیض آباد جا کر
چلا میں یاں سے اپنا دِل اُٹھا کر

جونہی داخل ہوا میں اُس نگر میں
کھُلا جنت کا دروازہ نظر میں

بمثال گُل ہر اِک دِل شاد پایا	عجب معمورۂ آباد پایا

فیض آباد سے مراجعت پر نہایت افسوس ظاہر کرتے ہیں ۔

قضا پھر لکھنؤ میں مُجھ کو لائی	نہ تھی معلوم مجھ کو یہ جُدائی
مجھے جنت سے جوں آدم نِکالا	بُرا دِن سر سے قسمت نے نہ ٹالا
کہ پھر دیکھوں وہی روئے دل افروز	دُعا میری یہی ہے اب شب وروز
وہی صحبت ہو اور وہ ساتھ کے یار	وہی ہو شہر اور وہ باغ وگلزار
غزل خوانی کروں جا اِس مکاں میں	پھروں میں پیچھے کرتا جہاں میں
رجب بیگ و حبیب اللہ فاضل	رہیں میری غزلخوانی میں شامل

رُباعی کا نمونہ

معنی بھی تو ہے اور بیاں بھی تو ہے	ظاہر بھی تو ہے اور نہاں بھی تو ہے
یاں بھی تو ہے اور واں بھی تو ہے	دونوں عالم میں تجھ سوا کوئی نہیں

ولہ

جو ہیں سو حسن روتے ہیں وہ اِس غم میں	کیا وحش وطیور وانس وجاں عالم میں
جلتے ہیں یہ دِل حسینؑ کے ماتم میں	روشن نہ سمجھ ضریح پر قندیلیں

ہجو کا نمونہ

اپنے گھر کی حالت

دو[2] روپیہ کے تئیں کرائے پر	ہم نے جب سے لیا ہے یاں اک گھر

جان سے ہیں تنگ اُس میں لوگ — گھر نہیں ہے وہ ایک جان کا روگ
پہلے اُس گھر کی خوبی یہ پائی — آتے ہی گھر میں مجھ کو تپ آئی
کلّہ آماس کر گیا سارا — پہلے ہی مجھ پہ گھر نے مُنھ مارا
وہ مثل ٹھیک ہے یہاں فی الحال — پہلے مُنھ چومتے ہی کاٹا گال

صنعت اعداد

صحن اُس کا بتاؤں کس مقدار — ایک دو تین چار پائی وار
پانچ بلّی کا کُہنہ سا چھپّر — ساتھ سایہ کے دھوپ آٹھ پہر
نو کا یا دس کڑی کا اک دالان — تس پر اِک ٹوٹے جھوپڑے کی شان
سیڑھی اِک بانس کی پُرانی سی — آنے جانے کے واسطے ہر دھری
نہ تو مطبخ نہ واں مکانِ ضرور — دونوں باتوں کا واں نہیں دستور
ایک چوکی دھری ہے صحن کے بیچ — صحن میں ساری جا ضرور کی کیچ
تس پہ دو ٹٹیاں برائے اوٹ — وہ کہ جاویں ہوا سے خاک میں لوٹ
ڈیوڑھی کا بند کیجئے جب دَر — بیٹھیے جا ضرور تب جا کر
آنے والا جو کوئی آ جاوے — دیکھ دروازہ بند پا جاوے
یعنی در جو کھُلا نہیں پایا — کوئی ہے جا ضرور کو آیا
گھر میں ہیں دھوپ سے کباب سبھی — گھر سے نکلے نہ آفتاب کبھی
ٹوٹا پھوٹا جلا بھُنا سارا — دھوپ سے گرم جیسے انگارا
چیز آبی و بادی اُس میں کم — زور خاکی و ناری کا پیہم
یاں کنواں بھی نہیں مزا ہے یہ — کس کا یہ گھر ہے کیا بلا ہے یہ
خوب یاں کا کھُلا جو ہم پر بھید — چاہ کی جا ہے چشمۂ خورشید

دِن کو آنکھوں میں بھرتے ہیں پانی / رات پلکوں سے قطرہ افشانی
گرد میں صورتیں اٹی ہیں سب / ماٹی کی مورتیں بنی ہیں سب
کپڑے ہم جھاڑتے ہیں لیل و نہار / دھوبی دھوتے ہیں جیسے دے دے مار
تکیے رہتے ہیں اس طرح میلے / جوں تیمم کی خاک کے تھیلے
طاق پر تھے جہاں جہاں جزدان / ہوگئے کل وہ کوہ ریگستان
خاک بھر بھر کے یوں ہوئی ہے دوات / جیسے آندھی میں ہو اندھیری رات
تھے دھرے وہ جو خاص و عام قلم / ریگ ماہی ہوے تمام قلم
جھاڑتے جھاڑتے بیاض و کتاب / حرف مٹ مٹ کے ہوگئے ہیں خراب
صاف آٹا نہ کوئی سانے گا / خوب جب تک نہ خاک چھانے گا
کیا کہیں کس طرح سے جیتے ہیں / خاک کھاتے ہیں کیچ پیتے ہیں

قصیدہ کا رنگ یہ ہے۔

کون بدمست گل اندام چمن میں ہے مقیم / جسکی بو دوش پہ اپنے لئے پھرتی ہے نسیم
خوش ادا کون یہ مستانہ پھرے ہے جسکے / نقش پاے گل نرگس کو کرے دائم تیم
عرق شبنم گل کس پہ چھڑکتا ہے گلاب / عندلیبوں کا ہوا رشک سے دل کسکے دو نیم
کون انگڑائیاں لیتا ہے چمن میں مخمور / غنچہ بھر بھر کے گلابی کرے ہے کیوں تقسیم
شاید اس باغ میں ہے آصف دوراں کا گذر / کہ ہے وہ ابن کریم ابن کریم ابن کریم
آصف الدولہ بہادر ہے وزیر اعظم / نائب ظل الٰہ صاحب تاج و دیہیم

میر تقی میر میر محمد تقی نام میر تخلّص۔ ریختہ گویان ہند کے اُستادِ اعظم شاعرانِ اُردو کے رہبرِ مسلّم۔ ادب و زباں دانی کے ماہرِ فن۔ خوش گو خوش بیان شیریں سخن۔ تذکروں میں والد کا نام میر عبداللہ لکھا ہے مگر ذکرِ میر میں میر صاحب نے کوئی نام نہیں لکھا۔ البتہ یہ تحریر کیا ہے "کہ میرے والد نے جو میرے دادا کے چھوٹے بیٹے تھے درویشی اختیار کی اور ترکِ دُنیا کر کے بیٹھ رہے شاہ کلیم اللہ اکبر آبادی سے علمِ ظاہری و معنوی کا استفادہ کیا جوان صالح و عاشق پیشہ تھے اس لیے علی متقی کے عرف سے مشہور ہوئے" چونکہ اُن کا نام تحریر نہیں ہے لہٰذا ممکن ہے کہ نام میر عبداللہ ہی ہو۔ اپنے بزرگوں کی نسبت میر صاحب تحریر فرماتے ہیں "میرے بزرگ زمانے کی نامساعدت سے اپنی قوم و قبیلہ کے ساتھ حجاز سے روانہ ہو کر سرحدِ دکن میں پہونچے وہاں سے وہ احمد آباد گجرات میں وارد ہوئے بعض تو اُن میں سے وہیں رہ گئے اور بعض تلاشِ معاش کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ چنانچہ میرے جدِ کلاں نے اکبر آباد میں توطن اختیار کیا مگر ناسازگاریِ آب و ہوا سے راہیِ عدم ہوئے۔ ایک فرزند چھوڑا جو میرے دادا تھے وہ اکبر آباد کی فوجداری پر سرفراز ہوئے پچاس سال کی عمر میں علیل ہوئے اور ابھی پوری صحت نہ ہوئی تھی کہ گوالیار گئے اور چند ہی روز کے بعد اس دُنیا سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے۔ اُن کے دو بیٹے تھے۔ بڑے بیٹے کو کچھ خللِ دماغ تھا اور وہ جوان مر گیا۔ چھوٹے بیٹے میرے والد تھے جو علی متقی کے نام سے مشہور تھے" میر صاحب نے اِن کے چند قصّے بیان فرمائے ہیں — درویش صفت تھے ایک دفعہ لاہور چلے گئے اور وہاں ایک فقیر جسنے مکر و فریب کا

جال پھیلا رکھا تھا اُس سے لوگوں کو آگاہ کیا۔ پھر وہ دلی آئے وہاں اُنکی بڑی قدر ہوئی۔ وہاں سے بیانہ پہنچے۔ ایک نوجوان سید پر اُن کی نظر پڑی جو خلوص کے ساتھ اُن کا معتقد ہوگیا وہاں سے آگرے آئے اور خانہ نشین ہوگئے۔ وہ نوجوان سید بھی اُن کی تلاش میں آگرہ پہونچا اور وہیں رہ پڑا۔ اُن کا نام سید امان اللہ تھا اور میر تقی اُن کی عزت کرتے تھے میر صاحب کی تربیت میں اُن کو بڑا دخل تھا میر صاحب اُن کو اچھے کہتے تھے اور ذکر میر میں ہمیشہ عم بزرگوار لکھکر یاد کرتے ہیں دن رات اُنھیں کے پاس رہتے اور اُن کی تمام تربیت سید صاحب کے زیر نظر ہوئی۔ سید امان اللہ کا جب انتقال ہوا تو میر صاحب دس برس کے تھے۔ میر صاحب اور اُن کے والد کو اُن کے مرنے کا سخت صدمہ ہوا۔ چنانچہ اُن کے والد بھی بخار میں مبتلا ہوکر مر گئے۔ بڑے بھائی حافظ محمد حسن نے میر صاحب سے بڑی بے مروتی کی اور باپ کے کُل ترکہ پر قبضہ کر لیا۔ اس صغر سنی میں میر صاحب اپنے چھوٹے بھائی محمد رضی کو اپنی جگہ چھوڑ کر خود تلاش معاش میں مصروف ہوئے۔ لیکن کوئی صورت نظر نہیں آئی۔ ناچار وطن کو خیرباد کہکر شاہجہاں آباد دہلی پہونچے۔ خواجہ محمد باسط جو صمصام الدولہ امیر الامرا کے بھتیجے تھے اُن کو نواب کے پاس لیگئے اور میر صاحب وہاں ملازم ہوگئے۔ نواب صاحب نادرشاہ کی جنگ میں مارے گئے اور میر صاحب کی ملازمت جاتی رہی۔ میر صاحب کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد آگرہ واپس آگئے مگر جب گذر اوقات کی کوئی معقول صورت نظر نہ آئی تو پھر دلی کا رُخ کیا اور اپنے بڑے بھائی کے خالو سراج الدین علی خاں آرزو کے یہاں جاکر ٹھہرے اور کچھ دنوں اُن کے

پاس رہے۔ مگر بڑے بھائی کی تحریک پر خان آرزو نے میر صاحب کو تکلیف پہونچانے
کی کوشش کی۔ اس سے میر صاحب کو اسقدر صدمہ ہوا کہ مکان کے دروازے
بند کیے پڑے رہتے اسی وجہ سے اُن کی حالت جنون کی سی ہوگئی۔ حکیم فخرالدین خاں
نے علاج کیا اور رفتہ رفتہ وہ حالت جاتی رہی۔ بعدہ ایک بزرگ میر جعفر نامے سے
کچھ تعلیم حاصل کی اور سید سعادت علی خاں نے اُن کو ریختہ میں شعر موزوں کرنیکی
ترغیب دی۔ اُدھر خان آرزو درپے آزار تھے۔ ایک روز مجبوراً میر صاحب اُن کے
مکان سے نکل گئے مگر خوبی قسمت سے ایک رئیس رعایت خاں نامے نے اُن کو
اپنا مصاحب بنا لیا اور اس طرح تنگدستی سے گونہ نجات ملی۔ جب احمد شاہ دُرّانی
کو سرہند میں شکست ہوئی تو میر صاحب بھی رعایت خاں کے ساتھ شریک تھے
اور جو خدمت اُن کے لائق ہوئی اُس کو انجام دیا۔ رعایت خاں کے ساتھ
میر صاحب نے قصبہ سانبھر کی سیر کی جو اجمیر کے قریب واقع ہے اور جب رعایت خاں
اور راجہ رنجیت سنگھ میں شکر رنجی ہوگئی تو میر صاحب نے صفائی کی کوشش کی۔
ذراسی بات پر رعایت خاں کی ملازمت ترک کردی مگر اُس نے اُن کی دوستی کا
حق خوب نباہا اور محمد رضی میر صاحب کے چھوٹے بھائی کو اپنے یہاں نوکر رکھ لیا
چند دنوں کے بعد میر صاحب نواب بہادر کے یہاں ملازم ہوگئے اور رُہیلوں کی
جنگ میں اُس اطراف کی سیر کی۔ جب صفدر جنگ نے نواب بہادر کو دغا سے
قتل کر ڈالا تو میر صاحب بیکار ہوگئے لیکن چند ہی روز بعد مہا نرائن دیوان
کی سرکار سے متوسل ہوگئے۔ اسی زمانے میں میر صاحب نے خان آرزو اپنے
خالو کی ہمسائگی چھوڑ دی اور امیر خاں کی حویلی میں رہنے لگے۔ سکندر آباد کی

لڑائی میں میر صاحب احمد شاہ کے ساتھ تھے۔ راجہ جگل کشور کے توسل سے مہاراجہ ناگرمل سے ملے اور پھر کچھ دنوں بعد اُن کے بیٹے نے ان کی کچھ تنخواہ مقرر کردی میر صاحب اُن کے خانہ باغ میں دوپہر رات تک موجود رہتے مشاہرہ معقول ہونے سے کسی قدر فارغ البالی سے بسر ہوتی تھی۔ خانہ جنگیوں سے دلی کی حالت ابتر ہو رہی تھی اسی میں میر صاحب کا مکان بھی خاک میں مل گیا اور سب مال و اسباب لُٹ گیا۔ اس لوٹ مار کے بعد میر صاحب معہ لواحقین کے دہلی سے نکل کھڑے ہوئے اور کچھ دنوں برسانہ ضلع متھرا میں قیام کرکے کُمہیر پہونچے جو سورج مل جاٹ کا قلعہ تھا اور بہادر سنگھ یہاں اُن سے بڑی مدارات سے پیش آئے اور سورج مل کے طویلے میں جو خانہ خرابان دلی کا مامن بنگیا تھا اعظم خاں سے ملاقات ہوئی میر صاحب کے بیٹے میر فیض علی بھی یہاں اُن کے ہمراہ تھے۔ راجہ سورج مل کے چھوٹے بیٹے نے میر صاحب کے واسطے کچھ ساز و سامان مہیا کردیا اور خود سورج مل نے روزینہ مقرر کردیا۔ چند دنوں بعد میر صاحب پھر دلی واپس آئے مگر گھروں کو خراب اور شہر کو ویران پایا۔ سورج مل کے ساتھ تیس سال کے بعد میر صاحب اکبرآباد پہونچے اور اپنے والد اور عم بزرگوار کی قبروں کی زیارت کی۔ اُن کے شعر و سخن کا شہرہ اب عالم گیر ہو چکا تھا چار مہینے وطن میں رہکر سورج مل کے قلعہ میں آگئے۔ کچھ دنوں بعد پھر اکبرآباد آئے اور پندرہ روز رہکر واپس چلے گئے۔ جاٹوں کی لوٹ مار سے راجہ ناگرمل معہ اپنے ہمراہیوں کے کاماں چلے گئے جو راجہ پرتھی سنگھ پسر مادھو سنگھ کا سرحدی مقام تھا۔ میر صاحب بھی اُن کی معیت میں تھے اور بوجہ ملازمت اِسی شہر میں چند دن اقامت گزیں ہوئے مگر تھوڑے عرصے کے بعد ملازمت سے

کنارہ کش ہو گئے۔ راجہ نے میر صاحب کو حسام الدین کے پاس بھیجا اور میر صاحب نے اُن کی طرف سے سب عہد و پیمان کئے مگر راجہ بادشاہ کے لشکر میں جو فرخ آباد میں تھا نہیں گیا۔ اور شہر کی طرف روانہ ہو گیا ناچار میر صاحب بھی اُسکے ہمراہ ہو گئے اور دہلی پہونچے اہل و عیال کو عرب سرائے میں چھوڑا اور راجہ سے جُدا ہو گئے۔ سرداروں کے اغوا سے بادشاہ نے مجبور ہو کر ضابطہ خاں پر حملہ کیا میر صاحب بھی اس حملہ میں بادشاہ کے ہمراہ تھے۔ ضابطہ خاں بے لڑے بھاگ گیا۔ میر صاحب چونکہ بے روزگار تھے تلاش معاش میں نکلے۔ وجیہ الدین خاں برادر خورد حسام الدولہ سے ملے اور اُس نے کچھ مقرر کر دیا۔ میر صاحب اِن دنوں خانہ نشین تھے۔ بادشاہ عالمگیر ثانی اُن کو اکثر طلب فرماتے۔ مگر وہ کبھی نہ گئے۔ ابوالقاسم خاں اور عبدالاحد خاں کا چچا زاد بھائی میر صاحب کے ساتھ اس زمانہ میں سلوک کرتے رہے۔ کبھی کبھی وہ اُن سے ملاقات کو جاتے اور بادشاہ بھی کبھی کبھی کچھ بھیج دیتے تھے اور حسن رضا خاں بھی میر صاحب کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتے تھے۔

روانگی لکھنؤ۔ لکھنؤ کی روانگی کے حالات میر صاحب یوں تحریر فرماتے ہیں "فقیر خانہ نشین تھا اور چاہتا تھا کہ شہر سے نکل جائے لیکن بے سامانی سے مجبور تھا۔ میری عزت و آبرو کی حفاظت کے خیال سے نواب وزیرالمما لک آصف الدولہ بہادر آصف الملک نے چاہا کہ میر میرے پاس آجائے تو اچھا ہو۔ چنانچہ میری طلبی کے لئے نواب سالار جنگ پسر اسحاق خاں موتمن الدولہ نے جو وزیر اعظم کے خالو ہوتے تھے، اُن قدیم تعلقات کی وجہ سے جو میرے

خالو سے تھے کہا کہ اگر نواب صاحب از راہ عنایت کچھ زادراہ عنایت فرمائیں
تو البتہ میر صاحب یہاں آسکتے ہیں۔ نواب صاحب نے حکم دیا اور اُنھوں نے
سرکار سے زادراہ لیکر مجھے خط لکھا کہ نواب والا جناب آپ کو یاد کرتے ہیں -
جس طرح ہو سکے آپ یہاں آجائیے۔ میں پہلے ہی دل برداشتہ بیٹھا تھا خط
کے آتے ہی لکھنؤ روانہ ہوگیا۔ چونکہ خُدا کی یہی مرضی تھی میں بے یار و مددگار
بغیر قافلہ اور رہبر کے فرخ آباد کے رستے سے گذرا دہاں کے رئیس مظفر جنگ تھے
اُنھوں نے ہرچند چاہا کہ کچھ روز وہاں ٹھہر جاؤں۔ مگر میرے دل نے قبول نہیں
کیا۔ دو ایک روز بعد روانہ ہو کر منزل مقصود پر پہونچ گیا۔ اول سالار جنگ کے
یہاں گیا اُنھوں نے میری بڑی عزت کی اور جو کچھ مناسب تھا بندگان عالی
کی جناب میں کہلا بھیجا۔ چار پانچ روز بعد اتفاقاً نواب مرغوں کی لڑائی دیکھنے کے
لئے تشریف لائے میں بھی وہاں حاضر تھا ملازمت حاصل کی محض فراست سے
دریافت فرمایا کہ کیا تم میر تقی ہو؟ اور نہایت لطف و عنایت سے بغل گیر ہوے
اور اپنے ساتھ نشست کے مقام پر لیگئے اپنے شعر مجھے مخاطب کرکے سُنائے۔
سبحان اللہ کلام الملوک ملوک الکلام۔ اس کے بعد فرط مہربانی سے مجھ سے کچھ
پڑھنے کی فرمائش کی۔ اُس روز میں نے اپنی غزل کے صرف چند شعر عرض کیے
رخصت کے وقت نواب سالار جنگ نے کہا کہ اب میر صاحب حسب الطلب حاضر
ہوگئے ہیں۔ بندگان عالی مختار ہیں اُنھیں کوئی جگہ عنایت فرمادی جائے
جب مرضی مبارک ہو یاد فرمائیں۔ فرمایا کہ میں کچھ مقرر کرکے آپ کو اطلاع دونگا
دو تین روز بعد یاد فرمایا۔ حاضر ہوا اور جو قصیدہ مدح میں کہا تھا پڑھا -

سماعت فرمایا اور کمال لطف کے ساتھ اپنے ملازموں کے سلسلے میں داخل فرمایا اور ہمیشہ میرے حال پر عنایت و مہربانی فرماتے رہے"۔

میر صاحب نے لکھنؤ میں زندگی آرام کے ساتھ بسر کی۔ نواب آصف الدولہ جب شکار کے لئے بہرائچ تک گئے تو میر صاحب بھی ہمرکاب تھے اُنکی یادگار میں شکار نامہ موزوں کیا دوسری دفعہ نواب کوہ شمالی کے دامن تک گئے۔ اُنھوں نے دوسرا شکار نامہ لکھکر حضور میں پیش کیا۔ اس شکار نامہ کی دو غزلوں کی نواب نے بطور مخمس تضمین فرمائی۔

آخر میں تحریر فرماتے ہیں کہ "اس زمانہ میں میرا مزاج ناساز رہتا ہے۔ یاروں کی ملاقات ترک کردی ہے بڑھاپا آپہونچا اور عمر عزیز ساٹھ سال کی ہوگئی۔ اکثر اوقات بیمار رہتا ہوں کچھ دنوں آنکھ کے درد کی تکلیف اُٹھائی ضعف بصر کی وجہ سے عینک لگائی۔ دانتوں کے درد کا کیا ذکر کروں۔ آخر دل کڑا کرکے ایک ایک کو جڑ سے اُکھڑوا دیا۔ غرض کہ ضعف قویٰ۔ بے دماغی۔ ناتوانی دل شکستگی اور آزردہ خاطری سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ زندہ نہ رہونگا اور زمانہ بھی رہنے کے قابل نہیں رہا ہے۔ بس آرزو اتنی ہے کہ خاتمہ بخیر ہو"۔ [۱]

میر صاحب کی عمر میر صاحب کی عمر میں لوگوں نے اختلاف کیا ہے۔ آزاد لکھتے ہیں کہ سو برس کی عمر پائی۔ اُن کی وفات کا سال تحقیق سے معلوم ہے ناسخ کے مشہور مصرعۂ تاریخ ع "واویلا مُرد شہ شاعراں" سے سنہ وفات بارہ سو چھبیس ہجری نکلتا ہے۔ تذکرۂ جہاں میں میر صاحب کی عمر

---

[۱] ملخص از ذکر میر مرتبہ مولوی عبدالحق صاحب (رسالہ اُردو اورنگ آباد دکن اپریل ۱۹۲۶ء)

۸۰ سال تحریر ہے۔ مصحفی نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ ۱۲۰۹ھ میں جبکہ وہ اپنا تذکرہ قلمبند کر رہے تھے میر صاحب کا سن اسّی سے متجاوز ہو چکا تھا مگر یہ قیاس پر زیادہ تر مبنی ہے۔ کتاب ذکر میر کی تاریخ جو ایک قطعہ سے نکالی ہے ۱۱۹۷ھ ہوتی ہے۔ کتاب کے اختتام پر میر صاحب نے اپنی عمر ۶۰ سال بتائی ہے۔ ان کی پیدائش کی تاریخ تقریباً ۱۱۳۷ ہجری ہوئی۔ نادر شاہ کا حملہ ۱۱۵۱ھ میں ہوا تھا اُس وقت اُن کی عمر صرف ۱۴ یا ۱۵ سال کی ہوگی۔ اگر پیدائش کا سن ۱۱۳۷ھ ہو تو میر صاحب کی عمر ۸۸ یا ۸۹ سال کی ہوتی ہے۔

ذکر میر ۱۱۹۷ ہجری

میر صاحب کی زندگی کے متعلق ابھی تک صحیح حالات بہت کم معلوم ہوئے۔ ڈاکٹر اسپرنگر لکھتے ہیں کہ ”جب میں ۱۸۴۸ء لغایت ۱۸۵۰ء میں شاہان اودھ کے کتبخانوں کی فہرست مرتب کر رہا تھا تو میں نے موتی محل میں ایک قلمی نسخہ میر صاحب کی خود نوشتہ سوانحعمری موسوم بہ ذکر میر کا دیکھا جو زبان فارسی میں ہے اور ضخامت ۱۵۲ صفحات کی ہے۔“ یہ کتاب ابھی تک نایاب تھی مگر اب دستیاب ہوگئی ہے اور انجمن ترقی اُردو حیدر آباد کی طرف سے چھپ گئی ہے۔ لکھنؤ میں بھی ایک قلمی نسخہ سید مسعود حسن رضوی کے پاس موجود ہے۔ اسکی وجہ سے بہت سی نئی باتیں میر صاحب کے حالات زندگی کے متعلق دریافت ہوگئیں اور اکثر بے بنیاد فرضی افسانوں کا جو میر صاحب کے متعلق بعد کے تذکرہ نویسوں نے لکھے ہیں خاتمہ ہو گیا۔ اکثر ظنی اور بے بنیاد باتیں جو عوام الناس میں مشہور تھیں معاصر تذکرہ نویسوں نے بغیر تحقیق کئے قلمبند کر دیں اور اُن کو بعد کے

لوگوں نے مستند تسلیم کرکے اور زیادہ چمکایا افسوس ہے کہ ذکر میر میر کی ادبی زندگی پر زیادہ روشنی نہیں ڈالتی اور نکات الشعرا میں میر نے اپنے متعلق سوائے اس کے اور کچھ نہیں لکھا "مولف این نسخہ متوطن اکبرآباد ست بسبب گردش لیل و نہار از چندے در شاہجہاں آباد ست" یہ تذکرہ تقریباً ۱۱۶۵ھ میں مرتب ہوا ذکر میر میں میر صاحب نے اپنی زندگی کے حالات قلمبند فرمائے ہیں۔ اپنے زمانے کے واقعات بھی لکھے ہیں۔ تاریخی لحاظ سے بھی کتاب خاص وقعت رکھتی ہے۔ نادرشاہ کی جنگ سے لیکر ضابطہ خاں کے قتل تک کے واقعات موجود ہیں یعنی ۱۱۵۱ ہجری سے لیکر ۱۱۹۷ھ تک کی تاریخ ہے اور اُس زمانے کے واقعات پر روشنی ڈالتی ہے۔ ابھی تک مؤرخین کو اس کتاب کا پتہ نہ تھا اور یہ کتاب تاریخی لحاظ سے قابل قدر ہے۔ دہلی کی خانہ جنگیاں۔ مرہٹوں۔ جاٹوں۔ روہیلوں و افغانوں کی لڑائیاں۔ نوابان اودھ کے معرکے۔ انگریزوں کے مورچے۔ عمائدین شہر کی سازشیں۔ اہل ہنود و مسلمانوں کے خوشگوار تعلقات سب کا ذکر اس کتاب میں موجود ہے۔ چونکہ اس زمانے کی بہت سی تاریخیں ہیں لہٰذا واقعات کی تصدیق یا تردید ہو سکتی ہے۔ میر صاحب خود بہت سی مہموں میں شریک تھے۔ افسوس ہے کہ میر صاحب نے اُس زمانے کے لٹریری پہلو پر بہت کم روشنی ڈالی ہے۔ شعرا کا ذکر بالکل نہیں ہے۔ ادبی زندگی کے حالات مفقود ہیں۔

سیادت میں اختلاف تذکرۂ شورش میں ہے (جس کا سنہ تالیف گیارہ سو ترانوے ہے جبکہ میر صاحب حیات تھے اور دلی میں مقیم تھے) کہ میر صاحب فی الحقیقت

سید نہ تھے بلکہ میر تخلص ہونے کی وجہ سے سید خیال کیے جانے لگے۔ تذکرۂ آبحیات میں ہے کہ کہن سال بزرگوں سے یہ بھی سنا ہے کہ جب انھوں نے میر تخلص کیا تو اُن کے والد نے منع کیا کہ ایسا نہ کرو ایک دن خواہ نخواہ سید ہو جاؤ گے اُس وقت اُنھوں نے خیال نہ کیا رفتہ رفتہ ہو ہی گئے۔ پھر سودا کے ایک قطعہ کا حوالہ دیتے ہیں جس کا آخری شعر یہ ہے

میری کے اب تو سارے مسالے ہیں مستعد

بیٹا تو گندنا بنے اور آپ کو تھمیر ؎ ؎

مگر یہ بھی لکھتے ہیں کہ یہ قطعہ سودا کے کلیات میں نہیں ہے اور پھر آگے خود کہتے ہیں کہ میر صاحب کی سیادت میں[1] شبہ نکرنا چاہیے اگر وہ سید نہ ہوتے تو خود کیوں کہتے

---

[1] یعنی مصنف آبحیات نے میر صاحب کی سیادت کے متعلق ایسے الفاظ میں لکھا ہے جن سے اُن کے سید ہونے میں شبہ بھی پایا جاتا ہے اور آگے چل کر اپنے اس شبہ کی خود ہی تردید بھی کر دی ہے۔ افسوس ہے انھوں نے ایک غیر معتبر روایت "کہن سال بزرگوں کی" زبانی نقل کر دی کہ جب میر صاحب نے میر تخلص کیا تو اُن کے والد نے منع کیا کہ ایسا نہ کرو ایک دن خواہ مخواہ سید ہو جاؤ گے اس زبانی اور غیر موثق روایت کے علاوہ سودا کا وہ قطعہ بھی پیش کرتے ہیں جسکے ایک شعر میں میر صاحب کی سیادت کے متعلق مذاق اُڑایا گیا ہے مگر خود ہی اس پیش کردہ شہادت میں شبہ پیدا کرتے ہیں کہ یہ قطعہ سودا کے کلیات میں نہیں ہے اور آگے چل کر اپنی رنگین عبارت میں میر صاحب کی مسکینی و غربت اور صبر و قناعت وغیرہ کا محضر تیار کر کے ادائے شہادت کرتے ہیں کہ اُن کی سیادت میں شبہ نہ کرنا چاہیے۔ یہ منطق سمجھ میں نہیں آتی اس وجہ سے کہ پہلے خود ہی شبہ کیا پھر اُس شبہ کی آپ ہی تردید کی۔ اس کے علاوہ شروع مضمون میں جہاں میر صاحب کے خاندان کا ذکر کیا ہے اُن کو "خلف میر عبداللہ" لکھتے ہیں یعنی اُن کے والد کی بھی سیادت کے قائل ہیں۔ اسی طرح مضمون کے آخر میں میر صاحب کے بیٹے کا نام "میر عسکری عرف میر کلّو" بتاتے ہیں ۱۲

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں   اِس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی

حقیقت یہ ہے کہ میر صاحب کی سیادت کے متعلق کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا اس وجہ سے کہ اپنی سیادت کا اشارہ انھوں نے اپنے اکثر اشعار میں کیا ہے۔ ذکر میر نے اس امر کا قطعی طور پر فیصلہ کر دیا ہے۔ میر صاحب اپنے والد کا ذکر ہر جگہ میر علی متقی کے نام سے کرتے ہیں۔ اپنا نام اپنے والد و بزرگوں کی زبانی میر محمد تقی لکھا ہے اپنے بیٹے کا نام میر فیض علی لکھا ہے۔ یہ روایت غلط ہے کہ جب اُنھوں نے میر تخلص اختیار کیا تو اُن کے والد نے منع کیا کیونکہ والد کی وفات کے وقت میر صاحب کی عمر دس گیارہ برس سے زیادہ کی نہ تھی اور اُس وقت شعر نہیں کہتے تھے "میر صاحب کا مذہب شیعہ تھا مگر ایسا تنگ نہیں جو دوسروں کے لئے ناگواری کا باعث ہو،، آزاد نے اپنی نہایت قابل قدر، مگر واقعات کے اعتبار سے کسی قدر غیر معتبر تصنیف (آبحیات) میں بعض غلط بیانیاں بھی کی ہیں۔ مثلاً بعض ایسے قصے اور اقوال میر صاحب کی طرف منسوب کیے ہیں جن سے اُن کی بد دماغی اور نازک مزاجی کا اظہار ہوتا ہے مثلاً وہ واقعہ جس میں میر صاحب کے سفر دلّی کا ذکر کیا ہے۔ اور میر قمر الدّین منت اور سعادت یار خاں رنگین کی شاگردی کے متعلق۔ افسوس ہے کہ اِن واقعات کی تصدیق نہیں کر لی گئی اپنی کتاب کو دلچسپ بنانے کی غرض سے بہت سے بے بنیاد قصے اور سُنے سُنائے واقعات بلا تحقیق (ممکن ہے بعض غلط تذکرہ نویسوں کی تقلید کے خیال سے) داخل کر دیے۔ الحمد للہ کہ نکات الشعرا کے شائع ہو جانے اور دیگر معاصرین میر کے تذکروں کے دستیاب ہونے سے

اکثر مشکوک واقعات اب صاف ہوگئے۔ نکات الشعرا کے متعلق آبحیات میں ہے "کہ نکات الشعرا شائق شعر کے لئے بہت مفید ہے۔

نکات الشعرا

اُس میں شعرائے اُردو کی بہت سی باتیں اس زمانہ کے لوگوں کے دیکھنے کے لائق ہیں مگر وہاں بھی اپنا انداز قائم ہے دیباچہ میں فرماتے ہیں کہ یہ اُردو کا پہلا تذکرہ ہے اس میں ایک ہزار شاعر کا حال لکھونگا۔ ان ہزار میں ایک بیچارہ بھی طعنوں اور ملامتوں سے نہیں بچا۔ ولی کہ بنی شعرا کا آدم ہے اسکے حق میں فرماتے ہیں۔ وے شاعریست از شیطان مشہورتر" مگر واقعات ان سب باتوں کی تردید کرتے ہیں۔ نکات الشعرا اب شائع ہوگئی ہے اُس کے دیباچہ میں یہ سب باتیں کہیں نہیں ہیں اور نہ اُس میں ایک ہزار شاعروں کا ذکر ہے بلکہ فی الحقیقت تقریبًا سو شعرا کا حال ہے نہ اُن کے کلام کی تنقید میں سختی اور بد دماغی سے کام لیا گیا ہے۔ تعجب معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کی عبارت نہایت سلیس اور مبالغے اور استعارے وغیرہ سے پاک و صاف ہے تنقید بھی نہایت مختصر اور زوردار الفاظ میں اور نہایت منصفانہ ہے۔ جہاں کہیں کسی شاعر کا حال زیادہ معلوم نہیں ہے تو صاف لکھدیتے ہیں کہ فقیر کو اسکے حال سے آگاہی نہیں۔ یا اسی قسم کا کوئی اور جملہ۔ درشت اور طنزیہ جملے کہیں کہیں ہیں مگر بہت کم۔ اور صرف اُسی صورت میں جبکہ کوئی شخص اُسکا مستحق فی الواقع ہے۔ ولی کی نسبت شیطان سے زیادہ مشہور والا فقرہ ہم کو کہیں نہیں ملتا۔ بلکہ برعکس اُس کے اُنکی نسبت تو یہ لکھتے ہیں "کہ از کمال شہرت احتیاج تعریف ندارد" پھر میر صاحب کے مذہب کے متعلق آبحیات میں ہے

کہ "میر صاحب کے ماموں حنفی مذہب تھے اور میر صاحب شیعہ اس پر نازک مزاجی غضب۔ غرض کسی مسئلہ پر بگڑ کر الگ ہوگئے" یہ صحیح ہے کہ خان آرزو کے متعلق میر صاحب کی نازک مزاجی یا بد دماغی کا تذکرہ نکات الشعرا میں کہیں پتا نہیں چلتا بلکہ وہ تو اُن کو اپنا اُستاد و پیر و مرشد اور رہنمائے فن وغیرہ ایسے معزز الفاظ سے یاد کرتے ہیں۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ میر صاحب کو دیگر مذاہب کے ساتھ تعصب اور ناروا داری کا ہرگز خیال نہ تھا بلکہ وہ دیگر مذاہب کا بڑا ادب و احترام کرتے تھے وہ علیحدگی جس کا ذکر مولانا آزاد نے کیا ہے میر صاحب نے اُس کے متعلق ذکر میر میں تحریر کیا ہے۔ لیکن اُن کے کلام سے کہیں نہیں پایا جاتا کہ اُنھوں نے خان آرزو کے خلاف کوئی بد وضعی کی۔ ذکر میر میں سراج الدین علی خان آرزو کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ نادرشاہ کے حملے کے بعد پھر دہلی گیا اور اپنے بڑے بھائی کے خالو سراج الدین علی خاں آرزو کا منت پذیر ہوا اور وہیں کچھ دن رہا اور شہر کے بعض صاحبوں سے چند کتابیں پڑھیں۔ جب میں کسی قابل ہوا تو بھائی صاحب (حافظ محمد حسن) کا خط پہونچا کہ میر محمد تقی فتنۂ روزگار ہے ہرگز اُسکی تربیت میں سعی نہ کی جائے وہ عزیز (آرزو) واقعی دنیا دار شخص تھا اپنے بھانجے کے لکھنے پر میرے درپے ہوگیا جب کبھی ملاقات ہوتی تو بلا وجہ بُرا بھلا کہنا شروع کر دیتے اور طرح طرح سے مجھے تکلیف پہونچانے کی کوشش کرتے میرے ساتھ اُن کا سلوک ایسا تھا جیسا کسی دشمن سے ہوتا ہے" اس رنج و غم میں میر صاحب کی حالت جنون کی سی ہوگئی۔ ایک روز خان آرزو نے میر صاحب کو

کھانا کھانے کے لئے بلایا اور ناگوار و تلخ باتیں کرنا شروع کیں میر صاحب بغیر کھانا کھائے اُٹھ آئے شام کو اُن کے گھر سے چلے گئے اور پھر کچھ عرصے بعد اُن کی ہمسائگی بھی ترک کر دی آرزو کے شجاع الدولہ کے پاس جانے کے بابت لکھتے ہیں کہ میرے خالو بادیہ پیمائے طمع ہوئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب دوسری بیوی سے تھے اور پہلی بیوی سے حافظ محمد حسن جن کے آرزو خالو تھے اور میر صاحب کے سوتیلے خالو ہوئے۔ اُنھوں نے میر صاحب کی کچھ پرورش ضرور کی اور تعلیم میں بھی کچھ حصہ لیا۔ نکات الشعرا میں خان آرزو کے کمالات کا اعتراف ہے اور ذکر میر میں خانگی تعلقات کا بیان ۔ پھر آزاد کے بیان سے ایک جگہ مترشح ہوتا ہے کہ میر صاحب نے اپنا تخلص میر سوز سے لیا جو پہلے میر تخلص کرتے تھے۔ یہ بھی ایک بے بنیاد دعوی ہے کیونکہ میر صاحب خود فرماتے ہیں کہ میں عرصہ سے یہ تخلص کرتا ہوں بلکہ حقیقت حال یہ ہے کہ جب سوز نے یہ دیکھا ہوگا کہ اُن کے اچھے اشعار اُن کے ہم تخلص کی طرف منسوب کیے جائینگے تو اُنھوں نے پہلا تخلص ترک کرکے سوز اختیار کیا ہوگا۔ خواجہ میر درد کی نسبت بھی میر صاحب نہایت عمدہ الفاظ استعمال کرتے ہیں اور بہت ادب و عزت سے اُن کا نام لیتے ہیں۔ مولانا آزاد یہ بھی لکھتے ہیں کہ میر صاحب اُن لوگوں کا ذکر جو دلّی کے رہنے والے نہ تھے اور زبان اُردو سے اسی وجہ سے ناواقف تھے بہت حقارت کے ساتھ کرتے ہیں۔ مگر یہ بھی واقعہ کے خلاف ہے اسوجہ سے کہ میر صاحب نے اکثر ایسے شعرا کی بہت کچھ تعریف کی ہے جو دلّی کے رہنے والے نہ تھے مثلاً میاں شرف الدین مضمون کی نسبت یہ دلچسپ الفاظ لکھتے ہیں۔

متوطن چھپا چھوکہ قصبہ ایست متصل اکبرآباد حریف ظریف، ہشاش بشاش ہنگامہ گرم کن مجلسہا، ہرچند کم گو بود لیکن بسیار خوش فکر و تلاش لفظ تازہ زیادہ“

میر صاحب کا کیرکٹر

اس میں کوئی شک نہیں کہ قسام ازل نے میر صاحب کو انتہا درجہ کی تمکنت، خودداری، اور ایک حساس طبیعت دی تھی۔ وہ اکثر رؤسا، اور امرا کے ارتباط اور میل جول تک کو نظر حقارت سے دیکھتے تھے کہ مبادا اِس سے اُن کی خودداری پر کوئی حرف نہ آئے۔ وہ بیحد ضابط، کم گو، اور آزاد طبیعت واقع ہوے تھے۔ افلاس اور کم مائگی نے اُن کی عالی ظرفی کو اعلیٰ تر کر دیا تھا۔

نازک دماغی

میر صاحب کی بد دماغی اور نازک مزاجی کو آزاد نے بڑے مبالغے سے بیان کیا ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ نازک مزاج ضرور تھے۔ راجہ ناگرمل جو اُن کا بڑا قدرداں تھا اسکی رفاقت محض اسوجہ سے چھوڑ دی کہ جو معاہدہ وہ اُس کے ایما سے بادشاہی اُمرا سے کرکے آئے تھے اُسپر اُس نے عمل نہیں کیا۔ ایک امیر راجہ جگل کشور جو محمد شاہ کے عہد میں دیوان بنگالہ تھے اور بڑی ثروت سے بسر کرتے تھے میر صاحب کو گھر سے اُٹھا لے گئے۔ اپنے کلام کی اصلاح کی خواہش کی میر صاحب نے اصلاح کی قابلیت دیکھی اور اُن کی اکثر تصنیفات پر خط کھینچ دیا۔ مگر راجہ جگل کشور نے کچھ خیال نہ کیا اور راجہ ناگرمل سے ملاقات کرا دی اور میر صاحب کی اُنھوں نے بہت کچھ قدر کی۔ عنایت خاں کی رفاقت میں چند روز رہے۔ ایک دن اُنھوں نے میر صاحب سے فرمایش کی کہ گویئے کو سیکھتے کے اپنے دو تین شعر یاد کرا دیجیے گا تو وہ گانے کے

قاعدے سے درست کرکے گا لیگا۔ میر صاحب نے عذر کیا خاں صاحب نے اصرار کیا مگر میر صاحب خانہ نشین ہوگئے اور اُن کی ملازمت چھوڑ دی عالمگیر ثانی بادشاہ نے بار بار بُلایا مگر میر صاحب نہیں گئے۔ اس کا ایک سبب تو طبعی تھا اور دوسرے یہ کہ اُنھیں اپنی وضع کا بڑا پاس تھا اور جب فقر و فاقہ درپیے ہو تو وضعداری نبھانے میں نازک مزاجی آہی جاتی ہے۔ اُن کی نازک دماغی دوسروں کی ہمدردی کی بھی متحمل نہیں ہوسکتی تھی سریع الغیظ اور جلد برہم ہوجانے والے تھے اور اپنی اس کمزوری سے خود بھی واقف تھے چنانچہ اپنے بعض اشعار میں اسکی طرف اشارہ کیا ہے اور میر حسن و لطف وغیرہ نے بھی اسکا ذکر کیا ہے

حالت تو یہ ہے مجھ کو غموں سے نہیں فراغ

دِل سوزشِ درونی سے جلتا ہے جوں چراغ

سینہ تمام چاک ہے سارا جگر ہے داغ ؏

ہے نام مجلسوں میں مرا میرِ بے دماغ

ازبسکہ کم دماغی نے پایا ہے اشتہار

ولہ

ہر چند میر بستی کے لوگوں سے ہے نفور

پر ہائے آدمی ہے وہ خانہ خراب کیا

ولہ

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ ؏

افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

ولہ

ہم خستہ دل ہیں تجھ سے بھی نازک مزاج تر
تیوری چڑھائی تونے کہ یاں جی نکل گیا

ولہ

نازک مزاج آپ قیامت ہیں میر جی!
جوں شیشہ میرے منھ نہ لگو میں نشہ میں ہوں

ہر چند کہ اپنی نسبت بعض اشعار میں اور تذکرہ میں حقیر اور منکسرانہ الفاظ استعمال کیے ہیں اور اپنے شاگردوں کو اپنا دوست بتایا ہے مگر یہ سب بھی اُسی خلقی تمکنت کی ایک شان اور ایک ادا ہے۔ اُن کی مشہور مثنوی اژدرنامہ جس میں کہ اپنے آپ کو ایک اژدہا قرار دیا ہے اور باقی شاعروں کو چھوٹے چھوٹے جانوروں سے تشبیہ دی ہے کوئی فرضی اور خیالی چیز نہ سمجھنا چاہیے بلکہ وہ اُن کے فطری غرور اور بددماغی کی ایک بیّن مثال سمجھی جا سکتی ہے۔ اپنے معاصر شاہ حاتم کو ان الفاظ میں یاد کرتے ہیں "مردیست جاہل و متمکن و مقطع وضع ..... دریافتہ نمی شود کہ ایں رنگ کہن بسبب شاعری است یا وضع او ہمین است خوب ست ارا باینہا چہ کار ..... بامن ہم آشنائے بیگانہ است" مگر اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ ہر شخص کو اسی ناروا داری اور کم بینی کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اپنے دوسرے معاصر اور حریف مرزا رفیع سودا کی نسبت اس طرح رطب اللساں ہیں "غزل و قصیدہ و مثنوی و قطعہ و مخمس و رباعی ہمہ را خوب می گوید۔ سرآمد شعرائے ہندی اوست بسیار خوش گوست...

چنانچہ ملک الشعرائی ریختہ اور اشاید" اسی طرح بعض خود اپنے شاگردوں کی بھی بہت کچھ تعریف کرتے ہیں۔ مگر مولانا آزاد نے اس قدرتی کمزوری پر اور گُل بوٹے لگائے ہیں فرماتے ہیں "اگر یہ غرور و بدد ماغی فقط امراکے ساتھ ہوتی تو معیوب نہ تھی افسوس یہ ہے کہ اوروں کے کمال بھی اُنھیں دکھائی نہ دیتے تھے اور یہ ہر ایسے شخص کے دامن پر نہایت بدنما دھبہ ہے جو کمال کے ساتھ صلاحیت اور نکوکاری کا خلعت پہنے ہو۔ بزرگوں کی تحریری روایتیں اور تقریری حکایتیں ثابت کرتی ہیں کہ خواجہ حافظ شیرازی اور شیخ سعدی کی غزل پڑھی جائے تو وہ سر ہلانا گناہ سمجھتے تھے کسی اور کی کیا حقیقت ہے۔" اس سخت اور غیر منصفانہ تنقید سے صاف ظاہر ہے کہ "نکات الشعرا" مولانا آزاد کی نظر سے نہیں گزری بلکہ اُنھوں نے میر صاحب کے غرور اور بدمزاجی کی اکثر بے بنیاد روایتیں ضعیف اور غیر قابل اعتماد تذکروں سے علی الخصوص تذکرۂ قاسم سے بغیر جانچے ہوئے لیلیں۔

میر کے کلام میں مایوسی و درد

میر ازل ہی سے دردمند دل لیکر آئے تھے اور اُن کو دُنیا میں سوائے رنج و الم کے کچھ اور نہیں دکھلائی دیتا تھا چنانچہ میر صاحب خود لکھتے ہیں ؎

نہ دردمندی سے یہ راہ تم چلے ورنہ قدم قدم پہ تھی یاں جائے نالہ و فریاد

پھر والد کی درویشانہ زندگی اور تلقین کہ "اے پسر عشق بورز۔ عشق است کہ دریں کارخانہ متصرف ست۔ اگر عشق نمی بود نظم کل صورت نمی بست۔ بے عشق زندگی وبال ست۔ دِل باختۂ عشق بودن کمال ست عشق بسازد۔

عشق بسوزد۔ در عالم ہر چہ ہست ظہور عشق است ..... بے عشق نباید بود
بے عشق نباید زیست"۔ چنانچہ جا بجا میر صاحب فرماتے ہیں ؎

عشق ہی عشق ہے جہاں دیکھو — سارے عالم میں بھر رہا ہے عشق

؎

یارب کوئی تو واسطہ سرگشتگی کا ہے — اِک عشق بھر رہا ہے زمیں آسمان میں

میر صاحب کی تربیت بھی سید امان اللہ کے زیر نظر ہوئی جو ایک صوفی منش بزرگ تھے۔ زمانۂ طفولیت ہی سے شان درویشی اور صبر و قناعت پیدا ہوگئی تھی۔ سید صاحب کی بدولت میر صاحب کو بہت سے درویشوں اور اہل دل سے ملنے کا اتفاق ہوا اور اُن کی سوز و گداز بھری باتیں سننے کا موقع ملا جو اُن کے دل میں اُتر گئیں اور جن کا رس اُن کی طبیعت اور کلام میں ہمیشہ باقی رہا"۔ میر صاحب کی زندگی بھی درد سے معمور ہے۔ بچپن سے ہی مصیبت کا سامنا تھا۔ دس سال کی عمر میں باپ کا انتقال ہوا۔ تلاش معاش کے لیے باہر نکلے۔ بڑے بھائی نے بیرخی اختیار کی۔ دلی گئے وہاں بہت تکلیف سے کٹی۔ خان آرزو بھی درپے آزار ہوگئے۔ میر صاحب بہت ہی دل شکستہ و دل گرفتہ رہتے تھے۔ اِس پر بے نوائی و بے بسی۔ اس غم و غصّہ میں ایک جنون کی سی حالت ہوگئی اور اُنھیں چاند میں ایک عجیب صورت نظر آنے لگی جس سے اُن کی وحشت و دیوانگی اور بڑھ گئی۔ اس حالت کا ذکر ذکر میر میں موجود ہے اور اُن کی مثنوی خواب و خیال میں بھی اسی طرف اشارہ ہے۔ قلبی واردات کی تصویر نظر آتی ہے اُس کے جستہ جستہ اشعار ذیل میں

درج ہیں۔

زمانے نے رکھا مجھے متصل　　پراگندہ روزی پراگندہ دِل

چلا اکبرآباد سے جس گھڑی　　درو بام پر چشم حسرت پڑی

پس از قطع رہ لائے دِلّی میں بخت　　بہت کھینچے یاں میں نے آزار سخت

جگر جورِ گردوں سے خوں ہو گیا　　مجھے رُکتے رُکتے جنوں ہو گیا

ہوا خبط سے مجھ کو ربطِ تمام　　لگی رہنے وحشت مجھے صبح و شام

کبھو کف بلب مست رہنے لگا　　کبھو سنگ در دست رہنے لگا

نظر آئی اِک شکل مہتاب میں　　کمی آئی جس سے خور و خواب میں

دِلی میں جب تک رہے روزی کا مستقل ٹھکانا نہ تھا۔ آج گھر میں اناج تو کل نانِ شبینہ کے محتاج۔ کبھی کبھی فاقہ کی نوبت پہونچی۔ اِس فقر و مسکینی میں زندگی بسر کی۔ چنانچہ کلام میں بھی اِس حالت کی جھلک موجود ہے ؎

نامرادانہ زیست کرتا تھا　　میر کی وضع یاد ہے ہم کو

بہت سعی کیجئے تو مر رہیے میر　　ولہ　　بس اپنا تو اِتنا ہی مقدور ہے

نہ مِل میر اب کے امیروں سے تو　　ولہ　　ہوئے ہیں فقیر اُن کی دولت سے ہم

پھر دِلّی کی بربادی۔ عزیزوں اور خاندانوں کی تباہی۔ آئے دِن کے انقلاب۔ مرہٹوں۔ جاٹوں۔ دُرّانیوں کی دستبرد و غارتگری اپنی آنکھ سے دیکھیں اور قلم سے لکھیں ؎

دِلّی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں اُنھیں　　تھا کل تلک دماغ جنھیں تاج و تخت کا

دِلِ عشق کا ہمیشہ حریفِ نبرد تھا　　ولہ　　اب جس جگہ کہ داغ ہے یاں پہلے درد تھا

مولوی عبدالسلام ندوی نے بہارِ بیخزاں کی روایت پر لکھا ہے کہ "میر صاحب تیغ عشق کے زخم خوردہ تھے اور اُن کے دل پر ابتدا ہی سے یہ چرکہ لگ چکا تھا۔ عمر بھر اُن کے دل میں یہ نشتر کھٹکتا رہا۔ اگرچہ یہ ایک راز ہے کہ عام طور پر تذکرہ نویسوں کو اسکی خبر نہیں ہے لیکن بعض تذکروں نے اس کو فاش کردیا ہے۔ چنانچہ بہارِ بیخزاں میں ہے کہ" بہ شہر خویش با پری تمثالے کہ از عزیزانش بود در پردہ تعشق طبع و میل خاطر داشت آخر عشق او خاصہ مشک پیدا کردہ می خواست کہ بخیہ بکار رسوے رسوائی مے کند و حسن بے پردہ بجلوہ گری درآید از ننگ افشاے راز وطن و اقربا بادلے بغل پروردہ حسرت و حرماں و با خاطر ناشاد دوست وگریبان قطع رشتہ حب وطن ساختہ از اکبرآباد بعد از خانہ برانداز یہا بشہر لکھنؤ رسید و ہمیں جا بصد حسرت جانکاہ جلاوطنی و حرماں نصیبی از دیدار یار و دیار جاں بجہاں آفریں داد تا بقید رشتہٴ حیات بود طوق محبت بہ گردن و سلسلۂ دیوانگی بپا داشت از کلام عاشقانہ و درد انگیزش پیداست کہ صد آرزو بخاک بردہ"۔ میر صاحب کے بعض اشعار سے بھی در پردہ اسکی تصدیق ہوتی ہے ؎

مرے سلیقہ سے میری نبھی محبت میں :: تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

کیا تھا شعر کو پردہ سخن کا :: وہی آخر کو ٹھہرا فن ہمارا

لیکن ہمارے نزدیک یہ بات پایۂ تحقیق کو نہیں پہونچی۔ اشعار سے اس بات کو ثابت کرنا ایک قیاسی دلیل ہے۔

تصانیف میر صاحب کی تصانیف کثرت سے ہیں۔ چونکہ بہت بڑی

عمر پائی تھی۔ لہذا تصنیف وتالیف کی تعداد بھی زیادہ ہے۔ اُن کی تصانیف حسب ذیل ہیں۔

(۱) چھ ضخیم دیوان غزلوں کے

(۲) ایک دیوان فارسی (جو ہنوز شائع نہیں ہوا ہے)

(۳) متعدد مثنویاں

(۴) ایک رسالہ بزبان فارسی موسوم بہ فیض میر جس کے آخر میں چند لطیفے وحکایات ہیں۔ اُن میں بعض بہت فحش ہیں اُس سے اُس زمانے کا مذاق معلوم ہوتا ہے

(۵) ایک تذکرہ بزبان فارسی شعرائے اُردو کا موسوم بہ نکات الشعراء

دیوانوں میں نہ صرف غزلیں ہیں بلکہ رباعیاں۔ مستزاد۔ واسوخت۔ مخمس۔ مسدس۔ ترجیع بند۔ ترکیب بند۔ مطلع۔ تضمینیں۔ فردیات۔ غرض کہ جملہ اقسام سخن موجود ہیں۔ دیوانوں کے صدہا صفحے ہیں۔ اور غزلیں ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔

میر صاحب نے چند قصیدے بھی لکھے۔ مگر اول تو اُنکی تعداد کم ہے۔ دوسرے بمقابلۂ سودا کے قصائد کے وہ زیادہ زوردار نہیں اُن کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب کی طبیعت غزل گوئی کے واسطے مخصوص تھی قصیدہ کی طرف مائل نہ تھی۔ اس وجہ سے کہ وہ امیروں اور رئیسوں کی خوشامد اور ہجوؤں سے کوسوں بھاگتے تھے اور نیز یہ کہ استغراق خودداری اور قدرتی کم سخنی اُن کو بیجا لفاظی کیطرف کسی طرح مائل نہ ہونے دیتی تھی۔

مخمسات بعض مناقب میں ہیں اور بعض شہر آشوب کی صورت میں ہیں جنمیں شاہ عالم بادشاہ دہلی کے زمانہ کی شکایات ہیں۔

غزلوں کے بعد اُن کی مثنویوں کا نمبر ہے جنکی تعداد بھی کثرت سے ہو مثنویاں اکثر عاشقانہ اور بہت مقبول ہیں بعض متفرق مضامین پر ہیں تعداد حسب ذیل ہے۔

(۱) مثنوی اژدر نامہ یا اژدر نامہ جس میں میر صاحب کے طبعی غرور اور دیگر معاصرین شعرا کی حقارت کا ایک منظر ہے۔ اُس میں اُنھوں نے اپنے آپ کو ایک اژدہا تصور کیا ہے جو چھوٹے چھوٹے کیڑوں سانپ بچھو وغیرہ کو کھا جاتا ہے اور ان حشرات الارض سے اُس زمانہ کے کم مایہ شعرا مُراد ہیں۔

(۲) شعلۂ عشق (۳) جوش عشق (۴) دریائے عشق

(۵) اعجاز عشق (۶) خواب خیال (۷) معاملات عشق

(۸) تنبیہ الجہال جس میں کہ فن نظم اور اُس کے مرتبہ کا بیان ہے

ان کے علاوہ تین مثنویاں شکار نامہ کی ہیں جن میں نواب آصف الدولہ کے سیر و شکار کا حال ہے۔ کچھ اور چھوٹی چھوٹی نظمیں ایسی چیزوں کے متعلق بھی ہیں جن سے میر صاحب کو بہت اُنس تھا۔ مثلاً کتا۔ بلی۔ بکری وغیرہ۔

ایک مثنوی مرغبازاں ایک میں موسم برسات اور اُس کی تکلیفوں کا خاص کر اپنے گھر کا حال بیان کیا ہے جو بارش کی شدت سے گر گیا تھا۔ اسی طرح ایک میں سفر برسات کا ذکر ہے۔ ایک چھوٹی سی مثنوی جھوٹ کیطرف سے

خطاب کرکے لکھی ہے کچھ مرثیے بھی لکھے ہیں مگر وہ چنداں قابل ذکر نہیں۔ تاریخ گوئی کا اُن کو مطلق شوق نہ تھا۔ ایک ساقی نامہ بھی ہے۔

میر صاحب کی ایجادیں میر صاحب اُردو واسوخت کے موجد تسلیم کئے گئے ہیں اسی طرح اُردو میں مثلث و مربع (یعنی تین اور چار مصرعوں کی نظمیں) بھی انھیں کی ایجاد ہیں۔ بعض فارسی کے شعروں کو تضمین کرکے کبھی مثلث کیا ہے اور کبھی مربع۔ مثلاً اہلی شیرازی کا شعر ہے۔

امروز یقیں شد کہ نہ داری سر اہلی   بیچارہ زلطفِ تو غلط داشت گما نہا

اس پر میر صاحب نے ایک مصرعہ لگا کے اس طرح مطلب پورا کیا۔

کل تک تو فریبندہ ملاقات تھی پہلی   امروز یقیں شد کہ نہ داری سر اہلی

بیچارہ زلطفِ تو غلط داشت گما نہا

میر صاحب کی شہرت خاصکر اُن کی غزلوں اور مثنویوں پر مبنی ہے غزلوں میں تو فی الحقیقت اُن کا جواب نہیں مگر مثنویاں میر حسن کی مثنوی سحر البیان کو نہیں پہونچتیں پھر بھی اُن کی بیساختگی اور فصیح البیانی و سادگی قابل داد ہے۔ دیوان فارسی بقول مصحفی ایک سال میں تیار ہوا تھا جب کہ ریختہ کہنا موقوف کردیا تھا۔

تذکرۂ نکات الشعرا یہ تذکرہ تقریباً ۱۱۶۵ھ مطابق ۱۷۵۲ء عیسوی میں لکھا گیا یہ حسب دعوے مصنف شعرائے اُردو کا سب سے پہلا تذکرہ ہے اور واقعی نہایت دلچسپ اور مفید ہے افسوس ہے اس میں حالات زیادہ تفصیل سے نہیں دیے گئے مگر پھر بھی جو باتیں معاصر شعرا کے متعلق اسمیں ملتی ہیں وہ بہت کچھ قابل قدر ہیں

جن شعراء کا ذکر ہے اُن کا کلام بھی بطور نمونہ کے دیا گیا ہے ۔

میر صاحب کی خدمات زبان اور شاعری کے ساتھ

میر صاحب نے اکثر فارسی ترکیبیں یا اُن کے ترجمہ کو اُردو میں داخل کرکے اُس کو ریختہ بنایا۔ آزاد نے آبحیات میں اُنکی بہت سی مثالیں دی ہیں۔ مثلاً

ہنگامہ گرم کن جو دلِ ناصبور تھا	پیدا ہر ایک نالہ سے شورِ نشور تھا
دِل کہ یک قطرہ خوں نہیں ہے بیش	ایک عالم کے سر بلا لایا
اے تو کہ یاں سے عاقبت کار جائیگا	یہ قافلہ رہے گا نہ زنہار جائیگا

ترجمہ کی مثال ۔

گل کو محبوب ہم قیاس کیا	فرق نکلا بہت جو باس کیا

باس کرنا یا بو کرنا فارسی 'بو کردن' کا ترجمہ ہے بمعنی سونگھنا ۔

ان میں سے اکثر چیزیں پسند عام ہو کر منظور ہوئیں بہت سی ناپسند ٹھیریں جو رفتہ رفتہ متروک ہوگئیں ۔ میر صاحب کے خیالات ریختہ کے متعلق جو نکات الشعراء کے آخر میں دیئے ہوے ہیں، خود اُنہی کی زبان سے سُننے کے لائق ہیں فرماتے ہیں :-

بدانکہ ریختہ بر چندیں قسم است - از انجملہ انچہ معلوم فقیر ست نوشتہ می آید اول آنکہ یک مصرعش فارسی و یک ہندی چنانچہ قطعۂ حضرت امیر خسرو علیہ الرحمۃ کہ نوشتہ شد۔ دوم آنکہ نصف مصرعش ہندی و نصف فارسی ۔ چنانچہ شعر

ط	زرگر پسرے چو ماہ پارہ نقد دل من گرفت و بشکست	کچھ گھڑئے سنوارئے ٹیکا را پھر کچھ نہ گھڑا نہ کچھ سنوارا

مرزا معز کہ نوشتہ[لہ] آمد۔ سوم آنکہ حرف و فعل فارسی بکار می برند، و ایں قبیح است چہارم آنکہ ترکیبات فارسی مے آرند اکثر ترکیب کہ مناسب زبان ریختہ می افتد آن جائز است۔ و ایں را غیر شاعر نمی داند و ترکیبے کہ نا مانوس ریختہ می باشد آن معیوب ست و دانستن ایں نیز موقوف سلیقۂ شاعری است و مختار فقیر ہم ہمین ست اگر ترکیب فارسی موافق گفتگوے ریختہ بود مضائقہ ندارد۔ پنجم ایہام است کہ در شاعران سلف دریں فن رواج داشت اکنوں طبعہا مصروف ایں صنعت کم است مگر بسیار شستگی بستہ بشود۔ معنی ایہام این ست کہ لفظے کہ بر او بناے بیت بود آں دو معنی داشتہ باشد یکی قریب و یکی بعید و بعید منظور شاعر باشد و قریب متروک او۔ ششم انداز ست کہ ما اختیار کردہ ایم و آں محیط ہمہ صنعتہا است تجنیس، ترصیع، تشبیہ، صفائی گفتگو، فصاحت، بلاغت، ادا بندی، خیال وغیرہ۔ ایں ہمہ در ضمن ہمین ست و فقیر ہم از ہمیں وتیرہ محظوظم۔ ہر کہ را دریں فن طرز خاصی است ایں معنی را می فہمد۔ با عوام کار ندارم"۔

میر بحیثیت شاعر کے

عام طور پر اُردو شاعری اُردو تغزل کی مرادف ہے اور میر صاحب غزل گوئی میں مسلم الثبوت اُستاد مانے گئے ہیں۔ لہٰذا نتیجہ نکلتا ہے کہ میر صاحب زبان اُردو کے سب سے بڑے شاعر اور مسلم الثبوت اُستاد تھے۔ میر صاحب کا پایہ مثنوی نویسی میں بھی بہت بلند ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ غزل گوئی میں اُن کا جواب نہیں اور اُس مملکت میں وہ منفرد اور تن تنہا حکمراں ہیں۔ ان کے اشعار صاف۔ سادہ۔ فصیح اور تیر و نشتر کا کام دینے والے درد و اثر

لہ - از زلف سیاہ تو بدل ۔ دد م پری ہے ؛ در خانۂ آئینہ ۔ ۔ گھٹا جوم پری ہے ؛ ۱۲

سے مملو ہوتے ہیں۔ اُن میں دلکشی اور زور کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ اظہار جذبات چستی بندش اور ترنم میں وہ اپنی آپ نظیر ہیں۔ اِن کے اکثر اشعار میں وہ ایک خاص کیفیت ہے جو سحر یا طلسم سے تعبیر کیجا سکتی ہے اور جو تمام زبانوں کی حقیقی اور سچّی شاعری کا طغرائے امتیاز ہے۔ میر صاحب کے بہتّر نشتر مشہور ہیں۔ مگر سچ پوچھیے تو اُن کے صدہا ایسے شعر نکلیں گے جنمیں حقیقی شاعری کے اوصاف بدرجۂ احسن موجود ہیں جب کوئی پھڑکتا ہوا شعر سُنا جاتا ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ یہ اُنھیں بہتّر نشتروں میں سے ہے۔ زبان شستہ کلام صاف بیان ایسا پاکیزہ اور دل آویز جیسے باتیں کرتے ہیں۔ وہ اُردو کے شیخ سعدی ہیں ان کا کلام اکسیر شاعری ہے۔ علی الخصوص چھوٹی بحروں کے تو وہ بادشاہ ہیں اور ہمارے نزدیک تو بڑی بحروں میں بھی وہ اپنا جواب نہیں رکھتے۔ اُن کے کلام میں جو حزن و ملال حسرت و مایوسی سے مملو ہے وہی اُن کی شاعری کی جان ہے یہی نا اُمیدی اور یاس اُن کی غزلوں کو زوردار اور مؤثر بناتی ہے میر صاحب شاعری اور زباندانی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ عام طور پر لوگ اُن کو خدائے سخن کہتے ہیں۔ غالب و ناسخ اور نیز تمام مشاہیر جو اُن کے بعد ہوئے اُن کی عظمت اور اُستادی کے معترف تھے اور یہ بات خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ وہ اپنے ہی زمانے میں بہت بڑے شاعر مانے جاتے تھے۔ اُن کے معاصر اور نیز بعد کے تمام تذکرہ نویسوں نے اُن کی بیحد تعریف کی ہے۔ اور نہایت رنگین عبارت اور مبالغہ آمیز کلمات اُن کی نسبت استعمال کیے ہیں۔ شاعر اور نثّار دونوں اُنکی تعریف کے معاملہ میں باہم مسابقت کرتے معلوم ہوتے ہیں اور آرٹ

اور نیچر دونوں میں اُن کے کمال کی مدح سرائی کے الفاظ و اصطلاحات ڈھونڈتے ہیں۔ مثلاً میر حسن اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ سرآمد شعرائے ہند اور اپنے وقت کے افصح الفصحا اور بے نظیر و بے عدیل شاعر تھے۔ اسی طرح مرزا علی لطف تذکرۂ گلشن ہند میں یوں رقمطراز ہیں کہ ”جو شخص کہ نظارہ گاہ سخن میں چشم خوردہ بیں رکھتا ہے اور چاشنی خرد سے امتیاز ذائقہ تلخ و شیریں رکھتا ہے تو وہ اس بات کو جانتا ہے اور اس رمز کو پہچانتا ہے کہ میر شیریں مقال ہیں اور ریختہ گویاں سابق و حال میں نسبت خورشید و ماہ ہے اور فرق سپید و سیاہ ہے“۔ صاحب طبقات الشعراء لکھتے ہیں ”مجموعۂ قابلیت و ہنر صاحب طبع خوش فکر سرآمد مشہوران عصر محاورہ داں و متین متلاشی مضامین نو و رنگین متجسس الفاظ چرب و شیریں۔ در میدان غزل پردازی گوے فصاحت از معاصراں مے برد و ہر چند سادہ گو است اما در سادہ گوئی پرکار رہیا دارد“ حقیقت یہ ہے کہ میر و مرزا دونوں اپنے مابعد کے شعرا کے واسطے ایک صحیح نمونہ اور سرچشمۂ فیض تھے۔ اُن کے کلام کی حلاوت و دل آویزی اُن کے اشعار کا درد و اثر اور رنگینی آجتک مشہور رہیں بلکہ جب تک زبان اُردو قائم ہے مشہور رہیں گی۔

میر اور سودا کا مقابلہ

میر صاحب کی شہرت اُن کی غزلوں اور مثنویوں پر مبنی ہے اور سودا قصیدہ اور ہجو کے اُستاد مانے جاتے ہیں۔ خود سودا کے زمانے میں یہی خیال اکثر ارباب فن کا تھا۔ چنانچہ حکیم قدرت اللہ خاں قاسم اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں ”زعم بعضے آنکہ سرآمد شعرائے فصاحت مرزا محمد رفیع سودا

درغزل گوئی بوے (میر تقی) نرسیدہ اما حق آنست کہ ہر گلے را رنگ و بوے دیگرست' مرزا دریائیست بیکراں و میر نہریست عظیم الشان۔ در معلومات قواعد میر را بر میرزا برتریست و در قوت شاعری مرزا را بر میر سروری" اسی طرح ایک مشہور صاحبدل خواجہ باسط نے' جو علاوہ کمالات عرفان و تصوف کے فن نقد میں بھی کامل دستگاہ رکھتے تھے اس مشکل اور نازک مسئلہ یعنی میر و مرزا کی شاعری کے فرق کو نہایت مختصر الفاظ میں فیصلہ کردیا اور فرمایا "کہ دونوں صاحب کمال ہیں۔ مگر فرق اتنا ہے کہ میر صاحب کا کلام آہ ہے اور مرزا کا کلام واہ ہے"۔ اسی فرق کو ایک نہایت لطیف پیرایہ میں امیر مینائی نے بھی اپنے ایک شعر میں ظاہر کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں بڑے شاعر اور اپنے اپنے طرز کے استاد تھے۔ ہماری ناچیز رائے میں اِن دونوں بزرگواروں کے طرز کلام کا فرق اُن کے مزاج اور طبیعت کے فرق پر بہت کچھ مبنی ہے۔ میر صاحب قدرتاً حزیں اور غمگیں واقع ہوے تھے اِن کی زندگی حزن و یاس اور مصائب و ادبار کا نمونہ تھی۔ اس پر طرّہ یہ کہ خودداری اور عزت کا اُن کو بیحد احساس تھا جس سے وہ مجبور ہوگئے تھے کہ عزلت اور تلخکامی کی زندگی بسر کریں۔ اسی وجہ سے عمر بھر تلخابۂ حیات پیتے رہے بزم طرب اور محفل سرور کے وہ فطرتاً اہل نہ تھے۔ خوشی اور ہشاشی بشاشی کا حصہ قسام ازل نے اُن کو دیا ہی نہ تھا۔ برعکس اِس کے سودا نہایت شگفتہ مزاج اور رنگیں طبع واقع ہوے تھے وارستگی اور آزادی اُنکی طبیعت کا اصلی جوہر تھا۔ خوشی و خرمی زندہ دلی اور ظرافت سے اُبلے پڑتے تھے

خوشی کے مجمعوں اور ہنسی مذاق کے جلسوں کے روح رواں تھے، جہاں اُن کی قابلیت خداداد کے جوہر کھلتے تھے۔ زندگی نہایت فارغ البالی اور شادکامی سے بسر کرتے تھے۔ نظر بریں ان دونوں کی شاعری اُن کے خیالات اور اُن کے مزاج اور دُنیا کے ساتھ اُن کے برتاؤ کا بہترین آئینہ کہی جا سکتی ہے اسی طرح اُن دونوں کے اپنی اپنی شاعری کے واسطے منتخب کئے ہوئے الفاظ بھی اُن کے حسب مزاج اور موافق حال ہیں۔ ظاہر ہے کہ درد و اثر کے لیے الفاظ نہایت نرم اور صاف و سادہ اور بندش نہایت سلیس اور بے تکلف ہونی چاہیئے اور یہی طرز غزل کے واسطے زیادہ موزوں ہے۔ علی الخصوص چھوٹی چھوٹی بحروں کے لئے جسمیں کہ میر صاحب کی شاعری لپنے عروج کمال پر دکھائی دیتی ہے۔ برعکس اس کے قصیدہ کے لئے شاندار الفاظ، علو مضامین، نادر تشبیہوں اور استعاروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ قصیدہ کہنا ایک پژمردہ اور دل گرفتہ آدمی کا کام نہیں۔ عاشقانہ خیالات مثلاً مصائب ہجر و فراق وغیرہ کے دردناک حالات جن بے تکلف اور سیدھے سادے الفاظ سے ظاہر ہو سکتے ہیں وہ قصیدہ کے لئے کسی طرح موزوں نہیں ہیں۔

میر درد و اثر اور سادگی کے مسلم الثبوت اُستاد ہیں۔ ان کے وہ اشعار جو بہتر نشتر کے فرضی نام سے مشہور ہیں سب خود اُنھیں کے سچّے اور دلی جذبات کا پرتو ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے تخیل سے اُسمیں رنگ آمیزی مطلق نہیں کی ہے۔

میر کی زندگی ایک درد و الم کی زندگی ہے اور انگریزی شاعر شیلی کی

یہ سطور اُن کے حسب حال ہیں "وہ حرماں نصیب لوگ غلطی سے گہوارۂ شعر میں ڈال دیے جاتے ہیں جو مصیبت تو خود جھیلتے ہیں مگر وہی مصیبت نظم میں دوسروں کو سُناتے ہیں "

اسی وجہ سے میر کے بہترین اور سب سے زیادہ مؤثر شعر وہی ہیں جنمیں درد و الم کے جذبات کا اظہار کیا گیا ہے۔ سودا کے کلام میں میر کا سا درد نہیں۔ میر کے اشعار غمگین اور چوٹیلے دلوں پر خاص اثر کرتے ہیں۔ اُن کا قصّہ غم کا قصہ ہے۔ وہ زندگی کا وہ رُخ جو یاس اور غم سے بھرا ہوا ہے نہایت آب و تاب اور سچّائی سے پیش کرتے ہیں۔ برخلاف اس کے سَودا اُس کا دوسرا رُخ دکھلاتے ہیں جو امید اور خوشی سے مملو ہے۔ سودا کے اشعار پڑھنے والے کے لئے سامان طرب و نشاط مہیّا کرتے ہیں۔ اُن کی طبیعت کسی محدود دائرے میں مقید رہنا پسند نہیں کرتی۔ وہ جذبات کے تنگ عالم سے نکل جانا چاہتے ہیں اور ایک وسیع جولانگاہ اپنے اظہار خیال کے لئے تلاش کرلیتے ہیں۔ اسی وجہ سے اُنھوں نے نئی نئی راہیں نکالیں اور اُن کے اشعار ایک ایسے گلدستہ کا مزا دیتے ہیں جو انواع و اقسام کے مختلف رنگ و بو کے پھولوں سے بسا ہوتا ہے۔ اُنھوں نے انقباضی جذبات کو چھوڑ کر انبساطی جذبات کو بہت کچھ وسعت دی ہے۔ میر کی دُنیا تاریکی اور غم سے بھری ہوئی ہے جسمیں کہ امید کی جھلک تک نظر نہیں آتی۔ اُن کے تمام اشعار اس مقولہ کے تحت میں ہیں "جو کوئی اس غمکدہ میں قدم رکھے اُمید کو پیچھے چھوڑ آئے"۔ میر کی ہنسی اور مذاق بناوٹی اور اُنکی

طعن و تشنیع مصنوعی ہے۔ یہ کہنا صحیح نہیں کہ میر نے ہجو اور قصیدہ نہیں لکھا فی الحقیقت ان دونوں صنفوں میں اُنھوں نے طبع آزمائی کی مگر چونکہ طبیعت اِن اصناف کے واسطے موزوں نہیں پائی تھی لہذا ناکام رہے۔ یہ بھی کہنا صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ وہ اپنے مزاج کی خودداری اور دولت و اقتدار کی بے پروائی کیوجہ سے ان اصناف سخن میں سرسبز نہوسے۔ اُنھوں نے اجگرنامہ ضرور لکھا مگر وہ سودا کی ہجوؤں کا عشر عشیر بھی نہیں۔ اسی طرح اُن کے قصائد جو نواب آصف الدولہ کی تعریف میں ہیں سودا کے قصائد کے سامنے ہیچ ہیں

دونوں بزرگوار میر اور سودا حقیقت اور اصلیت بیان کرنے کے بادشاہ ہیں۔ دونو وہ کامل مُصوّر ہیں جو خیالی تصاویر نظم میں ایسی خوبصورتی اور جزئیات کی تفصیل کے ساتھ کھینچتے ہیں کہ اُن کے لفظی مرقعے ہمارے دل کی آنکھوں کے سامنے جیتی جاگتی تصویریں معلوم ہوتے ہیں۔ یہ مرقع نگاری داخلی یا خارجی، یعنی جذبات انسانی یا مناظر قدرت، دونوں کی ہوسکتی ہے۔ پس جہانتک کہ جذبات انسانی اور علی الخصوص درد و غم کے جذبات کا تعلق ہے اُن کے اعلام و اظہار میں میر صاحب متفرد ہیں۔ مگر ان کے سوا دیگر جذبات پر سودا کو کمال حاصل ہے۔ سودا کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ جن مضامین کی وہ اپنے اشعار میں تصویر کھینچنا چاہتے ہیں اُن کے مالہٗ اور ما علیہ کا اُن کو بدرجہ کمال علم ہوتا ہے۔ میر صاحب اپنی افتاد طبیعت، اپنی نازک عادات اور اپنے استغراق خودی کیوجہ سے مجبوراً فطرت انسانی کا مطالعہ اس وسیع النظری سے نہیں کرسکتے اُن کی محدود نظر اسی استغراق اور خود بینی کا نتیجہ ہے۔ وہ اپنے رنگ میں

ڈوبے ہوئے تھے۔ اُن کو اپنے کام میں اسقدر انہماک اور توغل تھا کہ سات برس تک اپنے کمرہ کے پائیں باغ کو نظر اُٹھا کر دیکھنے کی فرصت نہ ملی۔ اس انہماک سے اتنا ضرور ہوا کہ وہ اپنے خاص کام میں یکتائے زمانہ ہو گئے۔ وہ تنوّع جو سودا کے کلام کی جان ہے میر صاحب کے یہاں مفقود ہے۔ سودا کی تصاویر نہایت رنگین اور خوشنما ہوتی ہیں۔ بخلاف میر صاحب کے جنکی دنیا مایوسیوں سے تیرہ و تار۔ جسکے پھول پژمردہ و افسردہ جسکی زمین تکلیفوں اور مصیبتوں کی قیام گاہ اور جس کا آسمان آلام و مصائب کی جائے پناہ۔ ایسے عالم میں مفر کا بس یہی طریقہ ہوتا ہے کہ یا سکوت و محویت اختیار کی جائے یا نالہ وزاری سے دل کی بھڑاس نکالی جائے یا عالم خواب کی سیر کی جائے۔ مگر وہ خواب بھی قوت متخیلہ ہی کے پیدا کئے ہوئے خواب پریشاں ہوتے ہیں۔ برخلاف اِس کے سودا کی دُنیا جیتی جاگتی دُنیا ہے جس میں بجائے تاریکی کے امید کی روشنی جلوہ گر۔ جس کے باغ سرسبز و شاداب۔ جس میں بادِ صبا خوبصورت پھولوں اور نازک پتیوں کے ساتھ ہر وقت اٹکھیلیاں کرتی پھرتی ہے۔

تشبیہیں اور استعارے ہر شاعری کے جزو اعظم مگر خصوصیت سے مشرقی شاعری کی تو وہ جان ہیں۔ اگر اُستادی کے ساتھ برتے جائیں تو شعر کے حُسن میں وہ چار چاند لگا دیتے ہیں۔ سودا وہ اُستاد ہے جو اُن کے صحیح استعمال پر قادر ہے۔ اُسکی یہاں دلچسپ تشبیہیں اور نادر استعارے میر کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہیں۔ وہ اُن مختلف علوم و فنون سے بھی

جن کو وہ شعر میں استعمال کرتا ہے بہ نسبت میر کے زیادہ واقف ہے۔
یہ بالکل صحیح ہے کہ سودا کی اکثر غزلوں میں قصیدہ کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ اسکی کم و بیش یہ وجہ ہو سکتی ہے کہ شاعر کا زبردست تخیل بعض وقت اُس کو ایسے مضامین اور الفاظ سجھاتا ہے جو غزلیت سے میل نہیں کھاتے وہ اپنی بلند پروازی اور تخیل کی تیزی کو روک نہیں سکتا۔ میر صاحب کے یہاں ایسے عیوب نہیں ہیں۔ سودا کے اس قسم کے اشعار اُن قواعد کے ضرور خلاف ہیں جو ترتیب غزل کے واسطے مقرر ہو گئے ہیں مگر اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اگر اسی قسم کے شعر علیحدہ علیحدہ دیکھے اور جانچے جائیں تو اُن کی عمدگی اور کمال میں کسی کو کیا کلام ہو سکتا ہے۔ یہ بات بھی ضرور یاد رکھنا چاہیے کہ ترتیب غزل کے قواعد سے استغنا اور بے پروائی متاخرین شعرائے فارسی کی تتبع میں ہے جن کے قدم بہ قدم اُردو شعرا چلنا چاہتے ہیں نظم فارسی کی آخری منزل ارتقا میں غزل کا محدود دائرہ بہت وسیع ہو گیا تھا اور اُس میں بہت سی چیزیں مثلاً فلسفہ، مذہب، اخلاق تصوف اور دیگر علوم و فنون وغیرہ سب شامل کر لئے گئے تھے۔ یوں سمجھنا چاہیے کہ عاشقانہ رنگ یا عشق مرتب اور منظم ہو کر سائنس کے درجہ پر پہونچ گیا تھا۔ اُردو شاعری جو فارسی کی متبع تھی اس انقلاب سے اُس نے بھی بہت کچھ فائدہ اُٹھایا۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ آخر الذکر مضامین سے بہرہ اندوزی بہ نسبت دِل کے دماغ زیادہ کرتا ہے یعنی جسقدر ان مضامین کی کثرت ہوتی ہے اُتنی ہی درد و اثر کی کمی ہو جاتی ہے۔ قصیدہ کی شان اور غزل کے رنگ میں زمین

و آسمان کا فرق ہوتا ہے اور یہ فرق ہمارے زمانہ کے نوآموز شعرا کے کلام میں جو سودا اور غالب وغیرہ ایسے استادوں کی تقلید کرنا چاہتے ہیں بخوبی نمایاں ہے۔

سودا اور میر دونوں موسیقیت الفاظ کے اُستاد ہیں اُن کے شعر سانچے میں ڈھلے ہوے۔ بندش نہایت چست۔ اور زوائد سے پاک ہوتے ہیں نشست الفاظ پر سودا کو زیادہ توجہ تھی۔ وہ ہر شعر کو اپنی جگہ پر مکمل بنانا چاہتے ہیں جو خود ایک بہت بڑا فن ہے۔ شاذ و نادر معنی میں گنجلک بھی پیدا ہوجاتی ہے۔ دونوں اُستاد دور از کار تلمیحات اور تشبیہات سے بچتے ہیں۔ اگرچہ سودا کے یہاں کبھی کبھی اِس قسم کی غلطی ہوجاتی ہے۔ دونوں اُستادان فن کے کلام کا مقابلہ ایک کارآمد اور قیمتی چیز ہے اس وجہ سے کہ دونوں ہم عصر تھے اور متحدہ اصناف سخن پر طبع آزمائی کرتے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ ہم طرح غزلیں کہی جاتی تھیں جن کا مقابلہ اس لئے بہت دلچسپ ہے کہ اُس سے دونوں کے مختلف مزاج اور طبیعت اور نیز انداز بیان کے فرق کا اندازہ بخوبی ہوسکتا ہے۔ دونوں کے کلام میں اُس عہد کے بعض نقائص بھی کہیں کہیں پائے جاتے ہیں۔ دونوں کے یہاں کبھی کبھی مبتذل اور فحش الفاظ استعمال ہوے ہیں بعض اوقات مضمون شعر میں فحش ہوتا ہے کہیں اختلاف تذکیر و تانیث اور شتر گربہ ہے اکثر اشعار معمولی بلکہ پھیکے اور بے مزہ بھی ہیں۔ میر صاحب کہیں کہیں ایہام بھی برتتے ہیں۔ امرد پرستی جو اُس زمانہ کی شاعری کا ایک قبیح موضوع ہے۔ دونوں کے کلام میں

جابجا پائی جاتی ہے۔

مختصر یہ کہ وسعت نظر، تنوع خیالات، جزئیات کے بیان کی قدرت، دنیاوی معاملات کی واقفیت، اور سب سے بڑھ کے یہ کہ مذاق اور ظرافت میں سودا کو میر پر برتری ہے۔ سادگی الفاظ، سلاست زبان، عاشقانہ رنگ، درد و اثر، فصاحت و بلاغت، اور تصوف میں میر صاحب کو سودا پر فضیلت ہے۔ کسی کا قول ہے اور سچ کہا ہے کہ دونوں کا کلام بیش بہا جواہر ہیں۔ میر صاحب کے یہاں صرف ہیرے ہیں۔ سودا کے یہاں ہیروں کے علاوہ موتی، زمرد، اور یاقوت بھی بکثرت پائے جاتے ہیں سچی کسوٹی پرکھنے والے کا مزاج اور مذاق ہے۔" [1]

اس عہد کے دیگر شعرا اس عہد میں ان دو بزرگواروں کے علاوہ اور بھی بہت سے شاعر گزرے ہیں مگر چونکہ وہ کثرت سے ہیں اور اُن کے کلام میں کوئی خصوصیت نہیں لہذا یہاں اُن کا ذکر نظر انداز کیا جاتا ہے۔ ناظرین کو اگر اُن کے کلام یا حال کے دریافت کرنے کا اشتیاق ہو تو اس عہد کے یا بعد کے تذکرے ملاحظہ کریں۔ [2]

---

[1] میر و مرزا کے کلام کے مقابلہ کے لئے دیکھو بقا کے اشعار صفحہ ۲۵۴

[2] اس عہد کے بعض شعراء کا حال مختصراً باب ۷ کے آخر میں بیان کیا گیا ہے دیکھو صفحہ ۲۴۵۔

باب ۷

اساتذۂ دہلی

طبقۂ متاخرین

انشا اور مصحفی کا زمانہ

طبقات کی ترتیب
اس دور کی ترقیاں

شعرا کے طبقات کی ترتیب کوئی فرضی چیز نہیں جیسا کہ بادی النظر میں وہ معلوم ہوتی ہے۔ گو یہ سچ ہے کہ اکثر شعرا ایک دور کے ماقبل کے دور کے بعض شعرا کے معاصر رہے ہیں مگر اس کا جواب یہ ہے کہ ایک تو یہ کہ مابعد کے دور کے شاعر دور ماقبل میں نوجوان اور نوآموز تھے اور اُس وقت اُنھوں نے کوئی شہرت نہیں حاصل کی تھی اور دور ماقبل کے شاعر کہن سال، مشاق، اور مشہور ہو چکے تھے۔ اسکے علاوہ زبان کا فرق بھی بہت کچھ قابل لحاظ ہے۔ اِس دَور میں بمقابلہ دور ماقبل کے زبان اور نیز بندش کے اعتبار سے شعر میں بہت کچھ ترقی ہوئی۔ بہت سے پرانے الفاظ اور ترکیبیں متروک ہو گئیں اور اُن کی جگہ نئے الفاظ اور جدید ترکیبوں نے لی۔ اس معاملہ میں زبان اُردو انشا کی بہت احسانمند ہے جنھوں نے اسکی ترقی اور توسیع کے لیے بہت سے نئے نئے تجارب اختیار کیے۔ مصحفی البتہ قدما کے پیرو تھے جنھوں نے نظم کی قدیم روایات کو جاری رکھا۔ جرأت بھی غزل میں میر کے پیرو تھے ۔

شاعری دربار سے وابستہ ہوگئی

اس دور کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس نے نظم اُردو کو دربار کے ساتھ وابستہ کردیا۔ دور ماقبل کے شعرا گو اپنے سرپرستوں سے انعام واکرام اور وظیفے اور تنخواہیں پاتے تھے مگر اپنی آزادی اور خودداری کو ہمیشہ قائم رکھتے رہے وہ اپنی حیثیت ایک ملازم کی کبھی نہیں سمجھتے تھے۔ اس دور میں یہ خرابی ہوئی کہ گو شعرا کی قدردانی اور سرپرستی بڑھ گئی مگر اُن کی خودداری اور عزت وآبرو کم ہوگئی۔ شاعری کا اب صرف یہ کام رہ گیا کہ اُس سے امیر ورئیس خوش کیے جائیں شاعر لوگ اپنے سرپرستوں کے چشم وابرو ہر وقت دیکھتے تھے اور چونکہ اُن کا دل خوش کرنا مقصود تھا لہٰذا اشعار بھی اُنھیں کے مزاج اور مذاق کے موافق کہے جاتے تھے۔ مختصر یہ کہ اس دور کے شعرا نقال اور مسخرے پہلے تھے اور شاعر بعد کو۔ اب شاعری حصول زر کا ایک کامیاب ذریعہ ہوگئی تھی اور شاعر اُمرا اور رؤسا کے درباروں میں پہونچنا بلکہ اپنے مالکوں کے مزاج میں درخور حاصل کرنا بس یہی اپنا فخر سمجھتے تھے اس کا ایک بڑا نتیجہ یہ ہوا کہ خود آپس ہی میں سخت رقابت اور بدمزگی شعرا میں پیدا ہوگئی۔ اس کے قبل بھی اس قسم کی بدمزگیاں ظہور میں آئی تھیں مگر وہ فن سے متعلق اور حدود شائستگی کے اندر ہوتی تھیں۔ اب چونکہ شاعری امیر رسی کا ایک ذریعہ ہوگئی تھی لہٰذا شاعر ایک دوسرے سے سخت رقابت اور عداوت برتتے تھے۔ اور اُن کے آپس کے شاعرانہ مقابلے اب تہذیب وشائستگی کی حد سے گزر کے گالی گلوج اور لپاڈگی کے درجہ تک پہونچ جاتے تھے۔ چنانچہ انشا اور مصحفی کے ہنگامے اس زمانہ کی تاریخ شاعری پر ایک نہایت بدنما دھبہ ہیں۔

اس وابستگی کے خراب نتائج

شاعری کی اس درباری وابستگی کا ایک خراب نتیجہ یہ ہوا کہ اُس کی متانت اور پاکیزگی اور علوِ خیال میں بہت فرق آگیا۔ درباری اثر سے اُسکی آیندہ ترقی کی راہیں مسدود ہو گئیں۔ خیالات میں نفاست اور پاکیزگی کم ہو گئی شعر کی روحانیت اور بلند پردازی مفقود ہو گئی۔ معشوق سے اب تک عموماً معشوق حقیقی مراد ہوتا تھا اب بجائے اسکے کوئی لونڈا یا رنڈی، جنکی ایسے عیش پرست درباروں میں کمی نہ تھی سمجھا جانے لگا۔ شہواتی جذبات بے تکلفی کے ساتھ بکثرت نظم ہونے لگے کیونکہ عیاش امرا اور اُن کے مصاحبین اسی قسم کے اشعار سے خوش ہوتے تھے اور اسی قسم کے فواحش پر انعام و اکرام دیتے تھے۔ دلی کی یہ حالت نہ تھی یہاں کے شعرا میں، گو کہ وظائف و تنخواہیں وہ بھی پاتے تھے، متانت اور سنجیدگی اور آزادی مزاج ابتک باقی تھی۔ بلکہ سچ پوچھیئے تو یہاں عموماً شاعری تصوف و عرفان کی گود میں پلی شعر گوئی ایک مقدس اور معزز مشغلہ سمجھی جاتی تھی۔ اہل اللہ کے دائروں اور خانقاہوں میں اُسکی نشو و نما ہوئی۔ شاہ گلشن، خواجہ میر درد، مرزا مظہر جانجاناں، یہ سب مشہور اہل دل بزرگ گزرے ہیں جنھوں نے شاعری کو بہت کچھ تحریک و ترقی دی۔ لکھنؤ میں برعکس اسکے شاعری کے سر پر سے روحانیت اور تصوف کا سایہ اُٹھ گیا اور اب وہ دربار سے متعلق ہو گئی۔ اب شاعر ولی ہونے کی نہیں بلکہ دربار رس ہونے کی تمنا کرتے تھے۔ یہ سچ ہے کہ کچھ ایسے لوگ جو دلی چھوڑ کر لکھنؤ آگئے تھے کچھ دنوں یہاں کی ہوا اور خراب صحبت سے بچتے رہے مگر رفتہ رفتہ طمع اور شہرت پسندی اور سب سے زیادہ اُس زمانہ کے بگڑے ہوے مذاق نے اُن کو اپنی راہ پر آخر لگا ہی لیا۔

ریختی | ایک جدید صنف شاعری، یعنی ریختی، جسکو اس انحطاط مذاق کا بدترین نمونہ سمجھنا چاہیئے اسی دور میں وجود میں آئی۔ اس کے موجد سعادت یار خاں رنگین تھے۔ جنھوں نے اپنے زمانہ کے مدرسہ تعیش میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے تمام مدارج عیاشی و آوارگی کو یکے بعد دیگرے بہ تمام و کمال طے کیا تھا۔ اُن کا کلام عورتوں کی زبان میں ہونے کی وجہ سے ظاہر ہے کہ عیاش مزاج لوگوں کو بہت دلچسپ معلوم ہوتا تھا مگر حقیقت میں سوائے فحش اور ابتذال کے اُس میں اور کچھ نہ تھا۔ انشا نے بھی بہت کچھ اُس میں حصّہ لیا۔

اِس عہد میں فن شعرگوئی کو بہت قوت حاصل ہوئی اور کثرت مزاولت سے شعرا نے من حیث الفن بڑی ترقی کی۔ اگرچہ شیریں کلامی اور بلند خیالی شعر میں کم ہوگئی مگر تکمیل فن نے اس کمی کو پورا کر دیا۔ اظہار قابلیت کی غرض سے لوگ مشکل بحروں اور سنگلاخ زمینوں میں طبع آزمائی کرتے تھے اور بجز دو ایک نہیں بلکہ صدہا اسی قسم کی غزلیں کہہ ڈالتے تھے جو اُن کے کمال کا نمونہ تو ضرور ہیں مگر وہ قدما کا درد و اثر اور صحیح جذبات کا اُن میں نام نہیں۔ اِس عہد کے شعرا نے شعر کی ظاہری درستی کی طرف جو خاص توجہ کی تھی وہی آیندہ چل کر ناسخ وغیرہ کے زمانہ میں ایک طرز خاص بن گئی۔

فنی مباحث کو چھوڑ کر شعرا نے شاعری کو حصول زر اور کسب معاش کا ایک ذریعہ قرار دے لیا تھا اور وہ مباحث اب درباری نزاعوں تک محدود ہو کر رہ گئے تھے۔ میاں مصحفی جو صاحب عالم مرزا سلیمان شکوہ کے اُستاد تھے انشا نے اُن کو اس جلیل القدر درجہ سے ہٹانا چاہا اور یہ امر ایک عظیم الشان جنگ کا

باعث ہوا جس کا تذکروں میں باتفصیل ذکر ہے۔ اُسکی ابتدا تو معمولی طریقہ سے ہوئی تھی مگر آخر کو وہ جھگڑ مچا کہ خدا کی پناہ! اُن کے مربّی اس تھکا فضیحتی کا دور سے تماشہ دیکھتے تھے اور اُن کے مہملیات کی داد دیکر جانبین کی آتش حسد و نفاق کو اور بھڑکاتے تھے۔ بالآخر شاعروں نے قلم ہاتھ سے رکھکر لاٹھی پونگے اُٹھا لیئے اور بے تکلف ایک دوسرے سے دست و گریباں بلکہ ایک دوسرے کی جان اور عزّت و آبرو کے درپے ہوگئے۔ سچ پوچھیے تو اس قسم کی لغو اور بیہودہ نظموں سے شاعری کی تہذیب و متانت میں فرق آگیا اور مصحفی اور انشا کی اس قسم کی نظمیں اب اُس زمانہ کے پُر شور رندان اور جھگڑ کا ایک نمونہ رہگئی ہیں جن کو پڑھکر ہنسی آتی ہے مگر رنج بھی ضرور ہوتا ہے۔

ہزل گویان اُردو اس موقع پر چند ہزل گویان اُردو کا بھی کچھ ذکر کردینا ضروری ہے حسب ذیل نام قابل ذکر ہیں۔ میر اٹل نارنولی۔ میر جعفر زٹل۔ زانی۔ چرکین۔ فسق میر غلام حسین برہان پوری شاگرد زانی۔ یہ منشی لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی کے ہمعصر تھے اور شفیق نے فسق کا ذکر اپنے تذکرہ چمنستان شعرا میں کیا ہے۔

انشا متوفی ۱۲۳۳ھ مطابق ۱۸۱۸ عیسوی سید انشاء اللہ خاں متخلّص بہ انشا خلف حکیم میر ماشاء اللہ خاں ان کے بزرگ نجف سے آئے تھے اور دلی میں بس گئے تھے۔ رفتہ رفتہ امراے شاہی میں داخل ہوئے۔ انشا کے والد شاہی طبیب تھے اور کچھ شعر بھی کہتے تھے اور مصدر تخلّص کرتے تھے۔ زوال سلطنت کے زمانہ میں وہ مرشد آباد گئے جو نوابان بنگالہ کا دار الحکومت تھا اور یہیں سید انشا کی

ولادت ہوئی۔ ابتدائے عمر میں علوم رسمیہ اپنے والد ہی سے حاصل کیئے شعر کہنے کا شوق ان کو بچپن سے تھا۔ کبھی کبھی والد سے اصلاح لیتے تھے۔ مگر زیادہ تر اپنی طبیعت خداداد اور فطری ذہانت سے کام لیتے تھے۔ انشا مرشدآباد چھوڑکر شاہ عالم کے زمانہ میں دلی آئے۔ شاہ عالم اب محض برائے نام بادشاہ رہ گئے تھے خود بھی شعر کہتے تھے اور شاعروں کے بڑے قدردان تھے اُنھوں نے انشا کی بڑی قدر کی۔ دربار اُسوقت بالکل لُٹا پٹا تھا۔ مگر پھر بھی اُس قدردان بادشاہ نے اس جواں ہمت اور جواں طبیعت شاعر کو نظر شفقت و عنایت سے دیکھا اور اس کو انعام واکرام سے مالا مال کیا۔ سید انشا اہل دربار میں داخل ہوئے اور اُنھوں نے بھی وہ وہ لطیفے اور چٹکلے بادشاہ اور اہل دربار کو سُنانا شروع کئے کہ پھر تو یہ عالم ہوا کہ ان کی تھوڑی دیر کی بھی جُدائی بادشاہ کو بہت ناگوار ہوتی تھی۔ آخرکار دلی کی تباہی سے بددل ہوکر اور نیز اس خیال سے کہ ان کی قابلیت کے موافق یہاں اُنکی قدر نہیں ہوتی تھی اور خاص کر مرزا عظیم بیگ کے مناقشہ کی وجہ سے انشا نے لکھنؤ کا رُخ کیا جو اس زمانہ میں دہلی سے نکلے ہوئے شعرا اور دیگر باکمالوں کا ملجا وماوا بنا ہوا تھا یہاں پہونچکر اُنھوں نے شاہزادہ مرزا سلیمان شکوہ متخلص بہ سلیمان کی ملازمت اختیار کرلی جو خود بھی صاحب دیوان اور شاعروں کے قدردان تھے۔ انشاء نے اپنی ظرافت اور بذلہ سنجیوں سے اُن کے مزاج میں بڑا رسوخ حاصل کیا اور تھوڑے عرصے بعد اُن کے قدیمی اُستاد مصحفی کی جگہ لے لی مگر اُن کی منچلی طبیعت جو ایک حال پر قائم رہنے والی نہ تھی ہمیشہ ترقی کے

نئے راستے ڈھونڈھتی تھی۔

انشا کی تقریب نواب سعادت علیخاں کے دربار میں

تفضل حسین خان علامہ[۱] جو اپنی قابلیت اور حسن تدبیر سے سرکار انگریزی کے معتمد اور نواب سعادت علیخاں کے مشیر کار تھے سید انشا اُن کی صحبت میں آیا جایا کرتے تھے خان علامہ اِن کی بڑی عزت کرتے تھے اور اس خیال میں تھے کہ کوئی مناسب حال صورت ان کے لئے نکالیں۔ اتفاق سے ایک دِن سید انشا جوشِ تقریر میں ایک ایسا لفظ بول گئے جو ذو معنیین تھا۔ اور اُردو میں اُس کے معنی قابل اظہار نہیں کہنے کو تو کہہ گئے۔ مگر خان علامہ کی نظر تاڑ کر بولے کہ زبان مارواڑی میں "بیوقوف" کو کہتے ہیں۔ اُنھوں نے کچھ سوچ کر کہا "خیر خاں صاحب انداز معلوم ہوگیا جلد کچھ صورت ہو جائیگی"۔ دوسرے دِن نواب سعادت علی خاں سے اِنکے خاندان کی بزرگی اور اِن کے ذاتی کمالات کا ذکر کرکے کہا کہ آپ کی صحبت میں اِن کا ہونا شغل صغریٰ و کبریٰ سے بہتر ہوگا۔ وہ سُن کر مشتاق ہوے۔ دوسرے دِن خاں صاحب سید انشا کو لے گئے[۲]۔ انشا نے اپنے لطیفوں اور چٹکلوں اور مذاق و ظرافت سے نواب کو ایسا پرچایا کہ اُن کو ان کی ایک دم کی جدائی بھی

---

[۱] وزیر علیخاں کی مسند نشینی اور بعد کو اُن کے اخراج اور سعادت علی خاں کی مسند نشینی انھیں کے حسن تدبیر کا نتیجہ تھی۔ خان علامہ علاوہ ایک مستند عالم فاضل اور باکمال ہونے کے اپنے زمانہ کے مشہور سیاست داں تھے۔ ان کو کئی زبانوں سے واقفیت تھی جن میں انگریزی اور لاطینی بھی شامل ہیں۔ سر آئزک نیوٹن کے ڈفرنشل کلکیولس کا ترجمہ انھوں نے فارسی میں کیا ہے۔

[۲] ماخوذ از آبحیات ۱۲

ناگوار تھی۔ اُن کی حاضر جوابیاں، اُن کے پر مذاق لطیفے، اُن کی ظرافتیں نواب کو
ایسی اچھی معلوم ہوتی تھیں کہ وہ اُن کو ایک دم بھی اپنے سے جدا رکھنا پسند نہ کرتے
تھے مگر افسوس ہے کہ آخر میں رنگ میں بھنگ اور ہنسی ہنسی میں مخالفت پیدا
ہو گئی۔ انشا اپنے مذاق اور دلگی کی باتوں میں بعض وقت حد سے گذر جاتے تھے
اور جو منھ میں آتا تھا کہہ جاتے تھے، ایسی باتیں اکثر موقعوں پر تو نواب کو موجب
تفریح ہوتی تھیں مگر بعض دفعہ مکدر ہو جاتے تھے اور ناک بھوں چڑھاتے تھے
نواب کے مزاج کا پارۂ حرارت ناپنے کے واسطے سید انشا بسا اوقات اچھے
بیرامٹر نہیں ثابت ہوتے تھے۔ مزاج میں بھی اختلاف تھا انشا کی آزاد طبیعت
یہ ہرگز گوارا نہیں کر سکتی تھی کہ موقع و بے موقع اور جا و بیجا نواب ہی کا کہنا مانا جائے
اور اُن کی ہاں میں ہاں ملائی جائے۔ چنانچہ ایک روز یہ واقعہ ہوا کہ دربار میں
شرفاے خاندانی کی شرافت و نجابت کا ذکر ہو رہا تھا نواب نے کہا "کیوں بھئی
ہم بھی نجیب الطرفین ہیں؟" انشا محض مذاق سے اور بغیر سمجھے بوجھے بول اُٹھے
"بلکہ انجب" (انجب عربی میں لونڈی بچہ کو کہتے ہیں) سعادت علی خاں
فی الحقیقت حرم سے تھے۔ اِس بے ہنگام لفظ پر سارے دربار میں سناٹا
چھا گیا مگر کمان سے نکلا ہوا تیر کیونکر واپس کیا جا سکتا ہے۔ نواب کے دل
کی کھٹک کبھی نہیں نکلی اور اب اس فکر میں رہنے لگے کہ کوئی موقع پائیں تو
انشا کو زک دیں۔ انشا کی بات بات کی گرفت ہونے لگی اور سخت سزائیں اور
تکلیفیں اُن کے واسطے تجویز کی جانے لگیں۔ حکم ہو گیا کہ سواے ہمارے
کسی امیر کے یہاں ہرگز نہ جاؤ۔ یہ نظر بندی اُن کے واسطے قید بے زنجیر تھی

اس پر طرّہ یہ ہوا کہ جوان لڑکا تعالیٰ اللہ خاں مر گیا جس سے اُن کی کمر ٹوٹ گئی۔ آخر میں ایک جنونی کیفیت بھی پیدا ہو گئی تھی جس کی ایک عبرتناک کیفیت میاں رنگین کی زبانی آبحیات میں بیان کیگئی ہے[1]۔ اسی اثنا میں تنخواہ بھی بند ہو گئی تھی جس سے فاقہ کی نوبت پہونچ گئی تھی۔ وہ شخص جو کبھی چہکتا ہوا بلبل بادشاہ کی ناک کا بال اور اپنے دوستوں کی آنکھوں کا نور اور دل کا سرور تھا بالآخر اسی خراب صحت اور فقر و فاقہ کی حالت میں اس دار فانی سے چل بسا۔ یہ واقعہ ۱۲۳۳ھ کا ہے جیسا کہ بسنت سنگھ نشاط کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے

خبر انتقال میر انشا ۔۔۔ دل غمدیدہ تا نشاط شنفت
سال تاریخ او ز جانِ اجل ۔۔۔ "عرفی وقت بود انشا" گفت

اُن کے کلام کی خصوصیات انشا کو زبان پر بڑی قدرت حاصل تھی۔ انھوں نے توسیع زبان کا کام جو مرزا رفیع سودا نے شروع کیا تھا جاری رکھا۔ انشا پہلے ہندوستانی شخص ہیں جنھوں نے زبان اُردو کی صرف و نحو مدون کی اور جس تحقیق و تلاش اور محنت سے اپنی مشہور کتاب دریائے لطافت مرتب کی اُس سے اُن کا

---

[1] آزاد نے انشا کے متعلق خصوصاً اُن کے مجنون ہو جانے اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے کی بہت سی روایتیں بیان کی ہیں جو پایۂ تحقیق کو نہیں پہونچتیں اور بہت سی روایتیں مستند طور پر غلط قرار پائی ہیں۔ حیات دبیر کے مصنف نے مرزا اوج کی زبانی لکھا ہے جو میر انشاء اللہ خاں کے نواسے تھے، کہ سید انشا نہ مجنون ہوے اور نہ انکی تنخواہ بند ہوئی۔ صرف اتنا صحیح ہے کہ نواب سعادت علیخاں نے حکم دیدیا تھا کہ وہ سوا دربار کے اور کہیں نہ آئیں جائیں اور دربار میں بھی بغیر بلائے حاضر نہوں معلوم ہوتا ہے کہ جس زمانہ میں انشا و مصحفی میں جھگڑا ہوا اور ہجو تک نوبت پہونچی تو نواب وزیر نے انشا کو لکھنؤ سے چلے جانیکا حکم دیدیا تھا۔ وہ حیدرآباد گئے چند دنوں کے بعد نواب وزیر نے پھر بلا لیا (تذکرہ خازن الشعرا)

پایۂ اُستادی بلند ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اُن کے کلام میں ہمواری اور استقامت نہیں ہے مگر اُن کا اچھا کلام یقیناً بہت قابل قدر بلکہ قابل استناد ہے۔ اُن کے مختلف اصناف سخن سے پایا جاتا ہے کہ وہ زبان کو وسعت دینے کی غرض سے بہت سے تجربے کرنا چاہتے تھے۔ اگر وہ اپنی طبیعت اور زبان پر قابو رکھتے تو یقیناً وہ زبان اُردو کے بڑے پایہ کے اُستاد سمجھے جاتے۔ انشاء کی خاص خصوصیات یہ ہیں (۱) ظرافت۔ مذاق اور ظرافت میں انکا ہم پلہ شعرائے اُردو میں سوائے سودا کے اور کوئی نہیں ہوا۔ انکی روزمرہ کی گفتگو اور کلام نظم و نثر دونوں مذاق اور ظرافت سے بھرے ہوئے ہیں (۲) جامعیت اِن کی طبیعت ایسی تھی جیسے ایک ترشا ہوا نگینہ جسکے مختلف پہل ہوتے ہیں۔ ان میں خاص صفت یہ تھی کہ ہر قسم کے مضامین کو اپنے رنگ میں ڈھال لیتے تھے۔ (۳) علم و فضل معلوم ہوتا ہے کہ مشکل مشکل مضامین علمیہ اپنے دماغ کے چھپے ہوئے گوشوں سے ایک لمحہ میں حاضر کر سکتے تھے اور اپنے دعوے کے ثبوت میں کوئی ایسا پر لطف قصہ یا دلیل یا شعر یا کوئی دوسری سند اس خوبی سے پیش کرتے کہ حریف اُس کو فوراً تسلیم کر لیتا (۴) نہایت ذہین اور طبّاع تھے۔ اور ان کی قوت تخیل بجلی سے تیز تھی (۵) فارسی اور عربی کے فاضل زبردست تھے۔ اور ان دونوں زبانوں میں اُن کے اشعار کا بہترین نمونہ موجود ہے۔ اِن کے علاوہ ترکی۔ پشتو۔ پوربی۔ پنجابی۔ مارواڑی۔ مرہٹی۔ کشمیری۔ اور ہندی بھی خوب جانتے تھے اور ان سب میں شعر کہہ سکتے تھے۔ غرضکہ ایک بہت زبردست اور قابل زباندان تھے۔ تضمین بھی خوب کرتے تھے۔ نہایت

تیز و طرار طبیعت پائی تھی۔ اور مشکل اور نئی نئی چیزوں میں اُن کو بڑا لطف آتا تھا۔ ایک مختصر دیوان صنعت غیر منقوطہ میں لکھا ہے بعض نظموں میں دوسری صنعتیں بھی دکھائی ہیں مثلاً واسع الشفتین یا ذولسانین وغیرہ۔ ان کو اُردو کا امیر خسرو کہنا بجا ہے ان کو مشکل بحریں اور مشکل زمینیں بہت پسند تھیں اور اس میں اپنی زباں دانی کی قوت دکھائی ہے۔ ان کے بعض قوافی بھی بہت غیر معمولی اور نشوار ہوتے ہیں اور گو کہ بہت ہوشیاری سے نظم کیے ہیں مگر پھر بھی کانوں کو بُرے معلوم ہوتے ہیں کیونکہ غزل کے واسطے وہ موزوں نہیں ہیں ظرافت اور مذاق جو ان کا خاصہ ہے بعض اوقات اُسکی اتنی کثرت ہو جاتی ہے کہ مہذب طبیعتوں پر گراں گزرتا ہے اور شعر میں ندرت اور خوبصورتی پیدا کرنے کے بجائے اُس کو مہمل اور بھونڈا کر دیتا ہے۔ ظرافت کی کثرت شاید اس وجہ سے کیگئی ہو کہ اُس زمانہ کے لوگوں کو جن کا مذاق بہت گر گیا تھا یہ رنگ بہت اچھا معلوم ہوتا تھا۔ اسی وجہ سے اُن کا مذاق لطافت اور تہذیب سے خالی ہے اور اسی تعلق سے اس عہد میں ریختی کی بنا پڑی جس کا موجد اور مخترع انشاء اور رنگین کو سمجھنا چاہیئے۔ انشا کی بے ہنگام ظرافت نے تصوف ایسی مقدس اور پاک چیز کو نہ چھوڑا۔ چنانچہ اگر کسی کو تصوف اور مذاق کا بے جوڑ میل دیکھنا منظور ہو تو وہ اُن کی مثنوی شیر برنج دیکھ لے۔

انشا کی خاص صفتیں یہ ہیں۔ زبان پر قدرت۔ ہمہ گیر طبیعت۔ ہر صنف شاعری میں مہارت۔ اعلیٰ قابلیت۔ قوت ایجاد و اختراع۔ وطن کی روایات قدیمہ سے محبّت اور مذاق و ظرافت۔ انشا نے سودا کی طرح مگر اُن سے کسی قدر

محدود درجہ پر ہندوستان کی تخئیل اور تلمیح سے اپنی غزلوں میں بہت کام لیا ہے
ان کا بڑا عیب یہ ہے کہ انھیں تناسب کا صحیح اندازہ نہیں ہے اور اسی وجہ سے
وہ صائب رائے قائم کرنے میں غلطی کر جاتے ہیں۔ اُن کے کلام میں ہمواری نہیں ہے
غزلوں میں خیالات کی قلت اور الفاظ کی کثرت پائی جاتی ہے جسکی وجہ شاید اُنکی
مشکل زمینیں اور قوافی ہوں قصیدہ اور غزلگوئی میں وہ معمولی قواعد شعر سے بے پروائی
برتتے ہیں۔ اظہار ظرافت پر بھی قابو نہیں رکھتے۔ نواب اور اُن کے عیش پرست
درباریوں کے خوش کرنے کے لیئے کبھی کبھی فحش سے بھی اپنی زبان خراب کرتے ہیں
یہ عیب ان کا خاص نہیں بلکہ اُس زمانہ کا عیب ہے۔ یہی حال عہد رسٹوریشن کے
انگریزی شعرا کا تھا جن کا کلام اُس زمانہ کی خراب سوسائٹی کا آئینہ ہے۔ انشا نے
شعر کو اپنے نواب کے خوشی کے ماتحت کر دیا تھا وہ شعر کے بلند درجہ پر کبھی فائز نہیں
ہوے۔ شاعری اُن کے واسطے حصول غرض کا ایک ذریعہ تھی۔ اُن کا کوئی اعلیٰ
مطمح نظر نہ تھا اور نہ کوئی پیغام اُن کو پہونچانا تھا۔ درباری شاعر بن کر اُن کو معقول
سزا ملی۔ جب کہ ان کے مسخرے پن کی باتوں اور ہزل و ہجو پر انعام و اکرام ملتے
تھے اور اُن کی قدر ہوتی تھی تو پھر اعلیٰ شاعری کی کوئی وجہ بھی نہ تھی۔ وہ ایسے
زبردست طبیعت کے پاک باطن بھی نہ تھے کہ اپنے زمانہ کے رنگ اور گرد و پیش کے
حالات سے متاثر نہ ہوتے۔ بہرطور جو کچھ لکھا ہے وہ سب بیکار اور خراب بھی نہیں
ہے۔ اُن کے کلام میں جا بجا نہایت بیش بہا جواہر بھی ملیں گے جو مرتبہ میں
کسی سے کم نہیں۔ ان کا قصیدہ جو جارج سوم کی تعریف میں ہے وہ نہایت
اعلیٰ درجہ کا ہے۔ سید انشا اور اُنکی شاعری کے متعلق میاں بیتاب کا چبھتا ہوا جملہ

یاد رکھنے کے قابل ہے اور وہ یہ ہے کہ انشاء کے علم و فضل کو اُنکی شاعری نے کھویا اور اُنکی شاعری کو نواب سعادت علی خاں کی دربارداری نے ڈبویا۔ اگر کسی کو انشا کے مفصل حالات دلچسپ لطیفوں اور چٹکلوں کے ساتھ دیکھنا منظور ہوں تو وہ آبحیات میں اُن کا حال پڑھے۔

تصانیف

ان کی تصانیف حسب ذیل ہیں :-

کلیات جس میں مندرجۂ ذیل چیزیں شامل ہیں :-

(۱) ایک دیوان اُردو غزلوں کا جس سے زبان پر اُن کی پوری قدرت معلوم ہوتی ہے مگر ہمواری نہیں ہے۔ فصیح الفاظ، عمدہ محاوروں، چُست ترکیبوں کے ساتھ یہ عیب بھی ہے کہ کہیں کہیں قواعد شعر کی خلاف ورزی ہو گئی ہے۔ بعض اشعار فی الواقع بہت اعلیٰ درجہ کے ہیں۔ اور نظم اُردو کے بہترین نمونے کہے جا سکتے ہیں۔

(۲) دیوان ریختی جس کے آخر میں کچھ مستزاد اور پہیلیاں اور طلسمات بھی ہیں۔

(۳) قصائد اُردو و فارسی۔ جو حمد و نعت اور منقبت ائمۂ معصومین اور مختلف اشخاص کی تعریفوں میں ہیں۔ ان میں زبان پر قدرت اور الفاظ کی شان و شکوہ بہت پائی جاتی ہے مگر قواعد کا خیال کم کیا گیا ہے بعض جگہ مذاق اور ظرافت کے ساتھ نازکخیالی بھی خوب ہے اور عربی فارسی ترکی اور دیگر زبانوں کے شعر بھی شامل کئے گئے ہیں کہیں کہیں اُن کو پڑھکر ہنسی آتی ہے جو قصیدہ کی شان کے خلاف ہے۔

(۴) دیوان فارسی کا بھی یہی حال ہے گو زبان کا زور اور لطف بہت کچھ ہے مگر اکثر جگہ صرف مسخرا پن ہے اور کچھ نہیں۔ اگر اپنے رفیق طبعی یعنی تمسخر کو چھوڑ کر تھوڑی دیر کے لئے ضبط سے کام لیتے تو اُن کا پایۂ شاعری بہت بلند ہوتا۔

(۵) ایک فارسی مثنوی موسوم بہ شیر و برنج جو مولانا روم کی مشہور مثنوی کی بحر میں اور اُسی طرز پر لکھی گئی ہے اور جسمیں مسائل روحانیت و تصوف کو مذاق کے پیرایہ میں بیان کیا ہے مولانا آزاد نے خوب لکھا ہے۔ کہ کھیر (شیر برنج) میں نمک ڈالکر تصوّف کو تمسخر کر دیا ہے۔

(۶) ایک مثنوی بے نقط جسکی سُرخیاں بھی بے نقط ہیں مثلاً "حمد" کے موقع پر لکھتے ہیں کہ "لوحہ در حمد مالک الملک" "نعت" کے واسطے "لوحہ در مدحِ سرورِ کل" "منقبت" کے واسطے "لوحہ مدحِ سوار دلدل" "بادشاہ کی تعریف کے لئے" "لوحہ در مدحِ حاکم عصر" وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب سرخیاں بھی موزوں ہیں۔ اس سے ہم دو بے نقط شعر نقل کرتے ہیں جس سے نمونۂ کلام کے علاوہ تاریخ تصنیف بھی معلوم ہو جاتی ہے۔

لوحِ سالِ کلامِ مسطور

دُر در سلکِ کلام کردم　　گردِ کرم الٰہ گردم
کردم سال ورا محرّر　　طور الاسرار و سطر گوہر
۱۲　۱۴

(۷) مثنوی شکار نامہ جو نواب سعادت علی خاں کے حکم سے اُن کے شکار دھرہرہ کے بیان میں بقید تاریخ بطور روزنامچہ کے لکھی گئی تھی اسکی نظم بہت دلچسپ اور ترکیبیں بہت چست ہیں تاریخ کے یہ دو اشعار بطور نمونہ دیے جاتے ہیں۔

قطعہ در تاریخ

فوجِ ظفر موج بایں عز و جاہ — گرد رسانید چو بر اوج ماہ
شوکتش آنشا بخطِ زر نوشت — فقرۂ تاریخ مظفر نوشت

(۸) ہجویں۔ گرمی۔ بھڑوں۔ کھٹملوں۔ مکھیوں۔ مچھروں وغیرہ کی شکایت میں اور متفرق اشخاص کی ہجویں منجملہ جن کے میاں مصحفی کی ہجو جو بحر طویل میں ہے بہت دلچسپ ہے۔

(۹) مثنوی موسوم بہ شکایت زمانہ

(۱۰) چند مثنویاں جو عاشقانہ رنگ میں ہیں۔ اور ایک میں ایک ہاتھی اور چنچل پیاری ہتھنی کی شادی کا دلچسپ افسانہ ہے

(۱۱) ایک مثنوی بزبان مارواڑی جس میں گیان چند ساہوکار کی ہجو ہے ایک دوسری مثنوی موسوم بہ مرغ نامہ جسمیں مرغبازی کے قواعد مذاق اور تمسخر کے ساتھ بیان کیے ہیں۔

(۱۲) مأتہ عامل عربی بزبان فارسی

(۱۳) متفرق اشعار معمے، رباعیاں قطعے، تاریخیں، پہیلیاں چیستانیں وغیرہ

(۱۴) دیوان بے نقط

کہانی ٹھیٹ ہندی میں | اس مضمون کے نام سے ایک کتاب نثر اُردو میں لکھی ہے جسمیں ایک لفظ بھی عربی و فارسی کا نہیں آنے دیا اور نہ کوئی لفظ سنسکرت یا ٹھیٹھ ہندی بھاشا کا ہے اور باوجود اس کے زبان نہایت سلیس اور بامحاورہ اُردو ہے مقدار میں تقریباً ۵۰ صفحے ہونگے۔ اس کے اکثر حصے اُن کتابوں میں نکل چکے ہیں جو فورٹ ولیم کالج کلکتہ کی طرف سے شائع ہوئی تھیں۔ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال نے عرصہ ہوا اسکو کئی جلدوں میں شائع کیا تھا۔ قصہ کا خلاصہ یہ ہے۔

ایک راجہ تھا جس کا نام سورج بھان تھا اور اسکی رانی کا نام لچھمی باس تھا۔ اُن کے ایک لڑکا تھا جو اودے بھان کے نام سے مشہور تھا اور وہی اس قصہ کا ہیرو ہے۔ ایک دن وہ بغرض سیر و شکار جنگل کی طرف نکل گیا۔ ایک ہرنی کے پیچھے گھوڑا اڑا ڈالا رات ہوگئی اور راستہ بھول گیا۔ ایک باغ میں اُس نے چند خوبصورت لڑکیوں کو جھولا جھولتے دیکھا جن میں راجہ جگ پرکاش درانی کام لتا کی خوبصورت لڑکی رانی کیتکی بھی تھی۔ دونوں ایک دوسرے پر عاشق ہوگئے۔ مدن بان رانی کیتکی کی سہیلی اور ہمراز تھی۔ اُس کے کہنے سے اِن دونوں نے اپنی اپنی انگوٹھی ایک دوسرے سے بدل لی۔ کنور اودے بھان واپس آیا تو اُسکی حالت کیتکی کے عشق میں خراب ہوگئی۔ آخرش یہ راز اودے بھان کے باپ پر ظاہر ہوا تو اُس نے

۱؎۔ ان مطبوعہ کتابوں کے علاوہ دو کتابیں قلمی ابھی دستیاب ہوئی ہیں۔ جن کو سید انشا نے نواب سعادت علی خاں کے حکم سے اُن کی دلچسپی کے واسطے لکھا تھا۔ ایک کا نام لطائف السعادت اور دوسری کا نام بحر السعادت ہے آخر الذکر کا دریائے لطافت سے بھی کچھ تعلق معلوم ہوتا ہے ممکن ہے کہ اُس کا نقش اول ہو۔

شادی کا پیام راجہ جگ پرکاش کو بھیجا جسے اُس نے بڑی حقارت سے رد کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں راجاؤں میں جنگ چھڑ گئی۔ لڑائی کے دوران میں کنور اودے بھان نے ایک مالن پھول کلی کے ہاتھ ایک رقعہ رانی کیتکی کے پاس بھیجا اور خفیہ بھاگ چلنے کے لیے اصرار کیا۔ رانی کیتکی کی غیرت نے اسکو قبول نہ کیا۔ جگ پرکاش نے دیکھا کہ فتح نصیب نہیں ہوتی تو اُس نے اپنے گرو مہندر گر کو جو کیلاس پربت (کوہ ہمالیہ) پر رہتا تھا اپنی کمک پر بُلایا۔ اُس نے اپنے علم کے زور سے سورج بھان کو شکست دی اور کنور اودے بھان اور سورج بھان اور مہارانی لچھمی باس ہرن دہرنی بن گئے اور کئی برس تک یوں ہی رہے۔ چلتے وقت گرو نے راجہ جگ پرکاش اور اُسکی رانی کو ایک شیر کی کھال اور بھبوت دی اور یہ ہدایت کی کہ اگر میری ضرورت ہو تو کھال میں سے ایک بال نکال کر جلا دینا میں فوراً پہونچ جاؤں گا اور بھبوت اس لیے ہے کہ جو کوئی چاہے اُسکا انجن لگائے وہ سب کو دیکھے اور اُسے کوئی نہ دیکھے۔ رانی کیتکی کو اپنے عاشق کی جدائی شاق تھی اور وہ نہایت پریشان و مضطرب تھی ایک روز جالا کی سے آنکھ مچولی کھیلنے کے بہانے اُسنے بھبوت مانگا اور اُسکو لگا کر اسکو نکل گئی۔ اُسکی سہیلی مدن بان کو جب یہ معلوم ہوا تو وہ بھی کیتکی کی تلاش میں بھبوت لگا کر نکلی۔ ایک عرصہ بعد دونوں کی ملاقات ہوئی۔ مدن بان واپس آگئی اور رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی محبت کا راز راجہ جگ پرکاش و رانی کام لتا پر ظاہر ہو گیا جب یہ معلوم ہوا تو اُس نے کھال کے بال سے مہندر گرو کو بُلایا اور کل حالات بیان کیے

رانی کیتکی اور اُس کے ماں باپ اپنے ملک کو چلے گئے اور مہندر گرو نے تلاش کرکے کنور اودے بھان اور اُسکے ماں اور باپ کو انکی اصلی صورت میں کردیا راجہ اندر نے بھی اس کام میں اُسکی مدد کی تھی اور آخرش رانی کیتکی کی شادی بڑی شان و شوکت و تزک و احتشام سے کنور اودے بھان کے ساتھ ہو گئی۔

نمونہ کلام یہ ہے: " اب اس کہانی کا کہنے والا یہاں آپ کو جتاتا ہے۔ اور جیسا کچھ اُسے لوگ پکارتے ہیں کہہ سناتا ہے اپنا ہاتھ منھ پر پھیر کر مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوں اور آپ کو جتاتا ہوں جو میرے داتا نے چاہا تو وہ تاؤ بھاؤ راؤ چاؤ اور کود پھاند اور لپٹ جھپٹ دکھاؤں کہ آپ کے دھیان کا گھوڑا جو بجلی سے بھی بہت چنچل اچپلاہٹ میں ہے دیکھتے ہی ہرن کے روپ اپنی چوکڑی بھول جائے " چوبکا

گھوڑے پر اپنے چڑھ کے آتا ہوں میں | کرتب جو جو ہیں سب دکھاتا ہوں میں
اُس چاہنے والے نے جو چاہا تو ابھی | کہتا جو کچھ ہوں کر دکھاتا ہوں میں

دریائے لطافت — پہلی کتاب قواعد اُردو کی ہے جو ہمارے اہل زبان نے اُردو کے متعلق لکھی ہے۔ اس کا سنہ تصنیف ۱۲۲۲ھ مطابق ۱۸۰۷ء ہے۔ اسکی تصنیف میں مرزا قتیل بھی شریک تھے۔ انشا نے اس کا پہلا حصہ لکھا جسمیں زبان اُردو کی صرف و نحو کا حال ہے اس میں اول اُردو بولنے والوں کی مختلف زبانوں کے نمونے دکھائے ہیں اور پھر قواعد بیان کیے ہیں۔ طرز تحریر میں وہی ظرافت اور تمسخر ہے جو اُن کے دم کے ساتھ ہے۔ دوسرا حصہ مرزا قتیل کی تصنیف ہے۔ اسمیں عروض و قافیہ

منطق، معانی، بیان وغیرہ کا ذکر ہے۔ مرزا قتیل نے بھی اپنے دوست کی پیروی میں مذاق اور ظرافت کو ہاتھ سے نہیں دیا۔ مگر پھر بھی حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ ہے لُطف سے خالی نہیں مثلاً تقطیع میں بجائے مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن کے پری خانم۔ پری خانم۔ پری خانم پری خانم لکھا ہے اور مفعول مفاعیلن مفعول مفاعیلن کی جگہ بیجان پری خانم۔ بیجان پری خانم۔ درج ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ دوسرا حصہ اتنا دلچسپ نہیں جتنا پہلا ہے۔ سید انشا، پہلے شخص ہیں جنھوں نے زبان اُردو کی اہمیت اور اس کے قواعد مرتب کرنے کی ضرورت کو محسوس کیا تھا۔ اُنھوں نے صحیح محاورات لفظوں کی اصل، اور تلفظ کی تحقیق و تلاش میں اپنا بہت سا وقت عزیز صرف کیا اور بیگماتی اور محلات کی جو زبان لکھی ہے وہ بھی ہمارے واسطے دلچسپی سے خالی نہیں۔ اُنھوں نے بڑی محنت اور قابلیت سے اُس اثر کا بھی ذکر کیا ہے جو مختلف قومیں اور جماعتیں مشترکہ زبان اُردو کی ترقی پر ڈالتی ہیں۔ قواعد کو نہایت صفائی کے ساتھ اور مکمل طریقہ پر بیان کیا ہے۔ اُردو کے حروف تہجی اور اُنکی آوازوں کو نظر تعمق سے دیکھا ہے ان کی رائے میں مجموعی آوازونکی تعداد ۸۵ ہے۔ زبان کے مختلف شعبوں مثلاً پوربی، مارواڑی وغیرہ کے نمونے دیے ہیں اور دکھایا ہے کہ اِن کا اثر اُردو پر کس طرح پڑتا ہے۔ یہ کتاب اس وجہ سے بھی دلچسپ ہے کہ اُسمیں بہت سے متروکات دیکر اُن کی جگہ مروجہ الفاظ کو بیان کیا ہے۔ پوری کتاب کا طرز تحریر مذاق و ظرافت سے بھرا ہوا ہے مگر باوصف اس کے وہ قدیم اُردو گرامر کی حیثیت سے نہایت قیمتی چیز ہے۔

غرض کل تصنیفات کی حالت مجموعی دیکھکر معلوم ہوتا ہے کہ انشا من حیث الادیب اور نیز من حیث الشاعر بہت بلند پایہ رکھتے تھے۔ اُن کی تصانیف میں اتنا تنوع ہے کہ کسی دوسرے شاعر کے یہاں نہیں۔ تصرف اور ایجادوں کے حاکم علی الاطلاق اور ظرافت و لطافت میں طاق و مشاق تھے چنانچہ اُن کا ایک قطعہ خمخانۂ جاوید جلد اول سے نقل کر کے بطور نمونہ ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے۔ فائق تخلّص ایک شاعر تھا جس نے اُن کی ہجو کہی اور خود لاکر سُنائی تھی۔ اُنھوں نے بہت تعریف کی اور پانچ روپئے دیے اور یہ قطعہ بھی کہکر روپیوں کے ساتھ ساتھ اُس کے حوالہ کیا۔

فائقِ بے حیا چو ہجوم گفت | دل من سوخت سوختہ بہ
صلہ اش پنج روپیہ دادم | دہنِ سگ بہ لقمہ دوختہ بہ

اس شاعر نے لفظ یہ کو مشدد باندھا تھا انشائے اُس کے جواب میں بطور تعریض کے جو قطعہ لکھا ہے درج ذیل ہے۔

چہ خوش گفت فائق شاعرِ غرّا | کہ چوں ذہن او ذہن رسا نباشد
یکے شعر نادر کہ در چند وزن | شود خواندہ و شک بمعنا نباشد
دراں لفظ یہ را بدال مشدّد | نوشت است و ایں غلط اصلا نباشد
شنید ایں سخن را چو گرد سخن | ز انشا کہ ہمسرش اصلا نباشد
بگفتا کہ من شاعرِ خوش فکرم | چو من ہیچ معقّل گویا نباشد
تو گلستاں را ندانی درست | ترا ہیچ شعور و ذکا نباشد
سند یاد از اُستاد است ما را | بکلام ما ہیچ خطا نباشد

چو تشدید در شعر ضرّورت افتد　　تشدّید صحّیح چپرّا نباشد

جرأت (متوفی ۱۲۲۵ھ)

جرأت تخلّص۔ مشہور نام شیخ قلندر بخش۔ اصلی نام یحییٰ امان تھا۔ ان کے والد کا نام حافظ امان ہے اور سلسلۂ خاندان رائے امان سے ملتا ہے جو محمّد شاہ بادشاہ دہلی کے زمانہ میں دربار شاہی میں خدمت دربانی پر مامور تھے۔ دلّی میں کوچۂ رائے مان[1] انھیں کی طرف منسوب ہے اور یہ نادر شاہی حملۂ دہلی ۱۱۳۹ھ میں مارے گئے۔ جرأت کا زمانۂ بچپن فیض آباد میں گذرا جیسا کہ میر حسن کے تذکرہ سے معلوم ہوتا ہے۔ وطن سے بہت کمسنی میں نکلے تھے۔ شروع میں نواب محبت خاں پسر حافظ رحمت خاں کی رفاقت کی چنانچہ خود کہتے ہیں

بسکہ گلچیں تھے سدا عشق کے ہم بستاں سے
ہوے نوکر بھی تو نواب محبت خاں سے

اس کے بعد ۱۲۱۵ھ میں صاحب عالم و عالمیان مرزا سلیمان شکوہ کے حاشیہ نشینوں میں داخل ہوے اور آخر تک لکھنؤ ہی میں رہے اور وہیں وفات پائی۔ ناسخ اور نساخ دونوں نے وفات کی تاریخیں کہی ہیں۔ ناسخ کی تاریخ یہ ہے ؎

جب میاں جرأت کا باغِ دہر سے　　گلشنِ فردوس کو جانا ہوا
مصرعِ تاریخ ناسخ نے کہا　　ہاے ہندُستان[2] کا شاعر مُوا ۱۲۲۵ھ

جرأت مرزا جعفر علی حسرت کے شاگرد تھے۔ علاوہ فن شاعری کے

---

[1] گلی کے سرے پر جو بورڈ لگا ہے اُس پر "کوچۂ رحمٰن" لکھا ہے ۱۲

[2] ہندستان بغیر واو کے پڑھنا چاہیئے ۱۲

نجوم میں ماہر اور فن موسیقی کا بھی شوق رکھتے تھے اور ستار خوب بجاتے تھے[1]۔ افسوس ہے جوانی ہی میں آنکھوں کی بینائی جاتی رہی۔ بعض کہتے ہیں یہ حادثہ چیچک سے ہوا، بعض کچھ دوسری وجہ بتاتے ہیں۔ مولانا آزاد نے آب حیات میں اسکو بہت طول دیکر لکھا ہے مختصر یہ ہے کہ ہمارا نوجوان عاشق مزاج شاعر جنس نازک کی پرلطف صحبتوں کا بہت دلدادہ تھا۔ مگر پردے کے سبب سے شرفا اور اُمرا کے گھروں میں گھسنے نہیں پاتا تھا۔ ایک مرتبہ آشوب چشم کے بعد مشہور کر دیا کہ میری آنکھوں کی بینائی جاتی رہی اور مجھ کو اب کچھ نہیں سوجھتا اس بہانے سے رئیسوں اور امیروں کے گھروں میں اندھا بن کے جانے لگا اور خوبصورت عورتوں کو چھپکے چھپکے تاکنے لگا۔ آخر کار اپنی اس بدکاری کی پاداش میں سچ مچ اندھا ہو گیا۔

جرأت زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے زبان عربی اور معمولی علوم و فنون سے ناواقف تھے مگر طبیعت بلا کی پائی تھی۔ شعر کا شوق اُن کو خلقی تھا، کبھی فکر شعر سے غافل نہیں رہتے تھے۔ میر حسن اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں "دیوانۂ فن شعر است کہ گاہے بیفکر نمی ماند۔ بسیار درد مند و گداز ہست"

تصانیف ایک دیوان اور دو مثنویاں یادگار چھوڑی ہیں، دیوان میں غزلیں، فردیات، رباعیاں، مخمس، مسدس، ہفت بند، ترجیع بند، واسوخت،

---

[1] مرزا علی لطف اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں "علم موسیقی میں مشغلہ بھلا چنگا رکھتا ہے اور ستار کے بجانے میں نہایت دست رسا رکھتا ہے۔ نجوم میں بھی اس شخص کو دخل تمام ہے ایسا کہ ایک عالم لکھنؤ کا اس کا منتظر احکام ہے"۱۲

تاریخیں، ہجو، سلام، مرثیے، سب کچھ ہیں۔ ایک فالنامہ بھی ہے۔ دو مرثیوں کے آخر میں جو تاریخیں دی ہوئی ہیں اُن سے ۱۱۹۱ھ اور ۱۱۹۲ھ نکلتے ہیں۔ مثنویوں میں ایک ۱۲ صفحات اور دوسری ۳۲ صفحات کی ہے۔ ایک میں برسات کی ہجو اور سن تصنیف ۱۱۹۵ھ ہے۔ دوسری مثنوی کا سن تالیف ایک تاریخ سے ۱۲۲۵ھ معلوم ہوتا ہے۔ اُس کا نام "حسن و عشق" اور اُس میں ایک بزرگ خواجہ حسن نام اور لکھنؤ کی ایک حسین رنڈی بخشی کے عشق کا ذکر ہے۔ اُس کی زبان نہایت فصیح و پر لطف اور کلام نہایت نمکین و بامزہ ہے۔

جرأت کی خصوصیات اور اُن کا مقابلہ میر کے ساتھ

جرأت نے قصیدہ یا کسی دوسری مشکل اور متین صنف نظم کو اختیار نہیں کیا فارسی میں بھی کچھ نہیں کہا جیسا کہ اُس زمانہ کے ذی استعداد شعرا کا دستور تھا۔ وہ علی الخصوص ایسی محفل کے شاعر تھے جہاں شراب ناب کے دور چلتے ہوں اور حسن و عشق کے چرچے ہوتے ہوں۔ عاشقانہ رنگ، بلکہ اس میں بھی معاملہ بندی، ان کا خاص رنگ ہے اور اُس میں ان کو درجۂ کمال حاصل ہے۔ یہی معاملہ بندی بعض وقت زیادہ تفصیل کے بعد فحش کی سرحد سے مل جاتی ہے اور ان کے اشعار کو مہذب صحبتوں کے لائق نہیں رکھتی۔ باعتبار رنگ کے ان کا اور میر کا کلام ملتا جلتا ہے۔ کیونکہ دونوں غزال تھے اور دونوں کا رنگ عاشقانہ ہے مگر میر کے جذبات اور درد و اثر جرأت کے یہاں مفقود ہیں۔ میر عمیق اور جرأت سطحی شاعر ہیں۔ ان کے یہاں معاشیق علی الخصوص معاشیق بازاری کے ناز و کرشمے، عشاق کی حرماں نصیبی، ہجر کی مصیبتیں، درباریوں کی ایک دوسرے کے ساتھ رقابت

اور بے پروائی وغیرہ وغیرہ، غرضکہ جو کچھ ایک عیش پرست دربار اور عشرت طلب سوسائٹی کا تقاضا تھا۔ بہت خوبی اور بڑی کامیابی سے بیان ہوا ہے۔ غزل کے لئے اُنکی طبیعت بہت مناسب واقع ہوئی تھی۔ میر کے رنگ کو اُنھوں نے اختیار کیا اور اُس کی شیرینی اور فصاحت و بلاغت میں ایک ایسی چاشنی اور شوخی اضافہ کی جس سے ان کا طرز علیحدہ ہو کر مقبول عام ہو گیا۔ مگر اس میں بھی شک نہیں کہ میر میں اور ان میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ میر کا تخیل بلند اور اُن کا عاشقانہ رنگ بہت اعلیٰ اور ارفع قسم کا ہے، جرأت کا عشق مادی اور ادنیٰ درجہ کا ہے۔ میر کے قدردان اہل دل سخن شناس اور جرأت کے دلدادہ عوام الناس ہیں۔ سچ پوچھیے تو اصلی فرق دونوں کی طبیعتوں کا ہے۔ میر میں متانت، خودداری، استغراق اور گوشہ نشینی تھی اور وہ شاعری کو ایک نہایت معزز اور مقدس کام خیال کرتے تھے۔ برخلاف اس کے جرأت ایک حریف ظریف، ہشاش بشاش خوش طبع آدمی تھے، ہمیشہ صحبت کے متلاشی اور شاعری کو ذریعۂ معاش اور جلب زر کا ایک زبردست آلہ سمجھتے تھے اور شعر کے ذریعہ سے اپنے تئیں اپنے مربیوں اور سرپرستوں کا ایک دلچسپ کھلونا بنائے ہوئے تھے اور اُن کے دل کو خوش کر کے اُن سے کچھ اینٹھنا جانتے تھے۔ اُن میں میر اور انشا کا ایسا علم و فضل اور قواعد شعر سے ویسی واقفیت نہ تھی مگر پھر بھی اُن کا ایک طرز خاص ہے اور اُن کے کلام میں ایسی سادگی اور مزہ ہے جو عام دلوں کو بہت مرغوب ہے۔ میر نے جو رائے اُن کی غزلوں کی نسبت ظاہر کی تھی وہ سُننے کے قابل ہے اور بہت صحیح ہے۔ مرزا محمد تقی خاں ترقی کے مکان پر ایک مشاعرہ تھا جس میں شہر کے سب نامی

رئیس اور شاعر جمع تھے میر اور جرأت بھی تھے۔ جرأت نے جو غزل پڑھی اُس پر بہت واہ واہ ہوئی اور بہت تعریفیں ہوئیں وہ ازراہ تبختر یا شوخی سے، جو کچھ سمجھیے، میر صاحب کے پاس آ بیٹھے اور اپنے کلام کی داد چاہی، میر صاحب نے دو ایک مرتبہ تو ٹالا مگر جب اُنھوں نے زیادہ اصرار کیا تو تیوری چڑھا کر فرمایا "تم شعر کہنا کیا جانو اپنے چوما چاٹی کر لیا کرو" مختصر یہ کہ جرأت کا پایۂ شاعری بہت بلند نہیں دربار کے توسل نے ان کو بھی مٹایا جیسا کہ انشا کو مٹایا تھا پھر بھی انشا کو اُن کے علم و فضل نے بچا لیا۔ اِن کا تو یہ بھی سہارا نہ تھا۔ جرأت نے زبان یا نظمِ اردو کی ترقّی میں بھی کوئی حصہ نہیں لیا۔ جو شاہراہ متقدمین قائم کر گئے تھے اُسی پر آنکھیں بند کئے چلے گئے۔ کہا جاتا ہے وہ عاشقانہ رنگ کے موجد ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ دعوےٰ صرف اس حد تک صحیح ہو سکتا ہے کہ اُنھوں نے سب سے پہلے بگڑے ہوے عام مذاق کی پیروی کی اور ایک ایسا رنگ اختیار کیا جسکی تکمیل متأخرین میں نواب مرزا خاں داغ کے ہاتھوں ہوئی۔ اِن دونوں شاعروں میں باعتبار لفظ اور معنی دونوں کے فی الواقع بہت مماثلت اور مشابہت ہے۔

جرأت اور داغ

مصحفی (متوفی ۱۱۶۴ھ تا ۱۲۴۰ھ)

شیخ غلام ہمدانی نام مصحفی تخلص۔ شیخ ولی محمد کے بیٹے امروہہ کے رہنے والے تھے۔ آغاز جوانی میں وطن چھوڑ کر سنہ ۱۱۹۰ھ میں دلّی آئے۔ جہاں تکمیل علوم کی اور شعر و سخن کی طرف مائل ہوئے۔ اِن کو پڑھنے کا اسقدر شوق اور کتب بینی سے اسقدر ذوق تھا کہ کتابیں عاریت لے لے کر پڑھتے تھے اور بطور خلاصہ اپنی یادداشت کے طریقہ پر لکھتے جاتے تھے۔

انھوں نے سنہ ۱۱۹۵ھ ہی میں شعر گوئی میں شہرت حاصل کرلی تھی کیونکہ تذکرۂ میر حسن میں ان کا ذکر عزت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ خود مشاعرہ بھی کرتے تھے جنمیں معزز شعرا مثل انشا اور میر حسن اور جرأت وغیرہ کے جمع ہوتے تھے۔ بارہ[12] برس دلّی میں رہ کر مثل اور شعرا کے لکھنؤ آئے جب کہ نواب آصف الدولہ سریرآرائے حکومت تھے۔ لکھنؤ میں اُنھوں نے مستقل قیام کیا اور شاہزادۂ مرزا سلیماں شکوہ کے ملازم ہو گئے۔ لکھنؤ آنے سے پہلے کچھ دنوں ٹانڈہ میں نواب محمد یار خاں کے پاس رہے تھے۔ لکھنؤ تھوڑے دنوں رہکر پھر دلّی چلے گئے مگر کچھ دنوں کے بعد آب و دانہ کی کشش اُن کو پھر لکھنؤ کھینچ لائی۔ آزاد کی تحقیق کے موافق سنہ ۱۲۴۰ھ میں تقریباً اسّی برس کی عمر میں انتقال کیا جب کہ آٹھواں دیوان ترتیب دے رہے تھے۔ شیفتہ بھی اپنے گلشن بیخار میں جو سنہ ۱۲۵۰ھ کی تصنیف ہے لکھتے ہیں کہ ان کو مرے دس برس ہوئے۔ حسرت موہانی اپنے تذکرہ میں ان کا سن ولادت سنہ ۱۱۶۴ھ لکھتے ہیں۔ لہذا مرنے کے وقت ان کی عمر ۷۶ برس کی ہوگی۔

تصانیف مصحفی اُردو اور فارسی دونوں کے پرگو شاعر تھے سنہ ۱۷۹۴ء کے پہلے انھوں نے دو دیوان فارسی مرتب کیے تھے ایک نظیری نیشاپوری کے جواب میں۔ اور دوسرا اپنی طبعزاد غزلوں کا مجموعہ۔ اِن کے علاوہ دو اور فارسی دیوان بھی لکھے ایک ناصر علی کے رنگ میں اور دوسرا جلال اسیر کے انداز میں یہ دونوں دیوان چوری گئے۔ اب ان کا صرف ایک دیوان فارسی مروّج ہے جس کا ذکر سب تذکرہ نویسوں نے کیا ہے۔ ایک تذکرہ فارسی شعرا کا اور ایک اردو شعرا کا فارسی زبان میں لکھا۔ شاہنامہ کا ایک حصہ بھی لکھا ہے جسمیں شاہ عالم کے خاندان تک کے حالات درج ہیں۔

تذکرہ شعرائے اُردو مصنفہ ۱۷۹۴ء

مصحفی کی شہرت زیادہ تر ان کے ضخیم اُردو دیوانوں اور تذکرہ پر مبنی ہے۔ آٹھ اردو دیوان انکی یادگار ہیں جن میں ہزارہا غزلیں قطعے قصائد وغیرہ سب کچھ موجود ہیں۔ تذکرہ شعرائے اُردو جو زبان فارسی میں ہے سنہ ۱۲۰۹ھ مطابق ۱۷۹۴ء میں ترتیب پایا۔ اور اب ملتا ہے۔ یہ نہایت مفید کتاب ہے اور اسمیں تقریبًا ساڑھے تین سو شعرا کا ذکر ہے جو محمد شاہ کے زمانہ سے لیکر مصنف کے زمانہ تک تھے اُنھوں نے اپنے معاصرین کا خصوصیت کے ساتھ مفصل ذکر کیا ہے اور کلام کے نمونے بھی دیے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ تذکرہ اُن کے شاگرد میر مستحسن خلیق خلف میر حسن کی خاص فرمائش سے لکھا گیا تھا۔ یہ بھی مشہور ہے کہ مصحفی کے آٹھوں دیوان اور دونوں تذکرے بھوپال میں کسی صاحب کے پاس موجود ہیں۔

خصوصیات کلام

سب سے بڑی صفت مصحفی میں یہ تھی کہ وہ نہایت زودگو تھے۔ جب وہ شعر کہتے تھے اور قلمبند کرتے جاتے تھے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی کتاب سے نقل کر رہے ہیں۔ مشاعروں کے لیے بکثرت غزلیں کہہ رکھتے تھے۔ معمولی غزلیں خریداروں کے ہاتھ بیچ ڈالتے اور منتخب اشعار اپنے لئے رکھ لیتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اِسی زودگوئی یا پُرگوئی سے اُن کے کلام میں ناہمواری پیدا ہوگئی کیونکہ پرگوئی نے زیادہ جانکاہی اور غور و فکر کا موقع نہیں دیا۔ دوسری خصوصیت انکی یہ ہے کہ وہ مسلم الثبوت جگت اُستاد تھے۔ اور بڑے بڑے اُستاد اُن کے دامن تلمذ سے وابستہ تھے مثلاً میر مستحسن خلیق۔ ضمیر۔ آتش۔ شہیدی۔ علیشی وغیرہ۔ بلکہ اگر سچ پوچھیئے تو ان کے زمانہ کے بعد کے اکثر شعرا بالواسطہ یا بلاواسطہ انھیں کے

شاگرد تھے ۔ ناسخ کی نسبت مشہور ہے کہ اُن کو کسی سے فخر تلمذ حاصل نہ تھا۔ مگر
وہ بھی محمد عیسیٰ تنہا کے ذریعہ سے جو مصحفی کے شاگرد رشید تھے، اسی مائدۂ سخن کے
ریزہ چین ثابت ہوتے ہیں جیسا کہ خود مصحفی نے اپنے چھٹے دیوان کے دیباچہ میں
ان کی نسبت لکھا ہے اس سے بڑھکر ثبوت مصحفی کے کمال فن کا کیا ہوسکتا ہے
کہ جتنے استاد اُن کے شاگردوں میں نکلے اتنے اور کسی کو نصیب نہیں ہوے ۔
تیسری خصوصیت یہ ہے کہ قواعد نظم کے یہ نہایت سخت پابند رہے اور حشو گریہ کے
عیب سے جو میر و سودا ایسے استادوں کے یہاں بھی پایا جاتا ہے، ان کا کلام پاک
ہے۔ ناسخ نے اور بھی اس اصلاح کے آئین کو درجہ تکمیل پر پہونچایا۔ مگر ان کے کلام
میں رطب و یابس شامل ہونے کی وجہ سے ہمواری نہیں ہے۔ کہیں میر تقی میر کا
درد و گداز ہے۔ کہیں سودا کی بلند پردازی۔ کہیں فغاں کی رنگینی۔ کہیں میر سوز کی
سادگی۔ کسی میں جرأت کی شوخی اور کہیں کہیں انشا کا بھی رنگ ہے اس میں کوئی
شک نہیں کہ ان کا کلام اعلیٰ درجہ کا قدما کے رنگ کا بھی بہت ہے۔ مگر زیادہ تر
غزلیں معمولی ہیں اور کسی خاص رنگ کی نہیں ہیں۔ بعض غزلوں کی زمینیں سودا کے
تتبع میں نہایت سخت اور ردیف و قافیہ مشکل رکھے گئے ہیں اور گوکہ ان میں شاعری کا
کمال دکھایا ہے مگر پھر بھی سودا کا ساز ور اور استادی نہیں پائی جاتی۔ اگرچہ میر تقی اور
میر سوز کے تتبع میں بہت سے اشعار سادہ اور فصیح اور دردناک لہجہ میں کہے ہیں مگر
پھر بھی مذکورۂ بالا اُستادوں کی وہ بات کہاں۔ مختصر یہ کہ غزل میں اُن کا کوئی خاص
رنگ نہیں اور بعض اشعار کی عمدگی کو من اولہ الی آخرہ نباہ نہیں سکتے یہی حال
اُن کے قصیدہ کا بھی ہے۔ جن میں قواعد کی پابندی اور الفاظ و معانی کی بلندی تو

ضرور ہے مگر متقدمین کا زور اور شان و شکوہ پیدا نہیں ہو سکا۔ چند مثنویاں بھی لکھی ہیں جن میں ایک "بحر المحبت" میر کی مثنوی "دریائے عشق" کے رنگ میں بلکہ اُسکی نقل ہے قصہ کا مضمون اور طرز عبارت وغیرہ سب اُسی سے ملتے جلتے ہیں۔

مختصر یہ کہ مصحفی کے کلام میں کوئی خاص بات نہیں، وہ متقدمین کے پیرو تھے اور نہایت زود گو اور پُر گو تھے۔ مختلف اصناف سخن پر اُنھیں کمال حاصل تھا اُنکی خصوصیات اُن کے یہاں جرأت سے زیادہ اور انشا سے کم ہیں۔ نہ تخئیل میں بلندی ہے نہ جذبات میں دلکشی ہے۔ الفاظ بھی بعض جگہ ایسے لکھ گئے ہیں جو اب متروک ہو گئے۔ زبان میں اکثر جگہ میر و سودا کی پیروی ہے گو کہ زمانہ انشا اور جرأت کا پایا تھا۔

مصحفی اور سید انشا کے معرکے

مصحفی اور سید انشا کے معرکے نہایت مشہور ہیں جنمیں مختلف ہجووں اور مذاق و تمسخر سے جو بسا اوقات فحش کی حد تک پہونچ جاتا تھا۔ بہت کام لیا گیا ہے۔ یہ واقعات نہایت تفصیل کے ساتھ آبحیات میں درج ہیں اگر کسی کو دیکھنا ہوں تو اُس کتاب میں دیکھنا چاہیے یہاں بھی مختصراً بمصداق مشتے نمونہ از خروارے لکھے جاتے ہیں۔ ابتدا اُس واقعہ کی یوں ہوئی کہ میاں مصحفی پہلے شہزادہ سلیمان شکوہ کے کلام پر اصلاح دیتے تھے۔ جب سید انشا پہونچے تو اُن کے سامنے اِن کا رنگ کب جم سکتا تھا۔ چنانچہ اب غزلیں اُن کے پاس آنے لگیں جس سے مصحفی کو بڑا قلق ہوا اسی اثنا میں انکی تنخواہ بھی کم کر دی گئی جس کے متعلق اُنھوں نے ایک قطعہ لکھکر شہزادہ موصوف کو گزرانا جس کے چند اشعار یہ ہیں ؎

چالیس برس کا ہی ہے چالیس کے لائق | تھا مردِ معمر کہیں دس بیس کے لائق
اے وائے کہ پچیس سے اب پانچ ہیں اپنے | ہم بھی تھے کسی روز وہیں پچیس کے لائق
اُستاد کا کرتے ہیں امیراب کے مُقرّر | ہوتا ہے جو در ماہہ کہ سائیس کے لائق

مشاعروں میں بھی ہم طرح غزلوں میں نوک جھوک ہوتی اور ایک دوسرے کا مذاق اُڑایا جاتا مثلاً ایک جلسہ میں میاں مصحفی نے غزل پڑھی جسکا مقطع تھا:۔

تھا مصحفی یہ مائل گریہ کہ پس از مرگ | تھی اُسکی دھری چشم پہ تابوت میں اُنگلی

اس شعر کو انشائے یا اُن کے یار دوستوں نے اُلٹ دیا اور کہا

تھا مصحفی کانا جو چھپانے کو پس از مرگ | رکھے ہوئے تھا آنکھ پہ تابوت میں اُنگلی

اسی زمانہ میں مصحفی نے ایک غزل کہی تھی جس کا یہ مطلع ہے ۔

سرِ مُشک کا ہے تیرا تو کافور کی گردن | نے موئے پری ایسے نہ یہ حور کی گردن

اس غزل پر سید انشا نے بہت سے اعتراض وارد کیے اور ایک قطعہ بھی نظم کیا۔ غزل کا مطلع ہے

توڑوں گا خمِ بادۂ انگور کی گردن | رکھ دونگا وہاں کاٹ کے اک حور کی گردن

اور قطعہ اس طرح شروع کیا ۔

سُن لیجیے گوش دل سے مری مشفقا یہ عرض | مانند بید غصہ سے مت تھرتھرائیے
بلّور گو درست ہو لیکن ضرور کیا | خواہی نخواہی اُسکو غزل میں کھپائیے
دستور وطور و نور یہ ہیں قافیے بہت | اسمیں جو چاہیے تو قصیدہ سُنائیے
کیا لطف ہے کہ گردن کافور باندھکر | مردے کی باس زندوں کو لاکر سُنگھائیے

اسی قسم کے اور بہت سے اشعار ہیں جن میں مصحفی کے زباندان ہونے پر اعتراض

کیا ہے۔ مصحفی نے جواب الجواب اپنی غزل کی طرح میں دیا۔ اور انشا کی غزل میں جو ان کے نزدیک قابل اعتراض باتیں تھیں ان پر اعتراض جمائے۔ مثلاً

اے آنکہ معارض ہو مری تیغ زباں سے — تو نے سپرِ عذر میں مستور کی گردن
ہے آدم خاکی کا بنا خاک کا پتلا — گر نور کا سر ہووے تو ہو نور کی گردن
لنگور کو شاعر تو نہ باندھیگا غزل میں — کسواسطے باندھے کوئی لنگور کی گردن
گردن تو صراحی کے لئے وضع ہے ناداں — بیجا ہے خم بادۂ انگور کی گردن

اس مباحثہ اور مناظرہ کے بعد پھر تو وہ جھگڑا شروع ہوا جو دونوں آدمیوں کی تہذیب و متانت سے بہت دور تھا۔ فریقین کے شاگردوں نے اپنے اپنے استادوں کی بیچ میں وہ طوفان اٹھائے کہ خدا کی پناہ۔ ایک دن میاں مصحفی کے سب شاگرد اکٹھا ہوئے شہدوں کا سوانگ بھرا اور ہجو کہہ کر اس کے اشعار پڑھتے ہوئے سید انشا کے مکان کی طرف روانہ ہوئے۔ اور آمادہ تھے کہ مارپیٹ بلکہ کشت و خون سے بھی دریغ نہ کریں۔ سید انشا کو اسکی پہلے سے خبر ہو گئی تھی وہ نہایت متحمل اور سمجھدار آدمی تھے۔ بجائے ان لوگوں پہ غصہ کرنے یا ان کا مقابلہ کرنے کے اُنھوں نے ان کی بہت خاطر و مدارات کی ان کو مٹھائیاں کھلائیں۔ گلوریاں اور ہار پھول ان کے سامنے پیش کیے اور اپنی ہجویں اپنے سامنے پڑھوا کر خود بھی بہت خوش ہوئے اور ان کو نہایت عزت و احترام سے رخصت کیا۔ مگر دوسرے دن جو جواب سید انشا نے تیار کیا وہ غضب کا تھا۔ ایک پُر تکلف بارات کی نقل بنائی جسمیں ایک مجمع کثیر شامل تھا اور لوگ ڈنڈوں پر کچھ اشعار پڑھتے ہوئے اور ایک گڈا اور ایک گڑیا ہاتھ میں

ہلاتے ہوئے جاتے تھے جس کا ایک شعر یہ ہے ۔

لڑتے ہوئے آئے ہیں مصحفی و مصحفن
سوانگ نیا لایا ہے دیکھنا چرخِ کہن

ان معرکوں میں نہ صرف معمولی لوگ بلکہ اُس زمانہ کے معزز شعرائے لکھنؤ سب شامل تھے اور اس پُر فتنہ مذاق سے لطف اُٹھاتے تھے۔ اکثر امرائے اور خاص کر مرزا سلیمان شکوہ نے سید انشا کا ساتھ دیا تھا جس سے مصحفی کو بہت رنج ہوا۔ چنانچہ اُنھوں نے اسی افسردہ دلی میں ایک غزل کہی جس کا مطلع و مقطع یہ ہے ۔

کچھ اسکے سوا اب مری تدبیر نہیں یاں
جاتا ہوں ترے در سے کہ توقیر نہیں یاں

سچ ہے کہ کچھ انسان کی توقیر نہیں یاں
اے مصحفی بے لطف ہے اس شہر میں رہنا

ادھر مرزا سلیمان شکوہ کو یہ شبہ پیدا ہوا تھا کہ اس شکوہ و شکایت میں ہم پر بھی چوٹیں کی ہیں اور وہ ناراض ہو گئے تھے ۔ مصحفی نے اس کی معذرت میں ان کے حضور میں ایک قصیدہ پیش کیا جسکا مطلع ہے ۔

کہ مجھ سے حضرت شہ میں نہیں ہوئی تقصیر
قسم بذات خدائیکہ ہے سمیع و بصیر

اس میں ممدوح کی عزت و شان اور اپنی بے حقیقتی کا مقابلہ کر کے کہتے ہیں کہ یہ ناممکن ہے کہ یہ نمکخوار قدیم حضور کی نسبت کوئی بُرا لفظ کہے۔ یہ افترا سب انشا کا بنایا ہوا ہے جس نے حضور کے مزاج کو مجھ سے منحرف کر دیا ہے ۔

اس قصیدہ میں اپنی اور اپنے ساتھیوں کی بریت اور سید انشا کی خطا ثابت کی ہے ۔ مختصر یہ کہ یہ معرکہ بھی بحیثیت شعر و شاعری ایک یادگار معرکہ ہے ہر چند اس میں خلاف تہذیب نظمیں کہی گئیں مگر پھر بھی یہ بہت دلچسپ اور اُس زمانہ کی

ایک خاص یادگار ہے۔

رنگین ۱۱۶۹ھ تا ۱۲۵۱ھ

سعادت یار خاں رنگین طہماسپ بیگ خاں تورانی کے فرزند ارجمند تھے۔ سرہند میں پیدا ہوئے ان کے والد توران سے آکر چند دنوں لاہور میں حسین الملک میر منو خاں کی سرکار میں ملازم رہے۔ اِس کے بعد دلی آئے جہاں پیشگاہ سلطانی سے منصب ہفت ہزاری اور خطاب محکم الدولہ اعتضاد جنگ بہادر عنایت ہوا۔ رنگین نے شاہزادہ مرزا سلیمان شکوہ کی ملازمت اختیار کر لی تھی وہ بہت اچھے شہسوار اور فنون سپہگری سے خوب واقف تھے۔ دکن میں نظام حیدر آباد کی فوج میں افسر توپ خانہ رہے۔ لیکن بعد کو نوکری چھوڑ کر گھوڑوں کی تجارت کرنے لگے۔ انشا کے وہ بڑے دوست تھے اور اکثر اُن سے لکھنؤ میں ملا کرتے تھے اوائل عمر میں شعر کہنا شروع کیا۔ اور سب سے پہلے شاہ حاتم کے شاگرد ہوئے۔ مشہور ہے کہ میر صاحب سے اصلاح لینا چاہتے تھے مگر انھوں نے یہ کہکر انکار کر دیا کہ تم امیر آدمی کے لڑکے ہو تم کو شاعری نہیں آسکتی تمھارے لئے شہسواری ورزش وغیرہ مناسب ہے تم کو اس سے کیا واسطہ حاتم کے بعد وہ محمد امان نثار کو اپنا کلام دکھاتے تھے اور جرمن مستشرق بلوم ہارٹ کی تحقیق ہے کہ مصحفی سے بھی اصلاح لیتے تھے۔ رنگین کو سیر و سیاحت کا بہت شوق تھا اور نہایت عاشق مزاج واقع ہوئے تھے چونکہ امیر آدمی تھے حسین بھی تھے لہذا زندگی نہایت عیش و عشرت سے پریوشوں کے جھگھٹے میں گزارتے تھے۔ بے انتہا خلیق متواضع اور مہذب آدمی تھے۔ ڈاکٹر اسپرنگر اور کریم الدین کی تحقیقات کے بموجب ۸۰ اسّی برس کی عمر میں ۱۲۵۱ھ میں فوت ہوئے۔ مگر شیفتہ اور گارسن ڈیٹاسی اُن کی عمر ۸۰ اکاسی

اور سن وفات بارہ سو پچاس بتاتے ہیں۔

تصانیف

(۱) "مثنوی دلپذیر" جسمیں تقریباً دو ہزار شعر ہوں گے اسمیں شاہزادے ماہ جبیں اور رانی سری نگر کا قصہ ہے اسکا سنہ تصنیف ۱۲۱۳ھ ہے جیسا کہ جرأت اور انشا وغیرہ کی تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے۔

(۲) "ایجاد رنگین" یہ بھی ایک مثنوی ہے اسمیں فحش قصے اور دلچسپ حکایات ہیں۔

(۳) چار دیوان جن کے علیحدہ علیحدہ نام "دیوان ریختہ۔ دیوان ریختی دیوان آمیختہ۔ دیوان انگیختہ" ہیں اور مجموعاً ان چار دیوانوں کا نام "چار عنصر رنگین" ہے۔

(۴) "مثنوی مظہر العجائب یا غرائب المشہور" اسمیں بھی حکایتیں ہیں۔

(۵) "مجالس رنگین" یہ ان کی بہت مشہور تصنیف ہے اور اسمیں اپنے زمانے کے شعرا کا حال لکھا ہے اور اُن کے کلام کی تنقید بھی کی ہے۔

(۶) فرسنامہ مصنفہ سنہ ۱۲۱۰ھ اسمیں گھوڑوں کی شناخت نیک و بد اور اُن کے علاج وغیرہ کا ذکر ہے۔ پہلا دیوان ۱۲۲۸ھ میں تیار ہوا تھا جیسا کہ ایک تاریخ سے معلوم ہوتا ہے۔ اس میں ۲۷ صفحہ غزلیات ۲۲ صفحہ رباعیات اور دو منظوم خط اور ایک قصیدہ ۶۰۰ شعروں کا ہے۔ دوسرا دیوان ۹۴ صفحہ کا غزلیات اور رباعیات پر مشتمل ہے تیسرے دیوان میں ان کے ہزلیات شامل ہیں۔ اور اسی میں ایک قصیدہ شیطان کی تعریف میں ہے۔ چوتھا دیوان ریختی کا ہے۔ اس کے دیباچہ میں مصنف نے مستورات کے خاص خاص

محاورات اور عورتوں کی اصطلاحیں بیان کی ہیں اور نیز بدچلن عورتوں کی جن کو وہ عروس شیطان لکھتا ہے بول چال درج ہے۔

ریختی سے کیا مطلب ہے اور اسکی ایجاد کے اسباب

ریختی کے طرز میں ایک قسم کی دلچسپی ضرور ہے۔ مگر خرابی یہ ہے کہ اسمیں اکثر غیر مہذب اور فحش آمیز اشارے ہوتے ہیں نساخ کی رائے ہے کہ اس طرز خاص کے موجد میاں رنگین تھے۔ اور رنگین نے خود بھی یہ دعوی اپنی نسبت اپنے دیوان کے دیباچہ میں کیا ہے مگر غور سے دیکھا جائے تو یہ طرز قدیم شعراء علی الخصوص شعرائے دکن میں بھی موجود تھا مثلاً مولانا ہاشمی بیجاپوری جو دکن کے ایک مشہور شاعر تھے اور مولانا قادری جو ولی کے ہم عصر تھے اور جن کا تخلص خاکی تھا اور جن کا دیوان ۱۱۸۲ھ میں مرتب ہوا ہے۔ ان لوگوں کے یہاں بھی ریختی کا پتہ چلتا ہے۔ مگر اتنا فرق ضرور ہے کہ ان قدیم شاعروں کی ریختی ایک خاص قسم کی تھی جسکی وجہ یہ ہے کہ چونکہ ان کے کلام میں بھاشا کا زیادہ اثر ہے لہذا اُسی کے تتبع میں اظہار عشق عورت کی جانب سے اور اُسی کے الفاظ میں کرتے ہیں بخلاف معمولی اُردو کے جسمیں اظہار عشق عموماً مرد کی جانب سے ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے اس قسم کی ریختی میں فحش اور ابتذال مطلق نہیں ہوتا۔ برخلاف انشا اور رنگین کے طرز کے جن کا دارومدار عیاشی و شہوت پرستی پر ہے۔ اُن کی غرض عموماً یہ ہوتی ہے کہ ایسا کلام پڑھکر لوگوں کو ہنسی آئے یا اُن کے نفسانی جذبات میں ہیجان پیدا ہو۔ اسی وجہ سے اس قسم کی نظموں میں خلوص اور بلند خیالی یہاں تک کہ بے ضرر سادہ مذاق بھی نہیں ہوتا۔

یہ بات ضرور قابل غور ہے کہ ہمارے ملک میں عورتوں اور مردونکی علیحدہ علیحدہ

زبان ہونے کے اسباب کیا ہیں۔ اِن دونوں کی زبانوں میں صرف الفاظ و محاورات کا فرق ہوتا ہے بعض الفاظ و محاورے مستورات کے لیے مخصوص ہیں جن کو عام طور پر مرد نہیں استعمال کرتے۔ ہمارے نزدیک اس خصوصیت اور فرق کی بڑی وجہ پردہ ہے جس سے اس ملک کی شریف گھرانے کی عورتیں غیر مردوں کے سامنے نہیں آسکتیں اور اُن کے ساتھ بے تکلفی سے نہیں مل سکتیں اکثر پُرانے خیال کے لوگوں میں تو پردہ کے بارہ میں یہاں تک سختی ہے کہ عورتیں اپنے غیر محرم رشتہ داروں تک سے پردہ کرتی ہیں پس ایسی قید کی صورت میں لازم ہوا کہ عورتیں اپنے واسطے کچھ خاص اصطلاحیں اور محاورے مخصوص کرلیں۔ مثلاً مرد چونکہ آزاد تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ ہوتے ہیں۔ لہذا وہ دوسری زبان کے الفاظ بے تکلف بولنے لگتے ہیں۔ عورتیں برعکس اسکے اپنے پردہ اور عدم تعلیم کی وجہ سے اپنی خالص زبان کی پابند رہتی ہیں۔ اور اسکی صحت اور بے میل رہنے کی حفاظت کرتی رہتی ہیں۔ پھر چونکہ عورتوں کے مزاج میں فطرتاً قدامت پسندی اور تغیر نا آشنائی ہوتی ہے اس وجہ سے دوسری زبان کے ثقیل اور کڈھب الفاظ اُن کو پسند نہیں آسکتے۔ مزید براں ان میں چونکہ قدرتاً شرم و حیا اور ضعیف الاعتقادی ہوتی ہے ایسے الفاظ اُن کو ایک رمز و کنایہ سے اور خاص طریقہ سے وضع کرنا پڑتے ہیں۔ جن کے نام لینے میں اُن کو شرم و حیا مانع ہو یا وہم و خوف دامنگیر ہو۔ یہ تخصیص اصطلاحات و محاورات ظاہر ہے کہ اُن گھرانوں میں بہت زیادہ ہے جہاں پردہ کی زیادہ سختی سے پابندی ہوتی ہے۔ اس فرق مذکورۂ بالا سے انشا اور رنگین نے اپنی خاص اغراض کے لیے

فائدہ اُٹھایا، اور اپنی نو ایجاد طرز کا دار و مدار اسی مخصوص عورتوں کی زبان اور نیز عیاشی اور بداخلاقی پر رکھا۔

ریختی اس زمانہ کی بگڑی ہوئی سوسائٹی کا بہترین آئینہ ہے جبکہ لکھنؤ کے عیش پسند فرمانرواؤں اور امرا کی محفلوں میں عیش و عشرت اور حسن پرستی کا بازار گرم تھا اور بازاری عورتوں کا عشق داخل فیشن ہو گیا تھا۔ شہر کے نوجوان اُمرا اس قسم کی بے اعتدالیوں سے متنبہ ہونے کے بجائے اِن کو کھلم کھلا اور بلا خوف لومۃ لائم عمل میں لاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس زمانہ کی نظم بھی اُن کے جذبات اور اُن کے مذاق کا آئینہ ہونا چاہیئے۔ مگر حقیقت میں اس قسم کی ناشائستہ اور غیر مہذب نظمیں نہایت ہی مخرب اخلاق اور نوجوانوں کے حق میں سم قاتل ہیں چنانچہ خود انشا نے بھی اس قسم کے فواحش کے بُرے اثر کا ذکر ایک جگہ اپنے دریائے لطافت میں کیا ہے۔ بہرطور یہ طرز اُس زمانہ میں بہت مقبول تھا اور اسکی ترقی کی معراج میر یار علی المتخلص بہ جان صاحب کے زمانہ میں ہوئی۔ جان صاحب میر امن کے بیٹے اور نواب عاشور علی خاں کے شاگرد تھے۔ وطن اصلی لکھنؤ تھا مگر آخر عمر میں بسبب ملازمت زیادہ تر رامپور میں رہے۔ جان صاحب نے اپنی تمام عمر اسی خاص صنف میں بسر کردی اور اپنی خاص روش میں خوب کہتے تھے۔ مشاعروں میں زنانہ لباس سے شریک ہوتے اور بالکل عورتوں کے طریقہ سے پڑھتے جس سے سننے والے ہنستے ہنستے لوٹ جاتے تھے۔ ۱۸۴۶ء میں وہ دلی گئے تھے اور وہاں سے بتلاش روزگار بھوپال آئے مگر ناکام رہے آخر کار رامپور میں نواب کلب علیخاں کے دامن دولت سے وابستہ ہو گئے اور یہیں رامپور

میں کچھ اوپر ستّر برس کے سن میں ۱۷۹۶ء میں انتقال کیا۔

غرضکہ یہ صنف شاعری اب مقبول نہیں ہے اور مہذب جلسوں میں اس کو کوئی پسند نہیں کرتا البتہ مذاق وظرافت کے وہ اشعار جو دائرۂ تہذیب سے خارج نہوں عام طریقہ سے پسند کیے جاتے ہیں۔

شاعر شاہان دہلی
شاہ عالم ثانی
سنہ ۱۷۶۱ تا سنہ ۱۸۰۶ء

آخر زمانہ کے شاہان دہلی شعرا کے مربی بھی تھے اور خود بھی اچھے خاصے شاعر تھے۔ مثلاً شاہ عالم ثانی جو آفتاب تخلص کرتے تھے ایک مثنوی موسوم بہ "مضمون اقدس" کے مصنف ہیں۔ جسمیں ایک فرضی افسانہ منظر شاہ بادشاہ چین کا ہے یہ مثنوی کا تاریخی نام ہے[1] جس سے ۱۲۰۱ نکلتے ہیں۔ اس مثنوی کے علاوہ ان کا ایک دیوان غزلوں کا ۲۴۴ صفحات کا ہے وہ فارسی بھی کہتے تھے چنانچہ اُن کا فارسی دیوان بھی موجود ہے اور وہ قصیدہ جسمیں نمکحرام غلام قادر کے ظلم وستم کا اور اپنی آنکھیں نکلے جانیکا ذکر کیا ہے بہت ہی دردناک ہے۔ بڑے بڑے شاعر مثلاً سودا۔ میر۔ نصیر۔ اعظم۔ انشا۔ زار۔ ممنون۔ احسان۔ اور فراق وغیرہ یہ سب انکی سرکار کے دعاگو تھے۔

مرزا سلیمان شکوہ
متخلص بہ سلیمان

شاہ عالم ثانی کے تیسرے بیٹے تھے۔ غلام قادر کی بغاوت کے بعد دہلی کی سکونت چھوڑ کر لکھنؤ چلے گئے اور مثل اپنے برادر بزرگ مرزا جواں بخت بہادر ولی عہد کے وہیں رہنے لگے۔ نواب آصف الدولہ بہادر نے اخراجات کے لیے چھ ہزار ماہوار مقرر کردیے تھے۔ نواب سعادت علی خاں اور

[1] تاریخ صحیح نہیں نکلتی اس سے صرف ۱۱۰۱ نکلتے ہیں ۱۲

غازی الدین حیدر ۱۸۱۹ء تک اُن سے جھک کر ملتے تھے اور نذریں دیتے تھے۔ جب غازی الدین حیدر نے تاج شاہی پہنا تو ملاقات بدرجہ مساوات چاہی شاہزادہ نے باقتضائے مصلحت وقت مرزا نصیر الدین حیدر ولی عہد سلطنت کے ساتھ اپنی بیٹی کی شادی کر دی جنھوں نے سلطان بہو کا خطاب پایا۔ مگر شوہر و بیوی میں ناموافقت رہی۔ ۲۸ سال لکھنؤ میں رہکر کا سگنج اپنے پرانے دوست کرنل گارڈنر کے پاس چلے گئے بعد کو اکبر آباد میں سکونت اختیار کر لی۔ اکبر شاہ ثانی کے زمانے میں کئی بار دہلی آئے ۱۸۳۸ء میں انتقال کیا اور سکندرہ میں مدفون ہوئے شعرا کے بہت بڑے سرپرست تھے۔ خود بھی اچھے خاصے شاعر صاحب دیوان ہیں۔ ابتدا میں شاہ حاتم کے شاگرد ہوئے اسکے بعد مصحفی اور انشا کو کلام دکھایا۔ دہلی سے جو باکمال لکھنؤ جاتا پہلے ان کے یہاں حاضر ہوتا اور صاحب عالم بھی الطاف امیرانہ سے پیش آتے۔ لکھنؤ میں مشاعرے کرتے مصحفی، قتیل، انشا، میر حسن سب اسی سرکار کے دعاگو تھے۔ اِن کا قلمی دیوان لالہ سری رام صاحب مصنف خمخانۂ جاوید کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

اکبر شاہ ثانی ۱۸۰۶ تا ۱۸۳۷ء

ابو النصر معین الدین اکبر شاہ ثانی بادشاہ دہلی حضرت شاہ عالم ثانی کے دوسرے بیٹے تھے۔ ۱۷۵۹ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۰۶ء میں تخت سلطنت پر بیٹھے اور ۱۸۳۷ء میں انتقال کیا ظفر نے تاریخ کہی ؎

پے سالِ وفات گفت ظفر عرش آرامگاہ عالی قدر

موزوں طبع تھے۔ اپنے باپ کے تخلص "آفتاب" کی رعایت سے شعاع تخلص کرتے تھے

فکر سخن کیطرف توجہ کم تھی لیکن شعرا کی بڑی قدر کرتے تھے میر نظام الدین ممنون غالب علیخاں سید۔ شاہ نصیر وغیرہ ان کے دربار کے شاعر تھے ۔

بہادر شاہ ثانی متخلص بہ ظفر

خاندان مغلیہ کے آخری تاجدار مرزا ابوالمظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ اکبر شاہ ثانی کے بیٹے تھے۔ ولادت ۱۷۷۵ء میں ہوئی اور باپ کے مرنے کے بعد ۱۸۳۷ء میں تخت پر بیٹھے اور غدر کے بعد ۱۸۵۸ء میں معزول ہو کر ملک برہما میں جلا وطن کئے گئے جہاں ۱۸۶۲ء میں انتقال کیا۔ بہادر شاہ شاعری کے بڑے دلدادہ تھے اور اکثر اپنا وقت اُس میں صرف کرتے تھے۔ چونکہ سلطنت کا کام کاج کچھ نہیں تھا زیادہ تر وقت شعر گوئی میں گزرتا تھا۔ اُستاد ذوق اور مرزا غالب کو کلام دکھاتے تھے۔ مگر قبل اس کے شاہ نصیر سے بھی استفادۂ سخن کیا تھا۔ شاعری کے علاوہ فن موسیقی میں بھی ان کو اچھا دخل تھا اُنکی اکثر ٹھمریاں شمالی ہند میں بہت مقبول ہوئیں۔ خوشنویس بھی بہت اچھے تھے۔ اور اکثر اپنے ہاتھ کے لکھے ہوے قرآن شریف دلّی کی بڑی مسجدوں میں بطور ہدیہ کے بھیجتے تھے۔ اُنھوں نے ایک شرح گلستاں بھی لکھی جو ایک اچھی کتاب سمجھی جاتی ہے مگر اُنکی شہرت کی اصلی بنا اُن کے ضخیم کلیات پر ہے جو بہت مشہور ہے چار دیوان اُن کے شائع ہو چکے ہیں اُن کو لوگ بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ اُنکی غزلیں اسقدر مقبول ہیں کہ اکثر ناچ رنگ کے جلسوں میں گائی جاتی ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اِن کے اُستاد ذوق اور غالب ان کو غزلیں کہکر دے دیتے تھے۔ اور اسمیں شک نہیں کہ ظفر کی بعض غزلوں میں اِن دونوں اُستادوں کا رنگ پایا جاتا ہے مگر پھر بھی ظفر کے خود شاعر ہونے میں کوئی کلام نہیں کیونکہ اُنکی بہت سی غزلیں

اُن کے خاص رنگ کی ہیں جو ذوق وغالب سے بالکل علیحدہ ہے معلوم نہیں
کہ ظفر نے بحالت قید بھی مشغلہ شعروشاعری جاری رکھا تھا یا نہیں اغلب ہے کہ یہ دلچسپ
مشغلہ اُن سے نہ چھوٹا ہو اور کچھ اُن کا اُس زمانہ کا بھی کلام موجود ہو۔کیا تعجب ہے
کہ سعی وتلاش اس معاملہ میں آیندہ کامیاب ہو۔

ان کا طرز کلام بہت صاف اور سادہ ہے۔کلام بہت مزیدار سلیس اور فصیح
ہوتا ہے اور ایک خاص درد واثر رکھتا ہے جو اُن کے مصائب کی اصلی تصویر ہے
ظفر اکثر جگہ مشکل مشکل بحریں اور سخت ردیف وقافیہ میں بھی غزلیں کہتے تھے۔جو
بہت کچھ قابل تعریف ہیں۔ان کے خیالات بلند اور تشبیہیں رنگین اور جذبات دلنشین
ہوتے ہیں۔

اس دور میں مذکورۂ بالا شعرا کے علاوہ اور بھی شعرا گذرے ہیں جو اگرچہ
اس پایہ کے نہ تھے مگر پھر بھی مشاہیر میں اُن کا شمار کیا جاتا ہے۔مثلاً قائم۔قاسم
حسرت۔منت۔ممنون وغیرہ۔ان کے علاوہ بعض شعرائے دور سابق کا بھی کچھ حال
جو گذشتہ باب میں رہگیا تھا مختصراً یہاں درج کیا جاتا ہے۔

قائم چاندپوری شیخ قیام الدین نام تھا بڑے اعلیٰ درجہ کے شاعر خاصکر قطعات
اور رباعیات میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔چاندپور ضلع بجنور کے رہنے والے تھے۔
مگر ملازمت کے تعلق سے زیادہ حصہ دہلی میں بسر ہوا جہاں وہ داروغۂ توپخانہ
تھے۔شروع میں اپنا کلام خواجہ میر درد کو دکھاتے تھے۔بعد کو سودا کے شاگرد
ہو گئے۔اُنھوں نے ایک تذکرہ بھی لکھا ہے جو کمیاب ہے۔دلی کی تباہی کے بعد
وہ ٹانڈہ (قریب آنولہ) میں نواب محمد یار خاں کی رفاقت میں رہتے تھے۔

اسکے بعد رامپور گئے جہاں سنہ ۱۲۰۰ھ میں انتقال کیا۔ اُنکی نسبت مصحفی لکھتے ہیں
"در پختگی کلام وچستی مصراع غزل وردیہ قصیدہ و مثنوی وغیرہ موافق رواج زمانہ
دوش بدوش استاد راہ می رفت دربعضی مقام رجحان می جست" اور مرزا علی لطف
اپنے تذکرہ گلشن ہند میں یوں رقمطراز ہیں "مضمون تراشی اور معنی بندی میں معروف
سچ تو یہ ہے کہ بعد سودا اور میر کے کسی ریختہ گو کی نظم کا نہیں یہ اسلوب ہے۔
راقم آثم کو تو طور گویائی اس سخن آفریں کا نہایت مرغوب ہے"۔

منت میر قمرالدین منّت دلی کے رہنے والے ننھیالی رشتے سے سید جلال
بخاری کی اولاد سے تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے سایۂ عاطفت
میں دلی میں پرورش پائی۔ روحانی تعلیم مولانا فخرالدین رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل
کی اور مشورۂ شعروسخن میر نورالدین نوید اور میر شمس الدین فقیر سے کرتے تھے بہت
پُرگو شاعر تھے۔ ایک کلیات تخمیناً ڈیڑھ لاکھ اشعار کا اپنی یادگار چھوڑا۔ متعدد
مثنویاں تصنیف کیں جسمیں سے ایک شکرستان ہے جو شیخ سعدی کی گلستاں کے
جواب میں لکھی ہے چنانچہ فرماتے ہیں ؎

درین عمر دہ مثنوی گفتہ ام | بہ آئین طرز نوی گفتہ ام
چو اشعار من در عدد میرسد | شمار قصائد بصد میرسد
بود شعر من در غزل سی ہزار | زباں صد رباعی گرفتم شمار

دلی چھوڑ کر سنہ ۱۱۹۱ھ میں لکھنؤ آئے۔ یہاں مسٹر جانسٹن سے ملاقات ہوئی
جو اُن کو کلکتہ لے گئے اور وارن ہسٹنگز کے روبرو اُن کو پیش کیا۔
لارڈ موصوف نے خطاب ملک الشعرائی ان کو عنایت کیا۔ اِن کی مدح میں اُنکے

اکثر قصائد ہیں۔ سنہ ۱۲[illegible]ھ میں گورنر جنرل نے ایک خاص سفارت پر اُنکو حیدرآباد بھیجا وہاں پہونچ کر حضور نظام کی مدح میں اُنھوں نے قصیدہ پیش کیا جس کے صلے میں بہت انعام واکرام پایا۔ بعد واپسی حیدرآباد عظیم آباد میں مہاراجہ تکیت رائے کی مصاحبت میں چند دنوں رہ کر پھر کلکتہ کا رُخ کیا جہاں پہونچتے ہی سنہ ۱۲۰[illegible]ھ میں سفر آخرت اختیار کیا۔ نمونۂ کلام یہ ہے ؎

اِس آنے کا کچھ ہے لطف پیارے ہردم جو کہو کہ جائیں گے ہم

ولہ

آہ اب کثرت داغ غم خوباں سے مدام صفحۂ سینہ پر از جلوۂ طاؤسی ہے

ولہ

گر اس لب جاں بخش کی کچھ بات سناؤں عیسیٰ بھی جو کچھ پوچھے تو صلوٰتیں سناؤں

ممنون میر نظام الدین ممنونؔ خلف میر قمر الدین منتؔ۔ ان کے آبا و اجداد سونی پت کے رہنے والے تھے مگر ان کی ولادت دلی میں ہوئی۔ اور وہیں نشوونما پایا۔ اکبر شاہ ثانی نے ان کو فخر الشعرا کا خطاب عطا کیا اور اکثر لوگ اِن کے سلسلۂ تلمذ میں داخل ہو گئے۔

کچھ دنوں یہ اجمیر میں بحیثیت صدر الصدور کے رہے تھے۔ مگر پھر دلّی آ گئے جہاں سنہ ۱۲۶[illegible]ھ میں انتقال کیا۔ خود بھی اعلیٰ پایہ کے شاعر تھے اور شاگرد بھی نامی وگرامی چھوڑے۔ مثلاً مفتی صدر الدین خاں آزردہ وغیرہ ان کا دیوان کمیاب ہے اُس کے دیکھنے سے اُنکی قادر الکلامی کا پورا اندازہ ہوتا ہے۔

حسرت دہلوی مرزا جعفر علی نام حسرتؔ تخلّص ابو الخیر عطار کے بیٹے تھے۔

دلّی میں پیدا ہوئے اور ابتدائً عطاری کا پیشہ کرتے تھے۔شعر سے اُن کو فطری ذوق تھا اور اس فن میں اُنھوں نے کمال حاصل کیا۔جب شاہ عالم ثانی سریر آرائے سلطنت ہوئے تو حسرت بھی اور شعرا کے ساتھ دامن دولت سے وابستہ ہوگئے۔جب نمکحرام غلام قادر نے بدنصیب بادشاہ کی آنکھیں نکالیں اور اسی قسم کی دوسری زیادتیاں کرکے لوٹ مار و بیگمات شاہی کی بےحرمتی وغیرہ کا ہنگامہ برپا کیا۔ تو اس عبرتناک منظر کو اُنھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا چنانچہ اسی قیامت خیز واقعہ کی نسبت اُن کی ایک دردانگیز نظم ہے۔حسرت دِلّی چھوڑکر فیض آباد آئے جو اُس وقت اودھ کا دارالسلطنت تھا۔اپنے سفر کے مصائب اور حالات کے بیان میں اُنھوں نے ایک دلچسپ نظم لکھی ہے جسمیں سفر کی تکلیفیں، دھوپ کی شدّت، پانی کی قلّت، سست رو گاڑی کی مصیبت وغیرہ وغیرہ نہایت تفصیل سے بیان کیگئی ہیں۔فیض آباد پہونچکر اُنھوں نے نواب کے سامنے اپنا قصیدہ پڑھا اور اس کے صلے میں کچھ وظیفہ مقرر ہوگیا جب شجاع الدولہ کے بعد آصف الدولہ نواب ہوئے تو حسرت نے انکی تہنیت میں ایک دوسرا قصیدہ لکھکر اُن کے سامنے پڑھا۔ ۱۱۹۵ھ میں جب لکھنؤ دارالسلطنت ہوا تو حسرت بھی اپنے دوستوں کے اصرار سے لکھنؤ آگئے اور یہاں گھنٹا بیگ کی گڑھیا پر قیام تھا۔شاہزادہ مرزا سلیمان شکوہ کے قیام لکھنؤ کے زمانہ میں حسرت کے شاگرد رشید میاں جرأت بھی اپنے اُستاد کے پاس رہنے لگے۔ اور یہ دونوں شاگرد و اُستاد لکھنؤ کے مشاعروں میں شریک ہوکر اپنی پرکیف غزلوں پر سامعین سے خراج تحسین وصول کرتے تھے۔حسرت سب سے پہلے

مرزا احسن علیخاں بہادر کی رفاقت میں تھے اُس کے بعد پرنس جہاندار شاہ کے ملازم ہو گئے مشہور ہے کہ یہ پالکی میں سوار ہوتے تھے جو امرا کے لیے مخصوص تھی۔ اس سے ان کے ہم پیشہ ساتھیوں کو بہت رشک ہوا اور اُنھوں نے اِن کے چڑھانے کے لیئے بہت سی ہجویں کہیں اور تمسخر کے اشعار لکھے۔ سودا نے بھی اسمیں حصہ لیا خود حسرت نے ایک لکھنؤ کے حکیم کی ہجو لکھی ہے جسمیں اُسکے پیشہ اور قابلیت پر حملہ کیا ہے اُن کو شاہزادہ سلیمان شکوہ بھی کچھ درماہہ دیتے تھے۔ وہ رلے سرب سنگھ دیوانہ کے شاگرد تھے اور خود ان کے بھی شاگرد بکثرت تھے چنانچہ میر حسن تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ "کثرت شاگردانش چنان ست کہ درصورت شناسی خود ہم حیران ست"۔ ان سب میں جرأت اور نواب محبت خاں محبت بہت نامور شاعر ہوے ہیں۔ مشہور ہے کہ وفات ۱۲۱۷ھ میں ہوئی اور لکھنؤ میں مدفون ہوئے تصنیفات میں ایک کلیات ہے جس میں ساقی نامہ، مثنوی، واسوخت، ترجیع بند، ترکیب بند، مسدس، مخمس، قصیدے، رباعیاں، اور دو دیوان غزلوں کے ہیں غرض کہ اصناف سخن میں سے ہر قسم کے نمونے اُس میں پائے جاتے ہیں۔ خاص انداز یہ بھی ہے کہ وہ غزل کو اکثر قطعہ پر ختم کرتے ہیں اور اکثر مسلسل غزل ایک ہی مضمون پر لکھتے ہیں۔

قدرت

شاہ قدرت اللہ قدرت میر شمس الدین فقیر کے برادر عمزاد تھے اور کوئی عجب نہیں کہ اُن کے شاگرد بھی ہوں۔ نساخ اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں کہ مرزا مظہر جانجاناں اور جعفر علی حسرت کے شاگرد تھے ۱۲۰۵ھ میں مرشدآباد میں انتقال کیا۔ میر اُن کی نسبت کوئی اچھی رائے نہیں رکھتے اور اُن کو "عاجز سخن" لکھا ہے مگر میر حسن نے اُن کے کلام کی بہت تعریف کی ہے لکھتے ہیں "سمند نظمش درمیدان فارسی و ہندی

چالاک وجست دتصویر بے نظیر معانیش در استخواں بندی الفاظ درست بندہ ویرا یک بار در مشاعرہ بہ لکھنؤ دیدہ ام"۔ اسی طرح مرزا علی لطف بھی اُن کے بہت مداح ہیں چند اشعار بطور نمونہ ہدیۂ ناظرین ہیں ؎

ہنگامۂ پرہیز و ورع اب بسر آیا ۔۔۔ اے بادہ کشو مژدہ کہ پھر ابر تر آیا
کچھ دیر ہوئی اشک نہیں آنکھوں سے گرتے ۔۔۔ شاید تہِ مژگاں کوئی لخت جگر آیا

ولہ

مجھ کو غفلت نے خبر ایام فرصت کی نہ دی ۔۔۔ آہ جب جاتے رہے دن تب میں پچھتانے لگا

ولہ

سینہ اُس کا ہے دل اُس کا ہے جگر اُس کا ہے ۔۔۔ تیر بیداد جدھر رُخ کرے گھر اُس کا ہے

ولہ

ایک ہی پردے کے گر سمجھو تو یہ سب ہیں الاپ ۔۔۔ گر صدائے چنگ ہے یا نغمۂ ناقوس ہے
صبر و طاقت تو کبھی کے کوچ یاں سے کر گئے ۔۔۔ اب وداعِ ننگ ہے اور رخصتِ ناموس ہے
کل ہوس اس طرح سے ترغیب دیتی تھی مجھے ۔۔۔ کیا ہی ملکِ روم ہے کیا سرزمینِ روس ہے
گر میسر ہو تو کس عشرت سے کیجے زندگی ۔۔۔ اس طرف آوازِ طبل اودھر صدائے کوس ہے
صبح سے تا شام چلتا ہوئے گلگوں کا دور ۔۔۔ شب ہوئی تو ماہرویوں سے کنار و بوس ہے
سنتے ہی عبرت یہ بولی اک تماشہ میں تجھے ۔۔۔ چل دکھاؤں کیا تو اپنی آز کا محبوس ہے
لیگئی اکبارگی گورِ غریباں کی طرف ۔۔۔ جس جگہ جانِ تمنا سو طرح مایوس ہے
مرقدیں دو تین دکھلا کر لگی کہنے مجھے ۔۔۔ یہ سکندر ہے یہ دارا ہے یہ کیکاؤس ہے
پوچھ تو ان سے کہ جاہ و حکمت دنیا سے آج ۔۔۔ کچھ بھی ان کے ہاتھ غیر از حسرت و افسوس ہے

کل تو قدرت پائے خم رکھتے تھے تسبیح ریا
آج رہن جام مے یہ فرقۂ سالوس ہے

بیدار — میر محمد علی عرف میر محمدی متخلص بہ بیدار خواجہ میر درد کے دوست اور شاگرد بھی تھے۔ فارسی میں مرتضیٰ قلی خاں فراق سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ شاہ حاتم کو بھی کلام دکھایا تھا۔ مولانا فخرالدین علیہ الرحمۃ کے مریدوں میں تھے۔ آخر عمر میں دلّی سے آگرہ چلے گئے جہاں ۱۲۰۹ھ مطابق ۱۷۹۴ء میں انتقال کیا اور وہیں مدفون ہوئے۔ میر و مرزا کے ہمعصر تھے۔ دو دیوان اپنی یادگار چھوڑے۔ ان کے کلام میں صفائی کے ساتھ تصوف کا رنگ بھی اچھا خاصہ ہے۔ دو چار شعر نمونہ کے دیے جاتے ہیں ؎

ہم خاک بھی ہو گئے ولیکن — جی سے نہ ترے غبار نکلا

ولہ

ترے رخسار و قد و چشم کے ہیں عاشق زار — گل جدا، سرو جدا، نرگسِ بیمار جدا

ولہ

بیدار راہ عشق کسی سے نہ طے ہوئی — صحرا میں قیس، کوہ میں فرہاد رہ گیا

ولہ

چھوڑ کر کوئے بتاں جاتا ہے تو کعبہ کو — جلد پھر یو تجھے بیدار خدا کو سونپا

ولہ

ربط جو چاہیے بیدار سو اُس سے معلوم — مگر اتنا کہ ملاقات چلی جاتی ہے

ہدایت — ہدایت اللہ خاں دہلوی خواجہ میر درد کے مریدوں اور شاگردوں میں تھے ۱۲۱۵ھ میں انتقال کیا صاحب دیوان ہیں۔ اور بقول مرزا علی لطف ایک مثنوی بنارس کی تعریف میں بھی خوب لکھی ہے۔ میر تقی میر اور میر حسن دونوں ان کے کمالات شاعری کے معترف ہیں۔

فراق — حکیم ثناء اللہ خاں متخلص بہ فراق ہدایت اللہ خاں ہدایت مذکورۂ بالا کے بھتیجے تھے۔ کسب سخن اور کسب باطن خواجہ میر درد سے کرتے تھے مشاہیر عصر میں سے تھے اور دلّی کے بہت نامور حکیم سمجھے جاتے تھے مصحفی اور میر حسن نے اُن کا ذکر خیر بہت اچھے لفظوں میں کیا ہے۔ میر حسن اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ میرے سامنے اُنھوں نے تحصیل طب کی اور جب میں شاہجہاں آباد میں تھا تو مجھ سے اور اُن سے مراسم دوستی و محبت بہت تھے۔

ضیا — میر ضیاء الدین ضیا دہلوی سودا کے معاصر تھے۔ دلّی سے فیض آباد اور لکھنؤ آئے اور یہاں سے عظیم آباد گئے جہاں مہاراجہ شتاب رائے کے بیٹے راجہ بہادر متخلص بہ راجہ اُن کے شاگرد ہو گئے پٹنے ہی میں انتقال کیا میر حسن اور مرزا علی لطف ان کے کلام کے معترف ہیں اور آخر الذکر اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں "اکثر شعر در زمین سنگلاخ گفتن و الفاظ نامعقول را مقبول دلہا ساختن کار اوست"۔ میر حسن ابتدا میں انھیں کے شاگرد تھے ان کو قصیدے اور مثنوی وغیرہ سے شوق نہ تھا صرف غزل کو پسند کرتے تھے جیسا کہ میر حسن کے بیان سے معلوم ہوتا ہے سنگلاخ زمینوں میں کہنے کا شوق تھا نمونۂ کلام یہ ہے۔

رسوائیوں کی اپنے مجھے کچھ ہوس نہیں — ناصح یہ کیا کروں کہ مرا دل پہ بس نہیں

کسی دشمن کی بھی یارب نہ گذرے شبِ جدائی کی
کہ جیسے اُس سے میرے وصل کا اک دن گذرتا ہے

ولہ

رازِ دل ہیں پوچھتے اور بولنے دیتے نہیں
بات منھ پر آرہی ہے اور لب ہلانا منع ہے

ولہ

اے آہ بچ نکل نہ کہیں دل چھلک پڑے
یہ جام بھر رہا ہے مبادا چھلک پڑے

ولہ

کون سے زخم کا کھلا ٹانکا
آج پھر دل میں درد ہوتا ہے

صاف تھا جبتک تو ہم کو بھی جوابِ صاف تھا
اب جو خط آنے لگا شاید کہ خط آنے لگا

کل کی رُسوائی تجھے کچھ کم نہ تھی اے ننگِ خلق
اُس کے کوچہ میں ضیا تو آج پھر جانے لگا

بقا — شیخ بقاء اللہ اکبر آبادی حافظ لطف اللہ خوشنویس کے بیٹے تھے دلی میں پیدا ہوئے مگر لکھنؤ میں توطن اختیار کیا۔ فارسی میں مرزا فاخر مکین اور اردو میں شاہ حاتم اور خواجہ میر درد کے شاگرد تھے۔ فارسی میں حزیں اور اردو میں بقا تخلص کرتے تھے۔ جو اپنے استاد شاہ حاتم کے کہنے سے رکھا تھا میر و سودا دونوں کو خاطر میں نہ لاتے تھے اور ان دونوں سے اور ان سے اکثر چوٹیں چلتی تھیں چنانچہ جب ان کے دو آبہ کا مضمون میر صاحب نے بھی باندھا تو انھوں نے جل کر کہا ؎

میر نے گر ترا مضمون دو آبے کا لیا
اے بقا تو بھی دُعا دے جو دعا دینی ہو

یا خدا میر کی آنکھوں کو دو آبہ کر دے
اور بینی کا یہ عالم ہو کہ تر بینی ہو

اِک اور موقع پر میر صاحب کی اس طرح خبر لیتے ہیں ؎

پگڑی اپنی سنبھالئے گا میر
اور بستی نہیں یہ دِلّی ہے

ایک جگہ میر و مرزا کی شاعری کا فرق اپنے مذاق اور ٹھٹول میں اس طرح دکھایا ہے ؎

میر و مرزا کی شعر خوانی نے
بسکہ عالم میں دھوم ڈالی تھی

کھول دیوان دونوں صاحب کے
اے بقا ہم نے جب زیارت کی

کچھ نہ پایا سوائے اس کے سخن
ایک تو تو کہے ہے اِک ہی ہی

یعنی ایک کے کلام میں روکھی پھیکی اخلاق آموزی ہے اور دوسرے کے یہاں محض ظرافت و تمسخر۔ مفلسی سے تنگ آکر تسخیر کواکب کے اعمال کا شوق کیا تھا اُس سے اُن کا دماغ خراب ہو گیا آخرکار ہر طرف سے مجبور ہو کر سنہ ۱۲۰۷ھ میں عتبات عالیات کی زیارت کو چلے مگر راستے ہی میں انتقال کیا۔ اپنے زمانہ کے مشہور شاعروں میں تھے صاحب دیوان ہیں۔

حزیں میر محمد باقر حزیں مرزا مظہر جانجاناں کے ممتاز شاگردوں میں تھے۔ بزرگ اُستاد سے بہت حسن عقیدت اور محبت رکھتے تھے چنانچہ ایک جگہ کہتے ہیں ؎

جس طرح جی چاہتا ہے ہو نہیں سکتی حزیں
حضرتِ اُستاد یعنی شاہ مظہر کی ثنا

مصائب روزگار سے تنگ آکر دِلّی سے پٹنہ عظیم آباد پہونچے۔ وہاں نواب صولت جنگ نے ان کی بڑی قدر دانی کی۔ ایک دیوان یادگار ہے جسمیں قصائد اور غزلیں ردیف وار موجود ہیں دو تین شعر بطور نمونہ کے یہاں دیے جاتے ہیں۔

کچھ کہا شاید اُسنے قاصد سے
دل میں میرے وہ اضطراب نہیں

حال اے قاصد مرا جو کچھ کہ تو جانا ہے کچھ
اس طرح سے اُس سے مت کہیو کہ وہ محجوب ہے

ہر نصیحت میں تری مانونگا ای ناصح پر ایک — دلبروں کے دیکھنے میں جی مرا نا چاہئیں

بیان خواجہ احسن اللہ کشمیری النسل تھے اور دلّی میں پیدا ہوے مرزا مظہر جانجانان کے شاگرد اور مولانا فخر الدین کے مرید تھے۔ آخر عمر میں حیدر آباد گئے اور نواب صفی ثانی کی ملازمت میں زندگی عزت سے بسر کی ۱۲۱۳ھ میں وفات پائی اور حیدر آباد ہی میں مدفون ہوے۔ ان کی وفات کی تاریخ ہے "اُستاد از جہاں رفت" میر حسن اپنے تذکرہ میں ان کے بڑے معرف ہیں لکھتے ہیں "شاعر عذب البیان از خوش گویان زمان خواجہ احسن اللہ المتخلص بہ بیان از تلامذۂ مرزا مظہر جانجانان .... ترجیع نامہ از و مشہورست بسیار خوب گفتہ رباعیات دلپذیر دارد" نمونہ کلام یہ ہے۔

کوئی کسی کا بیان آشنا نہیں دیکھا — سوائے اسکے ان آنکھوں نے کیا نہیں دیکھا

مصلحت ترک عشق ہے ناصح — لیک یہ ہم سے ہو نہیں سکتا

کہتا نہیں ہیں عرش پہ ای نالہ جا پہنچ — کانوں تلک تو اُسکے تو ای نارسا پہنچ

عرش تک جاتی تھی اب لب تک بھی آسکتی نہیں
رحم آتا ہے بیان اب مجھ کو اپنی آہ پر

صاف مُنھ پر میں نہیں کہتا کہ ہوگا اِس کے پاس
ورنہ کیا واقف نہیں ہیں دل ہے میرا جس کے پاس

کافر ہوں گر زیادہ کچھ اس سے آرزو ہو — اِک بیخلل مکاں ہو بس میں ہوں اور تو ہو

وصل کی شب کا ماجرا کیا کہوں تمسے شیر — شام سے لیکے صبح تک وہ ہی نہیں نہیں رہی

بیان کون ہے اب تلک پوچھتے ہو — تغافل کے قربان تجاہل کے صدقے

جادو تھی کہ سحر تھی بلا تھی — ظالم یہ تری نگاہ کیا تھی

راسخ شیخ غلام علی راسخ شاگردِ میر سنہ ۱۱۶۲ھ میں پٹنہ عظیم آباد میں پیدا ہوئے۔
شروع میں مرزا فدوی اور مرزا آشر کو کلام دکھاتے تھے مگر آخر میں باقاعدہ طور پر
میر تقی میر کے شاگرد ہو گئے تھے اور میر صاحب اِن کا بڑا خیال کرتے تھے۔
سنہ ۱۲۲۱ھ تک کلکتہ، غازی پور، دِلّی، لکھنؤ کی سیاحت میں مصروف رہے۔
اس کے بعد اپنے وطن مالوف کو واپس آئے اور شعر و شاعری کا مشغلہ وہاں
بہت زور و شور سے شروع کر دیا۔ چہتر برس کی عمر پا کر سنہ ۱۲۳۸ یا سنہ ۱۲۴۰ھ میں
وفات پائی۔ زبان پاکیزہ اور طرزِ بیان صاف و سادہ ہے۔ سادہ اشعار کے ساتھ
رنگین شعر بھی بہت مِلتے ہیں جب لکھنؤ میں تھے تو نواب آصف الدولہ اور غازی الدین حیدر
کی تعریف میں قصیدے بھی کہے تھے۔

اساتذہ لکھنؤ

ناسخ و آتش کا زمانہ

مرکز شاعری لکھنؤ میں منتقل ہوتا ہے

شاعری کا مرکز ترقی دلّی سے ہٹ کر اب لکھنؤ میں آگیا۔ اس کے اسباب مختصراً یہ تھے کہ سلطنت مغلیہ کے آخری فرمانروا بہت کمزور اور محض نام کے بادشاہ رہ گئے تھے۔ سب سے پہلا حملہ جس نے قصر سلطنت کو متزلزل کر دیا نادر شاہ کا تھا جس سے شیرازۂ حکومت بکھر گیا اور درختِ اقبال کی جڑیں کمزور ہو گئیں۔ نادر شاہ کے حملے کی تباہی اور بربادی سے ابھی سلطنت نہیں سنبھلی تھی کہ احمد شاہ دُرّانی اور مرہٹوں کی قتل و غارت نے لوگوں کی جان و مال کو اور زیادہ غیر محفوظ کر دیا۔ شاہ عالم ثانی بدبخت اور نمک حرام غلام قادر کے مظالم کا نشانہ بنے جس نے ایسے نیک دل اور فرشتہ سیرت بادشاہ کی آنکھیں نکال ڈالیں اور اُن کو قید کر لیا۔ ستم رسیدہ بادشاہ نے اپنی اس مصیبت و پریشانی کی حالت میں سیندھیا اور انگریزوں سے مدد چاہی چنانچہ اُن کے اُس دردناک قصیدے کے جو اس مصیبت کے وقت میں لکھا تھا چند اشعار یہ ہیں ۱؎

شاہ تیمور[۱] کہ دارد نسبت با من — زود باشد کہ بیاید بمددگاریٔ ما

۱؎ تیمور شاہ والی کابل ان کے بہنوئی تھے ۱۲۔

مادھوجی سیندھیا فرزند جگر بند من ست | ہست مصروف تلافی ستمگاری ما
راجۂ و راؤ زمیندار و امیر و چہ فقیر | حیف باشد کہ نسازند بہ غمخواری ما
آصف الدولۂ و انگریز کہ دستور من اند | چہ عجب گر بنمایند مددگاری ما

اس کے ساتھ ہی ساتھ ملک کے امرائے دولت بھی اپنے باہمی رشک و حسد اور فساد و عناد سے باز نہیں آتے تھے۔ اس عام بدامنی کا یہ نتیجہ ہوا کہ لوگ اپنا وطن چھوڑ چھوڑ کر بھاگنے لگے وہ شاعر جو سلطنت کے دامن دولت سے وابستہ تھے مثلاً میرؔ، سوداؔ، میر حسنؔ، انشاؔ وغیرہ انھوں نے بھی دلی چھوڑ کر لکھنؤ کا رُخ کیا جو اُس وقت ان کا قدر شناس اور ان کے واسطے دولت خیز خطہ تھا اور علم کی قدر دانی میں دربار دہلی کے قدم بقدم چلنا چاہتا تھا۔ اس طور پر دلی کا نقصان لکھنؤ کا نفع ثابت ہوا۔ شعرائے دلی کو اہل لکھنؤ نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اُن کے ساتھ نہایت اخلاق و محبت سے پیش آئے سلطنت کی طرف سے ان کے واسطے جاگیریں و وظائف انعام و اکرام مرحمت ہوئے۔ اور ان کی نازک مزاجیاں اور بد دماغیاں تک بہت کشادہ پیشانی سے برداشت کی جاتی تھیں۔ بلکہ اکثر انھیں صفات کی تعریف کی جاتی تھی سلسلۂ روابط کو اور زیادہ مضبوط کرنے کے لیے نوابان عہد اور اُمرائے وقت نے اکثر شعرا کو اپنے دامن دولت سے وابستہ کر لیا اور اُن کو اپنا رفیق و مصاحب بنا لیا۔ مگر سچ پوچھیے تو یہی ربط و ضبط اور دربار کا تعلق بالآخر شاعری کے حق میں سم قاتل ثابت ہوا۔ شروع میں جب کہ سرمایہ داران شعر آزاد مزاج اور خود دار ہوتے تھے تو اس میل جول سے کوئی نقصان نہیں ہوا بلکہ اس نے شاعری اور زبان کی ترقی میں بہت مدد دی۔ مگر ما بعد کے زمانہ میں جبکہ

شعرا اپنی عزت و آبرو کا بھی کچھ خیال نہیں کرتے تھے اور اپنے کلام کو اپنے
عیش پرست مالکوں کے رنگ میں رنگنا چاہتے تھے اس سے بہت برے نتائج
سرزد ہوئے مرتبۂ شاعری پست ہو گیا شعرا نے اپنے ہاتھوں خود کو ذلیل کر لیا۔
مثال کے لئے میر و سودا۔ اور انشا و مصحفی کی حالت پر نظر کرو اول الذکر دونوں
اصحاب گو کہ سلطنت کے وظیفہ خوار تھے مگر نہایت بلند اور آزاد طبیعت رکھتے
تھے۔ وہ کبھی اپنے اشعار میں کسی کی دست اندازی یا کسی خاص
رنگ کی پیروی جو ان کی طبیعت کے خلاف ہوتی گوارا نہیں
کرتے تھے برعکس اس کے مؤخر الذکر دونوں بزرگ دربارداری کے اثر سے
متأثر ہو گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاعری بجائے الہامی ہونے کے محض رسمی اور
تکلفات کی رہ گئی۔

لکھنؤ کا طرز شاعری

اس میں کوئی شک نہیں کہ لکھنؤ میں چراغ شاعری دلی والوں نے
روشن کیا۔ اور شاعری کا مذاق یہاں انھوں نے پھیلایا ان لوگوں کے آنے سے
پہلے مشہور مقامی شاعر یہاں کوئی نہیں تھے۔ لکھنؤ کے مستقر الخلافت ہو جانے
اور شعرائے دہلی کے یہاں بکثرت آجانے سے یہاں مذاق شاعری بہت پھیل گیا
اور شاعری کو بہت ترقی ہوئی۔ بادشاہ بڑے ذوق و شوق سے شاعروں کو
اپنی مصاحبت میں جگہ دیتے تھے۔ سودا کے بلائے جانے کا واقعہ مشہور ہے
کہ نواب شجاع الدولہ نے ان کو طلب کیا اور ایک خوبصورت حیلہ سے انھوں نے
اس کو ٹال دیا[1]۔ شعر کا اتنا چرچا پھیلا کہ جا بجا مشاعرے ہونے لگے۔ امرا اور
رؤسا اور نیز عوام الناس بھی شاعری کے دیوانے تھے عمدہ اشعار پڑھکر اور

[1] دیکھو صفحات ۱۲۸ و ۱۲۹۔

سُن کر لوٹ جاتے تھے مشاعروں کی محفلیں ماہوار اور ہفتہ وار سے ترقی کر کے اکثر جگہ روزانہ ہوتی تھیں جس میں شعرا اپنی اپنی عمدہ غزلیں پڑھتے تھے اور سامعین کی تعریف سے اُن کے دل بڑھتے تھے۔ اس مقابلہ سے یہ فائدہ ضرور تھا کہ علاوہ کلام کی کثرت کے لوگ ایک دوسرے پر فوقیت لیجانے کی کوشش کرتے تھے اور یہی فوقیت اور سرسبزی کا خیال لوگوں کے لئے مایۂ ناز تھا۔ اسی کثرت شوق نے ایک نئے اسکول کی بنیاد ڈالی جو بالکل مقامی تھا۔ دونوں اسکولوں کی نوعیت میں کوئی اہم اور اصولی فرق نہیں ہے مگر مضامین منتخب میں پسند طبع کے نمونے جُدا جُدا ہیں اور اسلوب بیان میں بھی فرق ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو جدت پسند طبائع نے قدامت پرستی سے گھبرا کر اپنے نام و نمود اور نُدرت کے خیال سے نئی نئی راہیں نکالیں۔ اور شعرائے دہلی کی قدیم شاہراہ کو چھوڑ دیا۔ ناسخ اس طرز جدید کے پیشوائے اعظم ہیں اور اُن کے بعض مشہور شاگرد بھی اُن کے قدم بقدم چل کر کامیاب ہوئے یہاں تک کہ زمانۂ موجودہ میں وہ طرز خاص نامقبول ٹھہری اور اب شاعری نے ایک جدید روش اختیار کی۔

طرز دہلی اور طرز لکھنؤ کا فرق اور اُن کا تقابل

طرز دہلی کی خصوصیت یہ ہے کہ اُس میں جذبات کی تصویر سادہ اور پر اثر الفاظ میں کھینچی جاتی ہے۔ تخیل اور جذبات پر رعایت لفظی کو مقدم سمجھتے ہیں۔ ناسخ اور اُن کے متبعین نے برخلاف اس کے اپنی تمام تر توجہ شعر کے حسن ظاہری اور رعایت لفظی اور صنایع بدایع پر صرف کر دی یعنی الفاظ کی مصوری ایک بُرے اسلوب سے کی۔ شکوہ الفاظ پر بلند خیالی اور مصوری جذبات کو قربان کر دیا۔ الفاظ میں صرف وہی لفظ

منتخب کئے جو کسی پہلو سے مراعات النظیر میں شامل ہو سکتے تھے مثلاً اگر کسی باغ کا منظر دکھانا ہوتا تو باغ ہی کی رعایت کے الفاظ استعمال کیے جاتے۔ دوسرے الفاظ گو کتنے ہی مناسب اور موزوں ہوتے مگر ان کو جگہ نہ ملتی اور سختی کے ساتھ ان کو برطرف کر دیا جاتا۔ اس رعایت لفظی کی بے انتہا پاسداری کا یہ اثر ہوا کہ شعر سے سادگی اور بے تکلفی جاتی رہی اور تکلف اور تصنع کی بھرمار ہو گئی ایسے الفاظ ڈھونڈھے جانے لگے جو مضمون سے کسی نہ کسی جہت سے ظاہری تعلق رکھتے ہوں گو دیگر وجوہ سے وہ کیسے ہی نامناسب اور بے موقع ہوں۔ گویا محض رعایت لفظی شعر کی خوبی اور عمدگی کا دارمدار رہ گئی۔ اور الفاظ کے قربانگاہ پر درد، واثر، جذبات، سادگی، سلاست، فصاحت، بلاغت وغیرہ سب بھینٹ چڑھا دی گئیں۔ اور اس کمی کو اغراق، غلو۔ اور دور از کار تشبیہوں نے پورا کیا۔ اس طرز میں کیفیات اور صحیح جذبات کی نازک تحلیل نہیں ہوتی۔ اور وہ روح کے اہتزاز کی پوری پوری ترجمانی نہیں کرتی۔ اُس میں شعر الفاظ رنگین کا محض ایک خوشنما گھروندا ہوتا ہے جو نظروں کو اچھا معلوم ہوتا ہے مگر کبھی دلکش نہیں ہوتا۔ ایسے لوگوں کے پیش نظر صائب اور بیدل کا کلام تھا جس کا مطالعہ اُنھوں نے غور سے کیا تھا۔ صائب کی طرح مثال دوسرے مصرع میں پیش ہوتی تھی اور دعوے پہلے میں کیا جاتا تھا۔ یہ مثالیں کہیں کہیں تو عمدہ اور دلچسپ ہوتی ہیں مگر بسا اوقات بالکل معمولی اور بے مزہ۔ بیدل کی تتبع میں نازک اور باریک تشبیہوں اور نازک خیالیوں سے کام لیا گیا مگر اُردو میں آکر وہ محض نقل ہو گئیں اور گورکھ دھندا بن گئیں۔ اس قسم کی بے قابو تخیئل پُرانے شعر اکے یہاں نہیں پائی جاتی۔ لکھنؤ کا طرز شاعری ناغ کو تو

متوجہ کرتا ہے مگر دل پر کوئی اثر نہیں کرتا۔ ایسے کلام کی صورت ظاہری بہت اچھی ہوتی ہے اور اُس کا وہی حال ہے جیسا کہ انگریزی میں پوپ[1] اور اُس کے متبعین کی شاعری کا ہے جسمیں سراسر تکلف اور تصنع ہے اور اصلیت اور درد واثر مطلق نہیں جس سے گو دماغ لطف اندوز ہوتا ہے مگر دل کوئی فائدہ نہیں اُٹھاتا شعر گوئی کی زحمت کے مقابلہ میں ایسے اشعار کا نتیجہ بالکل بے حقیقت ہوتا ہے پہلے پہلے تو تبدیل ذائقہ کے طور پر اس قسم کے اشعار اچھے معلوم ہوئے مگر جدت پسند طبیعتیں اُن سے گھبرا گئیں کیونکہ معمولی کاریگروں کے ہاتھ میں شاعری تمسخر انگیز ہوگئی۔ بیہودہ اشعار کی کثرت سے لوگوں کا دل پھر گیا اور اب وہ انیس و دبیر کی جادو نگاری اور غالب و مومن کی مضمون آفرینی سے لطف اندوز ہونے لگے۔
ہر دور کی شاعری اُس وقت کا آئینہ ہوتی ہے یہی حال لکھنؤ کی بھی شاعری کا ہے۔ ناسخ اور اُن کے شاگردوں کا کلام اُس زمانہ کی نسوانیت کا پتہ دیتا ہے اُنکی غزلوں سے اُس زمانہ کے زنانہ لباس اور زیور اور آرائش کی ایک مکمل فہرست مرتب ہوسکتی ہے۔ کبھی کبھی اُن کے کلام سے زنانہ گفتگو مترشح ہوتی ہے جو دِلّی والوں کے یہاں نہیں ہے۔ دِلّی والے فارسی کے انداز میں چھوٹی چھوٹی غزلیں کہتے اور پامال اور فرسودہ خیالات سے بہت بچتے تھے۔ بخلاف اس کے شعرائے لکھنؤ ایک ایک زمین میں چو غزلے اور پنج غزلے کہتے تھے اور یہ خراب رسم مصحفی اور جرأت کی نکالی ہوئی تھی۔ اسی کثرت کی وجہ سے اکثر اوقات شعر میں بدمزگی اور بے لطفی اور کبھی کبھی ابتذال پیدا ہوجاتا ہے۔

تحقیق الفاظ و رعایت لفظی کا زمانہ اس زمانہ میں اور نیز اس کے بعد کے زمانہ میں تحقیق الفاظ

درعایت لفظی کا بہت خیال رکھا جاتا تھا جسکی ابتدا شیخ ناسخ نے کی اور اُن کے شاگردوں کی کوششوں سے یہ رنگ لکھنؤ اور رام پور میں پھیل گیا یہی لوگ اصطلاح میں زباندان کہلاتے ہیں۔ رشک، بحر، سحر، منیر، جلال، برق، واجد علی شاہ اختر اسیر وغیرہ یہ سب لوگ مناسب الفاظ کے انتخاب میں نہایت جانفشانی کرتے تھے اور ہمیشہ خیال رکھتے تھے کہ صحیح الفاظ و محاورے اشعار میں استعمال کیے جائیں۔ ہندی الفاظ اور محاورات کے صحیح استعمال میں بھی یہی لوگ سند سمجھے جاتے تھے۔

اس چھان بین اور دقت نظر کا یہ نتیجہ ہوا کہ بہت سے الفاظ خارج کردیے گئے اور لغات شعریہ بہت کم رہ گئے۔ اسی وجہ سے زبان میں ایک کرختگی پیدا ہوگئی۔ کیونکہ جو الفاظ و محاورات منتخب شدہ تھے وہ صرف مقرر کردہ طریقہ پر استعمال کیے جا سکتے تھے اور مقرر کردہ قواعد کی خلاف ورزی معیوب سمجھی جاتی تھی۔

اِس جدید طرز لکھنؤ نے زبان میں بھی بعض اختلافات پیدا کردیے۔ لکھنؤ کے شعرا اور عوام الناس نے بعض الفاظ و محاورات کو خاص خاص محل پر استعمال کرنا شروع کیا اور اُن کا یہ دعوی ہے کہ یہ استعمال دہلی کے طریقۂ استعمال سے بہتر اور موزوں تر ہے۔ نیز یہ کہ اُن کے پسند کردہ الفاظ و محاورات زیادہ تر لطیف و فصیح ہوتے ہیں۔ یہ اختلاف بڑھتے بڑھتے زبان کی صرف و نحو تک پہونچ گیا اور تذکیر و تانیث میں فرق کیا جانے لگا۔ یعنی بعض الفاظ جو اہل لکھنؤ کے نزدیک مذکر ہیں وہ دہلی میں مؤنث بولے جاتے ہیں۔ اور بعض جو وہاں مؤنث ہیں وہ یہاں مذکر بولے جاتے ہیں۔ یہ اختلاف جو بہت زیادہ اہم نہیں ہے اور صرف چند الفاظ تک محدود ہے اسکی ابتدا امیر علی اوسط رشک شاگرد ناسخ نے کی تھی۔ اُن کے بعد سے

یہ قضیہ ابتک چلا آتا ہے اور ان دونوں مقاموں کے شاعر اب بھی اس فرق کا بہت خیال رکھتے ہیں۔

شیخ امام بخش ناسخ
متوفی سنہ ۱۲۵۴ھ
مطابق سنہ ۱۸۳۸ء

شیخ امام بخش متخلص ناسخ زبان اردو کے بہت بڑے شاعر اور طرز لکھنؤ کے موجد تھے۔ ان کے خاندانی حالات صحیح طور پر نہیں معلوم ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایک شخص مسمّی خدا بخش خیمہ دوز نے جو لاہور کا ایک دولتمند سوداگر تھا اور کوئی اولاد نہیں رکھتا تھا ان کو متبنیٰ کر لیا تھا اُس نے ان کو بہت اچھی تعلیم دی اور مثل اپنی اولاد کے اِن سے محبت کرتا تھا۔ اُس کے مرنے کے بعد اُس کے بھائیوں نے وراثت کا جھگڑا کیا اور ناسخ کی تبنیت کو غلط ٹھہرا کر اِن کو اپنے بھائی کا غلام بتایا رفتہ رفتہ کچھ مصالحت کی صورت پیدا ہوئی اور اسی اثنا میں ناسخ کو زہر دینے کی تدبیر کی گئی مگر وہ کارگر نہوئی۔ یہ معاملہ بالآخر عدالت میں پہونچا جہاں سے ناسخ کے حق میں فیصلہ ہوا۔ ان کے دیوان کی چند رباعیوں میں ان واقعات کی طرف حوالہ ہے مثلاً

(۱)

مشہور ہے گرچہ افترائے اعمام | پر کرتے نہیں غور خواص اور عوام
وارث ہونا دلیل فرزندی ہے | میراث نہ پا سکا کہیں کوئی غلام

(۲)

کہتے رہے اعمام عداوت سے غلام | میراث پدر پائی مگر میں نے تمام
اس دعوے باطل سے ستمگاروں کو | حاصل یہ ہوا کر گئے مجھ کو بدنام

فارسی اور عربی کی درسیات انھوں نے حافظ وارث علی اور علمائے فرنگی محل سے پڑھیں

جو لکھنؤ میں ایک بہت بڑا تعلیمی مرکز ہے۔ وثوق کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ شاعری میں انکو کس سے تلمذ تھا۔ مشہور ہے کہ ایک مرتبہ وہ میر کے پاس بغرض شاگردی گئے تھے مگر اُنھوں نے انکار کر دیا۔ یہ بات کسی قدر اعتبار سے مصحفی کی سند سے کہی جا سکتی ہے کہ ناسخ تنہا سے اصلاح سخن لیتے تھے جو مصحفی کے شاگرد تھے مگر یہ تعلق زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہا وہ اپنی ہی طبیعت پر زور دیتے تھے اور مشاعرہ کی غزلوں سے جو جو مزاولت بڑھتی جاتی تھی اوسیقدر ان کو کلام پر قدرت حاصل ہوتی جاتی تھی۔ بالآخر اُستاد مانے جانے لگے اور خود بیسیوں شاگردوں کی غزلوں پر اصلاح دینے لگے جنمیں سے اکثر مرتبہ کلام میں اُن سے کم نہیں ہیں۔ ناسخ کو ورزش کا بہت شوق تھا۔ بڑے تن و توش کے اور قوی ہیکل آدمی تھے اور کھاتے بہت تھے۔ شادی نہیں کی تھی۔ دن میں صرف ایک مرتبہ کھاتے تھے مگر اُس وقت تقریباً پانچ سیر غذا نوش جان کر لیتے تھے۔ رنگ سیاہ تھا اسی وجہ سے اُن کے حریف اور با مذاق لوگ دُم کٹے بھینسے کی پھبتی کہتے تھے۔ روزانہ معمول یہ تھا کہ صبح سویرے اُٹھتے ورزش سے فراغت کر کے نہاتے پھر اپنے شاگردوں اور دوستوں سے ملتے۔ اُسکے بعد قریب بارہ بجے کے کھانا کھاتے اور تھوڑی دیر آرام کرتے۔ سہ پہر کو پھر وہی شاگرد اور احباب جمع ہوتے اور شعر و شاعری کا چرچا ہوتا۔ رات کو فکر سخن کرتے جس میں اپنی غزلیں بھی کہتے اور شاگردوں کی غزلوں پر اصلاح بھی دیتے۔ بہت بڑے صاحب وضع تھے اور اسی پاسداری وضع کو دوسروں سے بھی چاہتے تھے جو ان سے ملنے آتے تھے۔ ان کی صحبت اور باتوں میں بڑی کشش تھی اسواسطے کہ باوجود شاعرانہ بد دماغی اور آزاد مزاجی کے لوگ کثرت سے ملنے آتے تھے جن میں اکثر لکھنؤ کے بڑے بڑے امرا اور رئیس ہوتے تھے۔ خود کبھی

کسی کی ملازمت نہیں کی اور اپنے قدردانوں کی قدرشناسی اور فیاضی کی بدولت نہایت آرام سے زندگی بسر کرتے تھے۔ مشہور ہے کہ ۱۸۳۱ء میں نواب آغا میر نے سوا لاکھ روپیہ اُن کو دیا تھا۔ وہ اُنھوں نے کہیں رکھوا دیا تھا لوگوں نے جانا انھی کے یہاں ہے چور نے رات کو نقب لگائی مگر کچھ نہ پایا اُنھوں نے تاریخ کہی

دزد در خانۂ ناسخ چو زدہ نقب امشب — نہ زر و سیم نہ بد مس خجل آمد بیروں

بہر تاریخ مسیحی چو بریدم سر زد — دزد از خانۂ مفلس خجل آمد بیروں

اس سے ۴ کے تخرجہ کے بعد ۱۸۳۱ء نکلتے ہیں ۔

ناسخ ایک مرتبہ غازی الدین حیدر کے عہد میں لکھنؤ سے چلے گئے تھے ۔ وجہ یہ تبلائی جاتی ہے کہ بادشاہ موصوف اُن کو اپنے دربار سے متعلق کرنا اور خطاب ملک الشعرائی دینا چاہتے تھے ناسخ کو یہ امر بہت ناگوار ہوا اور یہ کہکر خطاب واپس کر دیا کہ غازی الدین حیدر کو نہ تو شاہان دہلی کا مرتبہ حاصل ہے اور نہ سرکار انگریز کا ایسا اقتدار۔ پھر میں ایسے بادشاہ کا خطاب لیکے کیا کروں ۔ اِس حقارت آمیز جواب سے بادشاہ کو غصہ آیا اور ناسخ کو وطن چھوڑنا پڑا ۔ لکھنؤ سے وہ الہ آباد گئے جہاں چند دن قیام کیا۔ یہاں راجہ چندو لال دیوان سلطنت آصفیہ حیدر آباد دکن نے اُن کو بارہ ہزار روپیہ بھیجے اور ایک خط لکھا کہ اگر آپ دکن آئیے تو وہاں حسب مراتب آپ کے قدر و منزلت کی جائیگی۔ وطن کی محبت سے اُنھوں نے اسقدر دور و دراز جانے سے انکار کیا ۔ مشہور ہے ایک مرتبہ اور اُنھوں نے اسی قسم کا پیغام بھیجا تھا جسکے ساتھ پندرہ ہزار روپیہ بھی ارسال کیے تھے۔ غازی الدین حیدر کی وفات کے بعد وہ لکھنؤ واپس آئے ۔ مگر حکیم مہدی کی دشمنی کی وجہ سے جو اُن کے سرپرست اور قدردان آغا میر کے دشمن تھے

ان کو پھر لکھنؤ چھوڑنا پڑا۔ ایک مرتبہ فیض آباد الہ آباد بنارس کانپور اور پٹنہ میں تھوڑے تھوڑے دن قیام کیا مگر وطن کی محبت کبھی نہ بھولے آخر کار حکیم مہدی کے انتقال کے بعد ۱۲۴۷ھ میں پھر لکھنؤ واپس آئے۔ جہاں چند سال رہکر ۱۲۵۴ھ ہجری میں انتقال کیا میر علی اوسط رشک نے تاریخ کہی ؎

دلا شعر گوئی اوٹھی لکھنؤ سے

تصانیف ان کے تین دیوان ہیں جن میں سے دو زیادہ مشہور ہیں۔ ایک دیوان الہ آباد کے قیام میں مرتب کیا تھا جس کا سنہ تصنیف ۱۲۳۲ھ ہے۔ اسکا نام دفتر پریشان رکھا۔ اسمیں غزلوں رباعیوں اور تاریخوں کے سوا اور قسم کی نظم نہیں۔ دوسرے اور تیسرے دیوان کا سنہ تالیف علی الترتیب ۱۲۴۷ھ اور ۱۲۵۴ھ ہے[1]۔ ان کے دیوانوں میں جو تاریخیں ہیں وہ اس لیئے بہت قابل قدر ہیں کہ ان سے اکثر نامی گرامی شعرا اور دیگر مشاہیر کا سنہ وفات معلوم ہو جاتا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ ناسخ نے کوئی قصیدہ نہیں کہا۔ ان کے کلام میں قصائد کی جگہ اکثر قطعات نے لی ہے ہجو اور مذاق[2] کا بھی پتہ ان کے یہاں نہیں۔ ان کی ایک مثنوی بھی ہے جس کا نام

---

[1] فقیر مؤلف کے پاس جو نسخہ کلیات ہی اسکے آخر میں یہ عبارت ہی "الحمد للہ کہ بفرمائش شاہزادۂ والاجاہ مرزا فرخندہ بخت بہادر دام اقبالہ کلیات رئیس شعرائے زمان و سر دفتر بلغاء آوان علم و عمل الشیخ شیخ امام بخش متخلص بہ ناسخ دیوان اول مسمی بہ "دیوان ناسخ" در متن و دیوان دوم مسمی بہ "دفتر پریشان" بر حاشیہ دیوان سوم مسمی بہ "دفتر شعر" و ہر ردیف ملحق بہ دفتر پریشان بتاریخ چہارم جمادی الاول ۱۲۶۱ھ در مطبع مولائی واقع بازار راجہ ٹکیت رائے منطبع گردید"

[2] آب حیات میں ڈھونڈھ کے ایک تاریخ انکی نکالی ہے جس سے ان کی تفریح طبع اور مذاق کا حال معلوم ہوتا ہے۔ میر گھسیٹا نام ایک شخص مر گئے تو شیخ صاحب نے فرمایا ؎

جب میر گھسیٹا مر گئے ہاے | ہر ایک نے اپنے منھ کو پیٹا
ناسخ نے کہی یہ سن کے تاریخ | افسوس کہ موت نے گھسیٹا

"نظم سراج" ہے، جو تاریخی نام ہے۔ اس سے ۱۲۵۴ نکلتے ہیں یعنی اس سال اُن کے شاگرد رشک نے انکی وفات کے بعد اُس کو شائع کیا تھا۔ ایک مولود شریف بھی شیخ صاحب کی تصنیف ہے مگر یہ دونوں کتابیں مصنف کے پایہ سے بہت گری ہوئی ہیں۔

ناسخ کا اثر شاعری اور زبان پر

شیخ ناسخ تین چیزوں کے واسطے مشہور ہیں۔ ایک انکی قادرالکلامی جو انکی غزلوں سے معلوم ہوتی ہے۔ دوسرے وہ طرز جدید جو انھوں نے ایجاد کیا تھا۔ تیسرے ایک بڑی جماعت مشہور شاگردوں کی جنکو اپنے بعد وہ چھوڑ گئے۔ اسمیں کوئی شک نہیں کہ ناسخ ایک مسلم الثبوت اُستاد تھے جن کو زبان اُردو و فارسی پر قدرت حاصل تھی شعر کی آرایش ظاہری کما حقہٗ کرتے تھے لکھنؤ کے حلقۂ شعرا میں اُنکا بہت بڑا اثر تھا اور ابتک کسی تنازع فیہ ادبی مسئلہ میں مثلاً کسی محاورے یا لفظ کی صحت کے متعلق ان کا کلام سند میں پیش کیا جاتا ہے۔ الفاظ اپنی جگہ پر خوب صرف کرتے تھے اور ایسے الفاظ جو سودا و میر کے زمانہ کی یادگار رہگئے تھے اُن سے اجتناب کرتے تھے برخلاف ان کے مصحفی زمانہ قدیم کے بہت بڑے متبع تھے۔ ناسخ کے کلام میں یہ نقص ضرور ہے کہ اُنھوں نے الفاظ کی تلاش و جستجو پر ضرورت سے زیادہ توجہ کی اور بدنصیبی سے کہیں کہیں ایسے مغلق اور ادق الفاظ فارسی عربی داخل کرنا چاہے جو غزل کے شایان نہیں ہیں اسی وجہ سے ان کا کلام حسن ظاہری سے تو آراستہ ہے مگر دلچسپی اور تاثیر سے خالی ہے۔ یہی حال انگریزی میں پوپ شاعر کا ہے۔ جس میں کوئی ظاہری سقم تو نہیں مگر درد و اثر مطلق نہیں ہے۔

ناسخ کی غزلیں

اُن کی غزلیں شاندار الفاظ اور طرح طرح کی تشبیہات کا مجموعہ

ہوتی ہیں مگر جذبات و اثرات سے خالی ہیں تصنّع ان کے کلام کا اصلی جوہر ہے تشبیہیں اکثر نئی تو ہیں مگر عجیب ہوتی ہیں حسن ظاہری بجائے غرض ثانوی کے ان کے یہاں غرض اصلی ہے ۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ الفاظ کی مناسبت کی مہتات میں شعر کا مضمون خبط ہو جاتا ہے۔ انکی غزلیں صائب اور مرزا بیدل کے رنگ میں ہوتی ہیں یعنی اول الذکر کی تشبیہات اور آخر الذکر کی نازک خیالیاں کہیں کہیں اُن میں پائی جاتی ہیں۔ ناسخ کے چند ایسے اشعار جن میں عربی و فارسی کے الفاظ زیادہ استعمال کیے ہیں بطور نمونہ درج کیے جاتے ہیں۔

غیر کوثر کسی دریا کا میں سبّاح نہیں
بیشۂ شیر خدا بن کہیں سیّاح نہیں

ظلم طول شب فرقت کے تطاول نے کیا
دادرس کوئی بجز فالق الاصباح نہیں

بے خطر یوں ہاتھ دوڑاتا ہوں زلف یار پر
دوڑتا تھا جس طرح ثعبان موسیٰ مار پر

دیکھیو ناسخ سرِ شیخ معمم کی طرف
کیا کلس مسواک کا ہے گنبدِ دستار پر

کیونکر اے ناسخ خوارِ عجل دشمن ہو نہ خوار
کیسے موسیٰ کا علی شیر خدا ہارون ہوا

معمولی کلام کا انداز یہ ہے ۔

روے جاناں کا تصوّر میں جو نظّارا ہوا
دل میں تھا جو داغِ حسرت عرش کا تارا ہوا

وہ مہِ خانہ نشیں گلیوں میں آوارا ہوا
اے منجم دیکھنا ثابت بھی سیارا ہوا

محفلِ مے میں جو آیا تو براے میکشی
تھا جو شیشہ جوشِ مے سے ایک فوارا ہوا

چشم بد دور آج کیا آتے نظر ہیں گال صاف
سبزۂ خط کیا غزالِ چشم کا چارا ہوا

شب ہوا سے ہل گئی جو اسکی زلفِ عنبریں
دم میں موم شمع سارا عنبر سارا ہوا

بیٹھ پیچھے میرے بد کہنے سے زاہد یہ ملا
بیٹھ پر بارِ گنہ کا جمع پشتارا ہوا

دور بھینکا ساقیا لیتے ہی تیرے ہجر میں　　ہاتھ میں جام مے گل رنگ سا انگارا ہوا

جب نہانے کو ہوا عریاں وہ پتلا نور کا　　حوض میں روشن برنگ شمع فوّارا ہوا

دوستو جلدی خبر لینا کہیں ناسخ نہ ہو

قتل آج اسکی گلی میں ایک بیچارا ہوا

تاریخیں　تاریخ گوئی میں اُن کو خاص ملکہ تھا۔ بات بات پر تاریخ کہتے تھے بعض تاریخیں بہت عمدہ اور دلچسپ ہیں مثلاً کسی نے اُن کے خطوط چرائے تو کہا ؎

سیاہ ہمچو قلم باد روے حاسد من

پھر چار خط جاتے رہے تو کہا ؎

صد حیف تلف چہار نامہ

پیارے شاگرد خواجہ وزیر کا بیاہ ہوا تو فرمایا ؎

شدہ نوشہ وزیر من امروز

جب اُن کے یہاں لڑکا پیدا ہوا تو صبح کا وقت تھا فرمایا ؎

صبح طالع شد برآمد آفتاب

جب حکیم مہدی معزول ہو کر فرخ آباد گئے تو اُنھوں نے تاریخ کہی ؎

اُفتاد حکیم از وزارت　　تاریخ بطرز نو رقم کن

از جاے حکیم ہشت برگیر　　سہ مرتبہ نصف نصف کم کن

تصنیف نہیں کہا　تعجب ہے کہ اس صنف خاص میں اُنھوں نے کوئی توجہ نہیں کی درحالیکہ اسکی ترتیب میں درد و اثر کی زیادہ ضرورت نہ تھی۔ بلکہ اُن کا شوق تشکوہ الفاظ کا اس کا مدد و معاون ہوتا ممکن ہے اسکی وجہ یہ ہو کہ ان کی

فطری طبیعت کی آزادی نے خوشامد اور چاپلوسی کی اجازت نہ دی ہو۔ وہ تصوف سے بھی بیگانہ ہیں۔ اُن کے بعض اشعار جو صوفیانہ کہے جا سکتے ہیں اُن میں بھی خود انھیں کا رنگ غالب ہے اور حقیقی تصوف کہیں چھو نہیں گیا ہے۔ مزاح و ظرافت کا بھی کہیں اُن کے کلام میں ذکر نہیں۔ اُنکی ہنسی بناوٹی ہوتی ہے اور مذاق پھس پھسا۔ کہیں کہیں مذہبی حملے اور طعن و تشنیع سے بھی کام لیتے ہیں مگر اُس میں کسی قسم کی لطافت اور خوبی نہیں ہوتی بلکہ اُن کے مرتبہ سے گری معلوم ہوتی ہے۔

نقائص کلام کلام میں وہی نقائص ہیں جو عام طور پر اُن کے ایجاد کردہ طرز میں پائے جاتے ہیں یعنی کسی عمدہ خیال کا اُن میں پتہ نہیں۔ اُن کے کسی شعر پر پڑھنے والے کا دل نہیں پھڑکتا۔ نہ اُس میں کسی قسم کا انعکاس اور باریک نظری ہے اشعار ٹھس اور بے لوچ ہوتے ہیں۔ عام طور پر نقائص کلام یہ ہیں۔ تصنّع اور تکلف۔ فارسی تشبیہات جو اُردو کا جامہ پہن کر بدنما ہو گئی ہیں۔ بڑے بڑے فارسی عربی مغلق الفاظ جنکی اُردو غزل متحمل نہیں ہو سکتی۔ شعر کی ظاہری آرایش کو مقدم سمجھنا معمولی اور پست خیالات کا بے موقع اظہار شاندار الفاظ میں۔ سرقہ کا بھی الزام اُن پر لگایا جاتا ہے مگر سچ پوچھیے تو یہ دستور قدیم سے چلا آتا ہے۔

ناسخ کے کارنامے ناسخ اپنے تخلّص کے اعتبار سے طرز قدیم کے مٹانے والے تھے۔ مگر غور سے دیکھئے تو اس تغیر کا شوق اور خیال لوگوں کے دلوں میں پہلے سے چلا آتا تھا۔ مگر اُنھوں نے اُسکی ابتدا کی اور اپنے کلام میں اُسکو برتا۔ مرزا حاجی صاحب اُس زمانہ کے ایک مُتموّل اور باسوخ رئیس تھے جو خود بھی ذی استعداد تھے اور اُنکی سرکار میں

مرزا قتیل اور قاضی محمد صادق خاں اختر وغیرہ ایسے باکمال لوگ جمع رہتے تھے۔ ناسخ کو خوش نصیبی سے مرزا کے دربار میں رسائی ہو گئی جہاں ایسے کامل لوگوں کی صحبت میں اِن کو بھی زبان کی تراش خراش اور تحقیق و تدقیق کا شوق پیدا ہوا اور ان کے دِل بڑھانے سے کلام نے روز بروز رنگ پکڑنا شروع کیا۔ رفتہ رفتہ طبیعت میں اُمنگ اور دل میں جوش بڑھ گیا۔ غرضکہ مرزا حاجی کی مہربانی سے اُنکی شاعری خوب چمکی اور اس کو لکھنؤ میں خوب فروغ حاصل ہوا۔ ناسخ نے جو تغیرات غزل میں کئے اُن میں سے بعض یہ ہیں۔ لفظ اُردو بجائے ریختہ کے استعمال کیا جو لکھنؤ میں جاری ہو گیا۔ مگر دلی میں عرصہ تک وہی پُرانا لفظ قائم رہا۔ ایسی غزلیں کہیں جنکی ردیفیں اکہری مثلاً کا۔ کو۔ ہے۔ نہیں۔ سے۔ نے۔ پر۔ تک وغیرہ ہیں۔ افعال میں بھی تغیر کیا مثلاً آئے ہے جائے ہے کی بجائے آتا ہے۔ جاتا ہے۔ اور آئیاں۔ دکھائیاں وغیرہ ترک کر دیا۔ یہ آخری فرق لکھنؤ اور دلی کی زبان کا بہت متمائز فرق تھا جو بھی تک کسی قدر باقی ہے۔ نامہذب اور فحش الفاظ جو بعض قدما کے کلام میں پائے جاتے تھے انھوں نے خارج کر دیے۔ عربی اور فارسی الفاظ اور ترکیبوں کی طرف زیادہ توجہ کی۔ اور ہندی لفظوں کو بسا اوقات بے ضرورت خارج کیا۔ الفاظ کی تذکیر و تانیث کے سخت قواعد مقرر کئے۔ غزل کا دائرہ وسیع کیا الفاظ کا صحیح استعمال مقرر کیا۔ ایک طولانی فہرست اس قسم کے تغیرات کی جو اُن کے زمانہ میں عمل میں آئے۔ تذکرۂ جلوۂ خضر اور شعر الہند میں دی ہوئی ہے۔ ناسخ کی تعریف یہ ہے کہ اُنھوں نے اپنے مقرر کردہ قواعد پر خود بھی سختی سے عمل کیا اور اپنے شاگردوں کو بھی عمل درآمد پر مجبور کیا۔ اُن کے انتقال کے بعد اُن کے شاگرد میر علی اوسط رشک نے اُن سب

تغیرات کو ایک کتاب کی صورت میں منضبط کیا۔

شاگرد ناسخ کے بہت سے شاگرد تھے جن میں سے چند مشہور لوگوں کے نام یہ ہیں :-

وزیر برق رشک بحر منیر مہر نادر آباد طاہر

برق فتح الدولہ بخشی الملک مرزا محمد رضا برق، مرزا کاظم علی خاں کے بیٹے اور واجد علی شاہ آخری تاجدار اودھ کے مصاحب خاص اور استاد بھی تھے۔ بادشاہ کے ساتھ اُن کو بہت محبت تھی چنانچہ جب بعد انتزاعِ سلطنت بادشاہ کلکتہ گئے تو وہ بھی اُن کے ہمراہ تھے جہاں ۱۸۵۷ء میں انتقال کیا۔ یہ شعر اُن کا اُن کے حسب حال ہے۔

برق جو کہتے تھے آخر وہی کر کر اُٹھے
جان دی آپ کے دروازہ پہ مَر کر اُٹھے

برق شاعری کے علاوہ بانکپن میں بھی مشہور تھے۔ بانک بنوٹ وغیرہ اچھی جانتے اور تلوار خوب لگاتے تھے۔ لکھنؤ میں باعتبار اُن کے عالی خاندان اور ذی مرتبہ ہونے کے اور نیز اُن کے اخلاق و سیر چشمی کیوجہ سے اُن کی بڑی شہرت تھی۔ پُر گو شاعر تھے اور اپنے استاد ناسخ کے متبع تھے ان کے کلام میں بھی مثل ان کے اُستاد کے تکلف اور تصنع بہت ہے مگر زبان پر قدرت اور شعر میں مزہ ہے ایک ضخیم دیوان چھوڑا جس میں مختلف اصناف سخن موجود ہیں ایک شہر آشوب لکھنؤ کی تباہی کا بہت درد انگیز لکھا ہے یہ بھی گو کہ اپنے پرانے رنگ میں ہے مگر اکثر اشعار بہت مؤثر و درد انگیز ہیں۔ جلال اور سحر ان کے دو مشہور شاگرد تھے۔

نمونۂ کلام یہ ہے۔

اذاں دی کعبہ میں ناقوس دیر میں پھونکا   کہاں کہاں ترا عاشق تجھے پکار آیا

ولہٗ

قیس کا نام نہ لو ذکر جنوں جانے دو   دیکھ لینا مجھے تم موسم گل آنے دو

ولہٗ

نکلا غبار دل سے صفائی تو ہو گئی   اچھا ہوا جو خاک میں تم نے ملا دیا

ولہٗ

آتا نہیں قرار دلِ بیقرار کو   غم میں پھنسا ہوں دام محبت سے چھوٹ کر

بحر شیخ امداد علی بحر شیخ امام بخش اپنے استاد ناسخ کے ہمنام کے بیٹے تھے عمر بھر پریشانی اور عسرت میں گذری۔ آخر عمر میں نواب کلب علی خاں والی رامپور اُنکی سرپرستی فرماتے تھے۔ رامپور ہی میں پچھتر برس کی عمر میں سنہ ۱۳۰۰ھ مطابق سنہ ۱۸۸۲ء میں اس دار فانی سے رحلت کی۔ اِن کے دیوان کی ترتیب اِن کے دوست نواب سید محمد خاں رِند شاگرد آتش نے کی۔ ان کے کلام میں بھی پیچیدہ تمثیلیں اور دقیق استعارات پائے جاتے ہیں مگر پھر بھی اسقدر تصنّع اور الفاظ کی بھرمار نہیں ہے جیسا کہ دیگر شاگردان ناسخ کے یہاں ہے۔ اکثر اشعار بہت صاف وسلیس اور پُراثر بھی ہوتے ہیں۔ صحت الفاظ اور تحقیق لغت کے اُستاد تھے۔ ناسخ اور رشک کے بعد لکھنؤ کے دورِ متوسط کے شعراء میں بہت بڑا درجہ رکھتے تھے اور تحقیق الفاظ کے معاملہ میں خاصکر بہت مستند سمجھے جاتے تھے۔ کچھ صاف وسادہ اشعار بطور نمونے کے پیش کئے جاتے ہیں ؎

میرا دل کس نے لیا نام بتاؤں کس کا　　میں ہوں یا آپ ہیں گھر میں کوئی آیا نہ گیا

ولہٗ

ظالم ہماری آج کی یہ بات یاد رکھ　　اتنا بھی دل جلوں کا ستانا بھلا نہیں

ولہٗ

مدت سے التفات مرے حال پر نہیں　　کچھ تو کبھی ہو دل میں کہ سیدھی نظر نہیں

ولہٗ

افسوس عمر کٹ گئی رنج و ملال میں　　دیکھا نہ خواب میں بھی جو کچھ تھا خیال میں

ولہٗ

کیا کیا نہ مجھ سے سنگدلی دلبروں نے کی　　پتھر پڑیں سمجھ پہ نہ سمجھا کسی طرح

آباد　مرزا مہدی حسن خاں متخلص بہ آباد مرزا غلام جعفر کے بیٹے تھے ۱۲۲۸ھ میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ نوابان فرخ آباد سے سلسلۂ قرابت رکھتے تھے اور لکھنؤ کے رؤسا میں شمار کیے جاتے تھے۔ شعر گوئی سے بڑا شوق تھا مقررہ اوقات پر اپنے مکان پر مشاعرہ کرتے تھے اور دوسرے مشاعروں میں بھی بالالتزام جاتے تھے پرگو شاعر تھے دو دیوان ایک مثنوی اور تین واسوخت یادگار چھوڑے ہیں جنمیں سے ایک دیوان موسوم بہ "نگارستان عشق" لکھنؤ میں شائع ہوا تھا۔ ان کا ایک مجموعہ "بہارستان سخن" جس میں ناسخ و آتش کی ہمطرح غزلیں جمع کی ہیں بہت مشہور ہے۔ جس سے ان دونوں استادوں کے کلام کے موازنہ کا بہت اچھا موقع ملتا ہے۔ آباد کے کلام میں کوئی خاص خصوصیت نہیں البتہ کہیں کہیں کوئی پھڑکتا ہوا شعر نکل آتا ہے۔

خواجہ وزیر

خواجہ محمد وزیر المتخلص بہ وزیر خواجہ محمد فقیر کے بیٹے تھے۔ سلسلۂ خاندان ان کا باپ کی جانب سے حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبند سے ملتا ہے۔ لکھنؤ میں عالی خاندان ہونے اور نیز اپنے ذاتی تقدس کی وجہ سے بڑی عزت سے بسر کی۔ آخر عمر میں گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی اور شعر و سخن سے نفرت ہو گئی تھی فتوح اور تسخیر اعمال کا بہت شوق تھا۔ ہر وقت نقوش بھرا کرتے تھے سو روپیہ ماہوار سے خرچ کم نہ تھا مگر آمدنی کہیں سے کچھ نہ تھی۔ آزادی مزاج کا یہ حال تھا کہ واجد علی شاہ بادشاہ نے دو مرتبہ یاد فرمایا مگر وہ کچھ نہ کچھ عذر کر کے اپنی جگہ سے ہلے نہیں۔ بالآخر ۱۲۷۰ھ میں وفات پائی منشی اشرف علی شاگرد نسیم دہلوی نے مادۂ تاریخ خوب نکالا ہے

مزہ شعر کا ہائے جاتا رہا

ان کی وفات کے بعد ان کے شاگردوں اور دوستوں نے ان کا کچھ کلام بصورت غزلیات جمع کر کے شائع کیا اور اس کا تاریخی نام "دفتر فصاحت" رکھا جس سے ۱۲۶۳ فصلی مطابق ۱۲۷۱ھ اس کی تاریخ اشاعت نکلتی ہے۔

ان کے بہت سے شاگرد تھے جن میں سب سے مشہور فقیر محمد خاں گویا ہیں۔ خواجہ وزیر کا رنگ وہی ہے جو ان کے استاد کا ہے مگر اس میں شک نہیں کہ اپنے استاد کے سب سے زیادہ مشہور اور سب سے زیادہ محبوب شاگرد یہی تھے۔ مشکل مشکل طرحوں میں طبع آزمائیاں کی ہیں اور اپنے طرز کے موافق خوب خوب شعر نکالے ہیں۔ حق یہ ہے کہ اپنے عہد کے شعرا میں خواجہ وزیر بہت بڑے پائے کے شاعر تھے۔ نمونۂ کلام یہ ہے۔

چلا ہے او دلِ راحت طلب کیا شادماں ہو کر ۔۔۔ زمینِ کوئے جاناں رنج دیگی آسماں ہو کر

اسی باعث تو قتل عاشقاں سے منع کرتے تھے — اکیلے پھر رہے ہو یوسف بے کارواں ہو کر
ترچھی نظروں سے نہ دیکھو عاشق دلگیر کو — کیسے تیر انداز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو

ولہٗ

ہے چشم نیم باز عجب خواب ناز ہے — فتنہ تو سو رہا ہے درِ فتنہ باز ہے

ولہٗ

نہ کر نظر مرے جرم و گناہ بیحد پر — الٰہی تجکو غفور الرحیم کہتے ہیں
کہیں عدو نہ کہیں مجھکو دیکھکر محتاج — یہ اُن کے بندے ہیں جنکو کریم کہتے ہیں

رشک — میر علی اوسط رشک میر سلیمان کے بیٹے تھے بزرگون کا وطن فیض آباد تھا مگر ان کی نشو و نما لکھنؤ مین ہوئی اور یہین ان کی شاعری بھی پروان چڑھی۔ ناسخ کے مشہور شاگرد تھے زیادہ تر ان کی شہرت ان کی مبسوط اور جامع لغت موسوم بہ "نفس اللغۃ" پر مبنی ہی جو زبان فارسی مین ہے اور اُردو اور ہندی الفاظ و محاورات کی صحت کی تحقیق اُس میں کیگئی ہے یہ تاریخی نام ہے جس سے سن تالیف ۱۲۶۵ھ نکلتا ہے۔ وہ اُن کی زندگی ہی مین مشہور و مقبول ہو چکی تھی اب اُس کا ایک حصہ نشتر کاکوروی نے چھپوا کر دفتر نور اللغات سے شائع کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ اُن کے دو دیوان بھی ہیں جن کے علی الترتیب تاریخی نام "نظم مبارک" (۱۲۵۳ھ) اور "نظم گرامی" (۱۲۶۱ھ) ہیں۔ رشک کا بھی رنگ وہی ہے جو اُن کے اُستاد ناسخ کا ہے۔ ان کا کلام بھی بالکل بے مزہ اور سیٹھا پھیکا ہے اور اُس زمانے کے عیوب اس میں بھی سب موجود ہیں۔ رشک تاریخ گوئی میں بڑا ملکہ رکھتے تھے بات بات پر تاریخ کہتے تھے۔ اپنے بعد اُنھون نے بہت سے شاگرد چھوڑے جن میں منیر مشہور ہیں منیر پہلے ناسخ کے شاگرد تھے

مگر اُن کے بعد رشک سے اصلاح سخن لیتے تھے۔ رشک کچھ دن کانپور اور الہ آباد میں بھی رہے ہیں آخر عمر میں کربلائے معلی چلے گئے تھے اور وہیں ۱۲۸۴ھ میں ستّر برس کی عمر میں وفات پائی، ان کا بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ صحت الفاظ کا بہت خیال رکھتے تھے اور خود اپنے اُستاد کے زمانے میں بھی اسی بات کے لئے مشہور تھے۔ ان کے کلام میں بلند خیالی اور مضمون آفرینی کا پتہ نہیں معمولی باتیں کہتے ہیں اور بالکل معمولی طریقے سے کہتے ہیں۔ ان کو اس بات کا بڑا خیال تھا کہ جو لفظ جس طرح معمولی بول چال میں بولا جائے اسی طرح وہ نظم بھی کیا جائے مثلاً

ہم آپ میں آئیں گے تو وہ آئیں گے آپ ہی (آپ ہی)

دل ہی میں سُراغِ درِ دلدار ملے گا

بہت پُرگو تھے مگر کلام رعایت لفظی اور ضلع جگت کی پیچیدگیوں میں ایسا پھنسا ہوا ہے کہ دو چار شعر بھی اچھے مشکل سے ملتے ہیں۔ ان کی ایک طویل غزل ہے جس کا قافیہ "لگاؤ۔ تاؤ" وغیرہ ہے چونکہ قافیہ مشکل تھا اُنھوں نے محنت و جانفشانی سے بہت سے ہم قافیہ لفظ جمع کیے تھے۔ نمونے کے طور پر چند شعر لکھے جاتے ہیں

یار کو ہم سے کچھ لگاؤ نہیں	وہ محبت نہیں وہ چاؤ نہیں
پرزوں میں دستخط کروں کیا حال	ایک دو تین چار تاؤ نہیں
گنگ کو بحر غم سے کیا نسبت	یہ وہ دریا ہے جسمیں ناؤ نہیں
ابکی جاڑے ہیں اور نالہ و آہ	اس طرح کا کوئی الاؤ نہیں
چاول الماس گوشت لخت جگر	فرقتِ یار میں پُلاؤ نہیں
میرے کھانے سے کیوں خلاک ہی کباب	پاؤ روٹی ہے نانپاؤ نہیں

ہجر میں کیوں طرح طرح نہ دبائے   بارِ غم پر مرا دباؤ نہیں

یہ زمینِ غزل وہ ہے ای رشک

جس میں ذرہ کہیں بھراؤ نہیں

اتفاق سے "بلاؤ" کا قافیہ رہ گیا تھا اسکی کمی کسی ظریف نے پوری کردی اور خود انھیں کی طرف منسوب کردیا۔

دور سے چھیچھڑے دکھاؤ نہیں

رشک میٹھا ہے بن بلاؤ نہیں

مہر — مرزا حاتم علی بیگ متخلص بہ مہر سنہ ۱۲۳۰ھ میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک مشہور خاندان اصفہانی کے نونہال تھے۔ اُن کے والد مرزا فیض علی بیگ قزلباش ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد میں علی گڈھ کے تحصیلدار تھے۔ اُن کے دادا مرزا مراد علی خان بعہد نواب شجاع الدولہ لکھنؤ آئے اور خطاب رکن الدولہ سے سرفراز ہوئے۔ وہ کسی زمانہ میں رائے بریلی کے ناظم تھے۔ والد کا انتقال ان کی صغر سنی میں ہوا تھا۔ مشہور ہے کہ اُن کو شعر گوئی کا شوق بچپن سے تھا اور چودہ برس کے سن میں شعر کہنے لگے تھے جب ان کے بھائی مرزا عنایت علی بیگ متخلص بہ ماہ آتش کے شاگرد ہوئے تو خود اُنھوں نے زانوئے شاگردی ناسخ کے سامنے تہ کیا اور کہتے کہتے پختہ کار ہوگئے سنہ ۱۸۴۰ء میں سرکاری امتحان پاس کرکے چنار گڈھ ضلع مرزا پور کے منصف ہوئے چنانچہ اُن کا یہ شعر اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔

از بسکہ سوز ہجر سے خوگر ہوئے ہیں ہم

منصف چنار گڈھ کے مقرر ہوئے ہیں ہم

وہ عدالت العالیہ ہائیکورٹ کے وکیل بھی تھے ۱۸۵۷ء کے غدر میں اُنھوں نے چند انگریزوں کو پناہ دی تھی جسکے صلے میں خلعت فاخرہ اور دو گاؤں جاگیر میں سرکار سے عنایت ہوے۔ اس کے بعد وہ آگرے آگئے جہاں وکالت کرتے تھے اور کچھ دنوں آنریری مجسٹریٹی بھی کی ہے ۱۸۹۰ء میں بمقام ایٹہ انتقال کیا۔ وہاں اُنکے بیٹے مرزا سخاوت علی کچھ دن تحصیلدار رہے ہیں۔

مہر مذہباً امامیہ رکھتے تھے مگر متعصب بالکل نہ تھے اکثر مشہور لوگوں سے دوستی تھی مثلاً غالب، انیس، دبیر، غلام امام شہید، صبا، منیر وغیرہ چنانچہ غالب کے اکثر خطوط اُن کے نام اردوے معلّٰی میں موجود ہیں۔ مہاراجہ بلونت سنگھ راجہ بنارس جو اُن دنوں آگرے میں ٹھہرے تھے اِن کے شاگرد ہوے اور پچاس روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر کیا۔

تصانیف مہر کی اکثر تصانیف زمانۂ غدر میں تلف ہو گئیں مگر کتب ذیل مطبوعہ و غیر مطبوعہ یادگار باقی ہیں۔

(۱) دیوان اُردو موسوم بہ "الماس درخشاں" تاریخی نام "خیالات مہر" (۱۲۸۰ھ)۔ اِس کو اِن کے پوستے مرزا قاسم حسین قزلباش نے شائع کرا دیا ہے۔

(۲) "پیرایۂ عروض" ایک مختصر رسالہ فن عروض میں۔

(۳) ایاغ فرنگستان" ابتدائی عملداری انگریزی کی مختصر تاریخ ۱۸۷۳ء میں شائع ہوئی۔

(۴) "مثنوی داغِ نگار" جو ایک دن میں لکھی تھی۔

(۵) "داغ دل مہر" واسوخت۔

(۶) "مثنوی شعاع مہر" ۱۸۵۸ء میں شائع ہوئی جسکی تعریف مرزا غالب نے اپنے خطوط میں بہت کی ہے۔

ان کے علاوہ "شبیہ عشرت" "ضبط انتقام" "ہمدم آخرت" "بیان بخشائش" "عید قیصریہ" "پنجۂ مہر" "توقیر شرف" اور اور کچھ نظمیں بھی اُن کی طرف منسوب ہیں۔ بہت پُر گو تھے مختلف مضامین پر لکھتے تھے اور تاریخ خوب کہتے تھے۔ دوسرے درجہ کے شعرا میں مہر کا مرتبہ بلند ہے۔ اُن کے کلام میں سلاست و روانی، تناسب اور زبان پر قدرت ہے بعض اشعار اُن کے نہایت صاف و سلیس اور بہت پُر لطف ہوتے ہیں۔

منیر سید اسمٰعیل حسین متخلص بہ منیر خلف سید احمد حسین شاد شکوہ آباد ضلع مین پوری کے رہنے والے تھے۔ لکھنؤ میں عرصے تک رہے اور وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ اپنے اردو دیوان "منتخبات عالم" کے شروع میں جو فارسی دیباچہ لکھا ہے اُس میں اُنھوں نے اکثر اپنے واقعات زندگی بیان کیے ہیں۔ پہلے ناسخ سے بذریعۂ خط و کتابت صلاح سخن لیتے تھے پھر کانپور میں جب وہ نواب نظام الدولہ کی ملازمت میں تھے اور ناسخ وہاں پہونچے تو یہ اُن سے ملنے گئے اور شاگرد ہوگئے اور اُنہی کی ہدایت کے بموجب وہ رشک سے بھی مشورہ کرنے لگے چنانچہ اپنے کلام میں ان دونوں بزرگواروں کا ذکر بہت ادب و احترام سے کرتے ہیں اور اُنکی قابلیت کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ کلکتہ، مرشد آباد، اور الہ آباد میں بھی رہے تھے مگر لکھنؤ کے عاشقوں میں تھے یہاں کی دلچسپیاں اُن کو مجبور کرتی تھیں کہ اپنی مستقل سکونت وہاں اختیار کریں اور شعر و شاعری کے جلسوں میں برابر شریک ہوں۔ اس شوق کا

ذکر اُن کے کلام میں اکثر پایا جاتا ہے۔ لکھنؤ وہ کم سے کم سال میں ایک مرتبہ ضرور آتے تھے چنانچہ ایک مرتبہ یہاں ظفر الدولہ نواب علی اصغر خاں کے ملازم بھی ہو گئے مگر تھوڑے دنوں کے بعد پھر کانپور واپس جانا پڑا جہاں تھوڑے دن رہنے پائے تھے کہ لکھنؤ کی کشش نے پھر زور کیا اور اب کی مرتبہ نواب سید محمد ذکی متخلص بہ ذکی کے سلسلۂ رفقا میں داخل ہوئے اور اُن کے کلام کو اصلاح بھی دینے لگے۔ لکھنؤ میں دو سال قیام کر کے نواب تجمل حسین خان کی فرمائش سے فرخ آباد گئے جہاں نواب موصوف کی حین حیات قیام کیا۔ اسی عرصے میں مہاراجگان دھولپور اور الور نے بھی اُن کو اپنے دربار میں طلب کیا تھا مگر اُنھوں نے باندے میں ملازمت کرلی جہاں نواب علی بہادر والی ریاست کے استاد مقرر ہو گئے۔ بعد غدر ایک رنڈی مسماۃ نواب جان کے قتل کی سازش میں اُن پر مقدمہ قائم ہوا اور کالے پانی کی سزا تجویز ہوئی مگر ۱۸۶۰ء میں قید سے رہائی پائی۔ بالآخر بعہد نواب کلب علیخاں رامپور میں قیام کیا اور یہیں کی خاک میں ۱۸۸۱ء میں آرام کیا۔

تصانیف تین دیوان یادگار چھوڑے ہیں (۱) "منتخبات عالم" (۲) "تنویر الاشعار" (۳) "نظم منیر"۔ مثنوی "معراج المضامین" جس میں ائمہ معصومین کے کشف و کرامات بیان کیے ہیں اُنھیں کی تصنیف ہے۔ بہت پُرگو شاعر تھے اور مرثیہ بھی کہتے تھے مرثیے میں مرزا دبیر کے شاگرد تھے۔ قصیدے بڑے زوردار کہتے تھے اور قطعہ، رباعی، مخمس وغیرہ میں بھی بہت زور طبیعت دکھاتے تھے۔ ان کا رنگ ان کے اُستاد ناسخ اور رشک کا سمجھنا چاہیئے۔ اکثر اشعار میں بلند پروازی اور عمدہ تخئیل ہے، قطعات بہت صاف سادہ اور سلیس ہیں، غزلوں میں پورا لکھنؤ کا رنگ ہے مختصر یہ

کہ منیر کا مرتبہ اُس زمانے کے شعرا میں بہت بلند ہے۔

آتش متوفی ۱۲۶۳ ہجری خواجہ حیدر علی آتش خلف خواجہ علی بخش دلی کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد نواب شجاع الدولہ کے عہد میں دلی چھوڑ کر فیض آباد آئے اور محلہ مغلپورہ میں سکونت اختیار کی۔ آتش کی ولادت فیض آباد میں ہوئی۔ یہ بہت صغیر سن تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا اسی وجہ سے تعلیم سے بھی محروم رہے اور بُری صحبت میں بیٹھکر مزاج میں شوریدہ سری اور بانک پن آگیا۔ نواب مرزا محمد تقی خاں ترقی کی ملازمت اختیار کرلی اور انھیں کے ساتھ لکھنؤ آئے۔ یہاں اُس زمانے میں مصحفی اور انشا کے زوردار مقابلے ہو رہے تھے۔ اسی کو دیکھکر ان کو بھی شعر و سخن کا شوق پیدا ہوا۔ مصحفی کے شاگرد ہو گئے اور چند روز کی محنت میں ایسی مشق بہم پہونچائی کہ خود صاحب طرز ہو گئے۔ ناسخ اور انشا کی طرح ان کی استعداد علمی درجۂ تکمیل کو نہیں پہونچی تھی۔ البتہ درسی کتابیں دیکھی تھیں۔ اور ایک رسالہ فن عروض کا عربی میں پڑھا تھا۔

ناسخ اور آتش کی طرز زندگی میں بھی مثل اُن کے کلام کے بیّن فرق تھا آتش نہایت سادگی سے زندگی بسر کرتے تھے جسمیں تکلف اور تصنع کو مطلق دخل نہ تھا۔ وہ حُسن کے عاشق تھے اور آزاد مزاج واقع ہوئے تھے۔ سپاہیانہ وضع اور لباس رکھتے تھے۔ مگر اسمیں بھی بانکپن کو دخل تھا۔ تلوار باندھتے تھے اور مشاعروں تک میں اپنے ساتھ لیجاتے تھے۔ قناعت اور توکل کے ساتھ زندگی بسر کی کبھی کسی امیر کی اُسکی دولت کی وجہ سے خوشامد نہیں کی۔ شاگرد کبھی کبھی خود سلوک کرتے تھے مگر ان کا دست سوال کسی کے سامنے دراز نہیں ہوا۔

اسّی روپیہ مہینا بادشاہ کے یہاں سے ملتا تھا جس سے بمشکل گزارہ ہوتا تھا۔ اور کبھی کبھی کوئی شاگرد بھی اعانت کرتا تو کوئی انکار نہ تھا۔ محلہ معالیخاں کی سرائے میں ایک ٹوٹا پھوٹا مکان تھا جسمیں غریبا نہ زندگی بسر کرتے تھے۔ مزاج میں انتہا درجہ کی وضعداری اور خودداری تھی۔ اُمراسے بہت لوک کی لیتے تھے۔ مگر معمولا بہت منکسرالمزاج اور خلیق واقع ہوئے تھے۔ آخر میں ان سے اور ان کے اُستاد مصحفی سے کچھ بگاڑ ہوگیا تھا اصلاح لینا بند کردی تھی اور آپ اپنی غزلوں پر ایک گہری نظر اصلاحی ڈالتے تھے ناسخ کے معاصر تھے۔ لکھنؤ اس عہد میں دو فرقوں پر منقسم تھا۔ ایک جانبداران ناسخ دوسرا طرفداران آتش۔ اس آپس کے مقابلہ سے یہ فائدہ ضرور تھا کہ دونوں استادان سخن مقابلہ کے خیال سے طبیعت پر بہت زور دیکر کہتے تھے۔ البتہ ایک لطیف پیرایہ میں ایک دوسرے سے نوک جھونک ہوتی رہتی تھی مگر انشا اور مصحفی کی طرح دائرۂ تہذیب سے باہر نہ ہوتے تھے۔ اس قسم کے دو چار شعر نمونتًا لکھے جاتے ہیں :۔

ناسخ ؎

ایک جاہل کہہ رہا ہے میرے دیواں کا جواب بو مسیلم نے کہا تھا جیسے قرآں کا جواب

اس پر آتش نے یہ کہا۔ آتش ؎

کیوں نہ ہو مومن اُس ملحد کے دیواں کا جوب جسنے دیوان اپنا ٹھہرایا ہو قرآں کا جوب

آتش نے ایک مرتبہ کہا ؎

یہ بزم وہ ہے کہ لاخیر کا مقام نہیں ہمارے گنجفہ میں بازیِ غلام نہیں

ناسخ کی طرف سے جواب دیا گیا

جو خاص بندے ہیں وہ بندۂ عوام نہیں — ہزار بار جو یوسف بکے غلام نہیں

مگر باوجود اس سب کے آتش اپنے حریف ناسخ کا بہت احترام کرتے تھے۔ چنانچہ مشہور ہے کہ ناسخ کی وفات کے بعد اُنھوں نے شعر کہنا چھوڑ دیا۔ آتش نے سنہ ۱۲۶۳ھ میں انتقال کیا۔ رشک نے تاریخ کہی ہے

خواجہ حیدر علی اے وا مرد ند
۱۲ ۶۳

طرز کلام — کلام میں اُن کے تخلص کے اعتبار سے گرمی بہت ہے۔ تصنع اور تکلف مطلق نہیں۔ نہ معمولی اور مبتذل خیالات ہیں جن کا عیب شکوہ الفاظ سے چھپایا گیا ہو۔ نہ بیجا اور فضول تمثیلوں سے شعر بے مزہ کیے گئے ہیں۔ ترشے ہوئے الفاظ آبدار موتیوں کی طرح لڑی میں پروئے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اکثر اشعار میں روانی موسیقیت کی حد تک پہونچ گئی ہے۔ محاورات ایسے برمحل استعمال کیے ہیں کہ شاعری مرصع سازی معلوم ہوتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ انکی شاعری میں تیز انعکاس اور میر کی طرح درد و اثر کی تڑپ نہیں ہے پھر بھی ان کے بعض اشعار پوری اُردو شاعری میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ میر و غالب کے بعد اگر کسی کا مرتبہ ہے تو وہ آتش ہیں۔ بڑی خوبی ان کے کلام کی یہ ہے کہ جذبات کو نہایت مؤثر اور دلکش الفاظ میں ادا کرتے ہیں۔ نوق البھڑک الفاظ ان کے یہاں بہت کم ہیں۔ زبان بہت مزیدار اور روزمرہ کی بول چال ہے جسمیں ابتذال نہیں ہے شعر بآسانی سمجھ میں آتے ہیں اور بہت لطف دیتے ہیں۔ محاورات بہت منتخب اور برمحل ہوتے ہیں تلاش الفاظ بہت قابل تعریف ہے۔ خیالات میں بلندی ہے اگرچہ غالب کی ایسی نہیں اور عموماً فواحش سے پاک و صاف ہیں۔

تصانیف پہلا دیوان خود انھیں کی زندگی میں شایع ہو گیا تھا اور نہایت مقبول ہوا تھا۔ دوسرا دیوان جسے پہلے دیوان کا ضمیمہ سمجھنا چاہیے ان کے عزیز شاگرد میر دوست علی خلیل نے ان کے مرنے کے بعد مرتب کر کے پہلے دیوان میں شامل کر دیا۔ انھوں نے سوائے غزل کے اور کسی صنف شعر میں طبع آزمائی نہیں کی

نقائص کلام بعض کوتاہ نظر لوگ ان کے کلام میں یہ سقم نکالتے ہیں کہ انکے یہاں فقط باتیں ہی باتیں ہیں۔ کلام میں پختگی اور اشعار میں مضامین عالی نہیں اور اس سے نتیجہ اُنکی بے استعدادی کا نکالتے ہیں۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ حقیقی شاعری علم و فضل پر مبنی نہیں ہے گو اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ کم علمی کی وجہ سے وہ اکثر الفاظ غلط استعمال کرتے تھے۔ مثلاً المضاف بجاے المضاعف، حلوہٗ بیدود بجاے حلوائے بیدود، کفارا بجاے کفّارہ تشدید فا، مطالع بجاے مطالعہ وغیرہ۔ اسکے جواب میں انکی طرف سے یہ عذر پیش ہو سکتا ہے کہ انھوں نے تلفظ مروجہ کے موافق ان الفاظ کو استعمال کیا۔ اور لغوی صحت کی طرف توجہ نہیں کی اور بہت اچھا ہوا کہ اُنھوں نے زیادہ تحقیق سے کام نہیں لیا کیونکہ اسی چھان بین نے زبان کو سخت اور بے لوچ کر دیا اور اجنبی غیر ملکی الفاظ کی بھر مار کر دی۔

ناسخ اور آتش کا مُقابلہ دونوں زبان اُردو کے کامل استاد اور صاحب طرز تھے، اب اس زمانے میں ناسخ کا رنگ پھیکا پڑ گیا اور لوگ اُس کو پسند نہیں کرتے البتہ جب وہ اپنے عروج پر تھا تو اُس کی بڑی قدر تھی اور وہ بہت مقبول تھا۔ نواب مصطفٰے خاں شیفتہ اپنے تذکرہ گلشن بیخار میں ناسخ کو آتش پر ترجیح

دیتے ہیں[1] اور شیخ صاحب ہی کے کلام کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ مگر غالب اپنے ایک خط میں آتش کو فوقیت دیتے[2] ہیں اور لکھتے ہیں کہ ان کا کلام بہت مؤثر ہے حق یہ ہے کہ بندش کی چستی، الفاظ کی حلاوت اور مضمون کی بلندی میں

---

[1] نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ نے اپنے تذکرہ گلشن بیخار میں آتش کے حال میں جو اُن کا اور ناسخ کا مقابلہ کیا ہے وہ عجب گول گول الفاظ میں ہے جس سے کسی کی کمتری یا کسی کی برتری صاف طور پر نہیں ثابت ہوتی، فرماتے ہیں "مردم آن دیار آتش و ناسخ را کہ از اساتذہ مسلم آنجا است قریب ہم انگارند و ہر دو را ہموزن شمارند و تباحت این تحقیق لا یخفی علی من لہ حظ من الفہم" اگر ناسخ کو وہ فوقیت دیتے تو یقیناً اُن کے کلام کو بھی وہ ضرور پسند کرتے اور اس کے دیکھنے کا اشتیاق اُن کو ضرور ہوتا مگر تعجب ہے کہ اسی تذکرہ میں ناسخ کے حال میں لکھتے ہیں "دیوانے دیگر از افکار و قادش فراہم آمدہ و ہم در شہر رسید اما خاطر آسودگی از انتخاب آں باز ایستاد" اس سے ثابت ہوتا ہے کہ دوسرا دیوان دیکھنے کو نواب صاحب کا جی نہیں چاہا پھر کیونکر بالیقین کہا جا سکتا ہے کہ وہ ناسخ کو آتش پر فوقیت دیتے تھے۔

[2] مرزا غالب نے اپنے ایک خط میں جو چودھری عبدالغفور کے نام ہے یہ قطعہ نقل کیا ہے ؎

اگرچہ شاعرانِ نغز گفتار ۔۔۔ زیک جام اندر بزم سخن مست
ولے با بادۂ بعضے حریفاں ۔۔۔ خمارِ چشم ساقی نیز پیوست
مشو منکر کہ در اشعار این قوم ۔۔۔ ورائے شاعری چیزے دگر ہست

اس کے بعد اس "چیزے دگر" کی مثال میں میر تقی میر، سودا، مومن، اور قائم کا ایک ایک شعر پیش کر کے لکھا ہے کہ "ناسخ کے یہاں کمتر اور آتش کے یہاں بیشتر یہ تیز نشتر ہیں"۔

آتش کو ناسخ پر یقیناً فوقیت حاصل ہے۔ آتش کے یہاں الفاظ نہایت شیریں اور مزیدار ہوتے ہیں۔ بخلاف ناسخ کے کہ اُن کو موٹے موٹے الفاظ کا شوق ہے آتش کے اشعار نیچرل ہوتے ہیں۔ اُن میں بے تکلفی اور تڑپ ناسخ کی نسبت زیادہ ہوتی ہے آتش کے خیالات بہت رفیع ہیں اور اُن کا کیرکٹر آزادانہ اور فقیرانہ ہے جسکی ناسخ کے یہاں کمی ہے۔ صوفیانہ مضامین بہ نسبت ناسخ کے آتش کے یہاں بہت زیادہ ہیں مختصر یہ کہ ناسخ کے کلام میں صرف شکوہ الفاظ اور استعارات اور تشبیہیں ہیں اور جو مزہ اور حلاوت کہ آتش کے یہاں ہے اسمیں مطلق نہیں ہے۔ زبان کی صحت اور صفائی دونوں کے یہاں ہے مگر اس میں شک نہیں کہ بحیثیت ایک حقیقی شاعر کے آتش کو ناسخ پر ترجیح ہے۔

شاگرد آتش کے مشہور شاگرد حسب ذیل تھے۔ رند، صبا، خلیل، نسیم، نواب مرزا شوق اور آغا حجو شرف۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

آئے بھی لوگ بیٹھے بھی اُٹھ بھی کھڑے ہوئے — میں جا ہی ڈھونڈتا تری محفل میں رہ گیا

اللہ رے شوق اپنی جبیں کو خبر نہیں — اُس بُت کے آستانہ کا پتھر رگڑ گیا

بڑا شور سُنتے تھے پہلو میں دل کا — جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا

قاصدوں کے پاؤں توڑے بدگمانی نے مری — خط دیا لیکن نہ بتلایا نشانِ کوئے دوست

اُس بلا جاں سے آتش دیکھیے کیونکر نبھے — دل سوا شیشہ سے نازک دل سے نازک خوئے دوست

مشتاق درد عشق جگر بھی ہے دل بھی ہے — کھاؤں کدھر کی چوٹ بچاؤں کدھر کی چوٹ

کوچۂ یار میں سایہ کی طرح رہتا ہوں — در کے نزدیک کبھی ہوں کبھی دیوار کے پاس

رخسار زرد پر مرے بہتے ہیں اشک خوں — یکجا دکھا رہے ہیں خزاں و بہار رنگ

یہ کیفیت اُسے ملتی ہے ہو جسکے مقدر میں ۔۔۔ مئے اُلفت نہ خم میں ہے نہ شیشہ میں نہ ساغر میں

پر کترتا ہی مرے صیاد تو کاٹ اسطرح ۔۔۔ حسرت پرواز بھی اُڑ جائے بال و پر کے ساتھ

باغ میں آئے ہو ساتھ انکے بھی پھر لو دو گام ۔۔۔ کبک و طاؤس کا جھگڑا ہی چکاتے نہ چلو

ہنسنے والا نہیں ہے رونے پر ۔۔۔ ہمکو غربت وطن سے بہتر ہے

پیامبر نہ میسّر ہوا تو خوب ہوا ۔۔۔ زبان غیر سے کیا شرحِ آرزو کرتے

سوائے نام کے باقی اثر نشان سے نہ تھے ۔۔۔ زمیں سے دب گئے دبتے جو آسماں سے نہ تھے

شگفتہ رہتی ہے خاطر ہمیشہ ۔۔۔ قناعت بھی بہار بےخزاں ہے

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے ۔۔۔ ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

نقش پائے رفتگاں سے یہ صدا ہے آرہی ۔۔۔ دو قدم میں راہ طی ہو شوق منزل چاہیئے

افسوس ہے فرہاد کو پہلے ہی نہ سوجھی ۔۔۔ سر پھوڑ کے مرجائیے اس کوہکنی سے

رند نواب سید محمد خاں متخلص بہ رند سراج الدولہ نواب غیاث محمد خاں کے بیٹے تھے سنہ ۱۲۱۲ھ میں فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ چونکہ نواب وزیر کے خاندان سے قریبی تعلق تھا (ان کے والد نواب برہان الملک سعادت خاں کے حقیقی بھانجے تھے) اسواسطے بہو بیگم صاحبہ کے دامن تربیت میں ناز و نعمت سے پرورش پائی جب تک فیض آباد میں رہے اپنا کلام میر مستحسن خلیق کو دکھلاتے اور وفا تخلص کرتے تھے سنہ ۱۲۴۰ھ میں لکھنؤ چلے آئے اور یہیں سکونت اختیار کر لی۔ لکھنؤ آکر خواجہ حیدر علی آتش کے شاگرد ہوئے۔ اور اب رند تخلص رکھا۔ پہلا دیوان جو "گلدستہ عشق" کے نام سے مشہور ہے سنہ ۱۲۵۰ھ میں مرتب ہوا۔ دوسرا دیوان انکی وفات کے بعد شائع ہوا۔ تخلص کی مناسبت سے رندانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ اور دربار اودھ کی

مشہور عیش و عشرت اور مزہ داریوں کا پورا لطف اُٹھاتے تھے۔ اپنے اُستاد آتش کے مرنے کے بعد شراب چھوڑ دی تھی اور منہیات سے تائب ہوگئے تھے۔ اسی عرصہ میں بارادۂ حج روانہ ہوئے۔ مگر راستہ میں بمقام بمبئی عین غدر شروع ہونے سے کچھ دنوں پہلے سفر آخرت اختیار کیا۔ کلام ان کا نہایت صاف اور سادہ ہے جسمیں محاورات کی برجستگی اور تاثیر کا رنگ جھلکتا ہے۔ بلند پروازی اور خیال آفرینی ان کے یہاں کم ہے۔ مگر مذاق شعر بہت سلیم ہے اور ان کے اشعار مہذب کانوں پر ناگوار نہیں ہوتے۔ کچھ ایسے بھی اشعار پائے جاتے ہیں جن میں روحانیت اور تصوف کی جھلک ہے غرضکہ آتش کے شاگردوں میں ان کا بہت بڑا درجہ ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے۔

دید لیلیٰ کے لیے دیدۂ مجنوں ہے ضرور میری آنکھوں سے کوئی دیکھے تماشا تیرا

ولہ

پھینکدینگے اسے ہم چیر کے پہلو اپنا تجھپہ قابو نہیں دل پر تو ہے قابو اپنا

ولہ

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

مقابلہ کرو۔

بنال بلبل اگر بامنت سر یاریست ٭ کہ ما دو عاشق زاریم و کار ما زاریست (حافظ)

ای بلبل اگر نالی من با تو ہم آوازم ٭ تو عشق گلی داری من عشق گل اندامے (سعدی)

او دل ہدف تیر نگہ پھر کیا تو نے اگلے ہی مرے زخم جگر تھے ابھی آلے

ولہ

دو چار گام یاں سے ہی دو لتسرا ے دوست ٹوٹیں یہ پاؤں دیکھو تو آکر کہاں تھکے

قطعہ

بس اب آپ تشریف لیجائیے   گزرنی ہے جو کچھ گزر جائیگی
طبیعت کو ہوگا قلق چند روز   ٹھہرتے ٹھہرتے ٹھہر جائیگی

خلیل میر دوست علی متخلص بہ خلیل سید جمال علی کے صاحبزادہ تھے اور بدولی ملک اودھ کے رہنے والے تھے۔ یہ بھی آتش کے مشہور شاگردوں میں ہیں ۱۲۷۹ھ میں نواب نادر مرزا کی رفاقت میں کلکتہ گئے۔ ان کے کلام میں ناہمواری ہے بعض اشعار نہایت عمدہ اور بلند اور بعض بالکل معمولی ہیں۔ ان کو بھی غیر مانوس الفاظ اور رعایت لفظی کا بہت شوق ہے شعر عاشقانہ ہوتے ہیں مگر وہی عشق مجازی اور بعض میں ابتذال پایا جاتا ہے۔

نسیم پنڈت دیا شنکر کول متخلص بہ نسیم خلف پنڈت گنگا پرشاد کول آتش کے شاگرد اور مثنوی گلزار نسیم کے مشہور مصنف ہیں۔ پنڈت جی عموماً اپنے تخلص ہی سے مشہور ہیں۔ ایک معزز کشمیری خاندان سے تعلق رکھتے تھے ۱۲۲۷ھ میں پیدا ہوئے اور عین جوانی کی حالت میں ۱۲۶۰ھ میں بعمر ۳۲ سال انتقال کیا فارسی میں کافی دستگاہ رکھتے تھے اور بعہد امجد علی شاہ بادشاہ اودھ فوج میں بخشی گری کے عہدہ پر مامور تھے۔ بچپن ہی سے اُن کو شعر و سخن سے شوق تھا۔ چنانچہ اکثر اساتذۂ اُردو و فارسی کا کلام بخوبی پڑھا تھا بعمر ۲۰ سال آتش کے شاگرد ہوئے۔ ان کی زندۂ جاوید تصنیف مثنوی گلزار نسیم مثنوی میرحسن کے جواب میں ہے۔ مشہور ہے کہ پہلے یہ بہت ضخیم تھی مگر استاد کے کہنے سے اُنھوں نے اس کو مختصر کردیا۔ اور اب یہ اختصار کی ایک لاجواب مثال ہے۔ اس کا سنہ تصنیف ۱۲۵۴ھ

اور سنہ اشاعت ۱۲۶۰ھ ہے اُسوقت مصنف زندہ تھے اور اسکی اشاعت سے دفعتاً ان کی شہرت ہوگئی۔ اس کا ایجاز۔ روانی۔ مناسبت الفاظ۔ برجستگی محاورات۔ نادر تشبیہات و استعارات۔ یہ سب قابل تعریف ہیں۔ البتہ تصنع ضرور ہے۔ اور اسی وجہ سے اسکی حقیقی دلآویزی اور تاثیر میں کمی ہے۔ فن کے لحاظ اور تخیل کے اعتبار سے یہ ایک معرکۃ الآرا تصنیف ہے مثنوی سحر البیان سے اس کا مقابلہ ایک فضول سی بات ہے کیونکہ دونوں کا طرز جدا ہے۔ یہ مثنوی اسقدر مقبول ہوئی کہ اس کے بہت سے اشعار بطور ضرب المثل زبان پر چڑھ گئے ہیں۔ اس سے پنڈت دیا شنکر کا نام ہمیشہ کے لیے روشن ہے اور وہ اُردو کے ایک مایۂ ناز شاعر کہلائے جانے کے قرار واقعی مستحق ہیں۔

صبا۔ میر وزیر علی نام۔ میر بندہ علی کے بیٹے تھے لکھنؤ وطن تھا یہیں پیدا ہوئے اور یہیں ان کا نشوونما ہوا۔ اُن کے چچا میر اشرف علی نے اُن کو بیٹا بنایا تھا اور انھوں ہی نے اُن کو بقدر ضرورت عربی اور فارسی کی تعلیم دی تھی۔ صبا بہت خلیق اور ملنسار اور بڑے یار باش آدمی تھے۔ اُن کے دوست احباب ہر وقت اُن کے پاس رہتے تھے اور اُنکی خاطر تواضع یہ دل کھول کر کرتے تھے۔ دو سو روپیہ واجد علی شاہ کی سرکار سے اور تیس روپیہ ماہوار نواب محسن الدولہ کے یہاں سے ملتے تھے۔ خود آتش کے مشہور شاگرد تھے اور اپنے بھی بعض مشہور شاگرد چھوڑے ۱۲۷۱ھ میں گھوڑے سے گر کر جان دی۔ اِن کا ایک ضخیم دیوان عاشقانہ رنگ میں شائع ہوگیا ہے جسکا نام غنچۂ آرزو ہے ۱۲۷۲ھ۔ ایک مثنوی شکار نامہ واجد علی شاہ بھی اُنکی یادگار ہے۔ ان کے کلام میں تصنع اور آورد اور غیر مانوس الفاظ کی کثرت ہے۔ کبھی کبھی کوئی

تڑپتا ہوا شعر اپنے اُستاد آتش کے رنگ کا بھی کہہ جاتے ہیں۔

آغا حجو شرف

میر سادات حسین خاں نام عرف آغا حجو واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کے سمدھی یعنی مرزا حامد علی کوکب ولیعہد کے خسر تھے۔ غدر کے بعد اودھ کے مصیبت زدہ قافلہ کے ساتھ یہ بھی کلکتہ چلے گئے اور مٹیا برج میں ولیعہد کے ہمراہ تھے اتفاق سے ولیعہد کا عین جوانی میں انتقال ہو گیا جس سے ان کو سخت صدمہ ہوا جو کلام سے ظاہر ہو رہا ہے۔ اِن کا طرز کلام وہی ہے جو لکھنؤ اسکول کے شعرا کا ہے یعنی زبان نہایت صاف و سلیس۔ بندشیں اور ترکیبیں دلچسپ۔ البتہ مضمون آفرینی کی کمی ہے۔ فارسی اور عربی الفاظ ان کے کلام میں بہت کم ہیں۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

جہاں میں حسن پرستوں کی جان لینے کو — نکھر نکھر کے نکلتے ہیں خوبرو کیا کیا
ٹپک ٹپک کے کہیں گل بنا کہیں لالہ — چمن میں رنگ نہ لایا مرا لہو کیا کیا
زباں جو اُن کی شرف نشہ میں بہکتی ہے — مزے مزے کی وہ کرتے ہیں گفتگو کیا کیا

پھڑک کے جان نہ دیتا تو آہ کیا کرتا — قفس سے اور نکلنے کی راہ کیا کرتا

شاخ گل جھوم کے گلزار میں سیدھی جو ہوئی — پھر گیا آنکھ میں نقشہ تری انگڑائی کا

رما کے دھونی جو بیٹھا ہوں ناگ پر اُس کی — اسی لگیر کا مجھ کو فقیر ہونا تھا

اِس دور میں زبان میں کیا تغیرات ہوئے

تذکرہ جلوۂ خضر اور شعر الہند میں ایک مختصر فہرست اُن تغیرات کی دی ہے جو ناسخ اور آتش اور نیز اُنکے شاگردوں کے عہد میں نظم اُردو میں وقوع میں آئے وہ تغیرات یہ ہیں غیر مانوس اور موٹے موٹے فارسی و عربی الفاظ اور ترکیبوں کی کمی اکثر ہندی الفاظ جو ترک کر دیے گئے تھے اُنکا پھر داخل شعر کیا جانا صرف اُن محاورات کا استعمال جو حسن شعر کو بڑھائیں اور برمحل ہوں معشوق کا خط و خال گل و بلبل سرو و قمری وغیرہ کے رواج اور دور از کار تشبیہات و استعارات اور فضول مبالغوں کی کمی۔

باب ۹

دربار لکھنؤ اور اُس کے شعرا

واجد علی شاہ اختر کا عہد

جس طرح دلی اُردو شاعری کا گھوارہ تھا۔ اسی طرح اُس کے زوال کے بعد لکھنؤ اُس کا مسکن ومامن بن گیا۔ اس وجہ سے کہ دلی کے سب پرانے استاد مثل آرزو اور میر وسودا و سوز وغیرہ کے اپنا وطن چھوڑکر اور فرمانروایان اودھ کی داد ودہش اور جود وسخا کے افسانے سُن کر لکھنؤ چلے آئے۔ شاہانِ اودھ نے بادشاہان دہلی کے تتبع میں نہ صرف بڑے بڑے شاعر اپنے دربار میں جمع کئے تھے بلکہ خود بھی شعر وسخن کی طرف متوجہ ہو گئے تھے چنانچہ فرمانروایان ذیل جنکا مختصراً ذکر کیا جاتا ہے سب شاعر تھے۔

آصف الدولہ آصف نواب آصف الدولہ متخلص بہ آصف شعر وسخن کے بڑے قدردان ومُربّی تھے جنکی سخاوت اب تک ضرب المثل ہے۔ نواب یحییٰ خاں نام مرزا امانی عرف آصف تخلص تھا۔ نواب شجاع الدولہ بہادر کے فرزند دلبند اور جانشین تھے۔ ۲۷ برس کی عمر میں بمقام فیض آباد ۱۱۸۸ھ میں مسند نشین ہوئے۔

تاریخ جلوس یہ ہے ؎

گشت از پائے آصف الدولہ رونقِ مسندِ وزارتِ ہند

(اسمیں ۵ کے تعمیہ سے جو لفظ آصف الدولہ کی آخری ہ کے عدد ہیں ۱۱۸۹ھ نکلتے ہیں)
جب لکھنؤ دار السلطنت ہوا تو انھوں نے مشہور محل اور عمارتیں یہاں تعمیر کرائیں جو ابتک
انکی یادگار موجود ہیں انکو فن تعمیر کا بہت شوق تھا۔ اِن کے عہد میں انگریزوں کی
آمد اودھ میں زیادہ ہوئی اور ان کا رسوخ بڑھتا گیا۔ کئی انگریز اجارہ داری نوکری
و تجارت کے سلسلہ سے اودھ میں آئے۔ ریزیڈنسی کے خرچ کی تعداد لاکھوں تک
پہونچ گئی تھی۔ اس دربار میں ہندوؤں کو بڑے بڑے عہدے ملے تھے۔ راجہ
نول رائے صفدر جنگ کے دیوان تھے راجہ بینی بہادر شجاع الدولہ کے مشیر تھے
اور آصف الدولہ کے زمانے میں راجہ ٹکیت رائے، مہاراجہ جھاؤلال۔ اور
خوشحال رائے پسر راجہ نول رائے جلیل القدر عہدوں پر ممتاز ہوئے۔ شعر و شاعری
اور جملہ علوم و فنون کے بڑے قدردان تھے، خود بھی شعر کہتے تھے اور اپنا کلام میر سوز
کو برائے اصلاح دکھاتے تھے۔ نواب موصوف کے کلام میں اپنے استاد کی سی سادگی
اور صفائی ہے۔ اور تصنع اور تکلف جو ناسخ کے زمانہ میں وبال جان ہوگیا ان کے
یہاں نہیں ہے۔ ایک اردو دیوان ان سے یادگار رہے جسمیں تقریباً ۱۸۰ صفحات
میں غزلیں ۷۰ صفحات میں رباعیاں اور مخمس اور ۱۰۰ صفحات میں ایک
مثنوی ہے۔ انھیں کے مبارک عہد میں ملک الشعرا میرزا رفیع سودا اور خدائے سخن
میر اور میر سوز وغیرہ دلی سے لکھنؤ آئے اور انھیں کی سرکار دولتمدار کے مداح
اور وظیفہ خوار رہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے:—

جہاں تیغ اُس کی علم دیکھتے ہیں — وہاں اپنا سر ہم قلم دیکھتے ہیں
جو جلوہ صنم تجھ میں ہم دیکھتے ہیں — خدا کی خدائی میں کم دیکھتے ہیں

گزرتے ہیں سو خیال اپنے دل میں — کسی کا جو نقش قدم دیکھتے ہیں
بتوں کی گلی میں شب و روز آصف — تماشہ خدائی کا ہم دیکھتے ہیں

نواب وزیر علی خاں متخلص بہ وزیر و وزیری

آصف الدولہ کے بعد ۱۷۹۷ء میں انکے بیٹے وزیر علی مسند وزارت پر بیٹھے مگر چار ہی مہینے کے بعد ان کو انگریزوں نے معزول کر دیا کہا یہ گیا کہ وہ نواب آصف الدولہ کے صلب سے نہیں ہیں ممکن ہے یہ وجہ ہو کہ وزیر علی کے مزاج میں سرکشی تھی معزولی کے بعد وہ بنارس بھیجے گئے جہاں غصہ میں اُنھوں نے مسٹر چیری رزیڈنٹ کو مار ڈالا اور سرکشی و بغاوت شروع کر دی آخر کار جے پور میں جہاں کہ اُنھوں نے پناہ لی تھی گرفتار ہو کر انگریزوں کے حوالے کئے گئے پھر وہ سرکاری حکم سے قلعۂ فورٹ ولیم میں قید کئے گئے۔ وزیر علی شعر کہتے تھے اور وزیر تخلص کرتے تھے۔ ایک غزل کے چند اشعار جو مصیبت کی حالت میں لکھے تھے درج کیے جاتے ہیں۔

جوں سبزۂ زندے اُگتے ہی پیڑوں کے تلے ہم — اس گردش افلاک سے پھولے نہ پھلے ہم
ارمان بہت رکھتے تھے ہم دل کے چمن میں — بیٹھے نہ خوشی سے کبھی سائے کے تلے ہم
ہم وہ نہ قلم تھے کسی مالی کے لگائے — نرگس کے نہالوں میں تھے آصف کے پلے ہم
زندان مصیبت میں بھلا کس کو بلائیں — رہتے ہیں وزیری ہی سے دن رات ملے ہم

نواب سعادت علی خاں

نواب آصف الدولہ کے سوتیلے بھائی نواب سعادت علی خاں مسند وزارت پر متمکن ہوے۔ اُن کے عہد میں انگریزی گورنمنٹ سے ایک عہدنامہ کیا گیا جس سے انگریزوں کا رسوخ بڑھ گیا۔ اِن کا دو تہائی ملک ان کے قبضے سے نکل کر انگریزی علاقہ میں شامل ہو گیا۔ چونکہ ملک میں ہر طرف امن و امان تھا

بادشاہ کو عیش و عشرت کے سوائے اور کوئی کام نہ تھا۔ یہ بھی مثل اپنے بڑے بھائی آصف الدولہ کے علوم و فنون کے بڑے قدردان تھے اور خود بھی کبھی کبھی شعر کہتے تھے گوکہ ان کا کوئی کلام نہیں ملتا۔ مصحفی اور انشا کے مشہور معرکے انھیں کے زمانہ کی یادگار ہیں۔ سید انشا سعادت علی خاں کے دربار کے شاعر تھے اور جان بیلی انگریزوں کی طرف سے ریزیڈنٹ۔

غازی الدین حیدر — نواب سعادت علی خاں کے بعد اُن کے بیٹے غازی الدین حیدر مسند وزارت پر ۱۸۱۴ء میں جلوہ افروز ہوئے۔ اور پانچ برس بعد نواب گورنر جنرل بہادر لارڈ ہیسٹنگز نواب وزیر سے بادشاہ کہلائے جانے لگے چنانچہ جب ۱۸۱۹ء میں انکی تخت نشینی ہوئی تو اسقدر ساز و سامان اور تکلف اس تقریب میں کیا گیا کہ زر و جواہر بکثرت لٹائے گئے۔ ناسخ نے تاریخ کہی ؎

بگو ناسخ کہ ظلّ اللہ گردید

غازی الدین حیدر اُردو شعر کہہ لیتے تھے۔ مگر اُن کا کلام جو زیادہ تر منقبت اور مرثیہ کی صورت میں ہے اسقدر روکھا پھیکا اور بمزہ ہے کہ ڈاکٹر اسپرنگر کا قول اُن کے متعلق سچ معلوم ہوتا ہے کہ "اُن کے اشعار اس درجہ خراب ہیں کہ واقعی بادشاہ کا کلام معلوم ہوتے ہیں"۔

نصیر الدین حیدر — غازی الدین حیدر کے بعد اُن کے بیٹے نصیر الدین حیدر تخت سلطنت پر بیٹھے ان کا زمانۂ سلطنت ۱۸۲۷ء سے ۱۸۳۷ء تک ہے۔ مسند نشینی کی تاریخ ہی

جاودان سلطنت ہند مبارک باشد

جس سے بارہ سے تینتالیس نکلتے ہیں۔ یہ بھی مثل اپنے پدر بزرگوار کے ائمہ معصومین

کی شان میں اکثر کہا کرتے تھے۔ اور بادشاہ تخلص کرتے تھے۔ چنانچہ اُن کی یہ غزل مشہور ہے۔

یہ کس مست کے آنے کی آرزو ہے ۔۔۔ کہ ساقی لیے ساغرِ مشک بو ہے
سمایا ہے جب سے تو نظروں میں میری ۔۔۔ جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تو ہی تو ہے
جتاؤں میں کیا اپنا حالِ پریشاں ۔۔۔ عیاں زلفِ دلدار سے مو بمو ہے
چلو قبرِ فرہاد پر فاتحہ کو ۔۔۔ مگر آبِ شیریں سے لازم وضو ہے
شفق بن کے ہوتا ہے گردوں پہ ظاہر ۔۔۔ یہ کس کشتۂ بے گنہ کا لہو ہے
گلستاں میں جا کر ہر اک گل کو دیکھا ۔۔۔ نہ تیری سی رنگت نہ تیری سی بو ہے

رہے سایۂ پنجتن بادشہ پر
خداوندِ عالم نگہبان تو ہے

نصیر الدین حیدر کے بعد اُنکے حقیقی چچا محمد علی شاہ ۱۸۳۷ء لغایت ۱۸۴۲ء اور پھر ان کے بیٹے امجد علی شاہ (۱۸۴۲ء لغایت ۱۸۴۷ء) تخت نشین ہوئے۔ یہ بھی علوم و فنون کے مربی اور شعر و سخن کے قدر دان تھے۔ اور اُن کے زمانہ میں بھی شعرا انعام و اکرام اور وظائف اور مناصب سے سرفراز ہوتے تھے۔ ان کے بعد واجد علی شاہ کا زمانہ آیا۔ جو کسی قدر تفصیل طلب ہے لہذا علیحدہ لکھا جاتا ہے۔

اختر یہ تخلص سلطان عالم حضرت واجد علی شاہ آخری تاجدار اودھ کا ہے بعد وفات امجد علی شاہ اُن کے بیٹے سلطان عالم واجد علی شاہ بعمر ۲۰ سال ۱۸۴۷ء میں سریر آرائے سلطنت ہوئے ع مبارک مبارک ہو شاہانہ تاج ۱۲۶۳ھ تاریخ جلوس ہوئی۔ سلطان عالم کو فن تعمیر سے بیحد شوق تھا۔ تخت نشین ہوتے ہی

تعمیر قیصر باغ کا خیال پیدا ہوا۔ اُس کو عمارات و ایوان دلکشا۔ بارہ دری۔ نہر۔ وپُل سنگ مرمر و تصاویر رنگی سے مزین کیا مشہور ہے کہ دو کرور روپیہ اس عمارت میں صرف ہوا۔ یہاں ہر برسات میں ایک خاص میلہ ہوتا تھا جسکے تکلفات اور شان و شوکت بڑھے لوگونکی زبانی اب تک سنے جاتے ہیں سلطانعالم کو شروع میں چند روز انتظام مملکت کا شوق اور بعدالت و رعایا پروری کا ذوق رہا مگر نالائق مصاحبوں اور بدخواہ ہم نشینوں نے رفتہ رفتہ مزاج کو بدل دیا اور عیش وعشرت کی طرف مائل کر دیا۔ اب بجز محفل رقص و سرود اور کوئی مشغلہ باقی نہ رہا مثنوی غزالہ و ماہ پیکر کی تصنیف سے جلسہ رہس کی بنیاد پڑی۔ صدہا خوبصورت اور خوش گلو طوائفیں ملازم ہوگئیں جو محفل شاہی کو اپنے پراثر نغموں سے محظوظ کیا کرتی تھیں۔ غرضکہ اسی عیش وعشرت اور ناچ رنگ کی بدولت ملک میں انتہا درجہ کی بدنظمی پھیل گئی جسکی وجہ سے سلطنت انگریزی کو بار بار فہمایش کرنا پڑی۔ مگر اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ آخرکار ۱۳ جنوری ۱۸۵۶ء کو انتزاع سلطنت کا حکم سُنایا گیا۔ اور ایک ہفتہ کے اندر یہ عظیم الشان ملک جسکی آمدنی دو کرور سالانہ سے کم نہ تھی بادشاہ کے قبضہ سے نکل کر حکومت انگریزی میں شامل ہوگیا۔ سلطان عالم معزولی کے بعد کلکتہ بھیجدیے گئے اور یہ شعر کہتے ہوے کلکتہ چلے گئے ؎

رخصت اے اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں
در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں

جہاں تقریباً ڈیڑھ دو سال قلعۂ فورٹ ولیم میں نظربند کیے جانے کے بعد محلہ مٹیا برج میں قیام اختیار کیا۔ چونکہ سلطان عالم کو ہمیشہ سے فن تعمیر سے دلچسپی تھی یہاں بھی انھوں نے عالیشان کوٹھیاں اور پُرفضا باغات بنوانا شروع کیے اور تھوڑے ہی

عرصہ میں مٹیا برج لکھنؤ کا ایک مختصر نمونہ بن گیا۔ سلطان عالم نے جو سفر لکھنؤ سے کلکتہ تک کیا تھا اُس کا مختصر حال اپنی ایک مثنوی میں جس کا نام "حزنِ اختری" ہے۔ قلمبند کیا ہے۔

سلطان عالم کو مختلف چیزوں سے شوق تھا۔ مگر ہر بات میں نفاست اور جدت طرازی ملحوظ رہتی تھی۔ جانوروں اور مختلف اقسام کی چڑیوں سے اتنا شوق تھا کہ اُن کا کلکتہ کا چڑیا خانہ دیکھنے کے لیے لوگ دور دور سے آتے تھے۔ فن موسیقی اور علی الخصوص ناچنے اور بتانے کے لطیف فن میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ اسی طرح شعر و سخن کے بھی بیحد دلدادہ تھے۔ اور بڑے بڑے کامل اُستاد اس فن کے اپنے دربار میں جمع کر لیے تھے۔ اگر سچ پوچھیے تو انھیں شوقوں کی زیادتی نے یہ روز بد دکھایا۔ علاوہ اُردو کے ٹھیٹ ہندی میں بھی اُن کا کلام موجود ہے اور اُن کی بنائی ہوئی ٹھمریاں، دادرے وغیرہ جنمیں وہ "جان عالم پیا" تخلص کرتے تھے اب تک لکھنؤ میں زبان زد خاص و عام ہیں۔ کلکتہ ہی میں ۱۸۸۷ء میں اس دار فانی سے رحلت کی۔

تصانیف ان کی متعدد تصانیف اسوقت موجود ہیں۔ اور مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی جنمیں قصائد، غزلیات، مثنویاں، مرثیہ، وغیرہ سب شامل ہیں۔ تصانیف حسب ذیل ہیں۔

(۱) چھ دیوان بہ تفصیل ذیل سشتوع فیض۔ ثمر مضمون۔ سخن اشرف۔ گلدستۂ عاشقاں۔ ماہ ملک۔ نظم نامور

(۲) مثنویاں۔ حزن اختری (جس کا ذکر اوپر ہوا)۔ خطابات محلات۔

اِس میں اُن محلات کا ذکر ہے جن کے ساتھ عقد ہوا یا جن کے ساتھ متعہ ہوا - اور کن کن سے اولاد ہوئی اور کن کن کو طلاق دیا گیا - یہ مثنوی اُس وقت کی تصنیف ہے جب بادشاہ ایام غدر میں فورٹ ولیم میں قید تھے - بنی - نا جو - دُلھن - مثنوی در فن موسیقی - دریائے تعشق -

(۳) مراثی - جنکی تین جلدیں ہیں - ایک موسوم بہ جلد مراثی جسمیں ۲۵ مرثیہ یا دو ہزار ایک سو گیارہ بند ہیں - دفتر غم و بحر الم - اسمیں بائیس مرثیہ ہیں - ارشاد ایمان اسمیں ۳۳ مرثیہ ہیں -

(۴) قصائد اُردو و فارسی موسوم بہ قصائد المبارک

(۵) مباحثہ بین النفس والعقل -

(۶) صحیفۂ سلطانی - اس میں کچھ ادعیہ اور آیات قرآنی ہیں -

(۷) نصائح اختری -

(۸) عشق نامہ

(۹) رسالہ ایمان در بیان مصائب اہل بیت

(۱۰) دفتر پریشاں -

(۱۱) مقتل معتبر

(۱۲) دستور واجدی در سیاست مدن

(۱۳) صوت المبارک

(۱۴) ہیبت حیدری

(۱۵) جوہر عروض (۱۶) ارشاد خاقانی - یہ آخری دو کتابیں علم عروض میں ہیں

مختصر یہ کہ ان کی تصانیف کی تعداد تقریباً ۴۰ جلد ہوگی۔ اصلاح سخن میر مظفر علی آسیر
اور نواب فتح الدولہ برق سے لیتے تھے۔ برق کو مزاج شاہی میں خاص خصوصیت
حاصل تھی اور بادشاہ سے بہت محبت کرتے تھے۔ چنانچہ اسی وجہ سے ساتھ ہی
ساتھ کلکتہ گئے اور وہیں چند ماہ بعد ۱۸۵۷ء میں انتقال کیا۔ یہ شعر اُن کا اُن کے
حسب حال ہوا۔

برق جو کہتے تھے آخر وہی کر کر اُٹھے　　جان دی آپ کے دروازے پہ مر کر اُٹھے

آسیر برخلاف اس کے شرف رفاقت سے محروم رہے اور لکھنؤ ہی میں رہے۔
یہ بات سلطان عالم کو ناگوار گزری تھی۔ علاوہ آسیر اور برق کے اس عہد کے مشہور
شاعر۔ امانت۔ قلق۔ ہجر۔ سحر۔ ذکی۔ درخشاں۔ قبول۔ شفق۔ بیخود۔ ہنر۔ عطارد۔
ہلال۔ سرور تھے جن میں سے اکثر دامن دولت سے وابستہ بھی تھے۔ صاحبزادوں
میں نواب ولیعہد بہادر کوکب اور نواب برجیس قدر بہادر برجیس تخلص کرتے تھے۔

طرز کلام طرز کلام وہی ہے جو اُس زمانہ میں لکھنؤ کے شعرا کا عام رنگ تھا۔
رعایت لفظی کا اکثر خیال رہتا ہے سوز و گداز کی کمی ہے۔ البتہ اُن کی مثنوی
حُزن اختری جس میں مصائب سفر کا بیان ہے نہایت دلکش اور پُر تاثیر نظم ہے
اسکی سلاست اور فصاحت اور خوبی زبان کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ دیوانوں اور
مثنویوں کے علاوہ ان کے خطوط بھی بہت دلچسپ ہیں جو اُنھوں نے قیام کلکتہ
کے زمانہ میں اپنی محبوب بیوی نواب زینت محل کے نام لکھے تھے جن کو نواب اکلیل محل
یا ممتاز جہاں کے خطاب سے یاد کیا ہے۔ یہ خطوط بادشاہ کی اجازت سے مقفّٰی
اور مسجع دیباچہ کے ساتھ اکبر علیخاں توقیر نے جو بادشاہی منشی تھے جمع کئے۔ یہ خطوط

بترتیب سنہ جمع کئے گئے ہیں اور ۱۲۷۶ھ میں شائع کئے گئے۔ ان میں اکثر شاعرانہ انداز کے ساتھ نہایت محبت اور اخلاص سے اپنا اشتیاق اور لکھنؤ کی یاد کا دردانگیز صورت میں بیان کیا ہے۔ یہ خط اس لیے جمع کیے گئے تھے کہ بادشاہ کو قید کے مصائب اور اپنی پیاری بیوی کی مفارقت سے کسی قدر تسکین ہو۔

نمونۂ کلام یہ ہے :—

اس عشق نے رسوا کیا میں کیا بتاؤں کیا کیا   آہ دل ناشاد نے اور آسماں پیدا کیا

کمر دھوکا۔ دہن عقدہ۔ غزال آنکھیں پری چہرہ   شکم ہیرا بدن خوشبو۔ جبیں دریا۔ زباں عیسیٰ

برائے سیر مجھ سا رند میخانہ میں گر آئے   گرے ساغر۔ لنڈھے شیشا۔ ہنسے ساقی بہے دریا

یہی تشویش شب و روز ہے بنگالے میں   لکھنؤ پھر بھی دکھائے گا مقدر میرا

یہ تمنا نہ رہے زیست میں اے بارِ خدا   پھر مجھے لکھنؤ دنیا میں دکھائے غربت

ہاں وطن دیکھوں تو شاداں ہو دلِ زار مرا   یہ بھی ممکن ہے کہ روتے کو ہنسائے غربت

وسعتِ خلد سے بڑھکر ہے کہیں حبِّ وطن   تنگیٔ گور سے بدتر ہے فضائے غربت

یوں تو شاہانِ جہاں پر ہی پڑا وقت مگر   ختم ہے اختر بیکس پہ جفائے غربت

اسیر سید مظفر علیخاں متخلص بہ آسیر خلف سید امداد علی امیٹھی کے رہنے والے تھے کتب درسیہ علمائے فرنگی محل سے پڑھیں مصحفی سے اصلاح سخن لیتے تھے نصیر الدین حیدر کے زمانہ میں شاہی ملازمت شروع کی اور امجد علی شاہ کے عہد میں اقتدار پایا۔ اسکے بعد آٹھ نو سال تک واجد علی شاہ کے مصاحب خاص رہے اور تدبیر الدولہ مدبر الملک کے

معزز خطاب سے سرفراز ہوئے۔ بادشاہ کبھی کبھی اپنے کلام میں بھی ان سے مشورہ کرتے تھے جب بادشاہ کلکتہ جانے لگے تو اُنھوں نے رفاقت منظور کی جس سے بادشاہ آزردہ خاطر ہوئے جس کا ذکر جابجا اپنی تصانیف میں کیا ہے۔ بعد غدر نواب یوسف علیخاں والی رامپور۔ اور پھر اُن کے صاحبزادے نواب کلب علیخاں نے اِنکی اور ان کے کلام کی بڑی قدردانی کی۔ پھر مدت العمر اسی ریاست کے دعاگو رہے اور چھ ماہ رامپور اور چھ ماہ لکھنؤ رہا کرتے تھے سنہ ۱۲۹۷ھ مطابق سنہ ۱۸۸۰ء میں بعمر ۸۱ برس لکھنؤ میں انتقال کیا اور وہیں مدفون ہوئے۔ بہت مشاق اور پرگو شاعر تھے انکی تصانیف میں چھ دیوان اُردو ہیں جس میں سے چار چھپ چکے ہیں ایک دیوان فارسی اور ایک مثنوی "درۃ التاج" اور رسالہ عروض بھی شائع ہو گئے ہیں۔ ان کے علاوہ مرثیے اور قصائد بھی بہت سے لکھے ہیں۔ علم عروض اور فن نظم کے استاد کامل تھے۔ زبان پر انکی حیرت انگیز قدرت سب کو تسلیم ہے مگر کلام کا رنگ وہی ہے جو اُس زمانہ کے اہل لکھنؤ کا تھا۔ البتہ کبھی کبھی اس رنگ خاص سے علیحدہ ہو کر اچھے اچھے شعر نکالتے ہیں۔ شاگرد بھی بہت زبردست اور نامی گرامی پائے۔ مثلاً امیر مینائی ان کے علاوہ اِنکے دونوں بیٹے متخلص بہ حکیم و فضل اور نیر شوق اور واسطی بھی مشہور شاگرد اور صاحب دیوان شاعر تھے۔ نمونۂ کلام یہ ہے۔

کہنے کو یوں جہاں میں ہزاروں ہیں یار دوست — مشکل کے وقت ایک ہی پروردگار دوست

کس سے کہوں تلون ابنائے روزگار — دشمن یہ لاکھ بار ہوئے لاکھ بار دوست

ضد سے جتنا ہے یہاں کافر و دیندار میں فرق — زاہدا اتنا تو نہیں سبحہ و زنار میں فرق

زنجیر تعلق مرے پاؤں سے تو نکلے — ہے فاصلہ دو گام کا ہستی سے عدم تک

آیا ہے ہمکو ہاتھ یہ مضموں چراغ سے   روشن اُسی کا نام رہے جو جلائے دِل

امانت سید آغا حسن خلف میر آغا رضوی لکھنوی روضۂ مشہد مقدس کے کلید بردار سید علی رضوی کی اولاد سے تھے شروع میں مرثیہ گوئی کا شوق ہوا۔ میاں دلگیر کو جو اُس زمانہ کے مرثیہ گویوں میں نامور تھے اپنا کلام دکھاتے تھے چند روز بعد غزل گوئی کی طرف توجہ کی۔ چونکہ میاں دلگیر نے اصلاح دینے سے انکار کیا انھوں نے بھی اصلاح لینا ترک کر دی۔ ۱۲۵۱ھ میں بیس برس کی عمر میں کسی عارضہ کی وجہ سے قوت گویائی جاتی رہی اور گونگے ہوگئے مجبوراً بذریعہ تحریر بات کرتے تھے۔ یہی حالت ۱۲۶۱ھ تک رہی آخر کار خدا کی قدرت سے یہ مرض جاتا رہا۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ کربلا جا کر زبان خود بخود کھل گئی اور قوت گویائی عود کر آئی۔ امانت کو معما اور چیستان کہنے کا بہت شوق تھا۔ انکی تصانیف سے دیوان خزائن الفصاحت۔ گلدستۂ امانت۔ اندر سبھا اور اکثر مرثیے شائع ہو چکے ہیں۔ ایک واسوخت بھی لکھا ہے جو نہایت اعلیٰ درجہ رکھتا ہے ان کی تصانیف میں واسوخت اور اندر سبھا کو خاص شہرت حاصل ہوئی۔ اندر سبھا کو انوکھی اور دلچسپ کتاب ہونے کی وجہ سے اور نیز اس وجہ سے کہ اُردو ڈراما کی حیثیت سے یہ سب سے پہلی تصنیف ہے۔ اپنے جانشین دو لڑکے چھوڑے لطافت اور فصاحت جو اپنے اپنے رنگ میں شعرائے لکھنؤ میں بہت نامور ہوئے۔ اِن کا انداز کلام خاص ہے یعنی رعایت لفظی اور صنائع بدائع کا اسقدر شوق تھا کہ بعض شعر محض لفظی گورکھ دھندا معلوم ہوتے ہیں۔ لکھنؤ اسکول کے رنگ کے سب سے بڑے برتنے والے یہی ہیں جن کے لفظ لفظ سے تصنع اور

بنوٹ ظاہر ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر چند شعر لکھے جاتے ہیں۔

شمع روئے یار سے روشن مرا کاشانہ ہو بزم عالم میں یہ ہر شب ہے امانت کی دعا

کانٹے اب دیکھے نہیں جاتے زبانِ خار کے فی سبیل اللہ پانی ان کو دو اے آبلو

برعکس اسکے کہیں کہیں نہایت صاف اور مزیدار شعر بھی نکل آتے ہیں۔

موتی پرو رہا ہوں ترے بال بال میں آنسو رواں ہیں زلف سیہ کے خیال میں

زخم کیسوت ہے خون آنکھوں سے جاری اندنوں عشق کا خنجر لگا ہے دل پہ کاری اندنوں

ساقی مہوش ہو مے ہو شیشہ ہو پیمانہ ہو فصل گل ہو رات دن بس ہم ہوں اور میخانہ ہو

کاسۂ سر ہاتھ میں لے کر گدائی کیجئے کوچۂ قاتل تلک اے دل رسائی کیجئے

آفتاب الدولہ قلق

خواجہ ارشد علیخاں عرف خواجہ اسد اللہ ملقب بہ آفتاب الدولہ خواجہ وزیر کے بھانجے اور شاگرد بھی تھے۔ وہ اپنے آپ کو واجد علی شاہ کا بھی شاگرد بتاتے تھے۔ جو خوشامد اور زمانہ سازی پر مبنی معلوم ہوتا ہے اور واقعیت سے دور ہے۔ ان کے کلام میں محض لفظی تصنعات اور مثنوی میں تو اکثر جگہ ابتذال و رکاکت بھی پائی جاتی ہے۔ اسمیں کوئی شک نہیں کہ بلحاظ زبان کے انکا کلام بہت مستند اور قابل قدر ہے مگر شعر کی حقیقی خوبیوں سے معرّا ہے۔ ان کی مشہور مثنوی طلسم الفت نہایت دلچسپ اور قابل قدر کتاب ہے۔ ان کے دیوان موسوم بہ مظہر عشق کے شروع میں چند قصیدے واجد علی شاہ کی تعریف میں ہیں۔ ایک مخمس بھی ان کی تصنیف سے ہے جسمیں بادشاہ کی نظربندی کا حال نہایت دردناک طریقہ سے لکھا ہے۔ سچ پوچھیے تو یہ رنج و افسوس محض اپنے عیش و عشرت کے مفقود ہونے کی وجہ سے ہے نہ کہ حُبِّ وطن اور بادشاہ کی محبّت کے خیال سے۔

ذکی — مہدی علیخاں متخلص بہ ذکی شیخ کرامت علی کے بیٹے تھے۔ لکھنؤ کے رہنے والے تھے مگر آخر عمر میں مُراد آباد جا رہے تھے۔ غازی الدین حیدر کے عہد میں لکھنؤ آئے اور شیخ ناسخ کے شاگرد ہوئے۔ ایک قصیدہ بادشاہ کی تعریف میں پڑھا جسکے صلہ میں انعام واکرام پایا۔ یہاں سے وہ دہلی اور پھر دکن گئے جہاں اُنکی بڑی قدرومنزلت ہوئی۔ دکن سے لَوٹ کر واجد علی شاہ کے زمانہ میں پھر لکھنؤ آئے جنھوں نے اُن کو ملک الشعرائی کا خطاب عنایت کیا۔ بعد انتزاع سلطنت مراد آباد میں سکونت اختیار کرلی تھی مگر نواب یوسف علیخاں والی رام پور کی سرکار سے چند روز وابستہ رہے۔ نواب صاحب کے انتقال کے بعد انبالہ گئے اور وہیں ۱۳۰۱ھ میں انتقال کیا۔ علم عروض سے خوب واقف تھے اور اس فن میں ایک رسالہ بھی لکھا ہے جو ۱۲۶۵ھ میں شائع ہوا تھا۔ مشاق اور خوشگو شاعر تھے۔ اور دوسرے درجہ کے شعرائے لکھنؤ میں بلند پایہ رکھتے تھے۔

درخشاں — سید علیخاں مخاطب بہ مہتاب الدولہ کوکب الملک ستارہ جنگ کا تخلص ہے۔ اسیر لکھنوی کے شاگرد تھے اور انھیں کی کوشش سے دربار رس ہو گئے تھے بادشاہ کے ساتھ کلکتہ گئے اور وہیں انتقال کیا۔ فن نجوم سے بھی کچھ واقفیت رکھتے تھے۔ شاید اسی مناسبت سے یہ خطاب دیا گیا ہو۔ معمولی قابلیت کے آدمی تھے۔

اختر — قاضی محمد صادق خاں اختر قاضی محمد لعل کے صاحبزادے ہگلی بنگالہ کے قاضی زادوں میں تھے وطن چھوڑ کر لکھنؤ آرہے تھے۔ یہ غازی الدین حیدر کا زمانہ تھا جنھوں نے ان کو ملک الشعرا کا خطاب دیا آخر مرزا قتیل کے شاگرد ہو گئے

اور مصحفی جرأت اور انشا وغیرہ کے مشاعروں میں شرکت کی ۔ چند دن فرخ آباد میں بھی قیام کیا تھا ۔ مشہور ہے کہ واجد علی شاہ نے اِن کا تخلص ان سے مانگ لیا تھا اور اسکے صلے میں بہت کچھ انعام واکرام دیا تھا ۔ تھوڑے عرصہ میں واجد علی شاہ کچھ ناراض ہو گئے جسکی وجہ سے ان کو لکھنؤ چھوڑنا پڑا اور اٹاوہ کے تحصیلدار ہو گئے جہاں ۱۸۵۸ء میں انتقال[۱] کیا ۔ اختر بڑے جامع کمالات اور لکھنؤ کے نامی شاعروں میں سے تھے ۔ فارسی بہت کہتے تھے چنانچہ ان کی فارسی تصنیفات حسب ذیل ہیں "محامد[۱] حیدریہ" غازی الدین حیدر کی تعریف میں ۔ "گلدستہ[۲] محبت" جس میں گورنر جنرل لارڈ ہیسٹنگز اور غازی الدین حیدر کی ملاقات کا حال ہے ۔ 'مثنوی[۳] سراپا سوز' 'صبح[۴] صادق' جو اپنی سوانحعمری آپ ہی لکھی ہے ۔ 'تذکرہ[۵] آفتاب عالمتاب' جسمیں پانچہزار فارسی شعرا کا حال اور کلام فراہم کیا تھا ۔ 'دیوان[۶] فارسی' 'بہار[۷] بےخزاں' 'بہار[۸] اقبال' 'ہفت[۹] اختر' ایک[۱۰] دیوان ریختہ'

یہاں ان کی مشہور غزل قطعہ بند بطور نمونہ کلام پیش کیجاتی ہے :—

جب پردہ رُخ سے دور کرے وہ نقاب کا ۔۔۔ جلوہ ہر ایک ذرہ میں ہو آفتاب کا
کل بن کے شیخ مجتہد عصر سا قیا ۔۔۔ دکھلا کے باغ سبز ثواب و عذاب کا
کہنے لگا زراہ تبختر مجھے بطنز ۔۔۔ معلوم ہوگا حشر میں پینا شراب کا
میں نے کہا کہ یہ تو ہیں ہم خوب جانتے ۔۔۔ پر کیا کریں کہ ہے ابھی عالم شباب کا
گستاخی ہو معاف تو اک عرض میں کروں ۔۔۔ کیجیے جو آپ مجکو نہ مورد عتاب کا
تقوے ہمارے آگے ہو جب آپ کا درست ۔۔۔ اور ہو یقین آپ کے اِس اجتناب کا

---

[۱] تذکرہ گل رعنا اور خمخانۂ جاوید وغیرہ میں ان کے حال میں لکھا ہے کہ لکھنؤ میں وفات پائی ۔

مے ہووے کنج باغ ہو ساقی ہو باہوش — اور واں مخل نہ ہو کوئی باعث حجاب کا

گردن میں ہاتھ ڈال کے وہ شوخ بیحجاب — دے ذائقہ زباں کو دہن کے لعاب کا

کھینچے ہنسی سے اپنا ملا کر وہ مُنہ سے مُنہ — یہ ریش جس پہ جلوہ ہی رنگِ خضاب کا

منت سے یوں کہے کہ ہمارا لہو پیے — گر پی نہ جاے جلد یہ پیالہ شراب کا

اُس وقت ہم سلام کریں قبلہ آپ کو — گر کچھ بھی خوف کیجیے روزِ حساب کا

اور امتحاں بغیر تو یہ آپ کا غلام
قائل نہیں ہے قبلہ کسی شیخ و شاب کا

باب ۱۰

مرثیہ اور مرثیہ گو

مرثیہ کی تعریف

۱۔ مرثیہ وہ صنف نظم ہے جسمیں کسی مردہ شخص کی تعریف کی جائے اہل اسلام اس کے بہت شائق رہے ہیں۔ یہ قصیدہ کے برعکس ہے کیونکہ قصیدہ میں کسی زندہ شخص کی تعریف کیجاتی ہے اصطلاح میں مرثیہ انھیں نظموں کو کہتے ہیں جس میں حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین اور دیگر شہدائے کربلا کی شہادت کا ذکر کیا جائے اور جو علی العموم محرم کے زمانہ میں کسی مجلس عزا میں یا کسی تعزیہ کے ساتھ بہت سوز و گداز اور خوش الحانی کے ساتھ پڑھے جاتے ہیں۔ ابتدا میں اس قسم کی نظمیں صرف بین کے اشعار تک محدود ہوتی تھیں یعنی اُن میں ممدوح کی صفات حسنہ کا بیان ہوتا تھا اور اسکی موت پر اظہار افسوس کیا جاتا تھا۔ اس قسم کے مرثیے بہت مختصر ہوتے اور اُنکی غرض اصلی صرف گریہ و بکا ہوتی تھی۔ امتداد زمانہ سے مرثیہ کا دائرہ وسیع ہوتا گیا اور اُسمیں مختلف قسم کے نئے نئے مضامین داخل ہونے لگے مثلاً چہرہ، ممدوح کے مناقب، دشمنوں کے معائب، مناظر جنگ، مناظر قدرت، رجز خوانی۔ گھوڑے اور تلوار کی تعریف۔ سامان حرب ضرب وغیرہ اس قسم کے مضامین کے اضافہ سے مرثیہ کا مرتبہ بڑھ گیا اور آخرکار وہ اُردو نظم کی ایک مستقل صنف بن گیا۔

مرثیہ کی قدامت

عرب کی شاعری کی ابتدا مرثیہ ہی سے معلوم ہوتی ہے۔ مگر جب شاعری شاعر کے ذاتی مفاد پر مبنی ہوگئی تو مرثیہ کو زوال ہونا شروع ہوا اس لیے کہ اس سے کسی قسم کے نفع کی امید نہ تھی۔ کیونکہ مرنے والا کسی کو کیا فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جسقدر قصیدہ گوئی کو جو ذاتی مفاد پر مبنی تھی ترقی ہوئی اُتنا ہی مرثیہ گوئی میں تنزل ہوا۔ فارسی شاعری کی بنیاد چونکہ تکلف آورد، اور مداحی پر قائم ہوئی تھی اس لیے اُسکی ابتدا قصیدہ گوئی سے ہوئی۔ اور وہ انواع سخن جنکو جذبات سے لازمی تعلق تھا جس میں مرثیہ بھی داخل ہے دفعتاً پستی کی حالت میں آگئے۔ ہر چند کہ قدما کے یہاں ایسے بعض شعر ملتے ہیں جن میں فطرتی اثر اور جوش پایا جاتا ہے مثلاً شاہنامہ میں مادر سُہراب کا اظہار رنج و الم اپنے پیارے بیٹے سُہراب کی موت پر یا فرخی کا مرثیہ محمود غزنوی کی وفات پر جو دس بارہ بیتوں سے زیادہ نہیں۔ مگر یہ یا اس قسم کے اور اشعار جو بینیہ ہوں آجکل کے خیال کے مطابق بمشکل مرثیہ کہے جا سکتے ہیں۔ اسکے بعد سعدی اور خسرو کا زمانہ آیا۔ انھوں نے بھی مرثیے لکھے مگر وہ مقبول نہیں ہوے۔ اور نہ لوگوں کو اِن کے تتبع کا زیادہ خیال پیدا ہوا۔ ملا محتشم کاشی گو کہ بیمثل مرثیہ نگار تھے۔ مگر اُنھوں نے بھی طرز قدیم میں کوئی اضافہ نہیں کیا۔ اسی طرح طالب آملی۔ غزالی۔ میلی۔ کلیم وغیرہ نے گو کہ اور اصناف سخن میں خوب خوب کہا ہے۔ مگر اُنکے مرثیے مشہور نہیں ہیں۔ اسی طرح ظہوری کے مرثیے جو علی عادل شاہ کے واسطے لکھے گئے تھے بجز تعریفوں کے اور کچھ نہیں۔ البتہ ملا مقبل نے اس صنف میں ایک خاص زور اور جوش پیدا کیا جس سے ایران میں ایک تغیر عظیم پیدا ہو گیا اور ایرانی شاعر اس کو بہت پسند کرنے لگے۔

اُردو مرثیہ کی ابتدا جیسا ہم بیان کر چکے ہیں اُردو شاعری کی ابتدا دکن میں ہوئی
تھی اور اسکی ابتدائی کوششوں میں صنف مرثیہ بھی داخل تھی۔ شاہان گولکنڈہ
و بیجاپور نہ صرف شاعروں کے قدردان تھے۔ بلکہ خود بھی مذہبی آدمی ہونیکی وجہ سے
مرثیہ وغیرہ خوب کہتے تھے مگر مرثیہ اُس زمانہ میں بالکل ابتدائی حالت میں تھا
ولی نے کوئی مرثیہ نہیں کہا۔ البتہ چند بند شاہ وجیہ الدین کی تعریف میں ہیں
اُن کو مرثیہ سمجھیے یا کچھ اور [ل]۔ اسکے بعد جب شعرائے دہلی کی ترقی کا زمانہ آیا تو یہ
لوگ مرثیہ کے بہت شائق تھے اور اس کو ایک مذہبی فرض سمجھکر لکھتے تھے۔
مرثیہ کی نظم میں چونکہ مذہبیت کا رنگ غالب ہوتا تھا اس لئے عیوب شاعری
پر نکتہ چینی کی نظر نہ ڈالی جاتی تھی۔ میر تقی نے اپنے تذکرہ نکات الشعراء میں اور
میر حسن نے اپنے تذکرہ میں اکثر ایسے شعرا کا حال لکھا ہے جو مرثیہ گو تھے مثلاً
میر امانی۔ میر عاصمی۔ میر آل علی۔ درخشاں۔ سکندر۔ صبر۔ قادر۔ گمان۔ ندیم وغیرہ
اسیطرح میر و سودا نے بھی مرثیے لکھے ہیں مگر ان میں کوئی خاص بات نہیں۔
اُن میں حقیقی جذبات و اثر کی کمی ہے۔ میر ضاحک اور میر حسن کے مرثیے کوئی
خصوصیت نہیں رکھتے البتہ اس لیے قابل قدر ضرور ہیں کہ یہ بزرگوار میر انیس کے
اجداد میں تھے۔ سودا کے وقت تک عموماً مرثیے چو مصرعے ہوا کرتے تھے غالباً
سب سے پہلے سودا نے مسدس لکھا جو اب تک مروّج ہے۔ اسی طرح ضمیر نے
مرثیہ کے مضمون میں اضافہ کیا اور اسمیں جدید تشبیہات و استعارات معرکہ کارزار
کے مفصل حالات۔ شاعرانہ استدلال اور دلچسپ مبالغے داخل کیے جو انہیں

[ل] تذکرہ گل رعنا میں لکھا ہے کہ ولی نے کربلا کے حالات میں ایک مثنوی لکھی ہے ۱۲۔

ودبیر کے زمانہ میں معراج کمال تک پہونچ گئے۔ ضمیر نے کلام میں زور بندش میں چستی اور صفائی پیدا کی اور سوز کی جگہ تحت اللفظ پڑھنے کی بنیاد ڈالی۔

بزرگان انیس اور انکی خدمات مرثیے کے ساتھ

ابھی ہم ذکر کر چکے ہیں کہ میر امانی۔ اور میر ضاحک اور میر حسن نے مرثیے کہے تھے مگر اب وہ ملتے نہیں۔ میر حسن کے چار بیٹے تھے جسمیں سے تین یعنی خلیق اور خُلق اور محسن شاعر تھے خُلق اپنے والد ہی کے شاگرد تھے صاحب دیوان ہیں اور مرثیہ بھی کہتے تھے اور سو برس کی عمر میں اُنھوں نے انتقال کیا۔ خلیق بھی بجاے خود ایک نہایت مشہور شاعر تھے جن کے حالات علیحدہ ذیل میں قلمبند کیے جاتے ہیں۔

خلیق

میر مستحسن خلیق میر حسن کے صاحبزادے عمر میں خلق سے چھوٹے تھے فیض آباد اور لکھنؤ میں تعلیم و تربیت پائی۔ سولہ برس کی عمر سے مشق سخن شروع کی اور چونکہ خود ان کو شعر گوئی کا بہت شوق تھا اور باپ کو بوجہ تصنیف مثنوی سحر البیان فرصت نہ تھی لہذا ان کو مصحفی کا شاگرد کرا دیا۔ تھوڑے دنوں میں یہ مشاق ہو گئے اور کلام اسقدر بامزہ ہونے لگا کہ ایک مرتبہ مرزا محمد تقی ترقی کے یہاں فیض آباد میں مشاعرہ تھا جس میں خواجہ حیدر علی آتش بھی بلائے گئے تھے اور خیال تھا کہ وہ وہیں روک لئے جائینگے۔ جب شروع جلسہ میں خلیق نے غزل پڑھی۔ جس کا مطلع تھا۔

رشک آئینہ ہے اُس رشک قمر کا پہلو   صاف اِدھر سے نظر آتا ہے اُدھر کا پہلو

تو آتش نے اپنی غزل پھاڑ ڈالی اور کہا کہ جب ایسا شخص یہاں موجود ہے تو پھر میری کیا ضرورت ہے۔ تھوڑے عرصے کے بعد جب میر حسن کا انتقال ہو گیا تو

عیال کا بوجھ سر پر پڑا۔ چونکہ آمدنی کچھ نہ تھی لہذا غزلوں کی فروخت سے اپنا کام چلاتے تھے۔ میر خلیق ایک پرگو شاعر تھے ایک دیوان مرتب کرلیا تھا مگر وہ شایع نہ ہوسکا۔ آخری عمر مرثیہ گوئی میں صرف کی اور ضمیر اور فصیح اور دلگیر کے معاصر تھے۔ میاں دلگیر ناسخ کے شاگرد تھے مگر چونکہ زبان میں لکنت تھی اس لیے اپنا کلام خود نہ پڑھتے تھے۔ البتہ مرثیہ کو قدیم رنگ سے علیحدہ کرکے اُسمیں کچھ جدتیں پیدا کی تھیں۔ مرزا فصیح (شاگرد ناسخ) و دلگیر احج کو گئے اور وہیں رہ گئے اب صرف ضمیر اور خلیق کے واسطے میدان مرثیہ گوئی رہگیا تھا۔ لہذا یہ دونوں باکمال ایک دوسرے پر سبقت لیجانے کیلئے کاوشیں کرتے تھے جسکا نتیجہ مرثیے کی تکمیل و ترقی کیواسطے بہت اچھا نکلا۔ مرثیہ کی صورت میں یہ تغیر ہوا کہ بجائے چومصرعہ کے اب مسدس کا رواج ہوا۔ اسکی ابتدا سودا سے ہوئی تھی اور خلیق نے اسکو پھیلایا۔ سلام بھی بطرز غزل کہے جانے لگے مرثیہ پڑھنے کا طریقہ بجائے سوز کے تحت اللفظ مقرر ہوا۔ جو غزل مستزاد کے اسلوب پر کہی جاتی وہ نوحہ کہلاتی اور اُسکو سوز ہی کے اسلوب میں پڑھتے تھے۔ پہلے مرثیہ چالیس پچاس بندوں تک محدود تھا میر ضمیر پہلے شخص ہیں جنھوں نے اُس کو طول دیا۔ اس طرح کہ پہلے تمہید پھر سراپا۔ پھر میدان جنگ کا نقشہ دکھلا اور خاتمہ شہادت پر کیا۔ اس جدت کی بڑی قدر ہوئی اور اس نے مرثیہ گوئی کے عالم میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا اس وجہ سے کہ قدیم زمانہ میں مرثیے محض حصول ثواب کی غرض سے رونے رلانے کیواسطے ایک مقررہ طریقہ پر کہے جاتے تھے اب اُسمیں دوسری چیزیں شامل کی جانے لگیں جنکی جانچ پرتال بھی اُسیطرح کی جاتی تھی جس طرح اساتذۂ شعرا کے کلام کی ہوتی ہے۔ ان جدید مطالب کے

اضافہ سے مرثیہ گوئی کے قالب میں ایک نئی روح پھونکی گئی اور اسکی بوسیدہ ہڈیوں پر اس اضافہ سے نیا گوشت پوست چڑھایا گیا۔ اور اب وہ شاعری کی ایک موقر صنف قرار پایا جس سے کہ اب اکثر فرقہ ہاے اسلام یہانتک کہ اہل ہنود بھی دلچسپی لیتے ہیں اور بہت ذوق و شوق سے سنتے ہیں۔ میر خلیق کا بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اُنھوں نے صفائی زبان اور صحت محاورہ پر بہت توجہ کی اور درد و اثر کو خالی تشبیہوں اور لفظی مناسبت کے مقابلے میں زیادہ ملحوظ رکھا۔ اور یہی فرق انکے اور میر ضمیر کے یہاں مابہ الامتیاز ہے۔ انیس نے بھی اس معاملہ میں اپنے پدر بزرگوار کی پوری پیروی کی۔ اسیطرح پڑھنے کے طریقے میں بھی میر انیس نے اپنے والد ہی کا تتبع کیا۔ یہ زیادہ تر اعضا کی حرکت سے کام نہ لیتے تھے بلکہ صرف آنکھ کی گردش یا خفیف سی گردن کی جنبش سے سب کام نکالتے تھے۔ میر خلیق کا خاندان زبان اردو کی صحت اور محاوروں کی صفائی کے لیے مشہور رہے۔ چنانچہ ناسخ اپنے شاگردوں سے برابر کہتے تھے کہ اگر زبان سیکھنا ہو تو خلیق کے گھرانے سے سیکھو۔

میر انیس

میر ببر علی انیس ۱۲۱۶ھ یا ۱۲۱۷ھ میں بمقام فیض آباد محلہ گلاب باڑی میں پیدا ہوے جہاں ان کے والد رہتے تھے۔ اپنے والد کے سایۂ عاطفت میں تعلیم و تربیت پائی۔ لکھنؤ میں اُسوقت آئے جب اُن کے بڑے صاحبزادے میر نفیس پیدا ہو چکے تھے۔ چھوٹے بھائی اُنس ہمراہ تھے۔ ابتدا میں فیض آباد کے تعلقات بالکل منقطع نہیں ہوئے اس وجہ سے کہ باپ اور بھائی وہیں رہتے تھے مگر جب بعد کو پورا خاندان لکھنؤ چلا آیا تو یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ ابتدائی کتابیں مولوی حیدر علی صاحب سے اور صدر المفتی میر عباس صاحب سے

پڑھی تھی۔ ورزش کے بہت شائق تھے اور فنون سپہ گری میر کاظم علی اور اُن کے بیٹے
میر امیر علی سے حاصل کیے جو اس فن میں اُس زمانہ کے اُستاد مانے جاتے تھے۔
فن شہسواری سے بھی واقف تھے۔ فن سپہگری کی معلومات جنگ کے مناظر وغیرہ
دکھانے میں بہت کارآمد ثابت ہوئی۔ حُسن تنا سب کے ایسے عاشق تھے کہ خواہ وہ انسان
میں ہو یا کسی دوسری شے میں اُسکی دل سے قدر کرتے تھے۔ اُن کو اپنی عزّت
خاندانی پر بڑا فخر تھا اور خودداری اور عزت خاندانی کا ہمیشہ خیال رہتا تھا۔
وضعدار بھی بہت بڑے تھے ملنے جلنے میں رکھ رکھاؤ کا بہت خیال رکھتے تھے۔
ایک وقت معینہ پر لوگوں سے ملاقات کرتے تھے کوئی شخص حتیٰ کہ اُن کے گھر والے
بھی بغیر اطلاع اُن کے پاس نہیں آسکتے تھے۔ امرا سے بہت کھنچکر ملتے تھے۔ یہانتک
کہ بادشاہ وقت کے یہاں بھی اُسوقت تک نہیں گئے جبتک کہ ایک معتمد شاہی
اُن کو لینے نہ آیا۔ وہ اپنی عزت خاندانی اور عزت پیشہ کو سب باتوں پر مقدم سمجھتے
تھے آئین وضعداری کے بہت سختی سے پابند تھے جسکو انھوں نے اپنے اور اپنے
احباب اور ملنے والوں کے واسطے مقرر کرلیا تھا۔ وضع اور لباس بھی خاص تھا
جسکو اُنھوں نے عمر بھر نباہا۔ لوگ جس طرح اُن کے کلام کی عزت کرتے تھے اسی طرح
اُنکی پابندی وضع کے بھی قدردان اور مداح تھے۔ ایک مرتبہ نواب تہور جنگ ایک
رئیس حیدرآباد نے میر صاحب کی جوتیاں اُٹھا کر اُنکی پالکی میں رکھدیں اور اس پر
اُن کو بڑا فخر و ناز تھا۔ یہ اُن کے مزاج کی خودداری قناعت اور استغنا کا نتیجہ تھا
کہ کبھی کسی کی تعریف میں یا روپیہ کے لالچ میں ایک حرف زبان سے نہیں کہا
البتہ امرائے لکھنؤ جو ہدایا و تحائف مداح آل رسول سمجھ کر پیش کرتے تھے اُس کو

شبیہ میر ببر علی انیس اعلیٰ اللہ مقامہ

میر مونس لکھنوی

قبول بھی کر لیتے تھے۔

میر انیس لکھنؤ سے تا انتزاع سلطنت کبھی باہر نہیں نکلے۔ جب کبھی باہر جانیکا ذکر ہوتا تو فرماتے کہ اس کلام کو اسی شہر کے لوگ خوب سمجھ سکتے ہیں اور کوئی اسکی قدر کیا کریگا اور ہماری زبان کا لطف کیا اُٹھائے گا۔ لیکن تباہی لکھنؤ کے بعد پہلی مرتبہ ۱۸۵۹ء میں اور پھر ۱۸۶۰ء میں نواب قاسم علیخاں کی طلب اور اصرار سے پٹنہ عظیم آباد تشریف لیگئے اور واپسی میں بنارس میں بھی ایک مرتبہ ٹھہرے تھے۔ اس کے بعد ۱۸۷۱ء میں مولوی سید شریف حسین خاں کی تحریک اور نواب تہور جنگ بہادر کے سخت اصرار سے دکن حیدر آباد گئے اور لوٹتے ہوئے الٰہ آباد میں قیام کیا۔ اور ان سب مقامات پر اپنے معرکۃ الآرا مرثیوں سے لوگوں کو مستفیض اور داخل حسنات کیا۔ جس مجلس میں پڑھتے لوگ اس کثرت سے جمع ہو جاتے تھے کہ باوجود سخت انتظام اور پہروں کے بھی چپہ بھر زمین سننے والوں سے خالی نہ رہتی تھی۔ جب دوسرے شہروں کا یہ حال تھا تو پھر خاص لکھنؤ کا کیا پوچھنا ہے جو قدردانی اور کمال کا سرچشمہ تھا۔ میر صاحب کا انتقال بعارضہ بخار ۱۲۹۱ھ مطابق ۱۸۷۴ء میں ہوا[1]۔ اور اپنے باغ ہی میں دفن ہوئے۔

میر انیس بحیثیت شاعر میر صاحب خلقی شاعر تھے اور شاعری ورثہ میں پائی تھی۔ کوئی خاندان اتنا زبردست سلسلہ مشہور اور قابل شعراء کا نہیں پیش کر سکتا۔

---

[1] کسی نے کیا خوب مادۂ تاریخ نکالا ہے جسمیں مصرعہ کے ایک جزو سے میر انیس اور دوسرے جزو سے مرزا دبیر کی وفات کا سن نکلتا ہے مصرعہ یہ ہے ع

غم انیس میں ہے ہے۔ دیا دبیر کا غم
۱۲۹۱ ۱۲۹۲

لہذا جو فخر میر صاحب کو اپنے خاندان پر تھا وہ بجا تھا۔ میر صاحب نے بچپن ہی
میں جبکہ فیض آباد میں قیام تھا شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ پہلے حزیں تخلص کرتے
تھے شاید اس مناسبت سے کہ اُن کے پردادا میر ضاحک اور مشہور شاعر شیخ علی حزیں
میں بہت ربط و ضبط[1] تھا۔ جب لکھنؤ آئے تو اُن کے والد اُن کو ناسخ کے پاس لیگئے
ناسخ نے کہا کہ تخلص کو بدل دو چنانچہ ایسا ہی کیا انیس تخلص اختیار کیا۔ انیس نے
کم سنی سے مرثیہ کہنا شروع کر دیا تھا اور تھوڑے ہی دنوں کی مشق میں درجۂ کمال کو
پہنچ گئے تھے۔ چنانچہ انکی شہرت ان کے والد کے زمانہ میں ہو چکی تھی۔ جب خلیق اور
ضمیر میدان مرثیہ گوئی سے ہٹ گئے تو دبیر و انیس کا زمانہ آیا جنھوں نے اس
فن کو معراج کمال تک پہونچا دیا۔

تصانیف میر صاحب نے ہزارہا مرثیے، سلام، قطعات، رباعیاں لکھی ہیں۔
افسوس ہے کہ اُن کا پورا کلام اب تک شائع نہیں ہوا مگر جسقدر چھپ چکا ہے
پانچ جلدوں میں ہے۔ مابقی اُن کے اعزہ کے پاس محفوظ ہے۔ مشہور ہے کہ
انھوں نے ڈھائی لاکھ شعر کہے تھے جن میں کچھ غزلیں بھی تھیں۔
جس طرح اُن کا کلام لاجواب ہے اسی طرح اُن کے پڑھنے کا طریقہ بھی لاجواب تھا
اُن کی آواز، قد و قامت، صورت۔ غرض ہر شے اس کام کے لئے موزون واقع
ہوئی تھی۔ پڑھنے کا طریقہ یہ تھا کہ بڑا آئینہ سامنے رکھکر تنہائی میں بیٹھتے اور پڑھنے کی

[1] یہ نسبت قرین عقل نہیں معلوم ہوتی اسوجہ سے کہ میر ضاحک میر اور سودا کے معاصر تھے اور شیخ علی حزیں خان آرزو
کے زمانہ میں ہندوستان آئے تھے اور اُن سے سن میں بڑے تھے لہذا زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا
ہے کہ ضاحک نے اپنی بہت صغر سنی میں شیخ کو کہیں دیکھا ہو ارتباط وغیرہ تفاوت سن کیوجہ سے غیر ممکن ہے ۱۲

مشق کرتے تھے۔ میر انیس کا کلام ہموار ہے اور دوسرے شاعروں کی طرح رطب و یابس کا مجموعہ نہیں ہے۔ ادب اردو میں میر انیس ایک خاص مرتبہ رکھتے ہیں بحیثیت شاعر کے اُن کی جگہ صف اولین میں ہے اور بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو ان کو زبان اُردو کے تمام شعرا سے بہترین اور کامل ترین سمجھتے ہیں اور اُنکو ہندوستان کا شیکسپیر اور خدائے سخن اور نظم اُردو کا ہومر اور ورجل اور بالمیک خیال کرتے ہیں

انیس کی خدمت زبان کے ساتھ

انیس نے زبان اُردو کی بڑی خدمت کی اُس کو خوب صاف کیا اور مانجا اور اُن کا کلام اپنی فصاحت اور تازگی کے لئے مشہور عالم ہے۔ وہ صحت محاورہ کا بہت خیال رکھتے تھے۔ اور اسی پر اُن کو بڑا فخر و ناز تھا۔ لغات کی معلومات انکی بہت وسیع تھی۔ اور الفاظ کی سجاوٹ میں اِن کو کمال حاصل تھا۔ بہت سے نئے نئے محاورے انکی وجہ سے داخل زبان ہوئے اور قدیم محاورات کا صحیح استعمال بھی اُنھوں نے بتایا۔ ابتدائی کلام میں کچھ قدیم محاورات پائے جاتے ہیں مگر جوں جوں مشق بڑھتی گئی اور تجربہ وسیع ہوتا گیا اُسی قدر کلام صاف ہوتا گیا۔ میر صاحب کی زبان دلّی اور لکھنؤ دونوں جگہ مستند مانی جاتی ہے اُن کا خاندان صحت محاورہ کا محافظ سمجھا جاتا ہے چنانچہ خود فرماتے تھے کہ میں فلاں لفظ یا فلاں ترکیب کو اس طرح استعمال کرتا ہوں جیسا میرے گھرانے میں مروج ہے نہ کہ اسطرح کہ جیسے آپ اہل لکھنؤ بولتے ہیں۔ میر حسن اور میر خلیق کے تعلقات بہو بیگم صاحبہ کے خاندان کے ساتھ وابستہ تھے مشہور رہے کہ فیض آباد میں ان کے یہاں ایک باقاعدہ دفتر تھا جسمیں ایسے محاورے اور مثلیں جو بہو بیگم صاحبہ کے گھر میں بولی جاتی تھیں باقاعدہ درج ہوتی رہتی تھیں

اور اس دفتر کے افسر اعلیٰ میر حسن اور میر خلیق تھے۔ ظاہر ہے کہ زبان کی صحت و صفائی کے واسطے ان سے زیادہ کون مستند ہو سکتا تھا۔ میر صاحب کا مرتبہ زبان اُردو میں بہت خاص ہے اس وجہ سے جو احسان اُنھوں نے زبان کے ساتھ کیا وہ بھی خصوصیت رکھتا ہے۔ اُردو باوجود اصناف نظم کی تنوع اور کثرت کے رزمیہ نظم سے ابتک تہیدست تھی اُس میں ہومر کی الیاڈ۔ ورجل کی اینیاڈ۔ ویاس کی مہابھارت۔ والمیک کی رامائن۔ یا فردوسی کے شاہنامہ کی طرح کی کوئی تصنیف موجود نہیں جسکی وجہ یہ ہے کہ زبان اُردو ایک نوخیز چیز ہے اور اس قسم کی تصانیف رزمیہ کے لیے ایک مدت مدید کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر یہ کمی کسی طرح پوری ہو سکتی تھی تو وہ انیس کے مشہور مراثی سے ہوئی۔ ان کے مرثیوں کی تمہیدیں اور مناظر جنگ وغیرہ ایسی استادی اور کمال سے لکھے گئے ہیں کہ نظامی کے سکندرنامہ اور فردوسی کے شاہنامہ کا آسانی سے مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اسی طرح مناظر قدرت اور جذبات انسانی جس زور کے ساتھ انھوں نے دکھائے ہیں اُس کا بھی جواب زبان اُردو میں کہیں نہیں ملتا۔

مرقع نگاری انیس کو مناظر قدرت کی ہو بہو تصویر کھینچنے میں کمال حاصل تھا اس قسم کے بیانات مرثیہ سے غیر متعلق نہیں ہوتے بلکہ اصل مضمون کے تحت میں ہوتے ہیں مگر پھر بھی بالذات ایک مکمل چیز ہیں جو مرثیہ سے بے تکلف علیحدہ کیے جا سکتے ہیں۔ پورا مرثیہ ایک ایسا مرقع معلوم ہوتا ہے جسمیں صدہا خوبصورت خوبصورت مکمل تصویریں چسپاں ہیں جو بظاہر ایک دوسرے سے تعلق نہیں رکھتیں مگر پھر بھی مجموعی حیثیت سے اُسی کل کے تحت میں سب آتی ہیں۔ مثلاً

صبح کا سماں، طلوع آفتاب، نسیم سحر کے خوشگوار جھونکے، شام کا سہانا وقت، چاندنی کا لطف یا تاریکی کا بھیانک منظر۔ باغ میں پھولوں کا کھلنا اور مہکنا، سبزہ کی بہار وغیرہ وغیرہ الگ الگ چیزیں ہیں مگر سب مرثیہ کے جزو ضروری ہیں۔

اظہار جذبات

مثل عالم ظاہر کے عالم باطن یعنی جذبات کے اظہار پر بھی میر صاحب کو بہت بڑی قدرت حاصل ہے۔ جذبات۔ خوشی و غم۔ غصہ۔ محبت۔ رشک و حسد۔ بیم و رجا وغیرہ ایسی استادی سے بیان کرتے ہیں کہ دل وجد کرتا ہے ایک اور کمال یہ ہے کہ کہنے والے کی عمر۔ جنس۔ حالت وغیرہ کا پوری طرح خیال رکھا جاتا ہے۔ مثلاً اگر کسی بچہ کی زبان سے کچھ الفاظ کہے گئے ہیں تو خیالات اور زبان دونوں بچوں ہی کے ادا کیے جاتے ہیں۔ وہ کبھی اس نازک فرق کو نظر انداز نہیں کرتے جس سے اُنکی اصول ڈراما نویسی کی کماحقہ واقفیت کا اندازہ اچھی طرح کیا جاسکتا ہے۔ اسیطرح عورتوں کے مختلف رشتوں کے نازک فرق کو بھی بدرجۂ اتم ملحوظ رکھتے ہیں۔ معرکۂ جنگ میں مبارزوں کی رجز خوانی۔ حریف کا جواب۔ حملہ آوروں کے حملے۔ پہلوانوں کی لڑائیاں۔ سامان حرب و ضرب علی قدر مراتب اس خوبی سے دکھاتے ہیں کہ میدان کارزار کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ تلوار اور گھوڑے کی تعریف صدہا بلکہ ہزارہا جگہ کیگئی ہے مگر ہر دفعہ تشبیہ اور تخئیل نئی ہوتی ہے اور نیا لطف دیتی ہے۔

مرثیوں میں تسلسل بیان ایک حیرت انگیز چیز ہے۔ میر انیس ایک مستند مؤرخ کی حیثیت نہیں رکھتے کیونکہ جن واقعات کو اُنھوں نے نظم میں باندھا ہے وہ

من وعن ہرگز وقوع پذیر نہیں ہوے۔ اُن کا وجود اگر ہے تو شاعر کے تخیل میں ہے مگر یہی تخیلی وجود مابعد کے شعرا اپنے ماقبل کے شعرا کے کلام سے اخذ کرتے چلے آتے ہیں۔ میر انیس کا کلام اغلاط سے بھی بالکل پاک نہیں۔ مولوی عبدالغفور صاحب نساخ نے ایک رسالہ لکھا تھا جسمیں اُنھوں نے انیس اور دبیر کی عروضی اور دوسری قسم کی غلطیاں دکھائی ہیں۔ ان دونوں بزرگوں کے طرفداروں نے بھی اسکے جواب میں رسالے لکھے اور اپنے اپنے استادوں کی جانبداری کا حق ادا کیا۔ مگر سچ پوچھیے تو واقعیت بین بین میں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ میر انیس اور مرزا دبیر کے مرثیے اصلی حالت میں اور صحیح طور پر نہیں چھپے۔ اُن میں کچھ کتابت کی غلطیاں ہیں اور کچھ اُن لوگوں کی حسب موقع تحریفیں ہیں جنھوں نے مرثیے پڑھے۔ کہیں کہیں پُرانے محاورات بھی ہیں جو اب متروک ہو گئے۔ مگر اسمیں بھی کوئی شک نہیں کہ تمام مرثیوں میں ہمواری نہیں ہے اور بعض اشعار تو انیس اور دبیر ایسے پختہ کار شاعروں کے درجہ سے گرے ہوے ضرور ہیں۔ مگر تعجب کی کیا بات ہے اس وجہ سے کہ اُنھوں نے لاکھوں شعر کہے اگر کہیں کہیں غلطیاں بھی ہو گئیں تو اُس سے اُن کی اُستادی پر کیا حرف آتا ہے۔

میر انیس کا طرز میر انیس تمثیلوں۔ استعاروں، اور صنائع بدائع میں کمال رکھتے ہیں وہ فضول مبالغے اور بیجا اغراق کو ہرگز نہیں پسند کرتے جنکی اُس زمانہ میں کثرت تھی صنائع بدائع کا استعمال اس خوبی سے کرتے ہیں کہ جس سے شعر پر کوئی بار نہیں پڑتا اور حُسن بڑھ جاتا ہے۔ اسی طرح اُنکی تمثیلیں بھی نہایت حسین اور بہت ارفع اور نہایت آسانی سے سمجھ میں آنے والی ہیں وہ اُن سے ایک عجب دلکش اثر

پیدا کرتے ہیں۔ بڑی چیز کی مثال ہمیشہ بڑی چیز سے دیتے ہیں اُن کی تشبیہات کبھی معمولی اور ادنی قسم کی نہیں ہوتیں۔ کلام حسب موقع کہیں صاف و سلیس اور کہیں رنگین ہوتا ہے۔ مگر فصاحت اور زور کہیں ہاتھ سے نہیں جاتا بیان میں روانی غضب کی ہوتی ہے۔ فصاحت نشست الفاظ۔ اور زور یہ سب اُنکی کلام میں ملے ہوے ہیں۔ اشعار بہت صاف اور سلیس اور جلد سمجھ میں آنے والے ہیں اور یہ آخری صفت بعض وقت دھوکا دیتی ہے اور عمق معنی کو اُس گہرے غار کے پانی کی طرح پوشیدہ کر دیتی ہے جسکو صفائی اور موجوں کی روانی نے چھپا دیا ہو۔ ان کے قادر الکلام ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ ایک ہی بات اور ایک ہی مضمون کو اُسی سادگی اور دل آویزی کے ساتھ صدہا بار کہتے ہیں اور پھر ہر مرتبہ وہ نئی معلوم ہوتی ہے۔

انیس کا مرتبہ اُردو شعرا کی صف اولین میں نہایت اعلی و ارفع ہے۔ اُنکی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اُس زمانہ میں جب تصنع اور تکلف اور مبالغے اور اغراق کا بازار گرم تھا انکی شاعری جذبات حقیقی کا آئینہ تھی اور جس نیچرل شاعری کا آغاز حالی اور آزاد کے زمانہ سے ہوا اسکی داغ بیل انیس نے ڈالی تھی۔ انیس نے مرثیہ کو ایک کامل حربہ کی صورت میں چھوڑا جسکا استعمال حالی نے نہایت کامیابی سے کیا۔ اُن کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ انگریزی داں طبقہ میں بہت مقبول ہیں جسکا دماغ معمولی شعر و شاعری کی عطر بیزی سے بعض وقت پریشان ہو کر حقیقی شاعری کی نکہت کے لیے بیتاب ہوتا ہے۔ اُنکی شہرت برابر ترقی کر رہی ہے اور ہماری رائے میں اُسوقت تک ترقی کرتی جائیگی جبتک زبان اُردو ترقی کریگی۔

بلکہ اُسی وقت انیس کی واقعی قدر کیجائیگی -

دبیر مرزا سلامت علی دبیر دہلی میں ۱۲۱۸ھ مطابق ۱۸۰۳ء میں پیدا ہوئے ان کے والد کا نام مرزا غلام حسین تھا۔ ارباب تذکرہ میں خاندان کی نسبت اختلاف ہے اور کوشش کیگئی ہے کہ ان کو عالی خاندان اور ان کے بزرگوں کو نہایت معزز ثابت کیا جائے۔ مگر اسمیں شک نہیں کہ مرزا دبیر ایک شریف اور معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور اُن کے بزرگ قدیم زمانے میں کچھ اثر ضرور رکھتے تھے - ان کے والد تباہی دہلی کے بعد لکھنؤ آئے اور یہیں شادی کرکے رہ پڑے اُس کے بعد جب دہلی میں تسلط ہوگیا تو پھر دہلی واپس گئے۔ مگر دبیر اپنے والد کے ساتھ لکھنؤ اُس وقت آئے جب اُن کی عمر تقریباً سات برس کی تھی - مرزا استعداد علمی معقول رکھتے تھے اور درس و تدریس اور بحث و مباحثہ کے بڑے شائق تھے جس سے اُن کی ذہانت اور طباعی کو جولانی کا خوب موقع ملتا تھا شعر و سخن سے قدرتی مناسبت رکھتے اور علی الخصوص مرثیہ گوئی کے بچپن ہی سے دلدادہ تھے۔ میر ضمیر کے شاگرد ہوگئے اور تھوڑے ہی عرصہ میں اپنی ذہانت اور طبعی جودت سے اپنے ہم مشقوں پر گوسے سبقت لے گئے - اب ان کا شمار اچھے مرثیہ گویوں میں ہونے لگا چنانچہ مرزا رجب علی بیگ سُرور نے فسانہ عجائب میں اُس وقت کے مشہور مرثیہ گویان لکھنؤ میں دبیر کا بھی ذکر کیا ہے - مرزا دبیر کی شہرت برابر ترقی کرتی گئی یہاں تک کہ ان کو بادشاہ وقت کے سامنے پڑھنے کا بھی افتخار حاصل ہوا۔ لکھا ہے کہ اکثر رؤسائے لکھنؤ اور محلات شاہی بھی اُن کی شاگرد ہوگئی تھیں اور اب یہ زبان اُردو کے مسلم الثبوت استاد مانے جاتے تھے - اُن کی شہرت سے اور نیز اُستاد کی عزت و محبت کے

برتاؤ سے بعض لوگ آتش رشک وحسد سے جلنے لگے اور اُستاد و شاگرد میں ایک خاص موقع پر جبکہ مرزا دبیر نے نواب افتخار الدولہ[1] کی مجلس میں اپنا مرثیہ پڑھا تھا، رنجش اور بددلی پیدا کرادی مگر غنیمت ہے کہ اس معاملے نے طول نہیں کھینچا اور مصحفی و انشا کی طرح تھکا فضیحتی کی نوبت نہیں آئی۔ آخرکار معاملہ رفع دفع ہوگیا۔ مرزا صاحب ہمیشہ اپنے استاد کا نام ادب و احترام سے لیتے تھے اور لوگوں کو بھی کوئی موقع اُنکو برا بھلا کہنے کا اپنے سامنے نہیں دیتے تھے۔ مرزا صاحب کا دامن شہرت وسیع ہو چکا تھا کہ میر انیس فیض آباد سے لکھنؤ پہونچے۔ اب میر ضمیر بوڑھے ہوگئے تھے مقابلہ آیندہ مرزا دبیر اور میر انیس میں شروع ہوا۔ یہ دونوں بزرگوار بھی نہایت تہذیب و متانت سے ایک دوسرے کا مقابلہ کرتے اور جب کبھی کسی مجلس میں یکجائی کا موقع ہوتا تو ایک دوسرے کا بہت ادب و آداب کرتے تھے۔ ۱۲۹۱ہجری میں مرزا صاحب کو ضعف بصارت کی شکایت ہوئی۔ چنانچہ حکیم واجد علی شاہ جو اسوقت مٹیا برج میں قیام گزیں تھے کلکتہ تشریف لے گئے جہاں ایک ہوشیار ڈاکٹر نے کامیابی سے اُن کا علاج کیا۔ مثل میر انیس کے یہ بھی غدر ۱۸۵۷ء تک گھر سے نہیں نکلے تھے۔ مگر ۱۸۵۸ء میں مرشدآباد اور ۱۸۵۹ء میں پٹنہ عظیم آباد گئے اور ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۵ء میں لکھنؤ میں اس دار ناپائدار سے رحلت کی اور اپنے ہی مکان میں مدفون ہوئے۔

دبیر بحیثیت مرثیہ گو مرزا دبیر مرثیہ گوئی کے اُستاد کامل تھے۔ اُنھوں نے اپنی پوری عمر اسی مشغلہ میں صرف کی۔ اِن میں میر انیس کی اکثر خصوصیات موجود ہیں اور

[1] آب حیات میں لکھا ہے کہ یہ مجلس نواب شرف الدولہ کے یہاں ہوئی تھی ۱۲

شکوہ الفاظ اُس پر طرہ ہے۔ مرزا صاحب سامعہ نواز الفاظ کے ساتھ اعلےٰ تخیل، نئی تشبیہات اور تازگی مضامین کے بھی بہت دلدادہ ہیں۔ اسمیں بھی شک نہیں کہ بسا اوقات اُن کا مقصد پورا نہیں ہوتا اور کوہ کندن و کاہ برآوردن کی مثل صادق آتی ہے۔ اُن کے کلام میں ایک عالم فاضل کی جھلک برابر آتی ہے۔ وہ آیات قرآنی اور احادیث کو باندھنے کے بہت شائق ہیں اور بعض وقت اُردو کے ساتھ عربی کا جوڑ خوب بٹھاتے ہیں۔ دوسری صفت یہ تھی کہ بہت پُرگو اور زود گو تھے۔ اُن کی کثرت خیالات حیرت انگیز ہے۔ مختصر یہ کہ اپنی حسین اور نادر تشبیہات سے، اپنی شاندار ابیات سے، اپنے اعلیٰ مضامین سے، اپنے پُرشکوہ الفاظ سے، اپنی طباعی و ذہانت سے، اپنی زودگوئی اور پرگوئی سے، اور اپنی ایجاد پسند طبیعت سے وہ ضرور اس قابل ہیں کہ میر انیس کے پاس شعرا کی صف اولین میں اُن کو جگہ دی جائے۔

انیس اور دبیر کا مقابلہ ان دونوں کے مقابلے سے اہل لکھنؤ دو بڑی جماعتوں پر منقسم ہو گئے ایک طرفداران انیس دوسرے جانب داران دبیر جو باصطلاح اہل لکھنؤ انیسیے اور دبیریے کہلاتے تھے ان دونوں فریقوں کی جنبہ داری بعض اوقات حد اعتدال سے بڑھ کے سخیف اور مضحکہ انگیز درجہ تک پہونچ جاتی تھی مگر ایک مورخ کا یہ فرض نہیں ہے کہ ان جزئی مباحث میں پڑے پھر بھی ان نامور اُستادوں کے کلام کا مقابلہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ دونوں بزرگ ایک ہی زمانہ میں تھے یہانتک کہ ایک سال کی کمی بیشی میں پیدا ہوے اور ایک ہی سال کی کمی بیشی میں انتقال کیا دونوں ایک ہی صنف نظم (مرثیہ) میں مشغول و منہمک تھے۔ دونوں کی سوسائٹی

اور ماحول ایک ہی تھا۔ دونوں نے اپنی تصنیفات از قسم مراثی و رباعیات و سلام وغیرہ بکثرت چھوڑے اور دونوں زبان اُردو کے مستند اور مسلم الثبوت استاد تھے۔ اب فرق دیکھنا چاہیے کہ کیا ہے۔ انیس موروثی شاعر تھے شاعری اُن کو ورثے میں ملی تھی چنانچہ خود کہتے ہیں ؎

عمر گزری ہے اسی دشت کی سیّاحی میں
پانچویں پشت ہے شبیرؑ کی مدّاحی میں

مگر مرزا دبیر کو یہ شرف حاصل نہ تھا۔ دونوں کا طرز بھی جُدا جُدا ہے۔ انیس کی خاص توجہ زبان کی صفائی اور حلاوت، بندش کی چُستی اور محاورے کی درستی پر ہے۔ برخلاف اسکے مرزا دبیر کے یہاں جدت خیالات، بلند تخئیل نئی نئی تمثیلیں اور پُر شکوہ الفاظ زیورِ کلام ہیں مختصر طور پر فصاحت اور سادگی میر انیس کے کلام کا جوہر ہے اور صنعت اور رنگینی مرزا دبیر کا مایۂ ناز ہے۔ اسمیں کوئی شک نہیں کہ میر صاحب کا کلام ایسی بھدی ترکیبوں اور دور از کار تشبیہوں سے پاک و صاف ہے جو مرزا صاحب کے یہاں بکثرت ہیں۔ اسکی وجہ شاید یہ ہو جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے کہ مرزا صاحب کو عربی درسیات بہت مستحضر تھیں اور میر صاحب کو اسقدر نہ تھیں اور یہی کتابی علم کی کمی میر صاحب کی شگفتگی کلام کا باعث ہے

حقیقت یہ ہے کہ ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا ایک فضول سی بات ہے۔ اس معاملہ میں آخری فیصلہ کن چیز ادبی ذوق ہے اور ہر شخص کا ذوق الگ الگ ہوتا ہے۔ اس زمانہ میں یہ بات داخل فیشن ہو گئی ہے کہ دبیر کے کلام کو کم کر کے دکھایا جائے اور اُن کا مرتبہ انیس سے بہت کم رکھا جائے مگر حق یہ ہے کہ دبیر بھی

مثل انیس کے مسلم الثبوت استاد تھے جیسا کہ خود ان کے معاصرین امیر مینائی اور اسیر لکھنوی نے اعتراف کیا ہے۔ اُن کی شہرت خود اُن کے زمانہ میں بھی بہت تھی جیسا کہ لفظ "استاد" سے ثابت ہے جو اُن کے واسطے برابر استعمال کیا جاتا ہے۔

مرثیہ کی مقبولیت کے اسباب لکھنؤ ہمیشہ سے شیعیت کا مرکز رہا ہے اور اہل تشیع شہدائے کربلا کا دل سے ادب واحترام کرتے ہیں۔ اس شہر میں عشرۂ محرم بڑے دھوم دھام اور خاص اہتمام کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہاں کے تعمیر پسند بادشاہوں نے بڑے بڑے امام باڑے بنوائے جہاں ایام عزا میں مومنین جمع ہوتے ہیں اور شہدائے کربلا کی مجالس نہایت سیرچشمی اور تکلف سے کرتے ہیں، امیر سے غریب تک اس مہینہ کو متبرک سمجھکر جملہ مراسم عزاداری اُسمیں انجام دیتے ہیں۔ اظہار غم کا سب سے زیادہ مؤثر طریقہ مرثیہ خوانی ہے۔ کوئی شخص یہانتک کہ بڑے سے بڑا مشکک بھی علی الاعلان کسی کے مذہبی رسوم کی مخالفت کی جرأت نہیں کرسکتا۔ مرثیہ لکھنا اور مرثیہ پڑھنا ہمیشہ سے ایک مذہبی کام سمجھا جاتا ہے۔ ہر شیعہ شخص اپنی بڑی خوش نصیبی سمجھتا ہے اگر ایک بند بھی امام مظلوم کی شان میں یا ایک شعر جناب امیرؑ کی تعریف میں حصول ثواب کی نیت سے وہ کہدے۔ یہاں کے بادشاہ ایسے لوگوں کی قدردانی اس غرض سے کرتے تھے کہ لوگ اُن کو با مذہب خیال کریں۔ درحالیکہ وہ سال بھر دنیاوی عیش وعشرت میں منہمک رہتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ ایک مہینہ کی عزاداری سال بھر کے گناہوں کا کفارہ ہو جائیگی۔ مگر علما اور شعرا مرثیہ کی قدر ایک دوسرے نقطۂ نظر سے کرتے تھے۔ وہ اُس کو ایک ادبی چیز سمجھتے تھے۔ بہرطور جو کچھ وجہ بھی ہو

وہ زمانہ مرثیہ کے عروج کا زمانہ تھا۔

مرثیہ سے کیا کیا فائدے پہنچے

میر ضمیر پہلے شخص ہیں جنھوں نے مرثیہ میں نئی نئی ایجادیں کیں۔
رزمیہ۔ سراپا، گھوڑے اور تلوار وغیرہ کی طولانی تعریفیں نئی نئی تشبیہات
اور عمدہ تخیل کے ساتھ، مناظر جنگ معہ تفصیل جزئیات، غیر فصیح الفاظ اور ترکیبوں کا
ترک جن کو قدیم مرثیہ نویس مدت دراز سے برتتے چلے آتے تھے، غرض کہ یہ اور اسی قسم
کی بہت سی جدتوں کا سہرا میر ضمیر کے سر ہے مگر انیس و دبیر نے انھیں چیزوں کو ترقی
کی معراج تک پہنچایا اور اُن میں چار چاند لگائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اِن بزرگوں نے
اس صنف شاعری کو ترقی کے آسمان تک پہنچا دیا اور اسی زمانے سے مسدس جس میں
عموماً مرثیے لکھے جاتے ہیں پُرجوش نیچرل نظموں کے لئے بھی مناسب خیال کیا جانے لگا
"مدو جزر اسلام" حالی کا مشہور مسدس اسی عنوان پر ہے۔ سُرور جہاں آبادی نے
بھی اسی صنف کو اپنی قومی اور نیچرل نظموں کا آلۂ کار بنایا۔ اگر غور سے دیکھیے تو
آزاد، حالی، اور سرور وغیرہ کی دلچسپ اور زور دار نظمیں سب مرثیہ ہی کی خوشہ چین
اور رہین منت ہیں کیونکہ زمانۂ حال کے طرز میں وہ سب خصوصیات موجود ہیں جو
مرثیہ میں پائی جاتی ہیں، مثلاً تمہید، تسلسل بیان، اعلیٰ جذبات کا اظہار، سلاست
زبان، تشبیہات، تخیل وغیرہ، جو ہماری جدید شاعری کے بڑے عنصر ہیں سب
قریب قریب وہی ہیں جن کو مرثیہ کے اُستاد اب سے بہت پیشتر نہایت کامیابی
سے برت چکے ہیں۔

قدیم طرز لکھنؤ کی مصنوعی اور مخرب اخلاق فضائے شاعری میں مرثیہ کی
نمود اور اُسکی سلاست و فصاحت اور ادب آموزی نے وہی کام کیا جو ریگستان میں

ایک خوشنما سبزہ زار کرتا ہے۔ مرثیہ میں اُس حقیقی شاعری کا پرتو ہے جو اعلیٰ جذبات کو برانگیختہ کرتی ہے*۔ اُس کی ادب آموزی ایسے وقت میں، جب دنیائے شاعری عیش پسند درباروں کی خوشامد اور تتبع میں نہایت ادنے اور رکیک جذبات کی دلدل میں پھنسی ہوئی تھی، قابل صد ہزار آفریں ہے۔ ہرچند کوئی مرثیہ بلحاظ فن گرا ہوا ہو مگر پھر بھی وہ ایک اخلاقی نظم ضرور ہے اور اس معنی میں اُس کے مُفید ہونے میں کس کو کلام ہو سکتا ہے۔ اُس کا مضمون ضرور عالی اور مقدس ہوگا۔ لہٰذا شاعر گو غزل میں وہ کیسا ہی پست اور لااُبالی خیال ظاہر کرے مگر مرثیہ میں مناسبت مضمون کے خیال سے وہ ضرور سنجیدہ اور اخلاق آموز شعر کہنے پر مجبور ہوگا۔ شجاعت عالی ہمتی، عفت، انصاف وغیرہ کی تعریفیں جو ہم اس افسانۂ مصائب و غم میں برابر سُنتے رہتے ہیں۔ ہماری درستی اخلاق کے لئے اور ہم میں شریف اور اعلےٰ جذبات پیدا کرنے کے لئے ازبس مُفید اور ضروری ہیں۔ لڑائیوں کے ہوبہو نقشے، اسلامی نبرد آزماؤں کے تنہا مقابلوں کی جیتی جاگتی تصویریں، مبارزوں کی پُرجوش رجز خوانیاں، مخالفین کے جوابات، کُفّار کا قتل و قمع، کمزوروں کی اعانت و مدد، یہ سب ایسی چیزیں ہیں جو مرثیہ کی بدولت ہماری نظم اُردو میں صنف "ایپک" (رزمیہ) کا بیش بہا اضافہ کرتی ہیں جسکی اُس میں اب تک کمی تھی۔ ہمارے اُردو مراثی اکثر ایسے مکمل مرقعے پیش کرتے ہیں جو بلا تکلف دُنیا کی بہترین رزمیات سے مقابلے کے لیے تیّار ہیں۔ زبان کے ساتھ بھی مرثیہ کی خدمات نہایت بیش بہا اور عظیم الشان ہیں۔ چار پانچ لاکھ بیت جو انیس اور دبیر لکھکے چھوڑ گئے اُن سے ہماری زبان میں کیا کچھ کم قابل قدر اضافہ ہوا۔ پھر اُس

زمانہ سے اِس وقت تک کے استعمال نے اُن کو اور صاف کیا اور مانجا الحق مرثیہ نے محدود میدان اُردو کو وسیع کیا اور زبان اُردو کے سلاح خانے میں ایک نہایت قیمتی اور ضروری حربہ اضافہ کیا۔

دیگر مرثیہ نویس اِس زمانہ کے دیگر مرثیہ نویس میاں دلگیر اور فصیح تھے جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ اِن سے پیشتر میاں مسکین (جن کے مفصل حالات نہیں معلوم ہو سکے سوا اس کے کہ اُن کا نام میر عبداللہ تھا) افسردہ، سکندر، گدا وغیرہ ہیں۔ جن کے مرثیے اب بھی کبھی دیکھنے میں آ جاتے ہیں۔

خاندان انیس یہ عجیب بات ہے کہ علم و فضل اور شاعری اس مشہور خاندان میں پشتہا پشت سے چلی آتی ہے اور اب تک ماشاءاللہ وہ سلسلہ جاری ہے مشعل شاعری باپ سے بیٹے کو منتقل ہوتی چلی آئی ہے اور اب تک وہ روشن ہے۔ میر امامی (جو میر امامی موسوی ہروی کہلاتے ہیں) اس خاندان کے مورث اعلی تھے۔ اِن کے بعد سلسلۂ خاندان بصورت شجرہ حسب ذیل ہے :-

ON LIBRARY
ALIGARH

میر امامی
|
میر عزیز اللہ
|
میر ضاحک
|
میر حسن
|
خلق — خلیق — محسن

خلق: میر انیس
خلیق: میر مونس
محسن: میر اُنس → میر وحید

میر انیس: نفیس — سلیس — میر عسکری رئیس

نفیس: دولھا صاحب عروج — دختر — جلیس
سلیس: عارف
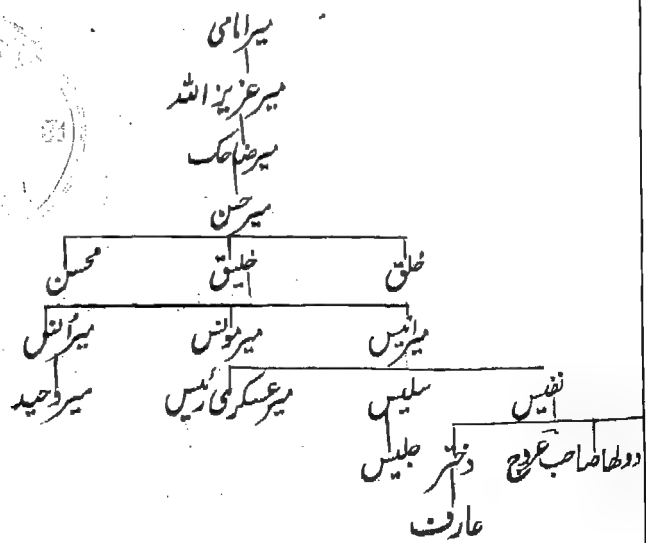
اِس خاندان میں اصحاب ذیل کے کچھ مختصر حالات ہدیۂ ناظرین کیے جاتے ہیں

میر مونس — میر محمد نواب مونس میر انیس کے چھوٹے بھائی تھے اور بہت اچھا مرثیہ کہتے تھے گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرتے تھے مگر میر انیس کی طرح مشہور نہ تھے۔ مرثیہ نہایت مؤثر اور دل کش طرح سے پڑھتے تھے۔ راجہ امیر حسن خاں صاحب مرحوم والی ریاست محمود آباد مرثیے میں اُن کے شاگرد تھے اور ایک معقول مشاہرہ دیتے تھے۔ میر مونس کا انتقال ۱۲۹۲ھ میں ہوا اور کوئی اولاد نہیں چھوڑی۔

میر نفیس — میر خورشید علی نفیس میر انیس کے بڑے صاحبزادے اپنے بھائیوں میر سلیس اور میر رئیس سے زیادہ ممتاز اور زیادہ مشہور تھے۔ لائق باپ کے لائق فرزند تھے اور انھیں سے اصلاح سخن لیتے تھے۔ اِن سے میر انیس بلکہ پورے خاندان کا نام روشن ہوا۔ بہت خوش گو اور قابل تھے اور اپنے بعد ایک بڑا ذخیرہ مراثی وسلام ورباعیات وغیرہ کا چھوڑ گئے۔ ۱۳۱۸ھ مطابق ۱۹۰۱ء میں بعمر پچاسی سال انتقال کیا۔

عارف — سید علی محمد عارف سید محمد حیدر کے صاحبزادے میر نفیس کے نواسے تھے ۱۸۵۹ء میں پیدا ہوئے اور اپنے نانا کی زیر نگرانی تعلیم و تربیت پائی اور اُنھیں سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ مہاراجہ سر محمد علی محمد خاں والی ریاست محمود آباد اُن کے شاگرد ہیں اور مبلغ ایک سو پچیس روپیہ ماہوار سے اُن کی خدمت کرتے تھے۔ عارف صاحب بہت بڑے زباندان تھے اور لکھنؤ کے مرثیہ گویوں میں ایک خاص درجۂ امتیاز اُن کو حاصل تھا۔ اُن کے مرثیے نہایت فصیح و بلیغ اور زوردار ہوتے ہیں۔ اُن کے مرثیوں میں مثل پیارے صاحب رشید کے

میر علی محمد عارف
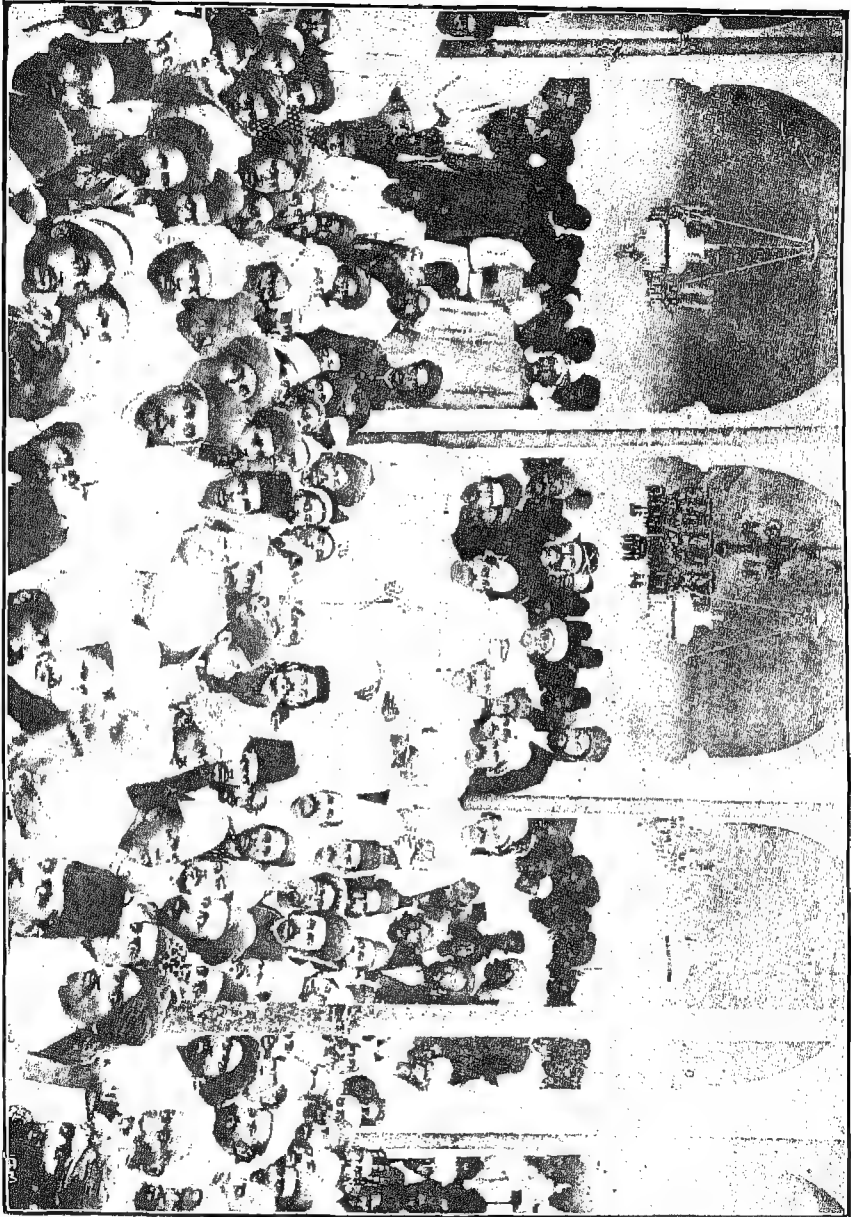
حیدرآباد مین میر نفیس لکھنوی کی ایک مجلس
میر نفیس وسط مین ھین اور عارف اُنکے داھنی جانب ھین

بہار و ساقی نامہ وغیرہ نہیں ہوتا وہ مرثیت کا زیادہ خیال رکھتے تھے ۱۳۲۳ھ میں بعمر ۷۵ سال انتقال کیا۔

جلیس | سید ابو محمد عرف ابو صاحب جلیس میر سلیس کے صاحبزادے پیارے صاحب رشید کے شاگرد تھے۔ ہونہار شخص تھے مگر افسوس ہے کہ جوانی میں ۱۳۲۵ھ میں انتقال کیا۔ مرثیہ اور غزل کہتے تھے۔ بالفعل اس خاندان میں دولھا صاحب عروج (میر نفیس کے صاحبزادے) اور فائق (عارف کے صاحبزادے) اور قدیم (سلیس کے صاحبزادے) موجود ہیں اور اپنے کلام سے اہل لکھنؤ اور دیگر شائقین کلام کو مستفیض اور محظوظ کرتے ہیں۔

سید میرزا اُنس کا خاندان | یہ خاندان بھی لکھنؤ کے مرثیہ گویوں کا ایک مشہور خاندان ہے اس کے بھی مختصر حالات ہدیۂ ناظرین کیے جاتے ہیں۔

سید میرزا اُنس | سید محمد میرزا اُنس سید علی میرزا کے صاحبزادے اور سید ذوالفقار علی میرزا کے پوتے تھے۔ صاحب دیوان ہیں مگر اب تک اُن کا کلام چھپا نہیں اور اُن کے خاندان میں محفوظ ہے۔ ہر اتوار کو اُس زمانے کے بڑے بڑے شاعر مثل قلق، بحر، اسیر، میر کلّو عرش وغیرہ کے بلا ناغہ اُن کے مکان پر جمع ہوتے تھے اور شعر و شاعری کے تذکرے رہتے تھے۔ نوابی میں سو روپیہ ماہوار ان کو خزانۂ شاہی سے ملتا تھا۔ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد اُنس نے نواب منور الدولہ کی سفارش سے نواب ملکہ جہاں کی سرکار میں بحیثیت داروغہ ملازمت کر لی تھی اور بہت عزت سے زندگی بسر کرتے تھے ۱۲۸۵ھ میں نواب کلب علی خاں والی رامپور نے اُنس کو طلب کیا اور اپنے اُستاد منشی امیر احمد صاحب مینائی کو اُنکے لینے کیواسطے

لکھنؤ بھیجا۔ اُنس رامپور گئے مگر تھوڑے عرصہ کے قیام کے بعد پھر لکھنؤ واپس آئے جہاں سنہ ۱۳۰۲ھ میں بعمر ۹۵ سال قضا کی۔ چونکہ اُن کا کلام چھپا نہیں لہذا اِس کے متعلق کوئی رائے نہیں ظاہر کی جاسکتی۔ صرف اِتنا کہہ سکتے ہیں کہ ناسخ کے شاگرد اور کہنہ مشق شاعر تھے۔ اِن کے پانچ بیٹے تھے۔ عشق، تعشق، صبر، صابر اور عاشق۔

عشق — حسین مرزا عشق، معروف بہ میر عشق، اپنے زمانے کے نامی مرثیہ گو اور انیس و دبیر کے ہم عصر تھے۔ یہ بھی مثل اِنھیں اُستادوں کے مرثیہ کے اُستاد مانے جاتے ہیں اور اِن کا کلام بہت اعلیٰ درجہ کا اور بے عیب ہے۔ سچ پوچھیے تو کلام کی عمدگی کے اعتبار سے ان کی شہرت کم ہے۔ اِن کے پوتے عسکری مرزا مؤدب جو اپنے چچا رشید کے شاگرد ہیں اب بھی موجود ہیں اور مرثیہ اچھا کہتے ہیں۔

تعشق — سید میرزا تعشق مرثیہ اور غزل دونوں کے اُستاد تھے۔ لکھنؤ میں سید صاحب کے لقب سے مشہور ہیں۔ ایک عرصۂ دراز تک کربلا میں قیام کیا اور بعد اپنے بڑے بھائی میر عشق کے انتقال کے وہاں سے واپس آئے۔ مرثیہ اور غزل دونوں خوب کہتے تھے۔ ناسخ کے شاگرد تھے اور اِن کا کلام جذبات، حُسن بندش، نزاکتِ خیال اور تاثیر کے لیے مشہور ہے۔ بعض لوگ تو اِن کی نسبت بڑے بڑے دعوے کرتے ہیں مگر اتنا ضرور ہے کہ یہ ایک فطری شاعر تھے اور اِن کے کلام میں بہت سوز و گداز اور تاثیر ہے اور اِن کا مرتبہ اپنے زمانے کے شعرا میں بہت بلند ہے۔ میر انیس ان کے ساتھ بہت محبت کرتے تھے اور اُنھیں کی صحبت سے یہ برابر فیضیاب رہے۔ سنہ ۱۳۰۹ھ میں بعمر ۷۰ سال انتقال کیا۔

سید مرزا تعشق لکھنوی
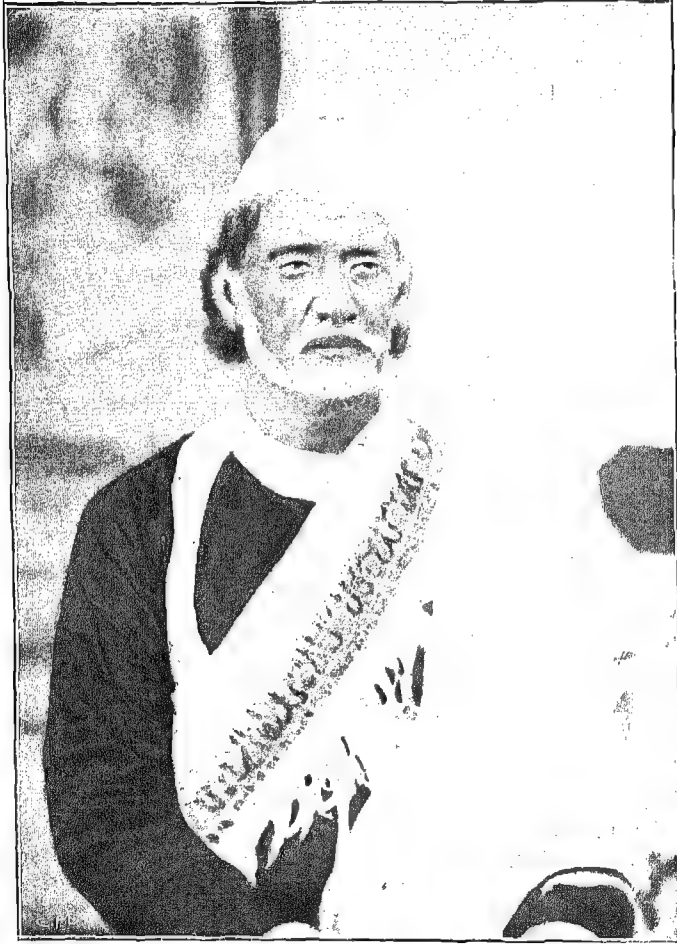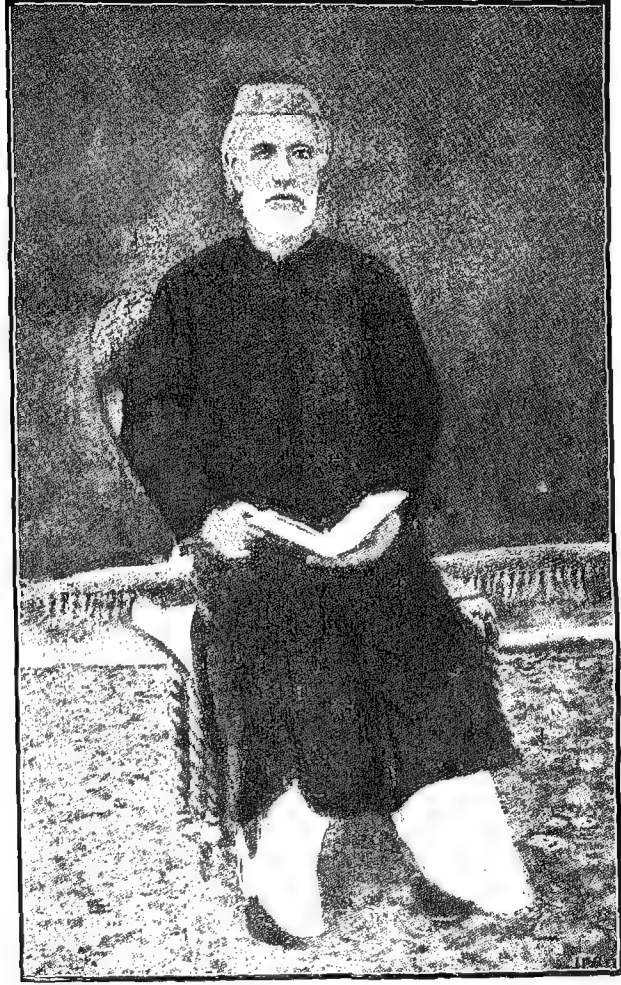
پیارے صاحب رشید

احمد میرزا صابر یہ اپنے مشہور بیٹے پیارے صاحب رشید کیوجہ سے قابل ذکر ہیں۔ انکی شادی میر انیس مرحوم کی دختر سے ہوئی تھی جس سے دو مشہور خاندانوں کا اتحاد ہوگیا۔ یہ واجد علی شاہ کے وظیفہ خوار اور نواب ملکہ جہاں کے یہاں داروغہ تھے۔ واجد علی شاہ اُن کو بہت مانتے تھے اور اُن کو محل شاہی نواب زہرہ محل کی ڈیوڑھی کا داروغہ کردیا تھا۔ جو منظوم خطوط بادشاہ اپنی محبوب بیوی کے نام بھیجتے تھے اُن کے جوابات اُسی طریقہ کی نظم میں اُنکی طرف سے یہ قلم بند کرتے تھے ۷۲ سال کی عمر میں ۱۳۱۱ھ میں انتقال کیا۔

پیارے صاحب رشید سید مصطفٰے میرزا معروف بہ پیارے صاحب المتخلص بہ رشید ۱۲۶۳ھ میں پیدا ہوئے اور ضروریات زمانہ کے مطابق تعلیم پائی اِن کی شادی میر عسکری رئیس خلف میر انیس کی صاحبزادی کے ساتھ ہوئی تھی۔ اپنا کلام اپنے چچا میر عشق کو دکھاتے اور کبھی کبھی میر انیس سے بھی اصلاح لیتے تھے عشق کے بعد اپنے دوسرے چچا تعشق سے مشورۂ سخن کیا اور سچ پوچھیے تو اُنھیں کا رنگ اُن کی غزلوں اور مرثیوں پر زیادہ غالب ہے۔ رشید کی توجہ زیادہ تر زبان پر تھی اور اس میں وہ اپنے اُستاد انیس کے قدم بقدم چلتے تھے۔ مرثیے، غزلیں، سلام، رُباعیاں، بکثرت لکھیں۔ کبھی کبھی قصیدے بھی کہے۔ اُن کی غزلوں میں سلاست زبان، حلاوت اور پابندی محاورہ کا بہت خیال ہے مگر جدت خیال اور تاثیر کم ہے۔ اُن کو فارسی ترکیبیں زیادہ پسند نہ تھیں۔ سلاموں میں غزلیت کا رنگ زیادہ ہے، مگر رباعیاں کثرت سے ہیں اور واقعی بہت عمدہ ہیں علی الخصوص وہ رباعیاں جو بڑھاپے پر لکھی ہیں بہت مؤثر اور دلچسپ ہیں۔ رشید بحیثیت

مرثیہ گو کے زیادہ مشہور ہیں۔ مرثیہ میں انھوں نے دو نئی چیزیں یعنی ساقی نامہ اور بہار اضافہ کیں جس سے مرثیہ کی ادبی شان اور بڑھ گئی اور نفس مرثیہ میں کوئی خلل بھی نہیں آیا۔ کیونکہ ایسے اشعار حسب موقع وہ رکھتے ہیں۔ اِن سے پیشتر بھی اکثر اُستادان فن اس قسم کے اشعار مرثیوں میں کہہ گئے ہیں مگر رشید نے اُن کو ایک ممتاز جگہ دی اور طول دیکر لکھا۔ ۱۸۹۴ء میں نواب رامپور نے رشید کو سُنا تھا۔ رشید پٹنہ عظیم آباد بھی گئے تھے جہاں اُنکی بڑی قدر اور خاطر و مدارات ہوئی۔ نواب بہرام الدولہ کے اصرار سے حیدر آباد دکن کا سفر کیا جہاں حضور نظام نے اُن کا مرثیہ سُنا اور بہت پسند کیا۔ اسی طرح کلکتہ اور دیگر مقامات میں بھی سفر کا اتفاق ہوا تھا رشید کا انتقال بعمر ۷۴ ۔ سال ۱۳۳۶ ہجری میں ہوا۔ اپنے بعد بہت سے شاگرد چھوڑے جن میں سے مشہور لوگوں کے نام یہ ہیں۔ سید باقر صاحب حمید (یہ اُن کے بھائی تھے اور ۱۳۳۹ھ میں انتقال کیا) مؤدب، پروفیسر ناصری، جلیس مرحوم اشہر (مؤلف حیات رشید) شدید، ناظم فرہاد وغیرہ۔

پیارے صاحب رشید لکھنؤ کی ادبی دنیا میں نہایت ممتاز درجہ رکھتے تھے اور زبان کے بڑے ماہر سمجھے جاتے تھے۔ اِن کی خصوصیت یہ ہے کہ غزل اور مرثیہ دونوں خوب کہتے تھے۔

خاندان دبیر
مرزا اوج

مرزا دبیر کے صاحبزادے مرزا محمد جعفر اوج اپنے والد کے متبع اور اُنھیں کے رنگ میں کہتے تھے۔ اِن کی بھی پٹنہ، حیدر آباد اور رامپور وغیرہ میں بڑی شہرت تھی اور اِن سب مقامات سے اُن کی حسب لیاقت اُن کی خدمت کی جاتی تھی۔ مرزا اوج بھی مثل اپنے

پدر بزرگوار کے بہت بڑے زباں داں اور عروض کے اُستاد سمجھے جاتے تھے۔
چنانچہ ایک رسالہ بھی اُنھوں نے اِس فن میں لکھا ہے۔ خسرو دکن نے اِن کو
بھی سُنا ہے۔

نعت نعت اُس نظم کو کہتے ہیں جس میں پیغمبرِ اسلام کی مدح میں اشعار
کہے جائیں۔ بہت سے شاعر گذرے ہیں جنھوں نے اس صنفِ نظم میں بہت کچھ
کہا ہے مگر ان سب میں امیر مینائی اور محسن کاکوروی بہت مشہور ہیں۔

باب ۱۱

نظیر اکبر آبادی اور شاہ نصیر دہلوی

نظیر اکبر آبادی

اِن کا تعلق کسی خاص دَور سے نہیں ہے اور ان کا کلام بھی ایک خاص رنگ رکھتا ہے لہٰذا ان کا ذکر علیحدہ کیا جاتا ہے۔

نظیر اکبر آبادی عہد محمد شاہ ثانی تقریباً اُس زمانے میں پیدا ہوئے جب نادر شاہ نے دہلی پر حملہ کیا تھا۔ اس وجہ سے وہ میر و سودا اور دیگر قدیم شعرائے دہلی کے معاصر کہے جا سکتے ہیں مگر چونکہ عمر زیادہ پائی تھی اسوجہ سے انشا جرأت اور ناسخ تک کا زمانہ دیکھا۔ یہ ان کی خصوصیت ہے کہ بسبب اپنی طویل عمر کے مختلف عہد کے شعرا ان کی نظر سے گذرے۔ اِن کا طرزِ کلام بھی ایک عجیب رنگ رکھتا ہے۔ قدما میں ان کا شمار اس وجہ سے نہیں ہو سکتا کہ ان کا اکثر کلام زمانۂ حال کا معلوم ہوتا ہے۔ متوسطین شعرائے دہلی میں بھی یہ نہیں لیے جا سکتے۔ اِس وجہ سے کہ اِن کے کلام میں بہت آزادہ روی ہے اور ان کے اور اُن کے مضامین اور انداز میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ لکھنؤ کا قدیم طرز تو ان میں چھو نہیں گیا ہے کیونکہ ان میں بنوٹ اور رنگینی جو طرزِ لکھنؤ کی خاص پہچان ہے مطلق نہیں پائی جاتی۔ اسی طرح دورِ جدید کے شعرائے دہلی مثلاً غالب، ذوق، اور مومن وغیرہ سے بھی یہ بالکل علیحدہ ہیں اسوجہ سے کہ ان کے یہاں سادگی ہر

اور فارسی الفاظ اور فارسی ترکیبوں کا اِن کو مثل اُنکے مطلق شوق نہیں ہے۔

نظیر کا نام ولی محمد اور اُن کے باپ کا نام محمد فاروق تھا۔ نظیر کی ولادت شہر دہلی میں ہوئی۔ چونکہ اپنے باپ کی بارہ اولادوں میں صرف یہی بچے تھے لہذا باپ اُن سے بہت محبت کرتے تھے۔ احمد شاہ ابدالی کے حملے کے وقت نظیر اپنی ماں اور نانی کو لیکر آگرہ چلے گئے جہاں محلّہ تاج گنج میں جو تاج محل کے قریب واقع ہے سکونت پذیر ہو گئے۔ ان کی شادی ایک عورت مسماۃ تہور بیگم دختر محمد رحمٰن سے ہوئی تھی جن سے ایک لڑکا خلیفہ گلزار علی اور ایک لڑکی اماّمی بیگم تھیں۔ نظیر فارسی کی معمولی قابلیت کے علاوہ تھوڑی بہت عربی بھی جانتے تھے اور فن خوشنویسی سے بھی واقف تھے جس کا اُس زمانے میں بہت چرچا تھا۔ نظیر کی طبیعت میں آسودگی اور قناعت اس درجہ تھی کہ اُنھوں نے حسب الطلب نواب سعادت علی خاں لکھنؤ آنے سے اور اسی طرح بھرت پور کے جانے سے بھی انکار کر دیا۔ اوائل عمر میں متھرا گئے تھے جہاں کسی جگہ معلّمی کی نوکری کر لی تھی مگر تھوڑے ہی دنوں کے بعد آگرہ واپس آ گئے اور یہاں لالہ بلاس رام کے لڑکے کو بمشاہرہ سترہ روپیہ ماہوار پڑھایا کرتے تھے۔

آخر عمر میں مرض فالج میں مبتلا ہو گئے تھے اور اسی مرض میں بہت کبرسنی کی حالت میں ۱۶-۱- اگست سنہ ۱۸۳۰ء کو انتقال کیا۔ جیسا کہ اُن کے ایک شاگرد کی تاریخ سے معلوم ہوتا[1] ہے۔ لائل صاحب سنہ ۱۸۳۲ء اُن کا سنہ وفات بتاتے ہیں

---

[1] وہ مصرع تاریخ یہ ہے ع مخمس بے سر و پا۔ بیت بے دِل۔ فرد بے سر شد۔

خ + م + ب + ت + ر + د
۶۰۰ ۴۰ ۲ ۴۰۰ ۲۰۰ ۴ = ۱۲۴۶ھ

مگر کوئی سند نہیں دیتے ہیں۔

نظیر بہت صحبت پسند آدمی تھے اور مختلف قسم کے لوگوں کی سوسائٹی میں ملتے جُلتے تھے اسی وجہ سے اُن کا تجربہ بہت وسیع تھا جس سے اُنھوں نے اپنے اشعار میں بہت بڑا فائدہ اُٹھایا ہے۔ اُن کو گانے سے کسرت سے اور سیر تماشے سے بہت شوق تھا۔ نہایت حلیم الطبع منکسر المزاج، اور اسی کے ساتھ نہایت ظریف اور با مذاق واقع ہوئے تھے۔ کسی طرح کا تعصّب اور خود بینی اُن کے مزاج میں نہ تھی ہندو مسلمان سب اُن کو مانتے اور سب اُن سے محبت رکھتے تھے۔

جوانی میں البتہ بہت رنگین مزاج تھے اور عشق و عاشقی کا بھی ذوق رکھتے تھے کہا جا سکتا ہے کہ جسقدر کلام میں اُن کے فواحش ہیں وہ اِسی دَور کی یادگار ہے۔ مشہور ہے کہ ایک رنڈی سے جس کا نام موتی تھا، اُن سے تعلق تھا اور آزادانہ زندگی شاید اسی زمانے میں بسر کرتے ہونگے۔ اِس زندگی کی جو جیتی جاگتی تصویریں اُن کے کلام میں موجود ہیں وہ یقیناً اسی عہد کی یادگار ہیں اور اگر غور سے دیکھا جائے تو فواحش کو مستثنےٰ کر کے اُن میں بیشتر مرقعے اُس سوسائٹی کے ہیں جس میں وہ اُس وقت مِلتے جُلتے تھے۔ مگر بڑھاپے میں یہ باتیں سب بدل گئی تھیں۔ گذشتہ گناہوں سے توبہ کر کے وہ ایک صوفی صافی ہو گئے تھے۔ اس زمانے کا اُن کا کلام نہایت قابل قدر اور پُر اثر ہے۔ بہت پُر گو شاعر تھے۔ کہا جاتا ہے کہ دو لاکھ سے زیادہ شعر کہے تھے مگر وہ سب کلام تلف ہو گیا بالفعل جسقدر موجود ہے اُسکی تعداد تقریباً چھ ہزار شعر سے زیادہ نہو گی اور یہ لالہ بلاس رام کی کاپیوں سے نقل کر کے لیا گیا ہے کیونکہ خود اُن کو اپنے کلام کے محفوظ رکھنے کی مطلق پروا نہ تھی۔

نظیر اکبر آبادی

مومن دهلوي

نظیر بحیثیت واعظ و ناصح

اگر نظیر کے کلام میں سے اُن کے معمولی اشعار نکال ڈالے جائیں تو اُن کا شمار بڑے بڑے فلسفیوں اور ناصح شعرا میں ہو سکتا ہے۔ اُن کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ولی کامل دنیا و مافیہا کی بے ثباتی اور بے حقیقتی پر پُر زور لکچر دے رہا ہے اور ایک دوسری زندگی کی تعلیم ہم کو دیتا ہے۔ جو رذائل و معائب سے بالکل پاک ہے۔ اُن کی دس گیارہ ایسی دلچسپ اور مؤثر نظمیں ہیں[1] جن کے اکثر اشعار فقیر اور سادھو لوگ خوش الحانی سے پڑھ پڑھ کے ہمارے دلوں کو بیتاب کرتے ہیں۔ اس قسم کی نظموں میں وہ "دنیا ہیچ است و کار دنیا ہمہ ہیچ" کے پوری طرح سے قائل ہیں۔ وہ خیر و خیرات کے بہت معرف ہیں اور دُنیا کو مزرع آخرت سمجھتے ہیں۔ اُن کی تمثیلیں بہت اعلیٰ اور دلکش ہوتی ہیں۔ اُن کی نظم "موت پر" اور "بنجارہ نامہ" مغرور اور سرکش لوگوں کے لئے ایک تازیانۂ عبرت ہے اور اُن کو آگاہ کرتا ہے کہ دُنیا دارِ فانی ہے اس کو چھوڑو اور عاقبت کی فکر کرو۔ نظیر کا مقابلہ اس معنی میں شیخ سعدی سے خوب ہو سکتا ہے کیونکہ دونوں کا کلام صاف اور سلیس اور دونوں میں تصوّف کا رنگ ہے، دونوں عاشقانہ رنگ کے اُستاد اور دونوں اپنی اپنی جگہ پر اور اپنے اپنے رنگ میں نصیحت گو بھی ہیں۔ نظیر چونکہ صوفی مشرب آدمی تھے لہذا اُن کو تمام مذہبی جھگڑوں اور مناقشوں اور نیز مذہبی پابندیوں سے بالکل بے تعلقی تھی، اُن کی صوفیانہ نظمیں بہت ہی اعلیٰ درجہ کی ہیں اور اس حیثیت سے اُن کا مقابلہ کسی دوسری زبان کے بہتر سے بہتر اخلاقی شاعر سے ہو سکتا ہے۔ وہ "الوحدة فی الکثرة" کے

---

[1] مثلاً "زر کی جو محبت تجھے تڑپائے گی بابا" یا "ٹک حرص و ہوا کو چھوڑ میاں" "جب مار اجل کا آ پہونچا ٹک اُس کو دیکھ ڈرو بابا" وغیرہ ۱۲

دل سے قائل اور ع "با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام" کے پورے عامل تھے اسی وجہ سے ہندو اور مسلمان دونوں اُن سے دلی محبت رکھتے اور اُن کو اپنا مُرشد اور گرو سمجھتے تھے۔ چنانچہ جب اُن کا انتقال ہوا تو اُن کے جنازہ کے ساتھ ہزارہا ہندو شریک تھے اور اپنی رسم و رواج کے مطابق نہایت ادب اور احترام سے اُس کو لے گئے۔ نظیر مثل گرونانک کے ایسے تارک الدنیا فقیروں اور سادھوؤں کے خاص شاعر تھے جو لوگوں کو ترک ماسوا اللہ کا سبق دیتے ہیں۔ انگریزی شعرا میں یہی حال ورڈس ورتھ کا ہے جسکی سانٹ (غزل) "دُنیا ہمارے ساتھ بہت ہے" بہت مشہور ہے۔ نظیر کی وسیع النظری، آزاد خیالی، ہمہ گیری اور بے تعصبی، ایسی خصوصیات ہیں جو اُن کے کلام کو تمام دوسرے شعرا کے کلام سے ممیز اور ممتاز کرتی ہیں۔

نظیر بحیثیت حقیقی ہندوستانی شاعر کے

نظیر کی ہمدردی و محبت بنی نوع انسان کے ساتھ محدود نہیں ہے بلکہ وہ حیوانات اور بے جان اشیاء سے بھی ایک خاص اُنس و محبت رکھتے ہیں۔ اُن کی نظمیں جانوروں کے متعلق مثلاً ریچھ کا بچہ، گلہری کا بچہ، جنگ جانوراں، ہرن کا بچہ، بلبلوں کی لڑائی وغیرہ اس قدر دلچسپ ہیں اور اسقدر جزئیات سے مملو ہیں کہ پڑھنے والے کو اُن کی عام واقفیت اور ہمہ دانی پر تعجب ہوتا ہے۔ اسی طرح چھوٹے بچے اُن کی نظمیں مثلاً کبوتر بازی، پتنگ بازی، تربوز، ع "کیا وقت تھا وہ جب تھے ہم دُودھ کے چھوڑے"، ع "کیا دن تھے وہ بھی یارو جب ہم تھے بھولے بھالے"، ہولی، دیوالی، بسنت، عید وغیرہ کو پڑھکر باغ باغ ہوتے ہیں۔ نظیر زندگی کے تمام لطفوں اور حظوں سے خوب بہرہ اندوز

ہوتے تھے۔ وہ ہندو مسلمانوں کے تہواروں میں شریک ہوتے اور اُن کے میلے ٹھیلوں کی خوب سیریں کرتے تھے۔ انھیں سیر تماشوں میں اُن کا پائے تہذیب کبھی پھسل جاتا ہے اور وہ بے تکان اڑانے لگتے ہیں مگر یہ ضرور ہے کہ انھیں چیزوں سے وہ مفید مطلب اور اخلاقی نتائج بھی نکالتے ہیں اور بقول شیکسپیر "پتھر سے وعظ سنتے ہیں اور ہر چیز میں اچھائی دیکھتے ہیں" یہ اُن کی خصوصیت ہے کہ انھوں نے دُنیا کے مختلف اشغال اور کھیل تماشوں کا حال اس مزے سے اور ایسے جوشِ مسرت کے ساتھ لکھا ہے کہ معلوم ہوتا ہے بچّوں کی طرح وہ خود اُن سب میں شریک ہیں پھر معمولی معمولی چیزوں کو ایسی دلچسپ تفصیل سے بیان کرتے ہیں کہ بغیر تعریف کیے رہا نہیں جاتا۔ اُن کی معلومات غیر محدود، اُن کا خزانۂ لُغات غیر مختتم، اور اُن کی صفائی بیان دلکش ہے۔ اِن کے مزاج میں چونکہ مذہبی تعصّب اور ناروا داری نہ تھی بلکہ کٹّرپن کو وہ نہایت نفرت اور حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اسی وجہ سے وہ ہندوؤں سے بہت خلط ملط رکھتے تھے اور اُن کے رسم و رواج، اُن کی زبان، اُن کے خیالات، اُن کے تہوار اور معتقدات تک کو ایسے دلچسپ طریقہ سے اور اسقدر صحت کے ساتھ بیان کر گئے ہیں کہ ہم کو اُن کی ہمہ دانی پر تعجب معلوم ہوتا ہے۔ وہ دوسرے مذہب کی چیزوں کے ساتھ کبھی تمسخر نہیں کرتے اور نہ اُن کو حقارت کے ساتھ دیکھتے ہیں، اسی سے اُنکے کلام میں ایک مقامی رنگ ہے جو اکثر ہمارے شعرائے اُردو میں کمیاب بلکہ نایاب ہے البتہ کہیں کہیں سودا، اور انشا کے کلام میں اس کا پتہ چلتا ہے۔ نظیر ایک خالص ہندوستانی شاعر تھے، کیونکہ اُن کے خیالات، اُن کی زبان اُن کے مضامین

سب مقامی رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے ۔

اُن کی خدمت زبان کے ساتھ

اُن کی خدمت زبان کے ساتھ بہت قابل قدر ہے۔ اُنھوں نے ایسے الفاظ سے بہت فائدہ اُٹھایا جن کو شعرا ونی اور بازاری سمجھ کے چھوڑ دیتے ہیں چونکہ ایسے الفاظ مروجہ مضامین شعر سے میل نہیں کھاتے اِس وجہ سے عام شعرا ان کو معمولی اور سوقیانہ سمجھ کے ترک کرتے ہیں اور شعر میں اُن کو داخل کرنا خلاف شان سمجھتے ہیں ۔ نظیر نے کمال کیا کہ ایسے ہی الفاظ کو اپنے اشعار میں جگہ دی اور دنیا کو دکھلا دیا کہ ان میں وہ خوبیاں چھپی ہوئی ہیں جنکو ظاہر بیں نگاہیں نہیں دیکھ سکتیں ۔ البتہ اسمیں بھی شک نہیں کہ اس قسم کے سب الفاظ اُس عزت کے مستحق نہیں تھے جو اُن کو حاصل ہوئی مگر بہت سی چیزیں باوجود مخالفت اور احتیاط کے بھی ادبی دنیا میں داخل ہوگئیں نظیر کی مستعملہ لغات تین قسموں پر تقسیم کی جاسکتی ہیں :-

(۱) ایسے الفاظ جو ان کے ابتدائی رنگ کے کلام میں بکثرت پائے جاتے ہیں اور اب بالکل خلاف تہذیب سمجھے جاتے ہیں ۔

(۲) ایسے الفاظ جو معمولاً اُردو شاعری کے مایۂ بساط ہیں ۔

(۳) وہ جواہر ریزے جن سے حُسن شعر بڑھ جاتا ہے اور خزانۂ زبان مالا مال ہوجاتا ہے ۔

نظیر پر بحیثیت شاعر الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ پڑھے لکھے نہیں تھے بلکہ ایک معمولی غلط گو شاعر تھے اور اپنے اشعار سے بازاری لوگوں کا دِل خوش کیا کرتے تھے ۔ اُن کا کلام غیر مہذب بلکہ فحش درجہ تک پہونچ جاتا ہے اور اُنھوں نے

اپنے عامیانہ اور سوقیانہ الفاظ کی آمیزش سے ہماری زبان کو غارت کر دیا۔ ان الزامات کے متعلق ہم آگے لکھیں گے مگر بالفعل مختصر طور پر اتنا کہنا ضروری سمجھتے ہیں کہ جو چیز نظیر کی خامی اور کمزوری سمجھی جاتی ہے وہی ہماری رائے میں فی الحقیقت اُنکی بڑی خصوصیت اور صفت ہے۔ مثلاً وہ ایسی معمولی چیزیں اور مناظر (میلے ٹھیلے وغیرہ) جن کو عام لوگ بہت پسند کرتے ہیں دیکھنے کے بہت شائق تھے اور اُن کے بیان کے لئے اُن کو عام فہم اور سیدھے سادے الفاظ کی ضرورت تھی لہذا ان کا بڑا کمال یہی ہے کہ وہ عوام الناس کے خیالات اور جذبات اور اُن کی بول چال کو خود اُنھیں کی زبان سے ظاہر کرتے ہیں۔ یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ وہ ایسی چیزوں کو فلسفیانہ نظر سے یا دور سے کھڑے ہو کر بطور تماشہ کے دیکھنا نہیں چاہتے نہ اُن میں کوئی نقص یا اعتراض نکالنا چاہتے ہیں بلکہ وہ اُن کا سچا فوٹو من وعن کھینچ دیتے ہیں وہ ایسے منظروں اور مجمعوں کو حکیمانہ یا جارحانہ نظر سے نہیں دیکھتے اسی وجہ سے اُن کا بیان ان چیزوں کا نہایت دلچسپ اور نیچرل ہوتا ہے تصنع اور بناوٹ اُن کے کلام میں مطلق نہیں ہوتی حالی نے شاید اسی کثرت الفاظ کے خیال سے نظیر کو میر انیس پر ترجیح دی ہے۔ نظیر ایسے موقعوں پر کوئی نکتہ چینی نہیں کرنا چاہتے بلکہ خود اُن میں شریک ہو کر اُن سے لطف اُٹھانا چاہتے ہیں۔ اُن کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ جس طرح کسی کی ہجو نہیں کہی اُسیطرح کسی کی تعریف میں کوئی قصیدہ بھی نہیں لکھا۔ یہ دونوں باتیں ہمارے نزدیک اُنکے کلام کا بہت بڑا جوہر ہیں اور اُن لغزشوں کی تلافی کر دیتی ہیں جو ابتدائے عمر میں اُن سے سرزد ہوئی ہونگی۔

نظیر جدید رنگ کے پیشرو تھے

یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ زمانۂ موجودہ کی فطری اور قومی

شاعری جسکی ابتدا مولانا آزاد اور حالی وغیرہ سے کہی جاتی ہے۔ اُس کے پیشرو بلکہ موجد نظیر اکبرآبادی کہے جاسکتے ہیں جسطرح انیس اور دبیر نے فاضلانہ قابلیت کے ساتھ مناظر جنگ اور مناظر قدرت کے بےمثل مرقعے اپنے اشعار میں دکھائے ہیں اُسی طرح نظیر نے بھی معمولی معمولی چیزوں کی ہو بہو تصویریں، جنکی گنجائش شعر میں مطلق نہ تھی، سیدھے سادے مؤثر الفاظ میں کھینچ دی ہیں جس سے ان کا کلام عوام الناس میں بہت مقبول ہے۔ اِس مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ فارسی کے دقیق لفظ اور ترکیبیں اور پیچیدہ تشبیہیں اور استعارے اُن کے کلام میں کہیں نہیں۔ اُن کی تحریر سادہ اور بےتکلف، اور اُن کا بیان صاف اور اصلیت کے مطابق ہوتا ہے۔ مگر نیچر کی پرستش سے وہ ناواقف ہیں، جنگلوں اور پہاڑی چوٹیوں کا حال اُن کے یہاں نہیں ہے۔ قدرتی مناظر کا فوٹو وہ صرف اُسی حالت میں کھینچتے ہیں جب اُن مناظر کا تعلق انسان سے ہوتا ہے، مثلاً باغوں میں روضۂ تاج گنج کو اُنھوں نے منتخب کیا۔ اُن کی نظمیں برخلاف معمولی اُردو نظموں کے مُسلسل ہوتی ہیں۔ البتہ اُن کے کلام میں وہ وسیع النظری اور گہرائی نہیں ہے جو متاخرین شعرائے دہلی کے کلام میں ہے۔ غرضکہ اپنے سادہ بیان سے، اپنے بےتکلف مگر پُرزور الفاظ سے، اپنے عام دلچسپی کے مضامین سے، اپنے دلکش اشعار سے جن میں تصنع اور یکرنگی کا نام نہیں نظیر اکبرآبادی ایک ایسے طرز کی بنا ڈال گئے جو آگے چل کر ہماری زبان اور ادب کی ترقی بلکہ ہمارے قومی احساس کے از سر نو زندگی کا بہت بڑا باعث ہوا۔

نظیر کا ظریفانہ رنگ، اُن کا مقابلہ انشا کے ساتھ

نظیر کا ظریفانہ رنگ خاص ہے اور عجیب قسم کا ہے، اِس

رنگ کی ترقی کا باعث اُن کا عام لوگوں کے ساتھ میل جول اور ربط ضبط ہے۔ چونکہ وہ عام لوگوں سے بے تکلفانہ اور مساویانہ ملتے تھے اور اُن کے شادی و غم میں برابر شریک رہتے تھے لہذا اُن کو فطرت انسانی کے مطالعہ کا خوب موقع ملتا تھا اور معلومات کے ساتھ اُنکی خوش طبعی اور ظرافت میں اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ وہ افلاس اور مصیبت کی تکلیفوں کو نہایت تحمل اور خندہ پیشانی سے برداشت کرتے اور ایسے حوادث کو اپنے مذاق میں اُڑا دیتے تھے۔ اُن کی ظرافت نہ تکلیف دہ ہے نہ اُس میں شہدپن ہوتا ہے۔ نظیر اور انشا دونوں اپنے اپنے رنگ میں ظرافت کے اُستاد تھے۔ مگر ان دونوں کی ظرافتوں میں فرق ہے۔ انشا کی ظرافت ایک ایسے درباری کی ظرافت ہے جو پُرمذاق باتوں سے اپنے مالک کو خوش کرنا چاہتا ہے اور اس کوشش میں وہ بھانڈوں کی طرح اپنی اور دوسروں کی بعزتی کی بھی مطلق پروا نہیں کرتا ہر چیز کو اپنے آقا کی خوشنودی مزاج پر وہ قربان کر دیتا ہے۔ نظیر ایک آزاد ظریف ہے جو اپنی با مذاق باتوں سے کسی کو رنج دینا نہیں چاہتا نہ کسی کی عزت پر حملہ کرتا ہے اور سب کو خوش رکھتا ہے۔ مختصر یہ کہ انشا کی ظرافت میں خوشامد اور پھبتی کی بُو آتی ہے اور نظیر ان عیوب سے پاک ہے۔ باوجود اس کے انشا اور نظیر میں کئی باتوں میں مماثلت بھی ہے دونوں شاعروں نے مشکل ردیف اور قافیوں میں طبع آزمائی کی ہے اور بعض غزلیں ہمطرح بھی کہی ہیں دونوں عربی مصرعے اشعار میں کامیابی کے ساتھ موزوں کرتے ہیں۔ دونوں کے کلام میں مقامی رنگ یعنی ہندی الفاظ اور ہندی رسم و رواج وغیرہ کثرت سے ہیں دونوں نے مختلف زبانوں میں شعر کہے، دونوں کے کلام میں تصوف کا سُنہرا رنگ جلوہ گر ہے۔ زبان کے بارہ میں دونوں آزاد ہیں

مگر فارسی اور عربی الفاظ صحت کے ساتھ استعمال کرنے میں آتشا مشاق ہیں۔ اور بمقابلہ نظیر کے اُن کے یہاں متروکات کم ہیں۔ اور اُن کی ظرافت کا رنگ بہت زیادہ گہرا ہے۔

نظیر بحیثیت مصوّر کے

چونکہ نظیر کو فن موسیقی سے بہت شوق تھا اس لئے اُن کو انتخاب الفاظ میں اس فن سے بہت مدد ملی۔ وہ ایک آرٹسٹ اور بہت بڑے مُرقّع نگار ہیں اُن کو اپنے اشعار کے واسطے انتخاب الفاظ میں وہی انہماک تھا جو انگریزی شاعر ٹینیسن کو تھا۔ وہ صنعت تجنیس کے بہت شایق ہیں اور اکثر ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں جنکی آواز سے اظہار مطلب ہوجاتا ہے۔ مثلاً لڑائی بھڑائی کے موقع پر وہ ثقیل حروف لاتے ہیں۔ شادی و مسرت کی محفلوں اور تہواروں کے بیان میں اُنھیں کے مناسب سُریلے اور دلکش الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ دُور از کار تشبیہات اُن کے کلام میں کم ہیں اور دیگر صنائع بدائع بھی نہایت اعتدال سے ہیں۔ اور آورد وغیرہ سے اُن کا کلام پاک ہے۔

اُردو کا شیکسپیر ہمارا کون شاعر ہوسکتا ہے

یہ سوال بہت دلچسپ ہے کہ اُردو کا شیکسپیر ہمارا کون شاعر ہے۔ اصل یہ ہے کہ ڈراما کا وجود اہل عجم میں تھا ہی نہیں اور نہ ہمارے اُردو شعرا نے اُسکو سنسکرت سے اخذ کیا۔ سودا اپنی اعلیٰ درجہ کی طباعی، اپنی زبردست شخصیت، اپنی عام واقفیت اور قدرت زبان کی وجہ سے ضرور قابل لحاظ ہیں۔ اُنھوں نے بے مثل ہجویں لکھی ہیں اور اسی وجہ سے وہ ایک زبردست کمیڈی نگار ہوسکتے تھے مگر اُن میں ٹریجڈی لکھنے کا مادّہ، یعنی فطرت انسانی کے ساتھ ہمدردی اور اس کا وسیع علم بہت محدود ہے۔ میر کی حالت یہ ہے کہ سُوز و گداز تو

اُن کے یہاں بدرجۂ اتم ہے مگر کیرکٹر نویسی سے وہ ناواقف ہیں۔ سوائے غزل اور مثنوی کے دیگر اصنافِ سخن اور نیز دیگر شعبہ ہائے زندگی میں اُنکی واقفیت بہت محدود ہے۔ انشا کے یہاں تمسخر اور ظرافت کی بہتات ہے۔ اور وہ اپنی قوت نقالی اور قدرت زبان کیوجہ سے خود ایکٹر بننے کے لیئے زیادہ موزوں تھے۔ مگر اُن کے درباری تعلق نے اُن کو ایک دوسری راہ پر لگا دیا اور تعمق خیال بھی اُن میں بہت کم ہے۔ انیس و دبیر گو فطری شاعر تھے زبان پر پوری طرح قدرت حاصل تھی کیرکٹر نویسی کے بھی مشاق تھے۔ مگر اُن کا دائرۂ عمل محدود ہے یعنی وہ محض مرثیہ نگار تھے۔ اور یہ تخصیص اُنکے واسطے قوت اور کمزوری دونوں کا باعث تھی۔ ایرانی پیشن پلے (یعنی تعزیہ داری وغیرہ) جس کا مقابلہ مریکل (معجزات) کے ڈراما اور مسٹری (مذہبی اسرار) کے ڈراما سے کیا جاسکتا ہے۔ باقاعدہ ڈراما سے قریب تر ہیں اور یہی انیس و دبیر کے موضوع ہیں لیکن اُس مذہبی جوش سے جو اُن کی نظموں میں سرایت کیے ہوئے ہے معمولی معمولی کیفیات و جذبات انسانی نظرانداز ہوتے رہے نظیر کو بھی مثل سودا انشا اور انیس کے زبان پر پوری طرح قدرت حاصل تھی اُس کی خصائل انسانی کی معلومات اکثر مشاہیر شعراء سے بڑھی ہوئی تھی۔ وہ ہندو اور مسلمان، بچے اور بوڑھے، امیر و غریب، خواص و عوام، دُنیادار اور تارک الدنیا سب سے ملتا جلتا تھا اور سب کا دوست اور بہی خواہ تھا، عورتوں کا علم بھی اُس کو کافی تھا۔ گو اُسکے یہاں ایسے مرقعے جیسے شیکسپیر کے یہاں ایموجن، ڈوسڈیمونا، پورشیا، اور افیلیا، کے ہیں موجود نہیں ہیں جسکی وجہ شاید یہ ہو کہ ہماری ہندوستانی سوسائٹی میں پردہ کا رواج ہے اور عورتیں آزادی کے ساتھ مردوں سے نہیں مل سکتیں اور اسی وجہ سے نظیر کو معزز عورتوں سے ملنے اور اُن کے

خیالات اور جذبات دریافت کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اُس کو صرف شاہدان بازاری کا تجربہ ہوا لہذا اُس کے اشعار میں اسی مخصوص جماعت کی طرف اشارات پائے جاتے ہیں۔ اُس کو کیرکٹر نگاری کا بڑا ملکہ تھا اور قوت بیانیہ بھی بڑے غضب کی پائی تھی مگر شیکسپیر کی طرح اسکے خیالات میں عمق نہیں ہے۔ اور نہ شیکسپیر کی ایسی اعلیٰ درجہ کی ذہانت اُس میں ہے۔ اُسکی دو نظمیں ایسی ہیں جن میں ڈراما کی کچھ خصوصیات پائی جاتی ہیں گو وہ پوری طرح ڈراما نہیں کہی جاسکتیں۔ ایک "لیلیٰ مجنوں" جو ٹریجڈی ہے اور دوسری "مہادیو کا بیاہ" جو اپنے انبساطی رنگ کی وجہ سے کمیڈی کہے جانے کی مستحق ہے۔ اسی طرح اُسکی نظمیں "ریچھ کا بچہ" اور "بلبلوں کی لڑائی" نہایت مزے کی اور اعلیٰ درجہ کی ہیں۔ نظیر میں سودا کا زور، میر کی بلند پروازی، انشا کی ظرافت، انیس و دبیر کا جوش و خروش نہیں ہے مگر یہ سب صفات اُس میں ایک حد تک ضرور پائی جاتی ہیں۔

نظیر کی سب سے بڑی صفت یہ ہے۔ کہ وہ معمولی معمولی چیزوں کے بیان میں ایسی دلچسپی پیدا کر دیتا ہے جو دوسروں کے یہاں اعلیٰ مضامین میں بھی نہیں پائی جاتی جب غزل کی یکرنگی اور قصیدہ کی لفاظی سے جی اُکتا جاتا ہے تو نظیر کے اس قسم کے مضامین بہت پسند آتے ہیں۔ اُس نے شعر میں نئے نئے مضامین اختیار کئے اور ادب اُردو کو بہت وسعت دی۔ یہ سچ ہے کہ وہ کوئی فاضل شاعر نہیں اور نہ وہ کیفیت اشیا کو فلسفیانہ طریقہ سے یا بہت گہرائی کے ساتھ بیان کرتا ہے بعض اوقات وہ فحش بھی کہہ جاتا ہے اور ایسے موقعوں پر اُسکی صاف بیانی سے تہذیب کے دل کو چوٹ لگتی ہے۔ وہ بڑے پایہ کا شاعر بھی نہ سہی۔ اور اُس کے کلام میں بعض جگہ متروکات

واغلاط بھی ضرور ہیں۔ زبان اور خیالات بھی بہت شستہ و رفتہ نہیں۔ مگر باایں ہمہ وہ ایک خالص ہندوستانی شاعر ہے اور ہندوستانی مضامین پر لکھتا ہے۔ ہندوستانی جذبات اُس کے دل میں جوش زن ہیں اور وہ مذہبی تعصب اور فرقہ وارانہ جھگڑوں سے بالکل پاک و صاف ہے، اپنے تنوع مضامین، اپنی ناصحانہ روش، اپنی وسیع النظری، اپنی ہر طبقہ کے ساتھ دلچسپی، اپنی خالص ہندوستانیت، اور علی الخصوص ایک جدید رنگ کی ایجاد کے سبب سے نظیر پوری طرح اس کا مستحق ہے کہ اُس کو شعرائے اُردو کی محفل میں ایک ممتاز جگہ دی جائے۔

شاہ نصیر دہلوی متوفی ۱۸۴۰ء

شاہ نصیر کا شمار مثل نظیر اکبرآبادی کے زبان اور زمانہ دونوں اعتبار سے طبقۂ متقدمین میں کیا جا سکتا ہے۔ مگر اِن کو شہرت شعرائے متوسطین کے زمانہ میں حاصل ہوئی۔ اِس لیے اِن کو دورِ متقدمین و متوسطین کے بیچ کی کڑی سمجھنا چاہیے۔ نصیر الدین نام نصیر تخلص اپنے سیاہ رنگ کی وجہ سے میاں کلو کے عرف سے مشہور تھے۔ شاہ غریب کے بیٹے دِلّی کے رہنے والے تھے، باپ ایک گوشہ نشین فقیر تھے اور جو آمدنی چند مواضعات جاگیر سے ہوتی تھی اُس پر بسر اوقات تھی۔ ہر چند کہ غریب باپ نے تعلیم و تربیت میں پوری کوشش کی مگر نصیر کو سوائے شاعری کے اور کچھ نہ آیا۔ شاعری کی طرف اُن کا رُجحان بچپن سے تھا۔ شاہ محمدی مائل کے شاگرد ہوگئے جو شیخ قیام الدین قائم سے اصلاح لیتے تھے اور اس نسبت سے شاہ نصیر کو سودا اور خواجہ میر درد سے بھی ایک تعلق شاگردی پیدا ہوگیا تھا۔ خاندانی وجاہت اور نیز شاعری کی وجہ سے شاہ عالم کے دربار میں نصیر کی رسائی ہوگئی۔ جہاں اُن کی قدردانی خوب ہوتی تھی اور انعام و اکرام سے بھی سرفراز ہوتے تھے۔ شاہ نصیر نے

سفر بہت کیے اور اکثر شہروں کے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ علی الخصوص لکھنؤ اور حیدرآباد متعدد مرتبہ گئے تھے۔ اپنے وطن دہلی میں اپنے مکان پر اکثر مشاعرے کرتے تھے جن میں اُس زمانہ کے مشہور شعرا جمع ہوتے تھے۔ ایسے ہی مجمعوں میں اُن کے شاگرد ذوق کو اپنی ابتدائی بلند پروازیوں کے جوہر دکھانے کا خوب موقع ملتا تھا۔

جب دلی میں تباہی آئی اور شعرا اِدھر اُدھر منتشر ہونے لگے۔ تو شاہ نصیر بھی ہراول ڈھونڈھنے باہر نکلے۔ دو مرتبہ لکھنؤ آئے اور چار مرتبہ حیدرآباد گئے۔ لکھنؤ میں جب یہ پہلی مرتبہ پہونچے تو مُصحفیؔ، انشاؔ اور جرأتؔ کا زمانہ تھا جن سے خوب خوب مقابلے رہے[1] دوسری مرتبہ ناسخؔ اور آتشؔ کا آوازۂ سخن بلند ہو رہا تھا۔ ناسخ سے بھی ایسے مقابلے ہوئے اور یہ کامیاب ہوئے[2]۔ حیدرآباد جانے کی یہ تقریب ہوئی کہ دیوان چندولال جو شاداں تخلص کرتے تھے اور اہل کمال خصوصاً شعرائے دہلی کے بڑے قدردان تھے انکی داد و دہش کا شہرہ سُن کر یہ وہاں پہونچے۔ مشہور ہے کہ دیوان موصوف نے ذوق اور ناسخ کو بھی حیدرآباد بلا بھیجا تھا مگر اُنھوں نے انکار کیا۔ شاہ نصیر نے اپنے حیدرآباد کے قیام میں بہت سے شاگرد جمع کر لیے اور اُن کے سبب سے وہاں بازار شاعری بہت گرم ہو گیا تھا۔ بالآخر چوتھی مرتبہ جب وہ حیدرآباد گئے تو چند روز قیام کر کے ۱۲۵۴ھ مطابق ۱۸۳۸ء میں وہیں انتقال کیا[3]۔

تصانیف شاہ نصیر ایک پُرگو شاعر تھے ساٹھ برس تک مشغلۂ شعر میں منہمک رہے

---

[1] دیکھو "بدن سرخ ترا" "چمن سرخ ترا" والی غزل مصحفی کے حالات میں اور اسی طرح میں شاہ نصیر کی غزل اُن کے حالات میں آبحیات میں ۱۲

[2] تذکرۂ گل رعنا میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ جیسی اُنکی قدر ہونا چاہیئے تھی نہیں ہوئی ۱۲

[3] قاضی مخدوم موسی کی خانقاہ میں دفن ہوئے۔ ایک شاگرد نے "چراغ گل" کے الفاظ سے تاریخ نکالی (آبحیات ذکر شاہ نصیر) ۱۲

اس طویل مدت میں ایسے ذہین وذکی شخص نے جو اسقدر شاعری کا دلدادہ ہو گیا کچھ نہ کہا ہوگا۔ مگر افسوس ہے کہ ان کا اکثر کلام تلف ہو گیا۔ اس لیئے کہ اُن کو کلام کے جمع کرنے اور حفاظت سے رکھنے کی عادت نہ تھی۔ اُن کے ایک شاگرد مہاراج سنگھ نے ان کا کچھ کلام بصورت دیوان کے جمع کیا جسمیں تقریباً ایک لاکھ شعر کہے جاتے ہیں۔ مگر بعض صحاب تذکرہ لکھتے ہیں کہ ان کے دیوان کی ترتیب میر عبدالرحمن خلف میر حسین تسکین شاگرد مومن نے کی تھی جسکا ایک قلمی نسخہ نواب صاحب رامپور نے اپنے کتبخانہ کے لئے خرید کیا تھا۔

شاہ نصیر نہایت متین و مہذب مگر اُس کے ساتھ ہی بڑے بذلہ سنج اور شگفتہ مزاج تھے سیکڑوں شاگرد دہلی لکھنؤ اور حیدرآباد میں چھوڑے۔ حنفی المذہب تھے مگر تعصب مطلق نہیں رکھتے تھے۔ آخر آخر میں اپنے مایۂ ناز شاگرد ذوق سے چشمک ہو گئی تھی۔ کیونکہ کثرت مشق نے ذوق کے دل میں ایک قسم کی انانیت پیدا کر دی تھی اور وہ سودا و میر ایسے باکمالوں کی برابری کا دعوے کرنے لگے تھے۔

اُن کا مرتبہ شاعری میں شاہ نصیر کی خصوصیت یہ ہے کہ سنگلاخ زمینوں اور مشکل مشکل ردیف و قافیہ میں غزلیں کہتے تھے جن میں اچھے شعر نکالنا ہر کسی کا کام نہیں مثلاً۔

شب کو کیونکر تجھ کو ہے پھبتا سر پر طرہ ہار گلے میں
جوں پروین و ہالۂ مہ تھا سر پر طرہ ہار گلے میں

بادہ کشی کے سکھلاتے ہیں کیا ہی قرینے ساون بھادوں
کیفیت کے ہم نے جو دیکھا دو ہیں مہینے ساون بھادوں

وقت نماز ہو اُن کا قامت گاہ خدنگ گاہ کماں ‏ ‏ بنجاتے ہیں اہلِ عبادت گاہ خدنگ و گاہ کماں

خال پشتِ لبِ شیریں ہے عسل کی مکھی ‏ ‏ روح فرہاد لپٹ بن کے جبل کی مکھی[1]

شکوہ الفاظ کے بھی عاشق تھے۔ اِن کے بعض استعارات اور تشبیہیں بہت نادر اور دلچسپ ہوتے ہیں[1]۔ مثل صائب کے مثالیہ اور اخلاقی مضامین بھی خوب باندھتے ہیں۔ فی البدیہ کہنے میں بھی مشاق تھے۔ علمی استعداد کم رکھتے تھے اور کہیں کہیں متروک الفاظ بھی نظم کر گئے ہیں۔ گو کہ کلام میں زور و اثر ہے مگر بلند پروازی اور اعلیٰ خیالات کم ہیں۔ دوسرے درجہ کے شعرا میں ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ کلام میں کوئی خاص بات نہیں البتہ اپنے زمانہ کے اُستاد تھے اور صدہا لائق شاگرد چھوڑ گئے۔

---

[1] مثلاً۔ دیہات جاگیر کے تعلق سے ایک دفعہ تحصیلدار سونی پت کے پاس ملاقات کو گئے اور کچھ زنگترے دلی سے بطور سوغات ساتھ لے گئے۔ تحصیلدار نے کہا کہ جناب شاہ صاحب! زنگتروں کی تکلیف کیا ضرور تھی۔ آپکی طرف سے بڑا تحفہ آپکا کلام ہے ان زنگتروں کی حسنِ تشبیہ میں کوئی شعر ارشاد فرمایئے۔ اسیوقت رباعی کہی اور سُنائی ؎

اے نیّر برجِ آسمانِ اقبال ‏ ‏ اِن زنگتروں پر غور سے کیجئے گا خیال

یہ نذرِ حقیر ہو قبولِ خاطر ‏ ‏ پردہ میں شفق کے ہیں گرہ بند ہلال

(آبحیات ذکر شاہ نصیر)

باب ۱۲

طبقۂ متوسطین شعرائے دہلی

ذوق و غالب کا زمانہ

دلی کی شاعری کا دوبارہ عروج

دلّی کا از سر نو پھر عروج ہوا صفحات گذشتہ میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ اُردو شاعری کا مرکز ترقی دلّی سے لکھنؤ منتقل ہو کر آ گیا تھا۔ لیکن قدما کی تخم ریزی بیکار نہیں گئی اُن کی کوششیں سرسبز ہوئیں اور وہ درخت جسکو دلّی کے قدیم شاعروں نے بڑی کدو کاوش سے سینچا تھا اب وہ نئے سرے سے پھیلنا شروع ہوا۔ دنیا میں مد و جزر، ترقی و تنزل، اور تنزل و ترقی کا قاعدہ ہمیشہ سے چلا آتا ہے یہی دلی کا بھی حال ہوا۔ تھوڑے عرصہ کی خاموشی کے بعد شاعری دہلی کی بلبل ہزار داستاں نے پھر نغمہ سرائی شروع کی۔ اور تمام اُردو داں پبلک کو اپنی خوشنوائیوں کا گرویدہ بنالیا۔ غالب، ظفر، ذوق، مومن وغیرہ اس دور کے نامی گرامی شعرا ہیں۔ غالب کی خداداد ذہانت اور طباعی کا مقابلہ تو دُنیا کے بہترین شعرا سے کیا جا سکتا ہے۔ ذوق و مومن گو کہ غالب کے مقابلہ میں نہیں چمک سکتے تھے مگر پھر بھی اپنے معاصرین میں بہت نمایاں درجہ رکھتے تھے۔ ظفر بھی کوئی معمولی درجہ کے شاعر نہ تھے اور چونکہ مشاغلِ حکمرانی کی زیادہ فکر نہیں رکھتے تھے۔ اس لیے شعر کے مشغلہ سے دل بہلاتے رہتے تھے وہ ذوق و غالب کے شاگرد تھے۔ اس زمانہ کے

شعرائے دہلی جدید طرز لکھنؤ کے بالکل متبع نہ تھے جہاں تصنّع تکلف اور رعایت لفظی وغیرہ شاعری کی جان سمجھی جاتی تھی۔ ان کا کلام حقیقی شاعری اور صحیح جذبات سے مملو ہے۔ غالب اور مومن کے یہاں فارسی الفاظ و محاورات کثرت سے ہیں اس وجہ سے کہ وہ فارسی کے بڑے زباں داں اور شاعر تھے۔ ان حضرات کے ابتدائی کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے قدما کی سیدھی سادی ہندی ترکیبیں نکال کر اُن کی جگہ فارسی الفاظ رکھدیے ہیں۔ اس زمانہ کا اُن کا کلام محض فارسی الفاظ کا ایک مجموعہ معلوم ہوتا ہے ہندی لفظ اور محاورے یہ اُسیوقت استعمال کرتے تھے کہ جب وہ کسی فارسی لفظ یا ترکیب کے ساتھ میل کھاتے تھے اور کلام کا حُسن بڑھاتے تھے۔ مومن اور غالب کے بعد غلبہ فارسی میں ایک معتدبہ کمی واقع ہوئی جملوں کی ترکیبیں سہل ہوگئیں شعروں میں صفائی اور روانی پیدا ہوئی اسی وجہ سے غالب و مومن کے شاگردوں کا کلام بہت صاف ہے مثال کے لیے حالی سالک ظہیر انور اور مجروح کے کلام کو دیکھنا چاہیئے۔

مومن ۱۲۱۵ھ لغایت ۱۲۶۸ھ
مطابق ۱۸۰۰ء لغایت ۱۸۵۱ء

حکیم مومن خاں حکیم غلام نبی خاں کے بیٹے تھے۔ ان کے دادا حکیم نامدار خاں جنکی اصل نجبائے کشمیر سے تھی سلطنت مُغلیہ کے آخری دور میں آکر بادشاہی طبیبوں میں داخل ہوے اور شاہ عالم کے زمانہ میں چند مواضعات جاگیر میں پائے۔ جب سرکار انگریزی کی حکومت ہوئی تو ان کی پنشن مقرر ہوگئی جس کا کچھ حصہ مومن خاں کو بھی ملتا تھا۔ مومن خاں کی ولادت ۱۲۱۵ھ میں ہوئی۔ بچپن ہی سے ذہانت اور طباعی اور شعر کہنے کی استعداد اُن میں موجود تھی۔ حافظہ بہت زبردست پایا تھا۔ جو بات سُنتے تھے فوراً یاد ہو جاتی تھی۔ عربی و فارسی میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ فن طب جو ان کا موروثی پیشہ تھا اپنے باپ و چچا سے حاصل کیا

شاعری کے علاوہ نجوم میں بھی اُنھوں نے کمال حاصل کیا تھا اور ایسا ملکہ بہم پہنچایا تھا کہ اُن کے احکام (پیشین گوئیاں) سن کر بڑے بڑے منجم حیران رہ جاتے تھے اکثر احکام کے صحیح ہونے کے سبب سے لوگ اُن کے بہت معتقد تھے اور اکثر آیندہ کی باتیں اُن سے دریافت کیا کرتے تھے شطرنج سے بھی اُن کو کمال مناسبت تھی۔ اور دلّی کے مشہور شاطر کرامت علیخاں سے قرابت قریبہ رکھتے تھے۔ مگر ان تمام مشاغل اور فنون کو اُنھوں نے ذریعۂ معاش نہیں بنایا تھا۔ آدمی بہت خوبصورت خوش وضع اور عاشق مزاج تھے۔ عشقبازی کے لیئے دلی ایسا وسیع شہر پایا تھا جہاں اُن کے عشق و محبت کے افسانے لوگوں کے زبان زد تھے۔ جب جوانی کی ہوسناکی ختم ہوگئی تو اُنھوں نے تمام بُری باتوں سے توبہ کرلی تھی اور نماز روزہ کے سختی سے پابند ہوگئے تھے۔ جو کلام اُن کی جوانی اور آزادہ روی کے زمانہ کا ہے وہ عاشقانہ رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ مگر آخر عمر میں کلام میں بہت پختگی اور متانت آگئی تھی۔ ابتدا میں شاہ نصیر کو اپنا کلام دکھاتے تھے مگر چند روز کے بعد ان سے صلاح لینی چھوڑ دی۔ اور اپنی ہی ذہانت اور طباعی پر بھروسہ رکھتے تھے۔ دلی سے پانچ مرتبہ باہر نکلے اور رامپور سہسوان۔ جہانگیر آباد۔ اور سہارنپور کی سیر کی۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

دلی سے رامپور میں لایا جنوں کا شوق ۔۔۔ ویرانہ چھوڑ آئے ہیں ویرانہ تر میں ہم

چھوڑ دلی کو سہسوان آیا ۔۔۔ ہرزہ گردی میں مبتلا ہوں میں

مگر وطن کی محبت نے پھر اپنی طرف جلد بلا لیا۔ جب مرزا غالب نے ۱۸۴۲ء میں دلّی کالج کی پرشین پروفیسری قبول کرنے سے انکار کیا تھا۔ تو ٹامسن صاحب نے یہی جگہ بمشاہرۂ اسّی روپیہ ماہوار اس شرط پر کہ باہر جائیں مومن خاں کو دینا چاہی مگر اُنھوں نے

باہر جانے سے انکار کیا۔ اسی طرح کپورتھلہ بھی بمشاہرۂ تین سو پچاس نہ گئے۔ کیونکہ سن لیا تھا کہ وہاں ایک گویّے کی یہی تنخواہ ہے۔ نواب وزیر الدولہ بہادر والی ٹونک نے ایک مرتبہ اُن کو بلا بھیجا اور اپنے پاس رکھنا چاہا مگر اُنھوں نے اس بنا پر انکار کر دیا کہ ٹونک میں دلّی کی پُر لطف صحبتیں کہاں میسّر ہونگی۔ مومن خاں نہایت آزاد مزاج قانع اور وطن دوست تھے۔ امیروں اور رئیسوں کی درباداری اور خوشامد سے اُن کو سخت نفرت اور عار تھا۔ یہی اُن کے کیرکٹر کی ایک نمایاں خصوصیت تھی۔ اُن کا دیوان اُمرا کے مدحیہ قصاید سے خالی ہے۔ سوائے اُس قصیدہ کے جسکا مطلع ہے۔

صبح ہوئی تو کیا ہوا ہے وہی تیرہ اختری کثرت دود سے سیاہ شعلہ شمع خاوری

یہ قصیدہ بطور اظہار شکریہ کے راجہ اجیت سنگھ رئیس پٹیالہ کی شان میں لکھا تھا جنھوں نے اُن کو ایک ہتھنی بطور تحفہ کے دی تھی۔

اپنی قابلیت اور جوہر ذاتی کا حکیم مومن خاں صاحب کو اسدرجہ خیال تھا کہ اُسکے مقابلہ میں لوگوں کی فصاحت و بلاغت کو ہیچ سمجھتے تھے۔ مشہور ہے کہ گلستان سعدی کو بھی ایک معمولی کتاب کہتے تھے۔ جب سعدی کی نسبت اُن کا ایسا خیال تھا تو اپنے معاصرین ذوق و غالب کو کیا خطرہ میں لاتے۔ اُن کے کلام کو نگاہ حقارت سے دیکھتے اور اُن کا مضحکہ اُڑاتے تھے۔ تاریخ گوئی میں اُن کو کمال حاصل تھا۔ تاریخ میں تخرجہ اور تعمیہ بُرا سمجھا جاتا ہے۔ مگر اُنکی طبع رسا نے اُس کو محسنات میں داخل کر دیا تھا۔ تاریخیں نئے نئے طریقہ سے نکالتے تھے۔ مثلاً اپنی صغیر سن بیٹی کی تاریخ وفات لکھی ؎ خاک بر فرق دولت دنیا ٭ من فشاندم خزانہ بر سر خاک۔ اسمیں "خزانہ" کے اعداد سر خاک یعنی (خ) کے اعداد کے ساتھ ملانے سے ۱۲۶۳ نکلتے ہیں۔ ایک بیٹی کی

ولادت کی تاریخ اس طرح کہی ہے

نال کٹنے کے ساتھ ہاتف نے   کہی تاریخ دختر مومن

"دختر مومن" کے اعداد سے "نال" کے اعداد خارج کرنے سے تاریخ نکل آتی ہے
اسی طرح شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی کی وفات کی تاریخ عجیب طریقہ سے
نکالی ہے ہے

دست بیداد اجل سے بے سروپا ہوگئے   فقر و دیں فضل و ہنر لطف و کرم علم و عمل

اس میں دوسرے مصرعہ کے الفاظ کے صرف بیچ کے حروف سے مادۂ تاریخ
۱۲۳۹ھ نکالا ہے۔

تصانیف تصانیف میں ایک دیوان جس میں چھ مثنویاں شامل ہیں یادگار چھوڑا
دیوان میں جمیع اصناف سخن جو شعرائے اُردو کو مطبوع ہیں بکثرت موجود ہیں۔ دیوان
کی ترتیب اُن کے مشہور شاگرد نواب مصطفٰے خاں شیفتہ نے کی تھی اور ۱۸۴۶ء میں
مولوی کریم الدین صاحب مولف تذکرۂ شعرائے ہند نے اُس کو شائع کیا

رنگ کلام مومن خاں کا کلام نازک خیالی اور بلند پروازی کے لیے شہرۂ آفاق ہے
اُن کی تشبیہیں اور استعارے بالکل غیر معمولی ہوتے ہیں اور کلام میں ایک خصوصیت
پیدا کر دیتے ہیں اُسمیں بلند پروازی کے ساتھ صحیح جذبات نگاری کا جوہر بھی ہے
اور یہی چیز اُن کو طرز لکھنؤ سے علیحدہ کر دیتی ہے۔ عاشقانہ رنگ کے وہ استاد کامل
ہیں۔ اُنکی علمی لیاقت اور طباعی اُن کو معمولی یا پامال مضامین سے بچاتی ہے۔ مثل
غالب کے وہ بھی کلام میں فارسیت کے بہت دلدادہ ہیں کیونکہ فارسی میں اُن کو بھی
وہی تبحر حاصل تھا بعض وقت یہ فارسیت کی کثرت اچھی نہیں معلوم ہوتی اور کلام کو

سخت اور گنجلک کر دیتی ہے۔ اُنکی مثنویاں سر تا سر نشتر ہیں جن میں حرماں نصیب عاشق
کے سوزِ محبت کا اظہار ہے۔ وہ جذبات سے بھری ہوئی ہیں اور مضطرب دلوں کی
صدائے بازگشت معلوم ہوتی ہیں۔ البتہ یہ اُن میں کمی ہے کہ عشق بازاری ہے اور طرزِ ادا
بلند نہیں ہے اس معنی میں وہ طلسمِ اُلفت اور زہرِ عشق وغیرہ کے رنگ کی کہی جا سکتی
ہیں۔ مومن کے یہاں الفاظ کا طلسم ہے اور اسی لفظی ہیر پھیر سے تخئیل کے نئے راستے
کھل جاتے ہیں مثلاً چند شعر درج ہیں۔

روزِ جزا جو قاتلِ دلجو خطاب تھا | میرا سوال ہی مرے خوں کا جواب تھا
پسِ شکستن خم زجرِ محتسب معقول | گناہگار نے سمجھا گناہگار مجھے
نقدِ جاں تھا نہ سزائے دیتِ عاشق حیف | خونِ فرہاد سرِ گردنِ فرہاد رہا
کیوں غش ہوئے دیکھ آئینہ کو | کہتے تھے کہ تاب لائیں گے ہم
آئینۂ زنگ غم نے توڑا | کیونکر اُسے مُنہ دکھائیں گے ہم

مومن کا مرتبہ بحیثیت شاعر

مومن شعرائے اُردو میں ایک خاص درجہ رکھتے ہیں نہ صرف
اپنی ذہانت اور طباعی اور دلفریب شاعری کی وجہ سے۔ یا اس لیے کہ اُن کے معاصرین
اُنکی بڑی قدر کرتے تھے بلکہ اس وجہ سے کہ وہ ایک صاحبِ طرز ہیں جن کے پیرو
نسیم دہلوی۔ منشی امیر اللہ تسلیم۔ حسرت موہانی وغیرہ ایسے نام بر آوردہ لوگ ہیں۔
مومن کے مشہور شاگردوں کے نام یہ ہیں نواب مصطفٰے خاں شیفتہ صاحبِ دیوان
و تذکرہ گلشن بیخار۔ میر حسین تسکین۔ میر غلام علی وحشت۔ اصغر علیخاں نسیم وغیرہ۔ مومن کا
انتقال ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۲ء میں کوٹھے سے گر کر ہوا۔ اُنھوں نے حکم لگایا تھا
کہ پانچ دن یا پانچ مہینے۔ یا پانچ برس میں مر جاؤں گا چنانچہ پانچ مہینے کے بعد مر گئے

کرنے کی تاریخ خود کہی تھی ۔ دست و بازو بہ شکست ۔ چونکہ اسی سال انتقال ہو گیا تھا لہٰذا یہی تاریخ اُن کے مرنے کی سمجھنا چاہیئے ۔

شیفتہ ۱۲۲۱ھ لغایت ۱۲۸۶ھ

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ خلف الصدق نواب مرتضیٰ خاں جنھوں نے لارڈ لیک کے ساتھ رہ کر بڑے بڑے کام کیے تھے اور اُس کے صلے میں ہوڈل پلول کا علاقہ جاگیر میں پایا تھا ۔ علاقہ جہانگیر آباد واقع ضلع بلند شہر خود نواب مصطفیٰ خاں صاحب نے خرید کیا جو اب تک اُن کی اولاد کے قبضہ میں ہے ۔ نواب صاحب موصوف کی ولادت ۱۲۲۱ھ مطابق ۱۸۰۶ء میں دہلی میں ہوئی اور غدر ۱۸۵۷ء تک وہیں قیام رہا ۔ اس کے بعد اپنے علاقے جہانگیر آباد میں قیام گزیں ہوئے نواب صاحب کو شعر و سخن سے ازلی مناسبت تھی ۔ پُرگو شاعر تھے ۔ فارسی میں حسرتی اور اُردو میں شیفتہ تخلص کرتے تھے مشہور ہے کہ فارسی میں غالب سے اور اُردو میں مومن سے مشورۂ سخن کرتے تھے شاید واقعہ یہ ہو کہ پہلے اپنا کلام مومن کو دکھاتے ہوں اور ان کے بعد غالب سے جو اُن کے بہت بڑے دوست تھے رجوع کی ہو ۔ شیفتہ کی قابلیت کا نشو و نما علم و فن اور شعر و سخن کے ایسے جمگھٹے میں ہوا جس میں مولوی امام بخش صہبائی ۔ عبداللہ خاں علوی ۔ مفتی صدرالدین خان آزردہ ۔ غالب ۔ ذوق شاہ نصیر احسان تسکین حکیم آغا جان عیش وغیرہ شریک تھے مفتی صدرالدین خاں اور خود نواب صاحب کے یہاں ہفتہ ہفتہ باری باری سے مشاعرہ ہوتا تھا ۔ اہل کمال اُس میں جمع ہو کر لطف سخن اُٹھاتے تھے ۔ نواب صاحب کی سخن فہمی کی اتنی شہرت تھی کہ غالب ایسا صاحب کمال اپنے اشعار کی اچھائی اور بُرائی کی کسوٹی نوابصاحب کی پسندیدگی کو قرار دیتا ہے اور کہتا ہے ۔

غالب بفنِ گفتگو نازد بدیں ارزش کہ او   ننوشت در دیواں غزل تا مصطفےٰ خاں خوش نکرد

ایک دوسری جگہ اُنکی طباعی اور ذہانت کی داد دیتے ہوے کہتے ہیں۔

غالب ز حسرتی چہ سرایم کہ در غزل   چوں او تلاشِ معنی و مضموں نکردہ کس

نواب صاحب کو سفر حج کے بعد سے شعر گوئی سے ایک بے توجہی سی ہو گئی تھی کبھی احباب کے اصرار سے کچھ کہہ لیتے تو کہہ لیتے۔ زیادہ وقت اپنا طاعت و عبادت اور اوراد و وظائف میں صرف کرتے تھے اور تمام منہیات سے تائب ہو گئے تھے۔ تصانیف میں ایک فارسی دیوان، ایک اُردو دیوان۔ ایک مجموعہ انشاے فارسی، جو فارسی انشا پردازی کا بہترین نمونہ ہے؛ ایک سفرنامہ موسوم بہ ترغیبُ السالِک، اِلیٰ اَحسَنِ المَسَالِک جس کا فارسی نام رہ آورد ہے۔ اور ایک مبسوط تذکرہ شعرائے اُردو کا زبان فارسی میں مشہور بہ گلشن بیخار اُن کی یادگار ہیں۔

شیفتہ بہ نسبت شاعر کے ناقد کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہیں۔ اپنے زمانہ میں بھی اِن کو یہی شہرت حاصل تھی اور اُردو اور فارسی شاعری کے اعلیٰ درجہ کے نقاد اور سخن سنج سمجھے جاتے تھے۔ ان کا تذکرہ گلشن بیخار ایک مبسوط اور مشہور تصنیف ہے اور ہمارے نزدیک وہ پہلا تذکرہ ہے جسمیں انصاف اور آزادی کے ساتھ اشعار کی تنقید کیگئی ہے۔ اُردو میں شیفتہ اپنے اُستاد مومن کے پیرو ہیں۔ اُن کا کلام اخلاق و تصوف کے مضامین سے لبریز ہے۔ اُن کے کلام میں وارفتگی مطلق نہیں ہے۔ اُن کے اُردو اشعار گو بہت اعلیٰ درجہ کے نہ سہی۔ مگر بلند مضامین۔ صاف اور با محاورہ زبان اور پاکیزہ خیالات رکھتے ہیں۔ دوسرے درجہ کے شعرا میں اُن کا درجہ ممتاز ہے۔ اُن کے صاحبزادہ نواب محمد اسحاق خاں نے اُن کا اردو و فارسی کلام معہ ایک مُفید

دیباچہ اور حالات کے ۱۹۱۵ء میں نظامی پریس بدایوں سے چھپوا کر شایع کیا۔

تسکین ۱۲۱۸ھ تا ۱۲۶۸ھ

میر حسین تسکین میر حسن عرف میرن صاحب کے بیٹے تھے۔ دتی میں پیدا ہوئے اور مولوی امام بخش صہبائی سے درسی کتابیں پڑھیں۔ شعر و سخن میں شاہ نصیر سے اصلاح لیتے تھے۔ مگر اُن کے انتقال کے بعد مومن کے شاگرد ہوئے اور شہرت حاصل کی۔ تلاش معاش میں لکھنؤ اور میرٹھ گئے مگر جب وہاں کچھ مقصد برآری نہوئی تو رام پور آرہے۔ جہاں نواب یوسف علیخاں نے اُن کی بڑی قدردانی کی۔ چند روز رام پور میں آرام سے بسر کرکے پچاس برس کے سن میں ۱۲۶۸ھ میں رامپور ہی میں انتقال کیا اور وہیں پیوند خاک ہوئے۔

کلام کا رنگ گواہی دیتا ہے کہ مومن کے شاگردوں میں یہ خاص مرتبہ رکھتے تھے۔ اپنے اُستاد کے قدم بقدم چلتے ہیں بلکہ کلام میں اسقدر ہمرنگی پیدا ہوگئی ہے کہ اگر دونوں کا کلام مخلوط کردیا جائے تو تمیز کرنا دشوار ہو جائے گا۔ تسکین کے بیٹے میر عبدالرحمٰن آسی رامپور میں نواب کلب علیخاں کے زمانہ تک تھے۔ یہ بھی ایک نام برآوردہ شاعر تھے۔

نسیم دہلوی
۱۷۹۹ء لغایت ۱۸۶۴ء

مرزا اصغر علیخاں متخلص بہ نسیم نواب آقا علیخاں کے بیٹے تھے دلی میں ۱۲۱۴ھ مطابق ۱۷۹۹ء میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پایا۔ ضروریات زمانہ کے موافق تعلیم سے فراغت حاصل کی۔ باپ کے مرنے کے بعد بھائیوں سے ناموافقت ہوگئی اور وہ اپنے بڑے بھائی مرزا اکبر علیخاں کے ساتھ لکھنؤ چلے آئے اور یہیں رہ پڑے۔ بعد کو بھائیوں نے عفو تقصیر کراکے ملنا چاہا مگر انھوں نے ایک نہ مانا۔ اور پھر دلی نہیں گئے۔ تمام عمر لکھنؤ میں فقر و فاقہ کی حالت میں

رہے مگر کبھی کسی کے سامنے دست سوال نہیں پھیلایا۔ بڑے پابند مذہب اور احکام قرآنی کے سختی سے عامل تھے۔ غدر کے بعد منشی نولکشور کے مطبع میں الف لیلہ کے منظوم ترجمہ کی خدمت پر مقرر ہوئے۔ ایک جلد ختم کی تھی کہ مطبع کی طرف سے تکمیل کتاب کی جلدی ہوئی جو اُن کو ناگوار خاطر ہوئی اور وہ علیحدہ ہوگئے۔ ان کے بعد منشی طوطارام شایاں نے بقیہ کتاب کو پورا کیا۔ تعجب ہے کہ جسوقت لکھنؤ کا طرز زوروں پر تھا اُسوقت نسیم دہلوی کو خود اپنے طرز میں لکھنؤ میں بڑی شہرت اور کامیابی حاصل ہوئی۔ یہ بڑے زود گو تھے مگر اسی کے ساتھ مزاج میں وارستگی اسقدر تھی کہ جو کچھ لکھتے اُس کی نقل اپنے پاس نہیں رکھتے تھے جسکی وجہ سے بہت کچھ کلام تلف ہوگیا۔ اُن کا دیوان اُن کے شاگرد حافظ عبدالواحد خاں مالک مطبع مصطفائی نے چھپوا دیا تھا۔ مگر اُس کو وہ اپنے لئے ننگ سمجھتے تھے۔ ان کی غزلوں کو مرزا غالب بھی پسند کرتے تھے۔ باوجود دہلوی ہونے اور اپنے شہر کی زبان پر فخر کرنے اور اسکی سختی کے ساتھ پابندی کے اکثر اہل لکھنؤ نسیم کے شاگرد ہوئے جن میں عبداللہ خاں مہر۔ منشی اشرف علی اشرف۔ منشی امیراللہ تسلیم مشہور ہیں۔

طرز کلام نسیم میں مومن کا رنگ بہت پایا جاتا ہے۔ اُن کا نہایت ہی لطیف طرز بیان نازک خیالی کے ساتھ ملا ہوا ہے جو مومن کا فیض تھا۔ نسیم کو تازگی کلام اور صحت محاورات کا بہت خیال تھا۔ لکھنؤ کی تصنعات اور لفاظی کو وہ پسند نہیں کرتے تھے ان کے کلام میں خیال کی دلفریبی کے ساتھ زبان کی صفائی اور پاکیزگی بہت نمایاں ہے اپنے استاد کی طرح وہ بھی فارسی ترکیبیں بہت استعمال کرتے ہیں۔ اور نزاکت خیال اور طرز بندش اور روانی کلام میں بھی انھیں کے پیرو ہیں نسیم کا مرتبہ شعرائے درجہ دوم میں

بہت برتر ہے ۔

ذوق ۱۲۰۴ لغایت ۱۲۷۱
مطابق ۱۷۸۹ء لغایت ۱۸۵۴ء

شیخ ابراہیم ذوق ایک غریب سپاہی شیخ محمد رمضان کے بیٹے تھے جن کو نواب لطف علیخاں رئیس دہلی کی حرم سرا کے کاروبار کی خدمت سپرد تھی۔ گو وہ کسی بڑے گھرانے سے نسبت نہ رکھتے تھے مگر اپنے جوہر ذاتی اور فنی قابلیت سے ہزاروں شریفوں اور عالی خاندانوں سے بڑھکر مشہور ہوے۔ اُن کی ابتدائی تعلیم ایک شخص حافظ غلام رسول کے سپرد ہوئی جو معمولی درجہ کے شاعر بھی تھے اور جن کے پاس محلے کے اکثر لڑکے پڑھنے آتے تھے۔ حافظ صاحب کو شعر سے بہت شوق تھا اور اکثر مشاعروں میں شرکت کرتے تھے۔ اُنھیں کے ساتھ ہمارے نوعمر ذوق بھی مشاعروں میں جایا کرتے تھے۔ جہاں لوگوں کے اشعار سُن کر اُن کو ایک روحانی لذت حاصل ہوتی اور شعر کہنے کا شوق دل میں پیدا ہوتا۔ اس زمانہ میں اکثر اچھے اچھے اشعار یاد کر لیتے اور اُن کو بار بار پڑھا کرتے تھے۔ اِس زمانہ کا کلام حافظ جی ہی کو دکھاتے اور اُن ہی سے اصلاح لیتے تھے۔ ذوق کے ہم محلہ اور ہم سبق میر کاظم حسین شاہ نصیر کے شاگرد ہو گئے جن کا اُس وقت دلی میں بڑا شہرہ تھا۔ اُن کی دیکھا دیکھی ذوق کو بھی خیال پیدا ہوا کہ شاہ نصیر کے شاگرد ہو جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا اور ایک دن میر کاظم حسین کے ساتھ جاکر شاہ صاحب کے شاگرد ہو گئے۔ نوجوان شاگرد کی غیر معمولی ذہانت اور طباعی سے تجربہ کار اُستاد کو خیال پیدا ہوا کہ کہیں ایسا نہو کہ شاگرد اُستاد سے بڑھ جائے۔ اسی خیال سے وہ کبھی اُنکی غزلوں کو بغیر اصلاح پھیر دیتے۔ کبھی منھ بنا کر کہتے یہ کچھ نہیں طبیعت پر زور ڈال کر کہو۔ ادھر ذوق کو ان کے دوستوں نے اُستاد کے خلاف اُبھار دیا۔ غرض کہ انھیں وجوہ سے رشتہ

اُستادی و شاگردی منقطع ہو گیا۔ ذوق اپنے کلام کو بنظر اصلاح خود دیکھنے لگے اور اسکی درستی و چستی میں بڑی کد و کاوش کرنے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کے کلام نے جلد شہرت حاصل کر لی اور اُن کی غزلیں محفلوں اور مجلسوں حتیٰ کہ کوچہ و بازار میں گائی جاتی تھیں۔ اس زمانہ میں مرزا ابوظفر ولیعہد سلطنت کے یہاں اکثر مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ اور بسا اوقات غزلیں فی البدیہہ کہی جاتی تھیں۔ جس سے شاعرانہ جودت اور تیز ہوتی تھی اور نو آموز شعرا کا شوق اور زیادہ ہوتا تھا۔ ان مشاعروں میں اکثر پُرانے اور کہنہ مشق شاعر مثلاً فراق، احسان، شکیبا، قاسم، عظیم، منت وغیرہ برابر شریک ہوتے تھے۔ انھیں میں بتوسط میر کاظم حسین بیقرار ذوق کی بھی رسائی ہوئی۔ اتفاق سے اس زمانہ میں شاہ نصیر دلی چھوڑ کر کہیں باہر گئے ہوئے تھے اور ولی عہد سلطنت ظفر کی غزلوں کی اصلاح میر کاظم حسین کے سپرد تھی اتفاقاً اُن کو بھی بحیثیت میر منشی جان الفنسٹن صاحب کہیں باہر جانا پڑا اور اب اصلاح کا کام ذوق کے سپرد ہو گیا جس کا صلہ چار روپیہ ماہوار بطور مشاہرہ مقرر ہوا۔ یہ تنخواہ گو بہت کم تھی مگر اس کمی کی تلافی انکی قدر و منزلت اور شہرت کی زیادتی سے بخوبی ہو گئی اس وجہ سے کہ اب شہر کے تمام امیر و رئیس اور نیز کہنہ مشق شاعر اُن کو اُستاد ماننے لگے۔ دلی میں نواب الٰہی بخش خاں متخلص معروف (مرزا غالب کے خسر) ایک عالی خاندان امیر تھے اور علوم ضروری سے باخبر ہونے کے علاوہ کہنہ مشق شاعر بھی تھے۔ پہلے شاہ نصیر سے اصلاح لیتے تھے۔ جب ذوق کا شہرہ ہوا تو انھیں بھی اشتیاق ہوا اور (بقول مولانا آزاد) ذوق کے شاگرد ہو گئے۔ اس وقت ذوق کی عمر تقریباً بیس سال تھی ان دو مشہور آدمیوں کی شاگردی سے نہ صرف ذوق کی شہرت میں اضافہ ہوا بلکہ اُن کو اپنے کلام کی پختگی و

صفائی کا انتہائی خیال ہوا۔ اور اسی وجہ سے وہ نہایت عمدہ شعر کہنے لگے اور یہی مشق آئندہ اُن کے کام آئی۔ کیونکہ اُن کو نواب صاحب کے کلام کی اصلاح میں بڑی کاہش کرنا پڑتی تھی اور اُن کی غزلوں کو جو کبھی سودا کبھی جراُت، کبھی درد کے طرز میں ہوتی تھیں بڑی دقت نظر سے بنانا پڑتا تھا[1]۔

شاہ نصیر سے معرکہ

جب شاہ نصیر دکن سے واپس آئے تو اپنا علم اُستادی پھر بلند کیا۔ ادھر ہونہار اور طباع شاگرد کے دل کو بھی اتنے دنوں کی مشق اور کدوکاوش نے اور بڑھا دیا تھا۔ مشکل مشکل بحروں اور ردیف قافیوں میں کہتے کہتے بڑی مشاقی اور روانی پیدا ہو گئی تھی۔ شاہ نصیر نے دکن میں کسی کی فرمائش سے نو شعر کی ایک غزل کہی تھی جسکی ردیف تھی "آتش و آب و خاک و باد" وہ غزل دلی کے مشاعرہ میں سنائی اور کہا کہ اس طرح میں جو غزل لکھے اُس کو میں اُستاد مانتا ہوں۔ شاہ صاحب کی مبارزطلبی پر ذوق نے مقابلہ کا بیڑا اُٹھا لیا اور ایک غزل اور تین قصیدہ لکھکر تیار کیے۔ شاہ صاحب کو شاگرد کی جراُت و گستاخی بہت ناگوار ہوئی ایک شاگرد سے اعتراض کرایا۔ جس کے جواب میں ذوق نے اکثر اسناد پیش کیے اور اس مقابلہ میں ذوق ہی کو کامیابی ہوئی اس کے بعد سے اُن کی اُستادی مسلم ہو گئی۔

[1] مصنف تذکرۂ گل رعنا اس معاملہ میں آزاد سے بالکل مختلف رائے رکھتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ "آزاد نے آب حیات میں جسطرح سے ظفر مرحوم کی کاوش فکر پر پانی پھیرا ہے۔ ان کے (معروف کے) بھی نتائج فکر کو اپنے اُستاد ذوق کے دامن کمال سے وابستہ کیا ہے باوجودیکہ اس کہنہ مشق شاعر کی عمر اس وقت چھاسٹھ برس کی تھی اور ذوق بمشکل اٹھارہ برس کے رہے ہونگے۔ مگر جوش عقیدت میں اسکا خیال نہیں رہا۔ (تذکرۂ گل رعنا فٹ نوٹ صفحہ ۲۸۳) اور نیز نواب سعید الدین احمد خاں طالب مرحوم نے بھی ایک مضمون میں نہایت مدلل طریقہ سے آزاد کے اس بیان کی تردید کی ہے۔ ۱۲

اُن کے اعلیٰ قصائد[1] کے صلہ میں اکبر شاہ ثانی نے اُن کو "خاقانی ہند" کا معزز خطاب عطا کیا تھا۔ جب مرزا ابوالظفر بادشاہ ہوکر بہادر شاہ ہوئے تو اُنھوں نے پہلے یہ قصیدہ گزرانا ؎

روکش تیرے رُخ سے ہو کیا نورِ سحر رنگِ شفق ۔۔۔ ہے ذرہ تیرا یہ تو انورِ سحر رنگِ شفق

اِس کے صلہ میں اُنکی تنخواہ چار روپیہ سے پانچ روپیہ ہوگئی اور پانچ سے سات رفتہ رفتہ سو تک اضافہ ہوا تھا اور عید بقرعید کے موقع پر خلعت و انعام سے سرفراز ہوتے تھے۔ آخر ایام میں ایک دفعہ بادشاہ بیمار ہوئے جب شفا پائی تو اُنھوں نے قصیدہ کہکر گزرانا[2] ؎

واہ وا کیا معتدل ہے باغِ عالم کی ہوا ۔۔۔ مثل نبضِ صاحبِ صحت ہے ہر موجِ صبا

اِس کے صلہ میں خلعت کے سوا خطاب خان بہادری اور ایک ہاتھی معہ حوضۂ نقرئی عنایت ہوا پھر ایک دوسرے قصیدے کے صلے میں

شب کو میں اپنے سرِ بسترِ خوابِ راحت ۔۔۔ نشۂ علم میں سرمستِ غرور و نخوت

ایک گانوں جاگیر میں عنایت ہوا۔ ذوق نے بعمر اڑسٹھ سال ۱۲۷۱ھ[3] میں انتقال کیا۔

---

[1] مثلاً وہ قصیدہ جس کا مطلع ہے ؎

جبکہ سرطان و اسد مہر کا ٹھہرا مسکن ۔۔۔ آب و ایلولہ ہوے نشو و نماے گلشن

[2] غالباً مرزا غالب نے اسی موقع پر یہ غزل کہی ہوگی جس کا یہ مطلع و مقطع ہے

پھر اس انداز سے بہار آئی ۔۔۔ کہ ہوے مہر و مہ تماشائی

کیوں نہ دنیا کو ہو خوشی غالب ۔۔۔ شاہ دیندار نے شفا پائی

[3] ظفر نے تاریخ کہی

شبِ چہارشنبہ بماہِ صفر ۔۔۔ بحکمِ خداوند جاں دادِ ذوق

ظفر روے اُردو بہ ناخن زغم ۔۔۔ خراشید و فرمود اُستاد ذوق
۱۲۷۱ھ

ذوق اپنی تیزی ذہن، براقی طبع اور قوت حافظہ کے لیے مشہور تھے۔ بڑے خدا ترس اور ہمدردی انسانی سے لبریز تھے۔ خوف خدا کا یہ حال تھا کہ کبھی کوئی جانور بلکہ ایک چڑیا تک ہلاک نہیں کی مختلف اذواق سے دلچسپی رکھتے تھے مثلاً موسیقی، نجوم، طب، تعبیر خواب وغیرہ شعرگوئی ان سب پر حاوی تھی۔ اس میں ان کو فنائیت کا مرتبہ حاصل تھا۔ جوں جوں عمر گذرتی گئی اُنکی قابلیت اور کمال میں اضافہ ہوتا گیا۔ اُن کو فقہ، تصوف، تفسیر، حدیث، تاریخ وغیرہ میں دستگاہ کامل تھی، دُنیاوی ترقی کے حوصلے اُن کو مطلق نہ تھے۔ دِلّی سے اُن کو اسقدر محبّت تھی کہ جب راجہ چندولال نے جو شاداں تخلص کرتے تھے اور شعروشاعری کے بڑے دلدادہ اور شعرا کے مربّی تھے اُن کو حیدرآباد بُلوا بھیجا تو اُنھوں نے صاف انکار کر دیا اور یہ شعر لکھکر بھیج دیا۔

ان دنوں گرچہ دکن میں ہے بڑی قدرِ سخن — کون جائے ذوق پر دلّی کی گلیاں چھوڑکر

ایک تنگ گلی کے اندر ایک چھوٹے سے مکان میں رہا کرتے تھے۔ جس میں کوئی زیب وزینت بلکہ آرام وآسائش تک کا سامان مہیّا نہ تھا۔ اُسی مکان میں ہر وقت بند اپنی فکر شعروسخن میں محو ومستغرق دنیا ومافیہا سے بالکل بیخبر رہتے تھے۔ احکام قرآنی کے پورے عامل اور نماز روزہ کے سختی سے پابند تھے۔ دِن رات میں اکثر اوقات اوراد ووظائف میں صرف کرتے تھے۔

تصانیف ایک ایسے شخص سے جس نے اپنی عمر کے پچاس برس سے زیادہ شعروسخن کی مشق میں صرف کیے ہوں اور سوائے شعروسخن کے اُس کا کوئی دوسرا مشغلہ نہ رہا ہو امید کیجا سکتی تھی کہ متعدد دیوان لاکھوں ابیات کے اُس نے یادگار چھوڑے ہونگے۔

اسمیں کوئی کلام نہیں کہ اُنھوں نے بہت کچھ لکھا تھا۔ اگر اُن کا سب کلام اس وقت جمع کیا جاتا تو کئی جلدیں تیار ہوتیں۔ مگر افسوس ہے کہ سارا کلام زمانۂ غدر کی لوٹ مار میں ضائع ہوگیا۔ مولوی محمد حسین آزاد اُن کے شاگرد رشید نے اس واقعہ کو نہایت دردناک طریقہ سے اپنی کتاب "آب حیات" میں لکھا ہے اور یہ تبلایا ہے کہ اُن کا جسقدر کلام ہمارے سامنے ہے وہ خود اُنکی اور حافظ غلام رسول ویران کی متحدہ کوششوں کا نتیجہ[۱] ہے۔

ذوق غزل اور قصیدہ دونوں کے استاد کامل تھے جنکی تعداد کافی مقدار میں وہ چھوڑ گئے ہیں۔ آب حیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک عشقیہ خط بطور مثنوی جسکا نام "نامۂ جہاں سوز" رکھا تھا اور پانچ سوابیات کے بعد ہنوز ناتمام تھا ایام غدر کی دستبرد میں ضائع ہوگیا۔ اُنھوں نے اکثر مخمس رباعیات اور تاریخیں بھی لکھی تھیں جنمیں سے اکثر ضائع ہوگئیں مگر چند دیوان موجودہ میں شامل ہیں۔ اپنے شاگرد رشید ظفر کیواسطے کچھ گیت وغیرہ بھی کہے تھے۔ البتہ سلام اور مرثیہ اور ہجو وغیرہ ان کے کلام میں نہیں پائی جاتیں۔

ذوق کی خدمت زبان کے ساتھ

ذوق کا بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اُنھوں نے زبان کو خوب صاف کیا اور اس پر جلادی۔ وہ ایک بہت بڑے صناع تھے اور الفاظ کی نشست اور مناسب استعمال سے کما حقہٗ واقف تھے، محاورات اور امثال کے استعمال میں وہ اپنا جواب نہیں رکھتے۔ الفاظ کا برمحل استعمال۔ فن عروض سے واقفیت۔ موسیقیت کلام۔ زور تخئیل اور بلندی مضامین، یہ سب چیزیں مِل کر اُن کے کلام کا جوہر اعلیٰ بن گئی ہیں۔ کسی دوسرے شاعر کے کلام میں لطف الفاظ کے ساتھ خوبی معنی اسقدر

---

[۱] مصنف خمخانۂ جاوید اس سعی میں انور اور ظہیر کو بھی شریک بتاتے ہیں۔ دیکھو حال انور دہلوی ۱۲

نہیں پائی جاتی۔

انداز کلام

ذوق کی شاعری میں تکلف اور تصنع مطلق نہیں ہے۔ اُن کے یہاں تشبیہات و استعارات اور دیگر صنایع بدایع نہایت مناسبت سے کالملح فی الطعام استعمال ہوئے ہیں جسکی وجہ سے شعر کا حُسن دوبالا ہو جاتا ہے اُن کے کلام سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ شاعر اپنی قابلیت اور علم و فضل کا زبردستی اظہار کرنا چاہتا ہے۔ کلام میں روانی اور ترنم بہت ہے۔ اعلیٰ تخئیل اور بلندی مضامین کبھی الفاظ کی خوبصورتی اور صرف برمحل کے مزاحم نہیں ہوتے ہر شعر برمحل اور حشو و زوائد سے پاک ہوتا ہے سُست اشعار اُن کے دیوان میں نہیں ہیں۔ قوت کلام اور تنوع مضامین کے اعتبار سے اُن کا مقابلہ سودا سے کیا جاسکتا ہے اور انھیں کے وہ متبع تھے بھی مگر اُن کے یہاں اور اُستادوں کا بھی رنگ موجود ہے مثلاً خواجہ میر درد۔ اور جرأت و مصحفی قصیدہ میں وہ کامل استاد مانے گئے اور اپنے تمام معاصرین پر سبقت لیگئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اُن کے اکثر قصائد ضائع ہو گئے۔ مگر جو کچھ ہمارے سامنے ہیں وہ اُن کی قادر الکلامی، اعلیٰ تخئیل اور بلند پروازی اور روانی کلام کے بمثیل نمونے ہیں۔ اِس صنف میں وہ اپنی آپ نظیر تھے۔ اُن کی غزلین، تازگی مضامین، خوبی محاورہ سادگی او صفائی کے لیے مشہور ہیں۔ اُن کے کلام میں شاہ نصیر، سودا، درد، مصحفی اور جرأت، سب کا رنگ پایا جاتا ہے اسی وجہ سے ان کے کلام کو گلدستہ گلہائے رنگارنگ کہنا بیجا نہیں۔ اِن کی وہ غزلیں جو جرأت کے رنگ میں ہیں مگر جرأت کے عیوب سے پاک ہیں نہایت اعلیٰ درجہ کی ہیں۔ اُن کے کلام پر بعض لوگوں کو یہ اعتراض ہے کہ وہ معائب سے پاک نہیں ہے اور عام لوگوں کے لئے ہے۔

ایسی صورت میں جب انکے اکثر معاصرین بڑے بڑے فارسی و عربی داں شاعر تھے۔ جن کا کلام معمولی آدمیوں کی سمجھ سے باہر تھا۔ یہ اعتراض بیجا بھی نہیں ہے۔ نازکخیالی اور معانی آفرینی میں اگرچہ وہ غالب سے کم ہوں مگر سادگی اور صفائی اور ترنم الفاظ کے لحاظ سے وہ ان سے بڑھے ہوئے ہیں اور قصیدہ میں تو اُن سے کہیں زیادہ ہیں۔ مختصر یہ کہ آسمان شاعری پر ذوق ایک درخشاں تارہ بن کر چمکے اور زبان اُردو کے بہترین شعرا میں ان کا شمار کیا جا سکتا ہے۔

شاگرد اُن کے سیکڑوں شاگرد تھے جن میں نواب مرزا خاں داغ۔ ظفر، آزاد، ظہیر اور انور بہت نامور ہوئے ہیں۔ اُن کے ایک ہی بیٹے تھے خلیفہ محمد اسمٰعیل، جو اُن کے فرزندان روحانی کی طرح زمانۂ غدر میں دُنیا سے اُٹھ گئے۔

ظہیر متوفی ۱۹۱۱ء سید ظہیر الدین نام ظہیر تخلّص سید جلال الدین حیدر کے بیٹے دلّی کے باشندے تھے، اُن کے والد ابوالمظفر بہادر شاہ کے خوشنویسی میں استاد مرصع رقم خاں بہادر کے خطاب سے سرفراز تھے۔ خود ظہیر بھی کمسنی ہی میں شاہی ملازمت میں داخل ہو گئے تھے۔ اور راقم الدولہ خطاب اور ایک مرصع دوات انعام میں پائی تھی۔ شعر و سخن سے بچپنے ہی سے شوق تھا۔ چودہ برس کے سن میں استاد ذوق کے شاگرد ہو گئے۔ غدر ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں ناچار دلّی سے نکلنا پڑا۔ جھجر۔ سونی پت نجیب آباد ہوتے ہوئے بریلی آئے اور یہاں سے لکھنؤ کا ارادہ کیا۔ مگر وہاں کے ابتر حالات سن کے کچھ دنوں بریلی میں رہ کر رام پور چلے گئے وہاں چار برس رہے اُس کے بعد دلّی آئے اور محکمہ چنگی میں ملازمت مل گئی اُس کے تھوڑے عرصے کے بعد اخبار جلوۂ طور کے اڈیٹر ہو گئے جو بلند شہر سے نکلتا تھا۔ ان کے مضامین کو مہاراجہ

شیودھان سنگھ والی الور نے پڑھا اور بہت پسند کیا۔ ان کو الور بلوا بھیجا جہاں یہ چار برس رہے۔ وہاں کی سازشوں سے دل برداشتہ ہو گئے۔ مجبور ہو کر پھر دلی آئے اور نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کی سفارش سے جے پور کے محکمۂ پولیس میں ان کو ایک معقول جگہ مل گئی۔ جے پور میں کم و بیش اُنیس سال رہے۔ والی ریاست کے مرنے پر ان کا تعلق ریاست سے منقطع ہو گیا۔ چند روز پریشانی میں بسر ہوئے تھے کہ نواب محمد علیخاں خلف نواب امیر خاں والی ٹونک نے بُلا بھیجا اور جب تک نواب زندہ رہے یہ بہت عزت و آبرو سے اُن کے ساتھ رہے۔ نواب کے مرنے کے بعد اُن کے صاحبزادے نواب ابراہیم علی خاں نے ان کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ اس طریقہ سے تقریباً پندرہ[15] سولہ[16] برس ٹونک میں رہے۔ آخر عمر میں حیدرآباد جانے کا شوق پیدا ہوا تھا۔ چنانچہ ٹونک سے رخصت لیکر حیدرآباد گئے۔ جہاں آٹھ مہینے کے قیام کے بعد باریابی ہوئی۔ مگر تنخواہ مقرر ہونے کی نوبت نہ آئی تھی کہ موت نے ساری امیدوں اور آرزوؤں کا خاتمہ کر دیا۔ بیکاری کے زمانہ میں جب پریشاں حال ہو گئے تھے تو مہاراجہ سرکشن پرشاد نے اُنکی بہت مدد کی تھی۔

ظہیر ایک پرگو شاعر تھے۔ تصنیفات کا حال یہ ہے کہ ایک دیوان مسمّٰی "گلستان سخن" آگرہ میں چھپ گیا ہے۔ دیوان دوم[2] و سوم[3] کا حق تصنیف قاضی عبدالکریم مالک مطبع کریمی بمبئی نے خرید لیا تھا اور یہ بھی چھپ گئے ہیں۔ چوتھا دیوان جسمیں بقول حسرت موہانی تین[3] سو غزلوں کے علاوہ بہت سے قصائد اور مسدس شامل ہیں، اُن کے نواسے کے پاس ہے۔

ظہیر اپنے زمانہ کے مشہور شاعر تھے۔ گو کہ ذوق کے شاگرد تھے مگر کلام میں مومن خاں کا

رنگ زیادہ پایا جاتا ہے جس کا اعتراف بعض غزلوں کے مقطعوں میں خود انھوں نے کیا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ کبھی رنگ غزل نے نہ دیا طرز مومن سے نہ آگاہ تھا جبتک کہ ظہیر

طاق ہیں لاریب اپنے فن میں ہم کیا نباہی طرز مومن اے ظہیر

آخری دور کے بڑے نامور شاعر تھے اور اپنے زمانہ میں زبان اور شاعری دونوں کے اُستاد مانے جاتے تھے۔ اِن کے مشہور شاگرد نجم الدین احمد ثاقب بدایونی ہیں جو پہلوانِ سخن کے لقب سے مشہور رہیں۔

انور — سید شجاع الدین عرف امراؤ مرزا متخلص بہ انور ظہیر مذکورۂ بالا کے چھوٹے بھائی تھے اور یہ بھی ذوق کے شاگرد تھے۔ ذوق کے بعد اپنا کلام مرزا غالب کو دکھلاتے تھے نہایت قابل اور ہونہار شاعر تھے۔ مگر افسوس ہے کہ جے پور میں عین جوانی میں بعمر ۳۸ سال انتقال کیا۔ ان کے تمام معاصرین ان کی بڑی عزت اور قدر کرتے تھے۔ اور یہ اُن سب مشاعروں میں شریک رہ چکے ہیں جو غدر کے دس سال بعد دلّی میں ہوا کرتے تھے جن میں داغ، حالی، ظہیر، مجروح، سالک، ارشد، مشاق، وغیرہ اپنی لاجواب غزلیں سُناتے تھے۔ اِن کے دو دیوان ضائع ہوگئے مگر محترمی لالہ سری رام صاحب قابل مصنف خمخانۂ جاوید نے بڑی محنت اور مشقت سے متفرق اور پریشان مسودوں سے ایک دیوان جمع کرکے چھپوایا ہے۔ انور کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں ذوق، غالب، اور مومن تینوں کا رنگ کچھ کچھ ملتا ہے۔

غالب ۱۲۱۲ھ لغایت ۱۲۸۵ھ ۱۷۹۶ء لغایت ۱۸۶۹ء عیسوی	زبان اُردو کے بہت بڑے ماہر آسمان شاعری کے سب سے درخشندہ تارے اپنے زمانہ کے استاد کامل

فلسفی شاعر مرزا اسد اللہ خاں متخلص بہ اسد و غالب ۱۲۱۲ھ مطابق ۱۷۹۶ء میں بمقام آگرہ پیدا ہوئے۔ لقب مرزا نوشہ تھا اور خطاب نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ بادشاہ دہلی سے عطا ہوا تھا۔ مرزا کو جس طرح اپنی ذاتی قابلیت پر اسی طرح اپنی اصل و نسل اور عالی خاندان ہونے پر بھی بڑا فخر و ناز تھا۔ جیسا کہ اُن کے اکثر اُردو و فارسی کلام سے ظاہر ہوتا ہے۔ مثال کے لئے یہ چند شعر کافی ہیں ؎

غالب از خاک پاکِ تورانیم — لاجرم در نسب فرہمندیم
ترک زادیم و در نژاد ہمی — بسترگانِ قوم پیوندیم
ایبکیم از جماعتِ اتراک — در تمامی ز ماہ دہ چندیم
فیض حق را بسینہ شاگردیم — عقل کل را بمہینہ فرزندیم
بتلاشے کہ ہست فیروزیم — بہ معاشے کہ نیست خورسندیم
ہمہ بر خویشتن ہمے گرییم — ہمہ بر روزگار سے خندیم

اشعار مذکورۂ بالا سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا خاندانی سلسلہ ایبک ترکمانوں سے جو وسط ایشیا کے رہنے والے تھے مِلتا ہے جو اپنے آپ کو سلاطین سلجوقیہ کی وساطت سے فریدوں کی نسل میں سمجھتے تھے۔ مرزا کے دادا سب سے پہلے ہندوستان آئے اور شاہ عالم کے دربار میں عزت پائی۔ مرزا کے والد مرزا عبد اللہ بیگ خاں نے ایک متلون زندگی بسر کی۔ کچھ دنوں دربار اودھ میں رہے پھر حیدر آباد گئے جہاں نواب نظام علی خاں بہادر کی سرکار میں تین سو سوار کی جمعیت سے ملازم رہے۔ کئی برس بعد گھر آئے۔ اور الور میں راجہ بختاور سنگھ کی ملازمت اختیار کی۔ یہاں کسی سرکش

گڑھی کی لڑائی کے موقعہ پر ۱۲۱۷ھ میں مارے گئے۔ اس وقت مرزا کا سن پانچ برس کا تھا مرزا عبد اللہ بیگ خاں کی شادی خواجہ غلام حسین خاں کی لڑکی سے ہوئی تھی جو فوج کے کمیدان اور آگرہ کے مشہور رئیس تھے۔ والد کے انتقال کے بعد مرزا کی پرورش اور تعلیم و تربیت اُن کے چچا مرزا نصر اللہ بیگ خاں کے سپرد ہوئی جو انگریزی فوج میں رسالدار تھے اور حسن خدمات اور وفاداری کے صلہ میں سرکار انگریزی سے جاگیر پائی تھی۔ ان کا انتقال بھی ۱۲۲۱ھ میں ہوگیا اُس وقت غالب کی عُمر نو برس کی تھی اسکے بعد اُن کی خبر گیری اُنکی نانہال میں ہوتی رہی اور انکے چچا کی جاگیر کے عوض میں سرکار انگریزی سے پنشن بھی ملتی رہی۔ مرزا کا بچپن آگرہ میں گزرا جہاں وہ ایک کہنہ مشق استاد شیخ معظم سے تعلیم پاتے رہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ اسی زمانہ میں مشہور شاعر نظیر اکبر آبادی سے بھی کچھ ابتدائی کتابیں پڑھی تھیں جب اُن کی عمر چودہ برس کی ہوئی تو ہرمزنام ایک پارسی سے جو ژند و پاژند کا عالم اور بڑا سیاح تھا، اُنکی ملاقات ہوگئی۔ ہرمز نے آخر میں مذہب اسلام قبول کرلیا تھا اور عبد الصمد نام رکھا تھا۔ یہ اُن کے ساتھ تقریباً دو برس رہا۔ اور چونکہ فارسی کیطرف اُن کو قدرتی مناسبت تھی لہذا اُس سے اُنھوں نے پوری طرح اکتساب کمال کیا۔ اس کے فیضان صحبت کا مرزا کو فخر تھا۔ اور اسمیں شک نہیں کہ اُسکی تعلیم و تربیت کے اثر سے مرزا میں وہ صحیح اور بامحاورہ فارسی قدیم لکھنے کا مادّہ بخوبی پیدا ہوگیا جو صرف ایک اہل زبان ہی کی مدد سے ہوسکتا ہے۔

غالب دہلی میں پہلی مرتبہ ۱۲۱۶ھ میں آئے جب اُن کے چچا کی شادی نواب فخر الدولہ کے خاندان میں ہوئی تھی۔ اور خود اُن کی شادی نواب الٰہی بخش خاں معروف کی بیٹی کے ساتھ، جو نواب فخر الدولہ والی لوہارو کے چھوٹے بھائی تھے ۱۲۲۵ھ میں ہوئی
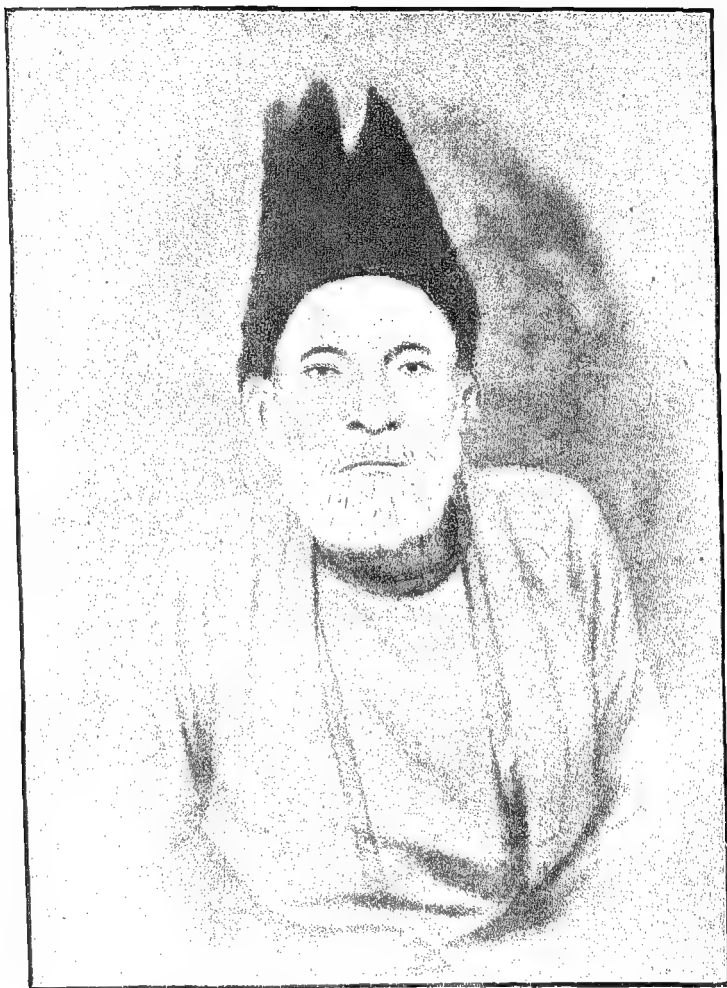
نجم الدولہ دبیرالملک مرزا اسد اللہ خان غالب دہلوی

میر مہدی مجروح

جبکہ اُن کا سن تیرہ برس کا تھا۔ دہلی کی فضا میں اسوقت شاعری گونج رہی تھی، مشاعرے جگہ بہ جگہ ہوا کرتے تھے۔ شادی بھی ایک مشہور و معروف شاعر کی بیٹی کے ساتھ ہوئی، ان سب اسباب سے نوعمر غالب کی نوخیز طبیعت پر شاعری کا گہرا اثر پڑا۔ شروع میں وہ فارسی کہتے تھے اور اُنھیں بہت کچھ کہا۔ مگر رفتہ رفتہ اُردو شاعری کی روزافزوں ترقی اور ماحول کے اثر سے اُردو کی طرف توجہ کی۔ پہلے اسدؔ تخلص کرتے تھے۔ جب کسی شخص کا یہ شعر سُنا ؎

اسد تم نے بنائی یہ غزل خوب ۔۔۔ ارے او شیر رحمت ہے خُدا کی

یہ سُنتے ہی اس تخلص سے نفرت ہوگئی۔ کیونکہ اُن کا یہ بھی قاعدہ تھا کہ عوام الناس کے ساتھ شریک حال ہونے کو بہت بُرا جانتے تھے۔ چنانچہ ۱۲۴۵ھ میں اسد اللہ الغالب علی بن ابیطالب" کی رعایت سے غالبؔ تخلص اختیار کیا لیکن جن غزلوں میں اسدؔ تخلص تھا اُنھیں اُسی طرح رہنے دیا۔ مرزا ۱۸۳۰ء میں کلکتہ بھی گئے تھے بہ سلسلہ اپنی پنشن کے جو ان کے چچا کو جاگیر ضبط ہوجانے کے عوض ملتی تھی اور آخر میں بند ہوگئی تھی۔ مگر باوجود مُتعدِد کوششوں کے اور ولایت میں اپیل دائر کرنے کے بھی مرزا اپنی اس کوشش میں ناکام رہے۔ کلکتہ کے راستے میں مرزا نے لکھنؤ اور بنارس کی بھی سیر کی تھی اور ایک قصیدہ نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ کے واسطے اور ایک نثر وزیر سلطنت کی مدح میں پیش کی تھی۔ آخری تاجدار اودھ واجد علی شاہ کی سرکار سے بھی پانچسو روپیہ سال ان کے واسطے مقرر ہوے تھے مگر دو برس کے بعد جب انتزاع سلطنت ہوا تو وہ موقوف ہوگئے۔ ۱۲۶۴ھ میں غالب تین ماہ کے واسطے کوتوال شہر کی عداوت کی وجہ سے قید ہوگئے تھے۔ مگر قید میں اِن کے مرتبہ کے موافق اِن کا احترام کیا گیا۔

سنہ ۱۸۴۲ء میں غالب ایک فارسی پروفیسری کے لئے جو دلی کالج میں خالی ہوئی تھی امیدوار تھے مگر چونکہ ٹامسن صاحب سکرٹیری گورنمنٹ نے بروقت ملاقات مرزا کا استقبال نہیں کیا۔ اس لئے اُنھوں نے اپنی کسرشان سمجھ کر ملازمت قبول نہ کی۔ سنہ ۱۲۶۶ھ (مطابق سنہ ۱۸۴۹ء) میں خطاب نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ بادشاہ نے دربار میں عطا کیا۔ اور ایک تاریخ خاندان تیموریہ لکھنے کا حکم دیا اور پچاس روپیہ مہینہ اس کے صلہ میں مقرر کیا۔ سنہ ۱۲۷۱ھ میں ذوق کی وفات کے بعد مرزا اُستاد شہ مقرر ہوئے اور اصلاح کا کام اُن کے سپرد ہوا۔ غدر کے ایام میں بوجہ سلسلہ ملازمت اور تقرب شاہی کے مرزا بھی مصائب میں مبتلا ہوگئے تھے پنشن بند ہوگئی اور اُن کے چال چلن کے متعلق تحقیقات کی جانے لگی آخر میں جب پوری صفائی ہوگئی اور یہ بیگناہ ثابت ہوئے تو انکی پنشن بحال ہوئی اور عزت سابق واپس دی گئی۔ غالب نواب یوسف علیخاں والی رام پور کے اُستاد بھی تھے جو اُن کو سو روپیہ ماہوار بطور پنشن کے عمر بھر دیتے رہے۔ غالب کا انتقال سنہ ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۵۔ فروری سنہ ۱۸۶۹ء بہ عمر ۷۳ سال چار ماہ بمقام دہلی ہوا اور وہیں دفن ہوئے۔

عام حالات اور طبعی عادات

غالب نہایت خلیق اور ملنسار واقع ہوئے تھے۔ اور ایک بڑی جماعت احباب اور قدردانوں کی رکھتے تھے۔ دوستوں کے ساتھ خط و کتابت کا سلسلہ جاری تھا جسکو وہ نہایت باقاعدہ طور پر وقت کی پابندی کے ساتھ انجام دیتے تھے دور دراز شاگردوں کے کلام کی اصلاح بھی مراسلت ہی کے ذریعہ سے ہوتی تھی اور وہ جواب دینے میں بہت مستعد تھے۔ اُن کی یہ عادت مرتے دم تک جاری رہی۔ محبت و ہمدردی اُن کے خمیر میں پڑی تھی۔ جیساکہ اُن کے خطوط اور

اشعار سے مترشح ہوتا ہے۔ مذہبی تعصبات اور غلو سے کوسوں دور تھے۔ سچ پوچھو تو ان کا مذہب بنی نوع انسان کے ساتھ ہمدردی اور محبت تھی جس میں کسی فرقہ اور جماعت کا مطلق خیال نہیں کرتے تھے۔ اُن کی مذہبی آزادی اور غیر متعصبی کا ثبوت اس سے بڑھکر کیا ہوسکتا ہے کہ ان کے دوستوں اور شاگردوں میں متعدد ہندو تھے جن میں سب سے زیادہ نامی وگرامی منشی ہرگوپال تفتہ تھے جو فارسی شعر کہنے میں بڑا ملکہ رکھتے تھے۔ گوکہ مرزا کبھی آسودہ حال اور دنیاوی جاہ و ثروت کے اعتبار سے فارغ البال نہیں ہوے مگر پھر بھی جسقدر اُنکی آمدنی تھی۔ وہ اپنی ضروریات کے ساتھ اپنے احباب اور ارباب احتیاج کے واسطے بلاتکلف وقف تھی۔ سخاوت کے ساتھ وہ صاف گوئی اور صاف باطنی کے لئے بھی مشہور تھے۔ چنانچہ خود اپنے عیوب اور کمیوں کو بھی کبھی نہیں چھپاتے بلکہ علی الاعلان اُن کو ظاہر کردیتے تھے مثلاً یہ سب جانتے ہیں کہ وہ شراب پیتے تھے مگر اس واقعہ کو اُنھوں نے کبھی نہیں چھپایا بلکہ اپنے اشعار میں اور نیز احباب کے خطوط میں کسی معقول توجیہ کے ساتھ لکھتے تھے اور اس طرح گویا کہ وہ اپنی ندامت کا اظہار کررہے ہیں۔ خلق و تواضع کے ساتھ اُن کو اپنی خودداری اور عزت اور اپنے مرتبہ کا بھی بہت بڑا خیال رہتا تھا۔ بڑے بڑے امرا سے وہ برابری سے ملتے اور اپنی علوشان کا ہر وقت خیال رکھتے تھے جیسا کہ اُس واقعہ سے پایا جاتا ہے جب اُنھوں نے دِلّی کالج کی پروفیسری کو نامنظور کیا۔ کبھی کبھی اُن کا یہ خیال حد اعتدال سے متجاوز بھی ہوجاتا تھا۔ مگر اپنے وسیع حلقۂ احباب کے ساتھ وہ ہمیشہ رفق و مدارا اور انکسار و تواضع ہی سے پیش آتے تھے۔ اُن کے خانگی تعلقات خاصکر اپنی بیوی کے ساتھ شگفتہ نہ تھے مرزا کی شادی تیرہ برس کی عُمر میں ہوئی تھی۔ اگرچہ وہ اپنی بیوی سے زیادہ محبت نہیں

رکھتے تھے مگر پھر بھی کوئی ظاہری رنجش نہ تھی اور نہ میل ملاپ میں کوئی فرق تھا۔ مرزا کی کئی اولادیں ہوئی تھیں مگر وہ سب بچپنے میں مرگئیں۔ مرزا کے چھوٹے بھائی جو فاتر العقل تھے اور انھیں کے ساتھ رہتے تھے غدر کے زمانہ میں مرے۔ مرزا اپنی بیوی کے بھانجے زین العابدین خاں عارف سے بہت محبت کرتے تھے۔ یہ بہت ہونہار شاعر تھے۔ اور مرزا کے سامنے ان کا انتقال ہوگیا تھا۔ ان کے دو بچوں سے مرزا صاحب کو کمال محبت تھی۔ آخر عمر میں مختلف امراض و آلام نے مرزا صاحب کو بہت پریشان کر دیا تھا پھر اس زمانہ میں اُنکی مالی حالت بھی درست نہ تھی۔ ایسی صورت میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ وہ اپنے افکار و مصائب کو شراب نوشی سے ہلکا کر دیتے تھے ؎

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو اِک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے

میر کی طرح غالب بھی مصائب و آلام کا مزہ چکھے ہوے تھے اسی وجہ سے ان کے کلام میں بھی مثل میر کے ایک خاص درد و اثر ہے۔ مرزا صاحب کے کلام میں تفاخر بیجا نہیں ہے بلکہ اُس سے حسن شعر میں اضافہ ہوتا ہے اور کلام کی قیمت بڑھ جاتی ہے اس لیے کہ وہ نہایت مدلل اور لطیف پیرایہ میں ادا کیا جاتا ہے جیسے فرماتے ہیں۔

ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالب میرے دعوے پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں

سب سے زیادہ قیمتی اور نمایاں جوہر مرزا صاحب کے کلام میں اُنکی نہایت لطیف ظرافت اور شگفتہ مزاجی ہے۔ جسکی بدولت بڑی سے بڑی تکلیفوں کو بھی ہنس کھیل کر کاٹ دیتے تھے۔ اسی خیال کو نہایت فلسفیانہ طریقہ پر ظاہر کرتے ہیں۔

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں

تاریک سے تاریک موقعوں پر بھی انکی ظرافت اور لطافت کی بجلی چمک جاتی ہی جس سے مصائب کی تیرگی کافور ہو جاتی ہے۔ اُن کی ظرافت میں کسی قسم کی تیزی اور بدمزگی نہیں ہوتی بلکہ اُس میں مناسبت اور جدت اسلوب کے ساتھ ہمدردی کی جھلک نظر آتی ہے کہیں کہیں اُن کے کلام میں بیزاری کا پرتو ہے مگر یہ کیفیت تنفر سے پیدا نہیں ہوتی۔ اُن کی ظرافت ومذاق سے کوئی نہیں چھوٹا۔ حتیٰ کہ اپنی بیوی کی نسبت بھی ایک خط میں لکھتے ہیں ''کہ ایک اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے۔ تو نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے نہ دم ہی نکلتا ہے''۔ اگر مرزا صاحب کے اس قسم کے لطائف وظرائف بالاستیعاب دیکھنا ہوں تو مولانا حالی کی یادگار غالب دیکھنا چاہیئے جسمیں ایسی باتیں بکثرت مذکور ہیں۔

غالب بحیثیت شاعر کے مرزا کا پایہ شاعری میں بہت بلند ہے اور اُسکو سب نے تسلیم کیا ہے وہ نہایت وسیع النظر اور کثیر المعلومات تھے اور اُن کے معاصرین بھی اس بارہ میں اُنکی بڑی قدر کرتے تھے۔ اُن کو فارسی سے اسقدر شغف تھا کہ وہ ہمیشہ یہ خواہش ظاہر کرتے کہ میری قابلیت کا اندازہ میرے فارسی کلام سے کیا جائے۔ اور اس بات پر نہایت افسوس کرتے کہ لوگ اسقدر فارسی سے بیگانہ ہوتے جاتے ہیں کہ اُن کے کلام کا قدر دان اور سمجھنے والا کوئی نہیں ہے۔

غریب شہر سخنہاے گفتنی دارد   بیا ور ید گر اینجا بود زباندانے

یہ عجیب بات اور نیرنگی قسمت ہے کہ اُن کی شہرت کا باعث اُنکی فارسی شاعری نہیں بلکہ اُردو شاعری ہوئی جسکی خود وہ کوئی قدر نہیں کرتے تھے ؎

فارسی بیں تا بدانی کاندر اقلیم خیال   مانی و ارژنگم و آن نسخۂ ارتنگ من است

اُردو وہ کبھی کبھی تبدیل ذائقہ کے لیے اور اپنے احباب کے اصرار سے کہہ لیا کرتے تھے۔ مختلف کتابیں اُنکی نظر سے گزری تھیں اور نہایت تعمق کی نظر سے اُن کو پڑھا تھا۔ قوت حافظہ کا یہ حال تھا اور اُس پر اتنا اعتبار تھا کہ کتابیں عاریت لیکر پڑھتے اور خود کبھی نہ مول لیتے تھے۔ فی البدیہ اشعار کہنے کی بھی عادت تھی جیسا کہ اُس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے جبکہ کلکتہ میں ایک دوست مولوی کرم حسین کی فرمایش سے چکنی ڈلی کی تعریف میں فوراً چند اشعار کہدیے تھے۔ عربی میں گو انھوں نے درس نظامیہ کی تکمیل نہیں کی تھی مگر مہارت کافی حاصل تھی۔ فن عرض کے اُستاد کامل تھے اور اس کے علاوہ نجوم میں بھی کچھ دخل تھا۔ تصوف سے کما حقہٗ واقف تھے اور اُس کے مسائل اپنے اشعار میں نہایت خوبی کے ساتھ نظم کیے ہیں۔ تاریخ، ریاضی اور ہندسہ سے اُن کو مطلق دلچسپی نہ تھی۔ گو کہ تعجب یہ ہے کہ دو تین کتابیں تاریخ کی خود تصنیف کر گئے ہیں۔ اسی طرح مرثیہ اور تاریخ گوئی سے بھی اُن کو کوئی لگاؤ نہ تھا[1]۔ البتہ فارسی میں بہت سے

[1] یہ کہنا صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ مرزا کو تاریخ گوئی سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ یوں تو اُن کے اردو دیوان میں بھی دو تین تاریخیں موجود ہیں مگر فارسی میں تو متعدد عمدہ تاریخیں اُن کے قطعات میں شامل ہیں۔ مثال کے طور پر ہم دو تاریخی مادے لکھتے ہیں جو بالکل ایک نئے ڈھنگ سے نکالے گئے ہیں۔ تاریخ وفات مرزا مسیتا بیگ

زسال واقعۂ میرزا مسیتا بیگ ۔۔۔ نمَت رہست شمارِ المۂ امجاد
صحیفہائے سماوی مبیّن از عشرات ۔۔۔ حدیقہائے بہشتی مشخص از آحاد
بحرمتِ دہ و دو ہادی و چہار کتاب ۔۔۔ کہ در نشیمنِ از ہشت خلد جایش باد

اس سے بارہ سیکڑے چار دہائیاں اور آٹھ اکائیاں یعنی ۱۲۴۸ھ نکلتے ہیں۔ اسیطرح ایک دوسری تاریخ میں فرماتے ہیں۔

جستم از سال رحلتش اثرے ۔۔۔ گفت غالب کہ خود ز روے شمار
از بروجِ سپہر جوے نمَت ۔۔۔ عشرات از کواکبِ سیّار
گفتم آحاد گفت شرمت باد ۔۔۔ از خداوند واحدُ القہار

اسمیں بارہ سیکڑے سات دہائیاں اور ایک اکائی یعنے کُل ۱۲۷۱ نکلتے ہیں۔ ۱۲

نوحے موجود ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک بہت بڑے فلسفی شاعر تھے اور اُن کی ذہانت کے مختلف پہلو تھے۔ جسکی وجہ سے ایک شاعر کا تبحر ایک مصوّر کی چابکدستی کے ساتھ مل گیا تھا۔

تصانیف | حسب ذیل تصانیف اُنکی یادگار ہیں :-

(۱)۔ عود ہندی (۲) اُردوے معلّی۔ (۳) کلیات نظم فارسی۔
(۴) کلیات نثر فارسی۔ (۵) دیوانِ اُردو (۶) لطائف غیبی
(۷)۔ تیغ تیز (۸) قاطع برہان (۹) پنج آہنگ
(۱۰) نامۂ غالب (۱۱) مہر نیمروز (۱۲) دستنبو۔
(۱۳) سبد چین۔ "عود ہندی" اور "اُردوے معلّی" اُردو خطوط کا مجموعہ ہیں جو اُنھوں نے اپنے احباب کو لکھے تھے۔ اور اول مرتبہ بصورت کتاب ۱۸۶۹ء میں شائع ہوے تھے۔ عود ہندی میں علاوہ خطوط کے چند دیباچے اور تقریظیں بھی شامل ہیں "لطایف غیبی" مباحثہ میں ہے اور سیف الحق کے فرضی نام سے لکھی ہے "تیغ تیز" اور "نامۂ غالب" بھی اُسی مناظرہ سے تعلق رکھتی ہیں جو قاطع برہان کی وجہ سے ہوا تھا۔

"پنج آہنگ" میں فارسی انشا پردازی کے مختلف نمونے ہیں "کلیات نظم غالب" اُن کے فارسی قصائد اور غزلیات، قطعات، مثنویات، رباعیات وغیرہ کا بیش بہا مجموعہ ہے۔ "مہر نیمروز" تاریخ ہے۔ مرزا نے اسکو حکیم احسن اللہ خاں طبیب خاص بادشاہ کے ایما سے لکھا تھا۔ اسکی پہلی جلد میں امیر تیمور سے ہمایوں تک کا حال قلمبند کیا اور مہر نیمروز نام رکھا۔ ارادہ تھا کہ اکبر سے لیکر بہادر شاہ تک کا بھی حال دوسری جلد

لہ دیکھو فٹ نوٹ صفحہ ۳۸۴ پر ۱۲

میں لکھیں اور "ماہ نیم ماہ" نام رکھیں کہ اس اثنا میں غدر ہوگیا اور وہ کتاب رہ گئی۔ "دستنبو" میں گیارہ مئی ۱۸۵۷ء سے یکم جولائی ۱۸۵۸ء تک حال بغاوت تباہی شہر اور اسکے ساتھ اپنے حالات بھی بیان کیئے ہیں۔ "سبد چین" میں چند قصائد اور قطعات فارسی میں اور کچھ خطوط ہیں۔

مرزا صاحب سے مباحثے — پہلا مباحثہ اسطرح ہوا کہ جب مرزا کلکتہ میں تھے تو بعض لوگوں نے اُن کے کلام پر کچھ اعتراض کیے اور سند میں قتیل کے اقوال پیش کیے۔ مرزا صاحب جن کا قول تھا ؎

آنکہ طے کردہ ایں مواقف را   چہ شناسد قتیل و واقف را

وہ بھلا قتیل کو کب ماننے والے تھے۔ اُنھوں نے اپنے کلام کی تائید میں اساتذۂ اہل زبان پیش کیے اور کہا ؎

فٹ نوٹ (حاشیہ متعلق صفحۂ ۳۸۳)

۱؎ مرزا کے فارسی قصائد کل چونسٹھ ہیں جنمیں سترہ قصیدے حسب تفصیل ذیل انگریز حکام کی شان میں ہیں۔

نام ممدوح	تعداد قصائد	نام ممدوح	تعداد قصائد
کوئین وکٹوریا	۳	مسٹر اسٹرلنگ	۱
لارڈ آکلینڈ گورنر جنرل	۱	ولیم فریزر	۱
لارڈ النبرا ایضاً	۲	مسٹر کالون	۱
سر چارلس مٹکاف ایضاً	۱	لارڈ ہارڈنگ گورنر جنرل	۱
جیمس ٹامسن	۱	مسٹر ایڈمنسٹن	۱
مسٹر پرنسپ	۱	لارڈ کیننگ گورنر جنرل	۱
ٹامس میٹکاف	۱	مسٹر منٹگمری لفٹننٹ گورنر	۱

ان کے علاوہ تین چار قطعات بھی انگریزوں کی شان میں ہیں ۱۲۔

دامن از کف کنم چگونہ رہا   طالب و عرفی و نظیری را

خاصہ روح و روان معنی را   آں ظہوری جہانِ معنی را

مخاصمین جو قتیل کے شاگرد تھے اس پر اور بر افروختہ ہو گئے اور مرزا صاحب کے کلام پر اور اعتراض وارد کئے۔ یہ سب واقعات ان کی مثنوی "بادِ مخالف" میں مذکور ہیں۔

دوسرا مباحثہ اس وجہ سے ہوا کہ مرزا نے فارسی کی مشہور لغت "برہان قاطع" پر اعتراض کیے اور ان کو کتابی صورت میں شائع کیا اور "قاطع برہان" نام رکھا۔ اس کے ایک سال بعد اس کتاب کو ترمیم کر کے اس کا نام "درفش کاویانی" رکھا۔ اس کتاب سے مرزا کی انتہائی قابلیت اور تبحر کا پتہ چلتا ہے اس کے اکثر جواب لکھے گئے۔ کلکتہ سے ایک شخص مرزا احمد بیگ نے "مؤید البرہان" کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ غالب نے اس کا جواب "تیغ تیز" سے دیا۔ اور ایک دوسری کتاب "ساطع برہان" کا جواب "نامۂ غالب" سے دیا گیا۔

مرزا کے فارسی کلام پر اس کتاب میں کوئی رائے دینا بے موقع ہے۔ مگر اتنا ہم ضرور کہیں گے کہ وہ نظم و نثر فارسی دونوں کے استاد کامل تھے اور ان کا مقابلہ ہندوستان اور ایران کے بڑے بڑے شعرا خسرو، نظیری، فیضی، بیدل و حزیں وغیرہ سے بے تکلف کیا جا سکتا ہے۔

غالب کی شاعری کے تین دور

غالب کی شاعری تین مراتب یا ادوار پر تقسیم کی جا سکتی ہے جس سے انکی شاعری کی ترقی اور نیز ہر دور کی خصوصیات کا پتہ بخوبی چل سکتا ہے۔ یہ بات ضرور پیش نظر رکھنا چاہیے کہ غالب اپنی قابلیت اور کلام کو اپنے اردو دیوان کی معیار سے کبھی نہیں جانچنا چاہتے تھے۔ ان کا قول تھا ؎

فارسی بیں تا ببینی نقشہائے رنگ رنگ　　　بگزر از مجموعۂ اُردو کہ بیرنگِ من است

اور وہ ہمیشہ اپنے فارسی کلام ہی کو اپنا مایۂ ناز سمجھتے تھے۔ اُنھوں نے اپنا مقابلہ کبھی کسی اردو شاعر سے نہیں کیا۔ البتہ اہل زبان کے کلام سے اپنے کلام کو تولنے پر ہمیشہ مستعد تھے۔ مگر بایں ہمہ اُنکی ذہانت وطباعی اور اُن کی فطری شاعری کا پورا اثر اُن کے اُردو کلام میں بھی اُسیطرح جلوہ گر ہے جس طرح اُن کے فارسی کلام میں ہے مرزا کا اُردو دیوان تقریباً اٹھارہ سو ابیات سے زیادہ نہوگا مگر اُس کو زبان اُردو کا بہترین خزانہ اور اُردو شاعری کا نہایت گرانقدر سرمایہ سمجھنا چاہیئے۔ مرزا کی شاعری کا پہلا دور اُس وقت سے شروع ہوتا ہے جب سے کہ اُنھوں نے شعر کہنا شروع کیا۔ تاعمر پچیس سال جبکہ اُنھوں نے اپنے اُردو دیوان کو چھانٹا اور اُسمیں سے فارسی کی غیر مانوس ترکیبیں اور بندشیں نکال ڈالیں۔ اب وہ قدیم کلام جو مروجہ دیوان سے خارج کیا گیا تھا ایک عرصۂ دراز کے بعد بڑی کوشش اور کاوش سے بہم پہونچا کر چھاپا گیا ہے۔ اور اُس کے مطالعہ سے بہت سے فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی افکار مرزا کی کس قسم کی ہوتی تھیں۔ نیز یہ کہ کن کن ترکیبوں اور بندشوں کو اُنھوں نے ترک کیا جو ابتدا میں اُن کو پسند تھیں۔ اس نئے دریافت شدہ کلام کی نازکخیالیاں اور نئی نئی ترکیبیں قرون وسطےٰ کے اُن یورپی شعرا سے ملتی جُلتی ہیں جن کو انگریزی اصطلاح میں "ہکولمن" کہتے ہیں۔ اس دَور کی شاعری ہیں فارسی ترکیبوں اور نازکخیالیوں کی بہت کثرت ہے علی الخصوص مرزا عبدالقادر بیدل کا بہت تتبع معلوم ہوتا ہے چنانچہ خود کہتے ہیں ؎

مطربِ دل نے مرے تارِ نفس سے غالب　　　ساز پر رشتہ پئے نغمۂ بیدل باندھا

مجھے راہ سخن میں خوف گمراہی نہیں غالب عصائے خضر صحرائے سخن ہے خامہ بیدل کا

"طرز نازک خیالی کے متبعین کی خصوصیت یہ معلوم ہوتی ہے کہ حقائق شعری کو سیدھے سیدھے الفاظ میں کہنے کے بجائے وہ مضمون کو تخیل کی پیچیدہ گھاٹیوں سے گزارتے ہیں اور اسی اشکال میں وہ اپنی خصوصیت اور ناموری سمجھتے ہیں بعض اوقات اُن کی یہ بلند پروازیاں اور نازک خیالیاں اسقدر بلند ہو جاتی ہیں کہ نظروں سے اوجھل ہو کر شعر کا مطلب اور اثر بالکل جاتا رہتا ہے۔ ایسے ہی اشعار پر "کوہ کندن و کاہ برآوردن" کی مثل پوری طرح صادق آتی ہے۔ یہ قدرتی بات تھی کہ مرزا کو یہ رنگ بہت پسند آیا اس وجہ سے کہ اُن کے مزاج کی اُفتاد یہ واقع ہوئی تھی کہ وہ ہر چیز میں اپنے آپ کو عام لوگوں سے علیحدہ رکھنا چاہتے تھے۔ اسی لیے شاعری میں بھی انھوں نے یہ رنگ اپنے واسطے منتخب کیا۔ اس وجہ سے کہ اس میں فارسیت کا غلبہ تھا۔ اور فارسی کا ذوق اُن کی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ یہ طرز ان کے اعلیٰ خیالات کے اظہار کا ایک بڑا آلۂ کار تھا۔ مرزا بیدل کے وہ صرف متبع ہی نہیں بلکہ خلوص کے ساتھ اُن کے معترف بھی ہیں جیسا کہ مذکورۂ بالا شعروں سے معلوم ہوا۔ یہ رنگ اگرچہ کچھ اچھا نہ تھا۔ مگر تھوڑی مدت تک مرزا کی طبیعت پر غالب رہا۔ بعد کو وہ خود سنبھل گئے اور اپنے واسطے ایک نیا راستہ نکالا جسمیں نہ صرف بیدل کی پیروی ترک کی بلکہ اُس طرز کا کلام بھی اپنے دیوان سے خارج کر دیا۔ اُن کے ابتدائی کلام کی خصوصیات حسب ذیل ہیں۔ عجیب و غریب تشبیہیں۔ ایسی بلند پروازیاں جن سے شعر کے معنی مبہم ہو کر رہ جاتے ہیں۔ فارسی کی ایسی بندشیں اور ایسے غیر مانوس الفاظ جو شعر کی روانی اور فصاحت کلام کے منافی ہیں۔ ابتدائی کلام میں

وہ پختہ کاری۔ وہ اثر اور وہ عمیق جذبات جو اُن کے بعد کے کلام میں ہیں نہیں پائے جاتے۔ اِن کے ایسے اشعار محض فارسی الفاظ کی لڑیاں معلوم ہوتے ہیں جن میں اُردو کی آمیزش محض اسوجہ سے ہے کہ شعر اُردو کہا جاسکے اور ادنیٰ تغیر سے وہ فارسی ہو جاتا ہے۔ گو اُن کے ابتدائی کلام کا مضحکہ بھی اُڑایا جاتا تھا جیسے کہ حکیم آغا جان عیش نے جل کر کہا کہ **قطعہ**

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے	مزا کہنے کا جب ہے اِک کہے اور دوسرا سمجھے
کلامِ میر سمجھے اور زبانِ میرزا سمجھے	مگر اِن کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ اس سے بھی اُن کے اعلیٰ درجہ کی دماغی قوت اور آیندہ کے ارتقا کا پتہ چلتا ہے۔ اُنکی اس دَور کی شاعری بھی نہایت ممتاز اور مخصوص ہے اور اُن کی اُفتادِ طبع سے معلوم ہو جاتا ہے کہ آیندہ وہ کتنی ترقی کرنے والے ہیں۔ اِن کی ابتدائی فکر میں بھی ایسی ایسی نازک خیالیاں نئی نئی تخیلیں اور پُر لطف تشبیہیں ملتی ہیں کہ اُردو شعرا میں اُوکسی کے یہاں نظر نہیں آتیں اپنے مخالفین کے اعتراضات اور مضحکہ انگیز نقالی اور اپنے مخلص احباب مثلاً مولٰنا فضل حق خیرآبادی اور مفتی صدر الدین خاں آزردہ وغیرہ کی دوستانہ صلاح اور خود اپنی انصاف پسند طبیعت کے تقاضا سے مرزا نے آخر کار یہ رنگ ترک کرکے ایک دوسری روش اختیار کی۔

دوسرے دَور میں فارسیت کا وہ غلبہ اور نازک خیالیوں کا وہ انداز نہیں جو پہلے مرزا کو مرغوب تھا۔ اسمیں زبان صاف ہوگئی ہے۔ الفاظ پر پوری قدرت ہے اور فارسی بندشوں اور محاورات میں ایک معتدبہ کمی ہے۔ مگر فارسی کے اعلیٰ خیالات ویسے ہی ہیں جو مذاقِ سلیم پر گراں نہیں گزرتے بلکہ سامع کے دل و دماغ میں ایک

پُر لطف ہیجان پیدا کر دیتے ہیں۔ اس قسم کے اشعار تھوڑی سی کاوش کے بعد جب سمجھ میں آجاتے ہیں تو مسرت کا وش غضب کی ہوتی ہے۔

مرزا کی شاعری کا تیسرا دور اُن کے کمال فن کا لُب لُباب اور ارتقائے کمال کی آخری منزل ہے۔ اس دور کے بعض اشعار جامعیت اور اختصار میں فی الحقیقت اپنا جواب نہیں رکھتے۔ اس عہد کی غزلوں میں ندرت خیال کے ساتھ لطافت زبان اور شستگی کلام عجیب لُطف دیتی ہے۔ اُن میں ایجاز کے ساتھ سادگی سلاست وروانی نازکخیالی اور جدت تخیل سب کچھ بدرجۂ احسن موجود ہے۔ اور انھیں سے غالب کو شعرائے اُردو کی صف اولین میں نہایت ممتاز جگہ ملی ہے۔

غالب کی خصوصیات
پہلی خصوصیت جدّت پسندی

ہماری رائے میں مرزا کے قصر شاعری کی مستحکم بُنیاد۔ اُن کی جدت طرازی پر قائم ہے جسمیں جدّت تخیل، جدّت طرز ادا جدّت تشبیہات، جدّت استعارات، جدّت محاکات، جدت الفاظ، غرض ہر قسم کی جدتیں شامل ہیں۔ پامال مضامین مرزا صاحب کی خاص طرز ادا سے بالکل نئے معلوم ہونے لگتے ہیں اور معمولی سے معمولی واقعات اک ایسے اسلوب سے بیان کر جاتے ہیں کہ گویا اس سے پہلے کبھی نہیں سُنے گئے تھے۔ نئے خیالات کے ادا کرنے کا طریقہ بھی نیا ہوتا ہے۔ اس جدت اسلوب سے معمولی سے معمولی خیال اور پامال سے پامال مضمون بہت مرتفع ہوجاتا ہے۔ اس جدت طرازی اور اُرجنیلٹی کی وجہ سے شعر میں کبھی کبھی معما کی سی صورت پیدا ہو جاتی ہے جس کا حل ایک خاص لُطف پیدا کرتا ہے۔ غالب اور اکثر شعرائے اُردو اور نیز بعض شعرائے فارسی میں بڑا فرق یہ ہے کہ غالب کے یہاں الفاظ خیالات کے تابع ہوتے ہیں اور اور لوگوں کے یہاں

مُعاملہ برعکس ہے جس سے اُن کے اشعار میں تصنع اور بدمزگی پیدا ہو جاتی ہے اور
اسی قسم کے کلام سے اُن کے دیوان بھرے پڑے ہیں۔ مرزا صاحب کے یہاں بخلاف
اِن کے تُک بندی اور قافیہ پیمائی نہیں بلکہ خیال آفرینی ہے۔

غالب نبود شیوۂ من قافیہ بندی ظلمے ست کہ بر کلک و ورق میکنم امشب

دوسری خصوصیت نظر فریب طرز تحریر

اسی سے متعلق اور ملتی جُلتی اُن کے کلام میں نظر فریبی اور بات
سے بات پیدا ہونا ہے۔ وہ ایک سُر چھیڑتے ہیں اور سامع کا
ذہن پورا راگ منضبط کرتا ہے۔ اسی وجہ سے مجہول الکیف سامع مرزا غالب کے شاعرانہ
ترانوں سے لُطف اندوز نہیں ہو سکتے مرزا کسی چیز کا تفصیلی ذکر نہیں کرتے۔ بلکہ
پڑھنے والے کا خیال خود اُس کے لوازم جمع کر لیتا ہے جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے
مرزا صاحب کی شاعری کا خاص طغرائے امتیاز جادۂ عام سے علیحدگی ہے جس کا
شوق بلکہ عشق اُن کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے تھا۔ وہ کسی چیز میں اپنی شرکت
عام لوگوں کے ساتھ پسند نہیں کرتے تھے تخلص بدلنے کا واقعہ جسکا ذکر اوپر ہوا
اسکا بیّن ثبوت ہے۔ اِسی طرح وہ اپنے لباس، وضع قطع، بات چیت، طرز تحریر،
غرضکہ ہر چیز میں اسی علیحدگی کا ہمیشہ خیال رکھتے تھے۔ اُن کے خطوط، اُن کے اشعار،
ہر چیز سے مترشح ہے کہ وہ عام باتوں سے سخت متنفر تھے۔

کیا آبروئے عشق جہاں عام ہو جفا ڈرتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھکر

اِن کی ابتدائی مشکل پسندی اسی علیحدگی پسندی پر مبنی معلوم ہوتی ہے اسیوجہ سے ہم اُنکی
شاعری سے عام دماغ لُطف نہیں اُٹھا سکتے انکے الفاظ میں خیالات کا اسقدر زور ہے کہ معلوم
ہوتا ہے کہ خیالات قید الفاظ کو توڑ ڈالینگے ع آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے ؎

تیسری خصوصیت ذاتی جذبات کا ادا کرنا

مرزا میں بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اُن کے اشعار اُن کے خیالات کا صحیح فوٹو ہوتے ہیں۔ وہ زندگی اور مختلف کیفیات زندگی کے ترانے گاتے ہیں۔ وہ اپنے اشعار کے ذریعہ سے اپنے دلی کیفیات اپنے کلام کے پڑھنے والے کے سامنے پیش کرتے ہیں جن میں کہیں غم والم کے نالے، کہیں اُن کی مانند عظمت کا مرقع، کہیں اُنکی حرماں نصیبی، کہیں ہجوم ناامیدی، کہیں جانکاہ مصائب کہیں سعی بیحاصل، کہیں دُنیا سے تنفر اور بیزاری، کہیں رحم خداوندی پر پورا پورا اعتماد، کہیں تعلقات دنیاوی سے دل بستگی اور اُنکی خوشی اور اُس کے آلام کا بیان ہوتا ہے۔ غرضکہ اُن کے لطیف اشعار اُن کی کیفیات قلبیہ کا جو وقتاً فوقتاً اور آناً فاناً وارد ہوتی رہتی ہیں صحیح بیرامیٹر ہیں۔

چوتھی خصوصیت فلسفیت اور حقیقت طرازی

مرزا ایک بہت بڑے فلسفی ہیں اور اُنکے اکثر اشعار حقایق فلسفہ کو نہایت آسانی اور سادگی سے ظاہر کرتے ہیں وہ رموز و حقایق تصوف سے پوری طرح واقف اور فرقہ بندی اور مذہبی تعصبات سے بالکل مبرا تھے۔ فرماتے ہیں ؎

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم   ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

اور اُن کے یہ خیال زبانی نہ تھے بلکہ وہ اُن پر پوری طرح عامل تھے۔ اُنکی زندگی مذہبی رواداری، آزادہ روی کی ایک درخشاں مثال تھی اسیطرح انکا تخیل عبادت بھی بہت بلند ہے کہتے ہیں ؎

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود   قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

جنت کے اس خیال سے کہ اسمیں نہریں جاری ہونگی اور وہی سب لطف حاصل ہونگے جو دُنیا میں ہوتے ہیں وہ متفق نہیں بلکہ اسکو اخلاق اعلی سے گرا ہوا سمجھتے ہیں کہتے ہیں ؎

ہمکو معلوم ہے جنّت کی حقیقت لیکن   دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ دوزخ میں ڈالدے کوئی لیکر بہشت کو

اُن کے نزدیک مصیبت عظمیٰ خود زندگی ہے جس سے احساس وجود پیدا ہوتا ہے اس وجہ سے کہ وہ اپنے مبدأ سے جُدا ہو جاتی ہے۔ نغمۂ زندگی کو ایک نالہ نَے سمجھنا چاہیے جو نیستان سے جُدا ہونے پر نے بے اختیارانہ کرتی رہتی ہے۔ اسی مضمون کو مرزا صاحب اس طرح ادا کرتے ہیں ؎

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

بحیثیت ایک صوفی صافی کے وہ دنیا کے شادی و غم سے بالکل متاثر نہیں ہوتے بلکہ ایک مرتفع مقام سے ترانہ سنجی کرتے ہیں۔

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ جب آنکھ کھُل گئی نہ زیاں تھا نہ سُود تھا

کسقدر خوبصورتی سے وہ اس حقیقت کو ظاہر کرتے ہیں کہ عالم ظاہر مظہر روح حیات ہے مگر خود روح حیات نہیں ہے۔ بقول برگسن کے یہی روح حیات اجسام میں جلوہ گر ہے مگر وہ خود اس عالم سے منزہ ہے۔ غالب کہتے ہیں۔

ہے غیب غیب جسکو سمجھتے ہیں ہم شہود ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

پانچویں خصوصیت جذبات نگاری

حقایق فلسفہ کے علاوہ مرزا صاحب کی شاعری جذبات سے بھی مملو ہے اُنکے یہاں جانکاہ مصائب، دلگداز تکلیفیں، ناقابل برداشت مصیبتیں جو لازمۂ زندگی ہیں نہایت مؤثر الفاظ میں بیان کیگئی ہیں گویا زندگی ایک ایسا جنازہ ہے جسکے ساتھ دور سے قضا کے قہقہوں کی آوازیں آرہی ہیں چنانچہ اسی زندگی اور غم کے لازم و ملزوم ہونے کے متعلق مرزا کہتے ہیں۔

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ بچیں کہاں کہ دل ہے — غم عشق اگر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا
غم ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج — شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

مرزا کے کلام میں بچوں کی سی ضد اور اپنے معاصر انگریزی شاعر شلی کی طرح تنک مزاجی پائی جاتی ہے۔ وہ نہیں سمجھ سکتے کہ ان کو انکے حال پر کیوں نہ چھوڑا جائے۔ اور ان کے معاملات میں کیوں دست اندازی اور مزاحمت کیجائے۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

بچہ کی بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ اُس کو تکلیف کیوں ہو۔ اسی طرح اس شعر میں

قفس میں مجھ سے رُودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

مرزا کے اشعار میں خود انھیں کے آلام و مصائب کے نقشے نظر آتے ہیں۔ انکے اشعار کو پڑھکر رنج و غم کی رفعت اور مصیبت کی عظمت معلوم ہوتی ہے اور گناہ کی ظلمت دور ہوکر اُسمیں ایک نورانیت معلوم ہونے لگتی ہے۔ مندرجۂ ذیل شعر میں انتہا درجہ کا انکسار اور عاجزی اور دلی پشیمانی اور اپنی بے حقیقتی کا اظہار کس پُر اثر اور درد انگیز طریقہ سے کیا ہے۔

قد پہ سنگِ سرِ رہ رکھتا ہوں — سخت ارزاں ہے گرانی میری

کلام میں ظرافت و شوخی

مرزا کی شاعری میں جو مایوسی اور درد کی تاریکی ہے اُسکو اُن کی طبعی ظرافت اور شوخی اکثر دُور کر دیتی ہے۔ اکثر اشعار میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ حُزن و یاس کے ابر میں ظرافت کی دُھوپ نکلی ہوئی ہے۔ اُن کی ظرافت کی لطافت اور شوخی کلام کی نزاکت کو ہم بے تکلف ایک نازک پھول کے ساتھ تشبیہ دے سکتے ہیں۔

مگر ان کی ظرافت کبھی حد اعتدال سے بڑھکر پھکڑ نہیں ہو جاتی۔ اور متین سے متین آدمی اُس سے لُطف اندوز ہو سکتے ہیں۔

اُن کے اکثر اشعار نفس شاعری کی جان اور فصاحت و بلاغت کے روح رواں ہیں۔ سادہ الفاظ کی سطح کے نیچے عمیق معنی اسطرح پنہاں ہیں جیسے دریا کے شفاف پانی کے نیچے دریا کی تہ۔ اُنکی ہر تصویر الفاظ کے پیچھے اُن کے ہر نقش خیال کی پشت پر ایسے ایسے تخیل کے وسیع مناظر نظر آتے رہتے ہیں جنکی محیط فضا حیات و ممات کے سربستہ رازوں سے معمور ہے۔

غالب ایک کامل مصوّر ہیں اور اُن کو خیالی تصویروں کے کھینچنے کا عجیب و غریب ملکہ حاصل ہے ؎

نیند اُسکی ہے دماغ اُسکا ہے راتیں اُسکی ہیں | تیری زلفیں جسکے بازو پر پریشاں ہو گئیں

مُند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالب | یار لائے مرے بالیں پہ اُسے پر کس وقت

مُند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے | خوب وقت آئے تم اس عاشق بیمار کے پاس

مرزا کو عجب قوت ایجاز حاصل تھی۔ اُن کے بعض اشعار ایجاز و اختصار اور بات سے بات پیدا کرنے کے بےمثل نمونے ہیں۔ مثلاً

آتا ہے داغ حسرتِ دل کا شمار یاد | مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

شعر نہایت پر تاثیر ہے۔ ظاہر میں تو ارتکاب شدہ گناہوں کے حساب سے بچنا چاہتا ہے مگر درپردہ کہتا ہے کہ بہت سے گناہ ایسے بھی ہیں جن کے نہ کرنے سے دل میں حسرتوں کے داغ پڑ گئے۔ یہ ایک نڈر اور صاف گو گنہ گار کی تصویر ہے جو خدا سے بیدھڑک کہتا ہے کہ کردہ گناہ میرے کم ہیں مگر ناکردہ گناہوں کی حسرت زیادہ

اور اسی کی میں تجھ سے داد چاہتا ہوں۔

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد　　یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا[۱] ہے

غالب کا مقابلہ اپنے معاصرین شعرا سے

علو خیال، فلسفۂ حیات، اور ذہانت وطباعی میں غالب اپنے معاصرین ذوق ومومن سے بڑھکر ہیں۔ مگر روزمرہ اور سادگی بیان اور محاورہ بندی کے اعتبار سے ذوق اُن سے بڑھے ہوے ہیں گو کہ مومن اسمیں بھی اُن سے کم ہیں۔ یورپ کے شاعروں میں جو ان کے ہمعصر یا قریب العہد تھے اُن کے کلام کا توازن شعرائے ذیل کے کلام سے کیا جاسکتا ہے۔

(۱)۔ رابرٹ براوننگ سے جو انگلستان کا اسی عہد کا ایک فلسفی شاعر تھا۔ پروفیسر سنٹیسبری براوننگ کی نسبت لکھتے ہیں کہ اُس کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ روح کا تجزیہ کرتا ہے۔ مرزا غالب تجزیہ اس قدر نہیں کرتے جتنا کہ رموز روحانی کے عمق کو دریافت کرتے ہیں۔ حقایق کی جھلکیاں وہ دیکھتے ہیں اُن کا کلام مثل مولنا روم وغیرہ کے سراپا اسرار تصوف نہیں ہے اور نہ من اولہ الی آخرہ کوئی فلسفہ ہے مگر حقائق اور رموز کا ان کے کلام میں جابجا پر تو موجود ہے۔ ان کو صوفی براوننگ کہنا بجا ہے۔ ہرچند کہ براوننگ کے کھرّے پن اور اکھڑپن سے اِن کا کلام پاک ہے۔

(۲) مضامین حزن ویاس میں اُن کا مقابلہ جرمنی کے شاعر "ہین" سے

---

[۱] مرزا کے اس خیال کی تائید کہ اکثر گناہ ایسے تھے جن سے میں بچا لہذا اُن کی حسرت کی بھی داد دی جائے یعنی اسکا ثمرہ نیک ملے۔ اس آیت وافی الہدایت سے ہوتی ہے۔ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ وَنَہَی النَّفْسَ عَنِ الْھَوٰی۔ فَاِنَّ الْجَنَّۃَ ہِیَ الْمَاْوٰی ۵ سورۃ النازعات

خوب ہو سکتا ہے۔

(۳) مگر فی الحقیقت اگر کوئی فلسفی شاعر ان کا مدمقابل یورپ میں گزرا ہے تو وہ جرمنی کا مشہور و معروف "گیٹے" ہے۔ غالب میں ان تین چیزوں کا اجتماع ہو گیا ہے یعنی فلسفی کی عقل دراک۔ صوفی کی نگاہ دوربین۔ چابکدست مصور کا نازک ہاتھ۔ اُن کی صنعت پُرکاری اور پُرکاری صنعت ہے۔ اور حُسن حق ہے اور حق حسن ہے وہ ایک صوفی صاف دل تھے اور ان کا یہ قول بالکل صحیح ہے۔

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں　　غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

اُن کا تصوف کوئی شغل دلچسپی نہیں اور نہ اُن کی شاعری محض خیالی شاعری ہے بلکہ وہ واقعات اور واردات سے لبریز ہے اور اسی وجہ سے اُسکا شمار دنیا کی بہترین شاعری میں کیا جاسکتا ہے۔

غالب کے شاگرد غالب کے بکثرت شاگرد تھے جن میں اصحاب ذیل کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

نواب ضیاء الدین خاں نیر درخشاں تخلص کہ اُن کے عزیز بھی تھے۔ میر مہدی مجروح۔ مرزا قربان علی بیگ سالک۔ خواجہ الطاف حسین حالی مصنف یادگار غالب۔ منشی ہرگوپال تفتہ۔ نواب علاء الدین خاں علوی۔ ذکی۔ عزیز۔ مشاق و جوہر وغیرہ۔ ان میں سے بعض کے مختصر حالات آگے درج ہیں[1]۔

---

[1] مصنف کتاب بابو رگھوپتی سہائے صاحب اور مسٹر صلاح الدین خدابخش اور آنریبل شیخ عبدالقادر صاحب کا دلی شکریہ ادا کرتے ہیں کہ ان حضرات کے بیش بہا مضامین سے جو غالب کی شاعری پر نکلے اُنھوں نے بہت فائدہ اُٹھایا۔

میر مہدی مجروح متوفی سنہ ۱۹۰۲ء

میر مہدی مجروح خلف میر حسین نگار مرزا غالب کے محبوب اور سب سے عزیز شاگرد دلّی کے رہنے والے تھے۔ غدر کے ہنگامہ میں وطن چھوڑ کر پانی پت چلے گئے اور وہیں سکونت اختیار کی کچھ عرصہ بعد جب کہ غدر کا طوفان فرو ہوا اور دلی میں گونہ امن وامان کی صورت پیدا ہوئی تو یہ پھر دلّی آ گئے۔ اور اپنے قدیم مشغلۂ شعر و سخن سے دلچسپی لینے اور مشاعروں میں شریک ہونے لگے۔ بعد چند روز کے بتلاش معاش الور گئے جہاں مہاراجہ شیو دہان سنگھ والی ریاست نے انکی قدردانی کی۔ آخر عمر میں نواب صاحب رامپور کی قدردانی اور عنایت و مہربانی سے اسی ریاست میں چلے آئے اور بفراغت زندگی بسر کی سنہ ۱۳۱۶ھ میں اپنا ایک دیوان "مظہر معانی" کے نام سے چھپوایا۔ میر مجروح کی زبان نہایت صاف و سادہ اور شیریں ہے چھوٹی بحروں میں اُن کا کمال بوجہ احسن معلوم ہوتا ہے۔ خیالات میں ندرت اور مضامین میں جدّت ان کے کلام میں نہیں ہے۔ مگر طرز ادا اُستادانہ ہے اور اشعار عیوب شاعری سے پاک ہیں۔ مولانا حالی ان کے بڑے معترف تھے۔ میر مجروح اُن لوگوں میں ہیں جنکو اُردو شاعری کی آخری یادگار سمجھنا چاہیے۔ اُنھوں نے اُردو شاعری کی روایات قدیمہ کو حتی الامکان خوب نباہا۔ مرزا غالب کے اکثر دلچسپ خط عود ہندی اور اُردوئے معلی میں ان کے نام موجود ہیں۔

سالک متوفی سنہ ۱۸۹۳ء

مرزا قربان علی بیگ سالک نواب مرزا عالم بیگ کے بیٹے تھے۔ حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ مگر بعض کے نزدیک مسقط الراس دلّی ہے۔ غرضکہ دلّی میں نشوونما پائی پہلے قربان تخلص کرتے اور مومن خاں سے اصلاح لیتے تھے۔ مگر جب اُن کا انتقال ہو گیا تو یہ غالب کے شاگرد ہوئے اور سالک تخلص اختیار کیا

غدر کے زمانہ میں یہ دلّی چھوڑ کر الور چلے گئے جہاں کچھ عرصے تک وکالت کرتے رہے
اس کے بعد حیدرآباد گئے اور وہاں محکمۂ تعلیمات میں سررشتہ دار ہوئے حیدرآباد
میں مخزن الفوائد کے نام سے ایک اردو رسالہ زیر سرپرستی نواب عماد الملک بہادر نکلتا تھا
سالک کچھ عرصے تک اُسکے مدیر رہے ۱۲۹۱ھ میں حیدرآباد ہی میں انتقال کیا۔
"ہنجار سالک" دیوان کا نام ہے۔ یہ بھی غالب کے مشہور شاگردوں میں سے تھے۔
کلام خیال اور زبان دونوں کے اعتبار سے اچھا ہے مگر جدت سے خالی ہے۔
اُن کا شہر آشوب دہلی کی تباہی پر اور اپنے اُستاد غالب کا مرثیہ بہت پرزور اور درد انگیز ہے

زکی متوفی ۱۹۰۲ء نواب سید محمد زکریا خاں رضوی متخلص بہ زکی ایک عالیخاندان
شخص تھے۔ دلی میں ۱۸۳۹ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد نواب سید محمد خاں اور
نانا نواب اعظم الدولہ میر محمد خاں معظم جنگ متخلص بہ سرور ہیں۔ یہ دونوں بھی مشہور شاعر
اور صاحب دیوان ہیں اور سرور کا ایک تذکرہ بھی ریختہ گو شعرا کا ہے۔ زکی کی تعلیم
دلّی میں ہوئی اور اُن کو زبان فارسی و عربی پر عبور حاصل تھا۔ اس کے علاوہ فن
طب حدیث و فقہ اور تصوف اور نجوم وغیرہ میں دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ موسیقی
اور فن خوشنویسی سے بھی باخبر تھے۔ مولنا صہبائی اور پنڈت رام کشور سنبھل کے علوم
درسیہ میں شاگرد تھے۔ فن شعر میں مرزا غالب کو کلام دکھلاتے تھے جن سے ان سے کچھ
قرابت بھی تھی۔ مرزا ان کا بہت خیال کرتے اور بہت محبت سے پیش آتے تھے۔
مرزا کے ہاتھ کی ایک سند کا عکس ان کے دیوان میں دیا ہوا ہے۔ زکی کو شعر و سخن
سے بہت شوق تھا اور اکثر مشاعروں میں شریک ہوتے رہتے تھے۔ جہاں کہیں جاتے
تھے شعر و سخن کی محفلیں گرماتے تھے۔ غالب کے شاگرد رشید اور اُن کے طرز کے متبع تھے۔

نواب سید محمد زکریا خان ذکی دہلوی

میرزا حاتم علی مہر

خیال آفرینی اور جدت تخئیل ان کے کلام کا جوہر ہے۔ البتہ درد و اثر اسقدر کلام
میں نہیں ہے مثل ظہیر و انور و سالک وغیرہ کے ان کو بھی تلاش معاش میں وطن
سے نکلنا پڑا۔ میرٹھ۔ گورکھپور اِلٰہ آباد وغیرہ میں ملازمت سرکاری کر کے ۱۹۱۱ء
میں بدایون میں بحیثیت ڈپٹی انسپکٹر مدارس پنشن پائی اور وہیں ۱۹۲۳ء میں انتقال کیا
اُن کا دیوان اُن کی زندگی میں چھپ گیا تھا اپنے زمانہ میں طرز قدیم کے استاد مانے جاتے
تھے۔ بہت سے شاگرد چھوڑے جن میں مولوی سید احمد مؤلف فرہنگ آصفیہ اور پنڈت
جواہر ناتھ کول ساقی تخلص زیادہ مشہور تھے۔

رخشاں متوفی ۱۸۵۸ء

نواب ضیاء الدین احمد خاں متخلص بہ رخشاں و نیّر نواب احمد بخش خاں
رئیس لوہارو کے چھوٹے بیٹے تھے۔ نواب صاحب لوہارو نے اپنی جاگیر اپنے چھوٹے
بیٹوں کے نام منتقل کر دی تھی جسکا انتظام نواب امین الدین احمد خاں کرتے تھے۔ نیّر
اور غالب سے رشتہ داری بھی تھی اور مرزا اُن کو اپنا خلیفہ کہا کرتے تھے۔ نیّر اپنے
زمانہ کے اہل علم اور اہل ثروت میں ایک خاص درجہ امتیاز رکھتے تھے اور شعر و سخن کے
بڑے ماہر اور پرکھنے والے سمجھے جاتے تھے۔ تاریخ سے بھی ان کو بہت دلچسپی تھی۔
چنانچہ الیٹ صاحب نے اپنی مشہور تاریخ ہندوستان کی تیاری میں انکی جامعیت
اور معلومات سے بہت کچھ مدد لی۔

نواب شہاب الدین احمد خاں متخلص بہ ثاقب نیّر کے بڑے بیٹے غالب کی
بیوی کے بھتیجے اور غالب کے شاگرد بھی تھے۔ شعر اُردو و فارسی دونوں میں کہتے
تھے ۱۸۶۹ء میں عین عالم شباب میں بعمر اُنتیس سال انتقال کیا۔

دوسرے بیٹے نواب سعید الدین احمد خاں متخلص بہ طالب، جن کی ولادت

۱۸۵۲ء میں ہوئی، اپنے بڑے بھائی ثاقب اور اُن کے مرنے کے بعد میر مجروح و سالک و حالی سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ کچھ عرصے تک دلّی کے آنریری مجسٹریٹ رہے پھر ۱۸۷۹ء میں پنجاب کے اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ہوگئے۔ ۱۸۸۵ء میں اپنے والد کے انتقال کے بعد اپنے عہدہ سے کنارہ کش ہوگئے تھے۔

مرزا شجاع الدین احمد خاں متخلص بہ تاباں نواب شہاب الدین احمد خاں ثاقب کے بیٹے شاداں اور داغ کے شاگرد ہیں۔ اُن کے دو دیوان ہیں۔ ان کی شادی مرزا باقر علی خاں کامل کی لڑکی سے ہوئی اور یہ وہی مرزا باقر علیخاں ہیں جنکو غالب نے پالا تھا۔ تاباں اب حضور نظام کے پنشن خوار ہیں۔

نواب مرزا سراج الدین احمد خاں متخلص بہ سائل خلف نواب شہاب الدین احمد خاں داغ کے ایک سربرآوردہ شاگرد اور ایک مشہور و معروف شاعر ہیں۔

آزردہ ۱۲۰۴ھ
لغایت ۱۲۸۵ھ

مُفتی صدرالدین خاں آزردہ خلف الرشید مولوی لُطف اللہ کشمیری اپنے زمانہ کے جید فاضل اور متبحر عالم تھے۔ اُس زمانہ کی علمی اور ادبی سوسائٹی میں ان سے بڑھکر اور کوئی ممتاز شخص نہ تھا۔ شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی اور مولٰنا فضل امام سے فیض تربیت حاصل کیا تھا۔ عہدۂ صدر الصدور پر فائز تھے جو اُس زمانہ میں ہندوستانیوں کے واسطے سب سے بڑا عہدہ سمجھا جاتا تھا عربی، فارسی، اُردو، تینوں زبانوں میں اُن کو دستگاہ کامل حاصل تھی۔ ان کے علم و فضل کی اسقدر شہرت تھی کہ نواب یوسف علیخاں والی رامپور اور نواب صدیق حسن خان صاحب مرحوم رئیس بھوپال نے اُن کے سامنے زانوے شاگردی تہ کیا تھا سر سید مرحوم بھی اُن کے شاگرد تھے اور ہمیشہ ان کا ذکر بڑے ادب و احترام سے کرتے تھے۔ اُن کو
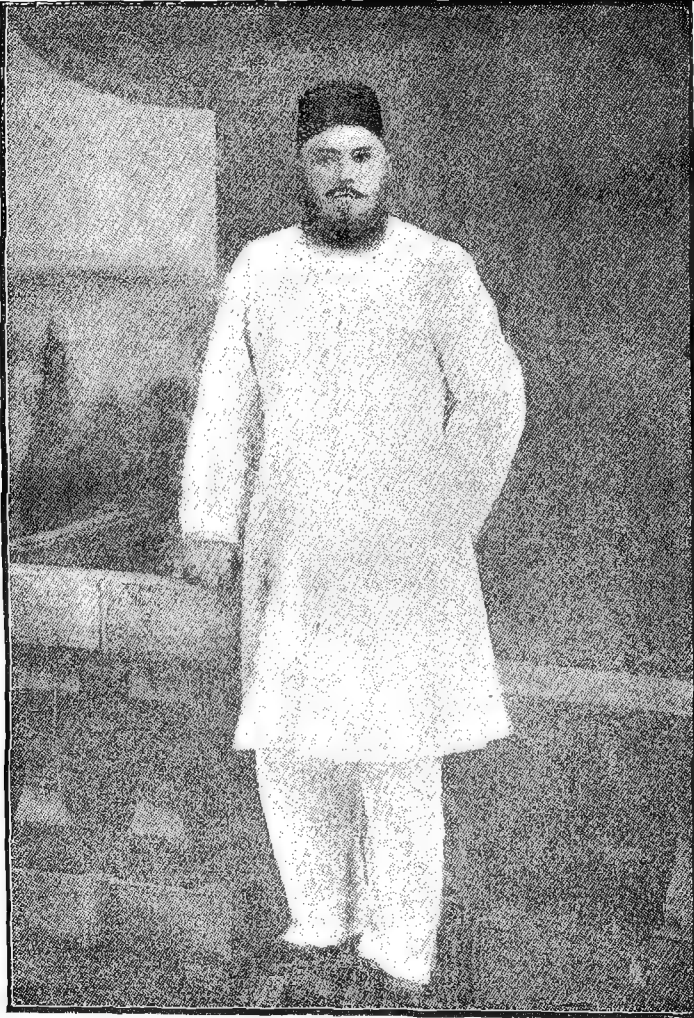
مولانا سید علی حیدر صاحب طباطبائی شارح دیوان غالب

نواب مرزا سعیدالدین احمد خان طالب دہلوی

درس و تدریس کا اسقدر شوق تھا کہ بعد انجام دینے اپنے فرائض منصبی کے اپنے اکثر شاگردوں کو سبق دیتے تھے۔ غالب مومن ذوق شیفتہ وغیرہ اُن کے احباب میں سے تھے۔ غدر کے زمانہ میں یہ بھی مصیبت میں مبتلا ہوئے اور نصف جاگیر ضبط ہو گئی آزردہ تینوں زبانوں یعنی عربی، فارسی، اُردو میں شعر کہتے تھے۔ اُردو میں اصلاحِ سخن پہلے شاہ نصیر سے اور پھر مجرم اکبرآبادی اور آخر میں میر ممنون سے لیتے تھے۔ ان کے اشعار نہایت صاف سلیس اور پر اثر ہوتے ہیں مگر کبھی دیوان کی صورت میں مرتب نہیں کیے گئے۔ اُن کا ایک تذکرہ شعرائے اُردو کا بھی ہے مگر اب نہیں ملتا۔ اُن کی شہرت بحیثیت ایک شاعر یا تذکرہ نویس کے اسقدر نہیں ہے جتنی کہ اُن کے علم و فضل کی ہے
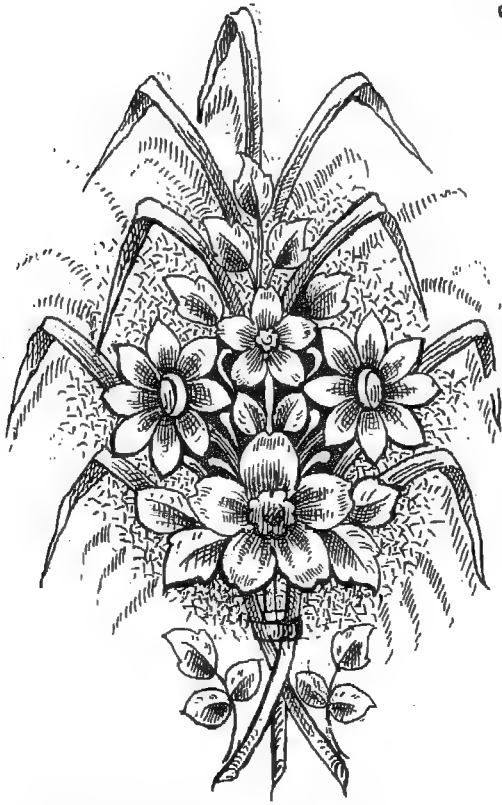
باب ۱۳

دربار رام پور و حیدر آباد

امیر و داغ کا زمانہ

بعد انتزاع سلطنت اودھ اور غدر ۵۷ء جبکہ واجد علی شاہ کلکتہ اور ابوالظفر بہادر شاہ قید کرکے رنگون بھیجے گئے لکھنؤ اور دلّی جو ایک عرصہ تک اردو شاعری کے مسکن و مامن رہ چکے تھے ادبی لحاظ سے بالکل ویران ہو گئے اور یہاں کے شاعر اب ہندستانی ریاستوں کی طرف نہایت اشتیاق اور حسرت کی نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

مٹیا برج کلکتہ میں شعرا کا مجمع

وہ شعرائے لکھنؤ جو لکھنؤ میں حضرت سلطان عالم واجد علی شاہ کے دامن دولت سے وابستہ تھے اُن میں سے بعض تو اپنے آقائے نامدار کے ساتھ ہی اور بعض غدر کے بعد جب کسی قدر تسلط اور امن و امان ہو گیا تو راہی کلکتہ ہوئے۔ چنانچہ بادشاہ نے جن کو مناسب نام و خطاب دینے کا خاص ملکہ تھا اُن سات بڑے شاعروں کو جو مٹیا برج میں اُن کے ساتھ تھے سبعہ سیّارہ کا خطاب دیا تھا۔ اُن میں سے ہر ایک بڑے بڑے معزز شاہی خطاب سے بھی سرفراز تھا۔ ان لوگوں کی وجہ سے مٹیا برج کی صحبتوں میں بڑی گرماگرمی تھی مشاعرے آئے دِن ہوا کرتے تھے اور مٹیا برج سواد کلکتہ نہیں بلکہ لکھنؤ کا ایک محلّہ معلوم ہوتا تھا۔ اُن سبعہ سیارہ میں جن کا ذکر اوپر ہوا بعض شعرا کے نام یہ ہیں :-

فتح الدولہ بخشی الملک مرزا محمد رضا برق۔ مہتاب الدولہ کوکب الملک ستارۂ جنگ متخلص
بہ درخشاں۔ اٰلک الدولہ صولت گلشن الدولہ حاجی مرزا علی متخلص بہ بہار شاگرد رشک۔
عیش مظفر علی ہنر۔ جو غزل میں صبا کے اور مرثیہ میں مرزا دبیر کے شاگرد تھے اور مخدرۂ عظمےٰ
نواب بادشاہ محل متخلص بعالم اور نواب محبوب عالم صاحبہ کے کہ یہ دونوں بیویاں
واجد علی شاہ کی تھیں اُستاد تھے۔ اسی پُر لطف مجمع میں داغ اور نظم طبا طبائی بھی
پہونچ گئے تھے۔ اِن صحبتوں اور مشاعروں سے زبان اور شاعری اُردو کا بنگال
میں بہت چرچا ہو گیا تھا۔ وہاں کے مقامی شعرا میں اُس زمانہ میں مولوی عبد الغفور
نسّاخ جو اُسوقت راج شاہی کے ڈپٹی کلکٹر تھے بہت ممتاز اور معزز سمجھے جاتے تھے۔
نسّاخ ایک ذی کمال سخن گو سخن سنج اور اچھے نقاد سخن تھے چنانچہ تذکرۂ سخن شعرا،
دفتر بے مثال، قطعہ منتخب، چشمۂ فیض، شاہد عشرت، مرغوب دل، اشعار نسّاخ،
گنج تواریخ، قند پارسی، ارمغاں، باغ فکر وغیرہ اُن سے یادگار ہیں۔ دبیر و
انیس کے کلام پر ایک تنقیدی نظر ڈالی ہے جو اکثر مقامات پر صحیح تو نہیں مگر دلچسپ
اور مفید ضرور ہے۔ اُن کے مشہور شاگردوں میں انسخ تھے۔

شعرائے دہلی اپنا وطن چھوڑ کر نکلتے ہیں

پہلا سفر شعرائے دہلی کا اپنے وطن مالوف سے جسکا اشارہ صفحات گذشتہ میں کئی بار ہو چکا ہے چند اسباب پر مبنی ہے
اور وہ یہ ہیں یعنی افغانوں اور مرہٹوں کے حملے اور دہلی کی تباہی اُن کے ہاتھ سے
شاہان دہلی کی عظمت قدیم کا جاتا رہنا۔ رعایا کی جان و مال کا عدم تحفظ۔ تلاش
معاش کی دقتیں شعرا کی بیقدری اور بیکاری پس یہی وجوہ تھیں جنکی بنا پر شعرا اپنا
وطن چھوڑنے اور دوسرے مقامات میں تلاش روزگار کے لئے نکل جانے پر مجبور ہوئے

چنانچہ فرخ آباد۔فیض آباد۔عظیم آباد۔مرشد آباد اور حیدر آباد دکن نے دہلی کے اِن شوریدہ بختوں کو اپنی آغوشِ محبت میں بے تکلف جگہ دی۔فرخ آباد اور فیض آباد دہلی سے بہ نسبت دوسرے مقامات کے زیادہ قریب تھے۔مگر چونکہ فرخ آباد ایک چھوٹا مقام تھا اور رُوسا وہاں کم تھے لہذا شعراے دہلی نے پہلے فیض آباد کا اور جب فیض آباد بدل کر لکھنؤ دارالسلطنت قرار پایا تو پھر لکھنؤ کا رُخ کیا۔لکھنؤ کے انتخاب کے خاص اسباب آگے چل کر ہم وضاحت سے بیان کرینگے۔

فرخ آباد فرخ آباد میں نواب مہربان خاں رند جو نواب احمد خاں بنگش کے ایک معزز رکن دربار تھے۔خود بہت بڑے شاعر اور موسیقی داں تھے شعر و سخن میں اُنھوں نے میر سوز سے اور جب مرزا سودا دلی سے فرخ آباد آئے تھے تو اُن سے بھی اصلاح لی تھی۔سودا نے انکی تعریف میں کچھ قصیدے بھی کہے ہیں۔کچھ دنوں بعد جب نواب موصوف کا خاندان برسرِ اقتدار نہ رہا تو شعر و شاعری کا چرچا بھی وہاں کم ہوگیا۔

عظیم آباد مہاراجہ شتاب رائے جو اُس زمانہ میں بنگال کے حاکم اعلیٰ تھے۔شاعروں کے قدرداں اور خود بھی شاعر یکتا تھے۔اُن کے بیٹے جو راجہ تخلص کرتے تھے میر ضیاءالدین ضیا ہمعصر سودا کے شاگرد تھے کہ وہ لکھنؤ کے بعد عظیم آباد چلے گئے تھے اسی طرح اشرف علیخاں فغاں بھی مہاراجہ موصوف کے دربار میں پہونچ گئے تھے اور اُنکی مہاراجہ بہت قدر کرتے تھے۔میر باقر حزیں شاگرد مرزا مظہر جان جاناں نواب سعادت جنگ رئیس عظیم آباد کے دامن دولت سے وابستہ تھے اور وہیں انتقال کیا۔اس سے معلوم ہوا کہ بہار میں شعراے دہلی کی بڑی قدر تھی اور شعر و سخن کا چرچا یہاں خوب تھا۔

مرشد آباد — نوابان مرشد آباد نے بھی اسی طرح شعرائے دہلی کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور ان کی قدردانی اور ان کے ساتھ بڑی مہربانی کی۔ میر سوز اور میر قدرت اللہ قدرت معاصر میر و سودا مرشد آباد گئے اور آخر الذکر وہیں ۱۲۰۵ھ میں پیوند خاک ہوئے۔ مرزا ظہور علی خلیق، نواب نوازش محمد خاں شہاب جنگ کے بلانے سے بعہد محمد شاہ بادشاہ دہلی مرشد آباد آئے تھے یہ اُس زمانہ کے ایک مشہور مرثیہ گو اور مرثیہ خواں تھے۔

ٹانڈہ — ٹانڈہ جو آنولہ ضلع بریلی اور رامپور کے قریب واقع ہے نواب محمد یار خاں متخلص بہ امیر کا قیام گاہ تھا۔ نواب صاحب نواب فیض اللہ خاں والی رامپور کے حقیقی چھوٹے بھائی تھے اور خود بھی شاعر اور شعرا نواز تھے۔ اُنھوں نے پہلے میر سوز اور سودا کو بلوایا مگر جب وہ نہیں آئے تو قائم چاندپوری کو جو خواجہ میر درد و سودا کے شاگرد تھے طلب کیا اور ان کو وہ سو روپیہ ماہوار دیتے تھے اور انھیں کے شاگرد بھی تھے مصحفی۔ فدوی لاہوری، میر محمد نعیم پروانہ اور عشرت وغیرہ بھی اس دربار کے زلہ خوار رہ چکے ہیں۔ نواب صاحب کا انتقال بمقام رامپور ۱۱۸۸ھ میں ہوا۔

حیدرآباد — پہلی مرتبہ شعرا اُس مُلک کی جانب کم متوجہ ہوئے۔ اس وجہ سے کہ دور و دراز کا سفر اور راستہ مرہٹوں اور پنڈاریوں کی غارتگری کی وجہ سے پُرخطر تھا۔ مگر اس پر بھی کچھ باہمت لوگ پہونچ ہی گئے۔ چنانچہ خواجہ احسن اللہ بیان شاگرد مظہر آصف جاہ ثانی کے عہد میں حیدرآباد پہونچے اور وہیں ۱۲۱۳ھ میں رحلت کی۔ اُن کے ایک شاگرد رائے گلاب چند ہمدم نے "اُستاد از جہاں رفت" تاریخ کہی۔ شاہ نصیر بھی متعدد بار حیدرآباد گئے تھے۔

فیض آباد و لکھنؤ

انتخاب فیض آباد کے وجوہ :-

(۱) دلی سے فیض آباد بہ نسبت دیگر مقامات مذکورہ کے قریب تر تھا۔

(۲) شعرا کی قدر وہاں بہ نسبت دیگر مقامات کے زیادہ ہوتی تھی۔

(۳) امۃ الزہرا بیگم معروف بہ بہو بیگم صاحبہ شجاع الدولہ کی بیوی اور آصف الدولہ کی ماں محمد شاہ بادشاہ دہلی کی بہت لاڈلی لے پالک بیٹی تھیں۔ ان کا وطن اصلی دہلی تھا اس وجہ سے ان کو اپنے اہل وطن یعنی دلی والوں سے کمال محبت اور ہمدردی تھی۔ اور اُن کے ساتھ علیٰ قدر مراتب بڑی شفقت اور محبت سے پیش آتی تھیں۔

(۴) نواب آصف الدولہ بہادر کو دہلی کے رئیس اعظم خانخاناں کی بیٹی منسوب تھیں اسوجہ سے لکھنؤ کو دہلی کے ساتھ ایک دوسرا پیوند محبت نصیب ہو گیا تھا۔ کچھ شعرا پر موقوف نہیں، دہلی کے تجار، ارباب حرفہ و پیشہ، ارباب نشاط، غرضکہ ہر جماعت اور پیشہ کے لوگ فیض آباد میں بکثرت تھے۔ مشہور تو یوں ہے کہ بہو بیگم صاحبہ کی داد و دہش کا شہرہ سن کر آدھی دہلی ادھر کھینچ کر آ گئی تھی۔ برخلاف اسکے ریاستہائے نظام و ٹیپو سلطان اور کرناٹک اور مرشد آباد دلی سے بہت دور تھے۔ پس کوئی تعجب نہیں کہ فیض آباد میں اتنا مجمع ہو گیا ہو۔ پھر جب نواب آصف الدولہ نے لکھنؤ کا رُخ کیا اور اس کو اپنا مستقل دار الحکومت بنا لیا تو یہ ساری محفل وہاں سے اُٹھکر لکھنؤ چلی آئی۔ چنانچہ اُسی زمانہ میں یا اُس کے قریب قریب یہ لوگ فیض آباد اور لکھنؤ پہونچ گئے تھے یعنی مرزا سودا، میر تقی، میر سوز، مرزا محمد تقی خاں ترقی شاگرد میر سوز، طالب علیخاں عیشی شاگرد قتیل، جعفر علی حسرت، بقاء اللہ خاں بقا، میر حسن، میر ولی اللہ محب شاگرد سودا۔ میر حیدر علی حیران شاگرد سرب سنگھ دیوانہ، میر ضاحک

میرزا فاخر مکین، میر غلام حسین برقستہ شاگرد میر ضیاء، فغاں، قائم، مصحفی، انشا، جرأت، رنگین، قتیل، قاضی محمد صادق خان اختر (جو ہوگلی کے رہنے والے تھے) ان کے علاوہ دیگر شعرا بھی مختلف اوقات میں دہلی سے لکھنؤ آتے اور لکھنؤ کی صحبت شعر و سخن کو گرماتے رہے نیز مرزا جواں بخت ولیعہد شاہ عالم جو تھوڑے دنوں لکھنؤ رکھر بنارس چلے گئے اور مرزا سلیماں شکوہ، مرزا جواں بخت کے چھوٹے بھائی جو بعد کو آئے اور بڑے تزک و احتشام سے لکھنؤ میں رہتے تھے انکی وجہ سے بھی شعر و شاعری کو بہت فروغ ہوا بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ گلستان لکھنؤ عنادل خوش الحان سخن کے دلکش ترانوں اور پُر لطف نواسنجیوں سے معمور اور مست ہو رہا ہے۔

شعرائے دہلی و لکھنؤ کا دوسرے مقامات پر منتشر ہو جانا

طرز لکھنؤ کو نقصان پہونچانے والی پہلی ضرب انتزاع سلطنت اودھ کو سمجھنا چاہیے جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ واجد علی شاہ کلکتہ بھیجدیے گئے۔ اسی کے ساتھ دوسری ضرب کاری جسنے ہماری اردو شاعری کو سخت نقصان پہونچایا۔ غدر ۵۷ھ اور دہلی اور لکھنؤ کی تباہی و بربادی کی صورت میں ظاہر ہوئی اسوجہ سے کہ یہی دونوں شہر بغاوت اور نیز انتقام بغاوت دونوں چیزوں کے بڑے مرکز تھے۔ بہادر شاہ کو مجرم ٹھہرا کر اور قید کر کے ہندوستان سے باہر بھیج دیا قلعۂ معلّی کے رہنے والے جو ابتک شعرائے دہلی کا ملجا و ماوا بنا ہوا تھا ادھر اُدھر تتر بتر ہو گئے۔ شعر و سخن کا کیا خاک خیال آتا جب جان و مال کے ساتھ عزت و آبرو بھی خطرہ میں پڑ گئی تھی۔ انھیں اسباب سے اور اسی حالت میں لکھنؤ اور دہلی کے شاعر اپنا وطن چھوڑ چھوڑ کر نکل کھڑے ہوئے۔ اکثروں نے رامپور کا رُخ کیا کیونکہ وہ دہلی اور لکھنؤ سے قریب تھا۔ پھر وہانکے والی ریاست بھی اہل سخن کے بڑے قدردان اور مربّی تھے۔

کچھ لوگ حیدرآباد پہونچے۔ کچھ اطراف وجوانب کی ہندوستانی ریاستوں مثلاً الور جے پور۔ بھرت پور۔ پٹیالہ۔ کپورتھلہ وغیرہ میں پناہ گزیں ہوے۔ اسلامی ریاستوں یعنی ٹونک۔ بھوپال۔ منگرول (کاٹھیاوار) مالیرکوٹلہ۔ اور بھاولپور نے بھی اکثر خانماں برباد شاعروں کو اپنی طرف کھینچا۔ چنانچہ کچھ تو یہاں کے درباروں میں نوکر ہو گئے۔ کچھ ان ریاستوں میں رہکر وہاں کے والیان ملک کی فیاضیوں سے بہرہ مند ہونے لگے مختصر یہ کہ رامپور اور حیدرآباد ہی ایسے دو بڑے دربار تھے جنھوں نے ان خستہ اور دل شکستہ شاعروں کی بڑی قدر کی۔ لہذا ان دو مقامات کے شعرا کا کچھ حال ہم اسی باب میں آگے کسی قدر تفصیل سے لکھیں گے۔ الور نے بھی جہاں کے حکمراں مہاراجہ شیودھان سنگھ مشہور قدردان سخن تھے۔ ظہیر۔ تصویر۔ تشنہ۔ شاگردان ذوق۔ اور میر مجروح اور سالک شاگردان غالب کی بڑی قدر کی۔ مہاراجہ موصوف نے مرزا رجب علی بیگ سرور مصنف فسانۂ عجائب کو بھی اپنے یہاں بلایا تھا۔ اسیطرح ظہیر اور اُن کے چھوٹے بھائی انور جے پور چلے گئے اور آخر الذکر کا انتقال بھی وہیں ہوا۔ ارشد گورگانی مالیرکوٹلہ اور بھاولپور میں رہے۔ ٹونک منگرول اور بھوپال کا علیحدہ علیحدہ ذکر آتا ہے۔

ٹونک والی ٹونک نواب محمد ابراہیم علی خاں ۱۸۴۸ء میں پیدا ہوے اور اپنے پدر بزرگوار نواب محمد علی خاں کی معزولی کے بعد ۱۸۶۷ء میں مسند آرائے حکومت ہوے۔ یہ شاعر ہیں اور خلیل تخلص فرماتے ہیں۔ پہلے بسمل خیرآبادی شاگرد امیر مینائی کے شاگرد تھے۔ اُن کے انتقال کے بعد اُن کے چھوٹے بھائی مضطر خیرآبادی سے مشورۂ سخن کرنے لگے۔ اُن کے دربار میں اور بھی بہت سے شاعر تھے جن میں ظہیر اور

نواب سلیمان خاں متخلص بہ آسد زیادہ مشہور ہیں آسد میر مظفر علی اسیر کے شاگرد اور صاحب دیوان ہیں۔ نواب صاحب موصوف نے ان کو خاص طور پر ٹونک طلب کیا تھا۔ ان کے اکثر شاگرد وہاں موجود ہیں مثلاً اصغر علیخاں آبرو حبیب اللہ ضبط۔ عبدالرحیم خاں شرف۔ خواجہ سید کرامت علی خلش داغ کے شاگرد تھے انھوں نے اپنے بعد ایک غیر مطبوع دیوان اور بہت سے شاگرد چھوڑے اور ۱۹۲۰ء عیسوی میں انتقال کیا۔ نواب صاحب موصوف کے صاحبزادے بھی شاعر ہیں اور اپنے پدر بزرگوار کے قدم بقدم چلتے ہیں۔

| منگرول | کاٹھیاوار میں ایک چھوٹی سی اسلامی ریاست ہے اس دور و دراز مقام میں بھی اردو شاعری کا خوب چرچا ہوا جسکی وجہ والی ریاست نواب حسین میاں بہادر کی توجہ اور قدر دانی کہی جا سکتی ہے۔ ان بزرگوار نے لکھنؤ اور دلی کے اُسوقت کے اکثر نامور شاعروں کو اپنی ریاست میں یکے بعد دیگرے طلب کیا تھا چنانچہ داغ تسلیم۔ جلال اور شمشاد جو ناسخ کے مشہور شاگرد اور لکھنؤ میں اُستاد مانے جاتے تھے اس قدر دان سخن کی فیاضیوں سے وقتاً فوقتاً بہرہ یاب ہوتے رہے۔ مقام کی دوری اور آب و ہوا کی ناسازگاری کیوجہ سے ان لوگوں نے وہاں قیام تو زیادہ نہیں کیا مگر اکثر ان میں کے ریاست سے ماہانہ تنخواہ پاتے رہے۔ جو اُن کو اُنکے مکان پر برابر بھیجدی جاتی تھی۔

| بھوپال | فرمانروائے ریاست[1] ہز ہائینس نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ بالقابہا اپنی ریاست کیا بلکہ تمام ہندوستان کے تعلیمی معاملات میں بیحد دلچسپی لیتی ہیں چنانچہ

[1] موجودہ فرمانروائے ریاست ہز ہائینس نواب حمید اللہ خاں بہادر بالقابہ ہیں ۱۲

مسلم یونیورسٹی اور اسی طرح کی دیگر قومی تعلیم گاہوں کے قیام میں انھوں نے ہمیشہ بہت بڑی فراخدلی سے حصہ لیا ہے اور شاہانہ عطیے اُن کو عنایت کیے ہیں۔ خود بھوپال میں صدہا اسکول اور مدارس اُن کے عہد مبارک میں اور ریاست ہی کے روپیہ سے قائم ہوے جو ہمیشہ ان کی علم دوستی اور ہنر پروری کی یادگار رہینگے۔ آپ مختلف علوم وفنون میں کافی دستگاہ رکھتی ہیں اور متعدد کتابوں کی مصنف ہیں بہت سے قابل ابنائے وطن کو جو ناسازگاری زمانہ کی وجہ سے اپنے علمی کارناموں کو شائع نہ کر سکے آپ کی ذات سے بہت بڑی مدد پہونچی ہے۔ سیرت نبوی کی تکمیل کے واسطے جس کا بہت بڑا حصّہ مولانا شبلی نعمانی مرحوم نے تیار کردیا تھا اب تک معقول رقم ماہانہ عطا فرماتی رہتی ہیں۔ آپ کی والدہ ماجدہ نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ مرحومہ بھی بہت اچھی شاعرہ تھیں اور اُردو میں شیریں اور بعد کو تاجور اور فارسی میں شاہجہاں تخلّص کرتی تھیں۔ اُنھوں نے اپنا عقد ثانی نواب صدیق حسن خاں صاحب سے کرلیا تھا۔ نواب صاحب موصوف عربی و فارسی کے بڑے عالم و فاضل اور اپنے زمانہ کے ایک مشہور محدث اور مفسر سمجھے جاتے تھے مفتی آزردہ کے شاگرد تھے۔ اور تقریباً ڈیڑھ دو سو کتابوں کے مصنف تھے شعرا اور اہل علم کے بڑے قدرداں تھے۔ اُردو میں توفیق اور فارسی اور عربی میں نواب تخلّص کرتے تھے۔ نواب شاہجہاں بیگم کے والد ماجد نواب جہانگیر محمد خاں مرحوم بھی خوب شعر کہتے تھے اور دولت تخلّص کرتے تھے۔ اُن کا دیوان چھپ گیا ہے۔ علاوہ خاندان ریاست کے بھوپال میں اور بھی بہت خوشگو شاعر ہمیشہ رہے ہیں۔

چونکہ ترقی شاعری کے آخری عہد میں رامپور و حیدرآباد نے شعرا کے

اجتماع اور قدردانی میں بہت نمایاں حصہ لیا ہے۔ لہذا اُن کا حال اختصار کے ساتھ علیحدہ علیحدہ لکھا جاتا ہے۔

رامپور ہمارے نزدیک اس امر کی کہ رامپور میں بمقابلہ اور شہروں کے شعرا کا مجمع خاص طور پر زیادہ ہوا تین وجہیں ہوسکتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ دلی اور لکھنؤ کے درمیان اور ان دونوں شہروں سے مساوی فاصلہ پر واقع ہے۔ دوسرے یہ کہ فرمانروایان ریاست خود بھی زبردست شاعر اور سخن سنج اور شعرا کے قدردان تھے اور شعرا کی محنت و جگرکاوی کے بدلے ہمیشہ اُن کو بیش بہا انعامات و وظائف سے سرفراز کرتے رہتے تھے۔ تیسرے یہ کہ وہ علما و ادبا، اور شعرا کو اپنا ملازم نہیں سمجھتے تھے بلکہ اُن سے مساویانہ برتاؤ کرتے اور اکثر اُنکی نازک مزاجیاں برداشت کرتے تھے۔ اِن کا دربار اِسی قسم کے اہل علم و فضل کا مجمع تھا اور نواب صاحب خود اُنکی دلچسپیوں میں حصّہ لیتے تھے۔ اسی وجہ سے وہ لوگ بڑی بڑی تنخواہوں پر بھی اول تو رامپور سے نکلنا ہی نہیں چاہتے تھے اور اگر جاتے بھی تو ہمیشہ رام پور کو یاد کرتے رہتے تھے۔

نواب یوسف علیخاں نواب یوسف علیخاں خلف نواب محمد سعید خاں بڑے علم دوست ہنر پرور اور شعرا کے مُربّی رئیس تھے خود بھی شاعر تھے اور اُردو فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے۔ اُردو میں ناظم تخلص کرتے تھے صاحب دیوان ہیں ابتدا میں حکیم مومن خاں سے اصلاح لیتے تھے۔ اُن کے بعد مرزا نوشہ غالب پھر میر مظفر علی اسیر کو کلام دکھانے لگے دلی اور لکھنؤ کی تباہی کے بعد جو شاعر وہاں سے نکلے اُن کو رامپور ہی میں جگہ ملی تھی۔ مولانا فضل حق خیرآبادی۔ مرزا غالب۔ میر حسین تسکین۔ میر مظفر علی اسیر اور بہت سے علما و شعرا اُن کے دامن دولت سے وابستہ تھے۔

نواب صاحب موصوف نے شعرائے دہلی و لکھنؤ کو اپنے دربار میں جمع کر کے اردو شاعری کو گنگا جمنی کر دیا تھا یعنی ان دونوں طرزوں کو ملا کر ایک نئے طرز کی بنیاد ڈالی تھی جسنے اُن کے بلند اقبال صاحبزادے نواب کلب علیخاں کے زمانہ میں بڑی ترقی کی۔

نواب کلب علی خاں،
۱۲۸۲ھ تا ۱۳۰۴ھ

نواب کلب علیخاں کے عہد میں جو ۱۲۸۱ھ مطابق ۱۸۶۵ء میں اپنے والد نواب یوسف علیخاں کی جگہ مسند نشین ہوے اردو شاعری نے رامپور میں پہلے سے بھی زیادہ ترقی کی۔ برخلاف فریڈرک اعظم بادشاہ جرمنی کے جو اپنے زمانہ میں کل بادشاہان یورپ میں علم و ہنر کا بڑا مربی اور قدردان سمجھا جاتا تھا نواب صاحب موصوف بڑے سخی اور فیاض تھے اور ہمیشہ انعام و اکرام سے شعرا کی قدر افزائی کرتے تھے۔ اُن کا مبارک عہد ادبی حیثیت سے رام پور کا زرین عہد کہا جاسکتا ہے۔ اُنھوں نے اپنی دانشمندی قدردانی اور مردم شناسی سے اپنی چھوٹی سی ریاست میں بڑے بڑے اہل کمال اور ارباب فن کو جمع کر لیا تھا جسکی نظیر ہندوستان کی کسی دوسری ریاست میں نہیں ملتی تھی۔ اس ریاست میں اُس وقت کے بہتر سے بہتر حکما، کامل نثار، شعرا، خوشنویس یہانتک کہ ہر ایک حرفہ اور پیشہ کے بھی مشہور اہل کمال مثلاً چوبدار، باورچی، رکابدار وغیرہ سب موجود تھے۔ علما کے گروہ میں علامہ عبدالحق خیرآبادی، علامہ عبدالحق مہندس، مولانا ارشاد حسین، سید حسن شاہ محدث اور مفتی سعد اللہ وغیرہ۔ حکما اور اطبا کے طبقہ میں حکیم محمد ابراہیم اور ان کے صاحبزادہ حکیم عبدالعلی حکیم علی حسین اور حکیم احمد رضا و حکیم حسین رضا وغیرہ تھے۔ شعرا کی جماعت بہت زبردست تھی۔ یوں تو اور بہت سے تھے مگر مشہور لوگوں میں یہ حضرات زیادہ نامور ہیں۔ میر مظفر علی اسیر، شیخ امداد علی بحر،

نواب سید یوسف علی خان بہادر فردوس مکان والی رامپور

جناب نواب سید کلب علی خان بہادر خلد آشیان

امیر۔ داغ۔ جلال۔ تسلیم۔ منیر۔ قلق۔ عروج۔ حیا۔ جان صاحب آغا جو شرف شاگرد آتش۔ انس شاگرد ناسخ۔ شاغل۔ شاداں۔ غنی۔ ضیا۔ خواجہ محمد شبیر۔ منصور۔ رضا وغیرہ۔ ان مشاہیر کے علاوہ اور سیکڑوں قابل اور لائق شخص پڑے ہوے تھے جنکی پرورش اور قدردانی ریاست کرتی تھی۔ مقرب لوگوں کے قیام کے واسطے ایک اعلی درجہ کا مکان مخصوص تھا۔ جو مصاحب منزل کے نام سے مشہور تھا۔ مگر باوجود ان اخراجات شاہانہ کے اسراف کا الزام ریاست پر عائد نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ یہ جتنے لوگ تھے سوائے مولانا ارشاد حسین۔ مولوی عبدالحق اور منشی امیر احمد مینائی کے کسی کی تنخواہ سو روپیہ سے زیادہ نہیں تھی۔ علاوہ اس کے کسی کو مفت اور فضول تنخواہ نہیں ملتی تھی۔ اور یہ سب لوگ ریاست کے مختلف کاموں پر باعتبار اپنی قابلیت اور سن کے مقرر تھے۔ مگر یہ ضرور ہے کہ نواب صاحب اپنے تمام ملازمین سے قطع نظر انعام واکرام کے نہایت شفقت اور محبت سے پیش آتے تھے۔ عید بقرعید اور اکثر خوشی کے موقعوں پر تمام معزز اور مقرب لوگوں کو خلعت اور انعام سے سرفراز فرماتے اور جن سے زیادہ خصوصیت ہوتی انکی خبرگیری خاص طور پر فرماتے۔ قرضداروں کا قرض ادا کر دیتے اور مختلف طریقوں سے انکو رہین منت کرتے تھے۔

نواب کلب علیخاں نے درسیات معقول و منقول مولنا فضل حق خیرآبادی سے پڑھی تھیں۔ پہلے انھوں نے اردو و فارسی نثر لکھنے کی مزاولت کی۔ اور اکثر کتابیں تصنیف کیں منجملہ جن کے بلبل نغمہ سنج۔ ترانۂ غم۔ قندیل حرم۔ اور شگوفۂ خسروی زیادہ مشہور ہیں۔ فارسی میں ان کا دیوان تاج فرخی کے نام سے مشہور ہے۔

اُردو میں اپنا کلام امیر مینائی کو دکھاتے اور اُنھیں سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ چار دیوان انکی یادگار اور انکی اعلیٰ قابلیت کے نمونے ہیں۔ نشید خسروانی۔ دستنبوء خاقانی۔ دُرۃ الانتخاب۔ اور توقیع سخن۔ نواب صاحب نواب تخلص کرتے تھے اور نہایت عمدہ شعر کہتے تھے۔ ان کو تحقیق لفظی کا خاص شوق تھا۔ اور الفاظ کی صحت و عدم صحت کے مُناظرے اُن کے سامنے اکثر ہوا کرتے تھے جن میں بحر تسلیم۔ جلال۔ امیر۔ اور منیر وغیرہ، جو اس فن خاص میں خاص بصیرت اور دلچسپی رکھتے تھے، نمایاں حصّہ لیتے تھے۔ اسی وجہ سے نواب صاحب کا بیشتر کلام متروکات اور غیر فصیح الفاظ اور ترکیبوں سے پاک ہے۔

اس اجتماع شعرا کا یہ نتیجہ بہت اچھا ہوا کہ اسکی وجہ سے دلّی اور لکھنؤ کے مختلف طرز آپس میں مل گئے اور ایک نئے طرز کی بُنیاد پڑی جسکی ابتدا، نواب یوسف علیخاں کے زمانہ میں ہو چکی تھی۔ یہ اُردو شاعری کا ایک ایسا اہم اور غور طلب مسئلہ ہے جسکی طرف کافی توجہ ابتک منعطف نہیں ہوئی ہے۔ ناسخ کا طرز اُن کے شاگردوں کے زمانہ میں جو کہ اپنے اُستاد کی اُستادانہ روش کو قائم نہ رکھ سکے تھے بد سے بدتر ہو گیا تھا۔ ان لوگوں کے کلام میں اُس طرز کے تمام عیوب تو موجود تھے مگر خوبیاں مفقود تھیں۔ اس طرز کے برتنے والے رامپور میں بحر۔ منیر۔ قلق اور اسیر تھے۔ برخلاف اس کے طرز دلی کے پیرو داغ و تسلیم تھے۔ داغ گو کہ ذوق کے شاگرد تھے مگر اُنھوں نے ایک ایسا دلکش طرز اختیار کیا تھا جسمیں جراُت کا کچھ رنگ ملتا جلتا تھا۔ اُن میں اور لکھنؤ والوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ اُن کے اشعار بہت مقبول ہوے ہر شخص اُن کے رنگ کا دلدادہ تھا۔ تسلیم گو کہ لکھنؤ کے تھے مگر رنگ بالکل

دلّی کا اختیار کیا تھا۔ وہ نسیم دہلوی کے شاگرد تھے جو مومن کے شاگرد تھے۔ نسیم کے طرز کی کیفیت ہم اُن کے حالات میں مفصل بیان کر چکے ہیں۔ اُن کے شاگرد تسلیم پر ناسخ کے رنگ کا جادو کبھی نہ چلا۔ وہ اُس کو ہمیشہ برا سمجھتے رہے اور جہاں کہیں رہے اپنے اُستاد اور استاد الاستاد یعنی نسیم اور مومن کی پیروی کرتے رہے۔ مومن اور غالب تھوڑے عرصہ تک رامپور میں رہے تھے اسوجہ سے اُن کا اثر کچھ زیادہ نہ پڑسکا اور میر حسین تسکین کوئی ایسے بلند مرتبہ شخص نہ تھے کہ اپنا اثر اپنے وقت کی زبان اور شاعری پر ڈالتے۔ مختصر یہ کہ یہ دونوں اسکول یعنی لکھنؤ اور دلّی آپس میں لڑتے جھگڑتے اور مباحثہ کرتے رہے جس کا نتیجہ شاعری کے لئے عموماً اچھا ہوا یعنی ناسخ کے زمانہ سے جو ایک بیجا الفاظی اور تصنع کا شوق داخل زبان ہو گیا تھا وہ جاتا رہا یا کم سے کم اُسکو شدید نقصان پہونچا۔ اور اسی کے ساتھ لفظی تحقیق کا یہ مبارک نتیجہ ہوا کہ ایسے الفاظ اور ترکیبیں جو قدما کی یادگار اور اہل دہلی کی مایۂ ناز تھیں رخصت ہو گئیں اب لوگ شاعری کے صحیح جذبات اور اُن کے مناسب الفاظ سے واقف ہو گئے۔ لکھنؤ کے طرز قدیم کے شیداؤں نے دیکھ لیا کہ اب اس جدید رنگ کے سامنے اُن کا رنگ نہیں جم سکتا۔ مجبوراً اُنکو طرز دہلی کیطرف متوجہ ہونا پڑا۔ چونکہ داغ کو مقبولیت عام حاصل ہو رہی تھی جیسا کہ ہم ابھی اوپر کہہ چکے ہیں۔ لہذا اُن کے معاصرین کو اسکے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ پبلک کی پسند کا اتباع کرتے ہوے وہی طرز اختیار کریں۔ چنانچہ امیر جو داغ کے بڑے حریف اور مد مقابل تھے اُن کو بھی اس رائے عامہ کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ اور اسی وجہ سے اُن کا دوسرا دیوان یعنی "صنمخانۂ عشق" داغ کے رنگ میں ہے گو کہ کہیں کہیں اپنے خاص رنگ میں بھی کہہ جاتے ہیں۔

اسی طرح اُنھوں نے "جوہر انتخاب" اور "گوہر انتخاب" ایک میر اور دوسرا خواجہ میر درد کے رنگ میں لکھکر اس بات کا ثبوت دیا کہ وہ دلی کے رنگ کو لکھنؤ پر ترجیح دیتے ہیں شاگردان امیر علی الخصوص ریاض جلیل۔ اور حفیظ نے ایک قدم اور بڑھایا بلکہ ان کے اکثر اشعار تو ایسے ہیں جو داغ اور شاگردان داغ کے کلام سے علیحدہ نہیں کیے جاسکتے یہی حال جلال کا بھی سمجھنا چاہیے۔ جلال رشک اور برق کے شاگرد تھے اور اُن کی نشو ونما بالکل لکھنؤ کے طرز پر ہوئی تھی۔ مگر تعجب ہے کہ اُنھوں نے بھی اس رنگ کو چھوڑ کر دلی کا رنگ اختیار کیا چنانچہ اُن کا ایک دیوان بالکل اُسی رنگ کا ہے۔ اور اسمیں اُنھوں نے میر کی بہت پیروی کی ہے۔ مگر ہمارے اس لکھنے سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ امیر و جلال بالکل اپنے رنگ کو بھول گئے تھے۔ البتہ ایک بڑی حد تک اُسکی پیروی کرتے تھے۔ ہمارے خیال میں قدیم رنگ کا خاتمہ اُس وقت ہوا جبکہ انجمن معیار لکھنؤ میں قائم ہوئی جس کے ماہواری رسالے اور اُسکی تحقیقات نے طرز قدیم کو لوگوں کے دل سے محو کر دیا۔

موجودہ فرمانروائے رامپور

موجودہ فرمانروائے رامپور یعنی ہز ہائینس نواب سید حامد علیخاں صاحب بہادر جمیع القابہ ایک نہایت روشن خیال تعلیم یافتہ اور مثل اپنے اسلاف کرام کے نہایت اعلیٰ درجہ کے شاعر اور سخن فہم اور شعراء کے مربی اور سرپرست ہیں۔ ان کے زمانہ میں بھی شعراء اور ہر قسم کے باکمالوں کا رامپور میں مجمع رہتا ہے اور یہ لوگ ہمیشہ ان کے جود و سخا سے بہرہ یاب ہوتے رہتے ہیں۔ اس زمانہ کی تمام قومی درسگاہیں اور مفید تحریکیں ان کے فیوض نامتناہی سے فیضیاب ہوتی رہتی ہیں۔

امیر مینائی ۱۲۴۴ھ
لغایت ۱۳۱۸ھ

منشی امیر احمد مینائی آمیر تخلص خلف مولوی کرم محمد ۱۸۲۹ء میں بعہد نصیر الدین حیدر لکھنؤ میں پیدا ہوئے حضرت مخدوم شاہ مینا کے، جن کا مزار لکھنؤ میں مرجع خاص و عام ہے، خاندان میں ہیں اسی تعلق سے مینائی کہلاتے ہیں۔ درسی کتابیں مفتی سعد اللہ مرحوم اور ان کے ہمعصر علمائے فرنگی محل سے پڑھی تھیں اور عربی و فارسی میں دستگاہ کامل رکھتے تھے منشی صاحب اپنی ذات سے بڑے منکسر المزاج صاحب زہد و تقوے اور صوفی مشرب بزرگ تھے۔ خاندان صابریہ چشتیہ کے سجادہ نشین حضرت امیر شاہ صاحب سے بیعت رکھتے تھے۔ طب جفر نجوم وغیرہ سے بھی واقف تھے۔ نہایت ذکی و طبّاع محنتی اور جفاکش تھے۔ اسی وجہ سے اپنے معاصروں میں جسطرح اپنی وضعداری اور سادگی کی وجہ سے مشہور تھے اسی طرح اپنے علم و فضل اور کمال و قابلیت میں بھی اُن سے ممتاز تھے۔

شعر و سخن کا شوق بچپن ہی میں پیدا ہو گیا تھا۔ اس فن میں آپ کو منشی مظفر علی اسیر سے تلمذ تھا مگر حقیقت یہ ہے کہ اپنی ہمہ دانی اور طبیعت کی روانی سے اپنے اُستاد سے بھی بڑھ گئے۔ ان کے وقت میں تمام فضائے لکھنؤ شاعری سے بھری ہوئی تھی شاگردان آتش و ناسخ کے مناقشے روزمرہ کے مشاعرے جسمیں شہر کے اساتذہ مثل صبا و خلیل و رند و سحر وغیرہ کے شرکت کرتے تھے، مراثی کے زور و شور اور انیس و دبیر کے معرکے غرضکہ ان تمام چیزوں نے ہونہار شاعر کی منچلی طبیعت پر بہت بڑا اثر ڈالا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی دنوں کی محنت و جانکاہی میں ایسی مشق سخن بہم پہونچائی اور اتنی شہرت حاصل کی کہ ۱۸۵۲ء میں ان کے اشعار کا تذکرہ سلطان عالم واجد علی شاہ کے دربار میں ہوا اور اُن کو بُلا کر اُن کا کلام سُنا گیا اور حسب الحکم سلطانی

دو کتابیں "ارشاد السلطان" اور "ہدایت السلطان" اُنھوں نے تصنیف کیں۔ جن کے صلہ میں خلعت فاخرہ اور انعام عطا ہوا۔ اُسی وقت سے اُنکی شہرت کا زمانہ شروع ہوا جو برابر ترقی کرتا گیا۔ مگر الحاق اودھ اور غدر کی وجہ سے شعراے دربار کے تمام حوصلے پست ہو گئے۔ اور وہ اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے۔ بعد غدر امیر نے دوستوں کے کہنے سے سرکاری ملازمت کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ مگر جب عہدۂ صدر امینی کیواسطے صاحب جج کو درخواست دینے کے متعلق اُن سے کہا گیا تو اُن کو یہ بات اچھی معلوم ہوئی اور ملازمت کا خیال ہی ترک کر دیا۔ تھوڑے روز کی بیکاری اور خانہ نشینی کے بعد فردوس مکاں نواب یوسف علیخاں والی ریاست رامپور نے اُن کو طلب کیا جو شعراے لکھنؤ و دہلی کے اُسوقت بڑے سرپرست تھے۔ نواب موصوف کے انتقال کے بعد خلد آشیاں نواب کلب علی خاں بہادر کا عہد حکومت آیا جسمیں اُردو شاعری کو اور بھی فروغ ہوا۔ ان سخن فہم اور سخن شناس رئیس نے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر تمام ہندوستان کے نامی و گرامی شعرا اور باکمالوں کو بُلا کر اپنے دامن دولت کے سایہ میں لے لیا تھا۔ غرضکہ یہ زمانہ یعنی امیر کے قیام رامپور کا زمانہ ان کی شاعری اور اقبال دونوں کے عروج کا زمانہ تھا۔ اسی میں اُن کو نواب کی اُستادی کا فخر حاصل ہوا۔ رام پور میں اُن کو بڑی عزت حاصل تھی اور وہ ایک بڑی ادبی اور سوشل ہستی سمجھے جاتے تھے۔ تنخواہ بھی معقول تھی جسکی وجہ سے بڑے مزے سے آزادانہ زندگی بسر کرتے اور شعر و شاعری اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہتے تھے۔ غرض کہ ۴۳ برس رامپور میں نہایت عزت و آبرو سے بسر کر کے جس میں اکثر مرتبہ لکھنؤ بھی آنا ہوا تھا بالآخر حیدر آباد کو روانہ ہوئے۔ وہاں جانے کی تقریب اس طرح ہوئی تھی کہ ۱۹۰۰ء میں

جب نظام حیدرآباد کلکتہ سے واپس آرہے تھے تو راستہ میں بنارس میں بھی ٹھہرے امیر نے ایک قصیدہ اُن کی تعریف میں کہکر بمقام بنارس اُنکی حضور میں پیش کیا تھا حضور نظام کو وہ بہت پسند آیا اور امیر سے حیدرآباد آنے کی فرمائش کی - چنانچہ سنہ ۱۹۰۰ء میں وہ عازم حیدرآباد ہوے - یہاں تھوڑے دِن قیام کیا تھا کہ بیمار ہوے اور تہتر برس دس مہینے کی عمر میں اس دار فانی سے رحلت کی علالت کے زمانہ میں داغ اور پنڈت رتن ناتھ سرشار اُنکی عیادت کو جاتے تھے اور مہاراجہ سرکشن پرشاد بھی اکثر قدم رنجہ فرماتے تھے جیسا کہ منشی صاحب کی اس رُباعی سے ظاہر ہوتا ہے -

رباعی

ہے آپ کا اخلاق جو ہمدرد مرا   رشک دم عیسیٰ ہے دم سرد مرا
فرماتے ہیں ہر روز عیادت میری   درماں مرے حق میں ہوگیا درد مرا

داغ نے وفات کی یہ تاریخ کہی

ولے وےلا چل بسا دنیا سے وہ   جو مرا ہم فن تھا میرا ہم صفیر
مصطفےٰ آباد (رامپور) سے آیا دکن   یہ سفر تھا اُس مسافر کا اخیر
کیا کہوں کیا کیا ہوئیں بیماریاں   کیا لکھوں تفصیل امراضِ کثیر
مبتلائے حدتِ صفرا و تپ   موردِ آزار اسہال و زحیر
گو بظاہر تھا امیر احمد لقب   درحقیقت باطناً پایا فقیر
شاہ مینا سے ہے نسلی سلسلہ   شاعری میں خاص تلمیذِ اسیر

ہے دُعا بھی داغ کی تاریخ بھی
قصر عالی پائے جنت میں امیر
۱۳   ۱۸

تصانیف امیر بہت پُر گو شاعر تھے اُن کی بعض نثر کی کتابیں اور ایک اُردو دیوان موسوم "بہ غیرت بہارستان" سُنا جاتا ہے کہ زمانۂ غدر میں تلف ہوگئے۔ پھر دوسری آفت یہ آئی کہ ۱۸۹۵ء میں اُن کے مکان میں آگ لگ گئی جس میں انکی اکثر تصانیف اور قیمتی کتابیں جل کر خاک ہوگئیں۔ موجودہ تصانیف میں جنکی فہرست ذیل میں دیجاتی ہے اُن کے دو دیوان عاشقانہ۔ یعنی "مرآۃ الغیب" اور "صنم خانہ"۔ اور ایک نعتیہ اشعار میں موسوم "بہ محامد خاتم النبیین" اور نیز "امیر اللغات" نہایت قابلِ قدر اور مشہور و معروف تصانیف ہیں۔ اُنکی تصانیف ترتیب وار حسب ذیل ہیں:۔

(۱)۔ ارشادُ السّلطان۔ (۲) ہدایت السّلطان۔

(۳)۔ غیرت بہارستان۔ اسمیں وہ غزلیں ہیں جو قبل غدر مشاعروں میں پڑھی تھیں۔ نیز چند قصائد در مدح واجد علی شاہ۔ یہ کلام غدر میں تلف ہوگیا۔

(۴) نورِ تجلّی۔ (۵) ابر کرم۔ یہ دونوں مثنویاں بھی غدر سے پہلے لکھنؤ میں لکھی تھیں۔ (۶) ذکر شاہ انبیا بصورت مسدس مولود شریف ہے۔

(۷) صبح ازل آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت کے بیان میں۔

(۸) شام ابد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بیان میں۔

(۹) لیلۃ القدر معراج کے حال میں (۱۰) مجموعۂ واسوخت۔ چھ واسوختوں کا مجموعہ جن کے تاریخی نام حسب ذیل ہیں اور سنہ تصنیف ۱۲۸۰ھ ہے۔ یعنی "بانگ اضطرار"، "واسوخت اُردو"، "شکایات رنجش"، "صفیر آتشبار"، "حسد اغیار"، "غبار طبع"۔ اس مسدس کو ایک عمدہ دیباچہ کے ساتھ "مینائے سخن" کے نام سے دائرۂ ادبیہ لکھنؤ نے چھاپا ہے۔ (۱۱) محامد خاتم النبیین۔ مؤلفہ ۱۲۸۹ھ۔

امیر مینائی

داغ دہلوی

نعتیہ دیوان ہے۔ (۱۲) انتخاب یادگار۔ رام پور کے شعرائے اُردو کا تذکرہ ہے جو نواب کلب علیخاں بہادر کے حکم سے سنہ ۱۲۹۰ھ میں لکھا تھا جیسا کہ تاریخی نام سے ظاہر ہوتا ہے (۱۳) خیابان آفرینش نثر میں مولود شریف ہے (۱۴) مرأۃ الغیب۔ اُردو غزلوں اور قصائد کا پہلا دیوان ہے۔

(۱۵) صنمخانۂ عشق مطبوعہ سنہ ۱۳۱۳ھ (۱۶) جوہر انتخاب (۱۷) گوہر انتخاب مؤلفہ سنہ ۱۳۱۳ھ۔ یہ دونوں میر تقی میر اور خواجہ میر درد کے رنگ میں کچھ غزلیں لکھی گئی ہیں۔

(۱۸) تیسرا دیوان جو ہنوز غیر مطبوع ہے۔ اسمیں چند قصائد اور رباعیات شامل ہیں۔

(۱۹) سرمۂ بصیرت۔ جو ایسے عربی و فارسی الفاظ کی ایک فرہنگ ہے جو اُردو میں غلط استعمال ہوتے ہیں اسمیں اُن کا صحیح طریقۂ استعمال معہ اسناد کے بتایا ہے۔

(۲۰) بہار ہند۔ ایک مختصر لغت اُردو محاورات و الفاظ کی جسکو امیر اللغات کا نقش اول کہنا چاہیئے۔ (۲۱) امیر اللغات جس کو منشی صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ سمجھنا چاہیئے مگر افسوس ہے کہ وہ ناتمام رہ گئی۔ صرف دو جلدیں الف ممدودہ اور الف مقصورہ کی اب تک تیار ہوئی ہیں۔ اِس کتاب میں قابل مصنف کے تبحر اور جامعیت اور نیز اُنکی سعی کدو کاوش اور محنت و جانکاہی کا پتہ چلتا ہے۔ اسکی دو جلدیں چھپ گئی ہیں۔ تیسری بھی تیار تھی مگر ضائع نہو سکی۔ ابتداءً آٹھ جلدوں میں اس کے نکالنے کا ارادہ تھا۔ نواب کلب علیخاں بہادر کے عہد میں شروع ہوئی تھی اور اُس کے بڑے سرپرست ہز آنر سر الفرڈ لائل لفٹنٹ گورنر ممالک متحدہ تھے۔ جنرل عظیم الدین خاں نائب پریسیڈینٹ کونسل آف ریجنسی رامپور نے بھی اسکی سرپرستی کی تھی منشی صاحب نے اپنے خطوط میں اس کتاب کا اکثر ذکر کیا ہے۔

(۲۲) خطوط اور متفرق چیزیں نظم و نثر ہیں۔ منشی صاحب کے شاگرد اور دوست بہت کثرت سے تھے اور منشی صاحب کو خط لکھنے کا بہت شوق تھا لہذا اُن کا مجموعۂ خطوط بہت دلچسپ ہے اس کو اُن کے شاگرد رشید مولوی احسن اللہ خاں ثاقب نے ایک نہایت مفید اور دلچسپ دیباچہ کے ساتھ شایع کیا ہے۔ ان خطوط سے منشی صاحب کے عادات واطوار اور کیرکٹر پر بہت کافی روشنی پڑتی ہے اور اگر کوئی لکھنا چاہے تو اُنکی سوانحعمری کا بہت عمدہ مواد اُن سے فراہم ہو سکتا ہے۔ نیز اُن میں فن نظم اور زبان کے متعلق اکثر مشکل مسائل کو حل کیا ہے۔ "رسالۂ اسرار نظم" اور "زاد الامیر" اور "مناجات" وغیرہ کو اُن کے متفرق تصانیف میں سمجھنا چاہیے۔

شاگرد منشی صاحب کے سیکڑوں شاگرد تھے جنمیں سے چند کے نام یہ ہیں۔ ناظم۔ نواب۔ صفدر۔ جاہ۔ جلیل۔ ریاض۔ برہم۔ زاہد۔ کوثر خیرآبادی۔ وسیم۔ حیران۔ محسن کاکوروی۔ عابد۔ رضا۔ دل۔ قرار۔ ثاقب۔ اصغر۔ مضطر۔ سرشار۔ حفیظ جونپوری۔ آہ۔ اختر۔ قمر۔ اِن میں ریاض۔ جلیل۔ مضطر۔ اور حفیظ بہت مشہور ہیں۔

امیر کی شاعری امیر نہ صرف ایک طباع شاعر بلکہ ایک متبحر عالم بھی تھے۔ اور ادبی دُنیا میں انکی شہرت انھیں دونوں باتوں پر مبنی ہے۔ انکا پہلا مطبوعہ دیوان مرآۃ الغیب کسی قدر ناہموار ہے کیونکہ ابتدائی کلام کے ساتھ جو بھدا اور بیمزہ ہے بعد کی غزلیں جن سے مشاقی اور پختگی معلوم ہوتی ہے ملی جُلی ہیں اُن کے ابتدائی کلام میں وہ سب عیوب موجود ہیں جو ناسخ کے رنگ کے لئے مخصوص ہیں یعنی جا و بیجا

رعایت لفظی۔ ابتذال رکیک اور بدنما تشبیہیں۔ عورتوں کا لباس اور سامان زینت مثلاً انگیا کرتی۔ اور کنگھی چوٹی وغیرہ۔ غرضکہ اس میں کوئی چیز نئی اور اوریجنل نہیں ہے بلکہ وہی پرانے فرسودہ مضامین ہیں جو اُلٹ پلٹ کر رنگین عبارت میں بیان کیے گئے ہیں۔ البتہ اُن کا دوسرا دیوان "صنمخانۂ عشق" اُن کے بڑے حریف اور معاصر داغ کے طرز پر ہے۔ اور اس میں اعلیٰ تخئیل سلاست وروانی اور دلکش عاشقانہ ترکیبیں بکثرت موجود ہیں۔ اُن کے نعتیہ اشعار گوکہ قدیمی مقررہ طرز میں ہیں مگر اکثر اعلیٰ تخئیل۔ فصاحت وبلاغت اور جوش اعتقاد کے بہترین نمونے ہیں۔ غرضکہ منشی صاحب کو مختلف اصناف سخن۔ غزل۔ قصیدہ۔ رباعی مخمس۔ مسدس وغیرہ پر عبور تام حاصل ہے اُن کا کلام اعلیٰ خیالات فصاحت وبلاغت۔ روانی و سلاست، توازن الفاظ اور ایجاز کے لئے مشہور ہے۔ حشو وزوائد اور صنائع بدایع لفظی کی کثرت سے اُن کا کلام پاک ہے۔ ان کے اشعار میں شگفتگی، نزاکت خیال بلند پروازی۔ شیرینی۔ زور اور قادر الکلامی بدرجۂ احسن موجود ہے۔ تصوف کی چاشنی بھی کہیں کہیں جلوہ گر ہے جو مشرقی شاعری کی جان اور ادب آموزی کی خاص پہچان ہے۔ اِس قسم کے خیالات کسی ایک شاعر کی ملک خاص نہیں ہوتے بلکہ مختلف لوگوں کے کلام میں بہ تبدیل الفاظ پائے جاتے ہیں۔

اخلاق وعادات منشی صاحب ایک پیکر متانت اور مجسم تہذیب تھے۔ شرم وحیا ان کے اخلاق کا خاص جوہر تھی۔ طبیعت نہایت محبت والی پائی تھی راستباز، ہمدردی سے بھرے ہوئے نہایت متقی وپرہیزگار اور سادہ مزاج واقع ہوے تھے، کبھی کسی لفظ فحش سے زبان کو آلودہ نہیں کیا۔ اور نہ کسکی ہجو لکھی

سچے پاکباز۔ صوفی مشرب احکام قرآنی کے پورے عامل تھے۔ اسی وجہ سے اُنکے تقدس اور پیرپائی کی شہرت لوگوں میں اُسی قدر تھی جس طرح اُن کے علم و فضل اور کمالات شاعری کی۔ مزاج میں انکسار اور تواضع اسقدر تھی کہ اپنے معاصر حریفوں علی الخصوص داغ سے کبھی مسابقت کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ تمام اپنے ہمعصروں سے نہایت خلوص اور محبت کا برتاؤ رکھتے تھے۔ ادبی مسائل کا جو اُنسے پوچھے جاتے تھے نہایت آزادی سے جواب دیتے تھے۔ اور کسی شخص یا جماعت کی پاسداری کبھی نہیں کرتے تھے۔ اپنے بعد چار بیٹے چھوڑے۔ قمر۔ آرزو۔ ضمیر۔ اختر۔ جو خدمات زبان کی منشی صاحب نے انجام دیں اُسکا ذکر ہم امیر اللغات کے سلسلہ میں اوپر کر آئے ہیں۔ منشی صاحب ایک بہت قابل اور طباع شاعر تھے۔ اور اُن کے اکثر اشعار زبان زد خلایق ہیں۔ اُن کا مرتبہ شعرائے اُردو میں بہت بلند ہے۔

چند اشعار بطور نمونہ

چند اشعار بطور نمونہ یہاں لکھے جاتے ہیں۔

قریب ہے یار روز محشر چھپے گا کُشتوں کا خون کیونکر
جو چُپ رہے گی زبان خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

(اس شعر کو مسٹر جسٹس محمود نے اپنے ایک فیصلے میں بطور سند کے لکھا تھا)

اے روح کیا بدن میں پڑی ہے بدن کو چھوڑ
میلا بہت ہوا ہے اب اس پیرہن کو چھوڑ

سیدھی نگاہ میں ہیں تری تیر کے خواص ۔۔۔ ترچھی ذرا ہوئی تو ہیں شمشیر کے خواص
ترکش میں تیر میان میں شمشیر بے قرار ۔۔۔ دیکھو تو بے قراری نخچیر کے خواص
کہتا ہے شعر سُن کے کوئی واہ کوئی آہ ۔۔۔ کچھ میرزا کے مجھ میں ہیں کچھ میر کے خواص

کیا یہ شوق نے اندھا مجھے نہ سوجھا کچھ
وگرنہ ربط کی اُس سے ہزار راہیں تھیں

وہ مزا دیا تڑپ نے کہ یہ آرزو ہے یارب
مرے دونوں پہلوؤں میں دلِ بیقرار ہوتا

جو نگاہ کی تھی ظالم تو پھر آنکھ کیوں چُرائی
وہی تیر کیوں نہ مارا جو جگر کے پار ہوتا

ایک دل ہمدم مرے پہلو سے کیا جاتا رہا
سب تڑپنے تلملانے کا مزا جاتا رہا

کھو گیا دِل کھو گیا رہتا تو کیا ہوتا امیر
جانے دو اک بیوفا جاتا رہا جاتا رہا

موقوف جرم ہی پہ کرم کا ظہور تھا
بندے اگر قصور نہ کرتے قصور تھا

صورت تری دکھا کے کہونگا یہ روزِ حشر
آنکھوں کا کچھ گناہ نہ دل کا قصور تھا

مِلا جب وہ کھلا تب یہ معما
کیا کرتے تھے اپنی جستجو ہم

جُدا ہے دختِ رز کا نام ہر صحبت میں اے ساقی
پری ہے میکشوں میں حور ہے پرہیزگاروں میں

ملا کر خاک میں بھی ہائے شرم اُن کی نہیں جاتی
نگہ نیچی کیے وہ سامنے مدفن کے بیٹھے ہیں

بیجاں کرکے مجھے سر پہ کھڑے ہیں چُپکے
ہاتھ اُٹھاتے بھی نہیں ہاتھ لگاتے بھی نہیں

اُلفت میں برابر ہے وفا ہو کہ جفا ہو
ہر بات میں لذت ہے اگر دل میں مزا ہو

آئے جو مری لاش پہ وہ طنز سے بولے
اب ہم ہیں خفا تم سے کہ تم ہم سے خفا ہو

آنکھیں کھولیں بھی بند بھی کیں
وہ شکل نہ سامنے سے سرکی

کیا تنگ ہے جلاد مری سختی جاں سے
ہر وار پہ کہتا ہے کہ ظالم کہیں مر بھی

وائے قسمت جو سب کی سُنتا ہے
وہ بھی عاشق کی اِلتجا نہ سُنے

باقی ہے امیر اب تو فقط جان کا جانا
ہوش و خرد و تاب و توان جا چکے کب کے

خودی سے بیخودی میں آ جو شوق حق پرستی ہو
جسے تو نیستی سمجھا ہے ای غافل وہ ہستی ہے

بڑھا ای آہ رسا اب کنگرے پر عرش کے پہنچی
بلندی کو بلندی جاننا ہمت کی پستی ہے

نہ گھبرا اے دل وا ماندہ اب منزل قریب آئی
اسی بستی کے آگے اور آباد ایک بستی ہے

نہ شاخ گل ہی اونچی ہے نہ دیوار چمن بلبل
تری ہمت کی کوتاہی تری قسمت کی پستی ہے

وصل ہو جائے یہیں حشر میں کیا رکھا ہے
آج کی بات کو کیوں کل پہ اٹھا رکھا ہے

ہم چلے دیر سے کعبہ کو تو وہ بت بولا
جا کے لے لیجئے کعبہ میں خدا رکھا ہے

انگور میں تھی یہ مے پانی کی چار بوندیں
جس دن سے کھنچ گئی ہے تلوار ہو گئی ہے

خود ترے ہونٹ یہ کہتے ہیں کہ بوسہ لیلو
اور معشوقوں کی ہوتی ہے نزاکت کیسی؟

تجھ سے مانگوں میں تجھی کو کہ سبھی کچھ مل جائے
سو سوالوں سے یہی ایک سوال اچھا ہے

نہ چوک وقت کو پا کر کہ ہر یہ وہ معشوق
کبھی امید نہیں جس سے جا کے آنے کی

داغ دہلوی ۱۸۳۱ء
لغایت ۱۹۰۵ء

نواب مرزا خان داغ ۱۸۳۱ء مطابق ۱۲۴۶ھ ہجری میں دلّی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد نواب شمس الدین خاں نواب ضیاء الدین خاں والی لوہارو کے بھائی تھے۔ ان کا انتقال ۱۲۵۱ھ میں ہوا جبکہ داغ تقریبًا چھ سات برس کے ہوں گے۔ دادا کا نام نواب احمد حسین خاں تھا والد کے انتقال کے بعد داغ کی ماں نے مرزا محمد سلطان عرف مرزا فخرو بہادر خلف بہادر شاہ کے ساتھ نکاح کر لیا اور شوکت محل کا خطاب پایا۔ ماں کے ساتھ یہ بھی لال قلعے پہونچے جہاں انکی تعلیم و تربیت ہوئی۔ قلعہ میں شعر و سخن کا چرچا بہت تھا، داغ کی منچلی طبیعت پر اپنے گرد و پیش کا بڑا اثر ہوا اور یہ بھی شاعری کی مقناطیسی قوت کے اثر سے متاثر ہو گئے۔ چونکہ بادشاہ اور مرزا فخرو دونوں ذوق کے شاگرد تھے یہ بھی

اُستاد ذوق کے شاگرد ہو گئے اور ان کے ساتھ مشاعروں میں جاتے اور داد سخن لیتے رہے۔ ابتدا میں فارسی اور عربی کی تعلیم بھی کچھ حاصل کی تھی چنانچہ فارسی مولوی غیاث الدین مؤلف غیاث اللغات اور مولوی احمد حسین سے پڑھتے تھے۔ خوشنویسی شہسواری۔ بانک پٹے وغیرہ کا بھی بہت شوق تھا۔ اور یہ فنون اُنھوں نے باقاعدہ اُستادوں سے حاصل کیے تھے شعر کا شوق اِن کو جبلّی تھا۔ اور طبیعت چونکہ مُناسب پائی تھی اس لئے تھوڑے ہی دنوں کی مشق سے پختہ کار شاعر ہو گئے ۱۸۵۶ء میں مرزا فخرو نے وفات پائی۔ مربّی باپ کا مرنا ان کے واسطے کیا کم مصیبت تھی کہ دوسرے ہی سال یعنی ۱۸۵۷ء کے عالم آشوب ہنگامے نے اُن کے رہے سہے حواس اور کھو دیے اور وہ بھی ہزاروں لاکھوں آدمیوں کی طرح دلّی چھوڑنے پر مجبور ہوے۔ جب کسی قدر ہنگامہ فرو ہوا تو مع اہل خاندان کے رام پور آئے جہاں نواب یوسف علیخاں بہادر جو اُن کو پیشتر سے جانتے تھے اُسوقت سر آرائے حکومت تھے۔ داغ پہلی مرتبہ ولیعہد ریاست نواب کلب علیخاں بہادر کے مصاحب مقرر ہوئے اور داروغۂ اصطبل کی خدمت ان کے سپرد ہوئی۔ اس خدمت کو اُنھوں نے نہایت قابلیت اور محنت کے ساتھ انجام دیا تھا اور اسوقت سے اُن کو گھوڑوں سے اور شہسواری سے دلچسپی ہو گئی تھی داغ نے اپنی عمر کے ۲۴ سال نواب کلب علیخاں بہادر کی ملازمت میں رامپور میں گزارے۔ جہاں یہ نہایت عزت و آبرو عیش و آرام سے زندگی بسر کرتے تھے۔ رام پور میں ان کو اسقدر آرام تھا کہ اُس کو آرام پور کہتے تھے۔ نواب کی ہمراہی میں حج و زیارت سے بھی مشرف ہوے تھے۔ اُنھوں نے دلی۔ لکھنو پٹنہ اور کلکتہ کا بھی سفر کیا۔ جہاں اُنکی بڑی قدر ہوئی اور اُن کے واسطے مشاعرے منعقد

کئے گئے۔ کلکتہ میں تین چار ماہ قیام کیا اور وہاں کے مشاعروں میں برابر شرکت کی۔ اپنے قیام کلکتہ کا ذکر انھوں نے اپنی مثنوی "فریاد داغ" میں کیا ہے۔ ۱۸۸۶ء میں نواب کلب علیخاں کی بے ہنگام موت سے انکی تمام آرزوؤں اور امیدوں پر پانی پھر گیا اُن کو بھی بعض اور لوگوں کی طرح جن کو اس مصیبت عظمیٰ سے نقصان پہونچا تھا رامپور چھوڑنا پڑا۔ چنانچہ وہ دلی چلے گئے اور وہاں کچھ دن قیام کرکے نکلے اور راستے میں مختلف مقامات کی سیر کرتے ہوئے ۱۸۸۸ء مطابق ۱۳۰۵ھ میں حیدرآباد پہنچے۔ راستے میں لاہور، امرتسر، کشن کوٹ، آگرہ، علی گڈھ، متھرا، جے پور، اور ریاست سنگرول واقع کاٹھیا وار میں ٹھہرتے ہوئے اور تھوڑے تھوڑے دن قیام کرتے ہوئے گئے تھے اور ان سب مقامات میں بیسیوں آدمی اُن کے شاگرد ہوئے۔ پہلی مرتبہ اعلیحضرت حضور نظام سے بتوسط راجہ گردھاری پرشاد متخلص بہ باقی ملاقات ہوئی تھی مگر چونکہ کوئی صورت حسب مراد اُس وقت نہیں نکلی لہذا دلی واپس آئے مگر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد ۱۳۰۸ھ میں سر آسمان جاہ بہادر کی طلبی اور حکم سے پھر حیدرآباد گئے اور ایکی مرتبہ قسمت نے یاوری کی اعلیحضرت (میر محبوب علی خاں) کے اُستاد مقرر ہوئے اور بیش قرار تنخواہ اور انعام واکرام کے علاوہ "مقرب السلطان بلبل ہندوستان جہاں استاد ناظم یار جنگ دبیر الدولہ فصیح الملک" کا معزز خطاب عنایت ہوا۔ ظاہر ہے کہ ایسی عزت افزائی کے بعد داغ کی عمر حیدرآباد میں نہایت کامیابی اور خوشی وخرمی سے گذرنے لگی۔ اُن کی تنخواہ پہلے ساڑھے چار سو روپیہ ماہوار مقرر ہوئے تھے مگر چند روز کے بعد ایک ہزار اور پھر پندرہ سو روپیہ ماہوار مقرر ہو گئے، جو بیش بہا صلے اور انعام واکرام تقریبوں کے موقع پر یا قصائد وغیرہ کے صلے میں ملتے تھے

وہ اس کے علاوہ تھے حیدرآباد میں داغ کو دنیاوی ثروت کا عروج حاصل ہوا۔ ہمارے خیال میں کسی اُردو شاعر کی کسی رئیس کے دربار میں نہ اسقدر عزت اور قدر و منزلت کی گئی اور نہ اتنی بیش قرار تنخواہ کبھی کسی کو ملی ہو گی۔ یہ ترقی ایسی نہ تھی کہ جو حاسدوں کی آنکھوں میں نہ کھٹکتی چند لوگوں نے اعتراضات کرنا شروع کیے۔ ان میں ایک ڈاکٹر ٹائل حیدرآبادی بھی تھے۔ تھوڑے مقابلے کے بعد مخالفین کے منہ بند ہو گئے داغ تقریباً اٹھارہ برس حیدرآباد میں رہے جہاں حضور نظام سے لیکر تمام اُمرا و رُوسا اُنکی عزت کرتے تھے اُن کی وجہ سے بازار شاعری جو شاہ نصیر کی وفات کے بعد کسی قدر سرد پڑ گیا تھا، پھر گرم ہو گیا۔ سیکڑوں شاگرد ان کے حیدرآباد میں ہو گئے اور مشاعرے کثرت سے ہونے لگے۔ داغ کے فروغ اور ترقی کی ایک خاص وجہ یہ بھی تھی کہ وہ ریاست کے سیاسیات سے بالکل الگ رہے اور نہ کسی پارٹی یا جماعت کی سازشوں میں کبھی شریک ہوے۔ اسی وجہ سے وہ وہاں بہت ہردلعزیز اور نہایت قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ اُن کے آخری زمانہ قیام حیدرآباد میں امیر مینائی بھی رامپور سے آگئے تھے۔ اور اُن ہی کے ساتھ رہتے تھے مگر قبل اسکے کہ حضور نظام کی حضوری حاصل ہو انتقال کر گئے۔ داغ بعارضہ فالج ۱۹۰۵ء میں حیدرآباد میں مرے اور وہیں دفن ہوئے۔

عام عادات و اخلاق نواب مرزا خاں داغ خوش طبع، رنگین مزاج، بذلہ سنج اور ہشاش بشاش تھے۔ مزاج میں خودداری تھی۔ خوشامد اور تملق سے دور رہتے تھے۔ کثیر الاحباب تھے اور اپنے سب احباب کے ساتھ نہایت شفقت و محبت سے پیش آتے تھے اپنے معاصر شعرا مثلاً جلال، امیر، تسلیم، ظہیر وغیرہ سے اُن کے تعلقات

بہت مخلصانہ اور دوستانہ تھے۔ رقابت پیشہ کی وجہ سے کبھی دوستی اور ملاقات میں فرق نہیں آیا۔ اُنھوں نے کبھی کسی کی ہجو نہیں کہی اور نہ کبھی اپنے مخالفین اور معترضین سے لڑے جھگڑے البتہ معاصرین سے کبھی کبھی شاعرانہ نوک جھوک رہتی تھی۔ بڑے رسا اور اسرار ذرائع ترقی سے واقف تھے اور یہی بڑی وجہ دربار نظام میں اُن کی ترقی کی تھی۔

داغ کی شاعری | داغ اپنے زمانہ کے بہت مشہور شاعر تھے۔ اُن کی زبان میں فصاحت و سادگی اور بیان میں ایک خاص قسم کی شوخی اور بانکپن ہے جسکی وجہ سے وہ اپنے معاصرین امیرؔ، جلالؔ، تسلیمؔ وغیرہ سے زیادہ مشہور ہوئے۔ اُن کا طرز عام پسند اور بہت دلچسپ ہے اسی وجہ سے اُن کے متبعین کثرت سے ہیں مشہور ہے کہ اُن کے شاگردوں کی تعداد پندرہ سو سے متجاوز ہے۔ یہی شہرت و عزت اور شاگردوں کی کثرت اُن کے جوہر ذاتی اور شاعرانہ قابلیت پر دال ہے " داغ نے ایک باضابطہ دفتر کھول دیا تھا جس کے کارکن بعض اُن کے شاگرد اور اکثر تنخواہ دار منشی بھی تھے۔ اِس دفتر میں اصلاح کلام کا کام جاری تھا۔

تصانیف | چار دیوان اُن سے یادگار ہیں۔ گلزار داغ۔ آفتاب داغ، مہتاب داغ، یادگار داغ۔ آخر الذکر یعنی یادگار داغ کا ایک ضمیمہ بھی ہے اور یہ ضمیمہ اور اصل دیوان دونوں اُنکی وفات کے بعد شایع ہوئے تھے۔ ایک مثنوی موسوم بہ فریاد داغ بھی لکھی ہے اِن کے علاوہ چند قصائد حضور نظام اور نواب صاحب رامپور کی تعریف میں، ایک پُرجوش شہر آشوب دلی کی تباہی پر، اور چند قطعات و رباعیات بھی اُن سے یادگار ہیں "گلزار داغ" اور "آفتاب داغ" دونوں رامپور میں چھپے تھے اور اِن میں زیادہ تر وہ

غزلیں ہیں جو رام پور کے مشاعروں میں امیر مینائی اور تسلیم وجلال وغیرہ کی ہم طرحی میں کہی گئی ہیں۔ اس زمانہ کے کلام میں انکی بے انتہا مشاقی اور نیز بڑی محنت و جانفشانی معلوم ہوتی ہے۔ مہتاب داغ اور یادگار داغ دکھن کی تصنیف ہیں ان میں بھی کلام کی روانی اور فصاحت جو اُن کا خاص انداز ہے خاص طور پر قابل تعریف ہے گلزار داغ جوانی کی تصنیف ہے۔ جب جذبات عشق و محبت محض خیالی نہ تھے بلکہ ذاتی تجربہ کا آئینہ تھے۔ آفتاب داغ بھی اسی زمانہ سے تعلق رکھتا ہے جسمیں واردات قلبیہ اور جذبات حقیقی کی اصلی تصویریں شاندار الفاظ میں کھینچی گئی ہیں۔ مگر برخلاف ان کے مہتاب داغ اس زمانہ کی تصنیف ہے جبکہ حرارت عشق و جوانی دھیمی اور ہلکی ہوکر ضیاے ماہتاب کے مانند نہایت خوشگوار ہوگئی ہے اور شباب کی ولولہ انگیزیاں اور ہنگامہ آرائیاں رخصت ہوکر اُن کی جگہ کہولت کی پختہ کاری اور سکون واطمینان نے لے لی ہے۔ مثنوی فریاد داغ میں اپنے عشق کا حال جو کلکتے کی ایک مشہور رنڈی منّی بائی حجاب کے ساتھ اُن کو تھا اور جو رامپور کا میلہ بنظیر دیکھنے کی غرض سے آئی تھی ایک شاعرانہ رنگ میں بیان کیا ہے۔ اِس مثنوی کے بہت سے اشعار نہایت اعلی درجہ کے ہیں اور سادگی اور روانی و عمدگی انکی قابل داد ہے علی الخصوص عاشق کا معشوق کی تصویر سے تخاطب نہایت دلکش انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ مگر بعض جگہ تعیش اور خراب جذبات کی تصویریں متانت اور تہذیب سے گری ہوئی ہیں۔ قصائد میں اُن کا مرتبہ بہت کم ہے یعنی سودا اور ذوق وغیرہ سے تو کوئی نسبت ہی نہیں ہمارے نزدیک امیر مینائی کے قصائد کو بھی وہ نہیں پہنچتے اُن میں کسی طرح کے بلند مضامین اور اعلی تخیل نہیں ہیں غزل گوئی کا رنگ اُن پر غالب ہے اور اکثر اشعار قصیدے کے نہیں بلکہ غزل کے

معلوم ہوتے ہیں اور مقررہ قواعد قصیدہ گوئی کے منافی ہیں۔ تشبیہ و استعارے میں بھی
کسی قسم کی جدت نہیں پائی جاتی اور ان میں بھی وہی عاشقانہ رنگ جھلکتا ہے۔
انکی رباعیات کا بھی یہی حال ہے یعنی بجائے ادب و اخلاق وغیرہ سکھانے کے
اُن کے مضامین زیادہ تر عاشقانہ ہی ہیں البتہ تاریخیں بہت اچھی اور اُستادانہ کہی ہیں

طرز کلام داغ کی عظمت ان تین چیزوں پر موقوف ہے یعنی (۱) اُنکی شہرت عام
(۲) اُن کا طرز خاص (۳) وہ خدمات جو اُنھوں نے زبان کے ساتھ انجام دی ہیں
داغ میٹھی، سُریلی اور عاشقانہ شاعری کے مسلم الثبوت اُستاد ہیں۔ اُن کی سب سے بڑی
خصوصیت یہ ہے کہ پیچیدہ اور گنجلک ترکیبوں اور موٹے موٹے غیر مانوس فارسی اور
عربی الفاظ کو اُنھوں نے اپنے کلام میں جگہ نہیں دی اسی سے اُن کا کلام تصنع اور
تکلف سے خالی ہے۔ الفاظ نہایت سادہ اور معمولی۔ ترکیبیں سیدھی سادی اور
درست۔ بندش نہایت چست۔ شعر کی ظاہری زیب و زینت یعنی صنائع بدائع کی
کثرت اور دور دراز کار تشبیہوں اور مبالغہ اور حشو و زوائد سے بھی اُن کا کلام پاک ہے۔
اشعار بالکل تلے نپے زوردار اور مؤثر ہوتے ہیں۔ کلام میں زندگی اور چونچالی پائی جاتی
ہے۔ ان کا کلام مختلف مضامین سے مملو اور غزل کے جسقدر موضوع ہیں اُن سب
پر حاوی ہوتا ہے کہیں شوخ حاضر جوابی، کہیں ظریفانہ بذلہ سنجی، کہیں کسی واعظ پر
چوٹ کی ہے، کہیں کسی زاہد کی داڑھی کھسوٹی ہے، کسی جگہ معاملہ بندی میں
نیاز عاشقانہ اور ناز معشوقانہ کے بے مثل مرقعے کھینچے ہیں کسی مقام پر ہجر کی حرماں نصیبیوں
کا ذکر ہے کسی موقعہ پر رقیبوں کی عیاریوں اور سازشوں کا بیان ہے غرضکہ اشعار
کسی نہ کسی جذبۂ انسانی کے سچے فوٹو ہیں اور چونکہ ان جذبات کا اظہار نہایت سلیس

اور عام فہم عبارت میں ہوتا ہے اس لیے وہ دلوں پر ہمیشہ تیر و نشتر کا کام دیتے ہیں
اُن کے اکثر اشعار میں جرأت کی معاملہ بندی اور رند کی صفائی ملی جلی معلوم ہوتی ہے
اور خوبی محاورہ اور لطافت زبان اُس پر طرّہ۔ اُن کا رنگ اُن کے زمانے میں اسقدر
مقبول ہوا کہ سیکڑوں پیرو اور ناقل اُن کے پیدا ہو گئے یہاں تک کہ اُن کے
بڑے حریف مقابل منشی امیر احمد مینائی نے بھی اپنے دوسرے دیوان میں زیادہ تر اُن ہی
کا رنگ اختیار کیا۔

کلام پر اعتراض زیادتی شہرت بعض وقت الزام و اعتراض کا باعث ہوتی ہے
داغ پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ وہ ارباب نشاط کے شاعر تھے اور اُن کے شعار
مہیج اور مخرب اخلاق ہوتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ بڑی زیادتی ہے اس وجہ سے
کہ اُن کے سیکڑوں بلکہ ہزاروں شعر ایسے نکلیں گے جن میں خیالات نہایت پاک و صاف
اور بہت بلند ہیں۔ اُن کی ہر چیز کھوٹی نہیں ہے بلکہ اسی زر اندود کلام میں سونے کے
ریزے بھی بہت ہیں۔ مگر اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اُن کے یہاں اصلیت
(اور یجیلٹی) اور متانت بہت کم ہے۔ فلسفہ اُن کے کلام میں مطلق نہیں نہ کسی اعلیٰ
خیال کی شرح و بسط ہے۔ فلسفۂ حیات اور فلسفۂ عشق سے وہ بہت کم تعلق رکھتے
ہیں۔ جس عشق کا وہ بیان کرتے ہیں اُس میں بھی کوئی عظمت کوئی سچائی اور حقیقی
حُسن کی جلوہ گری نہیں ہے۔ اُن کے معشوق اکثر معشوق بازاری ہیں جو اپنے حُسن
اور ناز و انداز کو سر راہ لیکر بیٹھتے ہیں۔ جن کا بوس و کنار اور اختلاط مثل اشیاء بازاری
کے خریدا اور بیچا جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اُن کے بعض اشعار مہذب کانوں
کے سُننے کے لائق نہیں ہوتے اور صرف ایسی محفلوں میں گائے جا سکتے ہیں جہاں ندائے قدح خوار

جمع ہوں اور ارباب نشاط کے جمگھٹے ہوں۔ ظاہر ہے کہ ایسے اشعار میں عشق و عاشقی کے صرف سطحی جذبات ہوتے ہیں اور ان سے قلب کے اندرونی پردے متأثر نہیں ہوتے اور نہ اُن کے سمجھنے میں جولانی خیال کا موقع ملتا ہے۔ داغ کے اشعار صرف ایسے عشق سے تعلق رکھتے ہیں جسکو خلوص اور روحانیت سے کوئی تعلق نہیں۔ نہ اُنمیں میر کا ایسا درد و اثر ہے نہ غالب کی سی معنی آفرینی و نازک خیالی۔ اُنکی تشبیہات بھی نادر اور عالی نہیں بلکہ وہی معمولی اور پامال تشبیہیں ہیں جنکو سُنتے سُنتے کان تھک گئے ہیں اُن میں جدّت اور ندرت مطلق نہیں ان کی مثنوی (فریاد داغ) میں تو ایک معشوق بازاری کے عشق کا حال ہے جسمیں کوئی بلند "آئیڈیل" مطلق نہیں۔

مگر بایں ہمہ وہ ایک بلند مرتبہ شاعر ضرور ہیں اور اُن کی زبان کے ساتھ اس خدمت کی ضرور قدر کرنا چاہیے کہ اُنھوں نے سخت اور مغلق الفاظ ترک کیے۔ اور سیدھے سادے شیریں الفاظ اور محاورے اپنے کلام میں استعمال کیے جس سے کلام کی بے ساختگی اور فصاحت اور بڑھ گئی۔ یہ بھی اُن کا کمال ہے کہ طویل اور مشکل بحریں سریلے اور میٹھے الفاظ میں لکھیں چسپت اور برجستہ اور نہایت فصیح اور بے حشو و زوائد اشعار نکالے۔ غرضکہ انھی سب خوبیوں کی وجہ سے اور نیز اس وجہ سے کہ اُن کو اکثر مشہور و معروف لوگوں کی اُستادی کا فخر حاصل ہے ان کا مرتبہ شعرائے متأخرین میں بہت بلند ہے۔ تغزل میں داغ کی شاعری کا اعتراف سب نے کیا ہے۔ حالی لکھتے ہیں ؎

داغ و مجروح کو سُن لو کہ پھر اس گلشن میں
نہ سُنے گا کوئی بُلبل کا ترانہ ہرگز

اقبال نے بھی ایک پر زور مرثیہ اُنکی نسبت لکھا ہے - اُن کے حریف و معاصر امیر مینائی کا صحیح معنوں میں کوئی مدمقابل اگر ہے تو یہی ہیں -

شاگرد

شاگردوں کی فہرست بہت طولانی ہے جن میں سے چند نام جو بہت مشہور ہیں یہاں لکھے جاتے ہیں :- اعلیحضرت حضور نظام حیدرآباد خُلد آشیاں یعنی نواب میر محبوب علیخاں متخلص بہ آصف - ڈاکٹر سر محمد اقبال - سایل دہلوی - بیخود دہلوی احسن مارہروی - بیخود بدایونی - نوح ناروی - نسیم بھرتپوری - جگر مرادآبادی - آغا شاعر دہلوی وغیرہم -

امیر و داغ کا مُقابلہ

یہ مقابلہ بھی اُسی قبیل سے سمجھنا چاہیے جیسا کہ میر و مرزا کا مقابلہ اُن کے حالات میں لکھا گیا ہے - امیر اور داغ دونوں اپنے اپنے رنگ میں مسلم الثبوت اُستاد مانے گئے ہیں - دونوں بزرگوار اپنے زمانہ کے بہت بڑے غزال تھے اور اکثر ہمطرح غزلوں پر طبع آزمائی کرتے تھے - دونوں نے ماشاءاللہ بکثرت شاگرد پائے اور دونوں کا حلقۂ احباب وسیع تھا - اخلاق و عادات کے اعتبار سے دونوں وسیع الاخلاق دوست پرست اور حلیم الطبع تھے - دونوں ذکی الطبع اور ذہین اور شاعری کے دلدادہ تھے - داغ کو امیر پر اس معنی میں فوقیت ہے کہ دنیاوی جاہ و جلال اور مرفہ الحالی کے اعتبار سے اپنے آخر زمانہ میں وہ اُن سے بڑھ گئے - اسی کا نتیجہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اُن کو امیر سے زیادہ شہرت بھی حاصل ہوئی - داغ کا کلام مطبوع عام و پسندیدۂ انام ہے جس طرح اُس سے عالم و فاضل اور شاعر محظوظ ہو سکتے ہیں اُسی طرح اُسکو پڑھکر یا دوسرے سے سُنکر ایک عامی بھی اُس سے لُطف اُٹھاتا ہے - مگر صاحب ذوق جو قوت ممیزہ سے

کلام لیتے ہیں اور جنکو داغ کے سطحی اور معمولی اشعار پسند نہیں آتے اُن کو امیر ہی کا کلام اچھا معلوم ہوتا ہے کیونکہ اُسمیں متانت و تہذیب کے ساتھ بلند خیالی بھی ہے اور وہ ضروریات شعریہ کو بھی پورا کرتا ہے مگر اصل یہ ہے جیساکہ ہم اوپر کہہ آئے ہیں کہ کلام کا فرق در اصل کلیم کا فرق ہے۔ خود شاعر کے مزاج ماحول اور افتاد طبیعت کو اُس کے کلام میں بڑا دخل ہوتا ہے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ داغ ایک بڑے زندہ دل زندمشرب شخص تھے اُن کا مزاج پارہ کی خاصیت رکھتا تھا پھر اُنکی نشوونما دلی کی شاعرانہ فضا میں ہوئی تھی۔ برخلاف اِس کے منشی صاحب ایک مولوی مَنش تقدس مآب بزرگ تھے لکھنؤ میں پیدا ہوے اور وہیں عرصہ تک رہے۔ دامنِ سلطنت سے وابستہ ہونے کی وجہ سے اُس عہد کے شعرائے شاہی سے بھی گاڑھا دوستانہ رکھتے تھے اسیر اُن کے اُستاد اور برق، صبا، بحر، قلق، وغیرہ اُنکے یار تھے۔ پس اُن لوگوں کے اثر اور نیز اُن کے طرز سے وہ کیسے بچ سکتے تھے۔ وہ اُس زمانہ کے رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے اور یہی حالت اُن کی برابر رہی یہاں تک کہ قیام رامپور اور داغ وغیرہ کی صحبت نے اُن کا پُرانا رنگ ایک حد تک زائل کردیا۔ منشی صاحب کا اوائل عمر کا جسقدر کلام ہے وہ ناسخ اور شاگردان ناسخ کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ چنانچہ اُن کا پہلا دیوان "مرآۃ الغیب" اِس دعوے کی بڑی دلیل ہے۔ اُسمیں اگر کہیں کہیں عمدہ اشعار ملتے ہیں تو اُن کے ساتھ ہی ساتھ رکیک و مبتذل خیالات بھدی اور بیہودہ تشبیہیں، انگیا کرتی، کنگھی چوٹی وغیرہ نامناسب رعایت لفظی کی بھی بھرمار ہے۔ دیوان مذکور اگرچہ لائق مصنف کی اُستادی اور قدرتِ کلام کا پتہ دیتا ہے مگر پھر بھی ناہمواری مندرجۂ بالا سے مملو ہے۔ داغ کا رنگ اگرچہ

دلّی میں قائم ہوا مگر اُنھوں نے اُسمیں کچھ جدت پیدا کرکے اپنا ایک خاص طرز بنالیا۔ یعنی جرأت کی معاملہ بندی کو آتش کی صفائی زبان اور محاورہ گوئی کے ساتھ سمو دیا اور اسی سے وہ چیز پیدا ہوگئی جو داغ کا طرز خاص کہلاتا ہے یعنی روزمرّہ اور زبان، محاورات کا برمحل استعمال، لفظوں کی نشست و ترتیب اور خیالات کی دلنشینی، اِن کے اشعار کا ظاہری یا خارجی حصہ تو بہت اچھا ہوتا ہے مگر داخلی یا معنوی حصّہ بہت سطحی ہے۔ اُن کا کلام لوگوں کو بہت پسند آیا کیونکہ اُن کے مذاق کے موافق تھا اور یہی بہت بڑا راز اُن کی شہرت و کامیابی کا ہے۔ منشی صاحب نے داغ کے رنگ کی مقبولیت اور اپنی شہرت کے مٹ جانے کے خیال سے اُنھیں کا رنگ اختیار کیا۔ اور ہرچند یہ صحیح ہے کہ اس تبدیل رنگ کی وجہ سے اُن کے مابعد کے کلام میں بیشتر سے بہت زیادہ صفائی اور روانی پیدا ہوگئی مگر پھر بھی وہ داغ تک نہ پہونچ سکے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ میں وہ اُن سے کم رہے اسی وجہ سے اُن کا دوسرا دیوان "صنمخانۂ عشق" "گلزار داغ" سے اگر وہ داغ کے طرز کے اعتبار سے دیکھا جائے تو بہت کم ہے۔ بہرحال یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ منشی صاحب نے یہ کیا کم کمال کیا کہ اپنے طرز قدیم کو چھوڑ کر طرز جدید میں اچھی خاصی کامیابی حاصل کرلی۔

اگر ایک بلند نقطۂ نظر سے اِن دونوں اُستادوں کی شاعری کو دیکھا جائے تو یہ ماننا پڑیگا کہ وہ حقیقی شعریت اور آتش الہامی جو قدیم استادوں کے یہاں پائی جاتی ہے ان دونوں کے یہاں بہت کم ہے۔ مگر باینہمہ باعتبار شکوہ الفاظ اور متانت اور نازک خیالی کے امیر کو داغ پر فوقیت حاصل ہے عروض اور ضروریات شعری

کے اعتبار سے امیر بہت بڑے اُستاد تھے اُن کے کلام میں اس قسم کے سقم شاذونادر ہی ملینگے۔ اور قصیدہ گوئی میں تو وہ داغ سے یقیناً بہتر ہیں۔ داغ کو اس صنفِ خاص سے زیادہ لگاؤ نہ تھا۔ گوکہ اُن کے معتقدین اس بارہ میں بھی اُنکی فضیلت کے قائل ہیں حقیقت یہ ہے کہ داغ ایک بہت بڑے غزل گو اور ایک طرزِ خاص کے موجد تھے اور یہی اُن کی شہرت کا باعث کہا جاسکتا ہے۔ منشی صاحب جامع الکمالات تھے۔ شاعر کے علاوہ وہ بہت بڑے نثار اور ناقد بھی تھے اور علمی قابلیت تو داغ سے یقینی بہت بڑھی رکھتے تھے "امیر اللغات" اور اُن کے وہ خطوط جنمیں اُنھوں نے اکثر نہایت پیچیدہ نکات ادبیہ حل کیے ہیں اُن کی قابلیت اور تلاش کے شاہد عادل ہیں۔ قصیدہ میں وہ سودا اور ذوق کے ہم پلہ کہے جاسکتے ہیں۔ البتہ ظہیر دہلوی شاگرد ذوق اس صنف میں اُن کے قریب قریب ہیں۔ اِن دونوں میں یہ بھی ایک بہت بڑا فرق ہے کہ امتداد زمانہ کے ساتھ منشی صاحب کی شاعری ترقی کرتی رہی اور داغ کا رنگ آخر عُمر میں کچھ ہلکا ہوگیا تھا۔ اُن کا بہترین زمانہ اُن کے قیام رامپور کا زمانہ کہا جاسکتا ہے جب سے کہ وہ حیدرآباد گئے اور وہاں ثروت و عیش اُن کو نصیب ہوا شاعرانہ جگرکاوی اور محنت کے وہ عادی نہ رہے۔ مگر سچ یہ ہے کہ آخری فیصلہ کن چیز اس معاملہ میں نقاد کا رنگ طبیعت اور رُجحان مذاق ہے۔

داغ کا کلام اسقدر مقبول اور مشہور ہے کہ اُس کا کچھ انتخاب دینا ایک فعلِ عبث معلوم ہوتا ہے مگر پھر بھی چند اشعار بطور نمونہ کے یہاں پیش کیے جاتے ہیں تاکہ ناظرین اُن سے لُطف اُٹھائیں۔

خدا کریم ہے یوں تو مگر ہے اتنا رشک
کہ میرے عشق سے پہلے تجھے جمال دیا

آج راہی جہاں سے داغ ہوا
خانۂ عشق بے چراغ ہوا

ڈر گئے نام شفا سنکے نہ ہے خواہش مرگ
منہ ذرا سا نکل آیا ترے بیماروں کا

جو عاشقی ہیں خاک ہوا کیمیا ہوا
کہتا تھا آج خاک میں کوئی ملا ہوا

وائے غفلت کہ اب کیا ہم نے
جو ہمیں پہلے کام کرنا تھا

جو ہو سکتا ہے اس سے وہ کسی سے ہو نہیں سکتا
مگر دیکھو تو پھر کچھ آدمی سے ہو نہیں سکتا

کچھ آگے داور محشر سے ہے اُمید مجھے
کچھ آپ نے مرے کہنے کا اعتبار کیا

لطف فرما جو وہ رہتا تو ٹھکانا ہی نہ تھا
عین حکمت تھی وہ کافر جو دل آزار رہا

خاطر سے یا لحاظ سے میں مان تو گیا
جھوٹی قسم سے آپکا ایمان تو گیا

دیکھا ہی بتکدہ میں جو ای شیخ کچھ نہ پوچھ
ایمان کی تو یہ ہے کہ ایمان تو گیا

وعدے پہ مرے اُنکے قیامت کی ہی تکرار
اور بات ہی اتنی کہ اُدھر کل ہی اِدھر آج

کل تاب فغاں بھی تو یہ تاثیر کہاں تھی
کیا کیا لب خاموش پہ قرباں ہی اثر آج

میخانے کے قریب تھی مسجد بھلے کو داغ
ہر شخص پوچھتا تھا کہ حضرت ادھر کہاں

آنکھ پڑتی ہے کہیں پاؤں کہیں پڑتا ہی
سب کی ہی تمکو خبر اپنی خبر کچھ بھی نہیں

کیسا جواب حضرت دل دیکھئے ذرا
پیغامبر کے ہاتھ میں ٹکڑے زباں کے ہیں

لطف مے تجھ سے کیا کہوں زاہد
ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں

اُڑ گئی یوں وفا زمانے سے
کبھی گویا کسی میں تھی ہی نہیں

بظاہر رہنما ہیں اور دل میں بدگمانی ہی
ترے کوچہ میں جو جاتا ہی آگے ہم بھی ہوتے ہیں

جو کہتا ہوں کہ مرتا ہوں تو فرماتے ہیں مر جاؤ
جو غش آتا ہے مجھ پر تو ہزاروں دم بھی ہوتے ہیں

رخ روشن کے آگے شمع رکھکر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے

مریض عشق کی کیا پوچھتے ہو یہ پوچھو
کہ زندہ کوئی بھی تیماردار باقی ہے

گرے ہوتے اُلجھ کر آستاں سے
چلے آتے ہو گھبرائے کہاں سے

ہر دل میں نئی طرح سے ہے یاد کسی کی
ملتی نہیں فریاد سے فریاد کسی کی

مَے پی تو سہی توبہ بھی ہو جائے گی زاہد
کمبخت قیامت ابھی آئی نہیں جاتی

یاد سب کچھ ہیں مجھے ہجر کے صدمے ظالم
بھول جاتا ہوں مگر دیکھ کے صورت تیری

اُردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

جلال لکھنوی
سنہ ۱۲۵۰ھ تا سنہ ۱۳۲۵ھ

حکیم سید ضامن علی جلال حکیم اصغر علی داستان گو کے بیٹے تھے لکھنؤ میں سنہ ۱۲۵۰ھ میں پیدا ہوئے کتب درسیہ فارسی وعربی سے نواب آصف الدولہ کے مدرسے میں فراغت حاصل کرکے اپنے آبائی پیشۂ طبابت کی تکمیل کیطرف توجہ کی۔ زمانے کے رنگ کے موافق اُن کو شعر و سخن کا شوق بچپنے ہی میں پیدا ہو گیا تھا اور کچھ دنوں بعد اس میں اسقدر محو ہو گئے کہ بجائے حکمت کے شاعری کو اپنا مستقل فن قرار دیا۔ ابتدا میں امیر علی خاں ہلال سے اصلاح لیتے تھے۔ جب کلام میں کچھ پختگی آگئی تو اُنھیں کے توسط سے اُن کے استاد رشک کے شاگرد ہو گئے۔ رشک اُس زمانے میں ایک خاص شہرت رکھتے تھے وہ ناسخ کے بہت ممتاز شاگردوں میں تھے اور اُستاد اسقدر ان کا خیال کرتے تھے کہ جو غزلیں اصلاح کے واسطے اُن کے پاس آتیں وہ اُن کو بنظر اصلاح رشک کے حوالے کرتے۔ جب رشک سفر عراق پر روانہ ہونے لگے تو اُنھوں نے نوجوان جلال کو

نواب فتح الدولہ برق کے سپرد کیا جن کی شاعری کا اس زمانہ میں بڑا زور و شور تھا روزانہ مشاعرے منعقد ہوتے جن میں بڑے بڑے اساتذۂ وقت مثل بحر، سحر، اسیر، امیر، قلق وغیرہ کے شریک ہوتے تھے جلال بھی ان مشاعروں میں بے تکلف جاتے اور اُستادوں کے کلام کو سُنتے اور خود اپنی غزلیں سُناتے۔ غدر ۱۸۵۷ء نے ان صحبتوں کو درہم و برہم کر دیا اور شعرا کو بجائے شعر کی تخیل کے اب اپنے پیٹ کا خیال پیدا ہوا۔ اِسی زمانہ میں اور انھیں افکار کی بدولت جلال نے ایک دواخانہ شہر لکھنؤ میں ایک شخص بخشی نند رائے کے مکان میں کھول لیا تھا جو اُنکے والد کے دوستوں میں تھے اور شاعر بھی تھے۔ مگر اس شغل میں بھی وہ اپنی محبوب شاعری کو کبھی نہیں بھولے اور اس میں بھی اُنکی مشق برابر جاری رہی۔ بالآخر نواب یوسف علیخاں والی رامپور کی قدردانی نے اُن کو رامپور گھسیٹ بُلایا جہاں اُن کے والد داستان گویوں میں ملازم تھے۔ تھوڑے عرصہ بعد جب نواب کا انتقال ہوا اور والی ریاست نواب کلب علیخاں ہوئے تو اُنھوں نے حکیم صاحب کو مشاہرہ سو روپیہ ماہوار ملازم رکھ لیا۔ حکیم صاحب اپنی تنک مزاجی اور نازک دماغی کی بدولت کئی مرتبہ ملازمت سے کنارہ کش ہوئے مگر نواب صاحب کی قدردانیوں اور فیاضیوں نے کبھی اُن کو رامپور سے ترک تعلق نہ کرنے دیا۔ وہ تقریباً بیس سال رامپور میں رہے اور برابر مشاعروں میں شریک ہوتے رہے جہاں اُن کے معاصر اور حریف نواب مرزا خاں داغ، منشی امیر اللہ تسلیم اور منشی امیر احمد مینائی بھی شریک ہوتے تھے۔ اس زمانے کی ان چاروں اُستادوں کی غزلیں جو اکثر ہم طرح ہوتی تھیں خالی از لطف نہیں ہیں کیونکہ اُن سے تقابلِ کلام کا اور ہر ایک شاعر کا رنگ طبیعت دریافت کرنے کا بہت اچھا موقع ملتا ہے۔

نواب کلب علیخاں بہادر کے انتقال اور کونسل آف ریجنسی کے قائم ہونے سے یہ پرلطف صحبتیں بھی قائم نہ رہ سکیں اور شعراسب تتر بتر ہوگئے حسن اتفاق یہ کہ ایک چھوٹی سی ریاست منگرول واقع کاٹھیاوار کے رئیس بااختیار نواب حسین میاں نے جن کو شعر کی قدردانی اور شعرا کی سرپرستی کا بڑا فخر حاصل ہے، حکیم صاحب کو اپنے یہاں طلب کرلیا، مگر وہاں بوجہ دوری اور ناموافقت آب وہوا وہ عرصہ تک نہ رہ سکے چندہی دن میں اپنے وطن مالوف لکھنؤ میں واپس آگئے جہاں نواب صاحب موصوف اُن کو پچیس روپیہ ماہوار اور مبلغ سو روپیہ ہر قصیدے کا صلہ جو وہ اُن کی خدمت میں بھیجتے تھے برابر عنایت کرتے رہے۔ آخر عمر میں حکیم صاحب کا سوائے شعروشاعری اور صلاح کے کوئی اور مشغلہ نہ تھا بعمر چھہتر سال بتاریخ ۲۔ اکتوبر سنہ ۱۹۰۹ء انتقال کیا۔

تصانیف تصانیف حسب ذیل موجود ہیں :-

(۱) چار دیوان"۔

(۲) "سرمایۂ زبان اُردو" جو محاورات و اصطلاحات زبان اُردو کی ایک مبسوط کتاب ہے۔

(۳) "افادۂ تاریخ" فن تاریخ گوئی پر ایک چھوٹا سا رسالہ ہے۔

(۴) "منتخب القواعد" اسمیں اکثر ہندی الفاظ کی اصل بتائی ہے اور مفرد و مرکب الفاظ کی تحقیق کی ہے۔

(۵ و ۶) دو لغات زبان اُردو کے موسوم بہ "تنقیح اللغات" و "گلشن فیض"۔

(۷) "رسالہ دستور الفصحا" جو فن عروض پر ایک مختصر رسالہ ہے۔

ڈاکٹر سر محمد اقبال پی-ایچ-ڈی

(۸) "مفید الشعرا" ایک رسالہ درباب تحقیق تذکیر و تانیث۔

فہرست مذکورۂ بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کو تحقیق زبان کے ساتھ بڑا شغف تھا اور مثل اپنے اُستاد رشک کے اُنھوں نے بھی اکثر رسالے اور لغات زبان اُردو کے الفاظ و محاورات و اصطلاحات کے متعلق تصنیف کئے بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ جس کام کو رشک نے شروع کیا تھا اُس کو اُنھوں نے درجۂ تکمیل کو پہونچایا۔ ہر چند کہ اُن کی یہ تصانیف ایک ابتدائی صورت میں ہیں اور اُن کے بعد اب بڑی بڑی کتابیں اسی موضوع میں نہایت شرح و بسط اور زیادہ تفصیل و تنقید کے ساتھ لکھی گئی ہیں مگر پھر بھی جلال کی خدمات کا اعتراف کرنا چاہیے۔ اُن کو بچپن سے صحبت و تکرار اور بحث و مباحثہ کا شوق تھا۔ چنانچہ اُس زمانے میں بھی وہ اساتذۂ وقت کے اسقام سے چشم پوشی نہیں کر سکتے تھے۔ بے تکلف اُن کی غلطیاں اُن کے مُنھ پر کہہ دیتے تھے۔ اور یہ عادت اُن کی آخر عُمر تک باقی رہی اسکی وجہ سے اُن سے اور اُن کے معاصرین سے معرکۃ الآرا مُناظرے اور مباحثے اس معاملہ میں ہوتے رہے۔

مزاج کی کیفیت کہا جاتا ہے کہ جلال ایک مغرور و مُتکبّر اور ہمچو من دیگرے نیست کے خیال کے آدمی تھے۔ مشہور ہے کہ وہ اکثر مشاعروں میں صرف اس وجہ سے شرکت نہیں کرتے تھے کہ غرور سخن اُن کو اسکی اجازت نہیں دیتا تھا۔ اپنے زمانے کے اکابر شعرا تک سے ملنے میں اُن کو عار تھا۔ دوسروں کے اشعار کی تعریف کرنے کی اُنھوں نے قسم کھائی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا حقارت آمیز برتاؤ جھگڑے اور فساد کا باعث ہوا کرتا ہے چنانچہ تسلیم کے ایک شاگرد ظہیر احسن شوق نیموی نے

دو کتابیں لکھ ڈالیں جس میں کہ جلال کی خوب خبر لیگئی اور اُن کے کلام کی غلطیاں نکالی گئیں اور اُن پر صدہا اعتراض وارد کئے گئے مگر حق یہ ہے کہ جلال اپنے شاگردوں اور دوستوں سے بہت اچھی طرح پیش آتے تھے اور دوسروں کے کلام کی اصلاح بہت محنت اور محبت سے دیتے تھے۔

خصوصیات کلام جلال کو طرز لکھنؤ کا آخری متبع سمجھنا چاہیئے۔ وہ قدیم اساتذہ لکھنؤ کے قدم بقدم چلتے تھے اور اس شاہراہ عام سے کبھی ہٹنا نہیں چاہتے تھے۔ ان کے متعدد دیوانوں میں کسی قسم کی دلآویزی اور خصوصیت اور ما بہ الامتیاز کوئی شے نہیں ہے۔ البتہ زبان میں تصنع بہت کم اور بے عیب ہے۔ پھڑکتے ہوے اشعار کہیں کہیں نکلتے ہیں۔ مگر عام طور پر کلام بے نمک اور معمولی ہے۔ جذبات یا انعکاس کا اسمیں کہیں پتہ نہیں۔ خیال آفرینی کم ہے۔ اکثر وہی معمولی معمولی باتیں ہیں۔ اور بعض اشعار تو اُنکی اُستادی کے درجہ سے بہت گرے ہوے ہیں مگر اسمیں بھی شک نہیں کہ کنگھی چوٹی اور عورتوں کی زیب و زینت کے مضامین جو قدیم طرز لکھنؤ کا مایۂ ناز تھے اُن کے یہاں نہیں پائے جاتے۔ اس کے علاوہ صحت الفاظ کا بھی اُن کو بڑا خیال رہتا ہے اور کلام تعقید اور نامناسب الفاظ سے پاک ہوتا ہے۔ جلال اپنے آپ کو صحت الفاظ و محاورہ کا بادشاہ سمجھتے تھے بہت پُر گو تھے۔ اور شاید یہ پُر گوئی ہی بدمزگی کلام کا باعث ہو۔ مشہور ہے کہ بیس پچیس غزلوں کی اصلاح اور تین چار غزلوں کی تصنیف اُن کا روزمرّہ کا معمول تھا۔ چنانچہ اُس زمانہ کے گلدستے اُنکی اور اُن کے شاگردوں کی غزلوں سے بھرے رہتے تھے۔ مختصر یہ کہ وہ کلام کے بہت اچھے ناقد تھے

اور اُردو کے دوسرے درجہ کے شعرا میں اُنکا پایہ بلند ہے ۔

شاگرد اِن کے مشہور شاگردوں میں اشخاص ذیل قابل ذکر ہیں ۔یعنی خود اُن کے بیٹے کمال جو ریاست رامپور میں ملازم تھے اور اب انتقال ہو گیا ۔میرزا ذاکر حسین ثاقب اور اُن کے صاحبزادے آرزو ۔ احسان شاہجہانپوری اور سردار اودھم سنگھ ۔

آرزو سید انور حسین صاحب لکھنوی آرزو تخلص خلف سید ذاکر حسین یاس مثل اپنے والد کے جلال کے شاگرد ہیں ۔لکھنؤ کے بہت نامور شاعروں میں ہیں ۔ اور کمال کے انتقال کے بعد جلال کے جانشین یہی سمجھے جاتے ہیں ۔پہلے اُمید تخلص کرتے تھے اب آرزو کرتے ہیں ۔فن عروض میں اُنکو پوری دستگاہ حاصل ہے اور تمام اصناف سخن میں شعر کہنے پر قادر ہیں ۔مرثیے بھی کہے ہیں اور ڈرامانویسی کا شوق ہے ۔گو کہ لکھنؤ کے باشندے ہیں مگر طرز دلّی والوں کا ہے ۔آرزو کا کلام ان کے اُستاد جلال کے رنگ کا بہت اچھا نمونہ ہے جبکہ اُنھوں نے اپنے طرز کو دلّی کے رنگ میں سمو دیا تھا ۔ان کے کلام میں سادگی اور روانی اور حلاوت اور جذبات سب کچھ موجود ہے ۔ موجودہ شعرائے لکھنؤ میں بلند پایہ رکھتے ہیں ۔

احسان اِحسان علیخاں نام احسان تخلص قاسم علیخاں کے صاحبزادہ ہیں سنہ ۱۲۷۶ھ میں بمقام اوڈلہ ضلع بریلی پیدا ہوئے اسکے بعد ان کے والدین شاہجہانپور چلے گئے جہاں اُنکی تعلیم و تربیت ہوئی ۔سولہ برس کی عمر سے اُن کو شعر کہنے کا شوق ہوا ۔ابتدائی کلام حافظ نثار احمد خاں تائب کو دکھاتے تھے سنہ ۱۸۸۰ء میں جلال کے شاگرد ہوئے سنہ ۱۸۸۲ء میں محکمۂ بندوبست گورکھپور میں سرکاری

ملازمت پائی اور بعد کو قانون گوئی منصرمی اور پیشکاری کے عہدوں پر فائز ہوئے سنہ ۱۸۹۰ء میں ملازمت چھوڑ کر مختاری کا امتحان دیا اور شاہجہاں پور میں کام شروع کیا۔ سنہ ۱۸۹۶ء میں ایک گلدستہ موسوم "بہ گلدستۂ ارمغان" نکالا جو کچھ عرصہ کے بعد بند ہو گیا۔ سنہ ۱۸۹۳ء میں اُن کا پہلا دیوان "خمکدۂ خیال" چھپا تھا۔ اِس کے علاوہ کچھ اور کتابیں بھی اُن کی تصنیف سے ہیں۔ سنہ ۱۸۹۱ء میں منگرول اور وہاں سے حیدرآباد گئے تھے۔ احسان ایک خوشگو شاعر ہیں مگر کوئی خصوصیت اُن کے کلام میں نہیں پائی جاتی۔ جلال کے مشہور شاگردوں میں ہیں۔

تسلیم سنہ ۱۸۲۰ء تا سنہ ۱۹۱۱ء

قصر شاعری رام پور کے چوتھے رکن منشی امیر اللہ تسلیم تھے سنہ ۱۸۲۰ء میں بمقام منگلسی جو نواح فیض آباد میں ایک گاؤں ہے پیدا ہوئے اِن کے والد مولوی عبد الصمد پہلے بدو سرائے میں جو دریاآباد کے قریب واقع ہے قیام کرتے تھے۔ بعد کو فیض آباد چلے آئے اور وہیں توطن اختیار کیا۔ تھوڑے عرصہ کے بعد لکھنؤ آ گئے اور محمد علی شاہ کے عہد میں صیغۂ فوج میں بمشاہرہ تیس روپیہ ماہوار ملازمت کر لی۔ تسلیم بھی بچپنے میں اپنے باپ کے ساتھ فوج میں داخل ہوئے تھے اور اُنکی علیحدگی کے بعد اُن کے عہدے پر فائز ہوئے۔ فارسی و عربی کی تعلیم خود اپنے والد سے اور مولوی شہاب الدین اور مولوی سلامت اللہ رام پوری سے حاصل کی تھی۔ فن خوشنویسی[1] کے اُستاد تھے اور مطبع منشی نولکشور لکھنؤ میں بمشاہرہ بیس[2] روپیہ ماہوار ملازم تھے شعر و سخن میں وہ نسیم دہلوی کے شاگرد تھے۔ اور طرزِ دہلی کے تتبع پر بڑا فخر کرتے تھے چنانچہ کہتے ہیں ؎

---

[1] راقم الحروف نے بھی فن خوشنویسی میں چند روز آپ سے استفاضہ کیا ہے ۱۲ مترجم

حضرت جلال لکھنوی مرحوم

منشي اميرالله تسليم لكهنوي
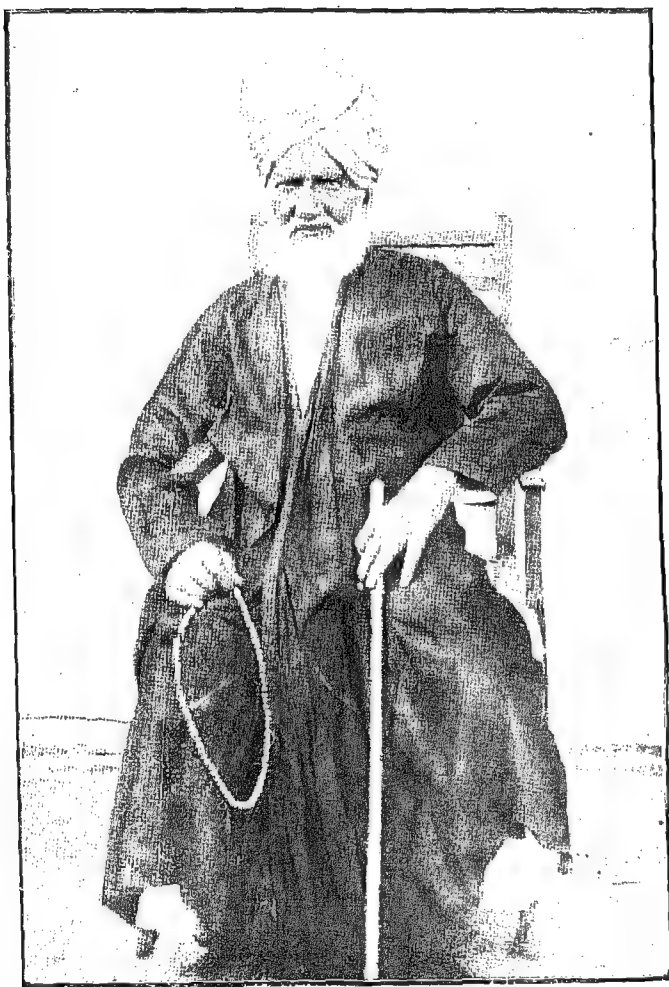
میں ہوں اے تسلیم شاگردِ نسیمِ دہلوی
مجھکو طرزِ شاعرانِ لکھنؤ سے کیا غرض

تھوڑے عرصہ کے بعد واجد علی شاہ کے زمانہ میں جب ان کی پلٹن توڑ دی گئی تو یہ بیکار ہو گئے۔ اُنھوں نے ایک منظوم عرضداشت اپنے ہاتھ سے خوشخط لکھکر مقبول الدولہ مرزا مہدی علیخاں قبول شاگردِ ناسخ کی وساطت سے پیش کی۔ بادشاہ نے دیکھا اور اُسپر یہ حکم لکھا ؎

بشنو ای خوشنویس و ای خوش گو	ہر دو فن میکنی و ہر دو نکو
اسمِ تو مندرج بہ دفتر شد	بست و دہ روپیہ مقرر شد

چنانچہ ان کا تیس۳۰ روپیہ ماہوار مقرر ہو گیا اور شعرائے شاہی کے زمرہ میں یہ داخل ہو گئے۔ بعد انتزاعِ سلطنت یہ رامپور چلے گئے جہاں کچھ عرصہ تک نہ کوئی معقول ملازمت ملی اور نہ مقبول شعرا کے حلقے میں داخل ہو سکے۔ کچھ عرصہ کے بعد ایک قصیدۂ مدحیہ نواب کلب علیخاں کے حضور میں جو اُسوقت ولیعہد ریاست تھے پیش کرنے کا موقع ملا۔ غدر کا ہنگامہ فرو ہونے کے بعد تسلیم رامپور سے لکھنؤ واپس آئے اور یہاں اپنے بچھڑے ہوے اعزا سے ملے۔ اسکے کچھ عرصہ بعد وہ منشی نولکشور کے مشہور مطبع میں جسکو قائم ہوے اُسوقت تھوڑا عرصہ گزرا تھا مصححوں میں ملازم ہو گئے جہاں اُنکے اُستاد نسیم نے بھی کچھ دنوں ملازمت کی تھی۔ لکھنؤ میں نواب محمد تقی خاں کی سرکار سے بھی دس۱۰ روپیہ ماہوار ان کو ملتے تھے اور نواب صاحب اپنا کلام اصلاح کے لئے اُن کو دکھاتے تھے۔ جب ۱۸۷۵ھ؁ میں نواب کلب علیخاں سر آرائے ریاست تھے تو ان کے طلب فرمانے سے یہ پھر رامپور گئے۔

اور ایکی مرتبہ تیس روپیہ ماہوار تنخواہ ہوئی جو بعد کو پچاس روپیہ تک بڑھادی گئی اور عہدۂ نظارت و پیشکاری سے ترقی کرکے وہاں کے مدارس کے ڈپٹی انسپکٹر مقرر ہوئے۔ نواب صاحب موصوف کی رحلت کے بعد یہ پھر رامپور سے نکلے اور ٹونک ہوتے ہوئے منگرول پہونچے جہاں کچھ دنوں قیام کرکے نواب عالیشان نواب سیّد حامد علیخاں بہادر والی رامپور کے طلب فرمانے سے پھر رامپور آگئے اس مرتبہ نواب صاحب نے ازراہِ قدردانی چالیس روپیہ ماہوار بطور پنشن مقرر کردیے جو اُن کو آخر وقت تک ملتے رہے۔ تسلیم نے اکانوے برس اس دُنیائے ناپائدار کی سیر کرکے ۱۹۱۱ء میں سفر آخرت اختیار کیا۔

تصانیف کہا جاتا ہے کہ اُن کا پہلا دیوان زمانۂ غدر میں ضائع ہوگیا۔ مطبوعہ دیوان ان کے حسب ذیل ہیں :۔

(۱) "نظم ارجمند" یہ لکھنؤ میں چھپا ہے اور اسمیں قبل غدر کا بھی کچھ کلام اور اُن کی دو مثنویاں بھی ہیں۔ (۲) "نظم دل افروز" مطبوعۂ رام پور۔ (۳) "دفتر خیال" ایضًا۔ چوتھا دیوان ناتمام سُنا جاتا ہے کہ اُن کے کسی شاگرد کے پاس رام پور میں موجود ہے۔ ان کے علاوہ مثنویاں حسب ذیل ہیں :۔

(۱) نالۂ تسلیم۔ (۲) شام غریباں (۳) صبح خنداں (۴) دل وجان (۵) نغمۂ بلبل۔ (۶) شوکت شاہجہانی (۷) گوہر انتخاب (۸) تاریخ رامپور ان کے علاوہ انھوں نے نواب صاحب رامپور بالقابہ کا سفرنامۂ یورپ منظوم لکھا ہے جسمیں تقریبًا بیس پچیس ہزار شعر ہیں۔

انداز کلام کلام نہایت سلیس بے تکلف ٹھوس اور زوردار ہے تمام اصناف سخن

ہیں مثنوی سب سے اچھی ہے اور اس میں وہ اپنے ہمعصروں پر گوے سبقت لیگئے ہیں۔ اسی میں وہ خوب پھلتے پھولتے ہیں۔ بعض قصیدے بھی بہت زوردار لکھے ہیں۔ غزلیں اکثر پُرمعنی اور پُر لطف ہوتی ہیں اور ان کا پہلا دیوان "نظم ارجمند" ہماری رائے میں سب دیوانوں سے بہتر ہے۔ مگر پُرگوئی نے ان کے ساتھ بھی وہی کیا جو دیگر شعرا کے ساتھ کیا ہے۔ یعنی کلام کو پھیکا اور بیمزہ بنا دیا ہے۔ تسلیم تین باتوں کے واسطے مشہور ہیں۔ اپنی غزلوں اور مثنوی کے لئے۔ دوسرے مومن کے تتبع کے واسطے۔ تیسرے اس وجہ سے کہ ہمارے زمانہ کے ذہین اور قابل شاعر حسرت موہانی کے وہ اُستاد ہیں۔

تسلیم نے اپنی عمر کا اکثر حصّہ مصیبت و افلاس میں بسر کیا یہانتک کہ بعض اوقات فقر و فاقہ کی نوبت آگئی۔ اکثر اوقات ان کے احباب اور ان کے شاگرد انکی اعانت کرتے تھے۔ اُن کی طویل عمر مصائب کی ایک طولانی داستان تھی جو آخر کار موت پر ختم ہوئی۔ مگر مفلسی اور پریشاں حالی نے اُن کے مزاج میں کسی قسم کا چڑچڑاپن اور غم و غصہ پیدا نہیں کیا تھا۔ بلکہ برعکس اسکے وہ نہایت ملنسار اور قانع واقع ہوے تھے۔ اور کسی مرفہ الحال ہم پیشہ شاعر پر اُن کو رشک و حسد کبھی نہیں ہوا۔ تسلیم کے ساتھ قدیم رنگ کا خاتمہ ہو گیا۔

اُن کے شاگرد بکثرت ہیں جن میں مولانا حسرت موہانی۔ عرش گیاوی۔ حاجی محمد اسمٰعیل خاں صبر معروف بہ بلبل تسلیم بہت ممتاز اور قابل ذکر ہیں۔ حسرت موہانی کا کچھ مختصر حال ہم آگے چل کر حصۂ نثر میں لکھیں گے۔

چند چیدہ اشعار بطور نمونہ نذر ناظرین کیے جاتے ہیں۔

ہاے کبتلک نہ میں گھبراؤنگا ای دستِ جنوں
اب تو دامن بھی نہیں ہی کہ بہل جاؤں گا

نالہ کھینچا ہی تو دل ہی خفا شوق ہی اُداس
تو کیا بدل گیا کہ زمانہ بدل گیا

آبرو گر چاہتا ہی کنجِ خلوت کر قبول
قطرۂ نیساں صدف میں آکے گوہر ہو گیا

عمر بھر رشک عدو ساتھ تھا کہتا کیا حال
وہ مِلا بھی کبھی تنہا تو میں تنہا نہ ہوا

قطرۂ خوں بھی نہیں دل میں مرے
ہاے تر ہو گی زبانِ تیر کیا

کچھ کہدو جھوٹ سچ کہ توقع بندھی رہے
توڑو نہ آسرا دلِ اُمّیدوار کا

تسلیم کسکے واسطے بیٹھے ہو گھر چلو
کیا اعتبار وعدۂ بے اعتبار کا

دل مرا تھا گر گیا، گم ہو گیا، جاتا رہا
غم تمھیں کاہے کا ہے جاتا رہا جاتا رہا

ڈھونڈھتا ہی روز و شب لیکر چراغِ مہر و ماہ
کیا ترا اے آسمانِ پُر جفا جاتا رہا

مرقد میں سُفیدی جو کفن کی نظر آئی
سمجھا میں پس مرگ مرے ساتھ گڑی دھوپ

اور ہیں جنکو ہی شاگردی پہ اے تسلیم ناز
میں نسیم دہلوی کے کفش برداروں میں ہوں

واعظ خدا شناس نہ ہو گا تمام عمر
اب تک پڑا ہوا ہے حرام و حلال میں

ایسا ستمِ چرخ سے اُف مُنھ سے نہ کرنا
یہ بات مرے دل میں ہی یا برگِ حنا میں

ڈراتا کیوں ہی ای تسلیم واعظ مجھ کو دوزخ سے
مرا حصہ نہیں ہی کیا خدا کے فضل و احساں میں

گردشِ بخت بہت دیکھ چکے اے تسلیم
چل کے میخانہ میں اب گردشِ ساغر دیکھو

کرتے ہیں سجدے اس لیے دیر و حرم میں ہم
کیا جانیے وہ شوخ کہاں ہو کہاں نہ ہو

طفلی سے جو بت شوخ ہو آفت کا بنا ہو
وہ فتنہ جوانی میں قیامت نہ ہو کیا ہو

کعبے کا ارادہ کیے نکلے تو ہیں گھر سے
آجائے وہ بُت سامنے اسدم تو مزا ہو

عرش — ضمیر الدین عرش صوبۂ بہار سے تعلق رکھتے ہیں منشی بندہ علی وکیل گیا

کے صاحبزادہ ہیں ایک عرصہ تک اخبارات و رسائل سے تعلق رکھنے کے بعد اُنھوں نے ریلوے کی ملازمت اختیار کر لی۔ پہلے شمشاد شاگرد ناسخ کے شاگرد ہوئے مگر بعد کو تسلیم کو کلام دکھانے لگے۔ ان کے اکثر تصانیف غیر مطبوعہ ہیں۔ پہلے ایک دیوان موسوم بہ "فکر عرش" داغ کے رنگ میں لکھا مگر وہ شایع نہیں ہوا۔ دوسرا دیوان موسوم بہ "نظم نونگار" تسلیم کے رنگ میں اور اُنھیں کا اصلاح کردہ ہے ان کے علاوہ ایک تیسرا دیوان بھی لکھا ہے۔ دو مختصر رسالے زبان اور فن عروض کے اور ایک تاریخ آگرہ و دہلی موسوم بہ "بارگاہ سلطانی" بھی اُنکی یادگار ہیں۔ کچھ عرصہ تک بہار سخن کی ایڈیٹری بھی کی ہے۔ اکثر غزلیں نیچرل رنگ میں خوب لکھتے ہیں اور اسی رنگ میں مشہور ہیں۔

دربار حیدرآباد

حیدرآباد دکن اپنی روایات علم و ادب کے واسطے ہمیشہ سے مشہور ہے۔ نظام الملک آصفجاہ اول جس طرح شاہان بیجاپور اور گولکنڈہ کے ملک کے وارث قرار پائے اسی طرح اُن کے مذاق علمی اور سرپرستی سخن کے بھی وارث وہی ہوئے۔ حیدرآباد ہمیشہ سے علم و فن اور شعر و شاعری کا مرکز اور ملکی و غیر ملکی ہر قسم کے شعرا اور اہل کمال کا ملجا و ماوا رہا ہے۔ فرمانروایان سلطنت اور امرائے دولت کا آوازۂ سخاوت اور شہرۂ فیاضی سُن سُنکر شعرا، علما، فقہا، محدثین شمالی ہند اور نیز دور و دراز قطار و امصار مثلاً ایران، عربستان، بخارا، سمرقند وغیرہ سے آتے تھے اور یہاں کی فیاضیوں سے

بہرہ مند ہوتے تھے۔ یہ باکمال لوگ افکار دنیاوی سے فارغ ہوکر علم و ادب کی خدمت کرتے اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہتے تھے اور ریاست کی بڑی زیب و زینت سمجھے جاتے تھے۔ خود فرمانروا بھی محض شاعری کے قدردان اور سرپرست ہی نہ تھے بلکہ خود بھی شعر و سخن کا ذوق سلیم رکھتے تھے۔ اگرچہ بعض عہدوں میں شاعری کا بازار سرد رہا مگر پھر بھی شمع سخن جو ایک مرتبہ روشن ہوچکی تھی وہ کبھی بجھی نہیں۔ فرمانروایان سابق اُس زمانہ کے دستور کے موافق فارسی زیادہ کہتے تھے۔ مگر زمانۂ حال میں اُردو کا چرچا زیادہ ہوگیا ہے جسکی تفصیل آئندہ سطور میں کیگئی ہے۔

نظام الملک آصفجاہ اول
سنہ ۱۶۷۱ء تا سنہ ۱۷۴۸ء

بانی خاندان نظام الملک آصفجاہ اول کا نام میر قمر الدین خاں تھا۔ فارسی میں شعر کہتے تھے اور دو دیوان اس زبان میں یادگار چھوڑے ہیں۔ "شاکر" تخلص کرتے اور مرزا عبد القادر بیدل سے اصلاح لیتے تھے۔ کلام میں تصوف کا رنگ بہت غالب تھا۔ مشہور ہے کہ نظم و نثر کئی زبانوں میں لکھ سکتے تھے۔ ممکن ہے کہ اُردو میں بھی کہا ہو مگر اُن کا کلام اب دستیاب نہیں ہوتا۔

میر محبوب علیخاں متخلص بہ آصف
سنہ ۱۸۶۹ء تا سنہ ۱۹۱۱ عیسوی

ہز ہائینس مظفر الملک فتح جنگ نواب میر محبوب علیخاں بہادر نظام الملک آصفجاہ ششم ۱۸۔ اگست سنہ ۱۸۶۶ء مطابق ۶۔ ربیع الثانی سنہ ۱۲۸۳ھ میں پیدا ہوئے اور کچھ کم تین برس کی عمر میں ۲۶ فروری سنہ ۱۸۶۹ء کو مسند آرائے ریاست ہوئے۔ آپ کی تعلیم و تربیت مختلف علوم و فنون میں مختلف اوقات میں اصحاب ذیل کے سپرد ہوئی۔ مولوی محمد زماں خاں شہید، مولوی مسیح الزماں خاں، مولوی انوار اللہ خاں، مولوی اشرف حسین، مظفر حسین خوشنویس۔

مرزا النصر اسعد خاں ۔ مسٹر کلارک ۔ سرور جنگ ۔ افسر جنگ اور مٹھو خاں وغیرہ ۔
آپ کو زبان عربی و فارسی اُردو و انگریزی سب میں عبور حاصل تھا ۔ علوم مروجہ کے
علاوہ فنون سپہ گری و شہسواری کے ماہر کامل تھے نشانہ بے مثل لگاتے تھے ۔ آپ کے
علم و فن اور شعر و سخن کی قدردانی کیوجہ سے تمام علماء و فضلائے عصر اور مشہور شعرائے
عہد کا مجمع دارالسلطنت حیدرآباد میں ہو گیا تھا ۔ جن میں سے بعض کے نام یہ ہیں
مولانا کرامت علی ۔ مولانا حیدر علی مصنف منتہی الکلام ۔ مولوی امین الدین خاں
خلف علامہ رشید الدین خاں دہلوی ۔ مولوی وحید الزماں خاں ۔ مولوی مہدی علی
مولوی مشتاق حسین ۔ مولوی سید حسین و سید علی بلگرامی ۔ مولوی نذیر احمد ۔
مولوی عزیز مرزا وغیرہ اور ان کے علاوہ سیکڑوں باکمال تھے کہ جو لکھنؤ اور دلّی
اور نیز دیگر مقامات سے شہریار دکن کی فیاضیوں اور حیدرآباد میں ہُن برسنے کا
شہرہ سُن سُن کر حیدرآباد چلے گئے تھے ۔ نظام مرحوم کی علمی سرپرستی اور قدردانی
کی بیّن مثال مولوی سید احمد دہلوی کی مشہور اردو لغت فرہنگ آصفیہ کی طباعت
واشاعت ہے جسکے واسطے اعلیٰ حضرت نے نہ صرف ایک زر کثیر مصنف کو عنایت
کیا بلکہ اسکے صلہ میں پچاس روپیہ ماہوار بطور پنشن کے عمر بھر کیواسطے مقرر کر دیا تھا ۔
اسی شاہانہ فیاضی اور سرورانہ قدردانی کا نتیجہ یہ بھی ہوا کہ بعض اور مشہور کتابیں اس
مبارک عہد میں تصنیف کی گئیں مثلاً تمدن عرب مرتبہ و مترجمہ مولوی سید علی بلگرامی
سوانحمری نواب سرسالار جنگ بہادر ۔ تاریخ دکن وغیرہ ۔ اسی در دولت سے مولانا
شبلی نعمانی ۔ مولانا حالی ۔ مولوی عبدالحق صاحب مصنف تفسیر حقانی ۔ قدر بلگرامی ۔
پنڈت رتن ناتھ سرشار ۔ مولوی عبدالحلیم شرر ۔ پروفیسر شہباز اور بیسیوں ایسے

کاملان فن برابر فیضیاب ہوتے رہے اور عمر بھر نہایت اطمینان کے ساتھ اپنے اپنے مشاغل علمیہ میں مصروف رہے۔ استاد شاہ بلبل ہندوستان نواب مرزا خان داغ کی شہرت اور ثروت کا ایسا عروج ہوا جو اس سے پیشتر کسی رئیس کی وجہ سے کسی شاعر کو میسّر نہیں ہوا تھا۔ مشہور ہے کہ آخر میں اُنکی تنخواہ پندرہ سو روپیہ ماہوار ہو گئے تھے۔ علاوہ اُن بیش بہا انعامات اور خلعت وغیرہ کے جو وقتاً فوقتاً اُن کو ملتے رہتے تھے۔

ہر چند کہ امیر مینائی اس معاملہ میں ناکام رہے اس وجہ سے کہ اُن کی عمر نے وفا نہیں کی مگر اُن کے صاحبزادے اختر مینائی اور اُن کے مشہور شاگرد حافظ جلیل حسن جلیل اب تک درباری شاعر ہیں۔ اور جلیل کو تو موجودہ حکمراں کی اُستادی کا فخر حاصل ہے۔

میر محبوب علیخاں آصف تخلص فرماتے تھے اور اپنے اُستاد داغ کے متبع تھے۔ دو دیوان آپکی یادگار ہیں۔ کلام میں داغ کا رنگ ہے اور حسن الفاظ کے ساتھ حسن معنی بھی بہت کچھ جلوہ گر ہے۔ نہایت سلیس فصیح اور بامحاورہ چُٹ پٹا کلام ہوتا تھا اور حُسن ظاہری کے ساتھ حُسنِ باطنی بھی بدرجۂ اتم موجود ہے۔

موجودہ فرمانروائے دکن

ہز اگزالٹڈ ہائنس اعلیحضرت سر عثمان علیخاں بہادر سجمیع القابہ شعر و سخن میں اپنے پدر بزرگوار کے متبع ہیں آپ بھی نہ صرف قدردان و مربی فن بلکہ بہت بڑے ناقد اور دلدادۂ سخن ہیں۔ آپ نے بھی اپنے دربار دُربار میں ایک مجمع شعرا و ادبا اور علما و فضلا کا جمع کیا ہے۔ آپ کے مبارک عہد میں عثمانیہ یونیورسٹی کا قیام جس سے کہ زبان اُردو کی ترقی اور وسعت میں بہت بڑا اضافہ اور اُسکو بے انتہا استحکام حاصل ہوا اور نیز دارالترجمہ کا قیام جس سے بہت سی بیش بہا غیر زبانوں کی

اعلیٰ حضرت نظام الملک نواب میر محبوب علی خان آصفجاہ
جنت آرام گاہ

ہز اکزالٹی ہائنس اعلیحضرت خسرو دکن خلداللہ ملکہ

کتابیں اُردو میں ترجمہ ہوگئیں آپ کے عہدزریں کی ایسی یادگاریں ہیں جس کے احسان سے ہماری زبان اور ہمارا ادب کبھی عہدہ برآنہیں ہوسکتا۔ آپ عثمان تخلص کرتے ہیں اور آپ کا ایک دیوان غزلوں کا چھپ گیا ہے۔ آپ حضرت جلیل سے استفادۂ سخن کرتے ہیں۔ کلام میں صفائی سادگی بے تکلفی اور فصاحت کوٹ کوٹ کر بھری ہے زوائد سے کلام پاک ہے۔ ہز اگزالٹڈ ہائنس زبان فارسی عربی میں بھی اچھا دخل رکھتے ہیں اور کبھی کبھی ان زبانوں میں بھی طبع آزمائی فرماتے ہیں۔

مہاراجہ چندولال شاداں ۱۷۶۶ء تا ۱۸۴۵ء

امرا اور رؤسائے ریاست عہد قدیم میں بحیثیت سرپرست شعرا اور اہل کمال کے جو مرتبہ مہاراجہ چندولال کو حاصل ہے وہ کسی دوسرے کو نصیب نہیں ہوا شاداں تخلص کرتے تھے اور ایک عرصے تک پیشکار ریاست یعنی وزیر اعظم کے عہدۂ جلیلہ پر ممتاز رہے۔ مہاراجہ بہادر قوم کے کھتری تھے۔ علاوہ خود اہل کمال ہونے کے اہل کمال کے بڑے مربی اور سرپرست تھے اور اس عہد میں جود و سخا میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے اُن کی سخاوت کی مثالیں اب تک بطور ضرب المثل حیدرآباد میں مشہور ہیں۔ اپنے زمانہ میں اسقدر مشہور تھے کہ ریاست حیدرآباد کو ان کے نام کے ساتھ نسبت دی جاتی تھی اور حیدرآباد چندولال کا حیدرآباد کہلاتا تھا۔ اُنکی سخاوت کا شہرہ سُن کر ہندوستان اور ایران کے اکثر شعرا اور اہل کمال وہاں جمع ہوگئے تھے اور جو مشاعرے خود اُنھیں کے محل سرا میں ہر رات کو ہوتے تھے اُن میں یہ صاحبان فن جمع ہوکر اپنا اپنا کمال دکھاتے تھے۔ انھیں مشاعروں میں نصیر دہلوی نے بھی اکثر شرکت کی ہے اور بیش بہا انعامات سے مالا مال ہوکر

واپس ہوئے ہیں۔ ذوق اور ناسخ بھی طلب کیئے گئے مگر جب وطن اور راہ کی تعب نے
اُس طرف جانے سے اُن کو باز رکھا۔ مہاراجہ موصوف اُردو فارسی دونوں زبانوں
میں کہتے تھے۔ چنانچہ دو دیوان اُردو اور ایک دیوان فارسی اُنکی یادگار ہیں۔
مشہور ہے کہ اُن کے زمانہ میں تین سو سے زیادہ شاعر حیدرآباد میں جمع تھے۔
جنکی ماہوار تنخواہ سو روپیہ سے ہزار روپیہ تک فی کس تھی۔ ایک کتاب موسوم
"بہ عشرتکدہ آفاق" بھی اُنکی تصنیف ہے۔ اسمیں اُنھوں نے اپنے خاندانی حالات
اور خود اپنے سوانح اور اپنی خدمات کا حال تفصیل سے لکھا ہے۔

راجہ گردھاری پرشاد باقی
سنہ ۱۸۴۰ء تا سنہ ۱۹۱۰ء

راجہ گردھاری پرشاد معروف بہ محبوب نواز راجہ بنسی دھر
قوم کے سکسینہ کایستھ تھے۔ فارسی اور سنسکرت کے عالم
تھے اور عربی میں بھی اچھا دخل رکھتے تھے۔ یہ بھی مشاہیر حیدرآباد سے ہیں اور
اِن کو بھی شعر و سخن کا ذوق اور سرپرستی شعرا کا شوق تھا۔ انھوں نے نواب مرزا خاں
داغ کی جب وہ حیدرآباد گئے ہیں بڑی قدر اور مدد کی۔ اکثر کتابیں اُنکی تصنیف
ہیں جن میں حسب ذیل زیادہ مشہور ہیں۔ بھگوت گیتا کا ترجمہ فارسی منظوم کیشو نامہ
کلیات باقی قصائد باقی۔ پرنس نامہ۔ کنز التاریخ۔ بقاے باقی۔ سیاق باقی۔
پیرایۂ عروض۔ آئینۂ سخن۔ ان کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی رواداری
کس قدر برتتے تھے۔ ان کے کلام میں تصوف کا رنگ بہت ہے۔ فلسفہ اور
مذہب سے اُن کو بڑی دلچسپی تھی اور ایک سچے درویش کی زندگی بسر کرتے تھے۔
انکی رباعیات نہایت مؤثر اور دلچسپ ہیں۔ ان کے کلام سے بڑی علمی قابلیت کا
اندازہ ہوتا ہے شمس الدین فیض کے شاگرد تھے۔

مہاراجہ سرکشن پرشاد متخلص بہ شاد
سنہ ولادت ۱۲۸۰ھ ۱۸۶۴ عیسوی

مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر وزیر اعظم حیدرآباد زمانۂ حال کے بہت ممتاز اور مشہور شاعر اور اسکالر ہیں۔ سلسلۂ خاندانی ایک نہایت قدیم اور معزز دلی کے خاندان سے ملتا ہے جن کا کوئی رکن نظام ہائے سابق میں سے کسی کے ساتھ حیدرآباد آیا تھا۔ اُن کے دادا مہاراجہ نرندر پرشاد اُس کونسل آف ریجنسی کے ایک رُکن تھے جو جنت آشیاں میر محبوب علیخاں کے زمانۂ نابالغی میں قائم ہوئی تھی۔ مہاراجہ چندو لال اور یہ ایک ہی خاندان سے ہیں۔ ان کے دادا نے اِن کو زبان عربی وفارسی میں بڑے قابل اُستادوں سے اعلی درجہ کی تعلیم دلائی تھی۔ اس کے علاوہ اُنھوں نے انگریزی اور تلنگی اور مرہٹی زبانوں میں بھی کافی دستگاہ بہم پہونچائی۔ مہاراجہ صاحب موصوف عربی وفارسی و اُردو نہایت بے تکلفی اور صفائی سے لکھتے ہیں۔ علاوہ نظم کے نثر کا اسلوب بھی نہایت دلکش ہوتا ہے۔ شاد تخلص فرماتے ہیں اور حضور نظام سابق یعنی میر محبوب علیخاں کے شاگرد ہیں جنھوں نے اِن کو "شاگرد خاص آصفجاہ" کے معزز لقب سے ممتاز کیا تھا۔ دو اُردو جرائد یعنی "دبدبۂ آصفیہ" اور "محبوب الکلام" کی کرسی ادارت پر بھی چند روز آپ متمکن رہے "محبوب الکلام" میں حضور نظام سابق بھی اپنا کلام اکثر شایع ہونے کے لئے عطا فرماتے تھے۔ مہاراجہ صاحب موصوف ایک اچھے خاصے صوفی ہیں اور اُن کا کلام مسائل تصوف سے لبریز ہے۔ اُن کے دیوان اُردو وفارسی شائع ہوچکے ہیں ایک دیوان معروف "بہ ثمکدہ رحمت" میں صرف نعتیہ اشعار ہیں۔ اِس سے ثابت ہوتا ہے کہ تعصبات سے مرتفع ہوکر آپ مذہب کو کس بلند نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں اور اخوت انسانی کے کسقدر قائل ہیں۔ خاندانی

روایات بذل و عطا پر بھی آپ پوری طرح عامل ہیں اور مہاراجہ چندولال کے نقش قدم
پر چلنے کے لیے ساعی رہتے ہیں۔ تقریباً ۴۰ تصانیف آپکی موجود ہیں جنمیں سے
بعض کے یہ نام ہیں۔ بزم خیال (۳ جلدوں میں۔ رباعیات شاد۔ ہدیۂ شاد
فریاد شاد۔ مطلع خورشید۔ ایمان شاد۔ خمار شاد۔ نغمۂ شاد۔ ارمغان وزارت
مخزن القوافی۔ مثنوی آئینہ وجود۔ مثنوی سر وجود وغیرہ۔ کلام بہت دلچسپ
اور بے تکلف ہوتا ہے علی الخصوص فارسی اور عربی اشعار کا اُردو شعر میں ترجمہ یا
تضمین بہت دلکش اور دلفریب ہوتی ہے۔ کلام میں حسن صوری و معنوی دونوں
موجود ہیں سنہ ۱۸۹۲ء میں اپنے خاندانی عہدۂ وزارت سے سرفراز ہوئے اور خطاب
"راجۂ راجگاں مہاراجہ بہادر" جو ان کے بزرگوں کا تھا ان کو عطا ہوا سنہ ۱۹۰۱ء میں
وزیر اعظم مقرر ہوئے اور "یمین السلطنۃ" کا خطاب عنایت ہوا۔ سنہ ۱۹۰۳ عیسوی میں
کے۔ سی۔ آئی۔ ای۔ اور سنہ ۱۹۱۰ء میں جی۔ سی۔ آئی۔ ای۔ گورنمنٹ انگلشیہ سے
ملا سنہ ۱۹۱۲ء میں عہدۂ وزارت سے کنارہ کش ہو گئے تھے مگر تھوڑے عرصہ سے
پھر قلمدان وزارت آپکو سپرد ہوا ہے۔

انجمن ترقی اُردو یہ مشہور و معروف انجمن حیدرآباد میں تیرہ چودہ برس سے قائم ہے
جب سے یہ عالم وجود میں آئی اپنے قابل اور ہر دلعزیز آنریری سکریٹری مولوی عبدالحق
صاحب بی۔ اے کی سرپرستی اور نگرانی میں یہ برابر ترقی کر رہی ہے سکریٹری صاحب
موصوف کی ان تھک کوششوں اور چند لایق اور قابل اشخاص کی قلمی امداد و اعانت
اور سب سے بڑھ کے اعلحضرت فرمانروائے دکن کی نظر کیمیا اثر کی بدولت یہ انجمن
زبان اُردو کی ترقی اور اشاعت کے نہایت مفید کام انجام دے رہی ہے۔ زبان

انگریزی کی اکثر مفید اور مشہور کتابیں نہایت قابلیت اور احتیاط کے ساتھ ترجمہ
ہو گئیں یا ہو رہی ہیں۔ مثلاً بکل کی تاریخ تمدن۔ ایبٹ کی سوانحمری نپولین بوناپارٹ
پلوٹارک کی سوانحمریاں حکمائے یونان وغیرہ کی۔ لیکی کی تاریخ اخلاق۔ ان کے
علاوہ بیسیوں مستند کتابیں۔ سائنس۔ فلسفہ۔ اخلاق۔ اقتصادیات۔ تاریخ کی۔
خواہ بصورت تالیف یا ترجمہ شایع ہو چکی ہیں یا پیش نظر ہیں۔ اسی طرح اُردو کی
اکثر پرانی کتابیں اور تذکرے بھی نہایت صحت اور عمدگی اور مفید فاضلانہ دیباچوں کے
ساتھ نکل چکے ہیں۔ اُردو رسم الخط کی اصلاح و ترقی اور اُسکو باقاعدہ اور سہل القراۃ
بنانے کے واسطے قابل اور تجربہ کار اصحاب کی کمیٹیاں بنائی گئی ہیں۔ پروفیسر
برون کی تاریخ ادب ایران اور نکلسن کی تاریخ ادب عرب بھی سنا ہو کہ ترجمہ ہو گئیں
اور چھپنے کے واسطے تیار ہیں۔ انگریزی و اُردو کے علاوہ عربی فارسی اور فرانسیسی
کی بیش بہا تصانیف سے بھی انجمن غافل نہیں ہے۔ ترجمہ کی آسانی
کے واسطے سائنس اور علوم و فنون کے اصطلاحات کا اُردو میں ترجمہ کر دیا گیا ہے
اور وہ بصورت لغت یا فرہنگ کے شائع بھی ہو گیا ہے۔ اسی طرح لغات اور محاورات
اور صناعوں اور پیشہ وروں کی مخصوص اصطلاحیں بھی مرتب کی گئی ہیں۔
آکسفورڈ کی مختصر زبان انگریزی کی لغت کے اُردو ترجمہ کا حکم ہو گیا ہے اور اس
کام کے لئے تقریباً بیس پچیس آدمی مقرر ہیں۔ جب یہ تیار ہو جائیگی تو یقیناً مفید چیز
ثابت ہو گی۔ سنا گیا ہے کہ انجمن اُردو کا نستعلیق ٹائپ تیار کرنے کی فکر میں ہے
جس سے کتابوں کے چھپنے اور بعد کو اُن کے پڑھنے میں بہت آسانی ہو گی۔
مختصر یہ کہ انجمن کے اشغال متعدد اور مختلف ہیں اور سب قابل تعریف ہیں۔ البتہ

زیادہ ہمت زیادہ مستعدی اور زیادہ محنت کی ضرورت ہے اور کام کرنے والے بھی زیادہ ہونا چاہییں تاکہ جو کام شروع کیا جائے وہ جلد ختم ہو جائے اور پبلک کو زحمت انتظار نہ اٹھانا پڑے۔ انجمن کا مشہور و معروف سہ ماہی رسالہ "اردو" جو زیر ادارت سکریٹری صاحب موصوف نکلتا ہے ہندوستان کے نہایت کارآمد اور مشہور رسائل اور جرائد میں سے ہے۔ اور اسمیں زبان اور ادب اردو کے متعلق نہایت قابل قدر اور دلچسپ مضامین ہوتے ہیں۔ حال میں انجمن نے ایک رسالہ موسوم بہ "سائنس" زیر ادارت ڈاکٹر مظفر الدین صاحب قریشی جاری کیا ہے جسمیں صرف مضامین سائنس ہوتے ہیں۔ یہ بھی مثل "اردو" کے نہایت مفید اور کارآمد مضامین کا حامل ہوتا ہے جس سے انشاء اللہ ملک کی بہت کچھ توقعات پوری ہونگی۔

عثمانیہ یونیورسٹی "عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام سے وہ روز افزوں علمی و ادبی عمیق قومی جذبات پورے ہو گئے جو اعلیٰ تعلیم کی زبان مادری میں نشر و اشاعت کے متعلق لوگوں کے دلوں میں عرصۂ دراز سے موجزن تھے اور جن کے واسطے وہ بہت بےچینی سے انتظار کر رہے تھے۔ عثمانیہ یونیورسٹی کا تقرر ابتدائی مباحث و مراحل طے ہو جانے کے بعد بالآخر ہز اگزالٹڈ ہائنس حضور نظام کے فرمان خسروی مورخۂ ۲۲ ستمبر ۱۹۱۸ء کے بموجب عمل میں آیا۔ بالفعل تمام شعبہائے علوم کی تعلیم زبان اردو میں ہوتی ہے انگریزی صرف بطور زبان ثانوی کے ایک ضروری سبجکٹ رکھی گئی ہے تاکہ طلبا اس زبان سے بھی ناآشنا اور انگریزی بولنے والی دنیا کے حالات و خیالات سے بےخبر نہ رہیں۔ ابتک صرف ایک کالج یونیورسٹی سے متعلق ہے جس کا افتتاح ۱۹۱۹ء میں ہوا تھا۔ یونیورسٹی نمایاں ترقی کر رہی ہے اور طلبا کی تعداد برابر

بڑھتی جاتی ہے۔ گورنمنٹ آف انڈیا نے یونیورسٹی کی حیثیت تسلیم کرلی ہے اور
اُس کے امتحانات اور ڈگریوں کو وہی مرتبہ حاصل ہے جو اُسی درجہ کی
برٹش انڈیا کی کسی یونیورسٹی کے امتحانوں اور ڈگریوں کو حاصل ہے۔ بالفعل
یونیورسٹی میں شعبہائے آلہیات (تھیالوجی) علوم وفنون (سائنس وآرٹس) اور
قانون کی تعلیم دی جاتی ہے۔

دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی کے واسطے ضروری کتابیں فراہم کرنیکی غرض سے
"دارالتصنیف والترجمہ" قائم ہے جو یونیورسٹی کے زیر نگرانی نہایت عمدہ اور
مفید کام انجام دے رہا ہے۔ ابھی پانچ ہی چھ برس کی مختصر عمر میں اسکی قابل قدر
کوششوں سے وہ تمام کتابیں تیار ہوگئی ہیں جو یونیورسٹی کے انٹرمیڈیٹ
اور بی۔ اے کے درجوں کے واسطے درکار ہیں۔ اس میں آٹھ قابل مترجم
زیر نگرانی ایک افسر اعلیٰ کے، جو ایک مشہور فاضل مصنف ہیں، کام کرتے ہیں۔ دارالترجمہ
کی خدمات قابل تحسین وآفریں ہیں۔ خاص کر جب ہم اُن دقتوں کا خیال کرتے ہیں
جو علوم وفنون کی کتابوں کے ترجمہ میں اور اُردو میں سائنٹفک الفاظ کے وضع
کرنے یا اُن کے مرادف قائم کرنے میں مترجموں اور مصنفوں کو ہوتی ہیں۔
سُنا گیا ہے کہ اس خاص کام کے واسطے ماہران فن کی کمیٹیاں قائم کیگئی ہیں
جن کے متعلق وضع الفاظ واصطلاحات علمیہ کا کام سپرد ہے۔ حال ہی میں
اس موضوع پر ایک مفید لغت بھی شائع ہوگئی ہے۔ دارالترجمہ کی ابتدا شروع
میں بطور ایک عارضی دفتر کے ہوئی تھی مگر کام کی اہمیت کے لحاظ سے ہز اگزالٹڈ
ہائنس نے اسکی عمر میں دس برس کی اور توسیع کردی ہے۔ دارالترجمہ کی خدمات میں

علاوہ مکمل یونیورسٹی کورس کے علوم ذیل کی کتابوں کی تصنیف و تراجم داخل ہین تاریخ (جسمیں مشرقی و مغربی اور قدیم و جدید ہر قسم کی تاریخ داخل ہے) فلسفہ اقتصادیات۔ ریاضی (خالص اور مخلوط دونوں) طبیعیات۔ کیمیا اور قانون۔ جب فن تعلیم و انجنیری اور طب کے شعبے یونیورسٹی میں کھلیں گے تو ان فنوں کی کتابیں بھی ترجمہ کیجائینگی جس کے واسطے ابھی سے خیال رکھا گیا ہے مصنفہ اور مترجم کتابوں میں ڈیڑھ سو سے زیادہ تیار اور شائع ہوچکی ہیں۔ ان میں سے اکثر داخل درس ہونے کے قابل ہیں۔ مختصر یہ کہ دارالترجمہ زبان اُردو کی اشاعت اور توسیع کے واسطے ایک نہایت مفید محکمہ ہے۔ اور خدمات کے لحاظ سے درازی عمر کا مستحق ہے۔
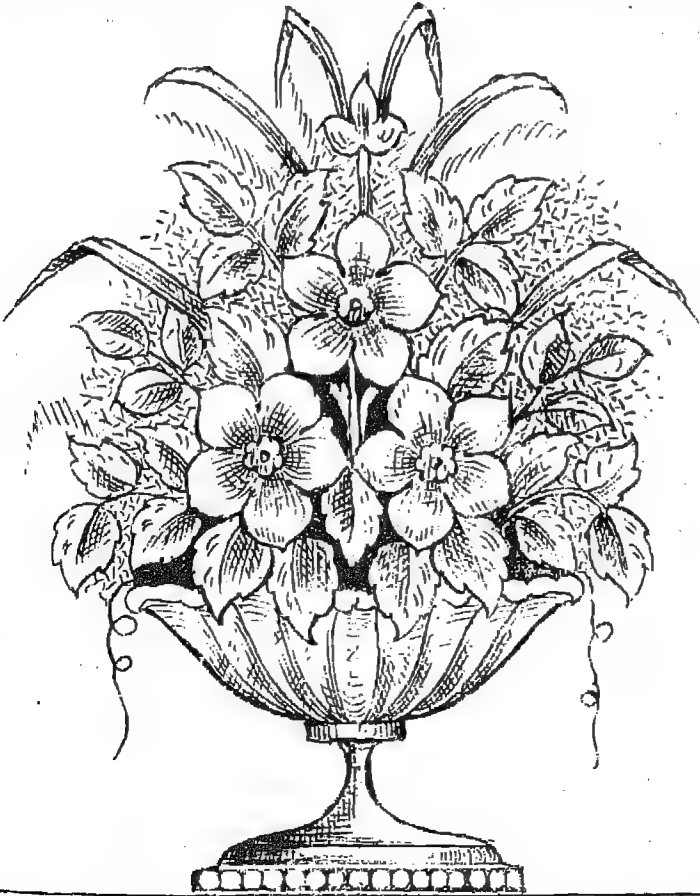
باب ۱۴

اُردو شاعری کا جدید رنگ

آزاد اور حالی کا زمانہ

طرز جدید کے پیشرو

اُردو مرثیہ نگاروں اور نیز نظیر اکبر آبادی نے اُس نئی روشنی کی جھلک دیکھ لی تھی جو بالآخر زمانۂ مابعد میں جدید رنگ میں جلوہ گر ہونیوالی تھی۔ ان لوگوں نے اس جدید رنگ کے واسطے ایک شارع عام اپنے زمانہ کے خیال کے موافق تیار کردیا تھا جسپر راستہ چلنے والے بعد کو آئے۔ اور شاعری میں اصلاح کا رُخ دکھادیا تھا۔ ہماری رائے میں قدیم زمانہ کے مرثیوں میں طرز جدید کا تخم یقیناً موجود تھا جس کی آبیاری بعد کے آنے والوں نے کی اور انھیں کے مبارک ہاتھوں سے وہ درخت پروان چڑھا اور برگ و بار لایا۔ مناظر قدرت، واقعات کے سچے فوٹو الفاظ میں انسان کے قلبی جذبات کا من وعن اظہار نصائح آموزی کیفیات قلبیہ کا اظہار الفاظ میں سلاست روانی، تشبیہ و استعارے کا حد سے متجاوز نہونا یہ سب باتیں جو زمانۂ حال کی شاعری کی جان ہیں پُرانے مرثیوں میں کم وبیش ضرور پائی جاتی ہیں اسی طرح نظیر اکبر آبادی نے بھی اپنے کلام میں اس آنیوالے انقلاب کی خبر دیدی تھی اور ہمارے نزدیک زیادہ صفائی اور زیادہ وضاحت سے دی تھی اس وجہ سے کہ مراثی میں تو یہ چیزیں بطور فروع و تمہید کے تھیں اور نظیر کے یہاں

وہ ایک مستقل عنوان کی صورت میں ہیں۔ مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اُس زمانے کے لوگوں نے اس رنگ کو قدر کی نگاہوں سے نہیں دیکھا اور اس کو ایک فضول چیز سمجھ کے اختیار نہیں کیا۔ اسی وجہ سے مرثیہ گو بگڑے شاعر کہلاتے تھے اور نظیر کو تو طرز قدیم کے دلدادہ ایک عامی اور جاہل شاعر سمجھتے تھے اور اب بھی سمجھتے ہیں کیونکہ اُس نے اُن کے خیال کے بموجب قواعد مقررہ کی پابندی نہیں کی اور وہ عالم و فاضل نہیں تھا اور الفاظ کی تراش و خراش کی اُس نے کبھی پرواہ نہیں کی یہ لوگ چونکہ شعر کے حسن ظاہر کو دیکھتے تھے اس وجہ سے نظیر کا بے تکلف اور نیچرل کلام اُن کو پسند نہیں آیا۔ اِن پُرانے خیالات کو محو کرنے کے لئے کسی زبردست قوت کی ضرورت تھی جسکی مختصر کیفیت سطور ذیل میں بیان کی گئی ہے۔

انقلاب کا اثر انقلاب زمانہ اُردو شاعری کے قدیم رنگ کے موافق ثابت نہیں ہوا دِلّی اور لکھنؤ کی سلطنتیں مٹ جانے سے شعرا کے سرپرست اُٹھ گئے۔ اب یہ لوگ بے پشت و پناہ رہ گئے اور معمولی آدمیوں کے دست نگر ہو گئے جنکی نسبت زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اُن کے دل میں شوق تو تھا مگر اتنا روپیہ اُن کے پاس کہاں تھا کہ مثل بادشاہوں یا اُمرا کے شعرا کی سرپرستی کر سکیں۔ ہر چند جیسا کہ پیشتر کہا جا چکا ہے اکثر لوگ روزی کی تلاش میں رام پور و حیدر آباد اور دوسری ہندوستانی ریاستوں میں چلے گئے۔ مگر وہاں بھی عرصۂ دراز تک اُن کے پاؤں نہ جم سکے اور تھوڑے عرصے کے بعد یا تو ایک جگہ سے دوسری جگہ آتے جاتے رہے یا اپنے وطن کو واپس آ گئے۔ اسی کے ساتھ انقلاب زمانہ نے اُمرا کو صرف دولت کے

اور بھی بہت سے مفید استعمال سکھائے جس سے شعر کی قدر اور شاعروں کے مالی نفع پر
بہت کچھ اثر پڑ گیا۔ لوگ اب زیادہ مادہ پرست اور کاروباری ہو گئے تھے جنکی دنیا میں
نثر کی صاف اور سادی صبح نظم کی خوش رنگ شفق سے بہتر ہے۔ اب وہ پُرانے رنگ کے
تغزل میں کوئی لطف نہیں پاتے تھے ہر چند کہ صنف غزل مقبول رہی اور اب تک
مقبول ہے۔ دہلی کی تباہی انتزاع ملک اودھ غدر ۱۸۵۷ء اور ان ہنگاموں کے انقلابات
نے لوگوں کی آنکھیں کھول دیں اور اب وہ خواب غفلت سے چونکے اور افکار دنیاوی
میں مبتلا ہو گئے۔ ہندوستانی ریاستیں گو ان ہنگاموں سے محفوظ تھیں مگر رفتار زمانہ
کے موافق اُن کو بھی اپنے معاملات کی صلاح کرنا ضرور تھی۔ اس وجہ سے وہ ریاستیں
جو شعرا کی ملجا و ماوا بنی ہوئی تھیں وہ بھی اس انقلاب سے محفوظ نہ رہ سکیں جسکا اثر
شعرا کی تنخواہوں اور منافع پر بھی بہت کچھ پڑا۔

انگریزی تعلیم کا اثر انگریزی تعلیم سے بھی اُردو نظم و نثر دونوں پر بہت کچھ اثر پڑا اور
اُنکو بڑی تقویت پہونچی۔ انگریزی تعلیم نے زبان اُردو کے ساتھ ہندوستان میں وہی
کیا جو انگلستان میں خود زبان انگریزی کے ساتھ ریناسانس[1] نے سولھویں صدی
میں اور رومانس (افسانہ نگاری) کے شوق نے اٹھارھویں صدی میں کیا تھا۔
ترجموں سے اس انقلاب کی ابتدا ہوئی۔ انگریزی ادب نے جسمیں نظم نثر اور ڈراما
سب کچھ داخل ہے بہت گہرا اثر ڈالا اور ہمارے رہنماؤں کے دل میں اردو زبان کے

---

[1] نشاۃ ثانیہ یعنی پندرھویں صدی عیسوی میں یورپ میں اور علی الخصوص اٹلی میں فنون لطیفہ
بلکہ جمیع مروجہ علوم و فنون کا قرون وسطی کے اثر سے نکل جانا اور ایک نیا طرز
اختیار کرنا ۱۲

اُسی نئے طرز پر ترقی کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ ابتدائی نقوش البتہ زیادہ گہرے نہیں تھے کیونکہ نقاش یا تو زبان انگریزی سے بالکل ناآشنا تھے یا بہت کم واقفیت رکھتے تھے وہ اس جدید رنگ سے اُن تراجم کے ذریعہ سے واقف ہوئے تھے جو خود انگریزوں کے ایما سے کرائے گئے تھے۔ مگر باوصف اس کمی کے وہ اس جدید رنگ کی تمام خوبیوں سے بخوبی واقف تھے اور اُنھوں نے اب ارادہ کر لیا تھا کہ طرز قدیم کو جس میں زمانہ حال کی روش کے اعتبار سے اکثر خرابیاں پائی جاتی تھیں بدل ڈالیں اور اُس میں ایک جدّت کی چاشنی پیدا کریں۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ تغیر فوراً اور دفعتہً نہیں ہوا۔ بلکہ آہستہ آہستہ اور بتدریج عمل میں آیا جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ نئے طرز کے ساتھ پُرانا طرز بھی قائم رہا۔ برخلاف رینا سانس اور رومانس کے دلدادوں کے ہماری زبان کے راہ نماؤں نے اپنے قدیم شعرا کے ادب و احترام اور نیز اُن کے رنگ کی مدح سرائی اور قدردانی میں کسی قسم کی کمی نہیں کی۔ مولانا حالی کی "یادگار غالب" اور آزاد کا مطبوعہ "دیوان ذوق" ہمارے اس دعوے کی پوری طرح تائید کرتے ہیں۔ ہمارے راہبر قدامت شکن نہ تھے بلکہ جدید رنگ کی تائید و تلقین کرنے کے باوجود وہ قدامت پرست رہے۔ اُن کی غرض صرف یہ تھی کہ ادب اُردو کا دائرہ اتنا وسیع ہو جائے کہ اُس میں جدید رنگ بھی شامل ہو کر اُس سے پُرانے رنگ کا تصنّع اور تکلّف جاتا رہے۔ فضول مبالغے، دوراز کار تشبیہیں، بے مزہ لفاظی ان چیزوں کے وہ مخالف تھے اور اُنکی اصلاح کی بنیاد انھیں خرابیوں کے دور کرنے پر پڑی تھی۔

جدید رنگ کی خصوصیات جو جو جدید رنگ پھیلتا گیا اور قوی ہوتا گیا اُسی قدر وہ مقبول ہوا اور اُسکے معرف اور برتنے والے پیدا ہوتے گئے۔ نئی پود جو قدیم رنگ سے

بالکل نا آشنا تھی اُس نے اس جدید رنگ کو بہت شوق کے ساتھ اور بہت جلد قبول کیا۔ اس رنگ کے خاص خصوصیات یہ ہیں۔ نئے سبجکٹ اور مضامین تلاش کیے گئے۔ غزلوں کا دائرہ جدید خیالات کے اظہار کے لئے تنگ اور بے مُناسب پایا گیا۔ مُسدّس اور مثنوی کا دَور دَورہ ہوا کیونکہ ان اصناف کے لکھنے والوں کو زیادہ آسانی ہوتی ہے قافیوں پر قابو ہوتا ہے اور اظہار خیال مسلسل کیا جاسکتا ہے جو غزل میں مشکل ہے۔ ایسے مضامین جنکی عبارت میں تکلف اور تصنع کی ضرورت تھی ترک کئے گئے۔ رباعی اور قطعات پر زیادہ توجہ لیگئی۔ نیچرل مضامین جو قدیم شاعری میں پس پشت ڈال دیے گئے تھے اب پیش پیش ہو گئے اور اُن پر بالاستیعاب لکھا جانے لگا مثلاً برکھا رُت، جاڑے اور گرمی کی بہاریں، دریا کی روانی، پہاڑوں کے خوشنما مناظر، اب ہماری جدید شاعری میں داخل ہو گئے جو قدما کے یہاں خال خال نظر آتے ہیں۔ اسی طرح خیالی نظمیں، بیانیہ نظمیں، تاریخی نظمیں، نصیحت آمیز اور اخلاقی نظمیں، پولٹیکل نظمیں، اشعار بصورت سوال وجواب وغیرہ وغیرہ بھی جدید شاعری میں جگہ پانے لگے۔ غزلوں میں بھی بہت بڑا انقلاب ہوا اب وہ پُرانے فرسودہ مضامین زلف کا کل کنگھی چوٹی مِسّی کاجل وغیرہ کے معیوب سمجھے جانے لگے، اب جذبات انسانی، اور کیفیات قلبی کا من وعن اظہار اور بے ثباتی دُنیا وغیرہ کا نہایت پراثر الفاظ میں بیان کیا جانا داخل فیشن ہو گیا۔ حسرت موہانی اور عزیز لکھنوی کی غزلیں اسی قبیل کی ہوتی ہیں۔

ایجاد اور اختراع کے شوق کی ترقی کے ساتھ کچھ ایسے لوگ بھی	اصناف سخن میں تجدید

پیدا ہوئے جنھوں نے انگریزی نظموں کی بعض بحریں اُردو میں داخل کرنے کی کوشش کی۔ مگر اس بات کا خیال نہیں رکھا کہ اُس قسم کی نظمیں بہ لحاظ اپنی نوعیت کے زبان اُردو سے میل نہیں کھاتیں۔ اسی طرح بلینک ورس (نثر مرجز) کے بھی بہت شائق پیدا ہو گئے مگر اس کو بھی پبلک مذاق نے پسند نہیں کیا اور یہ صنف بھی اُردو میں بالکل نامقبول رہی۔ ابتدا میں بعض مشہور اور کہنہ مشق استادوں نے اس پر طبع آزمائی کی تھی، مثلاً مولوی سید علی حیدر صاحب طباطبائی، مولانا شرر مرحوم، آزاد کاکوروی وغیرہ۔ اور اب بھی کچھ لوگ اس قسم کی بے قافیہ نظمیں لکھتے ہیں مگر اُن کو رواج عام شہرت نہیں دیتا۔ مولوی عظمت اللہ نے یہ جدّت کی ہے کہ ہندی دوہروں کی پیروی اُردو نظم میں شروع کر دی اور الفاظ اور مضامین وغیرہ بھی ہندی ہی ہوتے ہیں۔ اکثر ایسی نظمیں نہایت دلکش اور بامزہ ہوتی ہیں۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ قدیم طرز اور معمولی اصناف سخن بالکل بھلا دیے گئے تھے۔ ایسا نہیں ہوا۔ مسدس یعنی چھ مصرعہ والی نظم کو جو مرثیہ کے واسطے مخصوص ہو گئی تھی مولانا حالی نے اپنی مشہور کتاب "مدوجزر اسلام" معروف بہ "مسدس حالی" لکھ کے شہرت جاودانی بخشی۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد سے اِس صنف خاص کا بہت رواج ہو گیا اور اب یہ اسقدر مقبول ہے کہ ہر قسم کی نظمیں نیچرل، بیانیہ، مدحیہ، اخلاقی، سیاسی، وطنی ترانے، تاریخی نظمیں، سب اسی صورت میں لکھی جاتی ہیں۔ اور اُسکی وجہ ظاہر ہے۔ اُسکی بحریں نہایت زوردار اور خوش آیند معلوم ہوتی ہیں۔ سلسلۂ بیان کا اِس صنف میں بہت موقع ملتا ہے۔ چاروں مصرعوں کے ہم قافیہ ہونے کی وجہ سے کوئی رکاوٹ نہیں پیدا ہوتی جس سے شعر کا لُطف اور ترنّم

بڑھ جاتا ہے۔ مسدس کے علاوہ اور اصناف نظم میں بھی مضمون کے ساتھ مناسبت اور میل کا بہت لحاظ رکھا جاتا ہے نفس شعر میں یہ تغیر ہوا ہے کہ یادہ گوئی اور مبالغہ آمیز باتیں ترک کردی گئی ہیں۔ اور اب سادگی صفائی اور واقعیت شعر کی جان سمجھی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے زمانۂ موجودہ کی نظمیں بہت مؤثر اور جذبات سے بھری ہوتی ہیں۔

جدید رنگ کے اثرات

انگریزی طرز تعلیم نے اُس عام افسردگی کو دور کردیا جو آخر میں لکھنؤ اور دلی کی شاعری پر چھا گئی تھی۔ اُس نے شاعری کا دائرہ وسیع کیا اور ایک نئی روح آزادی اور بلند خیالی کی پھونکی۔ نثر کی ترقی اور جدید فن تنقید اور ڈراما کے رواج کا بھی وہی باعث ہوئی۔ اُسکی وجہ سے ایک وسیع اور قیمتی ذخیرۂ الفاظ، نئے تخیلات، نئی تشبیہات، نئے نئے مناظر اور شعر کے نئے نئے سامانِ زینت فراہم ہوئے۔ نئے نئے مضمون اور خیال ہاتھ آئے۔ اور اُن خیالات کے اظہار کے لئے نئی طرزیں اور صورتیں اختیار کی گئیں۔ اُسکی مدد سے اکثر جدید الفاظ زبان میں داخل ہوئے اور زبان اس قابل ہوگئی کہ معنی کا نازک نازک فرق الفاظ کے ذریعہ سے ادا کرسکے۔ انگریزی تعلیم کے اثر نے زبان اُردو کو قدامت پرستی کی زنجیروں سے آزاد کیا۔ جس نے لوگوں کے دل ودماغ کو ایسا جکڑ رکھا تھا کہ اُن کے خیالات میں تنوع باقی نہیں رہا تھا۔ اُن کا مطمح نظر محدود ہوگیا تھا اور اُنکی ذہانت وطباعی زنگ خوردہ ہوگئی تھی۔ ہندوستان کی دیسی زبانوں میں اُسکی وجہ سے گویا کایا پلٹ ہوگئی۔ اور اب وہ ایک درخشاں مستقبل اپنے سامنے رکھتی ہیں، اور نئے تجارب اختیار کرنے اور نئے خیالات کے اظہار میں اُن کو اپنے اوپر پورا بھروسہ ہے اسلئے اِن میں اتنا تغیر عظیم

پیدا کر دیا ہے کہ زمانۂ حال کی تصانیف اُن زبانوں میں گویا دوسری زبان کی تصنیفیں
معلوم ہوتی ہیں۔ مگر اسمیں بھی شک نہیں کہ ان خوبیوں کے باوجود بعض خرابیاں بھی
اُسی کی وجہ سے پیدا ہوئیں مثلاً مقررہ قواعد عروض سے لاپروائی۔ ہر قسم کے قابل
و ناقابل مضمون کو شعر کے سانچے میں ڈھالنا۔ انگریزی الفاظ کی بھرمار۔ پھر بھی اگر غور سے
دیکھا جائے تو اس کے فوائد نقصانات سے زیادہ ہیں اور یہ خرابیاں بھی جو آج پیش نظر
ہیں کسی وقت دفع ہو جائینگی۔

جدید ادب اُردو کے تین طرز
پہلا طبقہ

پہلا طرز اُن لوگوں کا ہے جو پس پشت دیکھنا اپنا نصب العین
سمجھتے ہیں یعنی قدامت پسند فرقہ جو بجائے زمانۂ موجودہ کے
گزشتہ زمانہ میں زندگی بسر کرتا معلوم ہوتا ہے۔ اِن کو اگلے وقت کی زبان تو پسند ہے
اور خود اپنی زبان کسی طرح پسند نہیں آتی۔ اپنے کلام کو قدیم سانچے میں ڈھالتے اور جدید
طرز سے نفرت کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک معمولاتِ زندگی پر غور کرنا بھی ایک گناہ کبیرہ
ہے اور یہ اس کو ایک بڑے فخر کی بات سمجھتے ہیں کہ ایسے مضامین جسمیں کچھ فلسفہ کچھ
تصوف اور کچھ عاشقانہ رنگ کی آمیزش ہو بس انھیں میں اشعار کہے جائیں۔ اگر ان کو
حقیقی تصوف اور عاشقانہ رنگ سے لگاؤ ہوتا تو البتہ معذور تھے۔ مگر بغیر کسی تعلّق کے
یہ یا تو قدما کے محض نقّال کہے جاسکتے ہیں یا لفظی کے شعبدہ باز۔ پرانے مضامین کے
ساتھ پرانی بحریں اور الفاظ استعمال کرنے میں بھی اُن کو انہماک ہے۔ یہ لوگ اس وجہ سے
شعر کہتے ہیں کہ صرف شاعری کو دلیل علم و قابلیت جانتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں پر انگریزی
شاعر یوپ کا وہ شعر صادق آتا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے۔

"وہ شعر اس وجہ سے کہتے ہیں کہ اُن کے باپ بھی شعر کہتے تھے۔ اور اپنی

عدم ذہانت سے اپنی ناخلفی کا اظہار کرتے ہیں"۔
ظاہر ہے کہ ایسے لوگ سچے شاعر کہلانے کے کیونکر مستحق ہو سکتے ہیں البتہ شاعروں کے نقال کہے جا سکتے ہیں۔ اسی قسم کے لوگوں کے کلام سے آجکل کے رسالے اور گلدستے بھرے ہوتے ہیں۔ مگر ان کے ساتھ ہی کچھ ایسے بھی ہیں جو قدیم طرز کی پیروی زیادہ قابلیت اور ہوشیاری سے کرتے ہیں اور قدما کی جانشینی کے مستحق سمجھے جا سکتے ہیں۔ مگر ہمارے ملک کے بعض طبیعت دار نوجوان ان لوگوں کے کلام کو بھی پسند نہیں کرتے غرضکہ طرز قدیم کے قابل اور ناقابل دونوں قسم کے پیرو زمانۂ موجودہ کی رفتار سے پیچھے ہٹتے جاتے ہیں۔ اور فی الحقیقت اگر زمانۂ موجودہ کی ضروریات پر نظر ڈالی جائے تو یہ کوئی مفید خدمت بھی انجام نہیں دیتے۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انکی کوششوں سے شاعری کا لنگر حرکت میں ضرور ہے۔

دوسرا طبقہ یہ طبقہ طبقۂ اول کی بالکل ضد ہے۔ یہ ہر مغربی چیز کا عاشق و دلدادہ ہے۔ اپنے مُلک کی پُرانی روایات کو نظرِ حقارت سے دیکھتا ہے مغربی شاعری کی تعریفوں میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتا ہے اور اتنا نہیں سمجھتا کہ مغربی شاعری مشرقی لوگوں کے کہاں تک حسب حال اور مناسب ہو سکتی ہے۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ مغربی تعلیم کی شراب نے اُن لوگوں کے دماغوں کو چکرا دیا اور اتنا مدہوش کر دیا ہے کہ وہ کوئی صحیح رائے نہیں قائم کر سکتے۔ اس طرز کے بانیوں نے محض نقل کو اصل الاصول قرار دیا ہے۔ وہ ہر چیز کو نئے رنگ میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ پُرانے زمانے سے اور پُرانے زمانے کی باتوں سے یا تو شرماتے ہیں یا اُن کو بے اعتنائی سے ٹال دیتے ہیں ایسے لوگوں کے نزدیک جدّت اور صرف جدّت شاعری کی جان ہے۔ یہ لوگ

اِس بات کی مطلق پروا نہیں کرتے کہ اُن کا کلام کسی قسم کا اثر کرتا ہے یا نہیں اور حالاتِ ملکی کے مناسب ہے یا نہیں۔ اسی قسم کے لوگوں نے کتابوں کے مارکٹ کو ترجموں سے بھر دیا ہے۔ وہ بھی نہایت بے سلیقگی سے محض فروخت کی غرض سے کیئے گئے ہیں۔ اِن ترجموں میں یہ بہت بڑا نقص ہے کہ علاوہ غلط اور غیر معتبر ہونے کے وہ عمدہ اور مستند کتابوں کے بھی ترجمے نہیں ہوتے بلکہ صرف ایسی کتابوں کے ترجمے ہوتے ہیں جو پسندیدۂ عوام ہیں مثلاً انگریزی ناولسٹ رینالڈس کے تراجم۔ اور اس پر بھی غضب یہ ہے کہ اکثر ترجمے اصل سے نہیں کیے جاتے۔ بلکہ ترجمہ در ترجمہ ہوتے ہیں جس سے اصلیت بالکل مفقود ہو جاتی ہے۔ اس ترجمہ کے شوق بلکہ ناکارہ کتابوں کے ترجمہ کے شوق کے ساتھ ایک نیا طرزِ تحریر بھی اختیار کیا گیا ہے۔ جس کو انگریز جرنلیس، کہتے ہیں۔ یعنی ایک ایسی ناقص اور نامکمل زبان جو نہ پوری طرح سے خیالات کے اظہار پر قادر ہے نہ معنی کے نازک نازک فرقوں کو الفاظ کے ذریعہ سے ظاہر کر سکتی ہے۔ یہ حال عام طور پر اُن کرایہ کے ٹٹو ناول نویسوں کا ہے جنکی لغو اور مُضر تصانیف سے بازار بھرا ہوا ہے نیز جلد باز اخبار نویسوں کا بھی یہی حال ہے پُرانے طرز کو ترک کرنے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ طرز ادا نامکمل ہو۔ زنگ فوق البھڑک ہو۔ اور عبارت طرفہ معجون بن جائے۔ ادیبوں کو اس کا ضرور خیال رکھنا چاہیئے کہ نجائی کو خوبصورتی پر بھدے پن کو حُسن تناسب پر اور شور وغل کو نغمے پر ہرگز ترجیح نہ دیں۔

تیسرا طبقہ یہ اُن اعتدال پسندوں کا اہم طبقہ ہے جو قدیم وجدید دونوں طرزوں کی خوبیوں کا خیال رکھتے ہوئے دونوں کو ملانا چاہتے ہیں۔ یہ گو زمانۂ موجودہ میں ہیں مگر زمانۂ گزشتہ کی عظیم الشان روایات سے بھی پوری طرح باخبر ہیں۔ یہ روایات قدیمہ کو

بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں مگر اپنے خیالات اپنے ہی ماحول سے حاصل کرتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے ان میں اورجنیلٹی یعنی اصلیت ہے۔ انکی غرض وہی ہے جو قدیم یونانی علم الاصنام کی روایات کے مطابق جیسن کی تھی جو ایک سُنہری بھیڑی کی تلاش میں ملکوں ملکوں پھرتا تھا۔ یہ لوگ بھی اُسی طرح اپنے کسی محبوب تخیل کی تلاش میں ملکوں ملکوں کے ادب و شاعری کی سیر کرتے ہیں۔ ان کو ایک ایسا تاجر نہ سمجھنا چاہیے جو ایک ملک میں مال خریدتا اور دوسرے میں بیچ ڈالتا ہے۔ بلکہ یہ راس المال شاعری کے صناع ہیں اور اپنے مصنوعات کے واسطے جنس خام اپنے ہی ملک سے تلاش کرتے ہیں اور ان سے نئی نئی خوبصورت چیزیں بناتے ہیں یہ اپنے شعروں سے اپنے اور نیز اپنی قوم کے دل دماغ کیواسطے غذاے روحانی تیار کرتے ہیں یہ زمانہ گذشتہ کو خوب سمجھتے ہیں اور اُس سے محبت رکھتے ہیں۔ خود اپنے زمانہ کی بڑی قدر کرتے ہیں اور زمانہ آیندہ سے مقابلہ کا خوف نہیں کرتے۔ اسی طبقہ میں ذیل کے مشہور شعرا اور شاعروں کو داخل سمجھنا چاہیے مثلاً حالی، آزاد، شرر، سرشار، سرور، مولوی محمد اسمٰعیل، اکبر الہ آبادی، ڈاکٹر سر محمد اقبال، اور حسرت وغیرہ جن میں سے بعض کے مختصر حالات ذیل میں قلمبند کیے جاتے ہیں۔ ان حضرات نے دونوں طرزوں کی خوبیوں اور عمدگیوں کو اخذ کرلیا ہے اور انھیں پر آیندہ ترقی کی اُمیدوں کا دارومدار ہے۔

حالی ۱۸۳۷ء تا ۱۹۱۴ء

شمس العلما خواجہ الطاف حسین حالی ۱۸۳۷ء میں پانی پت میں پیدا ہوے۔ انصاریوں کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ننھیال سادات کے ایک معزز گھرانے میں تھی اور پدری سلسلہ ان کا ایک بزرگ خواجہ ملک علی تک پہونچتا ہے جو اپنے وقت کے ایک مشہور و معروف عالم تھے

اور بزمانۂ غیاث الدین بلبن ہرات سے ہندوستان آئے تھے اور کچھ گانوں پانی پت کے قریب اُن کے گزارہ کے واسطے بادشاہ نے مقرر کر دیے تھے۔ وہ پانی پت کے قاضی بھی مقرر ہوئے تھے اور اجناس بازاری کے نرخ کا تقرر اور عیدین میں نماز پڑھانے کی خدمت اُن کے سپرد ہوئی تھی۔ خواجہ صاحب کے والد خواجہ ایزد بخش غربت اور ناداری کی حالت میں زندگی بسر کرتے تھے جب اُن کا انتقال ہوا تو خواجہ صاحب کی عمر نو برس کی تھی۔ اُن کے والد کو ایک مجنونانہ کیفیت رہتی تھی لہذا اُنکی تعلیم و تربیت کا بار اُنکے بڑے بھائی اور بہن پر پڑا۔ اُس زمانہ کے دستور کے مطابق قرآن شریف حفظ کرنے کے بعد اُنھوں نے رسمی تعلیم عربی و فارسی کی شروع کی۔ سید جعفر علی میر ممنون دہلوی کے بھانجے سے فارسی پڑھی اور مولوی ابراہیم حسین انصاری سے جو بعد فراغت علوم لکھنؤ سے واپس گئے تھے عربی شروع کی۔ ابھی درسیات سے فراغت نہیں ہوئی تھی اور ہنوز سترہ برس کی عمر کو نہیں پہونچے تھے کہ ان کی شادی ان کی مرضی کے خلاف کر دی گئی۔ تحصیل علم کے شوق میں اور نیز اس خیال سے کہ بیوی کے خبر گیران خوشحال ہیں یہ چپکے سے گھر چھوڑ کر ۱۸۵۴ء میں دلّی چلے گئے۔ یہاں مولوی نوازش علی سے جو اس زمانہ کے ایک مشہور معلم اور واعظ تھے سال ڈیڑھ سال تک عربی پڑھتے رہے۔ اس وقت ان کو صرف نحو۔ منطق۔ عروض وغیرہ میں کافی دستگاہ ہو گئی تھی۔ مگر ۱۸۵۵ء میں اپنے اعزّا کے اصرار سے پھر پانی پت واپس گئے یہاں اپنے طور پر کتب بینی کا مشغلہ جاری رہا۔ ۱۸۵۶ء میں کلکٹری حصار میں ایک ملازمت کر لی مگر غدر ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کی وجہ سے پھر اپنے وطن واپس آئے۔ اِبکی مرتبہ منطق و فلسفہ کے ساتھ حدیث و تفسیر کی کتابیں بھی نظر سے گذریں۔ غرض کہ

تین چار برس پانی پت میں قیام کے بعد ان سے نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ سے جو کہ جہانگیر آباد ضلع بلند شہر کے رئیس اعظم تھے ملاقات ہو گئی اور نیز انکی مصاحبت میں رہنے کا موقع مل گیا۔ نواب صاحب موصوف ایک جید فاضل اور مشہور شاعر تھے اُردو میں شیفتہ اور فارسی میں حسرتی تخلص کرتے تھے۔ یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے کہ آیا حالی نے اپنا کلام شیفتہ کو دکھلایا اور اُن سے اصلاح لیتے تھے یا نہیں مگر اسمیں کوئی شک نہیں جیسا کہ خواجہ صاحب کو خود اعتراف ہے کہ نواب صاحب کی ملازمت اور صحبت سے ان کو بہت کچھ فائدہ پہونچا۔ اُن کے اس شعر سے اتنا ضرور ثابت ہوتا ہے کہ وہ شیفتہ سے استفاضۂ سخن کرتے تھے ؎

حالی سخن میں شیفتہ سے مستفیض ہوں
شاگرد میرزا کا مقلد ہوں میر کا

جہانگیر آباد کی شاعرانہ فضا۔ نواب صاحب کی صحبت، وہانکی فارغ البالی کی زندگی۔ ان سب چیزوں نے پُرانا شعر و شاعری کا شوق جو ایک مدت سے افسردہ ہو رہا تھا از سر نو تازہ کر دیا اور اب یہ اپنی غزلیں مرزا غالب کے پاس بنظر اصلاح دلی بھیجنے لگے وہ شیفتہ کے پاس بحیثیت اُن کے رفیق اور ان کے بیٹوں کے معلم کے تقریباً آٹھ برس رہے۔ اسکے بعد وہ قسمت آزمائی کے لیے لاہور آئے جو اس وقت دلی سے بعد غدر نکلے ہوئے لوگوں کا ملجا و ماوا ہو رہا تھا۔ یہاں اُن کو گورنمنٹ بکڈپو میں ایک جگہ مل گئی جس میں اُن کو سرشتۂ تعلیم کی انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کی ہوئی کتابوں کی عبارت دیکھنا اور درست کرنا پڑتی تھی۔ چونکہ اس کام میں انگریزی ادب سے ایک قسم کی بالواسطہ واقفیت حاصل ہو گئی اور انگریزی خیالات و طرز ادا سے

ایک خاص مناسبت پیدا ہوگئی تھی لہٰذا مشرقی شاعری اور مشرقی انشا پردازی کی فضول باتوں کی وقعت اُن کے دل میں کم ہوگئی اور اسی کے ساتھ اپنی زبان اور اپنی شاعری میں بھی اُسی طرز کی اصلاح کا خیال پیدا ہوا۔ یہ اس جگہ پر تقریباً چار برس رہے ہونگے کہ وہاں سے دِلّی واپس آنا پڑا جہاں اُن کو اینگلو عربک اسکول میں ٹیچری کی جگہ مِل گئی۔ لاہور میں جفیپس کالج میں بھی آٹھ مہینے تک وہ ٹیچر رہ چکے تھے مگر وہ جگہ اُن کو پسند نہیں آئی تھی۔ دلّی میں سرسید مرحوم سے اُن سے ملاقات ہوئی جنکی خاص فرمائش سے مشہور و معروف "مسدّس حالی" لکھا ۱۸۸۶ء میں جبکہ وہ عربی کالج میں معلم تھے سر آسماں جاہ علی گڈھ آئے ہوے تھے جن سے سرسید مرحوم نے اُن کا تعارف کرادیا اور اُنھوں نے ازراہ قدردانی و مردم شناسی پچھتر روپیہ ماہوار نظام گورنمنٹ سے ادبی خدمات کی انجام دہی کے واسطے اُن کا مقرر کرادیا۔ بعد کو جبکہ مولانا حالی علیگڈھ کالج کے ڈیپوٹیشن کے ساتھ حیدرآباد گئے تھے تو یہ تنخواہ مبلغ سو روپیہ ماہوار کردی گئی تھی۔ ملازمت سے دست کشی کے بعد مولانا نے پانی پت میں سکونت اختیار کرلی تھی جہاں ایک قسم کی فارغ البالی کے ساتھ اپنے محبوب شغل تصنیف و تالیف میں وہ زندگی بسر کرتے تھے۔ ۱۹۰۴ء میں خطاب شمس العلما بجلدوے اُنکی قابلیت اور تعلیمی خدمات کے سرکار سے عطا ہوا۔ بالآخر ستتر برس کی طویل عمر میں ۱۲ صفر ۱۳۳۳ھ مطابق ۱۹۱۴ء کو اس دار ناپائدار سے رحلت کی۔

مولانا حالی پُرانے زمانے کے یادگار لوگوں میں تھے۔ نہایت خلیق، ملنسار، حلیم الطبع اور سچے فدائی قوم تھے۔ دنیوی جاہ و ثروت کا خیال اُن کے

دل میں مطلق نہ تھا۔ اُن کی زندگی ایک سچے انشا پرداز کی زندگی تھی جس نے اپنے تعلیمی تصنیفی مشاغل کے آگے دنیوی مرتبہ و عزت کو ہمیشہ ہیچ سمجھا۔ قومی ہمدردی اُن میں کوٹ کوٹ کے بھری ہوئی تھی مگر اُس کے ساتھ فرقہ وارانہ اختلافات سے وہ بالکل علیحدہ تھے۔ اُن کا مطمحِ نظر بہت بلند تھا اور لِمَ تَقُولُونَ مَالَا تَفْعَلُونَ ؕ کے وہ پورے عامل تھے۔

حالی کی شاعری اور اُس پر غالب اور شیفتہ کا اثر

حالی کی شاعری کی ابتدا دہلی میں ہوئی جبکہ وہ سترہ برس کی عمر میں چھپ کر گھر سے نکل گئے تھے دلّی میں وہ مرزا غالب کی صحبت میں اکثر آتے جاتے تھے اور انہیں کے سامنے زانوے شاگردی تہ کیا تھا۔ اس اثنا میں وہ مشاعروں میں بھی شریک ہوتے اور نکاتِ شعریہ مرزا غالب ہی سے حل کرتے تھے۔ مرزا بھی اُن سے بہت خوش تھے اور اُنکی طباعی اور استعدی کی قدر کرتے تھے۔ دلّی چھوڑنے کے بعد وہ جہانگیر آباد آئے جہاں نواب مصطفٰے خاں شیفتہ کی صحبت میں اُنکی شاعری کے رنگ میں پختگی آئی نواب صاحب کی صحبت اُنکی شعر گوئی کی محرک ہوتی تھی اور یہیں اُنھوں نے اپنا رنگ بدلا اور مقصد شاعری کو بھی تبدیل کیا۔ اب اُن کو پرانے رنگ کی فضول باتیں اور بے لطف مبالغے پسند نہیں آتے تھے۔ کسی چیز کا من وعن بیان سیدھے سادے الفاظ میں جسمیں حقیقی جذبات کا بھی کچھ شمول ہو، اب اُن کو مرغوب ہونے لگا۔ مرزا غالب سے اب بھی وہ اصلاح لیتے تھے اور اُنھیں کا رنگ اُن پر غالب تھا۔ ہر چند کہ شیفتہ کا اثر اور رنگ اُن کے اس زمانہ کے کلام میں بہت کچھ پایا جاتا ہے۔ نواب صاحب کے انتقال کے بعد وہ جہانگیر آباد سے لاہور آگئے۔ مگر یہاں اُن کا دل نہیں لگتا تھا اور

یہاں کا قیام وہ اپنے واسطے ایک قید سمجھتے تھے۔ چنانچہ اس زمانہ کے لاہور کے حالات اور وہاں کے لوگوں کی بے اعتنائی کا حال جو اُنھوں نے قلمبند کیا ہے اس سے اُن کے دلی خیالات کا پورا اندازہ ہو جاتا ہے مگر یہیں لاہور میں گورنمنٹ بکڈپو کی ملازمت میں اُن کو انگریزی علم ادب سے ترجموں کے ذریعہ سے واقفیت حاصل ہوئی جس کا اثر ان پر بہت اچھا پڑا۔ یہ زمانہ انکی علمی زندگی کے رُخ بدلجانے کا زمانہ تھا اور ان کے اس زمانہ کی تحریروں میں ہم کو اُس جدید رنگ کی ابتدا بخوبی نظر آتی ہے جو بعد کو ان کی زندگی کا بہت بڑا کارنامہ ثابت ہوا وہ انگریزی شاعری کے بڑے مداح تھے اور اسکی سادگی اور صفائی اور بلند نظری کو بہت پسند کرتے تھے۔ اُن کا دل چاہتا تھا کہ کاش یہی سب چیزیں ہمارے ملک کی شاعری میں بھی داخل ہو جائیں۔ اسی زمانہ میں لاہور میں ۱۸۷۴ء میں ایک ادبی انجمن قائم تھی جسکے بانی مولانا محمد حسین آزاد اور کرنیل ہالرائڈ ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم پنجاب اُسکے سرپرست تھے۔ اس انجمن کے جلسوں میں گو مشاعرے ہوتے مگر وہ اس زمانہ کے مشاعروں کی طرح نہیں تھے یعنی نہ تو کوئی مصرعۂ طرح مقرر کیا جاتا نہ کسی خاص ردیف و قافیہ کی پیروی کیجاتی۔ لوگ اپنے اپنے اشعار جو کسی خاص مضمون پر لکھے جاتے، جو انجمن کیطرف سے پہلے سے مقرر ہو جاتا تھا انجمن کے جلسوں میں پڑھتے تھے۔ حالی گو کہ اس انجمن کے بانیوں میں نہ تھے مگر اسکے ابتدائی شرکا میں ضرور تھے اور اسکے جلسوں کی شرکت میں بڑی سرگرمی سے حصّہ لیتے تھے چنانچہ اُن کی چار نظمیں "برکھا رُت۔ نشاط اُمید۔ مناظرۂ رحم و انصاف اور حبِ وطن" اسی انجمن کے مشاعروں میں پڑھی گئی تھیں اور بہت

مقبول ہوئی تھیں۔

سرسید کا اثر

غالب و شیفتہ کا اثر اُن کی شاعری پر سطور بالا میں بیان ہوا اب دیکھنا چاہیے کہ سرسید مرحوم نے اُن کی شاعری پر کیا اثر ڈالا۔ سرسید اس زمانہ میں مسلمانوں کو اُن کے خواب غفلت سے چونکانے اور اُنکی اصلاح کے کام میں مشغول تھے۔ جب اُنھوں نے حالی کی طبیعت کا رنگ دیکھا تو ان سے کہا کہ موجودہ مسلمانوں کے زوال کے متعلق ایک نظم لکھدو۔ مُسدّس حالی اسی کوشش کا نتیجہ تھا۔ یہ نہایت کامیاب کتاب ثابت ہوئی اور چھپنے کے ساتھ ہی فوراً مقبول عام ہوگئی۔ اُن کا رنگ اسقدر مقبول ہوا کہ اُس کے بہت سے ناقل پیدا ہوگئے مگر اب تک کسی شخص کو اس صنف میں وہ کامیابی نہیں نصیب ہوئی جو مولانا حالی کو ہوئی جسکے وہ فی الواقع مستحق تھے۔ اب وہ ایک قومی شاعر کی حیثیت سے مشہور ہوے۔ مسدس کے بعد بعض اور نظمیں دہلی کی تباہی اور بربادی پر اور حکیم محمود خانصاحب کا مرثیہ جسمیں مسلمانوں کی زمانۂ گزشتہ کی عظمت اور زمانۂ موجودہ کی پستی کا نہایت مؤثر الفاظ میں نقشہ کھینچا ہے اسی رنگ میں لکھا گیا۔ ان نظموں سے اُن کی شہرت ایک رفارمر اور خطیب کی ہوگئی۔ وہ اپنے ہم مذہبوں کو اپنے پُرزور اور مؤثر الفاظ کے ذریعہ سے اُبھارتے تھے کہ اب وقت آگیا ہے کہ کمرہمت باندھیں اور اپنی قوم کو قعر ذلت سے نکالنے میں جو کچھ ان سے ہوسکے مدد دیں۔ بلکہ یہ کہنا بیجا نہوگا کہ اُن کے مخاطب اُن کے اہل مذہب ہی نہیں بلکہ کل اہل وطن یعنے اہل ہند تھے۔ اُن کے اعلیٰ خیالات شریف عورتوں کے متعلق "چپ کی داد" اور "مناجات بیوہ" کی صورت میں ظاہر ہوے جو نہایت مؤثر اور دلکش نظمیں ہیں

آخر عمر میں اُن کے اشعار فلسفیانہ اور عمیق ہوتے تھے جیسا کہ اُن کے ترکیب بند "تحفۃ الاخوان" سے ظاہر ہے۔

تصانیف مولانا حالی کی منظوم تصانیف حسب ذیل ہیں۔ اُن کی نثر کی تصانیف نثر کے باب میں بیان کی جائینگی:۔

(۱) مثنویاں۔ مناظرۂ تعصب و انصاف۔ رحم و انصاف۔ برکھارت۔ نشاط اُمید۔ حُبِّ وطن۔ (۲) مسدس حالی۔ (۳) شکوۂ ہند۔ (۴) کُلیات حالی جسمیں اُن کا دیوان معہ مقدمۂ شعر و شاعری شائع ہوا ہے۔ (۵) مناجات بیوہ، اور چُپ کی داد۔ (۶) مراثی غالب و حکیم محمود خاں و تباہی دہلی وغیرہ (۷) مجموعۂ نظم حالی جسمیں اُردو کی متفرق نظمیں ہیں۔ (۸) مجموعۂ نظم فارسی۔ جسمیں فارسی کا کلام ہے۔

مثنویاں انکی مثنویاں بہت مقبول ہوئیں۔ یہاں تک کہ بعض تو یونیورسٹیوں کے کورس میں داخل ہیں۔ ان کی عبارت بہت صاف اور بے تکلف مشرقی مبالغے اور صنائع بدائع سے خالی ہے۔ ان میں اخلاقی تعلیم نہایت مؤثر اور دلفریب انداز سے دیگئی ہے اور کہیں کہیں بصورت مکالمہ ہے جسمیں ہر فریق کی اچھائیاں اور برائیاں نہایت حُسن و خوبی کے ساتھ واقعات تاریخی کے حوالوں سے بیان کیگئی ہیں مثلاً مثنوی رحم و انصاف میں رحم اور انصاف دونوں اپنی اپنی فضیلتیں اور دوسرے کی خرابیاں اور نقص ایک دلکش انداز سے بیان کرتے ہیں۔ اِن کا فیصلہ عقل کے سپرد کیا جاتا ہے جو یہ فیصلہ کرتی ہے کہ تم دونوں ایک دوسرے کے لازم و ملزوم اور معاون و مددگار ہو۔ مثنوی برکھارُت بھی نہایت عُمدہ اور دلچسپ مثنوی ہے

اس میں ہندوستان کے موسم بہار یعنی برسات کا حال بڑی خوبی اور دلفریبی سے
بیان کیا گیا ہے مثلاً بارش کے فائدے پہاڑوں اور میدانوں میں اس موسم میں فرش زمرّدیں کا
بچھ جانا۔ کل جاندار ہستیوں میں ایک خاص قسم کی زندگی اور اُمنگ کا پیدا ہونا
وغیرہ۔ اس کی زبان بے تکلف اور سہل اور طرز ادا نہایت نیچرل ہے۔ فضول مُبالغے
اور دور از کار تشبیہیں اور استعارے اسمیں مطلق نہیں۔ یہ اُس رنگ کی ابتدائی تصنیف
ہے جسمیں مولانا کو آخر عمر میں کمال حاصل ہوا۔ البتہ اگر پرانے شعرا کے نقطۂ نظر سے
دیکھا جائے تو یہ نظمیں بلحاظ زبان و تخیل کے کوئی اعلیٰ درجہ کا کمال نہیں رکھتیں۔
مگر اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ وہ ایک ایسے رنگ کی راہبر ہیں جس میں
لوگوں کے اب یہ دلنشین ہوتا جاتا ہے کہ علاوہ معمولی فرسودہ مضامین شاعری کے
کچھ اور بھی چیزیں ہیں جن پر شاعر بخوبی طبع آزمائی کر سکتا ہے۔

مسدس حالی مولانا کی یہ سب سے زیادہ مقبول اور سب سے زیادہ مشہور تصنیف
ہے۔ یہ ایک نیا دور پیدا کرنے والی کتاب ہے۔ اسکی مقبولیت اب بھی ویسی ہی
ہے جیسی کہ پہلے تھی۔ یہ ایک الہامی کتاب ہے اور اسکو تاریخ ارتقاء ادب اُردو
میں ایک سنگ نشان سمجھنا چاہیے۔ یہ ایک نیا تارہ ہے جو اُردو کے اُفق شاعری پر
طلوع ہوا۔ اس سے ہندوستان میں قومی اور وطنی نظموں کی بنیاد پڑی اور اسنے
یہ ثابت کر دیا کہ ایسی پُر اثر اور پُر درد نظموں کے واسطے مسدس نہایت موزوں چیز
ہے۔ اسکے بہت سے نقّال پیدا ہوے مگر کوئی شخص اب تک بہ لحاظ جوش اور زور
تخیل اور طرز ادا کے مولانا تک نہیں پہونچا، اسمیں اسلام کی گذشتہ عظمت مسلمانان
سابق کے کارنامے، اُن کے بلند خیالات اور اولوالعزمیاں اور برخلاف اس کے

زمانۂ موجودہ میں اُنکی پستی وزوال اور سستی و کاہلی کا ذکر ہے۔ آخر میں مسلمانوں سے
اپیل کیگئی ہے کہ تاریخ عالم میں جوان کا مرتبہ پہلے تھا اب پھر اُس کو حاصل کرنے
کے لئے کمر ہمت باندھیں۔ یہ کتاب بوڑھے۔ جوان۔ بچّے سب کے دلپسند ہے
اس لے کاروان مسلم کے لئے بانگ جرس کا کام کیا کہ اُٹھیں اور آمادۂ کار ہوں۔
طبع ہوتے ہی اسکی عظیم الشان اشاعت ہوئی۔ زمانۂ حال کی کوئی اُردو کی
کتاب مقبولیت میں اسکا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ ہندوستان کا ہر پڑھا لکھا مُسلمان
اس سے آشنا ہے اور کچھ عرصہ ہوا کہ بہت سے لوگوں کو تو یہ حفظ تھی۔ اس کی
سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ تمام قومی اچھائیوں اور بُرائیوں کا ایک ساتھ
جائزہ لیتی ہے یعنی اچھائیاں زمانۂ گزشتہ کی اور بُرائیاں زمانۂ موجودہ کی۔
اسمیں شاعر زمانۂ جاہلیت کی حالت، جزیرہ نمائے عرب کی تمام متمدن دنیا سے
انقطاعی صورت، عرب اقوام کا آپس میں ذرا ذرا سی بات پر لڑنا جھگڑنا۔ اُن کا
تعصب اور ناروا داری، اُن کا طغیان و بُت پرستی وغیرہ وغیرہ نہایت صحیح
واقعہ نگاری کے طریق پر دکھاتا ہے۔ اسی حالت میں پیغمبر اسلام کا ظہور ہوتا ہے۔
آپ کی تبلیغ کے ابتدائی ثمرات۔ اعلائے کلمۂ حق۔ توسیع علوم۔ استیصال ظلم و تعصب
اصلاح اخلاق اور اُن تمام خوبیوں کی نشر و اشاعت جن کے مفقود ہونے سے
آجکل اہل اسلام مورد آفات ہو رہے ہیں اور جنکی کیفیت آخر کتاب میں نہایت وضاحت
اور اثر سے لکھی ہے۔ اسمیں اسلام کی وہ تمام بیش بہا خدمتیں بیان کی گئی ہیں۔
جو اُس نے اپنے علوم و فنون کے ذریعہ سے اخلاقی اور علمی دُنیا میں کی ہیں۔ پھر
مسلمانوں کی تعمیر بلاد اور سیر و سیاحت کا ذکر ہے جسمیں یہ بتایا ہے کہ وہ اپنے وطن سے

نکل کر دور و دراز مقامات پر مثلاً اسپین میں جبرالٹر اور ہندوستان میں کوہ ہمالہ تک پہونچ گئے ۔

ہمالہ کو ہیں واقعات اُن کے ازبر	نشان اُن کے باقی ہیں جبرالٹر پر

سرسید مرحوم اس کتاب کے متعلق یوں رائے زنی کرتے ہیں :۔

"یہ کہنا بالکل مناسب ہوگا کہ اس کتاب نے ہماری صنف نظم میں ایک نیا دور پیدا کر دیا۔ اسکی عبارت کی خوبی اور صفائی اور روانی کی جسقدر تعریف کی جائے کم ہے۔ یہ امر کچھ تعجب خیز نہیں کہ اتنا مہتم بالشان مضمون اسقدر واقعیت کی پابندی کے ساتھ اور بلا اغراق و مبالغہ اور تمثیل و استعارہ کے جو کہ ہماری شاعری کی جان اور شاعروں کا ایمان ہے اور پھر اسقدر مؤثر اور سلیس اور فصیح طریقہ سے بیان کیا جائے۔ اُس کے بہت سے بند تو ایسے ہیں کہ اُن کو پڑھکر سخت سے سخت دل کے لوگ بھی بغیر آنسو بہائے نہیں رہ سکتے۔ کیوں نہو جو چیز دل سے نکلتی ہے وہ ضرور دل میں گھر کرتی ہے"

شکوۂ ہند — شکوۂ ہند[1] اور قصیدۂ غیاثیہ بھی مسدس مد و جزر اسلام کے طرز میں ہیں یعنی انمیں بھی وہی بیان اسلام کی قدیمی شان و شوکت اور موجودہ پستی نکبت کا ہے جواب ہندوستان میں رونما ہے۔ ترک لذات کی جگہ مزیداری، سادگی کی جگہ آرام طلبی، قوت اور مردانگی کے عوض ضعف اور بوداپن، چالاکی و مستعدی کے

[1] ۔ اس کا جواب بیان یزدانی نے "رخصت عروس" کے نام سے لکھا ہے۔ جس طرح شکوہ میں حالی نے ہندوستان کی شکایت کی ہے کہ اُس نے ہمکو خراب کیا اُسی طرح رخصت عروس میں یزدانی نے خود اپنی شکایت کی ہے کہ ہم نے ہندوستان کو خراب کیا ۱۲

بدلے سستی و کاہلی اب گھر گھر نظر آتی ہے۔ اس مرقع میں کہیں کہیں تصاویر کا رنگ شوخ اور تیز ہو گیا ہے مگر صرف اس غرض سے کہ خوابیدہ جماعت چونکے اور اپنے خواب غفلت سے بیدار ہو۔

مراثی — مراثی مرزا غالب و حکیم محمود خاں وغیرہ بھی نہایت دلچسپ مؤثر اور قابل قدر نظمیں ہیں۔ اوّل الذکر علی الخصوص نہایت ہی دردانگیز اور پُرزور مرثیہ ہے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کا رنج و غم متشکل بہ نظم ہو گیا ہے۔ وہ سچے جذبات اور حقیقی تاثر سے لبریز اور ایک غمزدہ دل کی کیفیات کی سچی تفسیر ہے سادگی یعنی شائبہ اغراق و مبالغہ سے اُس کا معرا ہونا جو مشرقی شاعری کا جوہر ہے اُسکا نشانِ امتیاز ہے اور فی الحقیقت یہی ایک کتاب مولانا حالی کی شہرت شاعری کے واسطے بالکل کافی ہے حکیم محمود خاں صاحب کے مرثیہ کا رنگ مسدس اور شکوہ کا رنگ ہے۔ اس میں دلّی کی تباہی اور مسلمانوں کی پستی کا ذکر نہایت اثر کے ساتھ عبرت انگیز طریقہ سے کیا ہے۔

مناجات بیوہ — یہ چھوٹی سی عجیب و غریب کتاب مولانا کی ہمارے نزدیک "مسدس" اور "شکوہ" سے بھی زیادہ مطبوع خلائق ہے اسکی بحر کسی قدر غیر معمولی ہے جو اصطلاح علم عروض میں "صوت الناقوس" کہلاتی ہے۔ فعلن فعلن فعلن فعلن۔ سوشل معاملات کی اصلاح کی ہوا اس کتاب کی تصنیف کے زمانہ میں ہندوستان بھر میں پھیلی ہوئی تھی۔ بنگال میں ودیا ساگر بیوہ عورتوں کے حامی تھے "مناجات بیوہ" میں بیوہ عورتوں کی دردناک حالت اس انداز سے بیان کیگئی ہے کہ اس کو پڑھکر یا سُن کر دل پھٹا جاتا ہے۔ اسکا ترجمہ ہندوستان کی اکثر زبانوں میں ہو گیا ہے

اس کتاب کے متعلق کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ اس کو پڑھتے وقت اکثر شوہردار عورتیں کہتی ہیں کہ کاش ہم بیوہ ہوتے تو اس سے زیادہ لطف اندوز ہوتے۔ اسکی تعریف اس سے بڑھکر اور کیا ہوسکتی ہے۔

چُپ کی داد — اس کتاب میں عورتوں کی خوبیوں اور نیز اُن کے اعلیٰ فرائض منصبی کا ذکر ہے۔ یہ حیدرآباد دکن میں مصنف نے ایک بہت بڑے جلسہ میں جسکے صدر مہاراجہ سرکشن پرشاد وزیر اعظم ریاست تھے پڑھکر سُنائی تھی۔ یہ کتاب بھی مولانا کے خاص رنگ کی ہے یعنی اسمیں بھی وہی سلاست بیان اور صفائی زبان اور سیدھی سیدھی باتیں ایک لطیف پیرایہ میں ہیں جو اُن کا خاص شیوہ ہے۔ ان تمام نظموں کی یہ خاص خوبی ہے کہ فرقہ وارانہ اختلافات سے مُصنّف مُرتفع ہیں۔

دیوان حالی — اس کے شروع میں مقدمہ شعر و شاعری ہے جسمیں کہ نفس شاعری کی حقیقت سے نہایت فاضلانہ طور پر بحث کیگئی ہے۔ دیوان میں حسب معمول قدیم غزلیات قدیم و جدید دونوں رنگ کی رباعیات، قصائد، ترکیب بند، تاریخیں سب کچھ ہیں قطعات میں اکثر کسی اخلاقی مسئلہ کو بصورت قصہ یا مکالمہ کے بیان کرتے ہیں۔ بعض قطعات فی الواقع نہایت بلیغ اور عمیق خیالات پر مشتمل ہیں غزلیات اور اصناف سخن ہیں سب سے زیادہ ہیں۔ اور مغلق و پیچیدہ خیالات سے خالی ہیں۔ طرز جدید کی غزلوں میں پُرانا رنگ بدل کر زمانۂ حال کی روش کی ابتدا معلوم ہوتی ہے۔ یہ سب غزلیں جذبات سے لبریز ہیں بعض اشعار میں کوئی خیال یا واقعہ مسلسل قطعہ بند صورت میں بیان کیا گیا ہی جو موجودہ رنگ کی خاص پہچان ہے۔ رباعیات مختلف مضامین پر اکثر اخلاقی اور نصیحت آمیز ہیں۔ اُن میں مفید اور کارآمد باتیں مؤثر اور زوردار الفاظ میں

قدما کے طرز پر بیان کیگئی ہیں جو بہت مقبول ہیں اور قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں۔ اُن کا ترجمہ انگریزی میں مسٹر جی۔ای۔وارڈ نے کردیا ہے۔ قصائد کی یہ شان ہے کہ برخلاف طریقۂ سابق کے مادح کی ساری قابلیت ممدوح کی مدح اور محض لفظی شان و شکوہ میں صرف نہیں ہوتی بلکہ ممدوح اپنے اہم فرائض اور ذمہ داریوں سے بھی آگاہ کیا جاتا ہے اور موقع موقع پر نصیحت و عبرت کی باتیں بھی اُسکو سُنائی جاتی ہیں۔ موجودہ حضور نظام خلد اللہ ملکہ کی تخت نشینی کا قصیدہ مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔

مقدمۂ شعر و شاعری اس میں نفس شعر و شاعری سے بحث اور شعر کے اعلیٰ آئیڈیل یعنی منتہائے مقصود کا ذکر ہے۔ ماہیت شعر کے متعلق مشرقی اور مغربی شعرا اور ناقدین کی رائیں نہایت تفصیل و وضاحت سے مثالوں کے ساتھ بیان کی گئی ہیں۔ مقدمہ گوکہ بڑی قابلیت سے لکھا گیا ہے مگر کسی قدر سطحی ہے۔ لائق مصنف کا خیال ہے کہ اردو غزل اور نیز دیگر اصناف سخن اصلاح کے محتاج ہیں لہٰذا ان میں ضروری اصلاح ضرور ہونا چاہیئے۔ وہ غزل میں مروجہ بیان حسن و عشق کو نہیں پسند کرتے بلکہ اُس کو اُس بلند پایہ پر دیکھنا چاہتے ہیں جسمیں صرف بہترین اور اعلیٰ ترین مظاہر دوستی و محبّت کا بیان ہو۔ اسی طرح وہ عورتوں کے بناؤ سنگار اور شیخ و زاہد سے چھیڑ چھاڑ کے بھی غزل میں حامی نہیں[1] ہیں

[1] افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ لائق مصنف نے اس موقع پر مولانا حالی کا مفہوم نہیں سمجھا اور عام طور پر لکھدیا کہ شیخ و زاہد پر جو پھبتیاں کسنے اور اُن کو بنانے کا اردو شاعری میں عام رواج ہوگیا ہے اُس سے لوگوں کو باز رہنا چاہیئے۔ مولانا نے اس موقع پر جو عبارت[2] (باقی در صفحہ آئندہ)

دائرۂ غزل کو وسیع ہونا چاہیے اور اسمیں صرف عاشقانہ فلسفیانہ صوفیانہ اور اخلاقی مضامین ہوں بلکہ ان کے علاوہ اسمیں نیچرل قومی اور سیاسی مضامین بھی جگہ پائیں

بقیہ مضمون حاشیہ صفحہ (۴۸۶)

واعظ اور زاہد کے لئے شاعر نے اوران پر نکتہ چینی کے متعلق لکھی ہے اُسکا ماحصل یہ ہے کہ اس قسم کی نکتہ چینی صرف دو صورتوں میں جائز ہو سکتی ہے ورنہ بالکل بیکار ہے اور اُسکو ترک کر دینا چاہیے۔ پہلی صورت یہ ہے کہ اس قسم کی نکتہ چینی اُنھیں لوگوں کو زیبا ہے جن کو فی الواقع اُس جماعت سے کسی قسم کی مخالفت ہو دوسری صورت یہ ہے کہ اگر اس قسم کی کوئی مخالفت نہو تو یہ طنز و تشنیع ایسے طریقہ سے کیجائے جس سے مقصود اصلی اُن معائب کا اظہار ہو جو اُس جماعت میں عموماً پائے جاتے ہیں مثلاً ریا۔ مکر۔ سالوس۔ خشونت۔ درشتی۔ بدخلقی وغیرہ نہ یہ کہ اُنکی ذات پر بلا وجہ حملہ کیا جائے یا اُنکی پستی میں اپنی بلندی ثابت کیجائے۔ مولانا حالی نے اس مجوزہ نظریہ کے ثبوت میں ذوق کے دو شعر پیش کیے ہیں ؎

رندِ خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو	تجھکو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

اور اس کے آگے لکھا ہے کہ چونکہ اس شعر میں اُس خصلت کی طرف اشارہ ہے جو طبقۂ زہاد و عباد میں اکثر پائی جاتی ہے کہ اوروں کو تو ذرا ذرا سی بات پر ملامت کرتے ہیں اور آپ اپنی اصلاح سے بیخبر ہیں۔ لہٰذا اس قسم کے اشعار پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ دوسرا شعر یہ ہے ؎

ذوق زیبا ہے جو ہو ریش سفید شیخ پر	وسمہ آب بنگ سے مہندی مے گلرنگ سے

اس شعر میں کوئی بات ایسی نہیں پائی جاتی جو شیخ پر طعن کی وجہ معقول ٹھہرے سوائے اسکے کہ بیچارے شیخ کی داڑھی سفید ہے اور محض اس جرم میں اُسکو بھنگڑ اور شرابی بنایا گیا ہے۔

اسی اصول کے تحت میں دو چار شعر مختلف لوگوں کے اس مبحث پر لکھے جاتے ہیں جن سے ناظرین خود اندازہ کرلیں گے کہ کون سا قاعدہ کس پر منطبق ہوتا ہے اور کس قسم کی طعن و تشنیع کی اجازت اور کسکی ممانعت ہے۔ (باقی اشعار متعلق مضمون ہذا در صفحہ ۴۸۸)

درستی زبان بھی بہت ضروری شے ہے اور الفاظ اور محاورات کی صحت کا ضرور خیال رکھا جائے۔ اسی طرح صنائع بدائع یعنی شعر کے ظاہری تکلفات کی بہتات نہ ہونا چاہیئے اور نہ شعر کی خوبی کا دارومدار اُن پر رکھا جائے سنگلاخ زمینیں اور مشکل ردیف قافیے جن کے مصحفی اور شاہ نصیر وغیرہ دلدادہ تھے اُن سے احتراز کرنا چاہیئے۔ حتیّٰ الامکان ردیف بھی اُڑا دی جائے[۱] ۔

اولیات حالی	حالی کا مرتبہ ادب اُردو میں خاص طور پر ممتاز ہے۔ سب سے پہلے

بقیہ مضمون حاشیہ صفحہ ۴۶۷

شیخ صاحب بُرائیاں مَے کی	اور جو کوئی چپت کی آجائے (ریاض)
اِک ٹیپ سی تھی حضرتِ زاہد کو ای ریاض	اب ہاتھ مل رہا ہوں کہ اچھی پڑی نہیں ،،
کسی مکیش کو دینگے تختۂ انگور کی خدمت	جناب شیخ ٹھیکہ لیچکے ہیں باغ رضواں کا (راسخ)
مے بنہاد مکن عرض کہ ایں جوہر ناب	پیش ایں قوم بشورابۂ زمزم نہ رسد (غالب)
دیکھنا نا سخ سرِ شیخ مُنعم کی طرف	کیا کلس مسواک کا ہے گنبدِ دستار پر
کہاں میخانہ کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ	پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے
کبھی کسی در پہ جبہ سائی کی	شیخ صاحب نماز کیا جانیں (داغ)

[۱] اس موقع پر یہ بتا دینا ضروری ہے کہ مولانا حالی ردیف کے خارج کرنے کی صلاح نہیں دیتے! بلکہ اُن کا منشا یہ ہے کہ غزل گوئی میں جہانتک ممکن ہو آسانی مدِنظر رکھی جائے۔ اُن کے الفاظ یہ ہیں "کہ شاعر کو چاہیئے کہ ہمیشہ ردیف ایسی اختیار کرے جو قافیہ سے میل کھاتی ہوئی ہو۔ اور ردیف و قافیہ دونوں ملکر دو مختصر کلموں سے زیادہ نہوں بلکہ رفتہ رفتہ مردف غزلیں لکھنی کم کرنی چاہییں اور سردست محض قافیہ پر قناعت کرنی چاہیئے" ۱۲

اُنھی نے غزل و قصیدہ میں جدید رنگ شامل کیا۔ مسدس کی اہمیت عملی طور پر ثابت کی اور مسلمانوں کے انحطاط کا تذکرہ غزل اور مسدس میں مؤثر طریقہ سے کیا۔ وطن یعنے مادرِ ہند پر نظمیں لکھیں۔ طرزِ قدیم پر کہ جسمیں تکلف و تصنع اور خلاف واقعہ باتیں جزو غالب تھیں ضرب کاری لگائی۔ ہمواری خیال کو مدنظر رکھا اور عبارت کو تعقید و تکلف سے پاک کیا۔ سیاسی مضامین اپنے کلام میں داخل کیئے۔ آزاد کے ساتھ حالی کو بھی اُردو شاعری کے جدید رنگ کا بانی سمجھنا بالکل بجا ہے۔ اُن کے کلام کی خصوصیات حسب ذیل ہیں۔ نیچر کی پیروی۔ مبالغہ اور اغراق سے احتراز۔ سادگی اور صفائی۔ جذبات اور درد و اثر۔ اُنکی عبارت بہت صاف سادہ اور جلد سمجھ میں آنے والی ہے۔ صنائع بدائع بہت کم اور احتیاط کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ فضول تعلّی اور بیجا اظہار علم و فضل سے محترز رہتے ہیں۔

نقائص حالی وہ کہیں کہیں قواعد عروض سے باہر نکل جاتے ہیں اور صحت الفاظ و محاورات کا خیال نہیں رکھتے۔ غیر مانوس انگریزی الفاظ بھی کہیں کہیں لکھ جاتے ہیں شاید اس غرض سے کہ کلام میں ایک خصوصیت پائی جائے اور معاصرین کے کلام سے تمیز ہو۔ کبھی اُنکا تخیل بہت اعلیٰ ہوتا ہے اور کبھی محض تُک بندی کی دلدل میں پھنس کر رہ جاتے ہیں ایک رفارمر اور نیشنلسٹ کی حیثیت بھی کہیں کلام کے مزے کو پھیکا کر دیتی ہے لیکن باوجود اس کے بھی اُن کے کمال شاعری پر کوئی حرف نہیں آتا اِس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ جس طرح وہ قومی اور وطنی نظموں کے موجد ہیں اسی طرح مناظر قدرت اور نیچرل شاعری میں بھی اُن کا کلام لاجواب ہے اور اُن کا یہ احسان کبھی نہ بھولیگا

کہ اُنھوں نے اُردو شاعری کو ایک بڑی حد تک اُن مضر اخلاق چیزوں سے پاک و صاف کر دیا
جو اُسمیں سرایت کیے ہوئے تھیں اور اُس میں ایک نئی روح پھونکی۔ مختصر یہ کہ ہر چند
وہ شعرائے اُردو کی صف اولین میں شامل نہ بھی کیے جائیں مگر ادب اُردو کے سب سے
بڑے محسن وہ ضرور شمار کیے جائینگے۔

مولانا محمد حسین آزاد

شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد کو جدید رنگ کا بانی اور ادب اُردو کا
مجدد سمجھنا بالکل بجا ہے۔ زمانہ حال کے بہت بڑے ادیب، بہت مشہور نثار، نامی گرامی
نقاد فن تعلیم کے بہت بڑے ماہر اور ایک مشہور و معروف اخبار نویس تھے۔ ان کمالات کے
علاوہ جدید فارسی کے اُستاد کامل اور فلالوجی (علم الالسنہ) کے بھی بڑے ماہر تھے
اُنکی خدمات اور احسانات زبان اُردو پر بیحد ہیں اُردو شاعری میں اس رنگ کا بانی اور اُسمیں
ایک نئی روح پھونکنے والا اگر کوئی فی الحقیقت کہا جاسکتا ہے تو وہ مولانا کی ذات ہے
وہ صحیح معنوں میں ادیب تھے اُن کے کچھ مختصر حالات آیندہ حصہ نثر میں بھی بیان کیے جائینگے
جس سے اُن کا حقیقی تعلق ہے۔ یہاں اُنکی شعر و شاعری کا ذکر نہایت اختصار کے ساتھ
کیا جاتا ہے۔

آزاد کی شاعری

آزاد فطری شاعر تھے اور ازل سے شاعرانہ طبیعت لائے تھے۔ اُن کی
نثر بھی اسقدر دلچسپ اور شاعرانہ تخیل رکھتی ہے کہ کسی طرح شعر سے کم نہیں ہے
اُن کے والد چونکہ اُستاد ذوق کے دوست تھے اور اُنکی صحبت میں بیٹھتے اُٹھتے تھے
لہذا آزاد بھی اوائل عمر میں اپنے والد کے ساتھ اُستاد کی خدمت میں اکثر حاضر ہوتے اور
اُنکی صحبت سے فیضیاب ہوتے۔ اُنھیں کی معیت میں دلّی کے بڑے بڑے مشاعروں
میں شریک ہوتے تھے جہاں مشہور اساتذہ فن سے شناسائی کے علاوہ اُن کے کلام کے

خواجہ الطاف حسین حالی

مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی
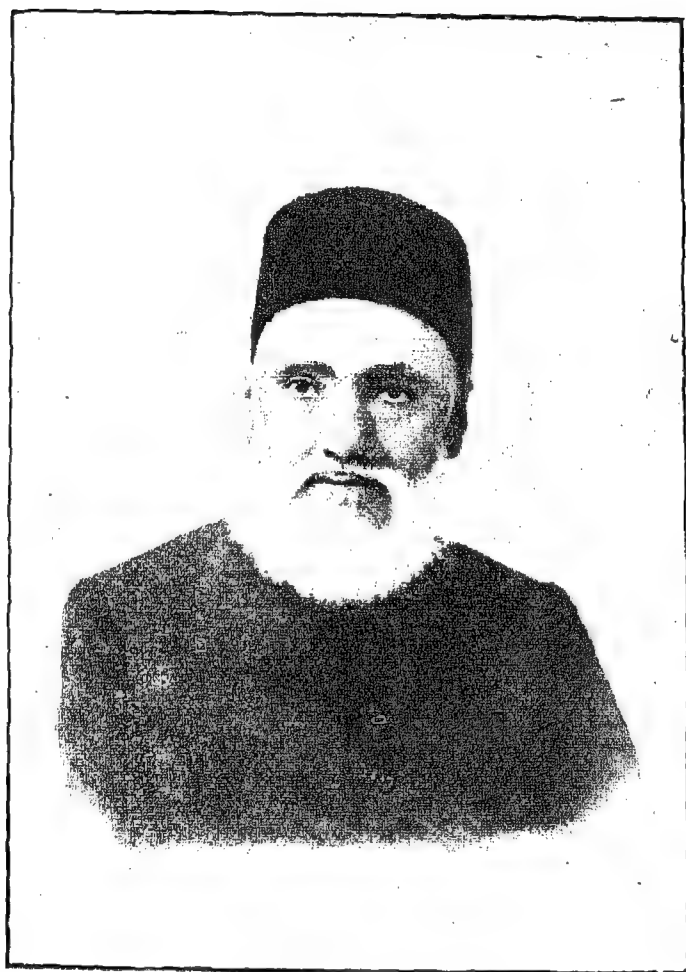
حُسن و قبح سے بھی بخوبی واقف ہوتے جاتے تھے۔ اُستاد ذوق سے نوجوان آزاد کو بڑی حُسنِ عقیدت تھی اور انھیں کے فیض صحبت اور حسن تربیت کا یہ اثر ہوا کہ آزاد کے دل میں جذبۂ شاعری پیدا ہو گیا۔ دِلّی کی آخری عظمت و شان کی یاد دلانے والی صحبتیں گرم تھیں کہ ۱۸۵۷ء کا غدر ہوا اور فلک تفرقہ پرداز نے اُن مجمعوں کو منتشر کر دیا۔ اب لوگ اِدھر اُدھر تلاش معاش میں سرگرداں ہو گئے۔ چونکہ لاہور دلی سے قریب تھا اس وجہ سے دلی کے اکثر تباہ حال اشخاص وہاں چلے گئے۔ اِنھی لوگوں میں محمد حسین آزاد، رائے بہادر منشی پیارے لال، پنڈت من پھول میر منشی، مولوی سید احمد مؤلف فرہنگ آصفیہ، مولوی کریم الدین، اور خواجہ الطاف حسین حالی تھے جن کو تقدیر نے ایک جگہ جمع کر دیا تھا حسن اتفاق سے پنجاب میں اسوقت کرنیل ہالرائڈ ڈائرکٹر تعلیمات تھے جو علاوہ زبان فارسی اور اُردو پر عبور رکھنے کے زبان اُردو کی توسیع و ترقی کا دل سے خیال رکھتے تھے۔ انہیں کے ایما سے مولانا آزاد نے ایک ادبی انجمن "انجمن پنجاب" کے نام سے لاہور میں قائم کی جسکے جلسے اُسی انجمن کے مکان میں ماہوار ہوا کرتے تھے۔ اس انجمن کے قیام کی خاص غرض یہ تھی کہ اُردو شاعری میں جو مبالغہ کے طوفان اور تشبیہ و استعارہ کے انبار ہیں وہ سب نکال دیے جائیں، نیز یہ کہ مشاعروں میں جو طریقہ مصرعۂ طرح دینے کا مرّوج ہے وہ موقوف کیا جائے اور بجائے اس کے شعراء خاص خاص مضامین و عنوان پر طبع آزمائی کیا کریں۔ قبل اس کے کہ اس قسم کے مشاعرے شروع ہوں مولانا نے انجمن کے جلسوں میں اپنے فاضلانہ لیکچر اور دلچسپ نظموں سے پہلے لوگوں کو تیار اور آمادہ کر دیا اور یہ دکھا دیا کہ یہ جدید رنگ عنقریب مقبول عام ہو جائے گا۔

اور حقیقی شاعری کیا چیز ہے۔ اُسکی ضروریات بتائیں اور وہ خرابیاں بھی دکھادیں جو
بالفعل پُرانے رنگ کی شاعری میں پائی جاتی ہیں۔ مئی ۱۸۷۴ء میں جو ایڈریس
انجمن کے افتتاح کے موقع پر اُنھوں نے پڑھا تھا اُسمیں اُردو شاعری کے عیوب
تکرار مضامین، غلو و مبالغہ، فضول تشبیہات و استعارات اُس کا تصنّع اور خلاف فطرت
رنگ۔ غرضکہ جو جو عیوب موجودہ شاعری میں پائے جاتے ہیں وہ سب
بہ وضاحت بیان کردیے اور صاف صاف کہہ دیا کہ اگر اُردو شاعری کی بقا منظور
ہے تو ہمکو چاہیے کہ عشق و عاشقی کے پُرانے ڈھکوسلے ترک کریں۔ اور عروس شاعری کو
تیرہ و تار حجروں سے نکال کر زمانۂ موجودہ کی روشنی میں لائیں۔ شاعروں سے کہا گیا
کہ پُرانے مضامین ترک کرو۔ سادگی، اظہار اصلیت اور درد و اثر بھاشا سے اور صاف بیانی
فائدہ رسانی اور وسعت نظر مغربی شاعری سے سیکھو۔

تصانیف منظوم آزاد نے جو کچھ زبان سے کہا اُس پر خود عمل بھی کیا۔ اُنھوں نے
اسی نئے رنگ میں متعدد چھوٹی چھوٹی مثنویاں اور نظمیں لکھیں۔ اوپر بیان ہو چکا ہے
کہ اُستاد ذوق کی صحبت نے اُن کے دل میں شاعری کا شوق اور جذبہ پیدا کر دیا تھا
اُستاد کی وفات کے بعد وہ حکیم آغا جان عیش سے اصلاح لینے لگے اور اپنا کلام
دلی کے مشاعروں میں سُنانے لگے۔ کہا جاتا ہے کہ اُن کا اس زمانہ کا کلام غدر کے
ہنگامہ میں سب ضائع ہو گیا۔ غدر کے بعد ان کو ریاست جیند میں ایک جگہ
مل گئی تھی جہاں وہ مشق نظم کرتے اور سلام، رباعیاں، مرثیے، غزلیں، قصیدے وغیرہ
سب کچھ کہتے رہے۔ اس زمانہ کا کچھ کلام اُن کے بیٹے مولوی محمد ابراہیم نے
سنہ ۱۸۹۹ء میں "نظم آزاد" کے نام سے شائع کیا ہے۔ لاہور میں سنہ ۱۸۷۴ عیسوی میں

اُس مشاعرے کی بنیاد پڑی تھی جسکا ذکر اوپر ہوا۔ اسی میں اُنھوں نے اپنی وہ دلچسپ نئے رنگ کی نظم پڑھی تھی جو مثنوی شب قدر کے نام سے مشہور ہے اور جسمیں رات کی آمد اور شام کی کیفیت کا ذکر ہے۔ پُرانے خیال کے لوگوں نے اس جدت کی بڑی مخالفت کی جس سے نئی اُمنگوں پر تو کوئی اثر نہ پڑا مگر اتنا ضرور ہوا کہ مشاعرہ ایک سال سے زیادہ قائم نہ رہ سکا۔ مشاعرہ کے بند ہو جانے سے بھی مولانا اپنی کوششوں سے باز نہ آئے اور کچھ نہ کچھ اس رنگ میں کہتے رہے۔ کبھی کبھی وہ اُردو نظمیں انگریزی نظموں کے طرز پر کہتے تھے جن میں کسی انگریزی چیز کا ترجمہ نہیں ہوتا تھا بلکہ انگریزی خیالات کو زبان اُردو کے سانچے میں ڈھال دیتے تھے۔ مثلاً اُن کی نظم "اولوالعزمی کے لئے کوئی سدراہ نہیں" انگریزی شاعر ٹنی سن کی نظم "اکسلسیر" کے انداز پر ہے مگر اُس کا ترجمہ ہرگز نہیں ہے۔ اسی رنگ کی دوسری نظمیں حسب ذیل ہیں۔ مثنوی شرافت حقیقی۔ معرفت آلہی۔ سلام علیک۔ جیسے چاہو سمجھ لو۔ جغرافیہ طبعی کی پہیلی۔ مبارکباد جشن جوبلی۔ ایک تارے کا عاشق۔ محنت کرو۔ یہ سب نظمیں مجموعۂ نظم آزاد میں موجود ہیں۔

آزاد کا قدیم وجدید رنگ قبل اس جدید رنگ اختیار کرنے کے آزاد اُسی پُرانے رنگ میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ چنانچہ مجموعۂ نظم آزاد کے آخر میں اُن کے پُرانے رنگ کی غزلیں اور قصائد موجود ہیں جن میں کچھ کچھ اشعار دلچسپ زوردار اور صوفیانہ رنگ کے بھی نکل آتے ہیں اسی کو ان کے آئندہ رنگ کا سنگ بنیاد سمجھنا چاہیے۔ جدید طرز کی مثنویاں حسب ذیل ہیں (۱) مثنوی شب قدر۔ یہ اُن کا شاہ کار ہے اور اسمیں مختلف لوگوں کے اشغال شب کے وقت کے نہایت عمدگی اور رنگ آمیزی سے

بیان کیے ہیں۔ طالبعلم۔ مہاجن اور چور کی کیفیت۔ علی الخصوص پڑھنے کے قابل ہے۔

طالبعلم

ہیں مدرسہ کے طالبعلم اپنے حال میں | کل صبح امتحاں ہے سو اسکے خیال میں
مل مل کے یاد کرتے ہیں آپس میں دور سے | پڑھتے جدا جدا بھی ہیں کچھ فکر و غور سے
کرلیں جو کچھ کہ کرنا ہے شب درمیان ہے | کل صبح اپنی جان ہے اور امتحان ہے

جی چھوڑ بیٹھے مرد یہ ہمت سے دور ہے
قسمت تو ہر طرح ہے پہ محنت ضرور ہے

مہاجن

اور وہ جو کھپتی ہے مہاجن جہان میں | آدھی بجی ہے پردہ ابھی ہے دکان میں
گنتی میں دام دام کی ہے دم دیے ہوے | بیٹھا ہے گود میں بہی کھاتا لیے ہوے
ہے سارے لین دین کی میزان تمام کی | لیکن غضب ہے کہ بدھ نہیں ملتی چھدام کی

چور

اے رات تیرے پردۂ دامن کی اوٹ میں | دزد سیاہ کار بھی ہے اپنی چوٹ میں
بیٹھا نقب لگا کے کسی کے مکاں میں ہے | اور ہاتھ ڈالا اسکے ہر اک این و آں میں ہے
اسباب سب اندھیرے میں گھر کا ٹٹول کر | ہے چپکے چپکے دیکھ رہا کھول کھول کر

لے جائے گا غرضکہ جو کچھ ہاتھ آئے گا
دیکھو کمایا کسنے ہے اور کون اڑائے گا

شاعر

اس تیرہ شب میں شاعر روشن دماغ ہے ۔ بیٹھا اندھیرے گھر میں جلائے چراغ ہے
ڈوبا ہے اپنے سر کو گریباں میں ڈال کے ۔ اُڑتا مگر ہے کھولے ہوئے پر خیال کے
لاتا فلک سے ہے کبھی تارے اُتار کر ۔ جاتا زمیں کی تہ میں ہے پھر غوطہ مار کر
پڑھتا ہے ذرہ ذرہ پہ افسوں نئے نئے
ہو جاتے ہیں وہی دُرِ مضموں نئے نئے
مضمون تازہ گر کوئی اس آن مل گیا ۔ یوں خوش ہے جیسے نقش سلیمان مل گیا
اِس تیرہ شب کے پردہ میں شاعر جو چور ہے ۔ پھرتا ٹٹولتا ہوا مانند کور ہے
مطلب اُڑاتا شعر سے مضموں غزل کے ہر ۔ لاتا پھر ایسے ڈھب سے لفافہ بدل کے ہر
تعریفیں اُسکی کرتے ہیں جو شعر سُنتے ہیں
مضموں گیا ہے جن کا وہ سر بیٹھے دُھنتے ہیں

اپنے متعلق

عالم ہے اپنے بستر راحت پہ خواب میں ۔ آزاد سر جھکائے خدا کی جناب میں
پھیلائے ہاتھ صورت امیدوار ہے ۔ اور کرتا صدق دل سے دعا بار بار ہے
مجھکو تو ملک سے ہے نہ ہے مال سے غرض ۔ رکھتا نہیں زمانہ کے جنجال سے غرض
یا رب یہ التجا ہے کرم تو اگر کرے
وہ بات دے زباں پہ کہ دلمیں اثر کرے

آجاتی پر کبھی جو ہے شوخی مزاج میں | کرتا ہے اُسکو خرچ عدو کے علاج میں
کرجاتا صاف دُشمن بدبیں یہ چوٹ ہے | اچھا تو ہے کہ رکھتا نہیں دل میں کھوٹ ہے
کھوٹا اگر زبان کا ہے دل کا کھرا تو ہے | اتنا ضرور ہے کہ ذرا مسخرا تو ہے

(۲) مثنوی حُب وطن اسمیں اُنھوں نے ایک دوسرا رنگ اختیار کیا ہے اور اپنے مطالب کو بعض سچّے اور بعض فرضی واقعات سے ثابت کیا ہے۔

(۳) مثنوی خواب امن ایک نہایت زوردار مثنوی ہے جسمیں یہ دکھلایا ہے کہ ہر قسم کی تمدنی ترقیاں کسی ملک میں صرف امن ہی کی صورتمیں ہوسکتی ہیں۔

(۴) مثنوی ابر کرم اسمیں ہندوستان کے موسم بہار یعنی برسات کا سماں دکھلایا ہے یہ حالی کی برکھارُت کے طرز پر ہے۔

(۵) صبح امید۔ اسمیں نہایت مؤثر طریقہ سے دکھلایا ہے کہ مختلف کاروبار عالم مثلاً زراعت، تجارت، ملک گیری، تعلیم وغیرہ میں امید ہی کام کرتی ہے اور کامیابی کا دارومدار اسی پر ہے۔

آزاد و حالی کا فرق آزاد مثل حالی کے شاعری کے دلدادہ نہ تھے۔ اُن کا کلام بھی عیوب شاعری سے پاک وصاف نہیں۔ حالی سرسید مرحوم کی وجہ سے اور نیز اپنی مناسبت طبعی سے ایک قومی شاعر ہوے اور تنزل اسلام کے راگ کو اکثر اپنے پُرجوش کلام کی لے میں الاپا۔ آزاد کو اس قسم کی کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے۔ اُن کی اُفتاد طبیعت عالمانہ تھی اور وہ علاوہ کامل نثار و شاعر ہونے کے ایک مشہور ماہر تعلیم اور جریدہ نگار اور ناقد بھی تھے اُنھوں نے ضروریات زمانہ کا لحاظ کرکے اپنے میلان طبیعت کو جو اُس زمانہ کا عام رنگ تھا جدید رنگ سے بدلا اور ایثار نفس سے

کام لیکر اسی میدان میں شہادت علمی کا درجہ حاصل کیا۔ اُن کے مختصر مجموعۂ نظم سے پایا جاتا ہے کہ وہ نظم سے نثر کو زیادہ ضروری اور مقدم سمجھتے اور اسی میں اپنے ملک اور اپنے ہم وطنوں کی فلاح و بہبود دیکھتے تھے۔ چنانچہ اُن کے دلی جذبات اور قلبی واردات کا اظہار جسقدر کہ نثر میں ہوا وہ نظم میں نہ ہو سکا۔ اُنکی نثریں گو نظم نہیں مگر حقیقی معنی میں بے تکلف اُن پر شعریت کا اطلاق ہو سکتا ہے۔

مولوی محمد اسماعیل میرٹھی مولوی محمد اسماعیل صاحب ۱۲۔ نومبر ۱۸۴۴ء کو پیدا ہوے۔ میرٹھ وطن تھا۔ سولہ سال کی عمر میں سررشتہ تعلیم کی ملازمت اختیار کی۔ تھوڑے عرصہ کے بعد ترقی کر کے فارسی کے ہیڈ مولوی مقرر ہوے۔ پہلے سہارنپور میں پھر میرٹھ میں ایک عرصہ تک اسی عہدہ پر رہ کر ۱۸۸۸ء میں سنٹرل نارمل اسکول آگرہ کو تبدیل ہو گئے جہاں بارہ برس تک قیام کر کے ۱۸۹۹ء میں پنشن لی۔ بعد پنشن اپنے وطن مالوف یعنی میرٹھ واپس آئے اور یہیں قیام اختیار کر کے بقیہ عمر تالیف و تصنیف میں ختم کر دی اُنکی اعلیٰ قابلیت اور خدمات ادبی کے صلے میں خطاب "خاں صاحب" بھی سرکار سے عنایت ہوا تھا۔ بالآخر یکم نومبر ۱۹۱۷ء کو اس دُنیاے ناپائدار سے رحلت کی۔ آگرہ کے قیام میں مولوی صاحب موصوف نے اپنی وہ اردو ریڈریں اور پرائمریں تصنیف کیں جو گورنمنٹ کی منظوری سے ایک عرصۂ دراز تک داخل کورس رہیں۔ یہ درسی کتابیں نہایت سادہ بے تکلف اور دلکش طرز میں لکھی گئی ہیں جو بچّوں کی سمجھ میں بخوبی آسکتی ہیں اور اُن کے لیے نہایت موزوں ہیں۔ اس مُعاملہ میں مولوی صاحب موصوف نے ممالک متحدہ کے واسطے وہی کیا جو مولانا محمد حسین آزاد نے صوبہ پنجاب کیواسطے کیا تھا بلکہ ایک معنی میں اُن سے بھی زیادہ خدمت انجام دی۔ یہ سب ریڈریں

سلاست زبان اور عمدگی مضامین کے اعتبار سے نہایت اعلیٰ درجہ کی ہیں ۔ بلکہ سچ پوچھیے تو ان کا جواب سر رشتۂ تعلیم کی منظور شدہ کتابوں میں کسی صوبہ میں اب تک نہیں ہوا ہے ۔

مولوی صاحب شاعر اور نثار دونوں تھے ۔ اُن کا خاص رنگ اِن دونوں صنفوں میں سادگی اور صفائی ہے جسکے وہ اُستاد کامل تھے شاعری میں طرز جدید اور طرز قدیم دونوں پر انھوں نے طبع آزمائی کی ہے اور تمام اصناف سخن میں کچھ نہ کچھ کہا ہے اور بہت خوب کہا ہے ۔ چنانچہ عاشقانہ، سیاسی، اخلاقی، سوشل اور نیچرل غرضکہ ہر قسم کی نظمیں انکی کہی ہوئی موجود ہیں اور حق یہ ہے کہ بے تکلفی اور سادگی میں اپنا جواب نہیں رکھتیں ۔ مولانا شبلی نعمانی کا قول تھا کہ حالی کے بعد اگر کسی نے سننے کے لائق کچھ کہا ہے تو وہ مولوی اسماعیل میرٹھی ہیں ۔ مولوی صاحب موصوف کا کلیات سنہ ۱۹۱۰ء میں شائع ہوا تھا اور اسمیں اُنکی تمام قدیم و جدید ہر رنگ کی نظمیں ہیں ۔ ان کے کلام میں تصوف کا رنگ بھی کچھ پایا جاتا ہے اور طبّاعی اور قادر الکلامی اُن کے لفظ لفظ سے ظاہر ہے ۔ مولوی صاحب کو تصوف کا بھی ذوق تھا اور حضرت غوث علی شاہ پانی پتی کے مریدان خاص میں تھے ۔ اُن کے جدید رنگ کی نظمیں نہایت اعلیٰ درجہ کی ہیں اور زمانہ موجودہ کی نیچرل نظموں کی پیشرو ہیں ۔ اُردو میں بلینک ورس یعنی بغیر قافیہ والی نظم یا نثر مرجّز میں بھی اُنھوں نے طبع آزمائی کی اور نہایت دل آویز طریقہ سے خیالات کو ادا کیا ہے ۔ علاوہ غزلیات کے جس میں صوفیانہ اور اخلاقی مضامین ہیں ۔ اُنھوں نے اکثر اخلاقی نظمیں قصّے کہانی کے طرز پر مثل "ایساپس فیبلس" کے لکھی ہیں جن سے عمدہ اخلاقی نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں

قلعۂ آگرہ کے متعلق بھی ان کی ایک مشہور نظم ہے اسمیں اُنھوں نے مسلمانوں کی ابتدائے ترقی کے دور نہایت مؤثر طریقے سے دکھا کر موجودہ ترقی کے راستے بتائے ہیں۔ اُن کا یہ بھی قصد تھا کہ لغات اُردو کی ترتیب اور قواعد اُردو کی تکمیل نئے طرز سے کریں چنانچہ اُن کے مسودات محفوظ ہیں اور امید کیجاتی ہے کہ کسی نہ کسی وقت ضرور شائع ہونگے۔ آخر عمر میں وہ حضرت امیر خسرو کے کلام کی تنقید اور اُنکی سوانحعمری مستند کتابوں اور تاریخوں کے حوالے سے مرتب کر رہے تھے اور قران السعدین کی تنقید مکمل ہو چکی تھی کہ موت نے اس کام کو روک دیا۔ اسی طرح یہ بھی سُنا جاتا ہے کہ ادب اُردو کی ایک تاریخ لکھنے کا بھی ارادہ تھا مگر وہ بھی پورا نہو سکا۔ مختصر یہ کہ مولوی صاحب زمانۂ حال کے شاعروں اور نثاروں میں بہت بلند پایہ رکھتے تھے اور طرز قدیم و جدید دونوں کا مجموعہ تھے۔

سُرور جہان آبادی منشی دُرگا سہائے سرور کو بھی اُردو شاعری کے طرز جدید کا ایک رُکن رکین سمجھنا چاہیے۔ یہ اُن لوگوں میں تھے جنھوں نے رنگ جدید کی طرف سب سے پہلے رہنمائی کی جہان آباد ضلع پیلی بھیت کے رہنے والے تھے ۱۸۷۳ء میں پیدا ہوئے شعر و شاعری سے فطری مناسبت تھی۔ اور کلام پُرانے اور نئے دونوں رنگوں کا ایک دلچسپ مجموعہ ہے۔ ان کا عمل "خذ ما صفا و دع ما کدر" پر تھا۔ یعنی پُرانے اور نئے رنگوں میں جو جو باتیں عُمدہ اور قابل قدر تھیں وہ لے لیں اور باقی کو چھوڑ دیا۔ مثلاً قدما کا درد و اثر اور بلند خیالی اور الفاظ کے ایجاز و اختصار کے ساتھ جدید رنگ کے تازہ مضامین اور حُب الوطنی کے جذبات نہایت خوبی کے ساتھ ملے جلے ہیں اور زمانۂ حال کی معمولی بے لُطف باتوں اور زمانۂ گذشتہ کی غیر مہذب معاملہ بندی سے

کلام پاک ہے۔ شستگی الفاظ کے ساتھ بلند خیالی اور پاکیزگی
ملی ہوئی ہے۔

سُرور کو شعر و شاعری سے حد درجہ کا شوق تھا بلکہ اُن کی نسبت یہ کہنا بجا
ہے کہ اُن کو فنا فی الشعر کا درجہ حاصل تھا اُن کے تمام افعال و اقوال حرکات و سکنات
شعریت میں ڈوبے ہوئے تھے اور ایک حقیقی شاعر کا پتہ دیتے تھے جیسا کہ اکثر شعرا
کا حال تھا سرور بھی نہایت آزاد مزاج اور رند مشرب واقع ہوئے تھے۔ فکر فردا
سے ہمیشہ آزاد رہتے تھے اسی وجہ سے وہ مصیبت و عُسرت کی زندگی بسر کرتے تھے مگر
یہ عُسرت و مصیبت اُن کے شاعرانہ شوق اور جذبات کو کبھی دھیما نہ کر سکی۔ وہ مذہبی
تقشف اور تعصب سے بالکل بیگانہ تھے۔ نہ اُن کو نمائش اور ظاہر داری کا شوق
تھا۔ بلکہ اُن کی زندگی بے پروائی اور سادگی کا ایک بہترین نمونہ تھی۔ اُنہیں دنیا کا مکر و فریب
مطلق نہ تھا اور جو کچھ عیوب اُن میں تھے وہ بھی ہنر معلوم ہوتے تھے۔ سب سے بڑا عیب
اُن میں مے نوشی کا تھا مگر یہ بھی مرزا غالب کی طرح اُن کی شاعری اور خیال آفرینی میں اکثر معین
ہوتی تھی۔ گو کہ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اسی کمبخت عادت کی بدولت اُنکی
ہونہار اور قابل قدر زندگی کا بہت قبل از وقت خاتمہ ہو گیا۔ صرف بعمر ۳۷ سال
۱۹۱۰ء میں اُنھوں نے انتقال کیا۔

اُن کی شاعری کے خصوصیات

(۱) سب سے بڑی خصوصیت اُن کی شاعری کی جذبات نگاری
اور درد و اثر ہے۔ اس رنگ میں وہ اپنے زمانہ میں اپنا جواب
نہیں رکھتے تھے۔ مثل استاد الشعرا میر تقی میر کے سُرور کے مزاج میں بھی حزن و یاس
اور رنج و الم کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اسی وجہ سے مثل میر کے اُنکا کلام بھی جذبات نگاری کا

حضرت سرور جہاں آبادی

منشی نوبت راے نظرؔ

ایک مرقع ہوتا تھا۔ اُن کی اس قسم کی نظمیں حسب ذیل ہیں :۔ دیوار کہن، حسرت شباب، اندوہ غربت، مرغان قفس، یاد طفلی، بلبل کا فسانہ۔ حسرت دیدار۔ ماتم آرزو وغیرہ

(۲) دوسری خصوصیت حب الوطنی ہے اس میں بھی وہ اپنا جواب نہیں رکھتے تھے مگر یہ بات قابل لحاظ ہے کہ وہ کسی خاص جماعت یا فرقہ کی جنبہ داری نہیں کرتے۔ بلکہ اُن کو ہندوستان کا قومی شاعر کہنا بالکل بجا ہے۔ اُن کے مخاطب صرف اُن کے ہم مذہب نہیں بلکہ ہندوستان کی پوری پبلک ہے۔ اس قسم کی اُنکی نظمیں یہ ہیں۔ خاک وطن۔ عروس حُبّ وطن۔ حسرت وطن۔ یاد وطن۔ مادر ہند وغیرہ۔ یہ مادر ہند یا بوبنکم چندر چٹرجی کی مشہور نظم بندے ماترم کے طرز پر لکھی گئی ہے۔ ان تمام نظموں میں حب وطن کا سچا جوش اور اعلیٰ خیالات ہیں۔ ان کے سوا بعض عاشقانہ نظمیں بھی اسی طرز کی ہیں مثلاً فسانۂ گل و بلبل۔ شمع و پروانہ وغیرہ۔

(۳) اس کے بعد اِن کی تاریخی اور مذہبی نظموں کا نمبر ہے۔ اِن میں بھی صحیح جذبات، صداقت، فصاحت۔ بے تکلفی اور روانی بدرجۂ کمال پائی جاتی ہیں۔ پدمنی۔ پدمنی کی چتا۔ سیتا جی کی گریہ و زاری۔ مہاراجہ دسرتھ کی بیقراری۔ جمنا۔ گنگا پریاگ کا سنگم۔ ستی۔ نور جہاں کا مزار۔ حسرت دیدار اور نلدمنتی اسی قسم کی نظمیں ہیں جو سب اعلیٰ خیالات اور درد و اثر سے مملو ہیں۔ ان سب میں "گنگا" اور "جمنا" خاص طور پر تعریف کے قابل ہیں جو محاسن شعری کے علاوہ جذبات اور اثر سے لبریز ہیں۔ یہ فی الحقیقت نہایت اعلیٰ درجہ کی نظمیں ہیں۔ جمنا میں علی الخصوص ہندوؤں کے قدیم تاریخی حوالے بہت دلچسپ ہیں۔

(۴) سرور کی چوتھی خصوصیت جو اِن کو اِن کے ہمعصروں سے ممیز و ممتاز کرتی ہے

یہ ہے کہ اُنھوں نے اُردو اشعار میں ہندی الفاظ کو کھپایا اور اس طرح کھپایا کہ اُس سے شعر کے محاسن میں اضافہ ہوگیا۔ علی الخصوص مذہبی نظموں میں اُنھوں نے پُرلے ٹھیٹ ہندی اور بھاشہ کے لفظ بہت اُستادی سے صرف کیے ہیں جن سے کلام کا لُطف دوبالا ہو جاتا ہے اسی طرح رامائن اور دیگر مذہب ہنود کی کتابوں کے بعض سین نہایت پُرزور لکھے ہیں۔ ان کی تمام اس قسم کی نظمیں اہل ہنود نہایت ذوق شوق سے پڑھتے ہیں۔

انگریزی نظموں کے ترجمے سرور کو زبان انگریزی کا بہت محدود علم تھا۔ مگر چونکہ طبیعت نہایت رسا اور شاعرانہ پائی تھی اس وجہ سے اُنھوں نے جو ترجمے انگریزی نظموں کے کیے ہیں وہ ہر چند کہ لفظی نہیں مگر پھر بھی اصلی معلوم ہوتے ہیں۔ اس قسم کی چیزیں بہت ہیں۔ تقریباً بیس سے کم نہونگی۔ بعض میں اُنھوں نے صرف کسی انگریزی نظم کا نام لے لیا ہے اور اُس پر بالکل ہندوستانی طریقہ سے طبع آزمائی کی ہے مرغابی۔ ترانۂ خواب بچّہ اور ہلال۔ کارزار ہستی۔ اُمید و طفلی۔ موسم سرما کا آخری گلاب۔ یہ سب اسی قسم کی نظمیں ہیں اور اپنے طریقہ میں بہت عمدہ اور دلکش ہیں ایسی ہی نیچرل نظموں میں اُن کی "بیر بہوٹی" اور "کوئل" کو بھی سمجھنا چاہیئے۔

سرور نے بعض اخلاقی نظمیں بھی لکھی ہیں۔ مگر یہ خیال رکھا ہے کہ شعر کی خوبی اور دلکشی وعظ و نصیحت کی روکھی پھیکی باتوں سے کم نہونے پائے۔ وہ شاعری کو وعظ پر مقدّم جانتے تھے۔ زن خوشخو۔ بے ثباتی دُنیا۔ ادائے شرم۔ اسی قسم کی نظمیں ہیں جن میں اعلیٰ خیالات نہایت حسین پیرایہ میں ظاہر کیے گئے ہیں۔

سُرور کو شعر گوئی میں کمال حاصل تھا وہ ہمیشہ شاعرانہ خیالات میں غرق

رہتے تھے اور نہایت زود گو اور بے تکلف کہنے والے تھے۔ ہر چند کہ اُنھوں نے مثنوی۔ غزل۔ رباعی۔ قطعہ۔ قصیدہ۔ ترجیع بند۔ ترکیب بند۔ غرضکہ سب اصنافِ سخن میں کچھ نہ کچھ لکھا ہے۔ مگر مسدس ان کو بہت محبوب تھا اور اس میں وہ بہت زورِ طبیعت دکھاتے تھے۔

مختصراً ان کے کلام کی خصوصیات حسب ذیل ہیں ؛۔ جذباتِ نگاری۔ درد و اثر۔ اعلیٰ تخئیل۔ نہایت پیاری اور میٹھی زبان۔ قلبی کیفیات کا موثر اظہار تنوعِ خیالات اور اُن کا اظہار نہایت شاعرانہ اور لطیف طریقہ سے خوبصورت الفاظ میں اور وسیع النظری۔ اُن کا کلام دو مجموعوں میں شائع ہوا ہے۔ ایک وہ جو زمانہ پریس کانپور سے اُن نظموں کا نکلا جو بہ اوقات مختلف رسالۂ زمانہ میں خمخانۂ سرور کے نام سے چھپیں۔ دوسرا جام سرور کے نام سے انڈین پریس الہ آباد سے شایع ہوا ہے۔ ان کا کثیر کلام ضائع ہو گیا مگر اس سے بھی بڑھکے قابل افسوس یہ بات ہے کہ اکثر لوگوں نے اُن کا کلام ہتھیا لیا۔ کبھی معاوضہ کے ساتھ اور کبھی معاوضہ بھی ہضم کر گئے۔ اُن کے انتقال کے بعد جو خطوط شائع ہوئے اُن سے صاف طور سے ثابت ہوتا ہے کہ کسی صاحب نے اُن سے مختلف مضامین پر کچھ نظمیں لکھوائی تھیں اور اُن کو اپنے نام سے شایع کرا دیا تھا۔ اس سے یہ حقیقت کھُل گئی کہ بعض حضرات جو خود تو شاعری سے بہرہ نہیں رکھتے مگر شعرا کی صفِ اوّل میں اپنا شمار کرانا چاہتے ہیں دوسروں سے کچھ دے لیکے کہوا لیتے ہیں اور پھر اُس کلام کو اپنے اسمِ گرامی کے ساتھ بے تکلف شایع کر دیتے ہیں۔

اکبر الہ آبادی اکبر اپنے زمانہ کی ایک بہت بڑی ہستی تھے اُنھوں نے ایک نئے طرز کی بنا ڈالی جسکے وہ خود ہی موجد اور خود ہی خاتم تھے اور اُس طرزِ خاص میں اُنکی نقل

بالکل محال ہے اُن کا کلام ممتنع التقلید اور ناقابل رسائی ہے۔ ان کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ ایک بےمثل شاعر ہونے کے علاوہ ناصح قوم اور بلندپایہ صوفی صافی بھی تھے۔ نثر کے خطوط بھی نہایت دلچسپ لکھتے تھے اور ان سب کے ساتھ ادب سوسائٹی اور حکومت کے زبردست نقاد اور ماہر سیاسیات تھے۔ پھر مذاق و ظرافت میں تو یکتائے روزگار تھے۔

سید اکبر حسین رضوی نام۔ ۱۶۔ نومبر ۱۸۴۶ء تاریخ ولادت ہے۔ اُن کے والدین مرفہ الحال نہ تھے۔ ابتدائی تعلیم مدارس اور سرکاری اسکولوں میں پائی ۱۸۶۶ء میں مختاری کا امتحان پاس کر کے نائب تحصیلدار مقرر ہوئے ۱۸۷۰ء میں ہائیکورٹ کی مثل خوانی کی جگہ ملی ۱۸۷۲ء میں وکالت کا امتحان پاس کر کے ۱۸۸۰ء تک وکالت کی پھر ملازمت سرکاری کی طرف میلان طبع ہوا اور منصف مقرر ہو گئے ۱۸۸۸ء میں سبارڈنٹ جج اور ۱۸۹۴ء میں عدالت خفیفہ کے جج ہوئے۔ اسکے بعد خان بہادر کا خطاب گورنمنٹ سے حاصل کر کے ملازمت سے کنارہ کش ہو گئے۔ الہ آباد یونیورسٹی کے فیلو بھی تھے۔ ستمبر ۱۹۲۱ء میں انتقال فرمایا۔ اور دنیائے ادب کو اپنا سوگوار چھوڑ گئے۔

اخلاق و عادات طبعاً نہایت خلیق اور منکسر المزاج تھے۔ مذاق اور ظرافت ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ سوسائٹی کی روحِ رواں سمجھے جاتے تھے۔ احباب کو جوان سے ملنے آتے تھے اپنی بذلہ سنجی اور ظرافت طبعی سے بہت مسرور کرتے۔ خلق و مدارا۔ تہذیب، صداقت، ہمدردی اور مہمان نوازی اُن کے خاص جوہر تھے۔ بعض باتیں جو اُن کے کلام میں "پالیسی" یعنی مصلحت اندیشی اور زمانہ سازی پر محمول کیجا سکتی ہیں وہ اُن کے اُن خطوط میں جو خواجہ حسن نظامی۔ عزیز لکھنوی منشی دیانرائن نگم وغیر
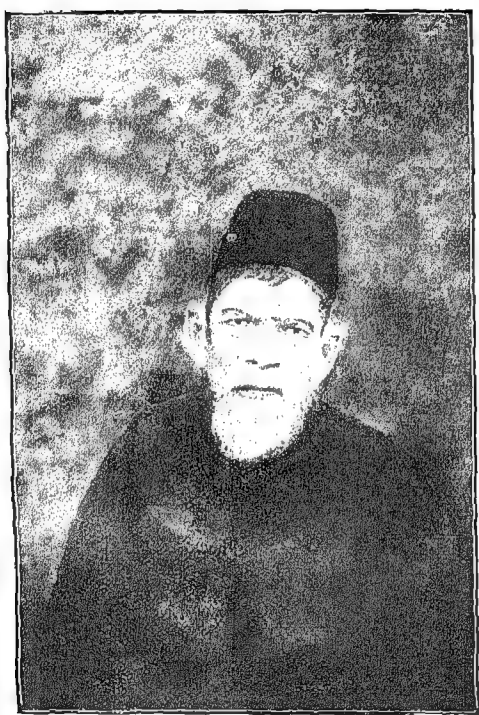
اکبرالہ آبادی

شاد عظیم آبادی

کے نام ہیں انکی راستبازی اور صداقت شعاری پر دلالت کرتی ہیں۔ اُنھوں نے بعض ایسی چیزیں بھی کہی ہیں جنکی اُن سے توقع نہیں ہوسکتی تھی۔ مگر وہ صرف اس لئے کہ وہ خودکو اور دوسروں کو پریشانی میں نہیں ڈالنا چاہتے تھے۔ مذہباً وہ سُنّی تھے مگر شیعوں سے کوئی مخالفت اور تعصّب نہیں رکھتے تھے۔ اسی طرح عقائد میں ہرچند کہ وہ ایک پکّے مسلمان تھے مگر مذہبی ناروا داری اور عصبیت سے کوسوں دُور تھے۔ آخر عمر میں عوارض اور مصائب سے دل شکستہ ہوگئے تھے۔ اپنی اہلیہ اور محبوب بیٹے ہاشم کے انتقال سے اُن پر بڑا اثر پڑا۔ چنانچہ آخرالذکر کی وفات پر ایک دردناک قطعہ کہا تھا جسکے دو شعر یہ ہیں۔

وہ چمن ہی مٹ گیا جسمیں کہ آئی تھی بہار / اب تجھے پاکر میں لے بادِ بہاری کیا کروں
بزم عشرت میں بٹھاتا تھا جسے وہ اُٹھ گیا / اب میں اے فرداتری امیدداری کیا کروں

اکبر کی شاعری اکبر فطری شاعر تھے بچپنے سے اُن کو شعر کا شوق تھا۔ چنانچہ انکا ابتدائے عمر کا کلام اُنکی کلیات میں موجود ہے۔ شروع میں اپنا کلام غلام حسین وحید کو دکھاتے تھے جو آتش کے شاگرد تھے۔ اسی زمانہ میں فارسی اور عربی کی درسیات سے فراغت حاصل کی اور یہ معلومات اُن کو آخر عمر میں بہت مفید ثابت ہوئیں۔ ملازمت کے زمانہ میں اُنھوں نے انگریزی پڑھی اور اُسمیں بھی اچھی خاصی مہارت حاصل کرلی۔ اکبر کا دورِ شاعری ایک بسیط دور ہے جسکو اُنھوں نے خود پانچ حصّوں پر تقسیم کیا ہے۔

پہلا دور ابتدا سے ۱۸۶۶ء تک پہلا دور ابتدائے مشق سے ۱۸۶۶ء تک کا ہے۔ اِس زمانہ کا کلام پُرانے رنگ کا ہے۔ جو اُس زمانہ کا رنگ تھا۔ یہ زمانہ اُنکی نومشقی کا سمجھنا چاہیے۔ اسمیں اُنھوں نے لکھنؤ اور دلّی کے مستند اساتذہ کی تقلید

اور اُن کے رنگ میں غزلیں کہیں اور اکثر مشاعروں میں پڑھیں۔ اُن غزلوں کا وہی رنگ ہے جو قدیم میں برتا جاتا تھا۔ مضامین بھی وہی مقررہ تھے جن پر برابر طبع آزمائی کیجاتی تھی۔ اگرچہ اُن میں کہیں کہیں جذبات عشقیہ بھی ہیں مگر صفائی، سادگی، حسن بندش، روانی وغیرہ بدرجۂ احسن پائی جاتی ہیں۔ اُس وقت کے کلام سے آیندہ کی ترقی کا پتہ چلتا ہے اگرچہ اُسمیں کچھ تصنع بھی شامل ہے۔

دوسرا دور ۱۸۶۶ء سے ۱۸۸۰ء عیسوی تک

اِس عہد میں صداقت اور جذبات کلام میں زیادہ ہیں۔ صلیت بھی صاف طور پر نمایاں ہے۔ مشاقی کی جلا کلام کا جوہر ہو اور قادر الکلامی کا بھی پتہ چلتا ہے مروجہ اور معینہ مضامین کم ہوتے جاتے ہیں۔ مگر پھر بھی کہیں کہیں اُن پر بھی طبع آزمائی کیگئی ہے۔ تصنع بے تکلفی اور اصلیت سے بدل گیا ہے۔ ذاتی رنگ حدود معینہ پر غالب آرہا ہے۔ اشعار نے حشو و زوائد سے پاک ہو کر اپنی کینچلی بدلدی ہے مگر غزلیں اسمیں بھی دل پر چڑھی ہوئی ہیں۔ بہر طور اشعار کے درد و اثر، بندش اور طرز ادا میں بیّن فرق معلوم ہوتا ہے۔

تیسرا دور ۱۸۸۰ء سے ۱۹۰۸ء تک

یہ زمانہ بہت بڑی ترقی کا زمانہ ہے۔ اسمیں شاعر کو اپنے کلام پر پوری طرح قدرت حاصل ہوگئی ہے۔ وہ راستہ کو ٹٹولتے نہیں اور نہ کہیں ٹھٹکتے ہیں بلکہ ہمت اور اعتبار کے ساتھ آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اب اُن کے کلام میں پورا اُستادانہ رنگ آگیا اور تجربہ اور نومشقی کا زمانہ ختم ہوگیا ہے۔ اب کلام میں نوکاری کی جھجک اور تردد نہیں باقی رہا۔ غزلیں اس دور میں بھی عنصر غالب ہیں۔ مذاق و ظرافت کا غلبہ ہے جسمیں ابھی وہ بات نہیں جو کہ بعد کو حاصل ہوئی۔ طنز سے بھی کلام آشنا ہوتا جاتا ہے غزلوں کا رنگ اب پرانے رنگ سے علیحدہ ہو کر

اُن میں ایک اخلاقی رنگ پیدا ہوگیا ہے۔ جدّتِ ادا اور ظرافت پر زیادہ زور دیا جاتا ہے
روحانیت اور تصوف بھی جلوہ گر ہے۔ غزلوں کا رنگ باعتبار مضامین اور طرز ادا کے تو
بہت کچھ ترقی کر گیا ہے مگر پھر بھی خارجی رنگ زیادہ ہے۔ اس زمانہ کا کلام ان کے
کلیات اوّل[1] و دوم[2] میں داخل ہے۔

چوتھا دور ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۲ء عیسوی تک

یہ دور بہت بڑی ترقی کا حامل ہے۔
اس میں اور دورِ سابق کی نوعیت میں کوئی
زیادہ فرق نہیں بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ اسی کا متمم ہے۔ اس دور میں اکبر
فی الواقع "لسان العصر" ہوگئے ہیں۔ اسمیں قدیم رنگ کی غزلگوئی گھٹتی جاتی
اور حقایق و فلسفہ بڑھتا جاتا ہے۔ مذاق و ظرافت بدستور ہے بلکہ اور تیز ہوگئی ہے
اور اسی رنگ میں واقعات حاضرہ اور مغربی تہذیب پر نہایت زبردست نکتہ چینی
کیجاتی ہے۔ اب ظرافت و شوخی بے لگام ہوگئی ہے اخلاقی، روحانی،
فلسفیانہ اور سیاسی رنگ کا کلام میں زور ہے۔ مگر ساتھ ہی عاشقانہ رنگ بھی موجود ہے
حسن و عشق کی زیرلبی گفتگو خاموش نہیں ہوئی مگر وہ اب سیاسیات کے غل غپاڑہ
میں مدھم پڑگئی ہے۔ اکبر اب اپنی صنعت کے صناع کامل ہوگئے ہیں اور کلام میں
پختہ کاری آگئی ہے۔ خیالات میں تموج ہے۔ قوت ابداع و ایجاد فن عروض
کے قواعد اور مشکلات سے دبتی نہیں۔ اظہار خیال کے نئے نئے طریقے اور راستے
ذہن میں آتے ہیں۔ اور ان کے واسطے نئے نئے دلچسپ قافیوں اور جدید استعاروں
اور تشبیہوں سے بہت کام لیا جاتا ہے۔ تصوف اور روحانیت بھی جلوہ گر ہے۔

پانچواں دور ۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۱ء تک

اس زمانہ کا کچھ کلام کلیات سوم میں شائع ہوگیا ہے

اِس دور میں عاشقانہ رنگ گھٹ کر بہت قدر قلیل رہگیا ہے اور اب اشعار بالکل سیاسی، اخلاقی روحانی رنگ میں رنگے ہوتے ہیں۔ یا پھر وہی ظرافت جلوہ فرما ہے۔ اس دور کو ان کی شاعری کی معراج سمجھنا چاہیے۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس زمانہ کے کلام میں وہ جوش و خروش اور بانکپن نہیں جو زمانہ شباب کے کلام میں ہے اور یہ سچ بھی ہے۔ اس لیے کہ طویل عمر نے اُن کو زمانہ کے نشیب و فراز اور حقایق سے آگاہ کر دیا ہے اب زندگی اُن کی نظر میں ایک عمیق معنی رکھتی ہے اور دُنیا کی بے ثباتی پر اُن کی نظر زیادہ جاتی ہے۔ اب چونکہ تجربہ وسیع ہو گیا ہے لہذا اکثر اشعار اس قابل ہیں کہ آدمی اُن کو اپنا دستور العمل بنائے۔ اس زمانہ کا اُن کا کلام بہت ہے۔ اسقدر کہ دو کلیات مرتب کیے جاسکتے ہیں۔ سُنا ہے کہ بعض اشعار ایسے بھی ہیں جنکو وہ صیغۂ راز میں رکھنا چاہتے تھے یعنی جنکی اشاعت اُن کو منظور نہ تھی۔ یہ بھی مشہور ہے کہ اُنھوں نے اپنے مرنے سے پہلے ایک کتاب مسمّٰی "بہ گاندھی نامہ" لکھی جسکو نان کو اپریشن کی ایک تاریخ سمجھنا چاہیے مگر اس کتاب کو انھوں نے مصلحتاً نہیں شائع کیا۔

اُن کا مطبوعہ کلام تین کلیات میں شامل ہے جنمیں سے دو اُنکی زندگی میں طبع ہوے تھے اور تیسرا اُن کے صاحبزادہ نے اُن کے انتقال کے بعد شائع کیا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ابھی ایک اور شائع ہونے کو باقی ہے۔ اکبر نثر کے خطوط بھی بہت خوب لکھتے تھے۔ اُن کے مکتوب الیہ کثیر التعداد تھے جن سے اُن سے خط و کتابت کا سلسلہ برابر جاری تھا۔ جو خطوط کہ اُنھوں نے خواجہ حسن نظامی۔ منشی دیا نرائن نگم۔ احسن مارہروی۔ مرزا محمد ہادی عزیز اور مولوی عبد الماجد بی اے کے نام لکھے ہیں وہ چھپ گئے ہیں۔ ان سے اُن کے اصلی مزاج کا رنگ اور بعض رنج کے واقعات بخوبی معلوم ہو سکتے ہیں اور ایک عمدہ

سوانحعمری تیار ہو سکتی ہے یہ خطوط نہایت دلچسپ اور لطیف مقولوں کی شان رکھتے ہیں۔ مگر پھر بھی مرزا غالب کے خطوط کی بات ان میں کہاں۔ اکبر کوئی بڑے نثار نہ تھے لہذا اُن کی کوئی نثر کی چیز سوائے ان خطوط اور اودھ پنچ کے مضامین کے جو پڑھنے کے قابل ہیں موجود نہیں ہے۔ اودھ پنچ ہی سے اُنھوں نے غالباً ظریفانہ رنگ اخذ کیا ہوگا۔

اکبر کی غزلیات چستی بندش، روزمرّہ، سلاست، روانی، بے تکلفی، اعلیٰ تخئیل، اور عمدہ تشبیہیں اکبر کی غزلوں کی جان ہیں۔ اُن کے اشعار دُنیا کی بے ثباتی دنیاوی جاہ و ثروت کی بے حقیقتی، اور دنیاوی مسرتوں کی ناپائداری کے مضامین سے مملو ہیں اور درد و اثر اور حزن و یاس کے مضامین بھی بکثرت اُن میں موجود ہیں۔ مگر اکبر کی شہرت زیادہ تر اُن کی غزلوں پر مبنی نہیں۔ کیونکہ انسے انکی مجموعی قابلیتوں کا صرف ایک رُخ نظر آتا ہے۔ نمونہ کے طور پر چند منتخب اشعار ان کی غزلوں کے یہاں لکھے جاتے ہیں۔

رنگ قدیم

جان نثاروں کے سوا کوئی نہ دیکھے سوئے دوست
چال ہے تیغ قضا کی جنبش ابروئے دوست

رقص کرتی ہے نسیم صبح کیوں مستانہ وار
گلشن دل سے اُڑا لائی ہے شاید بوئے دوست

کیسے کیسے گل کھلے ہیں نقش پائے یار سے
غیرتِ دامانِ گلچین ہو رہا ہے کوئے دوست

میں وہ آئینہ ہوں اس حیرت سرائے دہر میں
جسمیں جوہر کے عوض رہتا ہے عکس روئے دوست

لکھا ہوا ہے جور و نامرے مقدر میں
خیال تک نہیں جاتا کبھی ہنسی کی طرف

نگاہ پڑتی ہے اُن پر تمام محفل کی
وہ آنکھ اُٹھا کے نہیں دیکھتے کسی کی طرف

یہی نظر ہے جواب قاتل زمانہ ہوئی
یہی نظر ہو کہ اُٹھتی نہ تھی کسی کی طرف

ہزار جلوۂ حسن بتاں ہو اے اکبر
تم اپنا دھیان لگائے رہو اُسی کی طرف

کوئی پہونچا نہیں اے یار تیرے قدِ رعنا تک
ہماری فکرِ عالی سر سے ہو آئی طوبے تک

زمیں پر شمع روشن ہے فلک پر ماہ تاباں ہے
تمھارے نور سے ہیں فیضیاب ادنیٰ سے اعلیٰ تک

جو اُسنے ناز سے پوچھا کہ تیری آرزو کیا ہے
خوشی سے یہ ہوئے بیخود کہ ہم بھولے تمنا تک

کہیں دل ہوں کہیں میں باعثِ بیتابیِ دل ہوں
کہیں اندازِ بسمل ہوں کہیں میں نازِ قاتل ہوں

کہیں جلوہ ہوں صورت کا کہیں ہوں شاہدِ معنی
کہیں ہوں محمل لیلی کہیں لیلاے محمل ہوں

کہیں عاشق کا مطلب ہوں کہیں معشوق کی خواہش
کہیں مجبور مطلق ہوں کہیں مختار کامل ہوں

کہیں تصویرِ حیرت ہوں کہیں محوِ پریشانی
کہیں ہوں شیفتہ رُخ کا کہیں زلفوں کا مائل ہوں

کہیں ہوں ولولہ دل کا کہیں ہوں ضبط عاقل کا
روانی میں کہیں دریا کہیں رُکنے میں ساحل ہوں

رنگ متوسّط

دُنیا کا دیدنی وہ تماشا نکل گیا
اب گرد رہگئی ہے وہ میلا نکل گیا

ہر ارادہ میں نظر آتی ہے اک صورت یاس
شغل اب کچھ بھی نہیں فسخ عزیمت کے سوا

مطمئن ہو کے لگا تا ہوں لحد میں بستر	اب اُٹھاتا ہی مجھے کون قیامت کے سوا
پیغام آ رہا ہے دلِ بیقرار کا	قائم ہے سلسلہ مرے اشکوں کے تار کا
شائق ہوا ہے بوسۂ دامانِ یار کا	اللہ رے حوصلہ مری مشتِ غبار کا
باغ جہاں میں کوئی روش بےخلش نہیں	دوڑاؤں گل پہ ہاتھ تو کھٹکا ہے خار کا
شمس و قمر کو دیکھتے ہیں تجھ کو بھول کر	کیا شعبدہ ہے گردشِ لیل و نہار کا
اب تو ہے عشقِ بتاں میں زندگانی کا مزا	جب خدا کا سامنا ہوگا تو دیکھا جائیگا
ہے سبب جوشِ جنوں کا رنجِ ہجراں ای حضور	آپ تو تشریف لائیں ہوش بھی آجائیگا
عشقِ بُت میں کفر کا مجھکو ادب کرنا پڑا	جو برہمن نے کہا آخر وہ سب کرنا پڑا
تجربہ نے حُبِّ دُنیا سے سکھایا احتراز	پہلے کہتے تھے فقط مُنہ سے اور اب کرنا پڑا
عالمِ ہستی کو تھا مدِ نظر کتمانِ راز	ایک شے کو دوسری شے کا سبب کرنا پڑا

شعر غیروں کے اُسے مطلق نہیں آئے پسند
حضرت اکبر کو بالآخر طلب کرنا پڑا

(رنگ آخر)

جب یہ دیکھا کہ جہاں میں کوئی میرا نہ رہا	شدّتِ یاس سے میں آپ بھی اپنا نہ رہا
اسکی پروا نہ رہی خوش رہے دُنیا مجھسے	عاقلوں میں مری گنتی ہو یہ سودا نہ رہا
حیرت افزا ہے مرا حال مگر کون سُنے	دیدنی بھی ہے مگر دیکھنے والا نہ رہا

دیکھنے کی تو ہے یہ بات رہا کیا اُس میں
آپ اکبر سے عبث پوچھتے ہیں کیا نہ رہا

بے تعلق منزل ہستی سے گذرا دل مرا — اُسکی نظروں میں سزا وار تمنا کچھ نہ تھا

نہیں ہے کام زباں کا کچھ بدعا کے سوا — نظر کسی پہ نہیں ہے مری خدا کے سوا

کروں کیا غم کہ دُنیا سے بِلا کیا — کسی کو کیا ملا دُنیا میں تھا کیا

یہ دونوں مسئلے ہیں سخت مشکل — نہ پوچھو تم کہ میں کیا اور خُدا کیا

وہاں قالوا بلے یاں بُت پرستی — ذرا سوچو کہا کیا تھا کیا کیا

آہی اکبر بیکس کی ہو خیر

یہ چرچے ہو رہے ہیں جا بجا کیا

میرے دل سے امتیاز دی و فردا اُٹھ گیا — حشر بھی ماضی نظر آیا جو پردا اُٹھ گیا

جہان فانی کی حالتوں پر بہت توجہ عبث ہی اکبر

جو ہو چکا ہے وہ پھر نہ ہوگا جو ہو رہا ہے وہ ہو چکیگا

ترک دنیا کے خیالات کو دھوکا پایا — غور جب ہم نے کیا سانس کو دُنیا پایا

نبی کو سمجھا نہیں ہوں ابتک اگرچہ وہ اصل مدعا ہے

خدا کو البتہ جانتا ہوں خدا ہی ہے جو ہو رہا ہے

جُدائی نے میں بنایا مجھ کو جُدا نہ ہوتا تو میں نہ ہوتا

خُدا کی ہستی ہے مجھ سے ثابت خُدا نہوتا تو میں نہوتا

دونگا ذرا سمجھ کے جواب انکی بات کا — رُخ دیکھتا ہوں سلسلۂ واقعات کا

دہر میں سوختۂ گرمی بازار نہ ہو — دل میں ہو خون تو سودا کا خریدار نہو

نقش دل ہو صفت معنی رنگیں ای دوست — رنگ ظاہر پہ نہ جا نقش بہ دیوار نہو

سانس کی طرح چلے منزل ہستی میں بشر — مدعا یہ ہے کہ دم بھر کو بھی بیکار نہو

نہیں آزاد جو اپنوں سے تعلق کرے قطع — وہ ہے آزاد جو غیروں کا گرفتار نہ ہو
بزم ہے شعلہ مزاجوں کی سنبھل اے اکبر — برق خرمن کہیں یہ گرمیٔ گفتار نہ ہو

جنون عشق سے انسان کی طینت سنورتی ہے — یہی مستی وہ ہے جو عقل کو ہشیار کرتی ہے
یہ سچ ہے بیخبر ہے نصف دنیا نصف دنیا سے[۱] — کہ یہ ماتم میں ہے مصروف اور وہ چین کرتی ہے
وہ ایذائیں مجھے مایوسیوں نے دی ہیں اے اکبر
کہ امید اب قدم رکھتے ہوئے بھی دل میں ڈرتی ہے

اکبر کی خوش طبعی اور ظرافت اکبر کی خاص شہرت اُنکی ظرافت، بذلہ سنجی اور لطیف طنزیات پر مبنی ہے جو اُن کی زرین نظموں میں آبدار موتیوں کی طرح چمک رہی ہیں۔ اُن کا ابتدائی ظریفانہ رنگ اودھ پنچ کی نامہ نگاری سے شروع ہوا مگر وہ بہت جلد اُس سے گزر کر ترقی کے مدارج اعلیٰ تک پہونچ گیا۔ اسمیں کوئی شک نہیں کہ اوائل عمر ہی میں اُنکو اس رنگ سے خاص لگاؤ تھا کیونکہ اِس زمانہ کے کلام میں بھی متین اشعار کے ساتھ کہیں کہیں مذاقیہ اور ظریفانہ اشعار کہہ جاتے ہیں۔ اُس کے بعد جوں جوں زمانہ گزرتا گیا اور سوسائٹی کا رنگ بدلتا گیا اُن کے اس رنگ میں ترقی ہوتی گئی اور پختہ کاری آتی گئی اس رنگ نے اُنکی شوخ طبیعت کے واسطے نئے نئے راستے کھول دیے اور اُنھوں نے اس سے نہایت مفید خاص خاص کام لینا شروع کیے۔ اس رنگ میں حقیقتاً وہ بیمثال رہے اور ہر چند کہ بہت سے لوگوں نے انکی نقل کرنا چاہی مگر صحیح معنوں میں

[۱] ۔ مقابلہ کرو آدم اسمتھ کے اس مقولہ سے کہ "مفلسی ایک راز ہے جو نصف دنیا نصف دنیا سے چھپاتی ہے"۔ ۱۲

کوئی ناقل نہ ہوا سب نقال ہے۔ وہ حقیقی ظرافت اور شاعرانہ دل ودماغ کا مجموعہ تھے۔
اُن کا تیسرے دور کا کلام خاصکر اس رنگ میں بہت کامیاب ہے اسمیں ان کی
ظرافت محض ظرافت ہے آخر عمر میں البتہ اس طرز وروش میں فرق آگیا ہے اور وہ
ظرافت کے پردہ میں اور بہت سے مفید مضامین ادا کر جاتے ہیں۔ اس وقت
اگرچہ وہ نحیف وزار ہوگئے تھے مگر شاعرانہ دل ودماغ برابر اپنا کام کرتا تھا۔ اس زمانہ
میں وہ ظرافت اور بذلہ سنجی کو۔ اخلاقی، سیاسی، روحانی مسائل کے ادائے مطالب
کا ایک مؤثر ذریعہ بنائے ہوئے تھے۔ مقصود بالذات صرف ظرافت نہ تھی بلکہ تعلیم
حقایق مقصود اصلی تھی۔

اکبر کی ظرافت کے اجزا حسب ذیل ہیں:۔

(۱) جدید اور لطیف تشبیہیں اور تمثیلیں جو عام مشاہدے کی چیزوں میں
برتی جاتی ہیں۔ اُن میں وہ تصنّع اور نازک خیالی سے کام نہیں لیتے بلکہ انھیں چیزوں
کا ذکر کرتے ہیں جنکو ہر شخص دیکھتا ہے اور جانتا ہے اور انھیں کے بیان میں
ایک خاص جدّت اور لطف پیدا کر دیتے ہیں جس سے دل مزے لیتا ہے۔

(۲) نئے نئے با مذاق الفاظ مختلف زبانوں کے آخر شعر میں بطریق قافیہ
استعمال کرتے ہیں۔

(۳) معمولی الفاظ ایسے انوکھے طریقہ سے استعمال کرتے ہیں جو اُس سے
قبل کبھی نہیں سُنے گئے تھے۔

(۴) ایسے معمولی اور سبک الفاظ جن کو شعرا عام طور پر استعمال نہیں کرتے تو وہ
شعر میں نہایت جدّت طرازی اور شوخی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ اس قسم کے

الفاظ کی اتنی کثرت ہے کہ اُن کی ایک مختصر فرہنگ تیار ہو سکتی ہے مثلاً کلُو۔ صلُو۔ بُدّھو۔ جُمّن۔ وغیرہ۔ کہ یہ اُن کے خاص اصطلاحات ہیں اور وہ انکو خاص خاص معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ معمولی معمولی الفاظ مثلاً گٹ پٹ فالتو۔ یا اکثر بازاری محاورے جو شعر میں نہیں کھپ سکتے اور عام طور پر کانوں کو برے معلوم ہوتے ہیں مگر اُن کے کلام میں وہ نہایت عمدگی سے استعمال ہوئے ہیں اسی طرح ایسے بھی الفاظ ہیں کہ جو دیگر شعرا کے یہاں اور معنی میں استعمال ہوے ہیں مگر اکبر اُن کو بالکل دوسرے معنی میں استعمال کرتے ہیں بعض ایسے انگریزی الفاظ بھی لکھ جاتے ہیں جو اُردو میں ہنوز مروج نہیں ہوے اور کلام میں ثقیل اور بے میل معلوم ہوتے ہیں۔ اس تراش خراش میں اُنھوں نے محض اپنی طباعی اور ذہانت سے کام لیا ہے۔ کوئی رنگینی عبارت یا عمق معنی پیدا کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ صرف ہنسنا ہنسانا مقصود ہے۔

اکبر کی ظرافت کو محض بذلہ سنجی اور تمسخر نہ سمجھنا چاہیے، اُسکی تہ میں نہایت لطیف اور عمیق معنی ہوتے ہیں اور کوئی نہ کوئی حقیقت خواہ وہ اخلاقی ہو یا تعلیمی، سیاسی ہو یا معاشرتی، ادب آموز ہو یا روحانی ہمیشہ اُس میں پنہاں ہوتی ہے۔ اُن کے الفاظ اور معانی میں ہمیشہ چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ ان کے پند و نصائح کبھی تلخ نہیں معلوم ہوتے اور نہ اُن کا مذاق عامیانہ اور سوقیانہ ہوتا ہے۔ انکی ظرافت بہت جامع اور وسیع ہوتی ہے۔ وہ کبھی کسی مخصوص شخص یا جماعت کا خاکہ نہیں اُڑاتے بلکہ ان کی ظرافت کے تیر بلا لحاظ مراتب سب طرف چلتے ہیں۔ البتہ واقعات و سیاسیات حاضرہ اُنکی خاص دلچسپی کی چیز ہے۔ مغربی طرز تعلیم اور ہندوستان میں

انگریزی تہذیب کی دلدادگی پر اُنھوں نے بہت کچھ کہا ہے۔ اسیطرح سوسائٹی کی خرابیوں اور تعلیمی اور مذہبی نقائص کو بھی نشانۂ ظرافت بنایا ہے۔ امیر و غریب عالم و جاہل ہندو مسلمان سُنی شیعہ سب کی بلا امتیاز و تفریق خبر لیگئی ہے۔ اُن کے کلام کو دیکھکر معلوم ہوتا ہے کہ سیاسیات سے اُن کو خاص دلچسپی تھی۔ اس قسم کے بعض اشعار بادی النظر میں تو معمولی معلوم ہوتے ہیں مگر نظر غور سے دیکھا جائے تو ان میں تیر و نشتر بھرے ہیں۔

اکبر کی خاص اصطلاحات یہ ہیں۔ مس۔ شیخ۔ سیّد۔ اونٹ۔ گائے۔ کلیسا مسجد۔ مندر۔ بُت۔ کالج۔ برہمن۔ لالہ۔ اور اسی قسم کے دیگر الفاظ جو ایک خاص معنی رکھتے ہیں۔ مس سے مغربی تعلیم کی نظر فریبی اور دلکشی۔ شیخ سے پُرانے رنگ کے مسلمان جو اپنے مذہب کی باتوں سے تو واقف ہیں مگر انگریزی تہذیب سے بالکل ناآشنا ہیں۔ سیّد سے سر سیّد مرحوم جو انگریزی تعلیم و تہذیب کے دلدادہ تھے۔ یا ان کے متبعین یعنی علیگڈھ کالج کی تعلیم کے عاشق۔ اسی طرح اونٹ سے مسلمانوں کی قدیم شان و شوکت اور گائے سے مسلمان ہندوؤں کا اتحاد مُراد ہے۔

اقسامِ ظرافت اکبر کی ظرافت مندرجۂ ذیل اقسام پر تقسیم ہو سکتی ہے۔ مذہب۔ سیاسیات۔ تہذیب جدید۔ پردہ و تعلیم نسواں۔ ظرافتِ الفاظ۔ طنزیات۔
ان سب اقسام کے نمونے بالترتیب مختصراً پیش کیے جاتے ہیں۔

مذہب

داڑھی خدا کا نور ہے بیشک مگر جناب
فیشن کے انتظامِ صفائی کو کیا کروں

چہرے کے نیچے تہ ہی داڑھی کا جھول جھال — اِس فرد کو سجایئے تفصیل ذیل سے

سجائیں شوق سے ناقوس برہمن اکبر — یہاں تو شیخ کو دھن ہی بگل بجانے کی

مرعوب ہو گئے ہیں ولایت سے شیخ جی — اب صرف منع کرتے ہیں دیسی شراب کو

پیتا ہوں شراب آب زمزم کے ساتھ — رکھتا ہوں اک اونٹنی بھی ٹمٹم کے ساتھ

ہے عشق حقیقی و مجازی دونوں — قوّال کی بھی صدا ہے چھم چھم کے ساتھ

صاف کہتا ہوں رہیں خوش یا ہوں ناخوش مولوی

آسماں اب چاہتا ہے مولوی کُش مولوی

پیارا ہے ہمکو شیخ ہمارا بُرا سہی — چاقو ولائتی نہیں دیسی چُھرا سہی

مصیبت میں بھی اب یادِ خدا آتی نہیں انکو — دُعا مُنہ سے نہ نکلی پاکٹوں سے عرضیاں نکلیں

بے نمازوں میں ہیں وہ اور اسپہ شرماتے نہیں — یہ غنیمت ہے کوئی ٹوکے تو گرماتے نہیں

نیست کس مصروف کار دیں بقلب مطمئن — یک فنا فی الانرست و یک فنا فی اللہ ورن

شیخ پر گو کہ رشک آتا ہے — اونٹ کے سب لغات جانتے ہیں

ہیں مگر اونٹ پر ہمیں قابض — کام کی ہم یہ بات جانتے ہیں

اسلام کی رونق کا کیا حال کہیں تم سے — کونسل میں بہت سید مسجد میں فقط جمّن

آج بنگلے میں مرے آئی تھی آواز اذاں — جی رہے ہیں ابھی کچھ اگلے زمانے والے

مکّہ تک ریل کا سامان ہوا چاہتا ہے — اب تو انجن بھی مسلمان ہوا چاہتا ہے

سیاسیات

حریفوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جاکے تھانے میں — کہ اکبر ذکر کرتا ہے خدا کا اس زمانے میں

انوکھے ہیں مشاغل حضرت اکبر کے ان روزوں
الم ترکیف بیٹھے پڑھ رہے ہیں فیل خانے میں

مرید ان کے تو شہروں میں اڑے پھرتے ہیں موٹر پہ
نظر آتے ہیں لیکن شیخ جی ابتک میانے میں

بابو کہنے لگے سجبٹ پہ لڑو
ملک کو دیکھو اپنے حق پہ اڑو

کہدیا صاف ہم نے اے مہراج
ہو مبارک تمھیں یہ کام یہ کاج

ما مقیمان کوے دلداریم
یا ڈپوٹیشن ست یا غم میم

کھینچو نہ کمانوں کو نہ تلوار نکالو
جب توپ مقابل ہو تو اخبار نکالو

یہ دال لب گنگ کبھی گل نہیں سکتی
کلو کے پٹاخے سے بلا ٹل نہیں سکتی

کامیابی کا سدیشی پر ہر اک دل بستہ ہے
چونچ طوطا رام نے کھولی مگر پر بستہ ہے

اصل کا اس بت خود بیں سے کوئی ہنٹ کہاں
صرف بوسہ میں بھلا سلف گورنمنٹ کہاں

ممبر علیم ادہیں یا سکھ ندہاں ہیں
لیکن معائنہ کو وہی نا بدان ہیں

تعلیم و تہذیب جدید

ہم ایسی کل کتابیں قابل ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کے لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

شوق لیلائے سول سروس نے اس مجنون کو
اتنا دوڑایا لنگوٹی کر دیا پتلون کو

جامۂ ہستی کے ٹکڑے اڑ رہے ہیں نزع میں
پھینکیے اب کوٹ کو تہ کیجیے پتلون کو

نہ تیر افگنی ہے نہ اب حکمرانی
نہ وہ وضع ملت نہ قرآن خوانی

نہ باہم ادب ہے نہ وہ مہربانی
یہی کہتی پھرتی ہے لڑکے کی نانی

ہر اک شاخ میں پاپ لپی بولا ہے
مرا لال کالج کا کاکا توا ہے

تعلیم جو دی جاتی ہے ہمیں وہ کیا ہے فقط بازاری ہے
جو عقل سکھائی جاتی ہے وہ کیا ہے فقط سرکاری ہے

اُڑا دیا ہر اک کو مغرب نے پاس کر کے
سید بھی کورے کھسکے برسوں مساس کر کے

سنتے نہیں ہیں شیخ نئی روشنی کی بات
انجن کی ان کے کان میں اب بھاپ دیجئے

پردہ و تعلیم نسواں

پردہ اُٹھتا ہے ترقی کے یہ سامان تو ہیں
حوریں کالج میں پہنچ جائینگی غلمان تو ہیں

غریب اکبر نے بحث پردہ کی کی بہت کچھ مگر ہوا کیا
نقاب اُلٹ ہی دی اُسنے کہکر کہ کریگا مرا مُوا کیا

اُٹھ گیا پردہ تو اکبر کا بڑھا کون ساحق
بے پکارے جو مرے گھر میں چلا آتا ہے

بے حجابی مری ہمسائے کی خاطر سے نہیں
صرف حکام سے ملنے میں مزا آتا ہے

نظر میں تیرگی ہو اور رگوں میں ناتوانی ہو
ضرورت کیا ہے پردے کی جہاں میسے کا پانی ہو

تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر
خاتون خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہوں

ذی علم و متقی ہوں جو ہوں انکے منتظم
اُستاد اچھے ہوں مگر اُستاد جی نہ ہوں

ترقی کی نئی راہیں جو زیر آسماں نکلیں
میاں مسجد سے نکلے اور حرم سے بیبیاں نکلیں

حامد چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی
اب ہے شمع انجمن پہلے چراغ خانہ تھی

ہمارے ملک میں ہونا ہے کیا تعلیم نسواں سے
بجز اسکے کہ باوا اور بھی گھبرائیں اماں سے

ظرافت الفاظ

ح حکومت کی جب یہاں نہ رہی
حنفی نفی ہیں معطل ہیں ÷

ہر طرح اب ہیں عاجزی ہم میں
اب ہمارے امام حنبل[1] ہیں

اذانوں سے سوا بیدار کن انجن کی سیٹی ہے
اسی پر شیخ بیچارے نے چھاتی اپنی پیٹی ہے

[1] انگریزی میں ہمبل بمعنی عاجز کے ہیں ۱۲

کہاں باقی رہے ہم میں وہ اورادِ سحر گاہی ۔۔۔ وظیفہ کی جگہ پایونیر یا آئی ڈی ٹی ہے
گئے شربت کے دن یاروں کے آگے اب تو اے اکبر ۔۔۔ کبھی سوڈا کبھی لمنڈ کبھی وہسکی کبھی ٹی ہے
شیخ تثلیث کی تردید تو کرتے نہیں کچھ ۔۔۔ گھر میں بیٹھے ہوئے والتّین پڑھا کرتے ہیں
عاشقی کا ہو بُرا اُسنے بگاڑے سارے کام ۔۔۔ ہم تو اے بی میں رہے اغیار بی اے ہوگئے
شیخ جی گھر سے نہ نکلے اور یہ فرما دیا ۔۔۔ آپ بی اے پاس ہیں اور بندہ بی بی پاس ہے
پکالیں پیس کر دو روٹیاں تھوڑے سے جَو لانا ۔۔۔ ہماری کیا ہے اے بھائی نہ مسٹر ہیں نہ مولانا
عہد اسلام و عہد انگلش میں ۔۔۔ سُنیے قولِ اکبرِ سخنگو کا
پہلے توحید تھی تو اب تحصیل ۔۔۔ آگے غُل ایک کا تھا اب دو کا

طنزیات

آبرو اگر ملے جو ہے نام و نمود میں ۔۔۔ کیا حرج زندگی ہو اگر حالِ زشت میں
دوزخ کے داخلے میں نہیں ان کو عذر کچھ ۔۔۔ فوٹو کوئی لگا دے جو ان کا بہشت میں
نہ نماز ہے نہ روزہ نہ زکوٰۃ ہے نہ حج ہے ۔۔۔ تو خوشی پھر اسکی کیا ہے کوئی جنٹ کوئی جج ہے

ہماری مجلسیں اب بھی لطیف اجزا سے مملو ہیں
بُزِ اخفش تھے قبل اسکے اب اسپنسر کے ٹٹو ہیں

حالِ دُنیا سے بیخبر ہیں آپ ۔۔۔ گو تقدس مآب بیشک ہیں
شیخ جی پر یہ قول صادق ہے ۔۔۔ چاہِ زمزم کے آپ مینڈک ہیں
شیخ جی کو جو آگیا غصّہ ۔۔۔ لگے کہنے یہ پھینک کر دھسّا
تم ہو شیطان کے مطیع و مُرید ۔۔۔ تم کو ہر ایک جانتا ہے پلید
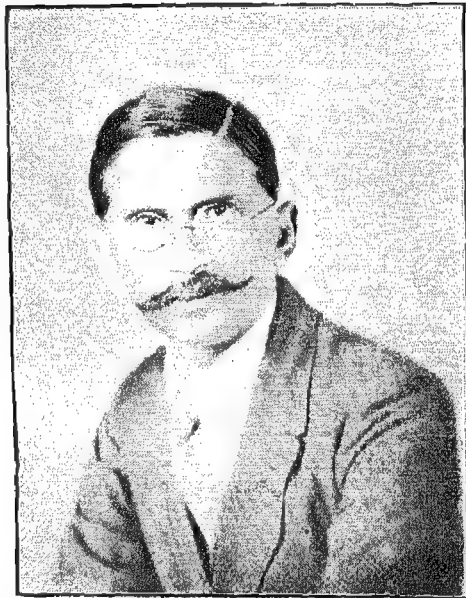
مرزا جعفر علی خان اثر لکھنوی

مولانا حسرت موہانی

ہے تمھاری نمود بس اتنی	جس طرح ہو پڑی پڑے پہ لید

استحصال بالجبر

یعنی ایسے اشعار جو ادنیٰ تغیر الفاظ سے کلام اکبر بن گئے ہیں ۔

کریما بہ بخشائے برحال قوم	صلوٰۃ است رائج در ایشاں نہ صوم
کریما بہ بخشائے برحال بندہ	کہ ہستم اسیر کمیٹی و چندہ
رشتۂ در گردنم افگندہ پیٹ	مے برد ہر جا کہ کیک است و پلیٹ
پہلے ہم لوگ یہ سمجھتے تھے	ہر چہ از باپ میرسد نیکوست
ہوگئی اب خیال کی اصلاح	ہر چہ از آپ میرسد نیکوست
اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز پانیر	کرزن چہ گفت و مل چہ شنید و ملر چہ کرد
ہیٹ را نہ بر سر من جائے دستار العزیز	مرد تا مسٹر تو اند شد چرا قبلہ شود
عمر گزری ہے اسی بزم کی طراری میں	دوسری پشت ہے چندہ کی طلبگاری میں
ڈنر سے تمکو کم فرصت یہاں فاقہ سے کم خالی	چلو بس ہو چکا ملنا نہ تم خالی نہ ہم خالی
الا یا ایہا الطفلک بجو راحت بہ ناولہا	کہ قرآں سہل بود اول ولے افتاد مشکلہا
بکن تزئین پائے خود بہ بوٹ و اسن و پتلوں	کہ سر سید خبردار ز راہ و رسم منزلہا
سکۂ زر با بوے در دھوتی زرتما ر داشت	با وجودش نالہائے زار در اخبار داشت
گفتمش در عین وصل ایں نالہ و فریاد چیست	گفت مارا خوف فیس و ٹکس در ایں کار داشت
در پس ہر گریہ آخر خندہ ایست	بعد ہر اسپیچ آخر چندہ ایست
یاد دار ایں قول مولانائے روم	مرد آخر بیں مبارک بندہ ایست

ہم ڈنر خواہی وہم آر دغ صاف   ایں خیال ست ومحال ست وگزاف

اکبر کی سیاسی نظمیں اس قسم کی نظمیں دو طرح کی ہیں۔ایک وہ جن میں محض ظرافت ہی ظرافت ہے یعنی ایک عمدہ خیال ظریفانہ طرز میں ادا کیا گیا ہے اور بس ان کا مقصد صرف خوش طبعی ہے۔دوسری وہ کہ جن میں ظرافت کے پردہ میں سیاسی معاملات اور حقایق مضمر ہیں۔اس قسم کے اشعار میں مصنف کی رائے کے ساتھ اُنکی ذاتی ناراضی اور غیظ وغضب بھی شامل ہے۔ان میں ظریفانہ انداز صرف اس لیے اختیار کیا گیا ہے کہ حق بات کی تلخی دور ہوکر شاعر کا دلی مطلب سامع کے دل میں اُتر جائے۔اس قسم کے اشعار سے وہ وہی کام لیتے ہیں جو ایک ہوشیار ڈاکٹر شکر آلود تلخ گولیوں سے لیتا ہے۔معمولی اشخاص کے واسطے ایسے اشعار صرف ہنسنے ہنسانے کا کام دیتے ہیں۔مگر جو لوگ اُن کے انداز طبیعت سے واقف ہیں اُن کے لیے وہ بہت عمیق معنی رکھتے ہیں۔پڑھنے والے کو چاہیے کہ اس قسم کے اشعار کا مطلب سمجھنے کیواسطے وہ ذرا غور و فکر سے کام لے سیاسی اشعار میں وہ مغربی طرز معاشرت کی حقیقی اور اصلی کیفیت دکھلاتے ہیں اُن کے نزدیک یہ سب دام ہیں جو مشرقی روحانیت کو شکار کرنے کے لئے بچھائے گئے ہیں۔سیاسی حقوق کو وہ محض زنجیر غلامی کی مختلف کڑیاں تصور کرتے ہیں جو سیدھے سادے ہندوستانیوں کے پھانسنے کی تدبیریں ہیں۔اُن کے نزدیک سرکاری اسکول ایسے کارخانوں سے زیادہ نہیں جن میں کلارک لوگ تیار کیے جاتے ہیں اور غلامی ذہنیت اور بڑھائی جاتی ہے اور انگریزی تعلیم سے زنجیر غلامی کی کڑیاں اور بھی کستی جاتی ہیں وہ محکمۂ سی۔آئی۔ڈی سے معشوق کی کمر کی تلاش کراتے ہیں اور کہتے ہیں۔

کیا پوچھتے ہو اکبر شوریدہ سر کا حال   خفیہ پولس سے پوچھ رہا ہوں کمر کا حال

عیسائیت کے اس فرسودہ اعتراض کے جواب میں کہ اسلام بذریعہ شمشیر پھیلایا گیا وہ پوچھتے ہیں کہ کیا یورپ بھی اپنی توپوں اور مغربی سازوسامان کی چمک چوندھ سے روپیہ وصول نہیں کرتا اور رعایا کو دائمی غلامی کی زنجیروں میں جکڑ بند کرنا نہیں چاہتا۔ مگر اس قسم کے اشعار کو انکی ذاتی رائے سمجھنا ضروری نہیں۔ کیونکہ اکبر ایک بڑے شاعر تھے۔ سیاست داں نہ تھے۔ اُنھوں نے علم پالٹیکس کی تعلیم نہیں پائی تھی۔ بلکہ وہ ایک سرکاری ملازم تھے اور مختلف عہدہ ہائے سرکاری پر اپنے فرائض منصبی قابلیت سے انجام دیکر پنشن پا گئے تھے اور حُسن خدمات کے صلے میں خان بہادری کا خطاب بھی ملا تھا۔ چونکہ وہ شاعر تھے لہذا ہر قسم کے خیالات کا اظہار شعر ہی میں کرتے تھے اس سے غرض نہیں کہ وہ خیال ان کا ذاتی ہوتا یا کسی دوسرے کا ہوتا تھا۔ اُن کو خیال کی واقعیت سے سروکار نہ تھا بلکہ اُسکے طرز ادا سے تھا۔ وہ کبھی گورنمنٹ کے موافق اور کبھی گورنمنٹ کے خلاف لکھتے تھے۔ اور چونکہ شاعر تھے لہذا نتائج کی گرفت سے بےخوف تھے انکی رائیں جیسا کہ اُن کے اشعار سے ظاہر ہوتی ہیں کسی ماہر سیاسیات کی مستند رائیں نہیں شمار کیجا سکتیں کیونکہ اُن کے مقولوں میں بعض جگہ اختلافات بھی ہیں۔ وہ فطرتاً بہت محتاط تھے اور کوئی ایسی رائے نہیں ظاہر کرسکتے تھے جسکے نتیجہ میں اُنکو دشواریاں پیش آتیں۔ وہ شاعر پہلے ہیں اور ماسوائے شاعر بعد کو۔ اُن کا مقدم فرض منصبی خوش کرنا ہے خیالات کا اظہار اُس کے مابعد ہے۔ وہ کسی گروہ یا جماعت کی کمزوریوں کی گرفت کرتے ہیں اور ان کو اپنے اشعار میں نہایت مختصر جامع اور ظریفانہ انداز سے پیش کرتے ہیں۔ بعض اوقات وہ مسلمانوں کے معترف ہیں کہ وہ انگریزی تعلیم حاصل کرنے میں کوشاں ہیں۔ دوسرے مواقع پر وہ اسی تعلیم مغربی کے سخت

مخالف ہیں کیونکہ یہ بیدینی اور لامذہبی کا زینہ ہے۔ وہ اخلاقی مسائل کو کسی رفارمر یا
فلسفی کیطرح شرح وبسط سے بیان کرنا نہیں چاہتے بلکہ اُن کو اپنے اشعار میں دلچسپ
مختصر طریقہ سے بیان کرجاتے ہیں مگر یہی اختصار مضمون کو بہت معنی خیز اور پُرزور
بنا دیتا ہے۔ پھر الفاظ کے انتخاب میں اُن کو وہ یدطولیٰ حاصل ہے کہ ایک ہی لفظ
سے کئی کئی معنی نکالتے ہیں جو بادی النظر میں عام لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتے۔ اُنکے
نزدیک تمام سیاسی امراض کی جڑ ہندوستان کی کمزوری ہے ہماری خوشامد اور گڑگڑانے
سے اور اسی طرح آہ وزاری اور اضطراب سے ہم کو کوئی فائدہ نہیں پہونچ سکتا۔
یہ قوے کا بیکار مصرف اور کمزوری کی نشانی ہے۔ اسی طرح اُنھوں نے کانگریس کی
کارروائیوں انتہا پسند جماعتوں "اور جابرانہ" حکومت کے نقائص کا بھی خوب خاکہ اُڑایا ہے
یہ سب مضامین نہایت نادر استعارات لطیف اشارات اور بلیغ ظرافت کے پردہ میں
چھپے ہوے ہیں معمولی پڑھنے والوں کے واسطے تو وہ محض ایک زعفران زار ہیں
اگر چشم حقیقت بین انکی تہ میں ایک معنی دیکھتی ہے۔ اُن کے اشعار میں محض سماعی اثر
سے بہت زیادہ اثر ہے۔ ان کے بعض اشعار پر گورنمنٹ کو جنگ عظیم اور بلوہ مسجد کانپور
کے زمانہ میں ان کو متنبہ کرنا پڑا تھا کہ شورش انگیز مضامین لکھنے سے آیندہ اجتناب
کریں۔ اُن کے اشعار بہت مؤثر تھے اور ہر شخص کی زبان پر تھے اسواسطے کہ اَدنےٰ سے
اعلیٰ اور عامی سے عالم تک اُن کو پڑھتے اور اپنی اپنی سمجھ کے مطابق اُن کا مطلب
نکال کر اُن سے محظوظ ہوتے تھے۔ اُن کے کلام کی یہ بھی ایک خاص صفت ہے
کہ اُردو اور ہندی زبان کے دلدادہ دونوں اُسکو مساوی طریقہ پر پسند کرتے ہیں۔
سیاسی اور اخلاقی میدان میں اکبر ایک قومی شاعر ہیں وہ اپنی قوم کے

لوگوں کو تنبیہ کرتے ہیں کہ تم نے اپنا قومی امتیاز اور قومی آئیڈیل چھوڑ دیے اور مغربی معاشرت اور مغربی تعلیم کے دلدادہ ہو گئے۔ اُن کا یہ اعتقاد ہے کہ روحانیت مادیت پر ضرور غالب آئیگی۔ تمام سیاسی مشکلات کا اُن کے نزدیک حل یہ ہے کہ احکام خداوندی کی تعمیل کی جائے اور قدرت خداوندی پر پورا بھروسا رکھا جائے ۔

اکبر بحیثیت نکتہ چین سوسائٹی

اکبر کی شاعری کی نمود کا زمانہ وہ تھا جبکہ ہندوستان گویا نیا جنم لے رہا تھا۔ مغربی تعلیم اور مغربی معاشرت کی شراب خالص ہندوستانیوں کے دماغوں میں اثر کر گئی تھی جسکی وجہ سے اعتدال دماغی وہ کھو بیٹھے تھے ہندوستان ایک عجیب انقلاب کا جولانگاہ تھا مغربی تمدن، مغربی اخلاق و معاشرت، غرض کہ ہر قسم کی مغربیت آنکھوں کو خیرہ اور دماغوں کو تیرہ کر رہی تھی۔ ہندوستانی لوگ مغربیت کے اتنے دلدادہ ہو گئے تھے کہ انگریز بننا اپنا فخر سمجھتے تھے۔ اس قسم کے لوگوں کو اسمیں خاص لطف آتا تھا کہ پرانی تہذیب اور پرانے خیالوں کا خاکہ اڑائیں۔ وہ ہر ہندوستانی چیز کو نگاہ حقارت سے دیکھتے تھے۔ یورپی نام۔ یورپی لباس۔ یورپی طعام۔ یورپی وضع و قطع مرغوب خاطر تھی۔ انگریزی گفتگو ایک خاص طغرائے امتیاز سمجھی جاتی تھی۔ ہر انگریزی چیز خواہ کیسی ہی ہو ہندوستانی چیز سے بہتر خیال کیجاتی تھی مختصر یہ کہ فاتحوں نے مفتوحوں کے عقل و تمیز ہوش و خرد پر بھی تسلط پالیا تھا قدیم رسم و رواج حتیٰ کہ مذہب کی بھی بے احترامی اور رسوم شکنی کی ہوا چلی ہوئی تھی۔ یہی پر آشوب زمانہ تھا کہ اس میں کچھ انجام بیں ہستیاں بھی پیدا ہو گئیں۔ یہ لوگ آیندہ خطرے سے واقف تھے۔ اُنھوں نے اُن تیز رفتار لوگوں کو جو شتر بے مہار کی طرح منہ اُٹھائے چلے جاتے تھے آگے بڑھنے سے روکا اور راستہ کے

خطرات سے آگاہ کیا۔ بنگال کا نامور افسانہ نگار بنکم چندر چٹرجی اسی قبیل کا آدمی تھا۔ اسنے اپنے پُرزور اور دلچسپ ناولوں میں انگریزی تہذیب اور انگریزی سوسائٹی کا جو خاکہ اُڑایا ہے اور جو کام اس کے افسانوں سے نکلا وہ بہترین وعظ و نصیحت اور سخت ترین نکتہ چینی سے ہرگز نہیں نکل سکتا تھا۔ اکبر نے بھی یہی روش اختیار کی مگر اُن کا حربہ بجائے نثر کے نظم تھا۔ اُنھوں نے بھی اُس زمانہ کی حماقتوں کو خوب لتاڑا اور لوگوں کے غرور اور طرز روش کا لطیف جوابات الزامی سے خوب خاکہ اڑایا ہے اگر بعض جگہ وہ چوک گئے ہیں اور نشانہ خطا کر گئے ہیں۔ اُنھوں نے تناسب حالات اور مصالح وقت کا خیال نہ کر کے بسا اوقات مغربی تہذیب کے درخت کو بیخ و بُن سے اُکھاڑنا چاہا ہے۔ وہ وقت کے ساتھ چلنا نہیں چاہتے تھے۔ اور مغربی تعلیم کے مستقل اور دیرپا فوائد کے بھی قائل نہ تھے۔ شاید اسی وجہ سے یعنی انتہائی قدامت پسندی سے پوری پبلک اُن کے ساتھ نہ تھی۔ اور اسی وجہ سے اُنکی شہرت پر کسی[1] قدر اثر پڑا۔

اس نئے انقلاب کے زمانہ میں سرسید سب سے پہلے شخص تھے جو مغربی تہذیب کے فوائد سے بہت متاثر ہو گئے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کو اُن کے

---

[1] - یہ مصنف صاحب کی ذاتی رائے معلوم ہوتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ اکبر ایک بہت مذہبی شخص تھے اور آخر عمر میں تو علی الخصوص اُن کا کلام مذہب اور روحانیت سے مملو تھا۔ وہ ترقی اور تہذیب کے کسی حال میں منکر نہ تھے عام اس سے کہ وہ مردوں میں ہو یا عورتوں میں۔ مگر جب اس ترقی و تہذیب کا تصادم مذہب سے ہوتا تھا تو وہ ہزار تہذیبوں کو مذہب پر قربان کرنا پسند کرتے تھے۔ مگر اس سے اُنکے کمال اور شہرت پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ اور کوئی طبقہ یا جماعت ایسی نہیں ہے کہ جو اِن کے کمال فن کی قائل اور معترف نہو محض اسوجہ سے کہ وہ ابن الوقت نہ تھے۔ بلکہ برعکس اسکے یہی احترام مذہب مثل ظرافت کے ان کا طرۂ امتیاز رہے۔

خواب غفلت سے چونکانے اور اُن کو قعرِ ذلت سے نکالنے کا بس یہی ایک ذریعہ ہے برخلاف اس کے اکبر تہذیب جدید کی کامل تقلید اور اسکی ہر بات ماننے کے مؤید نہ تھے۔ ہمارے نزدیک ان کا یہ خیال کہ مغربی تعلیم و تہذیب تمامتر بُری اور ناقابل تقلید ہے صحیح نہ تھا۔ وقت کے سیلاب کو روکنا یا اُسکے مخالف چلنا عقل کی بات نہیں ہے۔ اکبر جدید تعلیم کے اس وجہ سے مخالف تھے کہ اسمیں مذہب کو بالکل بھلادیا گیا ہے اور اسی وجہ سے لوگ آزاد خیال ہوکر مذہب کا مضحکہ اُڑاتے ہیں۔ وہ پردے کے قیود کم کرنے یا توڑنے کے بھی سخت مخالف تھے۔ کیونکہ اُن کے نزدیک اس میں بڑے بڑے نقصان ہیں۔ اُن کو معلوم تھا کہ انگلستان اور یورپ و امریکہ وغیرہ میں اس جنسی آزادی اور ارتباط سے بُرے بُرے نتیجے آئے دن پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ وہ اس خیال سے کانپتے تھے کہ اگر اسی قسم کا اختلاط مردوں اور عورتوں میں ہندوستان میں واقع ہوا تو اس سے کتنا بڑا طوفان برپا ہوگا۔ ان کے نزدیک مشرقی اور مغربی تہذیب و تمدن میں بعد المشرقین واقع ہے۔ اس ملک کے حالات خیالات روایات رسوم و رواج یورپ سے بالکل مختلف اور اکثر متضاد ہیں۔ یورپی خرابیوں کی اصلاح کی تدابیر ہندوستان کے لئے موزوں نہیں ہیں کیونکہ اسمیں اور ان میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اسیطرح وہ مغربی طرز پر تعلیم نسواں کے بھی سخت مخالف ہیں۔ کیونکہ اس سے عورتوں کے اخلاق پر ضرور اثر پڑیگا۔ انھیں وجوہ سے انھوں نے مغربیت پسندی کا اپنے اشعار میں خوب خاکہ اُڑایا ہے اور جابجا اسپر طنز کیے ہیں۔ ہندوستانی عشاق کو انکی رائے میں کتاب محبت کا سبق اپنے ہم مشربان یورپ سے لینا پڑیگا۔ اور ہندوستانی معاشیق کو ادا و ناز اور کرشمہ و غمزہ کا انداز اپنی یورپین ہمجنسوں سے سیکھنا پڑے گا

کمیٹیوں اور چندوں کا زمانہ ہے مردوں اور عورتوں دونوں کے خیالات اور جذبات اور اخلاق ہر چیز میں اک انقلاب عظیم پیدا ہوگیا ہے پُرانے قومی آئیڈیل لوگ کھو بیٹھے یا انکو عمداً حوالہ ماضی کردیا۔ علما و عرفا نے اپنی قدیمی وضع چھوڑکر شہرت پرستی اور نفس پرستی اختیار کرلی صوفی اب اپنے زہد و ورع کی تجارت کرنے لگے۔ علما مثل سابق کے شمع ہدایت نہیں رہے۔ عورتیں "چراغ خانہ" سے "شمع انجمن" بن گئیں۔ مادیت کا دور دورہ ہے۔ قناعت اور خودداری چھوڑکر لوگوں نے ترقی کا زینہ خوشامد اور چاپلوسی کو ٹھہرادیا۔ غرضکہ یہ امور مذکورۂ بالا اس نئے زمانہ کے تبرکات ہیں اور ان سے کسی قسم کا بھی فائدہ متصور نہیں ہے۔ اسی انتہائی قدامت پسندی کیوجہ سے وہ سرسید اور اُن کے متبعین یعنی تعلیم علیگڈھ کے حامیوں کے سخت مخالف تھے جسقدر سرسید کی رفتار اُن کے نزدیک تیز تھی اسیقدر ہمارے نزدیک اُنکی روش سست تھی۔ اکثر اس قسم کے اختلافات ضرورت شعری پر بھی مبنی کہے جاسکتے ہیں۔

اکبر نہ صرف جدید خیالات اور جدید تہذیب کی اشاعت کے خلاف ہیں بلکہ وہ قومی تہذیب و تعلیم کے زوال کے بھی نوحہ گر ہیں۔ وہ درستی اخلاق احیاے علوم قدیمہ اور اُن خرابیوں کے جو مشرقی شائستگی میں بیرونی اثرات سے داخل ہوگئی ہیں دور کرنے کے بڑے حامی ہیں۔ وہ تعلیم نسواں کے اصولاً خلاف نہیں مگر اُسکا صحیح طریقہ پر رواج چاہتے ہیں۔ اُنکی غرض یہ ہے کہ عورتیں تعلیم پاکر اچھی بیویاں اور اچھی مائیں بنیں۔ قومی جائداد نہ بنیں۔

قوم کے واسطے تعلیم نہ دو عورت کو ۔۔۔ دُوا سے شوہر و اطفال کی خاطر تعلیم

وہ پرانی پاس وضع۔ سچائی۔ ہمدردی۔ قناعت۔ خودداری وغیرہ کے

فقدان کا افسوس کرتے ہیں اور زمانہ موجودہ کے مایۂ ناز صفات پالسی - دوروئی - خود غرضی - بے حمیتی پر غصہ اور افسوس کرتے ہیں - اُن کو افسوس آتا ہے کہ اپنی ذاتی ترقی کی کورانہ روش کے پیچھے لوگ اپنے والدین بھائی بہن اور دیگر متعلقین و متوسلین کے واجبی حقوق فراموش کر بیٹھے یہاں تک کہ خدا کا بھی احساس اُنکے دل سے اُٹھ گیا - دُنیا کے بکھیڑوں کے پیچھے دین کو بھلا بیٹھے ہیں - یہ مادہ پرستی کا دور جو صرف تیز رفتار ریل اور ٹیلیگراف و ٹیلیفون کے معجز نما اثرات کا قائل ہے ہمارے دلوں کو کسی قسم کا سکون و اطمینان نہیں بخشتا موجودہ دور کی سائنس کی معجز نمائیاں اور نئی نئی مشینوں کی سحر آفرینیاں سراپا فائدہ ہی فائدہ نہیں ہیں - مرگ ناگہانی جو اکثر کثرت اضطرار اور تیز حرکتوں کا نتیجہ ہے اور کمی عمر اور خرابی صحت یہ سب اُسی کے برکات ہیں - جدید طریقہ تعلیم بھی جیساکہ خیال کیا جاتا تھا اخلاقی و روحانی امراض کے لیے اکسیر صفت ثابت نہیں ہوا سائنس کی ترقی اور نیچر کی مغلوبیت نے دل کی تکلیفوں کو کسی طرح رفع نہیں کیا اور نہ وہ مصائب دور کئے جنکے رفع کرنے کی امید کیجاتی تھی - دونوں تہذیبوں کے درمیان ایک عمیق خلیج حائل ہے - مغربی تہذیب ہمہ تن دنیاوی جاہ و ثروت تجارت و دولت کی طرف متوجہ ہے اور مشرقی تہذیب کا منتہائے نظر روحانی ترقی ہے وہ بہ آسانی مختصر اور تھوڑی چیز پر قانع ہو جاتی ہے ' فتوحات اور ملک گیری کا اسکو شوق نہیں قناعت اور تسلیم و رضا اُسکا آئین ہے -

اکبر کے مذہبی عقائد علاوہ شاعر کے وہ ایک ناصح قوم ' ریفارمر ' واعظ اور فلسفی بھی تھے - وہ خدا کی وحدانیت اور تاثیر دعا کے دل سے قائل تھے ' اُن کا دلی اعتقاد تھا کہ مذہب کا تعلق دل سے ہے اور اسمیں فلسفہ سائنس اور منطق کا کوئی دخل نہیں -

وہ مذہبی جھگڑوں اور جزئی اختلافات اور تعصبات سے بالکل بری تھے مذہب اُن کے نزدیک ایک زندہ اور محبت کرنے کے قابل شے ہے اُسکو چند آرا اور حقایق فلسفیانہ کا مجموعہ سمجھنا چاہیے اگر کوئی ایسی نکتہ چینی گوارا نہیں کرسکتے جو اعتقاد کے منافی ہو کیونکہ یہی مذہب کی جان ہے اُن میں تعصب اور کٹر پن مطلق نہیں اور اسی وجہ سے وہ مُلّائیت کی تنگ خیالی کو بُرا سمجھتے ہیں۔ اُن کا یہ بھی خیال ہے کہ اسلام اور دیگر مذاہب کے جُزئی اختلافات ایک وسیع النظر موحد کی نظر میں بالکل بے حقیقت معلوم ہوتے ہیں وہ اکثر اشعار میں انسان کی بے حقیقتی کا ذکر کرتے ہیں تاکہ وہ اپنی کامیابی پر مغرور نہو۔ اُن کا قول ہے کہ ہرچند سائنس کی ترقیوں کے قائل ہو مگر خدا کو کسی حال میں دل سے نہ بھولو۔ وہ اصول اخلاق اور فلسفہ اور حقایق معارف کے بیان کرنے میں ید طولی رکھتے ہیں۔ ظواہر مذہب کی وہ پرواہ نہیں کرتے۔ وہ نفس کشی اور ضبط خواہشات کو بہت ضروری سمجھتے ہیں۔ رسوم ظاہری مثل پوست کے ہیں اور اصول اور افعال واطوار مثل مغز کے۔ وہ تعصب اور غصہ کو بہت بُرا سمجھتے ہیں کیونکہ اس سے تنگ خیالی پیدا ہوتی ہے۔ وسعت نظر اور بلند خیالی ان عیوب کو رفع کردیتی ہے۔ آخر عمر میں وہ فلسفہ اور تصوف بہت کہتے تھے۔ ایک جگہ اُنھوں نے معاوضۂ آخرت کا مضمون بہت خوب لکھا ہے۔

| نادر کاکوروی متوفی ۱۹۱۲ء | نادر علیخاں نادر طرز جدید کے بہت عمدہ کہنے والوں میں سے تھے اس رنگ میں انکی اکثر نظمیں بہت مشہور ہیں۔ درد و اثر اعلیٰ تخئیل حب وطن ان کے کلام کے مخصوصات سے ہیں۔ یہ انگریزی شعرا بائرن اور ٹامس مور کے دلدادہ تھے اور چاہتے تھے کہ اُنھیں کا رنگ نہایت سلیس اور عمدہ طریقہ سے اُردو میں بھی داخل

نادر کاکوروی متوفی ۱۹۱۲ء

ہو جائے۔ اِنکی نظمیں "شمع و پروانہ"، "شعاعِ امید" "پیکرِ بے زبان" "فلسفۂ شعری" بہت مشہور ہیں۔ اُن کو اپنے وطن یعنی ہندوستان سے عشق تھا۔ چنانچہ اسی وطنی جذبات کی نظمیں "مقدس سرزمین" اور "مادرِ ہند" دیکھنے کے قابل ہیں۔ ٹامس مور کی مشہور کتاب "لالہ رُخ" کے طرز پر اُنھوں نے بھی ایک مثنوی لکھی ہے اور اس کا بھی نام لالہ رُخ رکھا ہے۔ اُن کا انتقال عین جوانی یعنی بیالیس برس کی عمر میں ۱۹۱۲ء میں ہوا۔ اِس بے ہنگام سانحہ سے ادبی دُنیا نے جو امیدیں انکی ذات سے قائم کی تھیں اُن سب پر پانی پھر گیا۔

حصۂ نظم تمام ہوا

فہرست مضامین

حصۂ نثر

مضمون	صفحہ

باب ۱۶

نثر اُردو کا دور متوسط

مضمون	صفحہ
اور دورِ جدید	

فہرست تصاویر حصۂ نثر

تاریخ ادب اردو

باب ۱۵
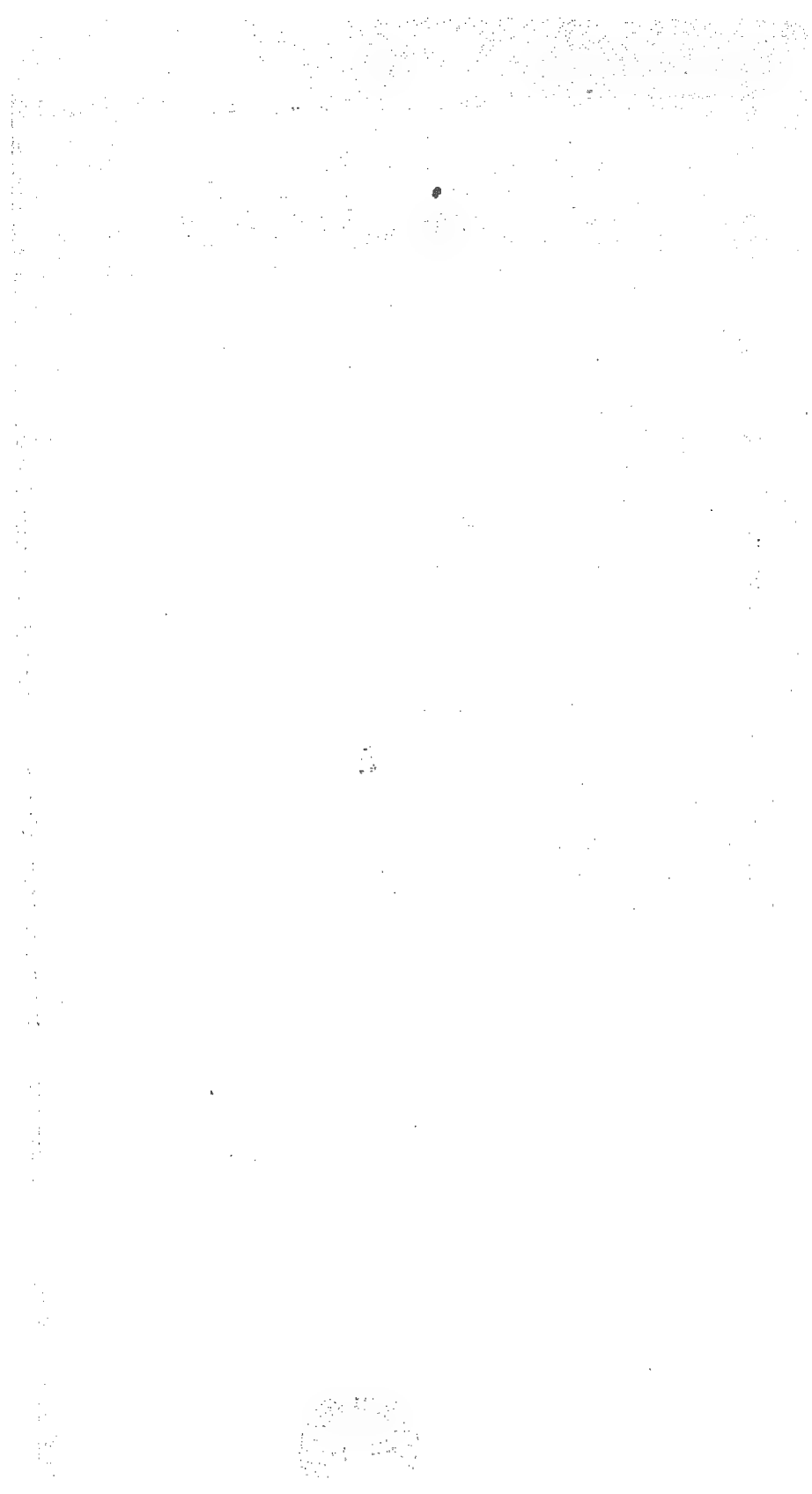
حصہ نثر

نثر اردو کی ابتدا اور ترقی

فورٹ ولیم کالج کلکتہ

نثر اردو کی تعویق آغاز کے اسباب

اردو نثر کی ابتداء واقعی فورٹ ولیم کالج کلکتہ سے ہوئی۔ شمالی ہند مین اُسکی عدم ترقی کی خاص وجہ یہ تھی کہ وہان فارسی کا رواج تھا۔ درباری اور تعلیم یافتہ شرفا کی زبان وہی تھی۔ مراسلے کتابون کی تقریظین اور دیباچے یہ سب فارسی ہی مین لکھے جاتے تھے۔ اردو شعرا کے تذکرے جن مین اُنکے کچھ حالات بھی ہوتے تھے یہ بھی فارسی ہی مین ہوتے تھے۔ نثر کی شان یہ تھی کہ عبارت مقفی اور مسجع ظہوری اور بیدل کے طرز پر مروج تھی۔ اُس وقت کے اردو نثر نگار ظہوری اور پنج رقعہ کی ایسی پیچیدہ اور مغلق عبارت لکھنے کے شایق تھے اور اسی قسم کی عبارت لکھنے مین ایک دوسرے پر سبقت لیجانے کی کوشش کرتے تھے۔ فارسی کی مروجہ اقسام نثر یعنی مرجز مقفی مسجع۔ اور عاری اردو مین بھی بے تکلف اختیار کیگئی تھین اور جب کبھی کوئی بات نثر مین لکھنا ہوتی تو وہ نہایت رنگین اور پر تکلف عبارت مین لکھی جاتی تھی۔ نظم کا عام رواج تہا یہانتک کہ خطوط بھی نظم مین لکھے جاتے تھے۔ نظم لکھنا قابلیت اور علمیت کی بڑی دلیل سمجھی جاتی تھی اور ایک پڑھے لکھے آدمی کا یہی منتہائے امتیاز تھا۔ نظم کا یہ عام رواج اور مقبولیت نثر کو بھی نظم نما بنائے ہوئے تھا۔ نثر بیچاری ایک گوشہ گمنامی مین پڑی ہوئی اپنی ترقی کا موقع دیکھ رہی تھی۔ کیونکہ وہ دور نظم کے عروج کا دور تھا اور نثر کی طرف کسیکی توجہ نہ تھی۔ یہ اسباب اُسکی ابتدا کی تاخیر کے ہوئے۔ اور

یہی اس بات کی بھی وجہ ہے کہ اسکی ابتدا ایسے مقام سے ہوئی جو شمالی ہند اور ادبی مرکز سے دُور تھا۔

زبان دکھنی مین قدیم اردو نثر کی تصانیف

محققین زبان اور ریسرچ اسکالرون نے بحر تحقیق مین غوطہ زنی کرکے دکن کی قدیم نثر کے بہت سے نمونے دستیاب کیے ہین۔ یہ کارروائی ہنوز جاری ہے اور امید کیجاتی ہے کہ بہت عرصہ نہین گزرے گا کہ کافی مواد ایک مکمل اور معتبر تاریخ نثر اُردو کی تیاری کے لیے فراہم ہو جائے گا۔ ایسے محقق ہمارے نزدیک مولوی عبدالحق صاحب اور حکیم سید شمس اللہ قادری ہین کہ جنکی کوششین اسبارہ مین بہت تحسین اور آفرین کے لایق ہین۔ جہانتک کہ قدیم ترین نمونے اسوقت تک دریافت ہوئے ہین انسے پتہ چلتا ہے کہ نثر اُردو کی تاریخ آٹھوین صدی ہجری سے شروع ہوتی ہے۔ یہ نمونے چھوٹے چھوٹے رسالون کی صورت مین ہین جن مین دکن اور گجرات کے فقرا اور اہل دل کے اقوال و امثال قلمبند کیے گئے ہین۔ یہ رسالے اکثر فارسی اور عربی کتابون کے ترجمے ہین اور زیادہ تر مذہبی رنگ مین ہین۔ مثلاً شیخ عین الدین گنج العلم (متوفی ۸۲۵ھ) کی تصانیف اور "معراج العاشقین" مصنفہ حضرت خواجہ گیسو دراز گلبرگوی جو اگرچہ کوئی ادبی حیثیت تو نہین رکھتا مگر پھر بھی اُس زمانے کی زبان کا حال بخوبی اس سے معلوم ہوتا ہے۔ اور آپ کے نواسے سید محمد عبداللہ الحسینی نے حضرت غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے رسالہ "نشاط العشق" کو دکھنی مین ترجمہ کیا۔ اسی طرح شاہ میرانجی شمس العشاق بیجاپوری نے شرح مرغوب القلوب لکھی اور انکے فرزند شاہ برہان الدین جانم متوفی ۹۹۰ھ نے متعدد کتابین لکھین جن مین سے دو کے نام "جل ترنگ" اور "گلباس" ہین۔ مولانا وجہی کی "سب رس" ۱۰۴۵ھ کی تصنیف ہے جسکا ذکر حصہ نظم مین مولانا وجہی کے بیان مین آچکا ہے۔ میران یعقوب نے "شمایل الاتقیا و دلایل الاتقیا" کا اُردو ترجمہ نہایت سلیس اور سادہ دکھنی زبان مین ۱۱۰۰ھ مین کیا۔ سید شاہ محمد قادری نے بھی جو اورنگزیب کے زمانے مین تھے اور رائچور کے نور دریا خاندان سے تعلق رکھتے تھے مختلف مذہبی رسالے لکھے ہین۔ گیارہوین صدی مین سید شاہ میر نے ایک مذہبی کتاب زبان دکنی مین "اسرار التوحید" کے نام سے لکھی۔

وہ مجلس فضلی مصنفہ ۱۱۴۵ھ

قبل اسکے کہ دکن کی اردو شمالی ہند مین آئے یہان بھی کچھ کتابین نثر مین لکھی گئین جو زیادہ تر قصہ کہانیون کی صورت یا مذہبی رنگ مین تھین اور فارسی سے

ترجمہ ہوئی تھین - انہین کتابون مین فضلی کی دہ مجلس ہے جو بعہد محمد شاہ بادشاہ دہلی ۱۱۴۵ھ مطابق ۱۷۳۲ء مین لکھی گئی۔ اسوقت مصنف کی عمر بائیس برس کی تھی جیساکہ وہ خود اس کتاب کے دیباچہ مین لکھتے ہین - یہ کتاب فارسی کی روضۃ الشہدا کا ترجمہ ہے جو ملا حسین واعظ کاشفی کی تصنیف ہے - فضلی نے اسکے دیباچہ مین لکھا ہے کہ میری بڑی تمنا تھی کہ یہ کتاب نہایت سہل اور عام فہم زبان مین جو اُسوقت مروج تھی لکھی جائے مگر چونکہ مذہبی کتاب تھی اور میرے سامنے اس سے قبل کوئی نمونہ موجود نہ تھا لہذا مجھے اسکی تحریر مین بہت پس و پیش تھا اسی حالت مین مین نے خواب مین سید الشہدا حضرت امام حسین علیہ السلام کو دیکھا کہ آپ تشریف لائے ہین اور آپنے میرے مشکلات کو حل کیا اور امداد فرمائی۔ فضلی نے جو مذہب امامیہ رکھتے تھے ائمہ معصومین کی شان مین کچھ نظمین اور مرثیے بھی لکھے ہین مگر اُنکو کچھ شہرت نہین ہوئی - وہ مجلس جسمین اصل مین بارہ مجلسین ہین نثر اُردو کی ایک کامل کتاب تو نہین کہی جاسکتی البتہ وہ اُس زمانے کی اردو نثر کا ایک عمدہ نمونہ ہے - عبارت مین خامی ہے جیساکہ ہر ابتدائی کام مین ہوا کرتی ہے جملے پیچیدہ پُر تصنع اور مقفی ہین - اسیطرح ایک مختصر نمونہ اُس زمانہ کی نثر اُردو کا سودا کے کلیات کے شروع میں موجود ہے جس سے اس زمانہ کا رنگ بخوبی معلوم ہوتا ہے زمانہ حال کی پابندی صرف و نحو اسمین بالکل نہین ہے صرف قافیہ دار الفاظ مثل نظم کے جملون کے آخر مین رکھدیے گئے ہین مضمون بھی تشبیہون اور استعارون سے مملو ہے ایسی عبارت صرف موزون نہونے کی وجہ سے نثر کہی جاسکتی ہے ورنہ اسمین اور نظم مین کوئی فرق نہین ہے - انشا اور قتیل کی دریائے لطافت گو فارسی مین ہے مگر نہایت دلچسپ کتاب ہے - اسمین اسوقت کے مختلف پیشہ ورون کی بولیان مختلف رسوم و رواج اور معمولی بول چال اور ضرب الامثال اور دلی اور لکھنؤ کی زبان کا فرق اور متروکات قدیم اور مختلف ملکون کی زبان کا زبان دہلی و لکھنؤ مین شامل ہونے سے اثر وغیرہ وغیرہ درج ہین -

نوطرز مرصع ترجمہ قصۂ چہار درویش مصنفہ ۱۷۹۸ء

دوسری مشہور کتاب اس عہد کی نوطرز مرصع ہے جسکو میر محمد عطا حسین خان متخلص بہ تحسین نے امیر خسرو کے قصہ چہار درویش سے اردو مین ترجمہ کیا - اسکا سنہ تصنیف ۱۷۹۸ء ہے اور یہ نواب شجاع الدولہ کے عہد مین مکمل ہوا جن کی تعریف مین ایک قصیدہ دیباچہ کے

آخر مین دیا ہوا ہے مصنّف مذکور مرصع رقم کے لقب سے مشہور تھے اور محمّد باقر خان شوق کے بیٹے اور
ابو المنصور خان صفدر جنگ کے دربار سے وابستہ تھے۔ بعد اُسکے وہ جنرل اسمتھ کے میر منشی مقرر ہوئے
اور انہین کے ساتھ کلکتہ گئے جب صاحب موصوف ولایت گئے تو تحسین پٹنہ چلے آئے اور وہان وکالت
کرنے لگے اپنے باپ کے انتقال کے بعد وہ پٹنہ سے فیض آباد آگئے جہان نواب شجاع الدولہ کے ملازم ہوگئے
یہ سلسلہ ملازمت نواب آصف الدولہ کے زمانہ تک قائم رہا تحسین علاوہ خوشنویس ہونے کے منشی بھی نہایت اچھے تھے
چنانچہ ضوابط انگریزی جو اس زمانہ کی گورنمنٹ ہند کے قوانین کا مجموعہ ہے اور "تواریخ قاسمی" اُنکی تصنیف ہین
یہ دونون کتابین فارسی مین ہین۔ "نوطرز مرصع" کی عبارت نہایت رنگین اور فارسی و عربی الفاظ سے مملو ہے
غالبًا یہی وجہ ہوگی کہ ڈاکٹر گلکرسٹ نے قصہ چہار درویش کا ایک دوسرا ترجمہ موسوم بہ "باغ و بہار"
نہایت صاف اردو زبان مین میر امن دہلوی سے کرایا جسکا مفصل حال آگے آتا ہے۔

فورٹ ولیم کالج سے نثر اردو کے تعلق کے اسباب

انگریزون نے ہندوستان مین اپنے تجارتی تعلقات کے سلسلہ مین بڑے
بڑے قطعات ملک حاصل کر لئے تھے جن کے عمدہ انتظام کے واسطے ضروری
تھا کہ اُنکے اعلیٰ عمال اس ملک کی زبان سے جس کا انتظام عاملانہ خواہ تاجرانہ اُنکے سپرد تھا اچھی طرح واقف
ہوجائین تجارتی تعلقات یومًا فیومًا کم ہوتے جاتے تھے مگر انتظامی معاملات بڑہتے جاتے تھے۔ مترجم
جن کے ذریعہ سے اہل ملک کی زبان اور خیالات کو یورپی عمال یا تجار سمجھ سکتے تھے اب بیکار ہوگئے تھے
کیونکہ یہ خیال پیدا ہوگیا تھا کہ کوئی قوم تا وقتیکہ مفتوح قوم کی زبان اور رسوم و رواج اور روایات
تاریخی و مذہبی سے کماحقہٗ بلاواسطہ واقف نہوگی اُسپر پورے طور سے حکومت نہین کر سکتی۔ اور ان سب
باتون کے لئے یہ ضروری تھا کہ حاکم اپنے محکومون کی زبان سیکھین۔ لہذا کورٹ آف ڈائرکٹرز نے یہ
دیکھکر کہ اُنکے عمال ہندوستان مین اپنے فرائض منصبی محض دیسی زبانون کے نجاننے کیوجہ سے بہت
بُری طرح سے ادہورے طریق پر ادا کرتے ہین یہ تاکیدی حکم دیدیا کہ آیندہ سے اُنکے حکام مقامی اپنے
عمال کیواسطے دیسی زبانون کی کماحقہٗ واقفیت کو ضروری قرار دین۔ اسی کے ساتھ چونکہ بڑے بڑے
قطعات ملک انگریزی عملداری مین داخل ہوتے جاتے تھے لہذا پارلیمنٹ انگلستان کو اب یہ محسوس ہونے لگا

کہ رعایا کی فلاح و بہبود اور تعلیم و ترقی کی ذمہ داری بھی ہمین پر عاید ہوتی ہے۔ چنانچہ اب اس کی کوشش ہونے لگی کہ جو رُکاوٹ خانہ جنگیون اور ملکی لڑائیون کیوجہ سے لوگونکے تعلیم مین پڑگئی تھی جسکی وجہ سے تعلیم کو بہت سخت صدمہ پہونچ رہا تھا اب دور ہو جائے۔ اسی اصُول پر تعلیم انگریزی کی اشاعت شروع ہوئی جس سے خیالات اور زبان دونون مین انقلاب عظیم پیدا ہونا شروع ہوا۔ جسکا اثر کہین نظم پر پڑا اور کہین نثر پر۔ مختصر یہ کہ تعلیم انگریزی نے ہندوستان کیواسطے وہی کیا جو آج سے پانچ چھہ سو برس پیشتر رنیاسانس (نشاۃ ثانیہ) نے یورپ کیواسطے کیا تھا۔ یہ قاعدہ ہے کہ ہر تغیر اور انقلاب کیساتھ اچھائیون کے ساتھ ساتھ کچھ برائیان بھی ضرور آجاتی ہین مگر اس صورت مین اچھائیون کا پلہ بھاری رہا۔ یعنی اس تعلیمی تغیر سے دیسی زبانون کو بہت فائدہ پہونچا۔

ڈاکٹر جان گلکرسٹ ۱۷۵۹ء لغایت ۱۸۴۱ء

ڈاکٹر جان گلکرسٹ جو انیسوین صدی کے شروع مین فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے منتظم اعلے تھے نثر اُردو کے مربّی (باپ) کہلائے جانے کے فی الحقیقت مستحق ہین انہین کی اَن تھک کوششون سے ملک کی دیسی زبان یعنے اُردو مکمل ہوکر سرکاری زبان بننے کے لایق ہوئی اور اُسمین اتنی صلاحیت پیدا ہوگئی کہ تھوڑے ہی عرصہ مین فارسی کی جگہ وہ سرکاری اور درباری زبان قرار پائی۔ ڈاکٹر موصوف اسکاٹ لینڈ کے باشندے تھے ۱۷۵۹ء مین بمقام اڈنبرا پیدا ہوے جارج ہیریٹ کے درسگاہ مین جو اسی شہر مین واقع تھی تعلیم پائی ۱۷۸۳ء مین ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت مین بحیثیت ڈاکٹر داخل ہوئے۔ ابتدا ہی سے یہ خیال اُنکے دل مین راسخ تھا کہ انگریزی افسرون کو فارسی زبان کی اسقدر ضرورت نہین (جیسا کہ اُسوقت دستور تھا) جسقدر کہ ملک کی دیسی زبانون علی الخصوص زبان ہندوستانی کی ہے جو اسوقت ہر طبقہ اشخاص سے میل جول کے لئے سب سے زیادہ مشہور زبان سمجھی جاتی تھی گلکرسٹ نے خود اس معاملہ مین سبقت کی۔ اُنکی نسبت لکھا ہے کہ وہ ہندوستانی کپڑے پہنے اُن مقامات مین جہان اردو بہت صحیح اور بامحاورہ بولی جاتی تھی برابر گھوما کرتے تھے۔ اور اردو کے علاوہ سنسکرت فارسی و دیگر مشرقی زبانون سے بھی باخبر تھے۔ انکی کامیابی کو دیکھکر دیگر ملازمین کمپنی کے دل مین بھی اُردو سیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ مختصر یہ کہ انگریزون مین اُردو پڑھنے کا رواج اُسی وقت سے ہوگیا۔ لارڈ ولیسلی نے جو

اسوقت گورنر جنرل تھے اس تجویز کی اہمیت اور ضرورت پر نظر کرکے اور گلگرسٹ کے مفید کاموں کے عمدہ نتایج کو دیکھکر انکو مالی امداد بھی بہت دی اور فورٹ ولیم کالج کا افسر اعلی مقرر کردیا۔ یہ کالج ۱۸۰۰ع مین اس غرض سے قایم ہوا تھا کہ اسمین کمپنی کے انگریزی ملازمین کو ملک کی دیسی زبانون مین تعلیم دیجائے گلگرسٹ عرصہ تک اپنی جگہ پر نہ رہ سکے۔ علالت کیوجہ سے مستعفی ہوکر ۱۸۰۴ع مین پنشن لیکر ولایت چلے گئے۔ زبان اردو سے انکو اسقدر عشق تھا کہ اڈنبرا مین ۱۸۱۶ع تک قیام کرکے لندن آ گئے جہان امیدواران انڈین سول سروس کو وہ مشرقی زبانون مین پرایوٹ طریق پر تعلیم دیا کرتے تھے ۱۸۱۸ع مین وہ اورینٹیل انسٹیٹیوٹ مین زبان اردو کے پروفیسر مقرر ہوگئے جسکو اس سال ایسٹ انڈیا کمپنی نے لندن مین قایم کیا تھا مگر ۱۸۲۵ع میں بند ہوگیا تھا۔ اسکے بند ہونیکے بعد بھی وہ تقریبًا سال بھر تک شایقین زبان کو پرایوٹ طور پر اردو پڑھاتے رہے اور اپنے بعد اپنی جگہ پر سینڈفورڈ آرنو اور ڈنکن فوربس کو جو مشہور مستشرق تھے مقرر کر گئے۔ گلگرسٹ کا انتقال ۸۲ برس کی عمر مین بمقام پیرس ۱۸۴۱ع مین ہوا۔ وہ بہت سی کتب متعلقہ زبان ہندوستانی کے مصنف ہین جنکی پوری فہرست ڈاکٹر گریرسن نے اپنی مشہور تصنیف "لنگوسٹک سروے آف انڈیا" (ہندوستانی زبانون کے تفتیشات) کی جلد نہم مین دی ہے۔ انکی بعض مشہور تصانیف کے نام یہ ہین (۱) انگریزی ہندوستانی ڈکشنری ۲ حصون مین۔ مطبوعہ ۱۷۹۰ع (۲) اورینٹیل لنگوسٹ (مشرقی زباندان) جو زبان اردو کا آسان مقدمہ ہے مطبوعہ ۱۷۹۸ع (۳) ہندوستانی گرامر مطبوعہ ۱۷۹۶ع (۴) ہندوستانی فلالوجی۔ گلگرسٹ ہی کے انتظام اور ماتحتی مین ایک جماعت ہندوستانیون کی کالج مین قایم ہوگئی تھی جنہون نے نہ صرف انگریزون کے پڑھنے کے واسطے درسی کتابین بلکہ زبان اردو و ہندی مین مستقل تصانیف نہایت اعلی درجہ کی تصنیف کین سلطنت مغلیہ کی تباہی کے بعد بعض مشہور اہل زبان و اہل قلم اپنا وطن چھوڑ چھوڑ کر ڈاکٹر گلگرسٹ کی شہرت اور فیاضی کا شہرہ سنکر کلکتہ پہنچ گئے تھے انہون نے ان سب کو نیز اکثر کلکتہ کے لوگونکو اپنے کالج مین خوشی سے جگہ دی۔ ڈاکٹر گلگرسٹ کے ساتھ بعض اور مشہور افسرون مثلًا۔ کپتان روبک کپتان ٹیلر ڈاکٹر ہنٹر وغیرہ کی خدمات بھی ضرور قابل تعریف ہین۔ ڈاکٹر گلگرسٹ

کے زمانہ مین مشہور ہندوستانی اہل قلم جو کالج مین جمع ہوگئے تھے حسب ذیل ہین - میر امّن افسوس حسینی - لطف - حیدری - جوان - للو لال جی - نہال چند - اکرام علی ولا - سید محمد منیر - سید بشیر علی افسوس - اور مداری لال گجراتی -

میر امّن دہلوی

میر امّن دہلوی متخلص بہ لطف دلّی کے رہنے والے تھے - انکے آباواجداد سلاطین مغلیہ کے زمانہ مین وظایف اور جاگیر دنسے معزز وممتاز تھے - احمد شاہ دُرّانی نے جب دہلی پر حملہ کیا تو فوج کی لوٹ مار مین میر امّن کا گھر بھی شامل تھا اور سورجمل جاٹ نے انکی خاندانی جاگیر پر قبضہ کرلیا تھا میر امّن اس مصیبت مین دلّی سے نکلکر پٹنے پہونچے یہان کچھ عرصہ تک رہ کر کلکتہ روانہ ہوئے - جہان نواب دلاور جنگ بہادر کے چھوٹے بھائی میر محمد کاظم خان کی تعلیم و تربیت انکی سپرد تھی - اسی زمانہ مین میر بہادر علی حسینی نے انکا تعارف ڈاکٹر گلکرسٹ سے کرادیا جنکی فرمایش سے انہون نے اپنی مشہور ومعروف کتاب قصہ چہار درویش لکھی جسکا تاریخی نام باغ وبہار ہے ۱۲۱۷ھ یہ قصہ اصل مین فارسی مین تھا اور اسکو امیر خسرو دہلوی نے اپنے پیرو مرشد حضرت نظام الدین اولیا کے بحالت علالت دل بہلانے کیواسطے تصنیف کیا تھا - تھوڑے عرصہ کے بعد جب حضرت کو صحت ہوئی تو آپنے دعا دی کہ اس قصہ کو جو کوئی سُنے گا وہ بحکم خدا بیماری سے شفا پائے گا - یہ قصہ فارسی مین بھی بہت مقبول ہے اور اس کے دونون اردو ترجمے یعنی تحسین اور میر امّن کے ترجمے معہ دیگر تراجم کے جو ہندوستانکی اکثر دیسی زبانون اور نیز غیر ملکی زبانون مین ہوے ہین بہت مقبول ہین - یہ کتاب ۱۸۰۱ء مطابق ۱۲۱۷ھ مین ختم ہوئی تحسین کے ترجمہ کو میر امّن نے اپنی زبان مین لکھا ہے کیونکہ اسمین اکثر غیر مانوس فارسی وعربی الفاظ تھے جنکو میر امّن نے نکالدیا اور اپنی کتاب کو سقدر صاف وسلیس و بامحاورہ عبارت مین لکھا کہ بقول سر سید مرحوم کے جو مرتبہ میر تقی میر کو نظم مین حاصل ہے وہی میر امن کو نثر مین ہے - یہ قصہ نہ صرف دلچسپ ہے بلکہ اسمین اُس زمانہ کے رسم ورواج اور طرز معاشرت کے مرقعے نہایت وضاحت سے کھینچے گئے ہین - دیباچے مین سبب تالیف کتاب اور اپنا حال لکھکر زبان اردو کی ایک مختصر سی تاریخ بھی بتادی ہے جو زیادہ صحیح نہین سمجھی جاسکتی - یہ عجیب بات ہے کہ کتاب باغ وبہار انگریزون مین بہت مقبول رہی ہے -

چنانچہ ابتک وہ انگریزی حکام کے اردو امتحانون مین داخل درس ہے۔ علاوہ اس کتاب کے گنجینۂ خوبی بھی میر امن کی تصنیف ہے جو ملا حسین واعظ کاشفی کی اخلاق محسنی کے طرز پر ۱۸۰۲ء مین تحریر کی گئی۔ منشی کریم الدین کا خیال ہے کہ میر امن نے کوئی دیوان بھی ضرور مرتب کیا ہو گا مگر اسکا کہین پتہ نہین۔ ڈاکٹر نیلن نے خود میر امنؔ کی زبانی سنا تھا کہ انکو کسی سے فن شعر مین تلمذ نہ تھا۔

افسوس ۱۷۳۵ء لغایت ۱۸۰۹ء

میر شیر علی دہلوی متخلص بہ افسوس میر علی مظفر خان کے بیٹے تھے جو نواب میر قاسم کے سرکار مین داروغہ سلح خانہ تھے۔ یہ حضرت امام جعفر صادق کی اولاد مین تھے اور انکے آبا و اجداد خاف کے رہنے والے تھے۔ انکے بزرگون مین سے ایک شخص سید بدر الدین نامی نارنول مین جو آگرہ کے قریب ہے سکونت گزین ہوئے۔ محمد شاہ بادشاہ کے عہد مین انکے باپ دریچا سید غلام علی خان آگرہ سے دلی آئے اور عمدۃ الملک نواب امیر خان کی سرکار مین ایک بیش قرار تنخواہ پر ملازمت اختیار کی افسوس دہلی مین پیدا ہوئے جسکو انکے بزرگون نے بطریق وطن کے اختیار کیا تھا۔ ۱۷۴۶ء مین جب نواب امیر خان کا انتقال ہوا تو افسوس کے والد پٹنہ چلے گئے، جہان نواب میر قاسم اور انکے بعد نواب میر جعفر کی ملازمت کرتے رہے۔ یہانتک کہ جب آخر الذکر معزول کئے گئے تو وہ لکھنؤ آگئے اور وہان سے حیدر آباد گئے جہان انکا انتقال ہوا۔ افسوس بھی اپنے والد کے ساتھ پٹنہ سے لکھنؤ آئے تھے اور چونکہ میلان طبیعت شعر و شاعری کیطرف بہت تہا اور فضلاے لکھنؤ مین ترانہ شاعری اسوقت گونج رہا تھا لہذا انھون نے بھی شعر کہنا شروع کر دیا۔ وہ اپنا کلام میر حیدر علی حیرانؔ کو دکھلاتے تھے اور بعض کہتے ہین کہ میر حسنؔ۔ میر تقیؔ۔ اور میر سوزؔ سے بھی اصلاح لیتے تھے۔ لکھنؤ مین انکی سرپرستی نواب سالار جنگ بہادر اور انکے بعد انکے بیٹے نواب مرزا نوازش علیخان کرتے رہے لکھنؤ ہی کے قیام مین نواب حسن رضا خان نائب نواب آصف الدولہ کی وساطت سے افسوس کرنیل اسکاٹ صاحب سے ملے جنہون نے انکی قابلیت اور ذہانت و ذکاوت کو بہت پسند کر کے دو سو روپیہ مشاہرہ پر انکو کلکتہ بھیجا اور پانچسو روپیہ زادِ راہ کے لیے بھی عنایت فرمائے افسوس راستہ مین مرشد آباد مین مرزا علی لطفؔ صاحب گلشن ہند سے بھی ملے تھے۔ کلکتہ پہونچکر وہ فورٹ ولیم کالج کے زمرۂ اسٹاف مین ایک معزز عہدہ پر فایز

ہوے انکی تصانیف حسب ذیل ہین (۱) اردو ترجمہ گلستان سعدی موسوم بہ باغ اردو جو کلکتہ مین پہلی مرتبہ سنہ ۱۸۰۲ع مین چھپا تھا اور نہایت قدر کی نگاہو نسے دیکھا جاتا ہے۔ (۲) سنہ ۱۸۰۴ع مین انہون نے اپنی مشہور کتاب آرایش محفل لکھنا شروع کی جس مین علاوہ ہندوستان کے جغرافیائی حالات کے فتح اسلام تک ہندو راجاؤن کی ایک مختصر تاریخ بھی ہے اسکی تصنیف مین اکثر تاریخون سے مدد لیگئی مگر اُسکا اصلی ماخذ منشی سوجن رائے بٹیا لوی کی خلاصۃ التواریخ ہے۔ انکے علاوہ افسوس نے میر بہادر علی کی نثر بے نظیر منشی عزت اللہ کی مذہب عشق اور مولوی محمد اسمٰعیل صاحب کی بہار دانش کی تصنیف مین بھی مدد دی تھی اور کلیات سودا بھی اپنی تصحیح سے چھپوایا تھا۔ ان تصانیف کے علاوہ انکا ایک دیوان بھی ہے جو قدر کی نگاہو نسے دیکھا جاتا ہے۔ افسوس کا انتقال سنہ ۱۸۰۹ع مین ہوا۔

میر بہادر علی حسینی اِن کے مفصّل حالات معلوم نہین ہوسکے بہرطور اتنا معلوم ہے کہ وہ فورٹ ولیم کالج مین میر منشی تھے اور کتب ذیل کے مصنف ہین (۱) اخلاق ہندی جو ڈاکٹر گلکرسٹ کی فرمایش سے سنہ ۱۸۰۲ع مین لکھی گئی یہ ہتوپدیش کے ایک فارسی ترجمہ کا جو شاہ نصیر الدین بہاری کے حکم سے مفتی تاج الدین نے مفرح القلوب کے نام سے کیا تھا صاف اور سلیس اردو ترجمہ ہے (۲) نثر بے نظیر یعنی مثنوی میر حسن نثر مین جو سنہ ۱۸۰۲ع مین تصنیف اور سنہ ۱۸۱۳ع مین یعنی دو برس قبل اصل مثنوی کے شایع ہوئی (۳) رسالہ گلکرسٹ یعنے گلکرسٹ صاحب کی گرامر کا خلاصہ زبان اُردو کی صرف و نحو اور فن عروض کا رسالہ ہے مطبوعہ کلکتہ سنہ ۱۸۱۶ع (۴) ترجمہ تاریخ آسام مصنفہ شہاب الدین تالش جس مین اورنگزیب کے مشہور جرنیل میر جملہ کے حملہ آسام سنہ ۱۶۶۲ع کا ذکر ہے۔ حسب الحکم کولبرک صاحب ترتیب پایا۔ انکے علاوہ قصہ لقمان اور قرآن شریف کے ایک ترجمہ مین بھی حسینی نے شرکت کی تھی۔

سید حیدر بخش حیدری سیّد حیدر بخش حیدری سیّد ابو الحسن کے بیٹے دلّی کے رہنے والے تھے۔ ان کے آبا و اجداد نجف کے باشندے تھے۔ اِن کے والد لالہ سکھدیو راے کے ساتھ دلّی سے نکلکر بنارس پہنچے اور وہین سکونت اختیار کرلی حیدر بخش اپنے والد کے ساتھ تھے۔ بنارس مین اسوقت نواب علی ابراہیم خان

متخلص بہ خلیل مصنف تذکرۂ گلزار ابراہیم عدالت انگریزی کے جج تھے - اُنکی سپردگی مین حیدری دیے
گئے تاکہ نواب صاحب کے فیض صحبت سے اچھی طرح مستفیض ہون علوم مذہبی کی تعلیم اُنکی مولوی غلام حسین غازیپوری
کے سایۂ عاطفت مین ہوئی جو نواب صاحب موصوف کی عدالت کے ایک سر برآوردہ مولوی تھے سنہ ۱۸۰۰ء
مین یہ سنکر کہ فورٹ ولیم کالج کلکتہ مین قابل منشیون کی مانگ ہے حیدری نے ایک کتاب موسوم بہ "قصہ
مہر و ماہ" ترتیب دی جس کا سنہ تصنیف سنہ ۱۲۱۴ھ ہے اور اسکو ڈاکٹر گلکرسٹ کی خدمت مین بطور اپنی قابلیت
کے نمونے کے پیش کیا - ڈاکٹر صاحب نے اُسکو بہت پسند کیا - اور حیدری کو کالج مذکور کی ایک منشی گری
پر ممتاز کیا - حیدری کی اکثر تصانیف ہین جو زیادہ تر فارسی کتابون کے تراجم ہین - کتب ذیل زیادہ
مشہور ہین (۱) قصۂ لیلی مجنون - جو امیر خسرو کی اسی نام کی مثنوی کا اردو ترجمہ ہے یہ غالباً ملازمت کالج
سے پیشتر تحریر ہوا تھا (۲) طوطا کہانی سید محمد قادری کے فارسی طوطی نامہ کا ترجمہ مصنفہ سنہ ۱۸۰۱ء بحکم ڈاکٹر گلکرسٹ
صاحب - اصل مین یہ قصہ سنسکرت مین شوک سپتتی کے نام سے تھا - فارسی مین اسی نام کی ایک کتاب
جو باون قصون پر مشتمل تھی ضیائے نخشبی نے سنہ ۱۳۳۰ھ مین لکھی تھی جس سے یہ دوسرا طوطی نامہ پینتیس قصص کا
سید محمد قادری نے سنہ ۱۰۹۳ھ مین مختصر اور صاف کر کے ترتیب دیا - یہ سب قصے مثل انگریزی کنگ آرتھر کے
فسانون کے ہندوستان مین بہت مقبول ہوئے اور ان کے ترجمے مختلف زبانون مین مختلف اوقات
مین ہوئے - مثلاً انگریزی مین اسمال صاحب نے سنہ ۱۸۷۵ء مین کیا - بنگلہ مین چنڈی چرن سیرام پوری نے
سنہ ۱۸۰۶ء مین کیا اور طوطا اتہاس نام رکھا ہندی مین انبا پرشاد راسا نے - زبان دکنی مین
نظم مین غواصی نے اور نثر مین ایک غیر معلوم شخص نے - ہندی مین اصل سنسکرت سے بھیرون پرشاد
نے - گجراتی نظم مین سمالابھٹ نے اور مرہٹی مین کسی غیر معلوم شخص نے (۳) آرایش محفل ترجمہ قصہ
حاتم طائی اسکو میر شیر علی افسوس کی آرایش محفل سے خلط ملط نکرنا چاہیئے - یہ قصہ سب سے پہلے سنہ ۱۸۲۴ء
مین کلکتہ مین چھپا تھا اور اس کی زبان نہایت سلیس سہل اور دلچسپ ہے - اسکا ترجمہ بھی بنگلہ ہندی اور
گجراتی مین ہوگیا ہے (۴) تاریخ نادری ترجمہ نادر نامہ منشی مرزا مہدی مرتبہ سنہ ۱۲۲۴ھ (۵) گل مغفرت
جسکو انہین کے گلشن شہیدان کا خلاصہ سمجھنا چاہیئے جو ملا حسین واعظ کاشفی کے روضۃ الشہدا کا ترجمہ ہے

اسکا دوسرا نام وہ مجلس بھی ہے۔ سنہ تصنیف ۱۸۱۲ء اور مقام طباعت کلکتہ ہے۔ اسکا ترجمہ زبان فرانسیسی مین بھی ہوگیا ہے (۶) گلزار دانش شیخ عنایت اللہ کی بہار دانش کا اردو ترجمہ جسمین عورتون کے مکر وکید کے قصے درج ہین (۷) ہفت پیکر نظامی کی مشہور مثنوی ہفت پیکر کا جواب مصنفہ ۱۸۰۶ء (۸) انکے علاوہ چند مراثی ایک دیوان غزلیات اور مجموعہ صد حکایات بھی انکی تصانیف سے ہین حیدری کا انتقال ۱۸۲۳ء مین ہوا جیسا کہ ڈاکٹر اسپرنگر نے فہرست کتب اودھ مین ذکر کیا ہے۔

مرزا کاظم علی جوان

اصل مین دلی کے باشندے تھے مگر لکھنؤ مین سکونت اختیار کرلی تھی جہان ۱۷۸۴ء مین وہ موجود تھے ان کا ذکر نواب علی ابراہیم خان نے اپنے تذکرہ گلزار ابراہیم مین کیا ہے جنکے پاس بنارس مین انہون نے اپنا کچھ کلام نمونتاً بھیجا تھا سنہ ۱۸۰۰ء مین کرنل اسکاٹ صاحب نے ان کو منشی گری کی ایک جگہ دے کر لکھنؤ سے کلکتہ روانہ کیا تھا منشی بینی نراین اپنے تذکرہ جہان مین جو ۱۸۱۴ء کی تصنیف ہے لکھتے ہین کہ یہ اسوقت زندہ تھے۔ بلکہ ۱۸۱۵ء مین جو مشاعرے فورٹ ولیم کالج کلکتہ مین ہوئے تھے اسمین بھی یہ موجود پائے جاتے ہین۔ کتب ذیل انکی طرف منسوب ہین (۱) کالیداس کی مشہور کتاب شکنتلا ناٹک کا اردو ترجمہ جسکے دیباچہ مین بطور تمہید کے وہ لکھتے ہین۔ کہ کالیداس کی اصل کتاب کا ترجمہ برج بھاشہ مین ۱۷۱۶ء مین ایک شاعر نواز کبیشر نامی نے مولے خان پسر خدای خان سپہ سالار شہنشاہ فرخ سیر کے حکم سے کیا تھا اور ڈاکٹر گلکرسٹ کی فرمایش سے یہ ترجمہ برج بھاشہ سے زبان اردو ۱۸۰۱ء مین کیا گیا۔ اور اسپر نظر ثانی للو لال جی کبیشر نے کی اور کلکتہ مین ۱۸۰۲ء مین طبع ہوا۔ (۲) قرآن شریف کا ایک اردو ترجمہ بفرمایش گلکرسٹ صاحب (۳) ترجمہ تاریخ فرشتہ متعلقہ خاندان بہمنی (۴) سنگھاسن بتیسی جسکی تصنیف مین للو لال جی بھی شریک تھے (۵) بارہ ماسہ یا دستور ہند مطبوعہ کلکتہ ۱۸۱۲ء جسمین ہندوستان کی مختلف فصلون اور موسمون اور ہندوؤن اور مسلمانون کے تہوارون کا ذکر ہے یہ کتاب بعد ترجمہ شکنتلا ناٹک کے تحریر ہوئی۔

جوان نے "خرد افروز" (جسکا حال آگے آتا ہے) اور میر و سودا کے کلام کے کچھ منتخبات بھی شایع کیے تھے انکے دو بیٹے عیان اور ممتاز بھی کسیقدر مشہور ہوئے۔

نہال چند لاہوری دلّی مین پیدا ہوے مگر چونکہ لاہور مین زیادہ رہے اسوجہ سے لاہوری کے لقب سے مشہور ہین ۱۲۱۷ھ مین کلکتہ گئے تھے - اِنکے کچھ مزید حالات معلوم نہین سوائے اِسکے جیسا کہ اپنی کتاب مذہب عشق کے دیباچہ مین وہ خود لکھتے ہین کہ کپتان ولورٹ نے ڈاکٹر گلکرسٹ سے انکا تعارف کرایا جنکی فرمایش سے انہون نے قصہ تاج الملوک اور بکاولی کا ترجمہ فارسی سے اردو مین کیا - انکی تصانیف حسب ذیل ہین (۱) مذکورۂ بالا مذہب عشق (جو تاریخی نام ہے) معروف بہ قصہ گل بکاولی جو شیخ عزت اللہ بنگالی کے اسی نام کے فارسی قصہ مصنفہ ۱۱۳۴ھ کا اردو ترجمہ ہے - ایک دوسرا اردو منظوم ترجمہ اسی قصہ کا کسی شخص ریحان نامی نے ۱۲۱۲ھ مین کیا ہے جسمین چالیس باب مین جو گلگشت کے نام سے موسوم ہین نیز ایک اُردو مثنوی موسوم بہ تحفۃ المجالس اسی قصہ کی بہت قدیم موجود ہے یہ نام تاریخی ہے جس سے ۱۰۵۳ھ نکلتے ہین - اور اس سے بھی ایک قدیم ترنسخہ کا پتہ چلتا ہے جو زبان دکنی مین ہے جسکا سنہ تصنیف ۱۰۳۵ھ ہے - مگران سب سے زیادہ مشہور مثنوی گلزار نسیم ہے جسکا سنہ تصنیف ۱۲۵۴ھ ہے - مذہب عشق کا سنہ تصنیف ان تاریخون سے جو کتاب کے آخر مین دی ہوئی ہین ۱۲۱۷ھ اور ۱۸۱۳ء عیسوی نکلتا ہے -

مظہر علیخان ولا مرزا لطف علی معروف بہ مظہر علیخان متخلص بہ ولا سلیمان علیخان وداد کے بیٹے دلّی کے رہنے والے تھے - مرزا جان طپش اور مصحفی کے شاگرد تھے گلشن بیخار مین میر نظام الدین ممنون کو بھی انکا اُستاد لکھا ہے یہ بھی کلکتہ کے کالج مین منشی تھے اور اکثر تراجم انکی طرف منسوب ہین مثلاً (۱) پندنامہ سعدی کا اردو ترجمہ منظوم مصنفہ ۱۸۰۲ء (۲) ناصر علیخان بلگرامی واسطی کی ہفت گلشن کا ترجمہ جو اخلاق و مواعظ کی ایک کتاب ہے اور سات بابون پر مشتمل ہے - جو تاریخین اسکے آخر مین دی ہوئی ہین اُن سے سنہ تصنیف ۱۸۰۱ء نکلتا ہے - اسمین اخلاقی حکایتین آداب گفتگو - بزرگونکی اطاعت و فرمانبرداری اور چند احادیث نبوی و اقوال حضرت علی رضی اللہ عنہ درج ہین (۳) قصہ مادہونل و کام کنڈلا جو موتی رام کبیشر کی برج بہاشہ کا اردو ترجمہ ہے سنہ تصنیف ۱۸۰۱ء ہے (۴) صورت کبیشر کی بیتال پچیسی بہاشہ کا اردو ترجمہ جو للولال جی کی شرکت مین کیا گیا وجہ تسمیہ یہ ہے کہ پچیس قصے

کسی بیتال پچیسی (بیتال بھوت) نے راجہ بکرماجیت کے سامنے کہے تھے یہ ہندوستانی پبلک مین بہت مقبول ہے مگر اسمین کوئی ادبی ندرت نہین ہے (۵) فارسی تاریخ شیرشاہی کا ترجمہ جو بعد کو انگریزی مین بھی ہوگیا ہے (۶) ایک دیوان ریختہ تقریباً ساڑھے تین سو صفحات کا جس مین غزلیات قصاید رباعیات وغیرہ معہ سوانحعمری مصنف کے ہین۔ اسکا ایک نسخہ خود مصنف نے بطور یادگار کے فورٹ ولیم کالج کو ۱۸۰۱ء مین دیا تھا۔

حفیظ الدین احمد۔ انہون نے خرد افروز کے نام سے ۱۸۰۳ء مین ابوالفضل کی عیار دانش کا اردو ترجمہ کیا۔ اور عیار دانش خود ملا حسین واعظ کاشفی کی انوار سہیلی کی تلخیص اور انوار سہیلی کلیلہ و دمنہ عربی کا ترجمہ ہے جو سنسکرت سے ماخوذ ہے۔ انہین قصون کا ایک ناتمام ترجمہ انوار سہیلی سے ایک شخص مرزا مہدی نامی نے کیا تھا جو کپتان ناکس کے منشی تھے اور انکے ساتھ کلکتہ اور گیا گئے تھے۔ کپتان ناکس نے گیا مین ایک مشہور داستان گو ہینگا خان نامی سے بھی اسی کتاب کا ترجمہ کرایا تھا۔ اور ان دونون کو مقابلہ کرکے مرزا مہدی کے ترجمے کو ترجیح دی تھی۔ انوار سہیلی کا ایک ترجمہ دکھنی زبان مین بھی موجود ہے جو ایک شخص مسمی محمد ابراہیم بیجاپوری کی تصنیف ہے اور مدراس مین ۱۸۲۴ء مین چھپا ہے۔ بستان حکمت فقیر محمد خان گویا کی بھی اسی کا ترجمہ ہے اور یہی سب سے بہتر ہے۔ نواب امیر علی خان واسطی نے ۱۸۲۰ء مین ایک مختصر ترجمہ ستارۂ ہند کے نام سے کیا تھا اور ایک منظوم ترجمہ موسوم بہار رنگ رائے پنی بہاری لال رنجی بھرت پوری نے ۱۸۷۹ء مین کیا تھا۔

مولوی اکرام علی۔ انہون نے عربی کی مشہور و معروف اخلاقی کتاب اخوان الصفا کا اردو مین ترجمہ کیا۔ اصل کتاب کے خاتمہ پر کشف الظنون کا حوالہ دیکر یہ لکھا ہے کہ رسایل اخوان الصفا کو جو تعداد مین اکاون تھا ہین اشخاص ذیل نے تحریر کیا۔ محمد بن نصر البستی معروف بہ مقدسی۔ ابوالحسن علی بن ہارون الزنجانی۔ ابو احمد النہرجوری عوفی۔ زید بن رفاعہ اور یہ سب کے سب حکیم تھے۔ اس پوری کتاب کا ترجمہ انگریزی مین ڈاکٹر ڈیٹرس نے ۱۸۶۰ء لغایت ۱۸۷۹ء مین کیا مولوی صاحب موصوف نے اردو مین صرف اسقدر حصہ کا ترجمہ کیا ہے جسمین کہ حیوانات اور انسان کی برتری کا سوال شاہ جن کے سامنے پیش کیا گیا ہے مختصر

مضمون یہ کہ جانور اپنے مالک انسان کے ظلم و تعدی سے عاجز آ گئے ہین اور انہون نے اپنا یہ مرافعہ بادشاہ الجنہ کے پاس جسکا نام بیوراسپ ہے پیش کیا ہے اس مقدمہ کے فیصلہ کا ایک دن مقرر کیا گیا ہے جس مین سب جانور جمع ہوئے ہین اور ہر ایک اپنے اپنے فضائل و فوائد اور یہ کہ وہ انسان کو کیا نفع پہونچاتا ہے اور انسان اُس کے ساتھ کیا بدسلوکی کرتا ہے بیان کرتا ہے چنانچہ گھوڑے گدھے۔ اونٹ اور بھیڑی کے بیان یکے بعد دیگرے لئے جاتے ہین جو سب ایسے ہی دلچسپ ہین جیسے کہ کنگزلی کی مشہور انگریزی کتاب ایونِنگز ایٹ ہوم۔ یہ ترجمہ کپتان ٹیلر صاحب کی فرمایش سے نہایت سلیس اور آسان اردو مین کیا گیا اور ۱۸۱۰ء مین شایع ہوا کپتان لاکٹ کی سفارش سے جو اُسوقت فورٹ ولیم کالج کے افسر اعلے تھے مولوی اکرام علی ۱۸۱۲ء مین محافظ دفتر مقرر ہوئے تھے۔

للو لال جی یہ گجراتی برہمن تھے مگر شمالی ہند مین سکونت گزین ہو گئے تھے۔ باوصف اسکے کہ ہندو تھے مگر اردو کے بھی بڑے ماہر تھے چنانچہ شکنتلا ناٹک۔ سنگھاسن بتیسی۔ بیتال پچیسی اور قصہ مادھونل کی تصنیف مین انہون نے اصل مضمون کو بہت مدد دی تھی جسکا حال اوپر بیان ہوا۔ علاوہ اسکے ۱۸۱۰ء مین انہون نے ایک کتاب زبان ہندی مین لطیف حکایات کی تصنیف کی جو "لطایف ہندی" کے نام سے مشہور ہے۔

بینی نرائن بینی نراین تخلص بہ جہان دیوان جہان کے مصنف ہین جسمین ایک تذکرہ ہندوستانی شعرا کا بھی شامل ہے جو کپتان روبک صاحب سکرٹری فورٹ ولیم کالج کی فرمایش سے ۱۸۱۲ء مین لکھا گیا اور انہین کے نام پر معنون بھی ہے۔ اسکے علاوہ انہون نے ایک فارسی قصے کا ترجمہ "چار گلشن" کے نام سے کیا جسمین بادشاہ کیوان اور فرخندہ کے حالات درج ہین۔ یہ قصہ ۱۸۱۲ء مین منشی امام بخش کے ایما و اصرار سے تیار کیا گیا اور کپتان ٹیلر صاحب کے سامنے پیش کیا گیا جنھون نے اسکو پسند کر کے مصنف کو انعام سے سرفراز کیا اور اسکی اصل کتبخانہ کالج مین داخل کرا دی گارسن ڈیٹاسی کی تحقیق ہے کہ انہون نے شاہ رفیع الدین صاحب کی تنبیہ الغافلین کا بھی ترجمہ اردو مین ۱۸۲۹ء مین کیا۔ وہ یہ بھی لکھتے ہین کہ بینی نراین مسلمان ہو گئے تھے اور مولانا سید احمد صاحب بریلوی سے بیعت بھی کر لی تھی۔

مرزا علی لطف کاظم بیگ خاں کے بیٹے تھے جو استرآباد کے رہنے والے تھے اور ۱۱۶۱ھ مین نادر شاہ کی ہمراہی مین آئے تھے اور بعد کو ابو المنصور خان صفدر جنگ کی وساطت سے دربار شاہی دہلی مین داخل ہو گئے لطف فارسی مین بھی شعر کہتے تھے اور اپنے باپ کے شاگرد تھے جنکا تخلص ہجر یا ہجری تھا۔ اردو شاعری کی نسبت لطف کا خود بیان ہے کہ مین کسیکا شاگرد نہین ہون دکن حیدر آباد کے سفر کے ارادہ سے نکلے تھے کہ ڈاکٹر گلکرسٹ نے انکو روک لیا۔ اور انکا مشہور تذکرہ "گلشن ہند" انسے لکھوایا چنانچہ اس قصہ کا ذکر انہون نے اپنے تذکرہ کے دیباچہ مین کیا ہے۔ اسکا سنہ تصنیف ۱۸۰۱ع اور ماخذ نواب علی ابراہیم خان کا تذکرہ گلزار ابراہیم ہے گو کہ اسمین بہت کچھ اضافہ کیا گیا ہے۔ یہ تذکرہ بالکل نایاب تھا جب حیدرآباد مین طوفان عظیم آیا تو اسکی ایک جلد موسی ندی مین بہتی ہوئی جا رہی تھی اتفاقاً وہ کسی قدردان کے ہاتھ آئی اور اب وہ ایک نہایت نفیس مفید اور دلچسپ مقدمہ کے ساتھ مولوی عبد الحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی اردو کے اہتمام سے شایع ہو گیا ہے۔ یہ تذکرہ نہایت دلچسپ ہے اسوجہ سے کہ اُس زمانہ کا طرز تحریر اسوقت کے مشہور مشہور شاعرون کے دلچسپ حالات جنسے کہ مصنف سے ملاقات ہوئی اور اسوقت کی سوسائٹی کے مرقعے اسمین موجود ہین۔ ہر چند کہ صحت واقعات کے لحاظ سے یہ بہت زیادہ قابل وثوق نہین اور عبارت بھی ضرورت سے زیادہ پر تکلف و پر تصنع مسجع و مقفی ہے۔

مولوی امانت اللہ انکا تخلص شیدا تھا انہون نے اخلاق جلالی کا ترجمہ "جامع الاخلاق" کے نام سے کپتان جیمس مونرٹ صاحب کے حکم سے ۱۸۰۵ع مین کیا۔ دیباچہ مین کپتان مذکور اور نیز گورنر جنرل مارکوئس آف ولزلی کی نہایت مبالغہ آمیز الفاظ مین تعریف ہے۔ مولوی امانت اللہ نے ۱۸۰۴ع مین کتاب ہدایت الاسلام زبان عربی و اردو تحریر کی جسکا ترجمہ خود گلکرسٹ صاحب نے انگریزی مین کیا۔ ۱۸۱۰ع مین انہون نے ایک منظوم صرف و نحو اردو موسوم بہ "صرف اردو" تصنیف کی۔

اس عہد کے دیگر منشی اور نثار علاوہ ان لوگون کے جن کا ذکر اوپر ہوا اس عہد کے بعض دیگر منشی و نثار یہ تھے۔ سید جعفر علی ؔ ۔ دان لکھنوی ۔ افتخار الدین شہرت۔ عبد الکریم خان کریم دہلوی۔ مرزا ہاشم علی عیان۔ مرزا قاسم علی ممتاز۔ میر عبد اللہ مسکین۔ مرزا جان طپش۔ مولوی خلیل علیخان اشک اور مرزا محمد فطرت۔

اشک نے سنہ ۱۸۱۰ء مین اکبر نامہ کا ترجمہ "واقعات اکبر" کے نام سے تیار کیا مگر وہ شایع نہین ہوا لیکن نے
ایک کتاب اردو محاورات پر لکھی اور ۱۸۱۱ء مین ایک طویل مثنوی بہار دانش کے نام سے لکھی - انکا
کلیات فورٹ ولیم کالج کی طرف سے شایع ہوگیا ہے -

تراجم قرآن شریف از مولانا شاہ ولی اللہ و شاہ عبد العزیز و شاہ عبد القادر و شاہ رفیع الدینؒ

مولانا شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی مشہور محدث و صوفی اٹھارہوین صدی کے آخر اور انیسوین صدی کے شروع مین ہوئے ہین انکے
متعدد تصانیف ہین جنمین حجۃ اللہ البالغہ - اور ازالۃ الخفا عن سیرۃ الخلفا - نہایت مشہور و ممتاز ہین
انکے بڑے صاحبزادہ مولانا شاہ عبد العزیز صاحب بھی علم و فضل اور زہد و تقوی مین اپنے والد بزرگوار
سے کم نہ تھے - اُنکا انتقال سنہ ۱۲۳۹ھ مین ہوا - دوسرے صاحبزادے مولانا شاہ رفیع الدین سنہ ۱۲۳۳ھ
بھی نہایت جید عالم تھے جنہون نے سب سے بڑا کام یہ کیا کہ قرآن شریف کا سب سے پہلا اردو ترجمہ کیا تیسرے
صاحبزادے مولانا شاہ عبد القادر تھے (سنہ ۱۲۳۰ھ) جو اپنے علم و فضل اور کمالات ظاہری و باطنی کے
واسطے مثل اپنے پدر بزرگوار اور برادران محترم کے مشہور تھے - انہون نے سنہ ۱۲۰۵ھ مین ایک دوسرا
اردو ترجمہ قرآن شریف کا کیا - اور ایک تفسیر موضح القرآن کے نام سے تصنیف کی - انکا ترجمہ نہایت سلیس
سادہ اور بامحاورہ اردو مین ہے جس سے انکا تجر علمی بدرجہ اتم ظاہر ہے - یہ ترجمہ اسقدر مقبول ہوا اور اتنک
ہے کہ مولوی نذیر احمد صاحب اپنے ترجمہ قرآن شریف مین انکی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہین کہ شاہ صاحب کا
پورا خاندان اس علمی خدمت کے واسطے مشہور ہے اور حق یہ ہے کہ یہ حضرات مترجمین متاخرین کے واسطے
کچھ نہین چھوڑ گئے کیونکہ ان لوگون کے تراجم اصل مین قرآن شریف کے تراجم نہین ہین بلکہ خاندان شاہ ولی اللہ
کے تراجم کے تراجم ہین - ہمارے نزدیک شاہ رفیع الدین صاحب اور شاہ عبد القادر صاحب کے ترجمے
فی الحقیقت اس تغیر عظیم کا پتہ دیتے ہین جو زبان اردو مین ہونے والا تھا جبکہ فارسی کا انحطاط ہو رہا تھا

مولوی محمد اسماعیل دہلوی

مولوی عبد الغنی کے بیٹے اور شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کے پوتے
تھے - ذہانت اور رسائی فکر مین یگانۂ روزگار اور اپنے عہد کے بہت بڑے عالم باعمل تھے - سید احمد
مجاہد بریلوی کے ہمراہ جہاد کی نیت سے نکلے مگر قلعہ بالاکوٹ ملک پنجاب کے قریب شربت شہادت

سے سیراب ہوے یہ واقعہ ۱۲۴۶ھ کا ہے۔ شاہ نصیر نے اس واقعہ کو مذاق کے طور پر ایک قصیدہ کی صورت مین لکھا تھا۔ جسکے دو شعر یہ ہین۔

کلام اللہ کی صورت ہوا دل انکا سیپارہ — نہ یاد آئی حدیث انکو نہ کوئی نص قرآنی

ہرن کی طرح میدان وغا مین چوکڑی بھولے — اگرچہ تھے دم شملہ سے وہ شیر نیستانی

جب اس قسم کے طنز آمیز اشعار انکے مریدون نے سنے تو وہ شاہ نصیر کے مکان پر چڑھ دوڑے اور انکی خوب خبر لینا چاہی۔ مرزا خانی[لہ] کوتوال شہر کو جب اسکی خبر ہوئی تو وہ موقع واردات پر پہونچے اور شاہ صاحب کو ان لوگون سے چھڑایا۔ مولانائے موصوف کی مشہور تصانیف حسب ذیل ہین۔ رسالہ توحید۔ صراط مستقیم۔ تنویر العینین۔ تقویۃ الایمان وغیرہ۔

ترتیب صرف و نحو ولغات اردو

کتب درسیہ اور تراجم کے علاوہ ترتیب صرف و نحو و تراجم کے اوپر بھی پوری توجہ مبذول کیگئی۔ کتب مذکورہ ذیل ان یوروپین اصحاب کی تصنیف و تالیف ہین جنکو زبان اردو کی ترقی سے بہت دلچسپی تھی۔ سب سے پہلی ہندوستانی گرامر وہ ہے جو ۱۷۱۵ء مین جان جوشوا کیٹلر نے تصنیف کی تھی جو بزمانہ شاہ عالم و جہاندار شاہ یعنی ۱۷۱۲ء مین مملکت ہالینڈ کی طرف سے ہندوستان مین سفیر تھے۔ انہون نے آگرہ لاہور دہلی وغیرہ کی بھی سیر کی تھی اور ۱۷۱۶ء مین اپنے ملک کی طرف سے ایران مین بھی سفیر ہوئے تھے۔ انہون نے ہندوستانی زبانکی ایک لغت تیار کی جسکو ایک انگریز ڈیوڈ مل نے ۱۷۴۳ء مین شایع کیا۔ کیٹلر مذکور کی گرامر مین نہ صرف ہندوستانی افعال کی گردانین ہین۔ بلکہ احکام عشرہ تورات اور "لارڈس پریئر" کا ترجمہ بھی اردو مین کیا ہے۔ ۱۷۴۴ء مین ایک مشہور جرمن پادری شلز نامی نے ایک دوسری ہندوستانی گرامر موسوم بہ "گرامٹیکا ہندوستانی کا" زبان لاطینی مین تیار کی جسمین ہندوستانی الفاظ بخط عربی و فارسی معہ خط انگریزی کے تحریر کیے۔ اسی سنہ مین مل نے ہندوستانی حروف تہجی اور کچھ ہندوستانی الفاظ کے اوپر ایک رسالہ لکھا۔ ۱۷۴۸ء مین بھی اسی مصنف نے

لہ یہ مرزا خانی راقم آثم (مترجم) کے دادا تھے جنکی تعریف مین اسی قصیدہ مین بطور شکریہ کے شاہ صاحب نے یہ شعر کہا ہے ؎ نصیر الدین بیچارہ تو رستہ طوس کا لیتا۔ نہوتے شحنۂ دہلی اگر یان میرزا خانی (دیکھو آب حیات ذکر شاہ نصیر)۔

ایک کتاب جی اے فرٹز نے تصنیف کی جسمین ہندوستانی حروف تہجی کا دوسرے ممالک کے حروف
سے مقابلہ کیا گیا ہے - اور ۱۷۷۱ء مین اسی قسم کی ایک تیسری کتاب ایک اٹالوی پادری کیسیانو بیلی گاٹی
نے تصنیف کی جسکا نام "الفابیٹم برہمانکم" رکھا - اس کتاب کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اسمین ہندوستانی
حروف اپنی خاص شکل مین ٹائپ مین لکھے گئے ہین ۱۷۷۲ء مین ہیڈلی کی گرامر اور ۱۷۷۸ء مین زبان بنگالی
مین ایک ہندوستانی گرامر موسوم بہ "گرامیٹکا اندوستانا" چھپین - اسکے بعد ڈاکٹر گلکرسٹ کی تصانیف
کا زمانہ آتا ہے جنھون نے نہایت تلاش اور شوق سے متعدد رسائل گرامر اور لغات اور فرہنگین اور
تحقیقات زبان کے متعلق دوسری کتابین تصنیف کین اور چھپوائین انکی مدت تصنیف ۲۰ برس ہے
اور ۱۷۸۳ء سے شروع ہوتی ہے - انہون نے تقریبًا پندرہ کتابین متعلق بہ صرف و نحو و علم الالسنہ
و لغات و تراجم و امثال وغیرہ تصنیف کین - اکثر ہندوستانی منشی اور پنڈت جو فورٹ ولیم کالج مین
ملازم تھے انکے ساتھ بھی یہ شریک تصنیف رہے - اسکے علاوہ ان کی نگرانی مین متعدد عمدہ عمدہ
ادبی کتابین تیار ہوئین - مختصر یہ کہ اس عہد کی تصنیفات و تالیفات کے وہ روح روان تھے -
اور علاوہ علمی قابلیت و استعداد کے ایسے خلیق متواضع اور ہمدرد واقع ہوئے تھے کہ مختلف اقطاع
ملک سے قابل قابل لوگ انکی قدردانی کا شہرہ سنکر ان کے پاس جمع ہو گئے تھے - انکی سب سے زیادہ
مشہور تصنیف ایک انگریزی ہندوستانی ڈکشنری مطبوعہ ۱۷۹۸ء اور ایک ہندوستانی گرامر مطبوعہ ۱۸۰۹ء
ہین - اسیطرح کپتان ٹیلر اور ڈاکٹر ہنٹر نے بھی ایک ہندوستانی انگریزی ڈکشنری ۱۸۰۸ء مین اور
مولوی امانت اللہ نے ایک مختصر ہندوستانی صرف و نحو منظوم موسوم بہ صرف اردو ۱۸۱۱ء مین تصنیف
کین - جان شیکسپیر کی ہندوستانی گرامر ۱۸۱۲ء مین اور ہندوستانی انگریزی ڈکشنری ۱۸۱۷ء مین شائع
ہوئین - کپتان پرائس اور سٹیس نے بھی ہندوستانی کتابین لکھین گارسن ڈیٹاسی مشہور مستشرق فرانس
نے زبان اردو کے متعلق متعدد کتابین زبان فرانسیسی مین تصنیف کین اور ڈنکن فاربس نے اپنی متعدد
تصانیف سے جو از قسم گرامر اور لغت ہین اور نیز اردو کی قدیم کتابون کو ایڈٹ کر کے زبان اردو کو ممنون احسان
کیا - سر ولیم ہانیر بانی ایشیاٹک سوسائٹی بنگال اور ڈاکٹر فیلن نے بھی نہایت مفید کتابین بصورت گرامر اور

لغت کے تصنیف کیں پلیٹ کی گرامر ۱۸۴۱ء مین اور ڈکشنری ۱۸۴۸ء مین اور پادری کریون صاحب کی مختصر ڈکشنری ۱۸۸۱ء مین چھپکر نکلین اور یہ سب کتابین طلبار کے لئے نہایت مفید سمجھی جاتی ہین۔

ہندوستانیونکی مرتب کردہ لغات و دیگر کتب

اب دیکھنا چاہئے کہ خود ہندوستانیون نے اپنی زبانکی ترقی و تمدین مین کیا حصّہ لیا۔ انشا اور قتیل کی متحدہ تصنیف "دریائے لطافت" جسکو زبان اردو کی سب سے زیادہ مشہور اور قدیم صرف ونحو کی کتاب سمجھنا چاہئے ۱۸۰۲ء مین تحریر اور ۱۸۵۰ء مین بمقام مرشدآباد پہلی بار شایع ہوئی۔ منشی محمد ابراہیم نے ایک اردو کی صرف ونحو معروف بہ تحفۃ الفنسن ۱۸۲۳ء مین لکھی مولوی احمد علی دہلوی کا رسالہ "چشمۂ فیض" اردو کی صرف ونحو پر ۱۸۴۵ء اور مولوی امام بخش صہبائی کا ترجمہ حدایق البلاغت ۱۸۴۹ء اور منشی کریم الدین کی قواعد المبتدی۔ نثار علی بیگ فیض اللہ خان اور محمد احسن کے رسالجات صرف ونحو مولوی محمد حسین آزاد کی کتاب "جامع القواعد" مطبوعہ لاہور ۱۸۴۵ء۔ جلال کی "گلشن فیض" مطبوعہ لکھنؤ ۱۸۸۰ء جو ایک اردو ہندی الفاظ و محاورات کی تحقیق کی لغت ہے یہ سب اسی زمانے کی تصنیف ہین۔ زمانہ حال کی تصنیفات مین منشی امیر احمد صاحب کی مشہور لغت امیراللغات (جو افسوس ہے کہ ناتمام ہے) مولوی سید احمد دہلوی کی فرہنگ آصفیہ چار جلدین جو سالہاسال کی کاوش و محنت کا بہت اچھا نتیجہ اور حضور نظام کی سرپرستی اور دریادلی کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ اور مولوی نورالحسن صاحب نیر کاکوروی کی نوراللغات قابل ذکر ہین۔ انجمن ترقی اردو نے ایک مختصر رسالہ صرف ونحو ایک نئے طریقہ سے ترتیب دیا ہے۔ مگر ہماری ناچیز رائے مین باوجود ان تمام کتب کے جنمین سے اکثر فی زماننا موجود ہین پھر بھی ایک مکمل سائینٹفک اردو گرامر کی اب بھی سخت ضرورت ہے۔ نیز یہ کہ اگر اس زمانہ کے فضلا کمر ہمت باندھ لین اور امیراللغات کی باقی جلدین پوری کردین اور کوئی دریادل رئیس اسکی طباعت کا اہتمام کردے تو اس مین شک نہین کہ اس کتاب کے تکمیل سے زبان اردو کی نہایت معقول اور عمدہ خدمت سرانجام پائیگی۔

عیسائی پادریون کے کارنامے زبان اردو کی توسیع و ترقی مین

سب سے قدیم اردو ترجمے بائیبل کے وہ ہین جو بنجمن شلز اور کالبر گ نے ۱۷۴۸ء لغایت ۱۷۵۸ء مین کئے مرزا محمد فطرت اور دیگر کالج کے منشیون نے عہد جدید کا

ترجمہ اردو مین کیا جو نظر ثانی ڈاکٹر ہنٹر ۱۸۰۵ء مین کلکتہ سے شایع ہوا۔ اسیطرح سیرام پور کے پادریون نے بھی بائیبل کے ترجمے اردو ہندی مین نکالے۔ پادری مارٹن نے ۱۸۱۴ء مین عہد جدید کا ترجمہ زبان یونانی سے اردو مین کیا جسپر مرزا محمد فطرت نے نظر ثانی کی۔ پوری بائیبل کا ترجمہ سیرام پور کے پادریون نے پانچ جلد ونمین ۱۸۱۶ء لغایت ۱۸۱۹ء مین شایع کیا۔ پادری لوگ اپنے مطالب عوام الناس پر دلنشین کرنیکے واسطے انھین کی زبان مین اپنی تحریرین اور تقریرین کرتے تھے اور اشاعت دین کی غرض سے متعدد رسالے پمفلٹ اور اخبار وغیرہ نکالتے تھے جنمین مذہبی ایتون اور گیتونکے علاوہ بہت سی مفید چیزین بھی شامل ہوتی تھین جنسے زبان کو بہت وسعت اور ترقی حاصل ہوئی۔

نثر اردو کا دور متوسط اور دور جدید

مطبوعات لکھنؤ ہرچند کہ نثر اردو کی ابتدا فورٹ ولیم کالج کلکتہ سے ہوئی تھی۔ مگر لکھنؤ بھی جو دلّی کی تباہی کے بعد علم وادب اور شعر وسخن کا مرکز بنگیا تھا نثر نگاری مین فورٹ ولیم کالج سے کچھ کم نرہا کتب ذیل سب اسی اشرف البلاد کی طباعت کی یادگار ہین بستان حکمت کلیلہ دمنہ۔ گل بکاولی۔ گلشن نوبہار گل وصنوبر۔ نورتن مصنفہ محمد بخش مہجور شاگرد جرأت وغیرہ وغیرہ۔

فقیر محمد خان گویا۔ بستان حکمت ۱۲۵۱ھ نواب فقیر محمد خان لکھنؤ کے ایک نامور رئیس اور فوج شاہی کے ایک مشہور رسالدار تھے حسام الدولہ خطاب اور گویا تخلص کرتے تھے ناسخ کے شاگرد تھے مگر خواجہ وزیر سے بھی اصلاح لیتے تھے۔ صاحب دیوان ہین گو کہ دیوان انکے مرنیکے ایک عرصہ کے بعد مطبع منشی نولکشور لکھنؤ مین چھپا۔ گویا کا انتقال ۱۲۶۶ھ مطابق ۱۸۵۰ء مین ہوا۔ انکی تصنیف بستان حکمت انوار سہیلی کا مشہور ترجمہ ہے جو ۱۲۵۱ھ مین ختم ہوا اور شیخ ناسخ نے تاریخ کہی جسکا مصرع تاریخ یہ ہے ع

خرد گفت بستان سیراب حکمت۔ سبب تالیف اس کا مصنف یون بیان کرتے ہین کہ ایکدن نہ ادلہ

خواجہ وزیر اور میان فرخ شاعر کہ یہ دونون شیخ ناسخ کے شاگرد تھے، اور چند احباب کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے اور انوار سہیلی کا ذکر ہو رہا تھا۔ اور سب لوگ اسکی تعریفین کر رہے تھے کہ اثنائے گفتگو مین سب اہل محفل نے مصنف سے اصرار کیا کہ اکثر زبانون مین اس کتاب کا ترجمہ ہو چکا ہے اگر تم اردو مین ترجمہ کرو تو خوب چیز ہو۔ غرضکہ ان لوگون کے اصرار پر مصنف نے کمر ہمت باندھی اور ترجمہ شروع کر کے انجام کو پہونچایا۔ اگر کتاب کو بالاستیعاب پڑھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ترجمہ لفظی نہین ہے بلکہ موقع موقع پر ایجاز و اطناب کو دخل دیا ہے البتہ عربی و فارسی الفاظ بہ کثرت ہین اور زبان بھی شگفتہ اور سلیس نہین عربی الفاظ اور امثال بکثرت استعمال کیے گئے ہین جس سے کہین کہین عبارت بے مزہ اور مغلق ہوگئی ہے۔ مگر یہ بات قابل توجہ ہے کہ عبارت مقفی اور مسجع نہین جیساکہ سرور کی فسانہ عجائب کی ہے۔ مختصر یہ کہ یہ کتاب ایک زمانہ مین مقبول تھی مگر اب لوگ اسکو کم پڑھتے ہین۔

مرزا رجب علی بیگ سرور
متوفی ۱۲۸۴ھ

لکھنؤ کے سب سے قدیم اور مشہور نثار مرزا رجب علی بیگ سرور ایک جامع الکمالات شخص تھے باپ کا نام مرزا اصغر علی بیگ تھا۔ ۱۲۰۱ھ یا ۱۲۰۲ھ مین لکھنؤ مین پیدا ہوئے اور وہین نشو و نما اور تعلیم پائی۔ عربی و فارسی مین اچھا دخل رکھتے تھے اور اپنے زمانہ کے مشہور خطاطون مین شمار کیے جاتے تھے۔ اس فن مین حافظ ابراہیم کے شاگرد تھے جنکا ذکر فسانہ عجائب مین موجود ہے۔ موسیقی سے بھی علمی اور عملی دونون طور پر بخوبی واقف تھے فن شعر مین آغا نوازش تلمیذ میر کے شاگرد تھے جنکا ذکر اپنی کتاب مین بہت محبت و ادب سے کرتے ہین۔ حریف ظریف ہشاش بشاش وجیہ اور خوشرو آدمی تھے۔ انکے دوستون مین شرف الدین میرٹھی اور مرزا غالب بھی تھے اور آخر الذکر نے فسانہ عجائب اور گلزار سرور پر فاضلانہ تقریظین بھی لکھی ہین۔

۱۲۴۰ھ مین سرور کانپور گئے اور کہا جاتا ہے کہ غازی الدین حیدر کے حکم سے لکھنؤ سے جلاوطن کر دیے گئے تھے۔ وہ کانپور سے نہایت بیزار ہین چنانچہ لکھتے ہین کہ "ربیع الثانی کے مہینہ مین کہ سنہ ہجری نبوی صلعم بارہ سو چالیس تھے آنیکا اتفاق مجبورًا کوردہ کانپور مین ہوا۔ بسکہ یہ بستی پوچ دلچسپی اشراف یہان عنقا صفت ناپیدا ہین۔ احیانًا جو ہونگے تو گوشہ نشین عزلت گزین۔ مگر چھوٹی اُمت

کی بڑی کثرت دیکھی۔ یہ طور دیکھکر دل وحشت منزل سخت گھبرایا کلیجہ منھ کو آیا۔ قریب تھا جنون ہوجائے۔ تیرہ بختی روز سیاہ پیش لائے" اس کے بعد لکھتے ہین کہ یہین کانپور مین حکیم سید اسد علی صاحب سے ملاقات ہوگئی جو میرے حالپر بڑی عنایت فرماتے تھے ایکدن اُنسے کہا کہ مین ایک قصہ لکھنا چاہتا ہون سنکر فرمایا بیکار مباش کچھ کیا کر۔ اُسوقت یہ کلمہ توسن طبع کو تازیانہ ہوا۔ یعنی باعث تصنیف کتاب بنگیا۔ پھر اسکے آگے ایک طنز یہ طور پر لکھتے ہین کہ مین ہیچمیرز ہون مجھکو زبان کا دعوے نہین۔ اگر شاہجہان آباد کا رہنے والا ہوتا تو زباندانی کا دعوی کرتا۔ جیسا کہ میر امن نے کیا ہے۔ جنکی نسبت یون گلفشانی کرتے ہین "اگر وہان (شاہجہان آباد مین) چندے بود و باش کرتا فصیحون کو تلاش کرتا تو فصاحت کا دم بھرتا جیسا کہ میر امن نے چار درویش مین بکھیڑا کیا ہے کہ ہم لوگون کے ذہن وحصہ مین یہ بات آئی ہے دتی کے روڑے ہین محاورے کے ہاتھ مُنھ توڑے ہین۔ پتھر پڑین ایسی سمجھ پر یہی خیال انسان کا خام ہوتا ہے۔ مفت مین نیک بدنام ہوتا ہے بشر کو دعوی کب سزاوار ہے۔ کاملون کو بیہودہ گوئی سے انکار بلکہ ننگ و عار ہے۔ مشک آنست کہ خود ببوید۔ نہ کہ عطار بگوید"[1] مختصر یہ کہ کانپور ہی مین یہ کتاب لکھی گئی۔ اسکے شروع مین چند سطور بادشاہ وقت غازی الدین حیدر کی مدح وثنا مین شاید اس غرض سے لکھی ہین کہ اُن کا قصور معاف کیا جائے اور لکھنؤ آنے کی اجازت دیجاے۔ یہ کتاب غازی الدین حیدر کے زمانہ مین شروع ہوئی تھی اور نصیر الدین حیدر کے عہد مین تمام ہوئی جنکی تعریف مین سرور نے لکھنؤ کے حالات کے سلسلہ مین بہت کچھ لکھا ہے اور آخر مین ایک دعائیہ غزل بھی انکی شان مین ہے جسکا مطلع ہے

تا ابد قایم رہے فرمانروا ئے لکھنؤ
یہ نصیر الدین حیدر بادشاہ لکھنؤ

اسی غزل کے چند مشہور شعر یہ ہین۔

یا تو ہم پھرتے تھے اُنمین یا ہوا یہ انقلاب
پھرتے ہین آنکھونمین ہردم کوچہ ہائے لکھنؤ

انکی استغنا سے کیا کیا آرزو کرتی ہے رشک
جام جم پر تف نہین کرتے گدائے لکھنؤ

جن و انس و وحش و طایر کیون نہ سب محکوم ہون
ہے سلیمان اندنون فرمانروائے لکھنؤ

یہ رہے آباد یا رب تا بہ دور مشتری
مین کہین ہون مانگتا ہون یہ دعائے لکھنؤ

[1] اس سخت تنقید کا جواب خواجہ فخر الدین حسین صاحب سخن دہلوی مرحوم نے سروش سخن مین نہایت فقرہ ان شگن اور معقول دیا ہے دیکھو دیباچہ سروش سخن

بُلبُلِ شیراز کو ہے رشکِ ناسخ کا سرور — صفہان اُسنے کئے ہین کوچہائے لکھنؤ

سرور کے اکثر اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب لکھنؤ مین نہین بلکہ کسی اور جگہ تحریر ہوئی مگر بعد اختتام بعہد نصیر الدین حیدر لکھنؤ مین آئی اسکا سنہ تصنیف ۱۲۴۰ھ ہے جیساکہ آخر کے قطعات تاریخ سے معلوم ہوتا ہے۔ ۱۸۴۷ء مین سرور کی بیوی کا انتقال ہوا اور اسی سال سرور واجد علی شاہ کے درباری شعرا مین بمشاہرہ پچاس روپیہ ماہوار داخل ہوئے۔ اور اُنھون نے اپنا مدحیہ قصیدہ حضرت ظل سبحانی کی تعریف مین معرفت قطب الدولہ مصاحب شاہی پیش کیا ۱۸۴۸ء مین بادشاہ کے حکم سے کتاب شمشیر خانی کا ترجمہ موسوم بہ سرور سلطانی کیا اور ۱۸۴۷ء اور ۱۸۵۱ء کے اثنا مین اکثر چھوٹے چھوٹے قصے تصنیف کئے جن مین سے ایک "شرر عشق" ہے جو نواب سکندر بیگم والی بھوپال کے حکم سے لکھا گیا ۱۸۵۶ء مین "شگوفۂ محبت" امجد علی خان رئیس سندیلہ کی فرمایش سے تحریر ہوا انتزاع سلطنت ۱۸۵۶ء کیوجہ سے سرور بہت خستہ حال اور پریشان روزگار ہوگئے تھے کچھ دنون قربان علی سررشتہ دار کارینگی صاحب اور منشی شیو پرشاد ملازم کمسریٹ نے انکی اعانت کی لیکن ۱۸۵۷ء کے غدر نے اس ذریعہ کو بھی منقطع کردیا۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد مہاراجہ ایشری پرشاد نرائن سنگھ والی بنارس کی طلبی پر سرور ۱۸۵۹ء مین بنارس گئے اور مہاراجہ صاحب نے وہان ان کی بہت قدر افزائی اور خاطر و مدارات کی۔ بنارس مین اُنھون نے "گلزار سرور" "شبستان سرور" اور دیگر نظم و نثر کی چھوٹی چھوٹی کتابین تصنیف کین۔ مہاراجہ بنارس کیطرح سرور کو مہاراجہ الور اور مہاراجہ ٹپیالہ نے بھی اپنی اپنی ریاستون مین طلب کیا تہا اور آخر الذکر نے ایک جوڑی طلائی کڑون کی انکو مرحمت فرمائی تھی۔ سرور کے ایک خط سے جو اُنکی انشائے سرور مین چھپ گیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دلی لکھنؤ میرٹھ اور راجپوتانہ بھی گئے تھے اسوجہ سے کہ اس خط مین انہون نے اپنے سفر کی تکلیفون کا حال مشرح طور پر لکھا ہے۔ انشائے مذکور مین جو خطوط درج ہین وہ انکے سوانح زندگی اور اس عہد کے حالات پر کافی روشنی ڈالتے ہین۔ ایکمرتبہ اُنپر ایک الزام قتل بھی لگایا گیا تہا۔ ۱۸۶۳ء مین سرور اپنی آنکھون کے علاج کے لئے کلکتہ گئے تھے۔ اور واجد علی شاہ سے بھی ملے تھے جو اسوقت مٹیا برج مین نظر بند

تھے مگر سرور وہان سے ناکام آئے اور بالآخر اپنی آنکھون کا علاج لکھنؤ مین ایک ہندوستانی ڈاکٹر سے کرایا۔ اسکے بعد وہ بنارس گئے جہان ۱۸۶۷ء (مطابق ۱۲۸۴ھ) مین (یعنے غالب سے ایک سال پیشتر) انتقال کیا۔

فسانۂ عجائب سرور کا سب سے بڑا کارنامہ انکی تصنیف فسانۂ عجائب ہے۔ اس کا قصہ معمولی حسن و عشق کا افسانہ ہے جسکے مضمون و واقعات مین کوئی جدت نہین اور عبارت اسی زمانہ کی مروجہ فارسی کی تقلید مین پر تکلف و تصنع مقفیٰ اور مسجع ہے۔ یہ ایک ایسا فرضی افسانہ ہے جسمین طلسم سحر دیو ونسے لڑائی جادوگرون سے مقابلے سفر کے عجائب و غرائب کبثرت ہین۔ یہ نوجوان طبیعتون کو بہت مرغوب ہے مگر سن رسیدہ لوگ نفس قصہ سے کوئی دلچسپی نہین رکھتے البتہ اُنکی زبان اور مصنوعی عبارت کو اکثر پسند کرتے ہین۔ اسکی عبارت پر تکلف ہے مگر اُسمین واقعات کی فراوانی نہین ہے۔ بعض فقرات ضرور ایسے ہین جو مثل نظم کے دلچسپ اور ادبی مرصع کاری کا بہترین نمونہ ہین۔ اس کتاب کو زمانۂ حال کے اصول تنقید سے جانچنا ایک فضول سی بات ہے اسوجہ سے کہ مصنف اگلے زمانہ کے لوگون مین ہین قصہ بھی پرانے رنگ کا ہے اور طرز عبارت اُس زمانہ کا ہے جب فارسی عام طریقہ سے رائج تھی اُردو کے خطوط تک مین تصنع اور تکلف شامل تھا اور سادگی عبارات کو لکھنے والے کی سادہ لوحی اور عدم قابلیت پر محمول کرتے تھے۔ ان قیود پر نظر کرتے ہوئے ہمکو اُن لوگون کا تہ دل سے ممنون ہونا چاہیے جنہون نے قدیم فرسودہ طریقون کو چھوڑ کر ایک نئی شاہراہ قایم کی۔ مثلاً مرزا غالب۔ اور سر سید وغیرہ جسطرح نظم اُردو کی ابتدا مرثیون غزلون اور مثنویون سے ہوئی اُسیطرح فرضی قصون اور افسانون پر نثر اُردو کی بنیاد رکھی گئی اور جسطرح اصناف نظم مذکورہ تدریجی ترقی کرتی ہوئی اس درجہ کو پہونچین اسیطرح نثر اُردو بھی اپنے ابتدائی مدارج طے کرکے زمانۂ حال کی سلیس اور متین سادہ روش پر آگئی۔ فسانۂ عجائب کا دیباچہ اس لئے اور بھی دلچسپ ہے کہ اُس مین اُس زمانہ کی شہر لکھنؤ کی سوسائٹی وہان کے طرز معاشرت امرا اور رؤسا کی وضعداریون اُنکے پر تکلف جلسون۔ شہر کے رسوم و رواج کھیل تماشون۔ دلچسپ مناظر مختلف پیشون اور اہل کمال کے حالات بازارون

کی چہل پہل۔ سودا فروشونکی آوازون وغیرہ وغیرہ کی دلکش اور جیتی جاگتی تصویرین ہین۔ مگر حقیقت
یہ ہے کہ انکو سرشار کی مرقع نگاری سے علیحدہ سمجھنا چاہیئے اسوجہ سے کہ سرشار کے یہان کیرکٹر اور
مختلف سوسائٹیون کے بحیثیت مجموعی نمونے دکھائے گئے ہین اُنمین تفصیل و تطویل سے کام لیا ہے اور
اپنے ظریفانہ طرز بیان سے اُسمین ایک دلکش اور نظر فریب رنگینی پیدا کردی ہے برعکس اسکے سرور کے
یہان سوسائٹی کے مرقعے یا کیرکٹر نگاری کے کرشمے نہین ہین نیز یہ کہ سرور اپنے سلسلۂ بیان مین اُن چیزون پر
جنکو وہ بیان کرنا چاہتے ہین صرف ایک سرسری نگاہ ڈالتے ہین جسکی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ سرشار بحیثیت
ایک ناولسٹ کے کیرکٹر نگاری اور تفصیل جزئیات کو مقدم سمجھتے ہین اور اسکی سرور کو چندان ضرورت نہین
اس موقع پر پنڈت بشن نراین در کے وہ فاضلانہ خیالات سُننے کے قابل ہین جو فسانہ عجائب کو پڑھکر
انہون نے انگریزی مین قلمبند فرمائے ہین۔ وہ لکھتے ہین کہ "سرشار کے بہ نسبت سرور کے یہان لکھنؤ کا
بیان بہت زیادہ مکمل۔ بہت زیادہ متناسب اور بہت زیادہ خوب صورت ہے۔ مگر سرور آدمیون کا حال
نہین لکھتے صرف چیزون کا مرقع کھینچتے ہیں۔ حلوائی کی دُکان کے پاس سے ہم گزرتے ہین اور ہمارے
مُنھ مین پانی بھر آتا ہے۔ تنبولیون کے یہان کی گلوریان دیکھکر ہمارا جی للچاتا ہے۔ بالائی کو دیکھکر یقین ہوجاتا
ہے کہ لکھنؤ کی بالائی کے آگے ڈیونشایر کی کریم (بالائی) کوئی چیز نہین۔ لیس فروش جوہری بنئے بقال کپڑے
سب چوکھا مال لئے بیٹھے ہین۔ چوک اور دوسری بازارین اور سیرگاہین (جواب باقی نہین رہین) ہم اِس
کتاب مین دیکھتے ہین اور اُنکی خوب سیر کرتے ہین۔ ہماری نگاہ اُن بلند عمارتون اور کمرون پر بھی جاتی ہے جہان
سے کچھ حسین صورتین اپنی جادو بھری نگاہون سے ہمکو جھانکتی ہین۔ ہم چوک مین ہوکر گذرتے ہین مگر وہ ایک
شہر خموشان ایک سونی بستی معلوم ہوتا ہے۔ راہ گیر اور دکاندار سب سو رہے ہین ہم مجمع مین چلتے ہین مگر
کھوے سے کھوا وہان نہین چھلتا۔ کمرے والیان ہمارے اشارون کا جواب نہین دیتین تنبولنین
کرشمہ و ناز مین مصروف ہین مگر مُنھ سے کچھ نہین بولتین کپڑے بھرے ہین۔ بساطی بدمست۔ حلوائی
اونگھ رہے ہین چلو اُنکی مٹھائیان جیبون مین بھر لیجلین۔ زندگی کا کہین پتہ نہین۔ مشہور مشہور
گوّیے ہمارے سامنے آتے ہین مگر انکا گانا سُننے مین نہین آتا۔ شعرا۔ فوجی سپاہی پہلوان۔ بادشاہ

وزیر سب سامنے سے فانوسی تصویرون کی طرح گزر جاتے ہین سب خاموش معلوم ہوتا ہے کہ مصنف
نے یہ سب تصویرین بے ہوشی کے عالم کی کھینچی ہین - لہذا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ سرور کا لکھنؤ وہ شہر
خموشان ہے جسکا نقشہ ٹینیسن نے اپنی مشہور نظم "ڈے ڈریم" (خواب روز) مین کھینچا ہے - وہ کہتا ہے -

"کہین ٹبلر (خانساماں) اپنے دونون گھٹنون کے بیچ مین شراب کی بوتل
دبائے بیٹھا ہے جو آدھی رکھی ہے - اور کہین بڑا اسٹوورڈ (باورچی)
اپنے کام مین مصروف ہے - کہین حسین میڈ (ماما) کا ہاتھ نو عمر خادم (پیج)
نے پکڑ لیا ہے - میڈ کچھ کہنے کیلئے اپنا مُنھ کھولا چاہتی ہے مگر پیج بوسہ کیواسطے
مُنھ لپکاتا ہے - اور شرم کی سرخی میڈ کے رخسارون پر دوڑ جاتی ہے"

اُس زمانہ مین مقفیٰ مسجع عبارت اسدرجہ مقبول اور مروج تھی کہ اس سے احتراز مشکل تھا اسیوجہ سے
فسانۂ عجائب کی عبارت سلیس اور بول چال روزمرہ مین شمار نہین کیجاسکتی برعکس اسکے اسمین تعقید و تکلف
بیحد ہے - اور سرور کی کھینچی ہوئی تصویرین جیسا کہ پنڈت بشن نرائن در نے اوپر بیان کیا ہے اشخاص
قصہ کے صحیح خط و خال نہین دکھاتین بلکہ وہ محض اُن اشخاص کے ماحول اور گرد و پیش کو ظاہر کرتی ہین
قوافی کی پابندی کی وجہ سے سلسلۂ بیان کی روانی اور سلاست مین فرق پڑجاتا ہے اور اکثر جگہ پڑھنے والا
الفاظ کے جال مین پھنس جاتا ہے - سرور نے اپنے جذبۂ وطنی کے جوش مین سیرامن بلکہ دِلّی والون پر اکثر چوٹین
کی ہین جسکا ذکر اوپر ہوا قصہ مین کیرکٹر نویسی کم ہے - مگر اسمین شک نہین کہ ملکۂ مہر نگار کے کیرکٹر مین سچی محبت
باوفائی - دلیری - معاملہ فہمی - جرأت اور متانت و بُردباری کو نہایت واضح طریقہ سے دکھایا ہے - دوسری
خصوصیت یہ ہے کہ اسمین ضمناً بعض قصے ایسے بھی بیان کئے ہین جنکے ہیرو انگریز ہین - مثلاً گسپر محسبٹن کا
قصہ جسکے ذیل مین کچھ انگریزی الفاظ آگئے ہین جو شاید اس سے پیشتر نثر اردو مین شاذ و نادر استعمال ہوئے
ہون - دنیا کی بے ثباتی کا سبق جو بندر کی تقریر سے ملتا ہے اور جوگی کی عبرت افزا نصیحتین نہایت موثر
اور دلکش ہین اس کتاب کے جواب مین دو قصے اور بھی لکھے گئے ایک "سرورش سخن" مولفہ خواجہ
فخر الدین حسین سخن دہلوی جو ۱۸۶۰ء مین تحریر ہوا اور جسمین سرور پر بہت سی چوٹین کی گئی ہین اور دلی

والونکی تعریفین ہین۔ دوسرا "طلسم حیرت" مولفہ محمد جعفر علی شیون لکھنوی جو ۱۸۷۲ء مین تصنیف ہوا جسمین سرور بلکہ اہل لکھنؤ کیطرف سے "سروش سخن" کے مطاعن کا جواب دیا گیا ہے۔

سرور کی دیگر تصانیف

(۱) ۱۸۴۷ء مین سرور سلطانی ترجمہ "شمشیر خانی" جو شاہنامہ فردوسی کا ملخص ہے۔ اس کا بھی طرز عبارت مثل فسانہ عجائب کے مقفےٰ اور مسجع ہے جو تاریخ کے لئے مناسب نہین اسمین ایک مقام پر جذبۂ وطنیت کے جوش مین ہندوستانکی بہت تعریف کی ہے جو قابل دید ہے (۲) ۱۸۵۱ء مین "شرر عشق" جسمین بھوپال کے جنگلون کے کسی واقعہ کو بیان کیا ہے کہ ایک سارس کا جوڑا جسکی محبت مشہور ہے ایک جنگل مین پھر رہا تھا کہ نر کو کسی نے مار ڈالا۔ مادہ نے لکڑیان جمع کین اور اسکے اوپر نہایت باقاعدہ طریقہ پر ستی ہو گئی وغیرہ (۳) اسی سال "شگوفہ محبت" بھی لکھا گیا جسمین مہر چند کھتری کا پرانا قصہ نئے انداز سے بیان کیا ہے اور واجد علی شاہ کے سفر کلکتہ کا بھی اسمین ذکر ہے (۴) "گلزار سرور" جو ایک فارسی کتاب حدائق العشاق کا ترجمہ ہے جسمین ایک افسانہ کی صورت مین روح اور عشق کا مجادلہ دکھایا گیا ہے۔ یہ ایک مذہبی مضمون ہے جسکو مصنف نے اپنی خاص رنگین عبارت مین لکھا ہے اسی پر مرزا غالب نے ایک دلچسپ تقریظ اسی رنگ یعنی مقفیٰ عبارت مین لکھی ہے (۵) "شبستان سرور" یعنی الف لیلہ کے چند قصونکا دلچسپ ترجمہ جسمین جا بجا چیدہ اشعار داخل کرکے کتاب کو بہت دلچسپ بنادیا ہے۔

الف لیلہ کے ترجمے

الف لیلہ کے قصے ہندوستان مین ہمیشہ سے مقبول رہے اور انکا ترجمہ اکثر لوگون نے کیا ہے منشی شمس الدین احمد نے ۱۸۳۶ء مین مدراس سے ایک ترجمہ نکالا جسکا نام "حکایات الجلیلہ" ہے جسمین صرف دوسو راتون کی حکایات ہین اور مدراس کالج کے طلبا کے واسطے یہ کتاب لکھی گئی تھی۔ دوسرا ترجمہ منشی عبد الکریم نے ۱۸۴۴ء مین فارسٹر صاحب کی انگریزی الف لیلہ سے کیا جسکی زبان اسقدر صاف اور سہل ہے کہ ادبی ذوق کے لوگ اسکو معیار سے گرا ہوا سمجھتے ہین پھر ایک منظوم ترجمہ منشی نولکشور صاحب کی فرمایش سے ۱۸۶۲ء و ۱۸۶۸ء مین چار حصونمین نسیم دہلوی منشی طوطا رام شایان اور منشی شادی لال چمن نے کیا جسکا ایک نثر کا ترجمہ منشی طوطا رام شایان نے ۱۸۷۶ء مین نکالا۔ اسکے بعد ۱۸۹۰ء مین حامد علی نے ترجمہ کیا اور مرزا حیرت دہلوی نے ۱۸۹۲ء مین "بستان حیرت"

کے نام سے بطرز ناول ترجمہ کیا۔ (۶) شاہزادۂ ایڈورڈ (جو بعد کو ایڈورڈ ہفتم ہوئے) کی شادی کے موقع پر سرور نے ایک تہنیت نامہ موسوم بہ "نثر نشرہ نثار" لکھا جسمین انگریزی حکومت کے فوائد اور برکات نہایت عمدہ الفاظ مین بیان کئے ہین (۷) انشائے سرور یعنی سرور کے خطوط جو انہین کے خاص طرز مین ہین۔

اردو نثارون مین سرور کا مرتبہ

اسمین کوئی شک نہین کہ قدیم طرز کے اردو نثارون مین سرور کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ اپنے طرز خاص مین وہ عدیم المثال ہین۔ مگر بعد کو جب زمانہ کا رنگ بدلا اور کاروباری دور شروع ہوا تو اس قسم کی پر تکلف اور پر تصنع عبارت جسکے طویل جملون اور ثقیل عربی و فارسی الفاظ سے لوگون کا جی اکتا گیا تھا اور موجودہ ضرورتون کے اظہار کے لئے بھی وہ ناموزون تھی، ترک کی گئی۔ بہر طور سرور نے اپنا رنگ خوب برتا اور اس رنگ کے وہ بڑے ماہر تھے۔ انکی تمام تصنیفات مین لکھنؤ کے حالات اور یہان کی سوسائٹی کے مرقعے خاص طور پر بہت دلچسپ ہین۔ نثر مین انکو اتنا شغف تھا اور اسمین وہ اتنے مشہور ہوے کہ انکے دیگر کمالات یعنی انکی خوشنویسی انکی موسیقی دانی یہانتک کہ انکی شاعری بھی اسکے سامنے فروغ نہ پا سکی۔ انکا دیوان مفقود ہے مگر ان اشعار سے جو انکی نثر کی کتابونمین جا بجا ملتے ہین کہا جا سکتا ہے کہ وہ بھی ضرور اعلے درجہ کا ہوگا۔ سرور گو کہ لکھنؤ کے عاشقون مین ہین اور لکھنوی ہین مگر پھر بھی انکے اشعار سے دلی کا اتباع معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ لکھنؤ کے تصنع اور مبالغہ سے وہ بری ہین۔

غالب بحیثیت نثار

عام لوگ غالب سے صرف بحیثیت ایک شاعر کے روشناس ہین انکی نثاری کی حیثیت عام نظرون سے پوشیدہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ فارسی اور اردو دونون کے بے مثل نثار بھی اسیطرح ہین جسطرح کہ بے نظیر و بے عدیل شاعر ہین۔ انکی نثر اردو کی تصانیف زیادہ تر خطوط و رقعات ہین چند تقریظین اور دیباچے ہین اور تین مختصر رسالے یعنی لطائف غیبی تیغ تیز اور نامۂ غالب[۱] جو سب برہان قاطع کے طرفدارون کے جواب مین لکھے گئے۔ اسکے سوا چند اجزا ایک ناتمام قصہ کے بھی ہین جو مرزا نے مرنے سے چند روز پہلے لکھنا شروع کیا تھا۔ مگر ان سب مین ان کے وہ خطوط جو اردوئے معلے اور عود ہندی کے نام سے مشہور ہین اور نیز وہ تقریظین جو چند کتابون پر لکھی ہین نثر اردو کا بہترین نمونہ

---

[۱] نامۂ غالب کو آب حیات مین مرزا کی تصانیف فارسی مین رکھا ہے ۱۲

مرزا غالب کچھہ تحریر فرما رہے ہین

اور اُن کے خاص رنگ کا آئینہ ہین۔

اُردوئے معلےٰ اور عود ہندی

سنہ ۱۸۵۰ء تک مرزا فارسی مین خط و کتابت کرتے تھے جیسا کہ اُن خطوط سے پایا جاتا ہے جو پنج آہنگ مین چھپے ہین اور نیز بعض جگہ خطوط اُردو مین بھی اسکا ذکر ہے۔ اُسکے بعد اُنھون نے اُردو مین خطوط لکھنا شروع کیے۔ ان کا رنگ بالکل مخصوص ہے اور انھین پر نثر اردو کی ایک خاص طرز کی بنیاد قایم ہوئی۔ مگر جہانتک خیال ہے کوئی شخص اُنکی پوری تقلید اور نقل مین کامیاب نہین ہوا یون تو بہت سی انشا اور رقعات کی کتابین موجود ہین اکثر مشہور لوگو نکے مکاتیب بھی شایع ہو چکے ہین مگر غور سے دیکھا جائے تو مرزا کا رنگ سب سے علیحدہ ہے۔ اُسمین کسی قسم کا تکلف اور تصنع خشونت اور خشکی مطلق نہین۔ عبارت کی روانی اور سلاست سے معلوم ہوتا ہے کہ قلم برداشتہ لکھتے چلے جاتے ہین اور مضامین کی کثرت پتہ دیتی ہے کہ ایک دریائے مضامین اُمڈا چلا آتا ہے۔ یہ ایک خاص صفت ہے کہ ہرچند عبارت حد درجہ کی بے تکلف اور روزمرّہ ہے مگر ابتذال اور سوقیت اُسمین مطلق نہین بلکہ اُسمین ایک ادبی شان ہے۔ بطون ہر فقرہ سے عیان اور ظرافت ہر جملہ کی تہ مین نہان ہے۔ مرزا اکثر ایسے خیالات کا جن سے ان کا مکتوب الیہ موافق نہ بھی ہو اس عبارت اور صفائی سے اظہار کرتے ہین جیسے کہ وہ جانتے ہین کہ اُنکی تحریر کا زور اور انکا انداز بیان اُس کی زبان بند کر دے گا بلکہ اُسکو انکے دام محبت مین اسیر کر لے گا۔ انکی تحریر مین بالکل باتون کا مزہ آتا ہے۔ اور بعض خطوط اُنھون نے فی الواقع مکالمہ کی صورت مین لکھے ہین کسی مین مکتوب الیہ کو غائب فرض کر لیا ہی جس سے مکتوب الیہ کوئی دوسرا شخص معلوم ہونے لگتا ہے۔ قلم کی ایک جنبش سے وہ ایسی سحر آفرینی کر دیتے ہین کہ دل مزے اٹھانے لگتا ہے۔ مرزا نے اپنے خطوط مین علاوہ ایک طرز خاص اختیار کرنے کے یہ جدت بھی کی ہو کہ القاب و آداب کا فرسودہ طریقہ اور بہت سی اور باتین جو عموماً خطوط مین لکھی جاتی ہین مگر درحقیقت فضول اور بیکار ہین سب چھوڑ دین۔ وہ پنج آہنگ مین لکھتے ہین کہ "خطوط نویسی مین میرا طریقہ یہ ہے کہ جب خط لکھنے کے لئے قلم و کاغذ اٹھاتا ہون تو مکتوب الیہ کو کسی ایسے لفظ سے جو اُس کی حالت کے موافق ہوتا ہے پکارتا ہون اور اُسکے بعد ہی مطلب شروع کر دیتا ہون القاب و آداب کا پرانا طریقہ اور شکر و شکوہ شادی و غم کا قدیم روّیہ مین نے بالکل اٹھا دیا" مثالاً یہان چند نمونے

اسی شان کے لکھے جاتے ہین" اہا ہا میرا پیارا مہدی آیا آؤ بھائی مزاج تو اچھا ہے بیٹھو یہ رام پور ہے دار السرور ہے جو لطف یہان ہے وہ اور کہان ہے" "آؤ میان سید زادہ آزادہ دلی کے عاشق دلدادہ ڈھئے ہوئے اردو بازار کے رہنے والے حسد سے لکھنؤ کو بُرا کہنے والے ...." "برخوردار نور چشم میر مہدی کو بعد دعا حیات وصحت کے معلوم ہو بھائی تم نے بخار کو کیون آنے دیا تپ کو کیون چڑھنے دیا۔ کیا بخار میرن صاحب کی صورت مین آیا تھا کہ تم مانع نہ آئے .... " "میری جان تو کیا کہہ رہا ہے بنیے سے سیانا سو دیوانا صبر و تسلیم توکل و رضا شیوہ صوفیہ کا ہے مجھ سے زیادہ اس کو کون سمجھے گا" "سید صاحب اچھا ڈھکوسلا نکالا ہے بعد القاب کے شکوہ شروع کر دینا اور میرن صاحب کو اپنا ہمزبان کر لینا"۔

یہان ہم مرزا کا ایک خط جو میر مہدی کے نام ہے بتمام و کمال نقل کرتے ہین تا کہ مرزا کی وہ تمام خصوصیات تحریر جن سے اُنکی نثر بھی مثل نظم کے معجز نما معلوم ہوتی ہے بخوبی سمجھ مین آسکین مثلاً خط سے القاب و آداب کا بالکل غائب ہونا اور بجائے اسکے ایک فرضی مکالمہ سے خط کا شروع کر دیا جانا۔ عبارت کی سادگی شوخی اور بے تکلفی۔ مذاق کے پیرایہ مین کچھ دوستانہ نصیحتین بھی کرنا۔ جدید رنگ زمانہ یعنی جمہوریت پسندی کے برخلاف پرائیوٹ خط مین بھی "ملکہ انگلستان" کے پہلے لفظ "جناب" لکھنا جس سے اُن کی حد درجہ کی قدامت پسندی اور تہذیب کا پتہ چلتا ہے۔ ابتدائی چند سطور کو جن سے خط شروع ہوتا ہے ہم مکالمے کی صورت مین لکھے دیتے ہین۔ غ سے غالب اور م سے میرن صاحب سمجھنا چاہئے۔

خط بنام میر مہدی

غ ۔ اے جناب میرن صاحب السلام علیکم ۔

م ۔ حضرت آداب

غ ۔ کہو صاحب آج اجازت ہے میر مہدی کے خط کا جواب لکھنے کو ۔

م ۔ حضور مین کیا منع کرتا ہون مین نے تو یہ عرض کیا تھا کہ اب وہ تندرست ہو گئے ہین بخار جاتا رہا ہے صرف پیچش باقی ہے وہ بھی رفع ہو جائیگی مین اپنے ہر خط مین آپ کی طرف سے لکھ دیتا ہون آپ پھر کیون تکلیف کرین ۔

غ۔ نہین میرن صاحب اُسکے خط کو آئے ہوے بہت دن ہوئے ہین وہ خفا ہوا ہو گا جواب لکھنا ضرور ہے
م۔ حضرت وہ آپکے فرزند ہین آپسے خفا کیا ہونگے ۔
غ۔ میان آخر کوئی وجہ تو بتاؤ کہ تم مجھے خط لکھنے سے کیون باز رکھتے ہو۔
م۔ سبحان اللہ سبحان اللہ اے لو حضرت آپ تو خط نہین لکھتے اور مجھے فرماتے ہین کہ تو باز رکھتا ہے
غ۔ اچھا تم باز نہین رکھتے مگر یہ تو کہو کہ تم کیون نہین چاہتے کہ مین میر مہدی کو خط لکھون ۔
م۔ کیا عرض کرون سچ تو یہ ہے کہ جب آپکا خط جاتا اور وہ پڑھا جاتا تو مین سنتا اور حظ اُٹھاتا اب جو مین وہان نہین ہون نہین چاہتا کہ آپ کا خط جائے۔ مین اب پنجشنبہ کو روانہ ہوتا ہون میری روانگی کے تین دن کے بعد آپ خط شوق سے لکھیے گا۔
غ۔ میان بیٹھو ہوش کی خبر لو تمہارے جانے سے نہ جانے سے مجھے کیا علاقہ مین بوڑھا آدمی بھولا آدمی تمھاری باتون مین آگیا اور آج تک اُسکو خط نہین لکھا۔ (اس کے بعد مسلسل خط شروع ہوتا ہے)
لاحول ولا قوۃ سنو میر مہدی صاحب میرا کچھ گناہ نہین۔ میرے پہلے خط کا جواب لکھو تپ تو رفع ہو گئی پیچش کے رفع ہونے کی خبر شتاب لکھو۔ پرہیز کا بھی خیال رکھا کرو۔ یہ جدی بات ہے کہ وہان کچھ کھانے کو ملتا ہی نہین تمھارا پرہیز اگر ہو گا بھی تو عصمت بی بی از بے چادری ہو گا۔ حالات یہان کے مفصل میرن صاحب کی زبانی معلوم ہونگے۔ دیکھو بیٹھے ہین کیا جانون حکیم میر اشرف مین اور اُن مین کچھ کونسل ہو تو رہی ہے پنجشنبہ روانگی کا دن ٹھیرا تو ہے اگر چل نکلین اور پہونچ جائین تو اُنسے یہ پوچھیو کہ جناب ملکہ انگلستان کی سالگرہ کی روشنی کی محفل مین تمھاری کیا گت ہوئی تھی اور یہ بھی معلوم کر بھیجو کہ یہ جو فارسی مثل مشہور ہے کہ دفتر را گاؤ خورد اسکے معنے کیا ہین۔ پوچھیو اور نہ چھوڑیو جب تک نہ بتائین الغرض پہلے تو آندھی چلی پھر مینھ آیا اب مینھ برس رہا ہے۔ مین خط لکھ چکا ہون سرنامہ لکھکر چھوڑ دونگا۔ جب ترشح موقوف ہو جائیگا تو کلیان ڈاک کو لیجائیگا۔ میر سرفراز حسین کو دعا پہونچے اللہ اللہ تم پانی پت کے سلطان العلما اور مجتہد العصر بن گئے۔ کہو وہان کے لوگ تمھین قبلہ و کعبہ کہنے لگے یا نہین میر نصیر الدین کو دعا
اس کاٹ چھانٹ سے قدما کی طویل اور غیر دلچسپ طرز تحریر کی درستی ہو گئی اور یہ ایک نہایت

عمدہ جدت کی مثال قائم ہوگئی جس سے اُردو خطوط نویسی پُرانے تکلف و تصنع اور بے موقع اظہار علمیت
سے آزاد ہو کر نہایت شیرین اور دلچسپ بن گئی ہر چند کہ یہ اختراع انکے معاصرین کو پسند نہ آیا مگر جون جون
زمانہ بدلتا گیا اور وقت گزرتا گیا اب لوگون کو اسکی اہمیت کا ضرور احساس ہو ا اور ہر طرف اُسکی تبعین
پیدا ہوگئے۔ مولانا حالی۔ سرسید۔ مولوی ذکاءاللہ مولٰنا محمد حسین آزاد اور اُنکے علاوہ دیگر ارباب قلم
مثلاً امیر مینائی اکبر وغیرہ نے بھی سادگی عبارت کو پسند کیا اور اپنے اپنے طریق پر نثرین لکھین مگر حق
یہ ہے کہ مرزا کی سادگی و دلکشی شوخی و ظرافت جذبات نگاری و اظہار مافی الضمیر مین کوئی انکا مدمقابل نہ ہوگا
انکے رقعات کی ایک بیّن خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ انکے حالات زندگی کے مصفٰے اور مجلّے آئینہ
ہین یہانتک کہ اگر کوئی شخص یہ زحمت گوارا کرے کہ انکے خطوط کو تاریخ تحریر کی ترتیب سے جمع کرے اور
اُن کے وہ حصے جو مرزا کے حالات زندگی کے متعلق ہین علیحدہ کرتا جائے تو مرزا کی ایک مختصر خود نوشتہ
سوانح عمری اُنسے مرتب ہو جائیگی۔ یہ خطوط اُنکی زندگی اور جزئیات زندگی کی تصویرین ہین انسے حیات،
احباب اور معاصرین سے تعلقات کے متعلق اُنکے نظریے اور ہمعصر اور قدیم شعرا کے متعلق انکے خیالات
سب بخوبی اخذ کئے جاسکتے ہین بعض کو پڑھکر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کی غرض اصلی مکتوب الیہ کے
دل کو خوش کرنا اور اسکا غم غلط کرنا ہے۔ اُنکا مذاقِ ظرافت بھی سب سے نرالا ہے۔ اردو نظم مین تو اسکا جواب
ہی نہین اہل یورپ مین بھی اس قسم کی لطیف ظرافت مفقود ہے فرنچ شاعر والٹیر اور انگریزی نثّار
ڈین سویفٹ اپنے اپنے طرز مین ایک خاص رنگ ظرافت رکھتے ہین مگر مرزا ان سب سے علیحدہ ہین
والٹیر کی طرح اُنمین نقالی اور سویفٹ کی طرح اُن مین تیزی اور دل آزاری نہین ہے انکی ظرافت
کی لطافت اور نزاکت کا پر تو اڈیسن مین کچھ کچھ پایا جاتا ہی مرزا کا یہ بہت بڑا احسان ہے کہ انہون نے نثر اردو
کو خشکی اور بدمزگی کے الزام سے بچالیا۔

مرزا کا قدیم رنگ یعنی مقفٰی اور مسجع عبارت

مرزا ہر چند خطوط مین سادگی اور سلاست عبارت کے دلدادہ
تھے۔ مگر رواج زمانہ کے موافق احباب کی کتابون پر تقریظین اُسی پرانے انداز مین لکھتے تھے۔ اسکی
وجہ مولانا حالی کی زبان سے سننا چاہیے وہ کہتے ہین "مرزا کو اس مین معذور سمجھنا چاہیئے۔ جو لوگ

تقریظون اور دیباچون کی فرمایش کرنے والے تھے وہ بغیران تکلفات بارده کے ہرگز خوش ہونے والے نہ تھے۔ جو طریقہ اس زمانہ مین ریویو لکھنے کا نکلا ہے اس کو اب بھی بہت کم لوگ پسند کرتے ہین اور مرزا کے وقت مین تو اس کا کہین نام و نشان ہی نہ تھا" یہان اُنکی دو تقریظون کی کچھ عبارت بطور نمونہ دی جاتی ہے تاکہ اس رنگ مین بھی اُن کا انداز تحریر بخوبی معلوم ہو سکے۔ (۱) مرزا رجب علی بیگ سرور کی گلزار سرور کی تقریظ۔ "سبحان اللہ خدا کی کیا نظر فروز صنعتین ہین تعالی اللہ کیا حیرت آور قدرتین ہین یہ جو "حدایق العشاق" کا فارسی زبان سے عبارت اردو مین نگارش پانا ہے ارم کا بین دنیا سے اُٹھکر بہارستان قدس کا ایک باغ بنجانا ہے۔ وہان حضرت رضوان ارم کے نخلبند و آبیار ہوے یہان مرزا رجب علی بیگ سرور حدایق العشاق کے صحیفہ نگار ہوے۔ اس مقام پر ہیچمیرز جو موسوم بہ اسد اللہ خان اور مخاطب بہ نجم الدولہ و متخلص بہ غالب ہے خداے جہان آفرین سے توفیق کا اور خلق سے انصاف کا طالب ہے۔ ہان اے صاحبان فہم و ادراک سرور سحر بیان کا اُردو کی نثر مین کیا پایہ ہے اور اس بزرگوار کا کلام شاہد معنی کیواسطے کیسا گران بہا پیرایہ ہے۔ مجھکو دعوی تھا کہ انداز بیان اور شوخی تقریر مین فسانہ عجائب بے نظیر ہے جس نے میرے دعوی کو اور فسانۂ عجائب کی یکتائی کو مٹادیا یہ وہ تحریر ہے ...."

(۲) مفتی میر لعل کی کتاب "سراج المعرفت" کی تقریظ۔ "حق یون ہے کہ حقیقت ازدی مثال اک نامہ در بہم پیچیدہ سربستہ ہے کہ جسکے عنوان پر لکھا ہے لا مؤثر فی الوجود الا اللہ اور خط مین مندرج ہے لا موجود الا اللہ اور اس خط کا لانے والا اور اس راز کا بتانے والا وہ نامہ آور ہے اور نام آور ہے کہ جس پر رسالت ختم ہوئی ختم نبوت کی حقیقت اور اس معنی غامض کی صورت یہ ہے کہ مراتب توحید چار ہین۔ آثاری افعالی صفاتی ذاتی انبیاے پیشین صلوات اللہ علی نبینا و علیہم اعلان مدارج سہ گانہ پر مامور تھے۔ خاتم الانبیا کو حکم ہوا کہ حجاب تعینات اعتباری کو اٹھا دین اور حقیقت بے رنگی ذات کو صورت الآن کما کان مین دکھا دین اب گنجینۂ معرفت خواص امت محمدی کا سینہ ہے اور کلمہ لا الہ الا اللہ مفتاح باب گنجینہ ہے ...."

کتب و رسائل اسلامی سے اُردو کو تقویت | ایک بہت بڑی تحریک جو ہر چند ادبی نوعیت نہین رکھتی تھی

انگریزی سے بلاشبہ نثر اُردو کو بہت فائدہ پہنچا اور اُسکی تقویت کا باعث ہوئی مولوی سید احمد شہید بریلوی اور اُنکے بزرگ استادون یعنے مشہور و معروف شاہ عبد العزیز اور شاہ عبد القادر کے زمانہ مین اشاعت مذہب (وہابیت) کی صورت مین رونما ہوئی جسکی وجہ سے تبلیغ دین کی غرض سے مختلف کتب و رسایل عوام الناس کے فایدہ کیواسطے صاف اور سہل زبان مین لکھے گئے۔ یہ خیال برابر زور پکڑتا اور قوت حاصل کرتا گیا اور گو اصل تحریک جو مولوی صاحب موصوف نے اٹھائی تھی اُنکی وفات کے بعد امتداد زمانہ سے دبگئی تھی مگر مشہور راہبر قوم سر سید احمد خان کے تمام تعلیمی معاشرتی مذہبی اور سیاسی اصلاحات کی وہی روح روان تھی [1] سید صاحب اور اُنکے رفقائے کار کے جدید اصولون کی اشاعت نے گو ملک مین اوسوقت بہت بیچینی اور مخالفت پیدا کردی تھی اور اختلافات کی آندہی سے ملک کی فضا گرد آلود ہوگئی تھی مگر جتقدر کتب اور رسایل ان مسایل کی موافقت و مخالفت مین لکھے گئے ہرچند کہ وہ مذہبی رنگ کے تھے مگر چونکہ وہ سب صاف اور سلیس زبان مین ہوتے تھے اسوجہ سے زبان کو اُس سے یقیناً بہت کچھ تقویت اور مدد پہنچی

مولوی سید احمد شہید ۱۷۸۲ء مین پیدا ہوئے اور شاہ عبد العزیز اور شاہ عبد القادر صاحب ایسے بزرگون سے علوم دینیہ کی تکمیل کی جنھون نے بعد کو تو مذہب کی صورت اختیار کرلی تھی۔ چونکہ بڑے قابل اور فصیح شخص تھے لہذا انکی تقریرین اور وعظ سنکر لوگ بکثرت ان کے مرید ہوگئے تھے۔ اپنے اصول کی تبلیغ پہلے دلی مین مکمل کرکے ۱۸۲۰ء مین کلکتہ گئے اور وہان سے ۱۸۲۲ء مین حج بیت اللہ کی نیت سے مکے روانہ ہوگئے۔ وہان کچھ دنون قیام کرکے قسطنطنیہ چلے گئے۔ اور چھہ برس تک ٹرکی کی سیر و سیاحت اور نیز اپنے ہمخیالون کی جماعت پیدا کرتے رہے جب دلی واپس آئے اور یہان کے مسلمانونکے

[1] مصنف صاحب کا یہ خیال صحیح نہین معلوم ہوتا کہ جو تحریک مذہبی بصورت اشاعت وہابیت مولوی سید احمد شہید کے زمانہ مین شروع ہوئی تھی اور جو ترمیمین اور تاویلین مذہب مین سر سید مرحوم نے پیش کین یہ دونون ایک ہی چیزین مین اسوجہ سے کہ وہابیون کے اصول کے مطابق جملہ احکام شریعت مین کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ پر بلا کسی توجیہ اور تاویل کے عمل واجب ہے اور سر سید مرحوم اپنے معتقدات اور اصولون کے ثابت کرنے مین دلایل عقلی اور تاویلات سے بہت کچھ کام لینا چاہتے تھے جو عقائد وہابیہ کے بالکل منافی ہے۔

عقاید کا دیگر ممالک کے لوگون سے مقابلہ کیا تو نسبتاً زمین و آسمان کا فرق پایا - اور اسی سے اُنکے دلمین
اصلاح کا خیال پیدا ہوا - چونکہ آدمی پرجوش تھے لہذا اشاعت دین کے متعلق اُنکے جوش کی کوئی انتہا
باقی نہین رہی تھی - چنانچہ پہلے سکھون سے اُنہون نے جہاد کا اعلان کیا اور ۱۸۲۶ء مین مولوی
اسماعیل کو ساتھ لیکر پشاور کیطرف روانہ ہوگئے - کہا جاتا ہے کہ اُنکے مریدون اور معتقدونکی تعداد
ایک لاکھ سے زاید تھی - اور اکثر امرا اور مشاہیر نے جو انکے معتقد اور ہم خیال تھے اس مذہبی کام
کے واسطے کافی روپیہ سے اُنکی مدد کی تھی یعنی ۱۸۳۰ء مین اپنے اس مشن مین اُنکو اتنی کامیابی ہوگئی تھی
کہ پورا پشاور اُنکے قبضہ مین آگیا تھا - لیکن بعد کو اُن کے اصولونکی سختی دیکھکر افغانون نے جنھون نے انکو
مدد دینے کا وعدہ کیا تھا، انسے بیوفائی کی - یہ حالت دیکھکر وہ دریائے اٹک کے اُس پار پہاڑونمین
جا چھپے جہان ۱۸۳۱ء مین سکھون کے ایک دستہ سے جسکا سردار شیر سنگھ تھا مقابلہ کرتے ہوئے مارے گئے

شاہ عبد العزیز صاحب نے قرآن شریف کی تفسیر موسوم بہ تفسیر عزیزی فارسی مین لکھی جسکا اب ترجمہ
اُردو مین ہوگیا ہے - اور اُنکے بھائی شاہ عبد القادر صاحب نے قرآن شریف کا ترجمہ اُردو مین کیا - جو ۱۸۰۳ء
مین ختم ہوا اور ایک شخص سید عبد اللہ نامی نے جو مولوی سید احمد مذکور کے مُرید تھے ۱۸۲۹ء مین مقام
ہُگلی اسکو چھپوایا - اسیطرح مولوی سید احمد صاحب کی کتاب تنبیہ الغافلین جو اصل مین زبان فارسی مین تھی
اسکا بھی اردو ترجمہ اُنہین مولوی عبد اللہ نے ۱۸۳۰ء مین ہگلی سے شایع کیا - مولوی اسمٰعیل صاحب
مشہور رسالہ تقویۃ الایمان اور نیز دیگر مریدان مولوی سید احمد کی تصانیف - مثلاً ترغیب جہاد -
ہدایۃ المومنین نصیحۃ المومنین موضح الکبائر و البدعات - مائۃ مسایل وغیرہ یہ سب اسی زمانہ کی کتابین ہین جو
اصل مین اشاعت دین کی غرض سے لکھی گئی تھین مگر جن سے زبان اردو کو بھی ضرور تقویت پہونچی -

چھاپہ کی ابتدا

منجملہ اور اسباب کے چھاپے نے بھی اشاعت و ترقی زبان مین بہت بڑی مدد دی اور قدیم
حالت مین ایک بہت بڑا تغیر پیدا کردیا - اٹھاروین صدی کے آخر مین فورٹ ولیم کالج کلکتہ مین ایک
چھاپہ خانہ کھل گیا تھا جسمین ڈاکٹر گلکرسٹ اور کالج کے منشیون کی تصانیف خود ڈاکٹر گلکرسٹ کے اہتمام
مین چھپکر تیار ہوتی تھین - مگر اُنکی تیاری مین اسقدر روپیہ خرچ ہوتا تھا کہ آخر کار یہ مطبع بند کردینا پڑا اور

ڈاکٹر گلکرسٹ کی بعض کتابین بھی یہان نہ چھپ سکین - اسکے علاوہ اس زمانہ مین جو ٹائپ کے حروف
مروج تھے وہ بھی نہایت بدنما اور بھدے تھے - اسی زمانہ مین سیرام پور واقعہ بنگال کے پادریون نے بھی
ایک چھاپہ خانہ کھولا تہا جسمین مختلف ہندوستانی زبانون کی کتابین چھپتی تہین سنہ ۱۸۱۲ء مین اس چھاپہ
خانہ مین آگ لگ گئی اور اکثر کتابین جلکر خاک ہوگئین سنہ ۱۸۳۰ء مین ایک لیتھو کا چھاپہ خانہ دلّی مین
قایم ہوا جسنے اشاعت کتب کو بہت آسان کردیا - اسمین پرانی کتابون کے ساتھ ساتھ انگریزی اور دیگر
غیر ملکی زبانون کے تراجم یا اور کتابین اور رسائل مختلف مضامین پر طبع ہوتے تھے - غازی الدین حیدر
کے عہد مین لکھنؤ مین بھی بہت صرف سے اور تکلف کے ساتھ ایک مطبع ٹائپ کا کھولا گیا تھا جسمین سب سے
پہلے ہفت قلزم چھپی تھی دوسری کتابین جو اس مطبع سے نکلین حسب ذیل ہین - مناقب الحیدریہ بزبان عربی
سنہ ۱۸۱۹ء مین - محامد حیدری فارسی مین سنہ ۱۸۲۲ء مین (یہ دونون کتابین غازی الدین حیدر کی تعریف
مین ہین) - گلدستہ محبت جسمین نواب گورنر جنرل لارڈ ہیسٹنگز اور غازی الدین حیدر کی ملاقات کا
حال فارسی مین ہے - ہنجسورہ بخط طغرا تاج اللغات جو ایک عربی کی لغت زبان فارسی مین ہے سنہ ۱۸۳۱ء
مین ایک انگریز مسٹر آرچر جنہون نے ایک لیتھو کا چھاپہ خانہ کانپور مین کھولا تھا نصیر الدین حیدر کے حکم
سے لکھنؤ آئے اور یہان بھی ایک مطبع جاری کیا - ایک اور مشہور کتاب جو اس زمانہ مین لکھنؤ مین چھپی وہ
ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ تھی جسکو لارڈ بروہم نے سائنس کے فوائد اور اعمال پر تصنیف کیا تھا -
اس کا ترجمہ سید کمال الدین حیدر معروف بہ میر محمد حسینی لکھنوی نے اسکول بک سوسائٹی کلکتہ کی فرمایش
سے کیا اور مطبع سلطانی مین سنہ ۱۸۴۳ء مین چھپا - یہ ترجمہ نہایت صاف اور سلیس اردو مین ہے - سب سے
پہلی کتاب جو لکھنؤ مین لیتھو مین چھپی شرح الفیہ تھی سنہ ۱۸۴۰ء مین تقریبًا بارہ چھاپے خانے لیتھو کے لکھنؤ
مین موجود تھے جنمین مطبع میر حسن اور مطبع مصطفائی بہت مشہور ہین سنہ ۱۸۴۹ء مین منشی کمال الدین حیدر
مذکور نے جو رصد خانہ شاہی کے میر منشی تھے بادشاہ کی خوشنودی مزاج کے واسطے خاندان شاہی کی تاریخ
لکھنا شروع کی مگر کچھ باتین بادشاہ کو پسند نہ آئین جسکی وجہ سے رصد خانہ توڑ دیا گیا اور کتاب کی طباعت
بھی روک دی گئی اور بہت سے اہل مطبع کانپور چلے گئے - مطابع کی تاریخ مین سب سے اہم واقعہ اس عہد کا

یہ ہے کہ لکھنؤ مین منشی نولکشور صاحب نے اپنا مشہور مطبع جاری کیا جسکی بدولت پرانی پرانی فارسی وعربی
ونیز سنسکرت و ہندی کی وہ کتابین چھپین جو کس مپرسی کی حالت مین پڑی تھین اور اگر شایع نہ ہوتین تو معدوم
ہو جاتین۔ اس مطبع نے علم کے محدود دائرے کو وسیع کر دیا اور اس کے فوائد ملک کے تمام طبقونکو یکسان طور پر
پہونچائے۔ تعلیم و تعلم کی ارزانی ہوگئی اسمین حدیث وتفسیر۔ قرآن شریف با ترجمہ فقہ اصول وغیرہ جملہ علوم
اہل اسلام۔ ونیز وید پران بید وغیرہ علوم اہل ہنود یکسان طور پر نہایت فراخدلی سے شایع کئے گئے۔ قرآن شریف
کے مترجم چھپنے سے لوگونکو اسکے مطالب سے آگاہی ہوئی اور اس سے وہی فائدہ مسلمانون کو ہوا جو بائبل کے ترجمے
سے مسیحیون کو پہونچا تھا۔

رسایل وجرائد واخبارات

طباعت کی آسانیونکا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ رسایل وجرائد اور اخبارات زبان اردو
مین بہ کثرت جاری ہوے جس سے پبلک کے معلومات مین بہت کچھ اضافہ ہوا اور انکو دنیا بھر کی خبرین بے
تکلف معلوم ہونے لگین۔ ہندوستانی اخبارات سے جولیتھو مین چھپنے لگے پبلک کے لئے تمدنی واقتصادی
معلومات کا ایک دروازہ کھل گیا اور ترقیونکی راہین فراخ ہوگئین۔ اور مضمون نویسونکو علاوہ توسیع زبان کے یہ
موقع بھی ملا کہ وہ اپنی زبان کو یورپی مضامین اور طرز کے موافق ڈھالین ۱۸۳۲ء مین بجائے فارسی کے اردو سرکاری
زبان قرار پائی جس سے اُسکا نہ صرف مرتبہ بڑھا بلکہ عربی و فارسی کے وہ سب الفاظ اور مصطلحات جو ابتک
اس زبان مین رائج تھے اردو زبان مین منتقل ہوگئے اور رواج پاگئے۔ مغربی تمدن کے اثر نے بھی زبان کو
طرح طرح کے فوائد سے مالامال کیا۔ سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ فارسی کی تقلید مین جو عبارت اور لفظون پر زور دیا جاتا
تھا وہ طریقہ متروک ہوکر زبان صاف اور سادہ ہوئی اور بجاے الفاظ کے نفس مطلب اور مضمون پر زور دیا جانے
لگا۔ اسکے علاوہ وہ درسی کتابین جو تعلیمی ضرورت سے انگریزی یا دوسری زبانون سے ترجمہ کی گئین
انکا ترجمہ سوائے صاف اور سادہ زبان کے پیچیدہ عبارت مین ہو بھی نہین سکتا تھا لہذا صاف اور سلیس
عبارت مین ترجمہ کی گئین۔ چنانچہ کلکتہ اور لاہور مین جو انگریزی کتابون کے ترجمے کئے گئے وہ سب
اسی قبیل کے تھے۔ اور اب اردو فارسی سے بے نیاز ہوکر اپنے پاؤن پر کھڑے ہونے کے قابل ہوگئی۔ اس اصلاح
کو سر سید ایسے قابل بزرگ کے مساعی جمیلہ نے بہت تقویت پہونچائی۔ یہ انیسوین صدی کے نصف

آخر مین ہندوستان کی ایک بزرگ ہستی اور مسلمانون کے ایک رہبر اور مصلح اعظم تھے جنکا کچھ مختصر حال آگے لکھا جاتا ہے ۔

سرسید احمد خان ۱۸۱۷ء تا ۱۸۹۸ء

جواد الدولہ عارف جنگ سرسید احمد خان بہادر ۔ کے ۔ سی ۔ ایس ۔ آئی ۔ ہندوستان کے مشہور لیڈر اور ایک فصیح البیان اور جلیل القدر مصنف فلسفی ریفارمر اور مدبر تھے ۔

اُنکی قابلیت اُنکی ہر دلعزیزی اور انکی مقناطیسی قوت کے اثر سے بہت سے قابل قابل اہل علم وفضل اُنکے گرد جمع ہو گئے تھے جنکے ادبی کارنامون سے نہ صرف ادب اُردو مالا مال ہوا بلکہ وہ ایک طرز خاص کے موجد ہوئے اور ہندوستان کے مسلمانونکے طرز زندگی اور معاشرت پر اُنکی مساعی جمیلہ کا بہت گہرا اثر پڑا ۔ چونکہ سید صاحب کی زندگی مختلف شعبون اور مشاغل پر منقسم ہے لہذا اُن سب سے قطع نظر کرکے ہم یہان انکا ذکر صرف ایک ادیب اور قومی لیڈر کی حیثیت سے کرتے ہین ۔

سرسید مرحوم دلی مین ۱۸۱۷ء مین پیدا ہوئے ۔ اُنکا خاندان علو نسبت اور اعزاز کے لحاظ سے ایک مشہور خاندان تھا ۔ انکے آباواجداد جو ابتدا عرب کے رہنے والے تھے داغستان آئے اور وہان کچھ دنون قیام کرکے ہمدان اور ہرات پہونچے ۔ انکے بزرگ شاہجہانکے عہد مین ہندوستان آئے اور یہان عہدہ ہائے جلیلہ پر ممتاز ہوئے ۔ عالمگیر ثانی نے سید صاحب کے دادا کو جوادالدولہ کا خطاب دیا تھا جو حسن اتفاق سے خود سید صاحب کو بھی عنایت ہوا ۔ سید صاحب کے والد میر تقی ایسے قانع بزرگ تھے کہ کہا جاتا ہے جب اکبر شاہ ثانی نے اُنکو عہدۂ وزارت پر ممتاز کرنا چاہا تو انہون نے اُس سے انکار کر دیا ۔ سید صاحب کی والدہ نے جن کا نام عزیز النسا بیگم تھا ، جو ایک روشندل خاتون تہین ، سید صاحب کی پرورش کی ، اور انکو زمانہ کی ضروریات کے موافق تعلیم دلائی ۔ سید صاحب نے خوش نصیبی سے ایسا زمانہ پایا تھا جسمین غالب صہبائی آزردہ ، شیفتہ ، مومن وغیرہ کیطرح کے زندہ دل ارباب کمال موجود تھے ۔ مرزا غالب اور سید صاحب مین اسقدر ارتباط تہا کہ سید صاحب اُن کو چچا کہتے تھے ۔ ۱۸۳۸ء مین سید صاحب دِلّی مین بعہدۂ سرشتہ داری مقرر ہوئے اور یہ اُنکی پہلی ملازمت تھی ۔ ۱۸۳۹ء

مین نائب میرنشی اور سنہ ۱۸۴۱ء مین امتحان منصفی پاس کرکے منصف ہوئے سنہ ۱۸۴۶ء سے سنہ ۱۸۵۴ء
تک دلّی کے صدرامین رہے اور اسی زمانہ مین اپنی مشہور و معروف کتاب آثار الصنادید لکھی جسمین دلّی
کے مشہور مقامات اور آثار قدیمہ اور نیز اپنے زمانہ کے دلی کے تمام کاملین اور فقرا علما اور شعرا وغیرہ
کا ذکر کیا ہے اس کتاب کی اتنی شہرت ہوئی کہ اُس کا ترجمہ انگریزی مین ہوا اور فرنچ مین گارسن ڈیٹاسی
نے ترجمہ کیا جو سنہ ۱۸۶۱ء مین شایع ہوا۔ سید صاحب نے سنہ ۱۸۴۲ء مین ایک کتاب موسوم بہ "جلاء القلوب"
جسمین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کا حال ہے سنہ ۱۸۴۴ء مین "تحفہ حسن"، سنہ ۱۸۴۴ء
مین "تحصیل فی جرح السایل" (ترجمہ معیار العقول) سنہ ۱۸۴۶ء مین "فواید الافکار" اور "قول متین"۔
سنہ ۱۸۴۹ء مین کلمۃ الحق، سنہ ۱۸۵۰ء مین راہ سنت۔ سنہ ۱۸۵۲ء مین سلسلۃ الملوک ہند جسمین دلّی کے بادشاہان
کے مختصر حالات راجہ جدہشٹر کے وقت سے لکھے ہین۔ اور سنہ ۱۸۵۳ء مین ترجمہ کیمیائے سعادت تصنیف
کین سنہ ۱۸۵۵ء مین سید صاحب بجنور منتقل ہو گئے جہان اُنھون نے تاریخ بجنور لکھی۔ آئین اکبری کی تصحیح
و تحشی کا فخر بھی سید صاحب کو حاصل ہے۔ مسٹر بلاکمین جنہون نے آئین اکبری کا انگریزی مین ترجمہ کیا ہے
سید صاحب کی کاوش کے معرف اور انکی تصحیح کے معترف ہین سنہ ۱۸۵۷ء یعنی سال غدر مین سید صاحب نے
مختلف طریقون سے امداد کی۔ اور جب انکو ایک علاقہ اُن کی خدمات کے صلے مین پیش کیا گیا تو اُنھون نے
اُسکے لینے سے انکار کر دیا سنہ ۱۸۵۸ء مین اُنھون نے اپنا مشہور پمفلٹ "اسباب بغاوت ہند" تصنیف کیا
جو سنہ ۱۸۶۰ء مین شایع ہوا۔ اسکے علاوہ ایک اور کتاب "وفادار مسلمانان ہند" کے نام سے شایع کی۔ برنی کی
"تاریخ فیروزشاہی" کی ایشیاٹک سوسائٹی کی فرمایش سے تصحیح کی سنہ ۱۸۶۲ء مین اُنکی تفسیر بائیبل موسوم بہ
"تبیین الکلام" شایع ہوئی جس کو قدیم روش کے مسلمانون نے ناپسند کیا اور اسپر نکتہ چینی کی مگر اہل یورپ
نے اسکی بڑی قدر کی سنہ ۱۸۶۲ء مین سید صاحب بدلکر غازی پور آئے جہان سائنٹیفک سوسائٹی کا
سنگ بنیاد رکھا گیا۔ اس سوسائٹی کے قیام کی غرض یہ تھی کہ مشہور اور مستند انگریزی کتابون
کا اردو مین ترجمہ کیا جائے تاکہ اہل اسلام یورپ کے خیالات اور وہانکے تمدن سے واقف ہون ڈیوک
آف آرگائیل جو اس زمانہ مین سکریٹری آف اسٹیٹ ہند تھے اِس سوسائٹی کے مربی (پیٹرن)۔

اور لفٹننٹ گورنران پنجاب و بنگال اس کے وائس پیٹرن بنائے گئے۔ ایک زمانہ مین یہ سوسائٹی بہت مشہور و مقبول تھی اور اسکے ممبرون نے نہایت عمدہ عمدہ رسالے مختلف مضامین مثلاً تاریخ بیوگرفی زراعت و فلاحت اقتصادیات پر لکھے۔ ۱۸۶۴ء مین وہ علیگڈھ آئے اور اُنکے ساتھ سوسائٹی بھی وہین منتقل ہو کر آگئی۔ ۱۸۵۹ء مین اُنھون نے ایک انگریزی اسکول مراد آباد مین اور ۱۸۶۴ء مین اسی طرح کا ایک اسکول غازی پور مین قایم کیا تھا اور مختلف مقامات مین انگریزی تعلیم کے فوائد اور برکتون پر لکچر دیے تھے۔ ۱۸۶۶ء مین انھون نے ایک انجمن قائم کی جسکا نام برٹش انڈین ایسوسی ایشن تھا۔ اور نیز اپنی سائنٹفک سوسائٹی کا ایک ماہوار رسالہ "علیگڈھ انسٹیٹوٹ گزٹ" کے نام سے نکالا جسمین وہ خود بھی مختلف قسم کے مضامین پر کچھ نہ کچھ لکھتے تھے۔ انگریزی اخبارون کے بھی اچھے اچھے مضامین اسمین ترجمہ کرا کے شایع کیے جاتے تھے۔ ۱۸۶۷ء مین انکا بنارس کو تبادلہ ہو گیا۔ مگر اُن کے ادبی اور تعلیمی کامون مین اس سے کسی قسم کا حرج واقع نہین ہوا۔ اسی عرصہ مین اُنھون نے ایک ہندوستانی یونیورسٹی قایم کرنے کی بھی کوشش کی تھی اور گورنر جنرل کو اس مضمون کا ایک میموریل بھی بھیجا تھا اور انکے اس خیال کے ساتھ ہمدردی بھی ظاہر کی گئی تھی۔ ۱۸۶۶ء مین رسالہ "احکام طعام یا اہل کتاب" تصنیف ہوا جس سے مذہبی لوگون مین ایک قسم کی شورش پیدا ہو گئی اور سید صاحب اِن باتون کی وجہ سے بہت بدنام ہو گئے۔ ۱۸۶۹ء مین اپنے بیٹے مسٹر محمود کے ساتھ (جو بعد کو الہ آباد ہائیکورٹ کے جج ہو گئے تھے) ولایت گئے اور اہل یورپ کے طرز معاشرت اور اخلاق و عادات اور نیز انکے سیاسی اور تعلیمی انتظامات کا مطالعہ خوب کیا۔ اسی زمانہ مین سر ولیم میور کی مشہور کتاب "لایف آف محمد" (سوانحعمری آنحضرت صلعم) کا ایک دلپذیر جواب انھون نے لکھا اور نیز مسلمانون کے واسطے ایک رہایشی کالج ولایت کے اکسفورڈ اور کیمبرج کالجون کے انداز پر ہندوستان مین کھولنے کا خیال پیدا ہوا۔ ولایت مین انکو سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب ملا اور ۱۸۷۰ء مین ہندوستان واپس آئے۔ یہان آکر انھون نے اپنا مشہور و معروف ماہوار رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کیا جسکے مطالعہ سے مسلمانان ہند کے خیالات مین ایک انقلاب عظیم رونما ہوا اس سے مسلمانون کو وہی فوائد پہونچے جو اڈیسن اور سٹیل کے رسایل "ٹیٹلر" اور "اسپکٹیٹر" سے

جوادالدولہ عارف جنگ سر سید احمد خان بہادر ایل ایل ڈی

نواب اعظم یار جنگ مولوی چراغ علی

اہل انگلستان کو حاصل ہوئے تھے اس کے جاری کرنیکی یہ غرض تھی کہ مسلمانون کے خیالات علی الخصوص
مذہبی خیالات مین وسعت اور ترقی پیدا ہو اور وہ مغربی علوم کی طرف مائل ہون جس سے اُنکے تمام معاشرتی
اور تمدنی معاملات مین ضرور اصلاح ہو جائیگی۔ اس مین مختلف قسم کے مضامین مذہب معاشرت اور تعلیم پر
لکھے جاتے تھے اور لکھنے والے خود سر سید نواب محسن الملک نواب وقار الملک اور مولوی چراغ علی
ایسے بزرگ تھے جو اپنے خیالات کو نہایت صفائی اور آزادی کیساتھ ظاہر کر دیتے تھے۔ اس رسالہ کی
یہ بڑی کوشش تھی کہ مسلمانون کے دل سے یہ غلط خیال کہ اسلام علوم دنیاوی اور اصلاح کا دشمن یا مخالف
ہے نکلجائے اور اُن کو یہ معلوم ہو جائے کہ کن اسباب سے اس قسم کے خیالات اُنکے پیش روون کے دل مین پیدا
ہو گئے تھے۔ وہ نقصان پہونچانے والے اور تکلیف دہ رسوم و قیود کو ترک کرین۔ وہ اپنے افلاس و ادبار کا
احساس کرین اور کٹھ ملاؤن کے پنجہ سے نجات پا جائین۔ اسی زمانہ مین ایک تفسیر قرآن بھی سید صاحب نے
تصنیف فرمائی جسکی چھ جلدین شایع ہوئین۔ مگر یہ نصف قرآن تک پہونچی۔ پہلی جلد ۱۲۹۷ھ مین طبع
ہوئی تھی۔ اس تفسیر کی خصوصیت یہ ہے کہ اس مین بہت سی باتون پر جن کا حوالہ قرآن شریف مین ہے بائیبل
کے قصص سے روشنی ڈالی گئی ہے جہاد۔ دوزخ و بہشت معراج وغیرہ پر جو دیگر اقوام نے اعتراضات اور
نکتہ چینیان کی ہین اُنکا شافی جواب دیا گیا ہے بعض تاویلات اور ضعیف و غیر مستند احادیث سے احتراز کی ہدایت
کیگئی ہے اور جو شکوک کہ علوم مادی کے پڑھنے سے قرآن کی الہامی کتاب ہونیمین پیدا ہوتے ہین وہ رفع
کئے گئے ہین۔ مگر اِن دونون چیزون سے قدیم روش کے مذہبی پیرو سید صاحب کے سخت مخالف ہو گئے
اُنکو کافر۔ ملحد۔ نیچری۔ کے خطابات دیے گئے۔ اکثر اخبارات اور رسائل صرف اسی غرض سے جاری
کئے گئے کہ سید صاحب اور اُنکے جدید خیالات کا خاکہ اڑایا جائے اُردو کے مشہور ظریف اخبار اودھ پنچ
مین اُنکے کارٹون نکلے اور تمسخر آمیز مضامین نظم و نثر اُنکے نسبت لکھے گئے۔ مگر سید صاحب اپنے مشاغل
مین سرگرم رہے اور اس مخالفت کا اثر مطلق اثر نہ پڑا۔ آخر عمر مین اُنکو سوائے اپنے محبوب کالج کی ترقی
کے اور کوئی خیال نہ تھا۔ ۱۸۷۶ء مین وہ سرکاری ملازمت سے کنارہ کش ہو گئے اور بقیہ عمر تعلیمی اور
سیاسی مشاغل مین گزار دی۔ بالآخر ۱۸۹۸ء مین ایک طویل عمر پا کر اور ایک کامیاب زندگی بسر کر کے

اس دنیا سے رخصت ہو گئے اور تمام ہندوستان کو اپنا سوگوار چھوڑ گئے۔

سید صاحب کا طرز تحریر

یقیناً سید صاحب اردو جرائد نگارون مین ایک بہت بلند مرتبہ رکھتے ہین۔ انکا قلم بہت زبردست اور انکا تبحر علمی بہت اعلیٰ تھا۔ اُن کا طرز تحریر زوردار مگر صاف اور سادہ ہے۔ اسمین کسی قسم کی عبارت آرائی نہین ہے۔ کچھ غلطیان بھی اسمین نکلین گی مگر سید صاحب قواعد صرف و نحو کی پابندی کی مطلق پروا نہین کرتے تھے وہ مقررہ قواعد انشا پردازی سے بالکل بے نیاز تھے۔ مگر یہی چیز اُنکی شہرت اور قابلیت کو نقصان پہونچانے کے بجائے اسمین اور اضافہ کرتی تھی۔ اُنکے طرز جدید نے قدیم تصنع نگاری پر جو بیدل اور ظہوری کی فارسی کی تقلید مین اردو مین بھی برتی جاتی تھی ایک ضرب کاری لگائی اور یہ ثابت کر دیا کہ سادہ اور بے تکلف عبارت مین تصنع سے زیادہ خوبیان ہین "مضمون کو دیکھو اور عبارت آرائی سے غرض نرکھو" پر سید صاحب کا عمل تھا اور حقیقت مین یہی حال انکی تمام تحریرون کا ہے۔ انکی عبارت اُنکے اداے مطالب مین کبھی قاصر نہین ہوتی اُنکو زبان پر عبور حاصل ہے۔ نثر اردو لکھنے مین وہ ایسے مشاق تھے کہ اُنکے پیشتر کوئی اُنکا ہم پلہ نہین تھا۔ مولانا حالی تو اُنکو نثر اردو کا مورث اعلےٰ قرار دیتے ہین۔ سب سے بڑی خوبی سید صاحب مین یہ تھی کہ وہ مشکل سے مشکل اور دقیق سے دقیق مضمون کو خواہ وہ مذہبی ہو یا سیاسی۔ نہایت صاف اور بے تکلف زبان مین ادا کر سکتے تھے۔ اور نیز اپنے مضامین کے حسن و قبح کو بھی نہایت زوردار الفاظ مین وضاحت سے بیان کر سکتے تھے۔ مگر سید صاحب اور غالب کے معاصرانہ تعلقات کو دیکھکر یہ ماننا پڑتا ہے کہ مرزا کی طرز خاص کا سید صاحب پر ایک خاص اثر پڑا اور جو سادگی اور بے تکلفی اُنکی عبارت مین پائی جاتی ہے اُسکا نقش اول غالب کے ہاتھون صورت پذیر ہو چکا تھا۔

سید صاحب کے رفقائے کار

دنیا کے تمام بڑے لوگونکی سب سے بڑی پہچان یہی ہے کہ وہ اپنے ساتھ والون مین بھی اپنا ہی ایسا جوش و خروش اور صداقت و راستبازی پیدا کر دیتے ہین۔ یہی حال سید صاحب کے حوارئین کا تھا جنکی زبردست جماعت نے اپنے ادبی اور سیاسی کارنامون سے ہندوستان مین ایک ہنگامہ پیدا کر دیا۔ خاص خاص لوگ جو اس جماعت مین شامل ہونے کا فخر رکھتے تھے یہ ہین۔ نواب

محسن الملک - نواب وقار الملک مولوی چراغ علی مولوی ذکاء اللہ - خواجہ الطاف حسین حالی - شبلی نعمانی مولانا نذیر احمد - اور مولوی زین العابدین - انمین سے اکثر اصحاب کے کچھ مختصر حالات اس کتاب مین قلمبند کئے گئے ہین حالی قومی شاعر تھے - مولوی نذیر احمد اپنے نصیحت آمیز افسانون اور ناولون کے لئے مشہور ہین - شبلی اور ذکاء اللہ فن نقد اور تاریخ کے امام تھے - مولوی چراغ علی اور نواب محسن الملک کے بیش بہا اور گرانقدر مضامین نے ادب اُردو کو ہمیشہ کے لئے ممنون احسان کیا - ان تمام بزرگون کی مساعی جمیلہ جو مسلمانون کی اصلاح حال کے لئے وقف تھین نہایت بارآور اور کامیاب ثابت ہوئین اور انکی تصانیف سے زبان اردو مین بیش بہا اضافہ ہوا۔

نواب محسن الملک ۱۸۳۷ء تا ۱۹۰۷ء

محسن الملک نواب سید مہدی علیخان بہادر ۱۸۳۷ء مین - اٹاوہ مین پیدا ہوئے - معمولی درسیات سے فراغت کرکے بعہد ایسٹ انڈیا کمپنی دس روپیہ ماہوار پر کلارک مقرر ہوئے - رفتہ رفتہ ترقی کرکے ۱۸۵۷ء مین اہلمد پھر سررشتہ دار اور ۱۸۶۱ء مین تحصیلدار سرکاری مقرر ہوئے - اپنے خدمات کی انجام دہی مین انہون نے انتہا درجہ کی قابلیت اور کارگزاری کا ثبوت دیا - اور اسی اثنا مین دو کتابین اردو مین ایک قانون مال اور دوسری قانون فوجداری کے متعلق تصنیف کین جنکو اُس زمانہ مین شہرت ہوئی ۱۸۶۳ء مین ڈپٹی کلکٹری کا مقابلہ کا امتحان کامیابی سے دیکر ۱۸۶۶ء مین مرزاپور کے ڈپٹی کلکٹر مقرر ہوئے - انکی قابلیت کی شہرت دور دور پہونچی تھی - چنانچہ سر سالار جنگ اول نے انکو حیدرآباد طلب کیا اور ۱۸۷۴ء مین وہ مالیات کے افسر اعلےٰ (انسپکٹر جنرل) مقرر ہوئے - قیام حیدرآباد کے زمانہ مین اُنہون نے اکثر کام نہایت مفید انجام دئے مثلاً محکمۂ بندوبست و پیمایش مین بہت مفید اصلاحین کین اور بجائے فارسی کے اردو کو سرکاری زبان قرار دیا ۱۸۷۶ء مین ریونیو سکرٹری یعنی اعلی معتمد مال اور ۱۸۸۴ء مین فنانشل و پولیٹیکل سکریٹری کے معزز عہدے پر ممتاز ہوئے اور سرکار نظام سے "محسن الدولہ محسن الملک منیر نواز جنگ" کا خطاب پایا - سفر انگلستان بھی کیا تھا اور گلیڈسٹون سے ملاقات کی تھی - بالآخر پولیٹیکل سازشون کے سبب سے اپنے عہدہ سے علیحدہ ہوکر اور آٹھ سو روپیہ ماہوار پنشن پاکر علیگڈھ چلے آئے جہان

بقیہ عمر کالج کے انتظام اور سرپرستی اور تعلیمی خدمات مین صرف کی۔

سید صاحب سے اُنکے بہت قدیم تعلقات تھے۔ مشہور ہے کہ جب سید صاحب شروع شروع مین مذہب مین کچھ دست انداز یان کر رہے تھے تو عام مسلمانونکی طرح یہ بھی اُنکو کافر و ملحد سمجھتے تھے مگر بعد کو جب اُنکی حقیقت سے آگاہ ہوے تو اُنکے بہت بڑے مدّاح اور معاون ہو گئے۔ چنانچہ "تہذیب الاخلاق" مین اکثر بیش بہا مضامین انہین کے قلم سے ہین جو ایک مذہبی اور تاریخی حیثیت رکھتے ہین اور جنکی غرض اصلی صرف یہ ہے کہ زمانہ حال کے مسلمان جو نکبت و ذلالت کے گڑھے مین پڑے ہوے ہین اپنے بزرگان سلف کے قدم بہ قدم چلین اور اپنے آپکو ہر حیثیت یعنے تعلیم و اخلاق و سیاست کے اعتبار سے کامیاب بنائین۔ اسمین کوئی شک نہین کہ یہ تمام مضامین اُنکے تبحر علمی وسیع النظری اور انصاف پسندی کے شاہد عادل ہین مولانا حالی نے بہت سچ لکھا ہے کہ "سید مہدی علی مسلمانون کے دلونکو اُنکے بزرگون کے کارنامے یاد دلا دلا کر اُبھارتے تھے اور جو کچھ کا اُنھون نے سرسید کی تائید مین لکھا وہ بڑے استدلال و استناد سے لکھا۔ اکثر اُن کے مضامین جو ایک اچھی خاصی کتاب کے برابر ہین بڑی تلاش اور محنت سے لکھے گئے ہین"۔ اسی طرح مولانا شبلی بھی انکی بہت تعریف کرتے ہین۔ اور کہتے ہین کہ "میدان ادب مین وہ کسی بڑے سے بڑے نثار سے پیچھے نہین رہے اور انکا ایک خاص طرز تحریر ہے"

اُن کے طرز تحریر کے خصوصیات یہ ہین کہ عبارت نہایت زوردار ہوتی ہے مگر اسپر بھی صفائی اور سلاست اور حسن بیان مین فرق نہین پڑتا۔ اگر کہین پرانے طرز کی تقلید مین عبارت آرائی اور رنگینی پیدا کرنا چاہتے ہین تو اُنکے صنایع بدایع اور استعارات و تمثیلات بُرے نہین معلوم ہوتے۔ بلکہ حسن عبارت کو اور بڑھا دیتے ہین۔ مگر یہ سمجھنا چاہیے کہ اس قسم کی پُر تکلف عبارت وہ زیادہ نہین لکھتے تھے۔ اُنکے زیادہ تر مضامین صاف سادہ اور سلیس ہین۔ علاوہ مضامین مذکورۂ بالا کے اُنکی کوئی مشہور تصنیف سوائے "آیات بینات" کے نہین ہے اور یہ ایک مذہبی رنگ کی کتاب ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مولوی ظفر علیخان نے ڈریپر کی مشہور کتاب "معرکہ مذہب و سائنس" کا ترجمہ نواب صاحب موصوف ہی کی فرمایش سے کیا تھا نواب صاحب نے ۱۹۰۷ء مین انتقال کیا اور سرسید کے قریب دفن ہوے۔

نواب وقار الملک
۱۸۳۹ء تا ۱۹۱۷ء

خلافت علیگڈھ کے خلیفہ ثانی نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین شیخ فضل حسین کے صاحبزادے تھے امروہہ (یوپی) کے قریب ایک گاؤن مین پیدا ہوے۔ ایک کمبوہ خاندان سے تھے شروع مین کسی اسکول مین پڑہاتے تھے اور زمانہ قحط مین امروہہ مین کچھ سرکاری خدمات انجام دین پھر رفتہ رفتہ سرشتہ دار اور منصرم صدر الصدور ہو گئے اور سر سید کے ساتھ کام کرتے رہے سر سید ہی کی سفارش سے حیدر آباد پہونچے جہان سر سالار جنگ کے حکم سے ناظم دیوانی کے عہدہ پر ممتاز ہوئے اور اپنی قابلیت تن دہی اور دیانت سے حکام اعلیٰ کو مطمئن اور خوش رکھا۔ سازشون کی وجہ سے انکو بھی حیدر آباد چھوڑنا پڑا مگر پھر جلد بلا لیے گئے اور دوبارہ انھون نے نہایت عمدہ اور مفید صلاحین سرکاری کامون مین کین جسکے صلہ مین معزز خطاب "وقار الدولہ وقار الملک" کا سرکار آصفیہ سے عنایت ہوا۔ ۱۸۹۲ء مین ملازمت سے کنارہ کش ہوکر بقیہ عمر قومی کامون مین علی الخصوص علیگڈھ کالج کی اصلاح و ترقی مین صرف کر دی۔ نواب صاحب موصوف ۱۸۶۶ء مین سائنٹفک سوسائٹی کے ممبر اور "تہذیب الاخلاق" کے مہتمم بھی ہو گئے تھے تصانیف آپکی چند قیمتی مضامین ہین" جو تہذیب الاخلاق مین شایع ہوئے اور ایک انگریزی کتاب "فرنچ ریوولیوشن اینڈ نپولین" کا اردو ترجمہ "سرگذشت نپولین بونا پارٹ ہے جسکی تالیف مین منشی گلزاری لال اور بابو گنگا پرشاد نے بھی کچھ حصہ لیا تھا اور ۱۸۷۱ء مین مطبع نول کشور سے چھپکر شایع ہوا۔

مولوی چراغ علی
۱۸۴۴ء تا ۱۸۹۵ء

نواب اعظم یار جنگ مولوی چراغ علی ۱۸۴۴ء مین پیدا ہوئے۔ والد کا نام مولوی محمد بخش تھا انھون نے میرٹھ سہارنپور اور پنجاب مین سرکاری ملازمت کرکے ۱۸۵۶ء مین انتقال کیا اور اپنے بعد چار لڑکے چھوڑے جنمین چراغ علی سب سے بڑے تھے۔ چراغ علی ابتدائی تعلیم سے فراغت کرکے ضلع بستی کے محکمہ خزانہ مین مبلغ بیس روپیہ ماہوار پر مقرر ہوے ۱۸۷۲ء مین عدالت جوڈیشل کمشنر اودھ کے ڈپٹی منصرم اور پھر سیتاپور کے تحصیلدار ہوے ۱۸۷۷ء مین سر سید کی کوشش سے حیدر آباد گئے جہان نواب محسن الملک کی ماتحتی مین نائب معتمد مال بمشاہرہ چار سو روپیہ مقرر ہوے اور رفتہ رفتہ ترقی کرکے ریوینو اور پولیٹکل سکرٹری کے معزز عہدہ پر بمشاہرہ پندرہ سو روپیہ ماہوار ممتاز ہوئے ۱۸۹۵ء مین انتقال کیا۔
مولوی چراغ علی نہایت بیدار مغز متدین غیر متعصب اور راستباز شخص تھے۔ کتب بینی کا انکو

اسقدر شوق تھا کہ مقامات دور دراز مثلاً مصر و شام سے کتابین منگواتے تھے۔ ابتداے عمر سے مضمون نگاری کا شوق تھا جسمین مذہبی رنگ غالب تھا کبھی کبھی عیسائی پادریون سے بھی مقابلہ ہوجاتا تھا جسمین یہ مذہب اسلام کی خوبیون کو نہایت شد و مد سے ثابت کرتے تھے۔ یہ مطالعہ کتب کے عاشق اور پابندی اصول کے ایک پیکر مجسم تھے۔ انکی تصانیف کثرت سے ہین۔ علاوہ اُن کتابون کے جو ملازمت حیدر آباد کے زمانہ مین حیدر آباد کے انتظامی معاملات اور سرکاری رپوٹون وغیرہ کے متعلق انھون نے لکھین کتب ذیل جو عام دلچسپی کی ہین مشہور ہین تحقیق الجہاد مسلمانون نے اپنے زمانۂ حکومت مین کیا کیا اصلاحات کین۔ رسول برحق۔ اسلام کی دنیاوی برکتین۔ قدیم قومونکی مختصر تاریخ۔ اِن کے علاوہ اُن کے مضامین تہذیب الاخلاق اور وہ خطوط جو مجموعۂ رسائل" کے نام سے چھپے ہین اور چند اردو اور انگریزی پمفلٹ بھی ہین جو مسائل اختلافی پر لکھے گئے تھے۔ مولویصاحب موصوف علاوہ ایک متبحر فاضل اور جید عالم ہونے کے فن مناظرہ مین ایک بہت بڑی دستگاہ رکھتے تھے اور انکو مشکل مسایل مین دلنشین جواب دینے کا ایک خاص سلیقہ تھا۔ اور عبارت بھی نہایت زوردار لکھتے تھے ہر چند کہ اسمین ادبی شان کم ہوتی تھی۔

مولوی محمد حسین آزاد متوفی سنہ ۱۹۱۰ء

شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد گذشتہ صدی کی تیسری دہائی مین دلّی مین پیدا ہوئے انکے والد مولوی باقر علی جنھون نے شمالی ہند مین مضمون نویسی مین بڑی شہرت حاصل کی تھی ذوق کے دلی دوست تھے۔ اسیوجہ سے آزاد کی ابتدائی تعلیم استاد ذوق کے سایہ عاطفت مین ہوئی انھین کی بابرکت صحبت مین اُنھون نے شعر گوئی اور فن عروض سیکھا آزاد پرانے دِلّی کالج کے تعلیم یافتہ تھے جس سے مولوی نذیر احمد مولوی ذکاء اللہ ماسٹر پیارے لال آشوب ایسے لایق اور ہونہار لوگ پڑھکر نکلے استاد ذوق کے ساتھ یہ بڑے بڑے مشاعرون مین شریک ہوتے اور بڑے بڑے شعرا سے روشناس ہوتے تھے اور انھین ادبی سر چشمون سے انکا ذوق سخن سیراب ہوتا تھا۔ غدر ۵۷ء کی مصیبتون کے بعد آزاد اپنے وطن سے نکل کھڑے ہوئے اور سرگردان پھرتے ہوئے لکھنؤ پہونچے۔ انکے والد کا انتقال غدر مین ہوچکا تھا استاد کا کلام اور کچھ خود انکا کلام جو پہلے کا تھا غدر مین ضایع ہوگیا تھا ہنگامہ غدر فرو ہونے کے بعد آزاد نے کسب معاش کے مختلف ذرایع اختیار کیے۔ کچھ دنون تک ایک فوجی اسکول مین ماسٹر رہے مگر چند دنونکے

بعد اس کام کو چھوڑ دیا۔ آخر کار پھرتے پھراتے ۱۸۶۴ء مین لاہور پہونچے اور مولوی رجب علی کے ذریعہ سے پنڈت من پھول لفٹننٹ گورنر کے میر منشی سے ملے جنکی سفارش سے سر رشتہ تعلیم کے محکمہ مین پندرہ ۱۵ روپیہ ماہوار کے ملازم ہوگئے۔ چھوٹے عہدے کیوجہ سے اتنا موقع نہین ملتا تھا کہ بڑے بڑے افسران سرکاری سے ملین جو انکی لیاقت اور قابلیت کا لحاظ اور قدر کرکے انکو کسی اعلے عہدے پر پہونچائین اتفاق سے ماسٹر پیارے لال آشوب کے ذریعہ سے جو اِن کے بہی خواہ اور دوست تھے میجر فلر صاحب ڈائرکٹر سر رشتہ تعلیم تک رسائی ہوگئی جو علوم و السنہ مشرقیہ سے کمال ذوق رکھتے تھے۔ اور رسائی کی صورت یہ ہوئی کہ میجر صاحب نے لفظ ایجاد کو مؤنث لکھا تھا جسکی نسبت تذکیر و تانیث کا کچھ شبہ تھا۔ ماسٹر پیارے لال نے آزاد کو بُلایا اور اُنسے اسکی بابت دریافت کیا گیا۔ اُنھون نے "ایجاد" کو مذکر کہا۔ اور جب سند مانگی گئی تو یہ شعر سودا کا پڑھا ہائے یہ کس بھڑوے کا ایجاد ہے۔ نسخہ مین معجون زر بنا د ہے اسوقت سے میجر صاحب کی خدمت مین انکی رسائی ہوگئی اور کچھ ترقی بھی ہوگئی۔ سب سے پہلے یہ اُردو و فارسی کی درسی کتابین لکھنے پر مامور ہوئے چنانچہ فارسی کی پہلی اور دوسری کتاب۔ اُردو کی پہلی۔ دوسری اور تیسری اور قصص ہند اس زمانہ کی انکی مشہور تصانیف ہین جو مبتدیون مین نہایت مقبول ہوئین۔ اور اُنھین تصانیف کی بدولت پنجاب مین اسکولی تعلیم بہت رائج ہوئی۔ آزاد کو یہ بھی فخر حاصل ہے کہ اُنھون نے انجمن پنجاب کے قیام مین بہت بڑا حصہ لیا جسکی وجہ سے صوبہ پنجاب مین اُردو کی ترقی اور ترویج ہوئی جب میجر فلر کے بعد کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر تعلیم مقرر ہوئے جنکو زبان اُردو کا محسن سمجھنا بالکل بجا ہے تو ۱۸۷۴ء مین آزاد نے کرنیل صاحب موصوف کو اس بات پر آمادہ کیا کہ انجمن پنجاب کی سرپرستی مین ایک خاص مشاعرہ قایم کیا جائے جسکی غرض یہ ہو کہ اردو شاعری کی مبالغہ آمیز اور پر تصنع روش بدلجائے اور اسمین حقیقت اور صلیت کی روح پیدا کیجائے ۱۸۶۵ء مین وہ کسی سرکاری کام سے کلکتہ اور پنڈت من پھول کی معیت مین ایک سفارتی مشن پر کابل و بخارا گئے تھے۔ ایران وہ دو مرتبہ گئے۔ پہلی مرتبہ ۱۸۶۵ء مین اور دوسری مرتبہ ۱۸۸۳ء مین۔ زبان فارسی سے انکو ایک خاص لگاؤ تھا اور اسیوجہ سے اسکا مطالعہ اُنھون نے خاص طور پر کیا تھا اور ایران کے قیام نے اُن کو جدید فارسی سے بھی آشنا کر دیا تھا۔ انہین وجوہ سے

انکی وہ تصانیف جو زبان فارسی کے متعلق ہین دلچسپی اور معلومات سے پُر ہین - کرنل ہالرائڈ نے آزاد کو اتالیق پنجاب" (ایک سرکاری اخبار) کا سب ایڈیٹر بمشاہرہ پچہتر روپیہ ماہوار مقرر کیا تھا - اور ایڈیٹر رائے بہادر پیارے لال آشوب تھے - جب تھوڑے عرصہ کے بعد یہ اخبار بند ہو گیا اور "پنجاب میگزین" اُسکی جگہ نکلا تو آزاد اسکے بھی سب ایڈیٹر مقرر ہوئے اور اُن کے بعد مولانا حالی کچھ دنون اس عہدے پر متعین رہے - آزاد گورنمنٹ کالج لاہور مین عربی اور فارسی کے پروفیسر بھی ہو گئے تھے ۱۸۸۷ء مین ملکہ وکٹوریہ کے جوبلی کے موقع پر اُنکی قابلیت کے صلہ مین انکو شمس العلما کا خطاب عطا ہوا - دماغی محنت اور سفر ایران کا تعب اور اپنی پیاری بیٹی کی بیوقت موت کو جس سے جنکو وہ بہت عزیز رکھتے تھے اور جنکو نہایت عمدہ تعلیم دلائی تھی اُنکے قواے دماغی پر بہت بڑا اثر پڑا جسکی وجہ سے ۱۸۸۹ء مین کچھ جنون کے آثار معلوم ہونے لگے جس سے وہ کسی دنیاوی کام کے لایق نہین رہے - آخر عمر تک یہی حالت جنون کی رہی اور ۲۲ جنوری ۱۹۱۰ء کو اس جہان فانی سے رحلت کی -

تصانیف آزاد کی حسب ذیل تصانیف ہین - فارسی ریڈرین (۲ حصے) قدیم اُردو ریڈرین (۳ حصے) اُردو کا قاعدہ و قواعد اُردو - قصص ہند - جامع القواعد - نئی اُردو ریڈرین (۳ حصون مین) آبحیات - نیرنگ خیال - سخندان فارس - قند پارسی - نصیحت کا کرن پھول - دیوان ذوق - نظم آزاد - دربار اکبری - نگارستان فارس - سپاک نماک - جانورستان -

ریڈرین اور اسکولی کتابین اُردو اور فارسی ریڈرین اور ابتدائی رسایل صرف و نحو طلبائے اسکول اور مبتدیون کے واسطے لکھے گئے تھے - ان سب کی عبارت نہایت سلیس اور عام فہم ہے اور فی الحقیقت طلبا کے واسطے وہ بہت مفید اور کچھ عرصہ تک وہ داخل درس رہی بھی ہین علی الخصوص قصص ہند جسمین تاریخ ہندوستان کے مشہور مشہور حالات و واقعات عجیب دلچسپ بلیغ اور پر زور عبارت مین لکھے گئے ہین - یہ لاجواب کتاب جماعت طلبا اور نیز پبلک مین بیحد مقبول ہے اور اسکے متعدد ایڈیشن شایع ہو چکے ہین بچے اُس کو دلچسپ واقعات کا مجموعہ سمجھتے ہین اور پڑھے لکھے اُسکی عبارت کے دلدادہ ہین - جملون کا توازن عبارت کی چستی الفاظ کی شکوہ - اور مضامین کی ترتیب اسکی ہمجنس کتابون سے اُسکا درجہ بلند کر دیتی ہے -

آبحیات مولانا آزاد کا شاہکار اور اُنکی بہترین تصنیف آبحیات ہے۔ اسمین مشہور مشہور شعرا کے مختصر حالات معہ اُنکے نمونۂ کلام اور تنقید کے درج ہین۔ اور زبان اردو کی تاریخ اور اُن تغیرات کا بھی ذکر ہے جو زبان اردو مین وقتاً فوقتاً ہوتے رہے ہین حقیقت مین اس کتاب کی تصنیف سے ایک بہت بڑی کمی پوری ہوگئی اسوجہ سے کہ گو کہ اس سے قبل اکثر تذکرے اور مجموعۂ اشعار موجود تھے۔ مگر وہ قابل اعتنا نہ تھے اور نامکمل بھی تھے بعض کا تو یہ حال تھا کہ مشہور مشہور شاعرون کا حال صرف چند سطرون مین لکھدیا اور اُنمین بھی آدھے سے زیادہ محض کلمات توصیف و تحسین۔ ادب اردو آزاد کا ممنون ہے کہ اُنھون نے ایک باقاعدہ اور مفصل تذکرۂ شعرا ترتیب دیا۔ جسکے واسطے یقیناً اُنکو بڑی محنت اور کاوش کرنا پڑی ہوگی۔ وہ ایک ایسا خزانۂ معلومات ہے کہ جس سے مابعد کے مصنفین بہت کچھ مدد لے سکتے ہین اور لیتے رہے ہین علاوہ اس خوبی یعنے گنجینۂ معلومات ہونے کے اُسکی اصلی خوبی اُسکی بے مثال طرز عبارت ہے کہ جسکی نقل کی سب کوشش کرتے آئے ہین مگر کماحقہ کوئی نہین کرسکا۔ الحق آزاد نے آبحیات لکھکر ادب اردو مین ایک جدید طرز کا اضافہ کیا جو مثل حالی کے سادہ اور عاری از زیب و زینت نہین اور نہ مولوی نذیر احمد کیطرح ثقیل اور روزنی ہے وہ ایک زوردار اور سب سے جدا رنگ رکھتی ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اُسمین کچھ ایسی خوبیان ہین جو احاطۂ بیان سے باہر ہین اور صرف دل اُنسے لطف اُٹھاتا ہے۔ مگر اُسی کے ساتھ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ مولانا نے اپنے جوش و شوق مین تاریخی مواد کو غور و خوض سے نہین دیکھا غیر موثق اور غیر معتبر حوالون کی بنیاد پر سر بفلک عمارتین کھڑی کردین۔ اور بعض جگہ کتاب مین دلچسپی پیدا کرنے کے لیئے واقعات مین کمی و بیشی اور تبدیلی تک کو جایز رکھا۔ مگر زمانہ حال کے تجسس و تلاش اور تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ آب حیات کے اکثر بیانات غلط یا کم از کم مشکوک ضرور ہین۔ اکثر جگہ جانبداری کا الزام بھی مصنف پر عاید ہوتا ہے۔ مثلاً اپنے استاد ذوق کی بیحد تعریف و توصیف اور اُنکے حالات مین شغف اور مرزا غالب کے کمالات سے نسبتاً بے پروائی بلکہ جگہ جگہ اُنپر در پردہ چوٹین۔ مرزا دبیر کے خاندان کو کم کرکے دکھانا۔ انشا کے آخری ملنے کے عبرت انگیز غیر موثق حالات وغیرہ یہ اور اسی قسم کی باتین جواب اُفق مطالعہ پر نظر آئی ہین آبحیات کے اکثر بیانات کے متضاد اور مخالف واقع ہین۔ پھر بھی اگر اس قسم کی اور بھی غلطیان نکل آئین تو اس سے ہماری

رائے مین کتاب کی اصل خوبی اور قدر و قیمت مین کوئی زیادہ فرق نہین آتا۔ اسی کتاب سے تنقید کا صحیح معیار اُردو
مین قایم ہوا حالی کی یادگار غالب کو اسی کتاب کے مطالعہ کا نتیجہ سمجھنا چاہیئے مختصر یہ کہ بحیثیت ایک قدیم تذکرہ
کے بحیثیت ایک خزانہ واقعات و حکایات کے بحیثیت غیر قابل تقلید ہونے کے یہ کتاب آپ اپنی جواب ہی
اور آئندہ بھی اسکا جواب مشکل معلوم ہوتا ہے۔

نیرنگ خیال یہ بھی ایک جدید رنگ کی کتاب ہے جسمین خیالی افسانون اور خواب وغیرہ کے پردہ مین عمدہ
اخلاقی نتایج نکالے ہین۔ یہ دو حصّون مین سنہ ۱۸۸۰ء مین تصنیف ہوئی تھی۔ اس قسم کے فرضی افسانے
اور حکایات ہر زمانہ اور ہر قوم مین لوگون کے مطبوع خاطر رہے ہین۔ یونانی اور رومی لوگون کو انکا بہت شوق
تھا۔ انگریزی مین ایڈیسن جان نبین اور اسپنسر کے الیگری (خیالی قصے) مشہور ہین اور فارسی مین مثنوی
مولانا روم اور انوار سُہیلی سنسکرت مین ہتوا پدیش اور عربی مین اخوان الصفا وغیرہ۔ ہمارے خیال مین
آزاد نے اپنے قصونکی بنیاد یونانی قصونپر رکھی ہے اور اس سے انکی یونانی علم الاصنام کی واقفیت کا بہت
کچھ پتہ چلتا ہے۔ ڈاکٹر لیٹنر نے انکو اس کتاب کے لکھنے کی ترغیب دی تھی اور اس کا خاکہ تیار کردیا تھا۔
مگر یہ بڑی قابل تعریف بات ہے کہ مولانا آزاد باوجود انگریزی کم جاننے کے اس تبلع مین کامیاب ہوئے
یہ کتاب اُنکے خاص طرز تحریر مین لکھی گئی ہے مگر نفس مضمون سے زیادہ طرز بیان بہت دلچسپ ہے۔

سخندان فارس ادب فارسی کے متعلق یہ کتاب بھی بہت دلچسپ ہے۔ در اصل یہ ایک قیمتی رسالہ
علم فلالوجی پر ہے جسمین فارسی اور سنسکرت زبانون کو متحد الاصل ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔
اسمین اہل ایران کے رسوم و رواج کا بھی ذکر ہے اور اُنکا مقابلہ ہندوستان سے کیا ہے۔ خود مصنف
کے سفر ایران اور انکے علمی مکاشفات کے حالات بھی درج ہین مثل مولانا شبلی کی شعر العجم کے یہ ایک
مکمل کتاب نہین کہی جاسکتی مگر پھر بھی بہت مفید اور ایک ذخیرہ معلومات ہے

قند پارسی اور نصیحت کا کرن پھول قند پارسی ایک مفید کتاب ہے جس سے زمانۂ حال کی فارسی کے
حاصل کرنے مین بہت کچھ مدد مل سکتی ہے۔ اسمین مولانا کے سفر ایران کے بھی کچھ حالات درج ہین
نصیحت کا کرن پھول جو ایک مکالمہ اور نصایح کے پیرایہ مین ہے بچون اور عورتون کے لئے بہت مفید ہے اسکی

شمس العلماء مولوی محمد حسین صاحب آزاد دہلوی

شمس العلما ڈاکٹر نذیر احمد ایل ایل ڈی

عبارت بہت صاف وسلیس ہے۔

دیوان ذوق | اس کتاب کی ترتیب و تالیف سے مولانا آزاد نے ادب اردو کی بیش بہا خدمت انجام دی ہے اور اپنے اُستاد کے کلام کو گمنامی سے بچا لیا ہے۔ تذکرۂ آبحیات میں اُنہوں نے نہایت مؤثر اور دردناک لہجہ سے اور تفصیل کے ساتھ اُستاد کے کلام کا ضایع ہوجانا اور پھر اُن اجزاے پریشان کو بڑی محنت اور دقتوں سے جمع کرنا بیان کیا ہے۔ دیوان کے شروع میں ایک مختصر دیباچہ ہے اور بعض بعض غزلوں کے ساتھ اُنکے حالات تصنیف پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اور پیشتر کے مطبوعہ کلام سے ایک تین اضافہ بھی اسمیں موجود ہے۔ ان دلچسپ نوٹوں سے نہ صرف اشعار کی قدر و قیمت بڑھ گئی ہے بلکہ اسمیں ایک "رومان" کی سی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ بعض لوگوں نے الحاقی کلام پر شک بھی ظاہر کیا ہے مگر ہمارے نزدیک اس قسم کے شکوک بے بنیاد ہیں اور ان پر زیادہ نہ خیال کرنا چاہیے۔

دربار اکبری | یہ عظیم الشان تصنیف اکبر بادشاہ کے عہد اور اُنکے ارکین سلطنت کے حال میں ہے اس کتاب کی عبارت اپنے رنگ میں لاجواب ہے۔ افسوس ہے کہ اسپر نظر ثانی نہو سکی۔ اس کتاب میں عہد اکبری کی جیتی جاگتی تصویریں دکھائی گئی ہیں۔

دیگر تصانیف | "سپاک و تماک"، "جانورستان" اُس زمانہ کی تصانیف ہیں جبکہ مولانا صحیح الدماغ نہ رہے تھے۔ اول الذکر ایک غیر مربوط مجموعہ متصوفانہ خیالات کا ہے جو اُسی عالم میں لکھے گئے تھے۔ اس سے کتنا بڑا شوق تصنیف و تالیف کا پایا جاتا ہے کہ باوجود تعطل دماغ کے بھی جب کبھی چند لمحے سکون کے ملتے تھے تو وہ اُن کو ادبی کاموں میں صرف کرتے تھے۔ اسی زمانے اور اسی حالت کی تصنیف "جانورستان" بھی ہے جسمیں کچھ جانوروں کے حالات اور انکی آوازوں کا بیان ہے۔ "نگارستان فارس" جو بعد انکے انتقال کے شایع ہوئی ایران و ہندوستان کے فارسی شعراء کا ایک مختصر تذکرہ ہے جسمیں رودکی سے لیکر حزین اور واقف و آرزو تک تقریباً ۱۰۳ شعرا کے حالات معہ اُنکے نمونۂ کلام کے درج ہیں۔ اسکی زبان بہت صاف و سادہ مگر مثل آبحیات کے پُر لطف نہیں ہے۔ شاید اسوجہ سے کہ یہ اُنکی ابتدائی تصنیفات میں سے ہو۔ آخری کتاب جو انکے نام سے اُنکے پوتے نے شایع کی ہے "الٰہیات" ہے۔

آزاد کا مرتبہ اردو نثارون مین

اردو نثر نگارون مین آزاد کی ایک بہت وقیع اور بہت نمایان ہستی ہے بحیثیت بانی تحریک جدید ہونے کے بحیثیت جدید طرز کے شاعر کے بحیثیت ایک فارسی اسکالر کے جو قدیم رنگ کے ساتھ جدید رنگ کے بھی بڑے ماہر تھے بحیثیت ایک مروج تعلیم کے جنکی وجہ سے پنجاب مین انگریزی کے ساتھ اردو و فارسی کی تعلیم نے بھی بڑا رواج پایا بحیثیت ایک اعلے مضمون نگار کے بحیثیت ایک زبردست ناقد کے بحیثیت ایک مشہور پروفیسر اور مصنف کے بحیثیت حامی اردو کے بحیثیت ایک زبردست مقرر کے آزاد اپنے زمانہ مین عدیم المثال تھے۔ مگر وہ چیز جس نے انکو زندہ جاوید کر دیا وہ ان کا خاص طرز تحریر ہے جو لاثانی ہے اور جسکی تقلید محال ہے۔ زبان اردو نے انکی ذات مین اپنا ایک بہت بڑا مددگار اور حامی پایا تھا۔ انکے طرز تحریر کی یہ خاص صفت ہے کہ فارسی اور عربی کے غیر مانوس الفاظ اور ترکیبین اور دور از کار صنائع بدائع جنکا آجکل بہت رواج ہے اسمین نہین پائے جاتے۔ انکی عبارت کی یہ خاص شان ہے کہ بھاشہ کی سادگی اور بے تکلفی۔ انگریزی کی صاف گوئی۔ اور فارسی کا حسن و خوبصورتی اسمین ملی جلی ہوتی ہے۔ وہ تصنعات اور تکلفات سے گو کہ عاری ہے مگر لطیف استعارے اور خوبصورت تشبیہین اسکے حسن کو دوبالا کرتی ہین۔ وہ ایک موسیقیت رکھتی ہے۔ آزاد کا مقابلہ انگریزی انشا پردازون مین ڈی کوئینسی لیمب اور اسٹیونسن سے جو صاحبان طرز خاص تھے بخوبی ہو سکتا ہے۔ اپنے زمانہ مین بھی آزاد بہت ہر دلعزیز اور مقبول ہو چکے تھے اور انکے معاصرین انکو نہایت قدر و عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ چنانچہ حالی نے آبحیات اور نیرنگ خیال کی تقریظون مین انکی بہت تعریف کی ہے اور شاعری کے طرز جدید کا انکو بانی قرار دیا ہے۔ اسیطرح مولانا شبلی انکو اردو کا ایک بہت بڑا ہیرو سمجھتے تھے اور انکی موت پر انکو خداے اردو کہکے یاد کیا۔ مولوی نذیر احمد اور مولوی ذکاء اللہ بھی انکے بڑے مداح اور قدردان تھے۔

آزاد ظریف الطبع۔ نہایت مہذب و متین۔ اور تعصب سے بالکل آزاد تھے۔ وہ سریع الغیظ مگر جلد معاف کر دینے والے تھے۔ بعض معاصرین سے چشمک رہتی تھی جسکا انجام بحث و مناظرہ کی صورت اختیار کر لیتا تھا۔

حالی | خواجہ الطاف حسین حالی کا ذکر بہ حیثیت شاعر کے حصۂ نظم مین ہو چکا ہے - یہان بحیثیت معز نثار کے انکا ذکر کیا جاتا ہے - انکی تصانیف حسب ذیل ہین - تریاق مسموم مطبوعہ ۱۸۶۶ء علم طبقات الارض کی ایک عربی کتاب کا ترجمہ مجلس النساء (۲ حصونمین) مطبوعہ ۱۸۷۴ء حیات سعدی مطبوعہ ۱۸۸۶ء مقدمہ شعر و شاعری - یادگار غالب مطبوعہ ۱۸۹۶ء حیات جاوید یعنی سر سید مرحوم کی سوانحعمری مطبوعہ ۱۹۰۱ء مضامین حالی یعنے ان مضامین کا مجموعہ جو وقتاً فوقتاً اخبارات و رسائل مین چھپے ہین -

ابتدائی تصانیف | "تریاق مسموم" پانی پت کے ایک شخص کے اعتراضات کا جواب ہے جو مسلمان سے عیسائی ہو گیا تھا اور جسنے اسلام پر اعتراضات کئے تھے - اس مین کوئی ادبی خوبی نہین محض اس لئے دلچسپ ہے کہ اس سے انکی ذکاوت اور طباعی کا پتہ چلتا ہے "طبقات الارض" ایک عربی کتاب کا ترجمہ ہے جو خود فرانسیسی سے کیا گیا تھا - یہ کتاب ڈاکٹر لیٹر کے زمانہ مین پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے شائع ہوئی تھی "مجلس النساء" ایک انعامی رسالہ ہے جسکے صلہ مین مولانا کو مبلغ چارسو روپیہ کا انعام لارڈ نارتھ بروک وایسرائے ہند نے عطا کیا تھا یہ عورتون کے واسطے بہت مفید ہے اور لڑکیون کے اسکولون مین ایک عرصہ تک بحیثیت درسی کتاب کے داخل رہی ہے - اسمین بہت سے ایسے الفاظ و محاورات ہین جو شریف گھرانے کی عورتین بولتی ہین -

حیات سعدی | حیات سعدی یعنے شیخ سعدی شیرازی کی سوانحعمری ہے اس سے مولانا نے اردو نثارون کی صف اول مین جگہ پائی اور انکی سوانح نگاری کی قابلیت اور اسلوب بیان کا پتہ چلا -

مقدمہ شعر و شاعری | مولانا کے دیوان کے شروع مین یہ معرکۃ الآرا مقدمہ ہے جسنے اردو کی ادبی دنیا مین ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا اور مولانا کی شہرت کا یہی سنگ بنیاد ہے - اسمین دو سو سے زیادہ صفحات ہین - اور گو کہ دیوان کے ساتھ چھپا ہے مگر اسکو دیوان سے کوئی تعلق نہین بلکہ یہ ایک نہایت قابلانہ تنقیدی مضمون نفس شاعری کے آئڈیل (انتہائی نقطۂ خیال) پر ہے - اسکی تصنیف سے بڑے تجسس و تلاش اور وسیع النظری کا پتہ چلتا ہے اسمین یونانی و رومی انگریزی و عربی نقادان فن شعر کے خیالات شعر کی بابت قلمبند کئے گئے ہین ہرچند کہ نہایت مجمل سطحی اور غیر مربوط طریقے سے انکا ذکر کیا گیا ہے - یورپ مین شاعری مین مولانا حالی تہ تک غوطہ نہین لگا سکتے کیونکہ اس بحر کے وہ شناور نہین ہین سنسکرت کی شاعری کو بوجہ عدم واقفیت زبان

بالکل چھوڑ دیا ہے۔ مگر باوجود ان سب کے کتاب ایک ذخیرۂ معلومات ہے اور اسوجہ سے کہ اس قسم کے فن نقد
مین سب سے پہلی تصنیف ہے نہایت قابل قدر ہے۔ اسکی بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ ایک ایسے شخص کے قلم
سے نکلی جو مغربی تعلیم سے بالکل ناآشنا تھا۔ اس کے مطالعہ سے قدیم طرز کے شعرا کے سامنے جدید معلومات
اور تخئیل کے دروازے کھل گئے ہین۔ مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس کتاب کی تقلید مین زمانہ موجودہ کے
اکثر دوادین کے ساتھ اکثر مقدمات لا طائل شایع ہوتے رہتے ہین جنکا اخذ درحقیقت یہی مقدمۂ شعر و شاعری ہے
اور کسی جدید بات کا اضافہ نہین کیا جاتا۔

یادگار غالب مولانا کی سب سے زیادہ ہردلعزیز تصنیف یادگار غالب ہے جس سے بہتر کوئی کتاب اس
طرز کی ابتک نہین نکلی۔ اسمین مرزا غالب کی زندگی کے حالات و واقعات انکے لطایف و ظرایف وغیرہ
نہایت عمدہ اور دلچسپ پیرایہ مین بیان کئے ہین اسکے بعد اُنکے ہرقسم کے کلام پر ناقدانہ نظر ڈالی گئی ہے۔
بڑی خوبی یہ ہے کہ چونکہ مصنف مرزا صاحب کے شاگرد تھے لہذا اکثر واقعات چشم دید لکھے ہین مشکل اشعار
کے معانی بھی سمجھائے ہین اور ان مواقع کا بھی بیان ہے جب وہ اشعار کہے گئے تھے جس سے اشعار کا لطف
دوبالا ہو جاتا ہے اس تصنیف کے ذریعہ سے حالی نے اپنے استاد غالب کی شاگردی کا حق اُسیطرح ادا
کردیا جسطرح کہ آزاد نے دیوان ذوق کو ترتیب دیکر ذوق کو زندہ جاوید بنایا۔ دونون اپنے اپنے استادون
کے شاگرد رشید اور ویسے چاہنے والے تھے۔ "یادگار غالب" تنقیدی کتابون مین ایک ممتاز درجہ رکھتی
ہے تنقید گو کہ اعلی درجہ کی ہے مگر پھر بھی جوش عقیدتمندی کہین کہین جادۂ انصاف سے ہٹا دیتا ہے۔

حیات جاوید حالی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ کتاب ہے جسکی وجہ سے خود انہون نے حیات ابدی پائی۔ یہ ایک
بہت مفصل اور جامع ضخیم کتاب ہے۔ اسمین سرسید مرحوم کی طویل اور مختلف الاحوال کثیر الاشغال زندگی
کے حالات اسقدر تفصیل کے ساتھ درج ہین کہ اسکو زبان اردو مین وہی مرتبہ حاصل ہوگیا ہے جو باسویل
کی مشہور کتاب "ڈاکٹر جانسن کی لائف" کو انگریزی مین ہوا ہے۔ سرسید بحیثیت ایک لیڈر اور مدبر اور
ریفارمر اور اہل قلم کے دکھائے گئے ہین۔ سرسید کے ساتھ انکے اکثر شرکائے کار کے بھی حالات اسمین درج
ہین۔ یہ ایک مہتم بالشان تصنیف ہے لیکن اسمین ہیرو کی تعریف مین مبالغہ کیا گیا ہے اسیوجہ سے مولانا شبلی کا

یہ اعتراض بالکل صحیح ہے کہ اس کتاب مین تصویر کا صرف ایک رخ دکھایا گیا ہی معائب یا تو چشم پوشی کی گئی ہی یا انکی کوئی توجیہ کردی گئی ہے۔ مگر ہماری رائے مین اس زمانہ کی تصانیف کو اتنی سختی کے ساتھ جانچنا مناسب نہین ہے۔ اسوجہ سے کہ سوانح نگاری اور فن تنقید ہمارے یہان ابھی ابتدائی حالت مین ہین اور زیادہ تر قطع و برید سے بجائے نفع کے نقصان کا احتمال ہے۔

مضامین حالی وہ مضامین ہین جو مولانا نے وقتاً فوقتاً اخبارات و جرائد مین علی الخصوص تہذیب الاخلاق مین چھپوائے ہین۔ انکے علاوہ نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کے مکاتیب کا ایک مجموعہ بھی انھون نے ترتیب دیکر چھپوایا ہے۔

طرز تحریر مولانا کی عبارت نہایت صاف سادہ زبردست اور زوردار ہوتی ہے۔ مگر اسمین آزاد کی سی شوخی اور رنگینی اور مولانا نذیر احمد کی سی نازک اور لطیف ظرافت نہین ہوتی۔ حالی گو کہ صاحب طرز نہین مگر بہترین نثار ہین۔ وہ اسلوب بیان سے زیادہ نفس مطلب کا خیال رکھتے ہین صنایع بدایع کی نہ انکے یہان کثرت ہے اور نہ انکا بیجا استعمال وہ کرتے ہین محض لفاظی اور عبارت آرائی وہ کبھی نہین کرتے۔ اور عبارت کی ظاہری آرائش سے وہ قطعاً احتراز کرتے ہین اسیوجہ سے انکی عبارت بہت سلجھی ہوئی اور صاف ستھری ہوتی ہے۔ گو کہ وہ بلند پروازی نہین کرتے مگر زور بیان اور فصاحت سے انکی عبارت مالامال ہوتی ہے۔ جدید نثر اردو نے انکو اپنا بہت بڑا حامی اور مددگار پایا اور انھون نے مرزا غالب اور سرسید کے طرز تحریر کو زندہ رکھا۔ انکی تصانیف آئندہ نسلون کے واسطے بہترین نمونہ سمجھی جاسکتی ہین۔

مولانا نذیر احمد ۱۸۳۱ء لغایت ۱۹۱۲ء شمس العلما خان بہادر مولانا نذیر احمد موضع راہر ضلع بجنور مین ۱۸۳۱ء مین پیدا ہوئے انکا خاندان علم و فضل کے لئے مشہور تھا۔ والد کا نام مولوی سعادت علی تھا۔ اور انھین سے انھون نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اسکے بعد مولوی نصراللہ ڈپٹی کلکٹر بجنور سے بھی کچھ پڑھا۔ اور دلی مین آکر ۱۸۴۵ء مین مولوی عبدالخالق کے شاگرد ہوے جنکی پوتی سے انھون نے عقد بھی کیا۔ دلی کالج کے مشہور پروفیسر عربی مولوی مملوک علی کے اصرار سے وہ دلی کالج مین داخل ہوئے اور وہان ادب عربی اور فلسفہ و ریاضی وغیرہ مین تکمیل حاصل کی۔ کالج کے پرنسپل مسٹر ٹیلر کی ترغیب سے انگریزی بھی شروع کی

مگر والد کی مخالفت کیوجہ سے چھوڑنا پڑی - اس زمانہ مین اُنکے ہم سبق حالی آزاد منشی کریم الدین - مولوی ذکاءاللہ اور پیارے لال آشوب تھے - مثل اس زمانہ کے اور بڑے لوگون کے مولوی نذیر احمد نے بھی زندگی کی ابتدا ایک چھوٹی سی ملازمت سے کی یعنے وہ پنجاب مین کسی مقام مین پچیس روپیہ ماہوار کے ٹیچر مقرر ہو گئے - تھوڑے دنون کے بعد ڈپٹی انسپکٹر مدارس بمشاہرہ سو روپیہ ماہوار مقرر ہوئے - غدر کے زمانہ مین اُنھون نے کسی میم کی جان بچائی تھی جس خدمت کے صلے مین ایک تمغہ اور کچھ زر نقد سرکار سے ملا اور انسپکٹر مدارس کے درجہ پر ترقی ہوئی - اسکے بعد اُنکا تبادلہ الہ آباد مین ہو گیا اور یہین انہون نے تھوڑی سی انگریزی سیکھ لی - کیونکہ انکو نہایت شرم و حجاب معلوم ہوتا تھا کہ جو زبان حاکم و محکوم کے درمیان تبادلہ خیال کا ذریعہ ہے اُس سے وہ محروم ہین - اپنی طباعی اور ذہانت سے اُنھون نے چھ مہینہ کے اندر انگریزی مین کافی مہارت پیدا کر لی اور بعد کو کتب بینی سے وہ اس قابل ہو گئے کہ ۱۸۶۱ء مین انڈین پینل کوڈ کے ترجمہ کی خدمت پر منجملہ دیگر اشخاص کے وہ بھی مقرر ہوئے - انکا ترجمہ (مجموعہ تعزیرات ہند) ایسا مقبول ہوا اور پسند آیا کہ اسکے بعد وہ تحصیلدار اور پھر افسر بندوبست ہو گئے - اُنہون نے نجوم کی بھی ایک کتاب کا ترجمہ کیا تھا جسکو اُس زمانہ کے رزیڈنٹ کشمیر نے لکھا تھا - اور مبلغ ایکہزار روپیہ انعام پایا تھا اُنکی قابلیت کا شہرہ سنکر سر سالار جنگ اوّل نے اُنکی خدمات گورنمنٹ سے اپنے یہان منتقل کرا لین اور افسر بندوبست بمشاہرہ آٹھ سو روپیہ ماہوار مقرر کیا - اسی عرصہ مین اُنہون نے قرآن شریف بھی حفظ کیا - اور بعد کو سر سالار جنگ کے ایما سے انگریزی ملازمت چھوڑ کر حضور نظام کی مستقل ملازمت اختیار کر لی جسمین وہ ترقی کرتے کرتے اعلی ممبر مال بمشاہرہ سترہ سو روپیہ مقرر ہوئے اور اُنکے بیٹے اور اعزا اکو معقول جگہین اچھے اچھے عہدون پر دی گیئن - سر سالار جنگ کے حکم سے انہون نے ایک نصاب تعلیم تیار کیا تھا - اور سر سالار جنگ کے صاحبزادہ نواب لائق علی خان اُنکے شاگرد تھے - ایک عرصہ تک اپنے عہدہ کے فرائض منصبی انجام دیکر ملازمت سے دست کش ہو گئے اور بقیہ عمر اپنے وطن مالوف دہلی مین یاد الٰہی اور تصنیف و تالیف کے مشغلے مین بسر کی ۱۹۱۲ء مین ایک نہایت کامیاب مصروف زندگی کے بعد اس جہان فانی سے عالم جاودانی کی طرف رحلت کی اور ملک و قوم کو اپنا سوگوار چھوڑ گئے -

مولانا موصوف سرسید کی اُس جماعت کے ایک معزز فرو تھے کہ جنھون نے اپنی تصنیف و تالیف اور اپنے لکچرون کے ذریعہ سے اپنے ہم مذہبونکی ترقی مین بڑی اعانت کی تھی۔

تصانیف — مولانا کی تصانیف بہ کثرت ہین جنمین سے حسب ذیل بہت مشہور ہین (از قسم ناول و حکایات) مراۃ العروس۔ بنات النعش۔ توبۃ النصوح۔ ابن الوقت۔ محصنات۔ ایامیٰ۔ رویائے صادقہ۔ منتخب الحکایات۔ (کتب مذہبی و اخلاقی) ترجمہ قرآن شریف۔ ادعیۃ القرآن۔ دہ سورہ۔ الحقوق والفرایض۔ مطالب القرآن۔ امہات الامہ۔ اجتہاد۔ (متفرق کتابین) صرف صغیر۔ رسم الخط۔ موعظہ حسنہ۔ افسانۂ غدر۔ نصاب خسرو۔ چند پند۔ مبادی الحکمۃ۔ مائنغیک فی الصرف۔ مجموعہ لیکچر۔ اور انگریزی قانونی کتابون کے ترجمے۔ مثلاً تعزیرات ہند قانون شہادت وغیرہ۔

مولانا کثیر التصنیف اور سریع التصنیف دونون تھے اُنکی اکثر کتابین مثلاً مانغیک فی الصرف مبادی الحکمۃ۔ منتخب الحکایات۔ رسم الخط وغیرہ۔ اسکول کے طلباء کے واسطے لکھی گیئین اور واقعی اُنکے واسطے بہت مفید ہین۔ سرکاری ایکٹون کے ترجمے گورنمنٹ کے حکم سے کیے گئے۔ مجموعہ تعزیرات ہند یعنی پنل کوڈ کے ترجمہ کو انکا ایک کارنامہ سمجھنا چاہیے۔ اس مشہور قانون کے ترجمے کے واسطے پہلے مولوی کریم بخش اور مولوی عظمت اللہ مقرر ہوئے تھے پھر سر ولیم میور لفٹنٹ گورنر کے حکم سے مولوی نذیر احمد اُنکے کام کی نگرانی اور نظر ثانی کے لئے مقرر ہوئے۔ اور اُنھون نے بڑی محنت و جانفشانی اور بڑی قابلیت سے یہ کام انجام دیا۔ اُنکے تمام قانونی تراجم نہایت عمدہ اور صحیح ہین جسمین اکثر جگہ نہایت مناسب اور ٹھیک الفاظ مشکل الفاظ انگریزی کے لئے اردو مین وضع کیے گئے ہین جو اب زبان زد خلایق ہوگئے ہین قانون شہادت یعنی ایوی ڈنس ایکٹ کا ترجمہ لیرون کی کتاب سے کیا گیا ہے۔ "افسانۂ غدر" ایڈورڈ صاحب کی ایک کتاب کا ترجمہ ہے جسمین انھون نے غدر ۱۸۵۷ء کے بعض دلچسپ سوانحات کو قلمبند کیا ہے۔ اِن کے علاوہ سات آٹھ چھوٹی چھوٹی مختصر کتابین اور رسایل ہین جو قیام حیدر آباد کے زمانہ مین وہان کے عمال کے لئے بطور ہدایت نامہ لکھے گئے تھے مگر سب چھپے نہین۔

کتب مناظرہ و متعلق مذہب

اُس زمانے مین مسلمانون اور عیسائی واعظون سے جنمین سے بعض دین اسلام کو چھوڑ کر مسیحی ہوگئے تھے اکثر مباحثے رہتے تھے اور بڑے بڑے لوگ مثلاً سر سید مولوی چراغ علی۔ نواب محسن الملک وغیرہ اُنمین بڑی دلچسپی لیتے تھے۔ ایک عیسائی مبلغ احمد شاہ نامی نے امہات المومنین کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جسمین پیغمبر اسلام کی ازواج مطہرات کی نسبت کچھ بیجا الزامات قائم کئے تھے۔ مولوی نذیر احمد نے اسکے جواب مین "امہات الامۃ" لکھی جسکی بعض لوگون نے تو بہت قدر کی مگر بعض نے سخت بُرا سمجھا اور اُسکے بارہ مین اتنا اختلاف بڑھا کہ اُسکی جلدین آخر مین جلا دی گئین اور وہ دوبارہ بعد ترمیم چھاپی گئی۔ مولانا کا سب سے بڑا کارنامہ اُنکا اردو ترجمہ قرآن شریف ہے جو نہایت آسان اور بامحاورہ زبان مین کیا گیا ہے۔ اس سے اُن لوگون کو بڑا نفع پہونچا جو قرآن شریف کو ازبر بلا معنے سمجھے یاد کر لیا کرتے تھے۔ اس سے پیشتر جسقدر ترجمے قرآن شریف کے ہوئے تھے اُنکی زبان قدیم تھی اکثر الفاظ متروک ہو گئے تھے اور ترجمہ تحت اللفظ تھا اسی وجہ سے مقبول عام نہ تھا۔ مولانا نے چار عالمونکی مدد سے پورا ترجمہ نہایت محنت و جانکاہی سے تین برس کے عرصہ مین پورا کر دیا۔ مگر اسمین بھی اتنا نقص ضرور ہے کہ بعض جگہ ترجمہ کی متانت قائم نرہی اور اصل الفاظ کا مطلب اردو الفاظ و محاورات کے بیجا تصرف سے جاتا رہتا ہے اور نیز یہ کہ کثرت تشریح اور اضافہ تمثیلات کی وجہ سے ترجمہ ترجمہ نہین رہتا بلکہ ایک تفسیر کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ آخر عمر مین انہون نے ادعیۃ القرآن دو سورۃ اور الحقوق والفرائض تصنیف کین جنمین سے آخر الذکر ایک نہایت جامع اور مکمل کتاب ہے۔ اُنکی آخری تصنیف جو نامکمل رہ گئی "مطالب القرآن" ہے یہ اب چھپ گئی ہے۔ مولانا کے پاس ایک مطبع بھی تھا جسکا نام شمسی پریس تھا اسی مین اُنکی تصانیف چھپا کرتی تھین۔

اخلاقی ناول

سب سے پہلی کتاب جس سے مولانا کی شہرت کو ترقی ہوئی اُنکا ناول مراۃ العروس ہے جو ایک معزز مسلمان خاندان کی پرائیویٹ زندگی کا ایک قصہ ہے۔ اسکی تصنیف اُسوقت ہوئی تھی جب مولانا ڈپٹی کلکٹر تھے۔ قصہ کا ماحصل صرف اسقدر ہے کہ ایک جاہل بے پڑھی لکھی لڑکی ایک شریف گھرانے کی تعلیم کے ذریعہ سے کیونکر بدل گئی۔ یہ کتاب مسلمانون اور ہندوون دونون مین

مقبول ہے اور عورتین اسکو بہت ذوق و شوق سے پڑھتی ہین - اسکی زبان نہایت سلیس اور بامحاورہ ہے اور
تعجب معلوم ہوتا ہے کہ مصنف عورتون کی خاص زبان اسقدر صحیح اور بامحاورہ لکھنے پر کیونکر قادر ہوے
اس کتاب کو پبلک مین بھی بہت مقبولیت حاصل ہوئی اور گورنمنٹ نے بھی ایکہزار جلدین خریدکین اور
ایکہزار روپیہ لائق مصنف کو انعام دیا - اس کا ترجمہ ہندوستان کی اکثر دیسی زبانون مین ہوگیا ہے
دوسری کتاب "بنات النعش" ہے جو مرأة العروس کے بعد اوراُسی طرز پر عورتون کی تعلیم کی غرض سے لکھی
گئی - اسمین بھی نہایت مفید اور دلچسپ باتین عام معلومات اور مبادی سائنس کے متعلق اکثر جگہ مکالمہ کی
صورت مین درج ہین - اسکی بھی پبلک اور گورنمنٹ دونون نے بڑی قدر کی - اسکے بعد "توبۃ النصوح"
کا نمبر ہے جو مولانا کا سب سے بہترین ناول سمجھا جاتا ہے - اسمین مختصر طور پر انھون نے قصہ کے طریق
پر یہ دکھلایا ہے کہ ایک فاسق و فاجر شخص جسکا نام نصوح ہے سخت ہیضہ مین مبتلا ہوجاتا ہے اور ایک
خواب دیکھتا ہے، اسکے بعد بیدار ہوکر خوف خداوندی سے لرزجاتا ہے اور پابند شرع ہوکر تمام منہیات
سے توبہ کرلیتا ہے - اسکی بیوی اور بعض اوراعزا بھی اُسکے ہمخیال ہوجاتے ہین مگر اُسکا بڑا لڑکا اُسکی راہ پر
نہین آتا اور مصائب مین مبتلا ہوتا ہے - اسمین مولانا نے ضمناً اولاد کی بُری اُٹھان کے بُرے نتیجے
اور کمسنی مین اُنکی سخت گیری اور نگرانی کی اہمیّت کو بڑی خوبی سے دکھلایا ہے - "ابن الوقت" مین ایک
ہندوستانی شخص کا حال لکھا گیا ہے جو غدر کے زمانے مین اپنی خدمات کے صلے مین ایک بڑے عہدہ
تک پہونچ جاتا ہے - اور انگریزون کے ساتھ میل جول کی وجہ سے انہین کی طرز معاشرت کو اختیار
کرلیتا ہے اور یورپین سوسائٹی مین شامل ہوکر اپنے ہندوستانی عزیزون اور دوستون کو نفرت اور حقارت
کی نظر سے دیکھنے لگتا ہے - پھر بعد کو جب اُسکے انگریز دوست سب چلے جاتے ہین تو وہ کدھر ہی کا نہین
رہتا اور آخر کار بڑی دقت سے پھر اپنی ہی قوم و جماعت کے لوگون مین ملنے کی کوشش کرتا ہے -
اس کتاب کی نسبت بعض لوگون کا یہ بھی خیال ہے کہ اسمین مصنف نے خود اپنی ہی سرگزشت ایک افسانہ
کے پیرایہ مین بیان کی ہے - "ایامیٰ" مین اُنھون نے بیوہ عورتون کی شادی پر بہت زور دیا ہے
اور ہندوستان مین اُنکی افسوسناک حالت کو بیان کرکے شرعاً ازدواج ثانی کے جواز کو ثابت کیا ہے -

محصنات" مین تعدد ازدواج کا نقصان دکھایا ہے۔ "رویائے صادقہ" مین اہل اسلام کے کچھ مذہبی عقاید کی بحث ایک دلچسپ مکالمہ کی صورت مین کی گئی ہے۔ مذکورہ بالا سب کتابین نہایت اخلاق آموز اور نصیحت خیز ہین۔

لیکچر اور تقریرین

ملازمت سے کنارہ کشی کے بعد مولانا نے اپنی تقرین اور لیکچر شروع کر دئے تھے ہمارے خیال مین آپکا پہلا پبلک لیکچر ۱۸۸۸ء مین ہوا تہا۔ وہ انجمن حمایت الاسلام لاہور اور مدرسہ طبیہ دہلی اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ جلسون مین پر زور تقریرین کرتے تھے۔ سرسید مرحوم کے اثر سے وہ ہر اسلامی اہم اجتماع مین شریک ہوتے تھے اور سامعین کو اپنی پرمغز تقریر دن سے محظوظ کرتے تھے۔ وہ نہایت خوش بیان اور طلیق اللسان مقرر تھے اور یہ بھی انکا قاعدہ تہا کہ اپنی وسیع معلومات اور دلچسپ حکایات اور علی الخصوص اپنے ظرافت آمیز طرز بیان سے سامعین کو بہت محظوظ کرتے تھے انکا مجموعۂ لیکچر چھپ گیا ہے اور مختلف انواع مضامین پر مشتمل ہے اسمین عقاید مذہبی تعلیم و حریت نسوان وغیرہ پر نہایت مبسوط بحث کی گئی ہے۔

بحیثیت شاعر کے

آخر عمر مین شاعری نے بھی طبیعت کو گدگدایا تہا اور شعر بھی کہہ لیتے تھے کبھی کبھی اپنے لکچرون کو اپنے اشعار سے دلچسپ بنانے کی کوشش کرتے تھے۔ مگر ہم نہایت ادب سے اس بات کے کہنے پر مجبور ہین کہ وہ محض تبرک ہی تبرک ہوتے تھے اور شعریت اُسمین مطلق نہ تھی مدریجًا کچھ کلام مین ترقی ضرور ہوئی مگر اصلی جذبات شعریہ سے وہ ہمیشہ دور رہے۔ اُن کا منظوم کلام چھپ گیا ہے اور مجموعہ "بینظیر" کے نام سے موسوم ہے مگر اس سے انکی قابلیت مین کسی قسم کا اضافہ نہین ہوتا۔

اخلاق و عادات

مولانا نہایت سادہ مزاج مہذب اور بہت ظریف الطبع تھے زندگی نہایت سادگی بلکہ عسرت سے بسر کرتے تھے اسی وجہ سے حجز رس مشہور تھے۔ مگر پھر بھی بعض بعض غریب طلبا کی امداد بہت فراخدلی سے کرتے تھے۔ آخر عمر مین روپیہ جمع کرنے کے شوق مین تجارت شروع کر دی تھی جس سے انکی آمدنی مین بہت کچھ اضافہ ہوگیا تہا تعلیم و تعلم کے وہ ایسے شایق تھے کہ مرتے دم تک یہی اشتغال جاری رکھے تھے علیگڈھ کالج کے وہ پرانے سرپرست اور معاون تھے ۱۸۹۷ء مین خطاب

خان بہادر مولوی ذکاءاللہ خان

مولوی سید احمد (دهلوی) مولف فرهنگ آصفیه

شمس العلماء ۱۹۰۲ء مین یونیورسٹی آف اڈنبرا کی طرف سے ال ایل ڈی کی اعزازی ڈگری۔ اور ۱۹۱۰ء مین پنجاب یونیورسٹی کی ڈی۔ او ایل یعنے ڈاکٹر آف اورنٹیل لرننگ (عالم علوم مشرقیہ) کی ڈگری حاصل کی تھی۔ اور نواب لفٹننٹ گورنر پنجاب نے جو بحیثیت چانسلر جلسہ کانوکیشن کے صدر تھے ڈگری دیتے وقت اُنکے علم وفضل اور طباعی و ذہانت کی بہت تعریف کی تھی۔

طرز تحریر

مولانا کی عبارت بہت آسان اور صاف و سادہ ہوتی ہے۔ البتہ کبھی کبھی بڑے بڑے عربی و فارسی کے غیر مانوس الفاظ آتے ہین۔ اور کہین رنگین عبارت اور صنایع بدایع سے اور بعض مواقع پر انگریزی الفاظ سے بھی کام لیتے ہین۔ جنسے ہمارے نزدیک عبارت مین بجائے چستی اور خوبصورتی کے بھونڈاپن اور خرابی پیدا ہو جاتی ہے آزاد کی سی لطافت اور شیرینی اُنکے یہان نہین ہے البتہ خاص چیز جو انکی نثر کا جوہر اعلے ہے وہ ان کا ظریفانہ رنگ ہے جو اُن کے ناول لکچر اور مضامین سب مین بدرجہ اتم موجود ہے اُنکی ظرافت بہت ہلکی اور لطیف ہوتی ہے اور اسمین پھکڑپن مطلق نہین ہوتا مولانا اپنے تمام معاصرین پر بلحاظ شہرت سبقت لیگئے ہین۔ یہ اس لئے کہ قوانین کے تراجم سے وہ گورنمنٹ اور پبلک مین روشناس ہوے۔ قرآن شریف کے ترجمے سے مسلمانون مین اُنکی شہرت ہوئی۔ اور ناولون وغیرہ کیوجہ سے ہر گھر مین اُنکا نام پہونچ گیا۔

مولوی ذکاء اللہ
۱۸۳۲ء تا ۱۹۱۰ء

شمس العلماء مولوی محمد ذکاء اللہ قدیم دلی کالج کے مشہور شاگردونمین تھے اور خود اُنھون نے اپنی زندگی بچونکی تعلیم و ترقی کے لئے وقف کر دی تھی ۱۸۳۲ء مین دلی مین پیدا ہوئے والد کا نام حافظ ثناء اللہ تھا اور مرزا کوچک سلطان بہادر شاہ کے سب سے چھوٹے بیٹے کے اتالیق تھے۔ مولوی ذکاء اللہ بارہ برس کی عمر مین کالج مین داخل ہوئے جہان مولوی نذیر احمد اور مولوی محمد حسین آزاد بھی پڑھتے تھے لہٰذا ان تینون مین عمر بھر رابطہ اتحاد و محبت قایم رہا اور تینون آدمی شمس العلماء کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ جب مولوی ذکاء اللہ کالج سے پڑھکر نکلے تو پھر اُسی کالج مین ریاضی کی تعلیم پر مقرر ہوئے جسکے بعد آگرہ کالج مین فارسی و اُردو کے پروفیسر ہو گئے۔ سات آٹھ برس تک تعلیمی لائن مین رہ کر ۱۸۵۵ء مین ڈپٹی انسپکٹر مدارس بمقام بلند شہر و

مراد آباد ہوگئے جس جگہ پر تقریباً گیارہ سال تک رہے سنہ ۱۸۶۹ء مین دلی نارمل اسکول کے مدرس اعلیٰ ہوئے اور سنہ ۱۸۷۶ء مین اورنٹیل کالج لاہور کی پروفیسری کے واسطے نامزد ہوئے۔ مگر قبل اسکے کہ اس نئے عہدہ کا چارج لین میور سنٹرل کالج الہ آباد مین عربی و فارسی کی پروفیسری اُنکو ملگئی جہانسے ۲۶ برس کی ملازمت کے بعد پنشن پائی اور تقریباً سہ بیس برس پنشن سے بہرہ یاب ہوکر سنہ ۱۹۱۰ء مین انتقال کیا۔

تصانیف تصانیف کثرت سے ہین۔ اور متعدد مضامین پر مشتمل ہین۔ مثلاً ریاضی تاریخ جغرافیہ۔ ادب اخلاق۔ طبعیات۔ کیمیا۔ سیاسیات وغیرہ۔ مطبوعہ وغیر مطبوعہ کتابون کی تعداد تقریباً ڈیڑھ سو سے کم نہ ہوگی۔ تصانیف کی کیفیت یہ ہے کہ زیادہ تر اسکولون کے طلبار کے لئے لکھی گئی ہین۔ لہذا رنگینی و عبارت آرائی اور ایک ادبی شان انمین بالکل نہین ہے۔ مولوی صاحب بحیثیت ایک ریاضی دان اور مترجم اور مورخ کے مشہور ہین۔ مگر ریاضی مین اُنکا پایہ بلند نہ تھا اور انکی کوشش صرف انگریزی کتابونکے ترجمے اور انکی شرحین لکھنے تک محدود رہی۔ البتہ تاریخ مین اُنھون نے ایک کارنمایان ضرور کیا۔ انکی تاریخ ہندوستان دس جلدون کی ایک ضخیم کتاب اور قابل قدر تصنیف ہے گو اسمین ریسرچ سے کم کام لیا گیا ہے اور عامۃ الناس کے لئے ہے۔ مہمات عظیم مین اُن بڑی لڑائیون کا ذکر ہے جو انگلستان اور دوسرے ملکون مین کوین وکٹوریہ کے عہد مین ہوئی تھین۔ انکی ایک اور بھی عمدہ تصنیف ہے جسمین کوئن وکٹوریہ کے عہد کے حالات اور ترقیان درج ہین جو تین جلدون مین ہی "آئین قیصری" مین کوئن وکٹوریہ کے عہد کی انتظامی تبدیلیان جو ہندوستان مین ہوئین اور فرہنگ فرنگ مین یورپین شائستگی کی تاریخ اور کوئن وکٹوریہ اور اُنکے شوہر کی زندگی کے حالات درج ہین۔ مولوی سمیع اللہ خان بہادر سی۔ ایم۔ جی کی سوانحعمری بھی اُنکی تصنیف ہے آخر عمر مین ایک تاریخ اسلام لکھنے مین مشغول تھے مگر وہ ناتمام رہی۔ ان تمام کتابون کا طرز تحریر نہایت صاف سلیس اور عبارت آرائی اور تصنع سے بالکل پاک ہے اور وہ سب اسکولون مین پڑھانے کے قابل ہین۔

مولوی صاحب مین ایک بڑی صفت یہ تھی کہ وہ اکثر مشہور جرائد اور رسالون کے باقاعدہ مضمون نگار بھی تھے مثلاً تہذیب الاخلاق سائنٹفک گزٹ علیگڈھ۔ رسالہ حسن۔ ادیب فیروز آباد۔

مخزن، زمانہ، خاتون وغیرہ انکی کثیر التصانیفی پر مولانا حالی نے یہ پھبتی کہی تھی کہ مولوی ذکاء اللہ کا دماغ ایک بنیئے کی دوکان ہے جسمین ہر قسم کی جنس موجود رہتی ہے۔ ممکن ہے اسمین یہی لطیف اشارہ ہو کہ بنیئے کے یہان عمدہ اور قیمتی چیزین کہان ملتی ہین۔

گورنمنٹ نے انکے علمی خدمات کی بڑی قدر کی تھی ترقی تعلیم نسوان کی کوششون کے صلےمین انکو ایک خلعت عطا ہوا اور دیگر علمی خدمات کے واسطے پندرہ سو روپیہ کا انعام اور خطاب خان بہادر و شمس العلماء عنایت ہوا۔ مولوی صاحب سید مرحوم کے گہرے دوستون مین تھے اور انکے تمام تعلیمی کامون مین ہاتھ بٹاتے تھے

مولوی سید احمد دہلوی مولوی سید احمد دہلوی اپنی مشہور و معروف اُردو لغت "فرہنگ آصفیہ" کے مصنف ہونے کی حیثیت سے اُردو دان پبلک مین ایک خاص شہرت رکھتے ہین۔ دلّی مین ۱۸۴۶ء مین پیدا ہوئے باپ کا نام حافظ سید عبد الرحمٰن تھا جو مستند سادات سے تھے اور ایک بڑے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔

مولوی صاحب کی ابتدائی تعلیم رواج زمانہ کیموافق دیسی مکتبونمین ہوئی جب کچھ حرف شناس ہوگئے تو سرکاری اسکول اور نارمل اسکول مین تحصیل علم کیا۔ اسکے بعد اپنی فطری طباعی اور مشاہیر اہل علم کی صحبت سے بہت کچھ فائدہ اٹھایا۔ بچپن ہی سے تصنیف و تالیف کا شوق تھا۔ چنانچہ طالب علمی ہی کے زمانہ مین ایک چھوٹی سی فارسی نظم "طفلی نامہ" کے نام سے اور ایک انشائی کتاب "تقویۃ الصبیان" لکھ ڈالی ۱۸۶۹ء مین انکی کتاب "کنز الفوائد" نکلی جسپر سرکار سے دوسو روپیہ انعام ملا ۱۸۶۸ء سے انہون نے اپنی جلیل القدر تصنیف فرہنگ آصفیہ کے واسطے مسالہ جمع کرنا شروع کر دیا تھا ۱۸۷۱ء مین انکی دوسری کتاب "وقایع درونیہ" شایع ہوئی جسپر انکو مبلغ ڈیڑھ سو روپیہ انعام ملے۔ اس رقم سے انکی فرہنگ آصفیہ کی تیاری مین کچھ آسانیان ہوگئین۔ اس اثنا مین ڈاکٹر فیلن صاحب نے جو صوبہ بہار مین انسپکٹر مدارس تھے انکو بلا بھیجا اور اپنی اردو اور انگریزی کی لغت کی تیاری مین اُنسے مدد لینا چاہی مولوی صاحب راضی ہوگئے اور فیلن کی ڈکشنری سات برس کی محنت شاقہ کے بعد ختم کی مگر اسکے ساتھ ہی ساتھ اپنا کام بھی کرتے رہے ۱۸۸۰ء مین انہون نے مہاراجہ الور کا ایک سفرنامہ مرتب کیا۔ اسکے بعد گورنمنٹ

پنجاب کے سرکاری بکڈپو مین نائب مترجم کی حیثیت سے مقرر ہوے - فیلن صاحب کی ڈکشنری کی تیاری کے زمانہ مین اُنھون نے اپنی کتاب ہادی النسا، شایع کی جو بہت مقبول ہوئی - اسکے بعد انکی حسب ذیل تصنیفات شایع ہوتی رہین جو اپنے طرز مین سب نہایت عمدہ اور مفید ہین "تکمیل الکلام" پیشہ ورون کے اصطلاحات مین "تحقیق الکلام" اردو زبان کے نکات کے متعلق "رس کہان" جس مین کچھ ہندی دوہے اور پہیلیان اور گیت ہین - "ریت کہان" اہل ہنود کے رسم و رواج کے متعلق "ناری کتھا" ہندو عورتون کی بولی - قواعد اُردو - تعلیم نسوان اور عورتون کے متعلق انکی حسب ذیل کتابین بہت مشہور ہین - لغات النسا، تحریر النسا، (لڑکیون کی ریڈر) "بی راحت زمانی کا قصہ" عورتون کو وقت کی قدر و قیمت سکھاتا ہے "اخلاق النسا" بچون کی پرورش اور تربیت کے متعلق "علم النسا" زبان اور اسکی ترقی کے متعلق - "رسوم دہلی" جسمین دہلی کے مروجہ رسوم و رواج کا ذکر ہے - غیر مطبوعہ کتابون مین سیر شملہ جسمین شملہ کی تاریخ بھی داخل ہے "اُردو ضرب الامثال" - "روزمرہ دہلی" - "رسوم اہل ہندوان دہلی" - انمین سے بعض اب شایع ہو رہی ہین -

فرہنگ آصفیہ اس کتاب کی تیاری اور طباعت کی دقتون اور پریشانیون کے متعلق مصنف نے دیباچہ مین بہت طول دیکر لکھا ہے جسکا ماحصل یہ ہے کہ مولوی صاحب کو اتنی بڑی تصنیف کے چھاپنے کے لئے ایک زر کثیر کی ضرورت تھی جسکی فراہمی سخت مشکل تھی - بالآخر خوش نصیبی سے ۱۸۸۸ء مین سر آسمان جاہ بہادر شملہ آئے جہان مولوی صاحب بھی کسی اسکول مین ملازم تھے - مولوی صاحب نے وزیر اعظم حیدرآباد کی خدمت مین حضوری حاصل کر کے اپنا مسودہ بطور نذر کے گزرانا جو سید علی بلگرامی کے معاینہ کے بعد منظور کر لیا گیا اور انعام کا وعدہ کیا گیا - جب ۱۸۹۲ء مین کتاب ختم ہوئی تو اس کا نام فرہنگ آصفیہ رکھا گیا - اور اسکے سلسلہ مین مصنف صاحب کو حیدرآباد متعدد دفعہ جانا پڑا - آخر کار وہ اپنی امید مین کامیاب ہوئے اور پچاس روپیہ ماہوار بطور پنشن اور پانچہزار انعام دیا گیا اسیطرح گورنمنٹ پنجاب نے بھی اُسکی قدر افزائی مین بہت کچھ حصہ لیا - فی الحقیقت یہ کتاب لغات اردو کی کتب مین ایک خاص درجہ امتیاز رکھتی ہے اور ایک بڑی تحقیقات اور جانکاہی کی یادگار ہے -

---

شبلی نعمانی ۱۸۵۷ء تا ۱۹۱۴ء
تعلیم اور ابتدائی مشاغل،

مولانا شبلی نعمانی اپنے زمانہ کے مشہور ترین و قابل ترین بزرگون مین تھے نہایت کثیر الاشواق اور جامع الاذواق تھے۔ اگر کوئی ایک شخص ایک شاعر فلسفی مورخ ناقد۔ ماہر تعلیم۔ معلّم۔ واعظ۔ رفارمر۔ جریدہ نگار۔ فقیہ۔ محدّث۔ سب کچھ ہوسکتا ہے تو وہ مولانا ہی کی ذات تھی کہ اُنھون نے ان سب کمالات مختلفہ اور علوم و فنون متنوعہ کا اپنی ذات مین اجتماع کرلیا تھا اور اس شعر کے صحیح مصداق بنگئے تھے ؎ وَلَیسَ لِلّٰہِ بِمُستَنکَرٍ اَن یَجمَعَ العَالَمَ فِی الوَاحِدِ مگر ان مین ادب تاریخ اور ریسرچ مین اُنکا رتبہ بہت بلند تھا۔ ۱۸۵۷ء مین موضع بندول ضلع اعظم گڈھ مین پیدا ہوئے اور اپنے والد شیخ حبیب اللہ (جو وکیل تھے) کے سایۂ عاطفت مین تربیت پائی۔ ابتدائی کتابین مولوی شکر اللہ نامی ایک شخص سے پڑہین اور جب عربی و فارسی مین کچھ دستگاہ ہوگئی تو مولانا فاروق چریا کوٹی کے سامنے جو اُسوقت غازی پور مین ہیڈ مولوی تھے اور فلسفہ و ریاضی و ادب وغیرہ کے استاد مانے جاتے تھے زانوے شاگردی تہ کیا انہین سے اُنھون نے عربی ادب اور معقولات پڑہین تھین۔ پھر جذبہ شوق نے اُبھارا اور تلاش علم کیواسطے وہ گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ اعظم گڑھ سے رام پور پہونچے جہان اُستاد زمانہ مولوی عبد الحق خیر آبادی سے معقول اور مولوی ارشاد حسین صاحب محدث سے حدیث و فقہ کے اسباق لئے۔ لاہور مین ادیب کامل مولوی فیض الحسن صاحب سے حماسہ پڑھا وہانسے سہارنپور آئے اور تکمیل حدیث مولوی احمد علی صاحب سے کی ۱۸۷۶ء مین جبکہ اُنکی عمر صرف ۱۹ سال کی تھی عازم حج بیت اللہ ہوئے اور راستہ مین وفور شوق اور جوش عقیدت سے ایک پُر درد قصیدہ فارسی کہا۔ بعد فراغت حج اعظم گڑھ واپس آئے اور سلسلہ درس و تدریس جاری رکھا شوق کتب بینی کا یہ حال تھا کہ کتب فروشون کی دکانپر بیٹھکر اکثر کتابین دیکھا کرتے تھے[۵]۔ اس زمانہ مین رد وہابیہ مین

---

[۵] مولانا میرے حال پر اک خاص نظر عنایت و شفقت رکھتے تھے مجھکو اُن کے اس استغراق کتب بینی کا ایک چشم دید واقعہ یاد ہے جس کا ذکر اس موقع پر دلچسپی سے خالی نہوگا منشی نثار حسین مرحوم اڈیٹر پیام یار مولانا کے ایک بے تکلف دوست تھے انکی چوک مین عطر کی دوکان تھی۔ جب مولانا لکھنؤ مین قیام کرتے تو سبزی منڈی مین خواجہ عزیز الدین صاحب عزیز کے مکان پر فروکش ہوتے اور سہ پہر کو منشی نثار حسین کی دوکان پر جو قریب ہی تھی آ بیٹھتے تھے۔ یہان اکثر ارباب کمال

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۶ پر ملاحظہ ہو)

بھی کچھ رسالے لکھے جس مین "اسکات المعتدی" جو عربی مین ہے زیادہ مشہور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انھون نے امتحان وکالت بھی پاس کیا تھا اور اعظم گڑھ اور بستی مین کچھ دنون وکالت بھی کی تھی در آخر کار جب اس پیشہ سے جی بھر گیا تو سرکاری ملازمت بھی چند دنون کی تھی اور کہین کے امین ہو گئے تھے چند دنون کے بعد یہ ملازمت چھوڑ دی اور اب ہمہ تن خدمت علم کیطرف متوجہ ہو گئے۔ ۱۸۸۲ء مین اپنے چھوٹے بھائی مہدی سے ملنے کے لئے جو علیگڈھ کالج مین پڑھتے تھے علیگڈھ جانے کا اتفاق ہوا یہان بتوسط خان بہادر محمد کریم ڈپٹی کلکٹر مولوی سمیع اللہ خان سے ملے جنکے ذریعہ سے سرسید مرحوم کی خدمت مین باریاب ہوئے اور ایک درخواست فارسی پروفیسری کی جگہ کے واسطے جو اُسوقت خالی تھی گذرانی۔ جو منظور ہو گئی اور کچھ دنون شہر مین قیام کے بعد خوش نصیبی سے سید صاحب کے بنگلے کے قریب رہنے کو جگہ ملگئی۔

قیام علیگڈھ علیگڈہ کالج کی اُس زمانہ کی فضا اس گل سرسید کی شگفتگی کے لئے بہت مفید ہوئی۔ ارباب کمال مثلاً سرسید اور مولانا حالی وغیرہ کی صحبت اور سرسید کے کتبخانے کی قربت سے مولانا نے بہت کچھ فائدہ اُٹھایا۔ علیگڈھ کے مشہور اسلام دوست پروفیسر آرنلڈ سے ملاقات ہو گئی مولانا نے اُنسے فرنچ سیکھی اور اُنکو عربی سکھائی جسطرح سے مولانا نے نکات تنقید بطرز اہل مغرب آرنلڈ صاحب

کا مجمع ہوتا تھا جس مین مولوی عبدالحلیم شرر۔ شوق قدوائی۔ لڈن صاحب خورشید۔ ابو صاحب جلیس۔ سید شہنشاہ حسین رضوی وکیل مرحوم اور اور بے تکلف احباب جمع ہوتے اور گھنٹہ دو گھنٹہ بیٹھکر خوش گپیان کرتے۔ وزیر بتولی کی خوش ذائقہ گلوریون اور حسین بخش ساقی کے معطر حقہ سے احباب کی ضیافت کیجاتی کبھی کبھی پنڈت رتن ناتھ سرشار کوٹ پتلون ڈاٹے عینک لگائے آنکھین مچکاتے اور ہنستے اس جلسہ مین شریک ہو جاتے اور اپنی پر لطف باتون سے سب کو محظوظ کرتے ایک دن جبکہ یہ سب یاران طریقت جمع اور مولانا بھی تشریف فرما تھے۔ شاید چھٹی یا ساتوین تاریخ محرم کی تھی وقت ۷۔۸ بجے شام۔ چوک مین بڑا مجمع تھا تعزیے معہ جلوس اور باجون وغیرہ کے نکل رہے تھے۔ شور وغل اور مجمع کی کوئی حد نہ تھی سب لوگ اس سیر مین مشغول مگر مولانا دکان کی کوٹھری مین بند کسی کتاب کے مقابلہ مین جو کسی کاتب سے لکھائی گئی تھی، اسقدر مشغول اور منہمک تھے کہ باوجود دوستون کے سخت اصرار کے بھی سر اٹھا کر نہ دیکھا اور اپنا کام کرتے رہے یہانتک کہ پوری کتاب اسی حالت مین تقریباً دس گیارہ بجے تک ختم کر دی۔ مترجم۔

سے حاصل کئے ہونگے اُسیطرح انصافاً یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ پروفیسر صاحب اپنی کتاب "پریچنگ آف اسلام" کی اکثر باتونکے لئے مولانا کے ممنون ہین ۔

ابتدائی تصانیف غالباً علیگڈھ ہی مین مولانا کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اسلام کی قدیم شان وشوکت اور اکابر سلف کے زرین کارنامے قلمبند کئے جائین۔ اس مبارک کام پر سرسید نے بھی اُنکی ہمت افزائی کی یہان سرسید کا کتب خانہ موجود ہی تھا جسمین دور دراز مقامات مصر وشام تک کی مطبوعہ کتابین دستیاب ہوسکتی تھین ۱۸۸۱ء مین مثنوی صبح امید کا ستارہ مولانا کے افق تصنیف پر جلوہ گر ہوا۔ جس مین اسلام کی شان وشوکت موجودہ مسلمانون کی نکبت وفلاکت اور اُنکے ابھارنے کے لئے سرسید کی کوششون کا ذکر نہایت پُر زور طریقے سے کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ایک زمانہ مین اسقدر مقبول اور علیگڈھ کالج کے طلباء کو اتنی پسند تھی کہ اکثر اوقات وہ اسکو اسٹیج پر خوش آوازی سے پڑھتے اور لوگونکے دلونکو بیچین کرتے تھے "مسلمانون کی گزشتہ تعلیم" جو ۱۸۸۷ء کی ایجوکیشنل کانفرنس مین بطور ایڈریس پڑہی گئی تھی ۱۸۸۷ء مین چھپ کر شایع ہوئی جس سے لوگونکو مولانا کی تاریخی معلومات اور تبحر علمی کا پورا پتہ معلوم ہوا۔ اب دنیائے تصنیف مین اُنکی شہرت بہت بڑھ گئی تھی۔ اُنکے دلمین خیال آیا کہ ایک مکمل اور مفصل تاریخ بلاد اسلام اور خلفائے عباسیہ کی مرتب کیجائے اور اس کا نام "ہیروز آف اسلام" (مشاہیر اسلام) انگریزی کی تقلید مین رکھا جائے۔ اس سلسلہ مین اُنہون نے "المامون" اور "سیرۃ النعمان" لکھی اور "الفاروق" شروع کرنے والے تھے کہ ۱۸۹۲ء مین سفر روم وشام اختیار کیا جسمین پروفیسر آرنلڈ بھی اُنکے ہمراہ تھے اور اُنہون نے قسطنطنیہ اور ایشیائے کوچک اور شام ومصر کے بڑے بڑے شہرون کی سیر کی۔ اس سفر کی زیادہ تر یہ غرض تھی کہ "الفاروق" کی تیاری کے واسطے صحیح اور معتبر ماخذ کا پتہ لگایا جائے نیز یہ بھی کہ بلاد اسلامی کی شان وشوکت اپنی آنکھ سے دیکھی جائے۔ سفر سے واپسی کے بعد اُنکا "سفرنامۂ روم وشام" نکلا جسمین پورے سفر کے حالات نہایت دلچسپ طریقے سے قلمبند ہین۔ ۱۸۹۸ء مین جب کہ سرسید کا انتقال ہوگیا تو مولانا بھی دل برداشتہ ہوگئے اور اپنا سلسلہ کالج سے منقطع کرلیا اور اعظم گڈھ گئے۔ اب وہ "الفاروق" کی تیاری مین ہمہ تن

مصروف ہو گئے اور ایک قومی انگریزی اسکول کی ترقی مین بھی بہت کوشش کی جسکا افتتاح ۱۸۸۳ء
مین ہو چکا تھا۔ ۱۸۹۹ء مین سفر کشمیر پیش آیا۔ مگر اتفاق سے وہان مولانا بیمار ہو گئے اور اسی حالت
مین "الفاروق" اختتام کو پہونچی۔

قیام حیدر آباد | مولانا کا سفر حیدر آباد نواب وقار الامرا کی وزارت کے زمانہ مین ہوا تھا۔ سب سے پہلے
وہ مولوی سید علی بلگرامی کی کوشش سے ناظم محکمہ تعلیم بمشاہرہ دوسو روپیہ ماہوار مقرر ہوئے جو
بعد کو تین سو روپیہ ہو گیا تھا۔ مولانا یہان چار برس رہے اور اس زمانہ مین انھون نے
محکمہ تعلیم مین بہت کچھ ترقیان کین اور اس کے ساتھہ اپنا سلسلۂ تالیف و تصنیف بھی برابر جاری
رکھا۔ سید علی بلگرامی نے جو سلسلۂ "کتب آصفیہ" کا جاری کیا تھا اُسمین مولانا کی بھی بعض کتابین شامل
ہین۔ اسی قیام حیدر آباد کے عرصہ مین جب کہ مولوی عزیز مرزا صاحب کا دور دورہ تھا مولانا
نے حیدر آباد مین ایک مشرقی یونیورسٹی کھولنے کا اسکیم تیار کیا تھا اور "الغزالی" "سوانح مولانا روم"
"الکلام" "علم الکلام"۔ اور "موازنہ انیس و دبیر" یہ سب اسی زمانہ کی تصانیف ہین۔

ندوۃ العلماء | ندوۃ العلماء کا قیام ۱۳۱۱ھ مطابق ۱۸۹۴ء مین ہوا تھا اُسکے قیام کی غرض اصلی
یہ تھی کہ عربی مدارس کے لئے ایک مفید نصاب تعلیم ضروریات زمانہ کا لحاظ رکھکر بنایا جائے نیز
یہ کہ مسلمانان ہندوستان کے آپس مین یا اُنکی جماعتون مین جو جو اختلافات ہین وہ رفع کئے جائین۔[۵]
اس عمدہ خیال کے محرک مولوی عبد الغفور صاحب ڈپٹی کلکٹر تھے مگر اس کی تکمیل مولوی سید محمد علی صاحب کانپوری

---

[۵] مقاصد ندوۃ العلماء جو سودہ دار العلوم ندوۃ العلماء کے آخری صفحہ کے پشت پر درج ہین حسب ذیل ہین۔

(۱) نصاب تعلیم کی اصلاح اور علوم دین کی ترقی اور تہذیب اخلاق اور شائستگی اطوار۔

(۲) علماء کے باہمی نزاع کا دفع اور اختلافی مسائل کے رد و قدح کا پورا پورا انسداد۔

(۳) عام مسلمانون کی صلاح و فلاح اور اسکے تدابیر مگر سیاسی اور ملکی معاملات اس سے علیحدہ ہین۔

(۴) ایک عظیم الشان اسلامی دار العلوم قائم کرنا جس مین علوم و فنون کے سوا عملی صنائع کی بھی تعلیم ہوگی۔

(۵) دینی امور مین فتوے دینے کیواسطے محکمہ افتاء کا ہونا جس مین بڑے بڑے عالم اور مفتی ہونگے۔

خلیفہ حضرت مولانا فضل رحمٰن صاحب مرادآبادی کے مبارک ہاتھون سے ہوئی جواس کے بانی اور ناظم اوّل تھے۔ مولانا شبلی اور مولوی عبدالحق دہلوی صاحب تفسیر حقانی نے اسکے قواعد و ضوابط مرتب کیئے اکابر قوم مثلاً سرسید نواب محسن الملک اور نواب وقارالملک وغیرہ نے بھی اسکے اغراض ومقاصد کو پسند کیا اور تحریر وتقریر کے ذریعہ سے اس کا خیر مقدم کیا۔ کہا جاتا ہے کہ نواب وقارالملک سو روپیہ ماہوار ندوۃ کو اپنے پاس سے دیتے تھے پھر مولانا شبلی کی تجویز ہوئی کہ اس جماعت کے تحت مین ایک مدرسہ کھولا جائے جو ضروریات وقت کا لحاظ رکھ کے طلبا کو تعلیم دے سکے چنانچہ ۱۳۱۶ھ مطابق ۱۸۹۸ء مین اسی تجویز کے موافق دارالعلوم کے کچھ ابتدائی درجے کھولدئے گئے۔ اور ۱۸۹۹ء مین رؤسا رشاہجہانپور کی فیاضی سے کچھ زمینداری بطریق وقف ندوۃ العلماء کو حاصل ہوئی جسکو ندوۃ العلماء نے ٹھیکہ پر دیدیا ہے اور مبلغ سات سے روپیہ سالانہ اسکی آمدنی سے ملتا رہتا ہے۔ ایک عظیم الشان کتب خانہ کی بھی نبیاد ڈالی گئی جس مین تقریباً دس ہزار کتابین داخل ہو چکی ہین اور علاوہ مطبوعات یورپ، مصر قسطنطنیہ۔ ٹونس طہران وغیرہ کے تقریباً ایک ہزار کتابین قلمی اور اکثر نادرالوجود ہین جو مصنفین کے ہاتھہ کی لکھی ہوئی ہین یا مصنفین کے قریب زمانہ مین لکھی گئی ہین اور ان پر نامور علمار کے دستخط موجود ہین۔ اس نوبت پر ایک افسوسناک واقعہ پیش آیا کہ سرانٹونی میکڈانل جو اسوقت ممالک متحدہ کے لفٹنٹ گورنر تھے ندوہ کے سخت مخالف ہو گئے۔ اور اسکو سیاسی سازشون کا ایک آلہ کار سمجھکر نگاہ شک سے دیکھنے لگے۔ مولوی احمد رضا خان بریلوی کے بعض رسائل بھی جو بہت پرجوش لہجے مین لکھے گئے تھے اسیوقت نکلے اور ندوہ کے مقابلہ پر ایک جنگجو جماعت جدیدہ قایم کی گئی جسکے اجلاس کلکتہ مین ہوئے تھے۔ غرضکہ جب لاٹ صاحب ولایت چلے گئے تو مولانا شبلی حیدرآباد سے لکھنؤ آئے اور ندوۃ العلماء کے ابتر انتظامات کو اپنے ہاتھہ مین لیا اور پبلک اور گورنمنٹ کے دلمین جو بدگمانیان اور شکوک اسکی طرف سے پیدا ہو گئے تھے انکے رفع کرنے مین بڑی کوشش کی۔ اس کام مین کرنل عبدالمجید خان صاحب نے بھی انکی بڑی مدد کی۔ ندوہ کی مالی حالت اسوقت ایسی خراب ہو گئی تھی کہ اسکے ٹوٹ جانے کا اندیشہ تھا۔ مولانا

نے اسکو درست کرنے کے لئے اکثر ولیسی ریاستون کا سفر کیا اور رام پور سے مبلغ پانچسو روپیہ سالانہ
اور بھوپال سے مبلغ ڈہائی سو روپیہ سالانہ اعانتی رقمین مقرر ہوئین اسیطرح ہز ہائینس آغا خان
نے پانچسو روپیہ سالانہ اور نواب صاحب بہاول پور کی جدۂ ماجدہ نے پچاس ہزار روپیہ تعمیر عمارت
کے واسطے عنایت کئے[له] گورمنٹ نے ایک وسیع اور خوشنما قطعہ آراضی دریائے گومتی کے کنارے
لکھنؤ مین دار العلوم کے واسطے عطا فرمایا نیز چھ ہزار روپیہ سالانہ کی امداد انگریزی زبان اور علوم دنیوی
کے سلئے دینا منظور فرمایا۔ سر جان ہیوٹ صاحب بہادر لفٹنٹ گورنر ممالک متحدہ نے دار العلوم
کا سنگ نبیاد ۲۸ نومبر سنہ ۱۹۰۶ء کو رکھا اسیطرح مولانا کی کوششین بارور ہوئین مگر آپس کی نزاعین
ہنوز قائم رہین کیونکہ علماء کا آپس مین متحد الخیال ہونا سخت مشکل کام تہا۔ وہ لوگ مولانا پر بوجہ انکی
آزادخیالی کے پورا اعتماد نہین رکھتے تھے۔ اسیوجہ سے مولانا کچھ بددل ہوکر سنہ ۱۹۱۳ء مین لکھنؤ سے چلے
گئے۔ اور اعظم گڈہ مین دار المصنفین کی نبیاد ڈالی[عه] اسی اثنا مین ایک نہایت افسوسناک واقعہ پیش آیا
کہ مولانا کی ٹانگ ایک اتفاقیہ گولی کے لگ جانیسے زخمی ہوئی اور آخر کار مجبور ہوکر اسکو کاٹنا پڑا۔

[له] دار العلوم ندوۃ العلماء کی گذشتہ تاریخ" مطبوعہ سنہ ۱۹۲۰ء مین ندوۃ العلماء کی جو مالی حالت بیان کی گئی ہے اس سے ندوۃ العلماء
کی آمدنی حسب ذیل معلوم ہوتی ہے (۱) بھوپال سے تین ہزار روپیہ سالانہ جو ماہ بماہ ملتا ہے (۲) بہاولپور سے وظائف کی مد مین تین سو روپیہ
سالانہ (۳) مسلمانان مدارس سے تقریبًا دو ہزار روپیہ سالانہ اس رقم سے طلباء غیر مستطیع کو مدد دیجاتی ہے (۴) دولت آصفیہ حیدرآباد
دکن سے تقریبًا سو روپیہ ماہوار دفتر کے خرچ کے لئے۔

[عه] عزیز محترم عالیجناب نواب صفی الدولہ سید علی حسن خان بہادر عرف علی میان صاحب جنسے مولانا مرحوم سے ربط محبت
و یگانگت بہت بڑہا ہوا تھا اور جنکی نظر سے یہ مضمون گذر چکا ہے فرماتے تھے کہ "قیام دار المصنفین کے متعلق مینے مولانا
کو نیم راضی کرلیا تھا کہ لکھنؤ مین کھولا جائے مگر انکی خواہش تھی کہ اسکا تعلق ندوہ سے نہو اور یہ ایک بالکل علیحدہ
چیز ہے اسکے واسطے بعض مواقع لکھنؤ مین دیکھے گئے اور مولانا نے دو ایک جگہون کو پسند بھی کیا پھر مولانا کبھی تشریف
لے گئے مین بھی وہان موجود تھا وہان سے اپنے چھوٹے بھائی مولوی محمد اسحاق کی اچانک موت کی خبر سنکر دفعتًا الہ آباد انکو آنا پڑا
یہان سے وہ بضرورت اعظم گڈہ گئے اور مجھکو لکھا کہ دار المصنفین یہان قایم کرنے کا ارادہ ہے اسکے افتتاح مین تم بھی شریک ہو۔
مین گیا تو معلوم ہوا کہ مولانا نے اپنا باغ وغیرہ اسکے واسطے وقف کردیا ہے اور بعض اور لوگون نے اپنی جائداد دیدی ہے
مینے کہا کہ بہت بہتر ہوتا کہ دار المصنفین لکھنؤ مین قایم ہوتا ہنسکر فرمایا کہ کیا مضائقہ ہے یہان انکو بالفعل رہنے دیجئے جب موقع
آئیگا تو لکھنؤ مین منتقل ہوجائیگا۔"

مولانا شبلی نعمانی

مولوی سعید انصاری

مولانا عبدالسلام ندوی

مولانا سید سلیمان ندوی

مولوی ابوالحسنات ندوی
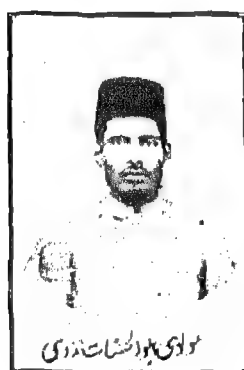
ندوہ نے جو خدمات ملک کی انجام دین گو کہ یہ نہین کہا جا سکتا کہ ابھی وہ تکمیل کو پہنچین مگر اسمین شک نہین کہ وہ بہت قابل تعریف ہین۔ سب سے بڑا کام اسنے یہ کیا کہ قدامت پسند عالمون مین جو ضروریات زمانہ سے بیخبر تھے ایک بیداری پیدا کردی اور انکو بھی اسکی ضرورت محسوس ہونے لگی کہ اُن کا قدیم نصاب بدلکر موجودہ زمانہ کی ترقیون کے حسب حال بنایا جائے۔ انگریزی زبان بھی داخل نصاب کیجائے۔ غیر مفید کتابین اور علوم موقوف کئے جائین اور ادب عربی و فارسی اور حدیث و تفسیر کی تحصیل پر زیادہ زور دیا جائے۔ ندوہ نے یہ بڑا کام کیا کہ علوم عربیہ اور اسلامی تہذیب کو دنیا کے سامنے صحیح طور پر پیش کیا۔ قیمتی قلمی اور نیز ہزارہا مفید مطبوعہ کتابین جمع کر کے ایک اعلےٰ درجہ کا کتب خانہ قایم کیا۔ قرآن شریف کے صحیح انگریزی ترجمہ کا بھی کام ہاتھہ مین لیا تھا۔ مسلمانون کے عہد حکومت ہندوستان کے متعلق جو تاریخی غلطیان ناواقفیت سے لوگون مین مشہور ہوگئی ہین اُن کو رفع کیا۔ اسی طرح مسلمانونکے قانون وقف و میراث کے متعلق جو پیچیدہ مسایل قانونی اکثر پیش آجاتے ہین اُنپر روشنی ڈالی۔ اسلامی علوم اور تمدن کا ایک مرکز قایم کیا جسکا اثر ممالک دور و دراز تک پر پڑا۔ ایک خاص رسالہ "الندوہ" بہ ادارت مولانا شبلی و مولوی حبیب الرحمان صاحب شروانی نکالا گیا جسمین نہایت عمدہ اور قابلیت کے مضامین شایع ہوئے۔ مگر حق یہ ہے کہ مولانا کے انتقال سے ندوہ کو جو نقصان عظیم پہونچا اسکی تلافی اب بہت مشکل ہے۔

دار المصنفین اعظم گڈھ لکھنؤ سے واپسی کے بعد مولانا ہمہ تن اپنی محبوب اور مایہ ناز تصنیف "سیرۃ النبی" کی تکمیل مین مصروف ہوگئے اور شعر العجم کا پانچوان حصہ بھی اسیوقت تمام کیا۔ مولانا چونکہ تالیف و تصنیف کے عاشقون مین تھے لہذا مصنفین کی ایک جماعت قایم کرنیکا خیال جو بہت عرصہ سے اُنکے دلمین

جاگزین" تھا خدا خدا کر کے وہ اب پورا ہوا جس کے واسطے انہون نے اپنی ذاتی جائداد یعنی ایک مکان اور باغ اور نیز اپنا قیمتی کتب خانہ وقف کر دیا۔ اسکے علاوہ ندوہ مین ایک درجۂ تکمیل بھی کھولا جسمین عربی و فارسی کے منتہی طالب علم ریسرچ کی خدمات انجام دیتے ہین۔

قابلیت اور خدمات کا اعتراف ۔ ۱۸۹۲ء مین سلطان ٹرکی نے تمغۂ مجیدی انکو عنایت کیا تھا اور اسی کے قریب برٹش گورنمنٹ نے خطاب شمس العلماء عطا کیا۔ وہ الٰہ آباد یونیورسٹی کے فیلو اور مختلف کمیٹیون کے ایک معزز رکن تھے۔ یعنی ترقی علوم مشرقیہ کی کمیٹی جو بمقام شملہ سر ہارکورٹ بٹلر کی صدارت مین منعقد ہوئی تھی کمیٹی بابتہ نزاع مابین زبان اردو و ہندی اور کمیٹی اتحاد ہندو مسلم جسکو گورنمنٹ نے منعقد کیا تھا۔

اخلاق و عادات ۔ مولانا شبلی ایک نہایت سچے اور راستباز خلیق و متواضع آدمی تھے۔ اُنکی ایک زبردست شخصیت تھی۔ گفتگو نہایت شیرین اور دلچسپ اور پر از معلومات ہوتی تھی۔ حافظہ بہت زبردست پایا تھا۔ روپیہ کا مطلق خیال نہین کرتے اور جو کچھ ملتا تھا نہایت آزادی سے خرچ کرتے تھے ہندو مسلم اتحاد کے دل سے خواہان تھے۔

تصانیف ۔ مولانا کی تصانیف بہت کثرت سے ہین جنمین حسب ذیل مشہور ہین۔ سیرۃ النبی (صرف دو جلدون کی تکمیل کر سکے) شعر العجم پانچ حصے۔ الفاروق۔ المامون۔ سیرۃ النعمان۔ الغزالی الکلام۔ علم الکلام۔ سوانح مولانا روم۔ موازنۂ انیس و دبیر۔ سفرنامہ روم و مصر و شام۔ اورنگ زیب عالمگیر۔ الجزیہ۔ مسلمانون کی گذشتہ تعلیم۔ تاریخ اسلام و فلسفۂ اسلام۔ حیات خسرو۔ تنقید جرجی زیدان مقالات شبلی۔ مکاتیب شبلی۔ رسائل شبلی۔ (نظم مین) دیوان شبلی اور دستۂ گل۔ مثنوی صبح امید۔ مجموعۂ نظم اردو۔

مولانا بحیثیت مورخ کے ۔ مولانا کا بڑا کمال یہ ہے کہ اُنھون نے اسلام کی قدیم شان و شوکت کی تاریخ کو طرز جدید مین پیش کیا اور ایسے دلچسپ طریق سے لکھا کہ عوام و خواص سب اُس سے مستفیض ہو سکتے ہین اور ہر نظر مین وہ نہایت دلچسپ معلوم ہوتی ہے۔ پھر یہ کہ اُنکی تالیف مین انتہا کے

تجسس و تلاش اور عمیق مطالعہ سے کام لیا اور جدید طرق تنقید کیموافق غیر معتبر اور بیکار چیزون کو ترک کیا۔ الفاروق المامون۔ الغزالی۔ سیرۃ النعمان۔ مسلمانونکی گزشتہ تعلیم۔ اور علی الخصوص اُنکی معرکتہ الآرا تصنیف یعنی سیرۃ النبی جسکو انہون نے ناتمام چھوڑا ایسی یادگار تصانیف ہین جو اُنکے تبحر علمی، وسیع تحقیق عمیق مطالعہ اور سعید کد و کاوش کا پتہ دیتی ہین۔

مولانا بہ حیثیت ناقد کے

مولانا علاوہ جلیل القدر مورخ کے ایک زبردست ناقد بھی تھے۔ شاعر شیرین مقال ہونیکے ساتھ قوت انتخاب۔ ذوق سلیم۔ رائے صائب بھی اعلیٰ درجہ کی رکھتے تھے۔ اگر کسی شخص کو زمانہ حال کی کوئی ایسی تصنیف دیکھنا ہو جو وسعت مطالعہ اور تحقیق کے ساتھ فصاحت و بلاغت اور سلاست زبان کا ایک بہترین مجموعہ کہی جاسکے تو اُس کو شعر العجم دیکھنا چاہیئے جسکی یکتائی پر پروفیسر برون ایسے مشہور زمانہ مستشرق کی شہادت موجود ہے یہ سچ ہے کہ مولانا کے انتقال کے بعد اُسکی اکثر غلطیان نکالی گئین اور وہ ایک جارحانہ نظر سے دیکھی جارہی ہے مگر پھر بھی ہمارے نزدیک کتاب کی قدر و قیمت اور مولانا کے تبحر علمی مین اس سے کوئی فرق نہین آسکتا۔ کتاب مذکور نظم فارسی کی ایک مکمل تاریخ ہے اور نہایت سلیس اور دلچسپ زبان مین ہے۔ "موازنہ انیس و دبیر" بھی ایک بہت بیش بہا تصنیف ہے۔ اور گو کہ اُس سے بھی اختلاف کیا گیا اور بعض کتابین اسکے جواب مین نکلین مگر پھر بھی اُسکی اکثر باتین کارآمد اور صحیح ضرور ہین آرٹیکل اور مضمون نگاری مین بھی مولانا ایک یدطولیٰ رکھتے تھے۔ اُنکی اس قسم کی تحریرین نہایت دلچسپی اور شوق سے پڑھی جاتی ہین کیونکہ اُسمین نہایت مفید اور کارآمد باتین پائی جاتی ہین۔ اُنکے مکاتیب بھی بہت دلچسپ ہین جس سے اُنکے ذاتی حالات اور نیز اُنکے معاصرین اور اُس زمانہ کے حالات پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ "مقالات شبلی" اور "رسائل شبلی" اُنکے اخباری مضامین کا اور "مکاتیب شبلی" اُنکے خطوط کا مجموعہ ہے۔

طرز تحریر

مولانا ہمیشہ صفائی اور سادگی اور وضاحت کلام کو بہت پسند کرتے تھے۔ اُنکی عبارت کبھی گنجلک نہین ہوتی اُسمین ایک خاص چمک اور تڑپ ہوتی ہے۔ سر سید مرحوم مولانا کو اُنکے طرز تحریر پر مبارکباد دیتے تھے اور کہتے تھے کہ تم تو لکھنؤ اور دلی دونون کے لئے باعث رشک ہو۔

مولانا کے یہان صنایع بدایع اور عبارت مین تکلف بہت کم ہوتا ہے۔ اور گو کہ اکثر جگہ فصاحت اور زور بیان مضمون مین چار چاند لگا دیتا ہے پھر بھی نفس مطلب نہایت واضح رہتا ہے۔ یہ بڑی قابل تعریف بات ہی کہ مختلف انواع تحریر کے لئے مولانا اُسی کے مناسب حال انداز بیان بھی اختیار کرتے ہین۔ بعض تکلف پسند طبیعتون کو مثلاً وہ جنکی زبان کو آزاد کی اردو کا چٹخارہ ہے ممکن ہے کہ مولانا کا رنگ روکھا پھیکا اور بے مزہ معلوم ہو مگر کاروباری نثر کا وہ بے مثل نمونہ ہے۔ جو کہ دور موجودہ کا سب سے بڑا کارنامہ ہے جیسا کہ لکھا گیا مولانا کا مرتبہ بحیثیت ایک مورخ اور ناقد کے بہت بلند ہے اُنھون نے اسلامی تمدن کی توسیع و اشاعت مین بڑا حصہ لیا۔ اُنہین ہم پین اسلامزم کی نئی صبح جلوہ گر دیکھتے ہین۔ اور یہ اُنہین سب سے بڑا کمال ہے کہ علوم مشرقی کو وہ مغربی روشنی مین دیکھتے ہین۔ وہ ندوۃ العلماء کے رُوح رواں اور دار المصنفین کے بانی تھے۔ اپنے زمانہ کی نمایان ہستیون اور بلند شخصیتون مین سے تھے۔ اور در اصل انہین کی روحانی برکت ہے جو دار المصنفین کی مساعی جمیلہ کی کامیابی کا باعث ہے۔ اُنکے لایق شاگرد ولئے ابدالآباد تک اُنکا نام روشن رہیگا۔

سلیمان ندوی

مولانا سید سلیمان صاحب مولانا شبلی کے جانشین علوم مشرقی اور عربی و فارسی کے جیّد فاضل ہین۔ مولانا شبلی مرحوم اُنسے اپنی زندگی مین بہت محبت کرتے اور ایک خاص نظر شفقت و عنایت انپر رکھتے تھے۔ اور اُسیوقت وہ اپنی ذہانت و قابلیت و طباعی سے اُنکے اور شاگردون سے ممتاز تھے۔ اُنہون نے مولانا مرحوم کی روایات کو جاری رکھا اور بالفعل اُنہین کی نگرانی اور اہتمام مین حلقہ دار المصنفین عربی اور فارسی کی نایاب کتابون کے ترجمہ و تالیف کی بیش بہا خدمت انجام دے رہا ہے۔ وہ المعارف کے ایڈیٹر بھی ہین جو زبان اُردو کا مشہور رسالہ علوم اہل اسلام کی اشاعت کے لئے مخصوص ہے اور اسکے مضامین سے اونکی مضمون نگاری اعلیٰ قابلیت اور تحقیق علمی کا پتہ چلتا ہے۔ مولانا دار المصنفین اور معارف دونون کی روح روان ہین۔ اُنہون نے بلاد اسلامی اور یورپ کا سفر بھی کیا ہے۔ اور سیرۃ النبی کا بقیہ حصہ اُسی شان و شوکت سے ختم کیا ہے۔ سیرۃ العائشہ۔ ارض القرآن۔ لغات جدیدہ وغیرہ آپ کی مقبول اور مفید تصانیف سے ہین۔

مولانا سلیمان صاحب کے علاوہ مولانا حمید الدین - مولانا عبد الباری - مولانا عبد الماجد دریابادی - پروفیسر نواب علی - اور مولانا عبد السّلام - دار المصنفین کے پرجوش اور معزز ارکین ہین - مولانا حمید الدین صاحب علاوہ انگریزی کے زبان فارسی و عربی کے مستند فاضل اور علم القرآن اور ادب عربی مین ایک خاص بصیرت رکھتے ہین - مولوی عبد الباری نے برکلے کے فلسفہ کا بہت سلیس ترجمہ اردو مین کیا ہے اور بعض اور فلسفیانہ تصانیف بھی اُنکی ہین - مولوی عبد السلام اور مولوی عبد الماجد کے مختصر حالات حسب ذیل ہین -

اس موقع پر یہ لکھنا بے محل نہوگا کہ شعبۂ دار المصنفین اپنے سامنے ایک درخشندہ مستقبل رکھتا ہے اور اگر اسنے اپنی موجودہ رفتار ترقی جاری رکھی تو اسمین کوئی شک نہین کہ زبان اُردو کی تکمیل مین یہ بہت بڑا حصہ لیگا - مگر ضرورت یہ ہے کہ وہ اپنی تصانیف مین عربی اور فارسی الفاظ کی بہتات سے احتراز کرے - تاکہ تمام بہی خواہان اردو کو اس سے سچی ہمدردی رہے - اور اسطرح یہ بھی بیجا ہے کہ تمام مغربی و دیگر علوم مشرقیہ سے قطع نظر کر کے اپنی توجہ صرف علوم اسلامی کی نشر و اشاعت پر محدود رکھے

مولوی عبد السلام ندوی مولوی عبد السلام صاحب کی ذات پر دار المصنفین کو جسقدر ناز ہو کم ہے وہ وقتاً فوقتاً معارف مین نہایت اعلیٰ درجہ کے مضامین لکھتے رہتے ہین - سیرت عمر بن عبد العزیز اسوۂ صحابیات - شعر الہند حصہ اول و دوم - ابن یمین - وغیرہ انکی تصانیف ہین - سنا ہے کہ مولانا شبلی کی زندگی کے حالات بھی مرتب کر رہے ہین مگر وہ اب تک شایع نہین ہوے - شعر الہند مین جو نظم اُردو کی ایک مبسوط تاریخ ہے اُن اثرات و حالات کو جو مختلف اوقات مین نظم اردو پر مترتب ہوئے ہین مفصل اور نہایت خوبی سے بیان کیا ہے - اپنی نوعیت مین یہ کتاب بہت عمدہ اور قابل تعریف ہے اور اس کتاب کو تصنیف کر کے مصنف نے فی الحقیقت زبان اردو کی بہت بڑی خدمت کی ہے - مگر یہ کہنا پڑتا ہے کہ کتاب کا نام اسم غیر مسمیٰ ہے نیز اس مین بعض ضروری باتون مین فرو گزاشتین بھی ہوگئی ہین اور اکثر اُن لوگون کا ذکر بھی نہین جنہون نے زبان اُردو کی ترقی مین بہت کوششین کی ہین ان اعتراضات کا یہ جواب دیا جاسکتا ہے کہ اس کتاب مین نظم اُردو کو ایک خاص نقطہ نظر سے دیکھا گیا ہے - بہر حال کچھ

بھی ہو کتاب کارآمد اور مفید ضرور ہے اور مثل مولوی حکیم عبد الحی صاحب مرحوم کے "گل رعنا" کے جو قدیم طرز کا تذکرہ ہے اس مین بعض خاص خاص باتین ایسی ہین جو دوسری کتابون مین نہین ملتین

مولوی عبد الماجد دریا آبادی | مولوی عبد الماجد صاحب بی اے دریا بادی خلف الصدق مولوی عبد القادر ڈپٹی کلکٹر مرحوم ۱۸۹۳ء آپ کا سال ولادت ہے۔ ابتدائی عربی اور فارسی تعلیم سے گھر پر فراغت کرکے زبان انگریزی سیتاپور ہائی اسکول مین پڑھنا شروع کی اور انٹرنیس پاس کرکے کیننگ کالج لکھنؤ مین داخل ہوئے جہان سے ۱۹۱۲ء مین بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی پھر درجہ تکمیل (پوسٹ گریجویٹ اسٹڈیز) کے لئے علی گڈھ کالج مین داخل ہوئے مگر والد کے انتقال کے سبب سے وہان زیادہ عرصہ تک قیام نہ کر سکے لکھنؤ چلے آئے اور یہان آکر تصنیف و تالیف کے سلسلہ مین مشغول ہو گئے ۱۹۱۷ء مین عثمانیہ یونیورسٹی کے دار الترجمہ سے تعلق ہو گیا تھا مگر کچھ عرصہ بعد یہ تعلق ترک کر دیا۔ گو اب بھی گورنمنٹ نظام کے وظیفہ خوار ہین اور عثمانیہ یونیورسٹی کے واسطے کچھ نہ کچھ ادبی کام کرتے رہتے ہین مولانا سیاسیات سے بھی بڑی دلچسپی رکھتے ہین اور سیاسی حلقون مین ایک خاص عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہین۔ ہفتہ وار اخبار "سچ" آپ کی ادارت مین نکلتا ہے۔

مولانا کو ادبی دنیا مین ایک خاص شہرت حاصل ہے۔ کتب ذیل آپ کی تصانیف سے مشہور ہین فلسفہ جذبات۔ فلسفہ اجتماع۔ تاریخ اخلاق یورپ۔ مکالمات برکلے یعنی برکلے کی مشہور کتاب "ڈائیلاگز" کا اردو ترجمہ۔ پیام امن۔ بحر المحبت (مثنوی مصحفی)۔ زود پشیمان (ناٹک) سائیکالوجی آف لیڈر شپ (انگریزی مین) تصوف و اسلام۔ فلسفیانہ مضامین۔ (اسمین وہ چھ مضامین داخل ہین جو الناظر مین چھپے تھے) مولانا کا مطالعہ فلسفہ بہت عمیق ہے اور فلسفیانہ کتابین اور مضامین نہایت سلیس اور دلچسپ اردو مین لکھنے کا آپ کو خاص ملکہ حاصل ہے۔ آپ کے انگریزی کے ترجمے نہایت صاف بامحاورہ اور متین ہوتے ہین۔ مصحفی کی مثنوی "بحر المحبت" جو غیر مطبوعہ تھی آپنے نہایت محنت اور عرقریزی سے چھپوائی اور اُس پر ایک مفید اور بلیغ مقدمہ لکھا ہے۔ آپ کبھی کبھی اپنے مقررہ مسلک یعنی فلسفہ اور تصوف اور سنگین اصناف سخن سے ہٹ بھی جاتے ہین اور تفنن طبع کے طور پر ہلکی اور سبک چیزون کیطرف متوجہ

ہو جاتے ہین اسی آخر الذکر صنف مین آپ کا ڈراما "زود پشیمان" ہے جو ہر چند کہ اسٹیج کے لائق نہین مگر پڑھنے مین بہت لطیف اور دلچسپ ہے۔ آپ کو شعر گوئی مین بھی کافی شہرت حاصل ہے گو کہ کم کہتے ہین مگر جس قدر کہتے ہین زیادہ تر متصوفانہ رنگ مین ہوتا ہے۔ موجودہ اخبارات و رسائل مثلاً معارف۔ الناظر۔ اردو۔ ہندوستان ریویو۔ ماڈرن ریویو۔ وغیرہ یہ سب آپ کے اعلی مضامین کے مرہون منت ہین۔ آپکے مضامین معلومات سے پر ہوتے ہین اور اسی کے ساتھ اعتدال پسندی اور بیحبلتی اور علمیت آپکے کلام کا خاص جوہر ہے۔ قوت تنقید آپ کو خدا تعالےٰ نے بہت اعلی درجہ کی دی ہے۔ سنا جاتا ہے کہ بالفعل آپ ملفوظات مولانا روم کو شایع کرنے کی تیاری کر رہے ہین آپ کی ذات ادب اردو کے لیے باعث فخر ہے اور آپ کی تصانیف سے زبان کو خاص فوائد پہونچتے رہتے ہین"۔

جدید علوم کی ترویج۔ دلی کالج کا قیام

دلّی کالج کے قیام سے جدید علوم و فنون کی ترویج و ترقی مین خاص مدد ملی بقول مسٹر اینڈریوز کے "انیسوین صدی کے شروع مین جو ایک عجیب و غریب علمی روشنی چمکی تھی اسکی وجہ زیادہ تر نئے انگریزی علوم و فنون تھے جنکی تعلیم نے ہندوستانیون کے واسطے ایک بالکل طلسمی منظر پیش کر دیا تھا کوئی نہین کہہ سکتا تھا کہ اندر پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہوگا۔ دلی کالج مین جو کیمسٹری اور فزکس (کیمیا و طبعیات) کے نئے نئے تجارب طلبا کو دکھائے جاتے تھے اُسنے وہ بنہایت مسرور بلکہ مبہوت ہو جاتے تھے اور نہین کہہ سکتے تھے کہ آئندہ وہ کیا دیکھینگے وہ بے تکلف خیال کرتے تھے کہ ہم لوگ ایک جدید دور کے بانی ہین اور ترقی اور انکشافات کے وہ خواب دیکھا کرتے تھے اس جدید علمی نور نے اُس عہد کو منور کر دیا تھا جس مین سلطنت مغلیہ کے دور آخر کا کروفر اور شان و شکوہ بھی کچھ شامل تھے مگر یہ روشنی تھوڑے عرصہ تک قایم رہکر بجھ گئی اور اُسکے فنا ہونیکے اسباب مین غدر ۱۸۵۷ء کو بھی بڑا دخل ہے"۔

دلّی کالج مین ۱۸۲۸ء مین ایک درجہ انگریزی کا بھی کھل گیا تھا اور باوجود انگریزی سے

مخالفت کے طلبار کی تعداد کم نہ تھی ۱۸۳۱ء کے رجسٹرون سے معلوم ہوتا ہے کہ اسوقت بھی کالج مین تین سو طالب علم انگریزی پڑھتے تھے اسکول اجمیری دروازہ کے قریب تھا مگر جب وہ ترقی کرکے کالج ہوا تو کشمیری دروازہ اور دریائے جمنا کے قریب آگیا ۱۸۴۳ء مین اسکول اجمیری دروازہ سے منتقل ہوکر شاہی کتب خانہ مین آگیا چونکہ جدید تعلیم سے لوگون مین منافرت اور مخالفت پھیلی ہوئی تھی لہذا اسوقت طلبہ سے کوئی فیس نہین لیجاتی تھی بلکہ اچھے اچھے وظائف آئین انگریزی کا شوق پیدا کرنیکے واسطے انکو دیے جاتے تھے۔ کالج مین مغربی علوم کے ساتھ ایک مشرقی صیغہ بھی تھا۔ ریاضی کی تعلیم نہایت اعلی درجہ کی ہوتی تھی۔ ادب اور زبان انگریزی کو لوگ زیادہ پسند نہین کرتے تھے مگر مغربی علوم اور ریاضی کے بہت گرویدہ تھے۔ تعلیم زیادہ تر لکچرون کی مدد سے ہوتی تھی نہ کہ کتابون سے کیونکہ کتابین دور دراز مقامات سے آتی تھین اور وقت سے ملتی تھین اور ظاہر ہے کہ اسوقت جدید علوم کی کتابون کے ترجے بھی نہین ہوے تھے۔ لکچرون کو طلبہ نہایت شوق سے سنتے تھے۔ نئے نئے ریاضی کے مسایل سیکھکر اور جدید تجارب کیمیاوی و برقی و مقناطیسی اپنی آنکھون سے دیکھکر انکو خیال پیدا ہوتا تھا کہ ہم بالکل اک نئی علمی دنیا مین قدم رکھ رہے ہین۔ پروفیسر رامچندر جو ایک زبردست شخصیت رکھتے تھے اور مسٹر ٹیلر پرنسپل کالج اور پنڈت اجودھیا پرشاد جو دلی کے کشمیری پنڈت اور اسسٹنٹ پروفیسر تھے طلبہ کی تعلیم و ترقی مین نمایان حصہ لیتے تھے۔ مشرقی صیغہ مین عربی و فارسی کی تعلیم زبان اُردو کی وساطت سے ہوتی تھی اور یہ صیغہ طلبہ مین بہت ہر دلعزیز تھا۔ مولوی امام بخش صہبائی فارسی کے بڑے زباندان اور ماہر کالج مین فارسی پڑھاتے تھے ٹیلر صاحب اور مولوی امام بخش صہبائی دونون غدر مین مارے گئے۔

دلی کالج سے پڑھکر مشہور لوگ نکلے جنہون نے زبان اُردو کی آیندہ توسیع و ترقی پر بہت بڑا اثر ڈالا مثلاً مولوی نذیر احمد ماسٹر پیارے لال آشوب۔ مولانا آزاد۔ مولانا حالی۔ اور مولوی ذکاءاللہ کے نام پیش کیے جاسکتے ہین۔ دنیاوی ترقیان بھی ان مین سے بعض نے بہت کین چنانچہ مولوی شہامت علی ریاست اندور کے وزیر اعظم ہوگئے اور ڈاکٹر مکند لال شمالی ہند مین نہایت مشہور

ومعروف زمانہ حال کے طرز کے ڈاکٹر گزرے ہین، ڈاکٹر چمن لال عیسائی ہو گئے تھے اور غدر مین مارے گئے۔ سنہ ۱۸۴۲ء مین دلّی کالج کی سرپرستی مین ایک ادبی انجمن کھولی گئی جس کے روح رواں پروفیسر رامچندر اور مولانا صہبائی تھے اس انجمن کی قابل ستائش کوششون سے اکثر مفید کتابین تیار ہوئین جو دلّی مین چھپین اور طلبہ کے بہت کام آئین ان مین سے اکثر کتابین انگریزی سے اور بعض فارسی سے ترجمہ ہوئی تھین دلّی کی تقلید مین اور شہرون مین بھی مثلاً آگرہ اور لکھنؤ اور بنارس مین اسی قسم کی کتابین تیار ہوئی تھین جو انڈیا آفس کے کتب خانہ مین موجود ہین اور اُنکے نام بلوم ہارٹ نے اپنی مرتبہ فہرست مین دیے ہین۔ اسی قسم کے تراجم اور تالیفات سے یہ بہت بڑا فائدہ ہوا کہ نثر اردو بہت صاف سادہ اور بے تکلف ہو کر اس قابل ہو گئی کہ اُسمین کاروباری دنیا کی باتین لکھی جائین اور غیر زبانون سے کارآمد ترجمے کیے جاوین سنہ ۱۸۶۵ء مین رائے بہادر ماسٹر پیارے لال آشوب نے دلّی مین ایک اور ادبی سوسائٹی کی بنیاد ڈالی تھی جس کے وہ خود سکریٹری تھے۔ اس سوسائٹی کے انتظام مین بہت سے مفید لکچر دیے گئے اور نثر اردو کا چراغ گو کہ ٹمٹما تا رہا مگر بجھا نہین۔ آشوب ہی کی توجہ اور مدد سے مولانا آزاد اور حالی نے جدید رنگ کی شاعری اختیار کی اور انھین نے مولانا حالی کو اکثر انگریزی چیزین ترجمہ کر کر کے دین تاکہ وہ اُنکو اردو کا جامہ پہنائین۔ پروفیسر رامچندر اور مولانا صہبائی کے مختصر حالات علیحدہ لکھے جاتے ہین۔

پروفیسر رامچندر یہ قدیم دلّی کالج مین ریاضی کے مشہور پروفیسر تھے۔ ٹیلر صاحب پرنسپل کالج کے میل جول اور اثر سے عیسائی ہو گئے تھے۔ یہ اُن لوگون مین ہین جنھون نے قدیم دلی کالج کے انگریزی اسکول مین سب سے پہلے تعلیم پائی تھی۔ بہت ذکی اور ذہین آدمی تھے اُنھون نے ریاضی کا ایک نیا مسئلہ دریافت کیا تھا جسکی وجہ سے اُن کو اہل یورپ کے مشہور مہندسون مین شہرت حاصل ہو گئی تھی۔ مولوی نذیر احمد مولانا آزاد مولوی ذکاء اللہ وغیرہ ایسے مشہور مشہور لوگ اُنکے شاگرد تھے مولوی ذکاء اللہ کو علم ریاضی سے خاص مناسبت تھی اس وجہ سے وہ پروفیسر رامچندر کے بہت محبوب شاگرد تھے۔ اور اسی وجہ سے ان دونون مین ایک فنّی محبت اور ارتباط

عمر بھر قایم رہا۔

پروفیسر رامچندر کی نسبت لکھا ہے کہ نہایت بے خوف راست باز۔ راسخ الاعتقاد شخص تھے چونکہ ہندو مذہب چھوڑ کر عیسائی ہوئے تھے لہذا تمام تعلقات ذات و برادری کے منقطع ہو گئے تھے اور بڑی تکلیفین اُٹھانا پڑی تھین اور اسی وجہ سے مزاج مین ایک قسم کی سختی اور خشونت پیدا ہو گئی تھی جو کبھی کبھی مباحثے اور مناظرے کی صورت مین ظاہر ہوتی تھی مگر پھر بھی رحم دل و معاملے کے پکے تھے۔ غدر کے زمانہ مین انکی جان خطرہ مین پڑ گئی۔ ایک شاگرد نے اس سے اونکو مطلع کیا چنانچہ وہ کچھ دن اک مکان مین چھپے رہے بعد کو بھیس بدل کر نکل گئے کچھ دنون بعد جب شہر مین امن و امان ہو گیا تو واپس آئے اور اپنی کوشش سے اپنے بعض دوستون کو بھی شہر مین بلوا لیا۔ کہا جاتا ہے کہ پروفیسر صاحب ریاست پٹیالہ کے ڈائرکٹر تعلیمات ہو گئے تھے۔ وہ "تذکرۃ الکاملین" کے مصنف ہین جس مین روم اور یونان کے مشہور مشہور فلاسفرون اور شعراء کے مختصر حالات انگریزی اور عربی کتابون سے اخذ کر کے لکھے ہین یہ کتاب سب سے پہلے ۱۸۴۹ء مین چھپی تھی بعد کو ۱۸۵۸ء مین مطبع منشی نولکشور مین چھپی۔ اس مین بعض انگریزی شعراء اور فلسفی بعض فارسی شعراء اور بعض مشہور اہل ہند مثلاً والمیک شنکرا چارج اور بھاسکر جوتشی کے حالات بھی درج ہین۔ پروفیسر صاحب "اصول علم ہیئت" اور "عجائب روزگار" کے بھی مصنف ہین یہ کتابین ۱۸۵۸ء و ۱۸۵۸ء مین تیار ہوئی تھین انکی زبان بہت صاف اور سلیس ہے اور انکے نثر کے نمونے مولوی غلام یحییٰ صاحب تنہا نے اپنی کتاب "سیر المصنفین" مین دیے ہین۔

مولوی امام بخش صہبائی صہبائی قدیم دلی کالج مین فارسی اور عربی کے پروفیسر بہت روشن خیال اور اخلاقی جرأت کے آدمی تھے۔ زبان فارسی مین انکو کمال حاصل تھا اور اس زمانہ مین بھی جبکہ فارسی کا دور دورہ تھا اک خاص عزت اور قدر کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ اُنھون نے سرسید مرحوم کو "آثار الصنادید" کی تصنیف مین بہت مدد دی تھی۔ طلبہ مین بہت ہر دلعزیز تھے اور انکی قابلیت اور شہرت کا طلبہ کے دل پر بڑا اثر تھا۔ فن شعر مین استاد مشہور تھے اور قلعہ کے اکثر

شاہزادے اور متوسلین اُن سے اصلاح لیا کرتے تھے متعدد کتابین اُن سے یادگار ہین۔ زمانہ غدر مین مارے گئے اور ان کا مکان کھود کر زمین کے برابر کر دیا گیا۔

مولوی غلام امام شہید مولوی غلام امام شہید شاہ غلام محمد کے بیٹے امیٹھی ضلع لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ لکھنؤ کے نامبرآوردہ شاعرون مین ہین چونکہ نعت بہت کہتے تھے اس وجہ سے مداح نبی اور عاشق رسول کے لقب سے مشہور ہین قتیل و مصحفی سے اصلاح لیتے اور فارسی نظم و نثر مین آغا سید اسمعیل مازندرانی کے شاگرد تھے۔ الہ آباد مین پیشکار تھے ملازمت سے دستکش ہونیکے بعد ریاست حیدر آباد سے اک معقول رقم بطور وظیفہ کے آخر عمر تک ملتی رہی نواح لکھنؤ حیدر آباد دکن مراد آباد رام پور اور آگرہ مین کثرت سے شاگرد چھوڑے۔ سر سالار جنگ اوّل نواب کلب علیخان اور دیگر رؤسا عہد انکی بڑی عزت کرتے تھے "مجموعہ میلاد شریف" "انشا بہار بیخزان" اور چند قصائد و غزلیات ان سے یادگار ہین تاجگنج آگرہ کا حال پرانے رنگ کی نثر مین انھون نے خوب لکھا ہے۔

منشی غلام غوث بیخبر خواجہ غلام غوث بیخبر کا اصل وطن کشمیر تھا جہان انکے بزرگ معزز عہدون پر ممتاز تھے۔ انکے والد خواجہ حضور اللہ کشمیر سے تبت اور وہانسے نیپال آئے جہان خواجہ غلام غوث کی ولادت سنہ ۱۲۴۰ھ مین ہوئی۔ یہ اپنے والدین کے ساتھ بہت کم سنی مین جبکہ انکی عمر صرف چار برس کی تھی بنارس آئے یہان کچھ قدیم رنگ کی تعلیم حاصل کر کے سنہ ۱۸۴۰ع مین اپنے مامون خان بہادر مولوی سید محمد خان کی ماتحتی مین جو نواب لفٹنٹ گورنر ممالک مغربی و شمالی کے میر منشی تھے ملازم ہو گئے۔ وہ لارڈ النبرا گورنر جنرل کی ہمراہی مین قلعہ گوالیار کی جنگ مین بھی شریک ہوئے تھے اور بعد اختتام جنگ ایک اعزازی خلعت سرکار سے عنایت ہوا تھا۔ اپنے مامون کے انتقال کے بعد انکے عہدۂ میر منشی پر فائز ہوئے جہان عرصہ دراز تک نہایت قابلیت کے ساتھ خدمات منصبی انجام دیکر سنہ ۱۸۸۵ع مین ملازمت سے کنارہ کش ہوئے۔ خواجہ صاحب کو علاوہ خطاب خان بہادری کے بہت سے

انعامات اور خلعت اور طلائی تمغہ قیصر ہند سرکار سے عنایت ہوا تھا۔ مرزا غالب کے بڑے دوستون مین تھے چنانچہ مرزا کے اکثر دلچسپ خطوط انکے نام "اردوے معلے" اور "عود ہندی" مین موجود ہین "فغان بےخبر" اور "خونناب جگر" انکی گران بہا تصانیف ہین۔ سنہ ۱۹۰۸ء مین بہت کبرسنی مین انتقال کیا۔ انکی تقریظ شہید کی "بہار سخندان" پر پُر اسرار طرز اور خوشامدانہ رنگ مین ہے۔ خواجہ صاحب عام طور پر صاف اور سلیس نثر لکھتے تھے مگر تقریظون وغیرہ مین وہی قدیم رنگ برتتے تھے یعنے مقفی اور مسجع عبارت فارسی کی تقلید مین۔

شمس العلما سید علی بلگرامی

شمس العلما ڈاکٹر سید علی بلگرامی۔ بلگرام کے ایک مشہور خاندان کی آپ یادگار تھے جو علم و فضل کے لحاظ سے بہت معزز و ممتاز تھا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف ہندوستان مین ایک نمایان شہرت اور قابلیت سے تعلیم ختم کرکے تکمیل کے لئے انگلستان گئے جہان آپنے ہندوستان سے بھی زیادہ شہرت اور کامیابی حاصل کی۔ آپ کے اخراجات سفر کے متکفل سر سالار جنگ بہادر تھے آپ کو مختلف زبانین سیکھنے کا خاص شوق تھا چنانچہ۔ عربی و فارسی و سنسکرت مین کامل مہارت حاصل کرنے کے علاوہ یورپ کی مختلف زبانین اور نیز ہندوستان کی اکثر زبانین مثلاً بنگلہ مرہٹی تلنگی خوب جانتے تھے۔ آپ کی شہرت زیادہ تر آپکی مشہور کتب "تمدن عرب" اور "تمدن ہند" سے ہے۔ جس مین اول الذکر فرنچ مستشرق لیبان کی مشہور کتاب کا ترجمہ ہے۔ آپنے ایک ڈاکٹری کتاب کا بھی ترجمہ کیا ہے۔ علاوہ تصنیف و تالیف کے آپ علیگڈھ کالج کے معاملات مین بھی بہت دلچسپی لیتے تھے آپ مذکورۂ بالا دونون کتابون کی وجہ سے مصنفین زبان اردو کی صف اول مین جگہ پانیکے مستحق ہین کیونکہ یہ دونون کتابین علمیت اور قابلیت کے علاوہ آپکی قدرت زبان پر پوری گواہی دیتی ہین۔

سید حسین بلگرامی

آنریبل نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی سی۔ آئی۔ ای۔ ڈاکٹر سید علی بلگرامی مذکورۂ بالا کے برادر بزرگ ہین اور گو کہ علمی اور ادبی قابلیت مین چھوٹے بھائی بڑے بھائی پر فوقیت رکھتے ہون مگر سلک اور سیاسی زندگی مین نواب صاحب کو ڈاکٹر صاحب موصوف پر یقیناً فضیلت حاصل ہے آپ ایک عرصۂ دراز تک حیدر آباد دکن مین دولت آصفیہ کے اکثر معزز عہدون پر ممتاز رہکر سکرٹری آف اسٹیٹ ہند

شمس العلما ڈاکٹر مولوی سید علی بلگرامی

مولوی محمد عزیز مرزا۔ بی اے۔ ایم آر ۔ اے۔ ایس

کی کونسل مین منتقل ہو گئے۔ افسوس ہے کہ آپنے تصنیف و تالیف کے میدان مین کوئی معرکۃ الآرا یادگار نہین چھوڑی۔ صرف چند مضامین اور وہ اڈریس جو علی گڈہ ایجوکیشنل کانفرنس مین پڑھے گئے تھے اور "رسائل عماد الملک" کے نام سے چھپ گئے ہین ادبی دنیا مین شہرت رکھتے ہین۔ یہ کتاب تقریباً چار سو صفحہ کی ہے اور اس کے اکثر مضامین سے علی الخصوص ترقی تعلیم کے مضامین سے آپ کی قیمتی رائین بخوبی ظاہر ہوتی ہین۔ "ہوا اور پانی" کا مضمون علی الخصوص بہت عمدہ اور قابل قدر ہے۔ اور سائنٹفک ہونیکے باوجود غیر ضروری اصطلاحات سے پاک ہے۔ دائرۃ المعارف کا قیام جس کا مقصد کمیاب اور مفید عربی کتابون کا شایع کرنا تھا آپ ہی کی مبارک کوششون کا نتیجہ ہے۔ آپ نے بہت کچھ وقت قرآن شریف کے انگریزی ترجمہ پر بھی صرف کیا مگر افسوس ہے کہ وہ ناتمام رہا۔

مولوی عزیز مرزا مولوی عزیز مرزا بی اے اس زمانہ کے نہایت قابل اور مشہور نثارون مین شمار کیے جاتے تھے ۱۸۸۸ء مین علی گڈہ کالج سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کر کے حیدرآباد مین ملازمت اختیار کی یہان مختلف جگہون پر رہنے کے بعد ہوم سکرٹری کے جلیل القدر عہدے پر فائز ہوئے۔ یہ نہایت قابل تعریف بات ہے کہ وہ اپنے عہدہ کے اہم فرائض منصبی کی انجام دہی مین بھی اتنا وقت نکال لیتے تھے جس کا بیشتر حصہ تصنیف و تالیف اور مشاغل علمیہ مین صرف ہوتا تھا۔ تصانیف حسب ذیل ہین (۱) نواب فتح نواز جنگ مولوی مہدی حسن کے انگریزی سفرنامہ انگلستان کا ترجمہ جو "گلگشت فرنگ" کے نام سے مشہور ہے (۲) شاہان بہمنی کے مشہور وزیر خواجہ جہان عماد الدین محمود گاوان کے حالات زندگی موسوم بہ "سیرۃ المحمود"[1] (۳) کالیداس کا مشہور ڈراما "وکرم اروسی" کا اردو ترجمہ۔ جسکے شروع مین ایک فاضلانہ مقدمہ ہے جس مین سنسکرت ڈراما کی اصل اور نوعیت کے متعلق بہت سی مفید باتین لکھی ہین۔ انکو پرانے سکّے جمع کرنیکا بھی بہت شوق تھا چنانچہ اُنکا مجموعہ سکہ جات بہت اعلیٰ درجہ کا خیال کیا جاتا تھا۔ اکثر جرائد و اخبارات مین جو مضامین لکھتے تھے وہ "خیالات عزیز" کے نام سے

[1] اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن عکسی تصاویر اور نقشون کے ساتھ مصنف مرحوم کے لایق فرزند کی طرف سے نظامی پریس بدایون سے حال مین شائع ہوا ہے ۱۲۔

شایع ہو گئے ہین۔ انکو بھی علی گڈھ کالج کی ترقی بلکہ عموماً مسلمانون کی ترقی تعلیم سے بڑی دلچسپی تھی ۱۹۰۹ء
مین ملازمت سے کنارہ کش ہو کر آل انڈیا مسلم لیگ کے جنرل سکرٹری ہو گئے تھے جس مین نہایت
ہوشیاری اور قابلیت سے اپنے فرائض منصبی انجام دئے تھے۔ اُن کا انتقال ۱۹۱۲ء مین ہوا۔ طرز تحریر
نہایت سلیس اور دلکش ہے۔ بیجا لفاظی اور تطویل سے بہت بچتے ہین۔ اپنے زمانہ کے مشہور نثر
نگارون مین خیال کئے جاتے تھے۔

مولوی عبدالحق سکرٹری انجمن ترقی اُردو

زمانۂ موجودہ کے مشہور افاضل اور مصنفین مین مولوی عبدالحق صاحب قابل مدیر رسالہ "اُردو" اور آنریری سکرٹری انجمن ترقی اُردو کا اسم گرامی
خاص طور پر نمایان ہے۔ سچ پوچھئے تو جس قدر زبان اُردو کی ترویج و ترقی اس وقت دکن مین
ہے وہ آپ ہی کی ذات بابرکات کی بدولت ہے۔ آپ ہی انجمن مذکور کے روح روان اور
آپ ہی کے ہاتھ مین اسکے کل کاروبار کی عنان ہے۔ انجمن نے آپ ہی کے زیر ہدایت و سرپرستی
نہایت مفید اور عمدہ کتابین خواہ از قسم تالیفات یا تراجم بکثرت شایع کی ہین اور اکثر مطبوعات
انجمن پر جو مفید اور فاضلانہ مقدمے اور دیباچے ہین وہ آپ ہی کے رشحات قلم کے نمونے ہین
جنسے آپ کی تحقیقات علمیہ اور معلومات کا پورا پتہ چلتا ہے۔ انکے علاوہ جو مضامین آپ رسائل
وغیرہ مین لکھتے رہتے ہین وہ بھی نہایت موقر اور پُراز معلومات ہوتے ہین۔ الحق آپ کی ذات
ہمارے لئے بہت غنیمت اور یقیناً آپ کی شخصیت بہت زبردست ہے۔ آپ نے تمام
عمر ادب اُردو کی خدمت مین صرف کر دی اور اسی کی بدولت ہمکو آج یہ دن نصیب ہوا کہ صدہا
پُرانے قلمی نسخے جو گوشۂ گمنامی مین پڑے پڑے ضایع ہو جاتے آج زیب قرطاس ہو کر ہماری
آنکھون کو روشن کر رہے ہین اور قدیم تاریخ نظم و نثر اُردو سے جسقدر ہم اسوقت بہرہ مند ہین وہ بھی
زیادہ تر آپ ہی کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے ایک عرصہ دراز تک آپ نے نظام گورنمنٹ کے محکمہ تعلیم مین
کام کیا۔ مثل اکابر سلف کے آپ حد درجہ منکسر المزاج اور خاموش کام کرنیوالون مین ہین اور اسی وجہ
سے اپنے زندگی کے حالات تک دینے سے گریز فرماتے ہین۔ قوت نقد آپ مین بہت زبردست ہے

اور آپ کی تنقیدات ہمیشہ غیر جانبدارانہ اور منصفانہ ہوتی ہین - اُردو نثارون مین آپ کا مرتبہ بہت بلند ہے اور سب سے بڑی خوبی آپ کی تحریر مین یہ ہے کہ آپ کبھی عمدہ ہندی الفاظ کو نہین چھوڑتے بلکہ اُن کو اپنی عبارت مین نہایت خوبی اور استادی کے ساتھ کھپاتے جاتے ہین - البتہ آپ کی عبارت کا مثل مولانا آزاد وغیرہ کے کوئی خاص طرز نہین جو لوگ آزاد کے طرز اور اُن کی شوخیون کو پسند کرتے ہین انکو ضرور آپ کی عبارت روکھی پھیکی اور بے مزہ معلوم ہوگی - مگر اس سے کسی کو انکار نہو گا کہ آپ کو زبان پر پوری طرح قدرت حاصل ہے - ہمارے نزدیک آپ کی تحریر کا رنگ اگر کسی سے ملتا ہے تو وہ مولانا حالی ہین بلکہ زمانہ حال کی ضروریات اور جدت طرازیون کا لحاظ رکھا جائے تو اُن پر آپ سبقت لیگئے ہین - علاوہ دیگر کمالات کے جس سے آپ متصف ہین سب سے بڑی صفت آپ مین یہ ہے کہ آپ نے اس عہد مین اپنے اثر سے لوگون کے دلون مین زبان کا خاص شوق پیدا کر دیا ہے -

مولوی وحید الدین سلیم مثل مولوی عبد الحق صاحب کے مولوی سید وحید الدین صاحب سلیم بھی زمانہ موجودہ کے نامور نثارون اور محسنین زبان اُردو مین ہین - آپ مشہور خاندان سادات سے ہین جنھون نے پانی پت مین توطن اختیار کر لیا تھا جہان آپکے پدر بزرگوار حاجی مولوی فرید الدین صاحب کو شاہ شرف بو علی قلندر کے مزار پر انوار کی تولیت کا شرف حاصل تھا - مولوی صاحب موصوف ابتدائی تعلیم سے فراغت حاصل کر کے لاہور گئے جہان آپنے ادب عربی کی تکمیل مولانا فیض الحسن سہارنپوری سے کی اور معقول و منقول مولانا عبد اللہ ٹونکی سے پڑھا - زبان انگریزی مین انٹرنیس کا امتحان پاس کیا اور فارسی مین منشی فاضل کا درجہ حاصل کیا - ابتدا مین قانون کی طرف کچھ میلان خاطر تھا مگر اس خیال کو ترک کر کے ریاست بہاولپور مین صیغہ تعلیم مین کوئی جگہ حاصل کی جہان کچھ عرصہ تک قیام کر کے رامپور ہائی اسکول کے ہیڈ مولوی ہو گئے مگر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد آپ کے قدر دان و مربی جنرل عظیم الدین خان کے قتل کا ناگوار واقعہ پیش آیا تو ترک تعلق کر دیا - کچھ دنون اپنے وطن پانی پت مین مطب بھی کھولا تھا اور ایک دواخانہ بھی قایم کیا تھا -

اسکے بعد مولانا حالی کی وساطت سے سر سید مرحوم کی خدمتمین باریابی ہوئی وہ آپ کو دیکھکر بہت خوش ہوئے اور آپ کی وجاہت اور قابلیت کا انکے دل پر بہت اثر ہوا۔ سلیم صاحب سرسید کے پرایوٹ سکریٹری ہوگئے اور عام طور پر انکی تصنیفات اور مضمون نگاری مین اعانت کرنے لگے۔ سید صاحب کے ساتھ انکے مرتے دم تک رہے۔ اس کے بعد اپنا رسالہ "معارف" نکالا جو کچھ عرصہ تک کامیابی سے چلا پھر نواب محسن الملک کے اصرار سے علی گڑھ گزٹ کے اڈیٹر ہو گئے مگر تھوڑے دنون بعد بوجہ علالت کے اسکو ترک کر دیا۔ اسکے بعد مسلم گزٹ لکھنؤ کے اڈیٹر ہوے مگر مسجد کانپور کے ہنگامے کے متعلق کچھ تیز مضامین لکھنے کی درجہ سے یہ جگہ بھی چھوڑنا پڑی پھر اخبار زمیندار کے اسٹاف مین بحیثیت چیف اڈیٹر داخل ہوے لیکن جب اسکی ضمانت ضبط ہوگئی تو ان کو بھی اپنے تعلقات اخبار سے منقطع کرنا پڑے۔ انکی مضمون نگاری اور ترجمہ کی شہرت نے حیدرآباد کے دارالترجمہ کیطرف انکو گھسیٹا جہان انکی مشہور کتاب "وضع اصطلاحات" تصنیف ہوئی۔ جب عثمانیہ یونیورسٹی کا قیام ہوا تو پہلے وہ اسسٹنٹ پروفیسر اردو مقرر ہوئے مگر چار برس کے بعد پورے پروفیسر ہو گئے۔

آپ کا طرز تحریر نہایت زوردار سلیس اور معنی خیز ہے، کہین کہین آپ جذبات نگاری سے بھی کام لیتے ہین۔ آپ اس زمانہ کے اکثر مشہور جرائد اور رسائل مین مفید مضامین لکھتے رہتے ہین علی الخصوص آپکے مضامین "تلسی داس کی شاعری"، "اندو دیومالا" اور "عرب کی شاعری" جو رسالہ "اردو" مین چھپے تھے نہایت اعلیٰ درجہ کے اور قابل پڑھنے کے ہین۔ اک بڑی صفت آپ کی تحریر مین یہ ہے کہ آپ غیر مانوس فارسی اور عربی الفاظ کے زیادہ شایق نہین بلکہ مثل مولانا حالی کے ہندی کے شیرین اور سریلے الفاظ اپنی تحریرون مین بے تکلف استعمال کرتے ہین۔ آپ کی قابل قدر تصنیف "وضع اصطلاحات" نہایت مفید اور اعلیٰ درجہ کی کتاب ہے جس سے آپ کے تبحر علمی اور تحقیق کا پتہ چلتا ہے۔ اسمین زبان اردو کی اصل کا نہایت غور سے مطالعہ کیا گیا ہے اور جدید سائنٹفک اور ٹکنیکل الفاظ اور محاورات وضع کرنیکے لئے نہایت مفید قواعد قائم کئے ہین۔[1]

---

[1] افسوس ہے کہ مولوی صاحب موصوف کا ابھی تھوڑا عرصہ ہوا کہ انتقال ہو گیا ۱۲

شیخ عبدالقادر

شیخ عبدالقادر صاحب زبان اور ادب اردو کے مستقل محسنون مین ہین۔ اب سے
تقریبًا باون ترپن برس پیشتر لدھیانہ مین پیدا ہوئے جہان آپکے اسلاف قانون گویون کے معزز
خدمات انجام دیتے تھے۔ آپ کے والد شیخ فتح الدین لدھیانہ کے محکمہ مال مین ملازم تھے۔ جسوقت
اُن کا انتقال ہوا شیخ صاحب کی عمر صرف پندرہ سال کی تھی۔ زمانہ طالب علمی نہایت ناموری اور
کامیابی سے ختم کرکے ۱۸۹۴ء مین فورمین کرسچین کالج لکھنؤ سے بی اے کی ڈگری اوّل درجہ مین حاصل
کی جسکے بعد پنجاب "آبزرور" کے اڈیٹوریل اسٹاف مین داخل ہوے اور ۱۸۹۸ء مین چیف اڈیٹر ہوے
۱۹۰۴ء مین اخبار سے تعلق ترک کرکے بیرسٹری کیواسطے انگلستان روانہ ہوے جہان حسب معمول
تین برس رہے اور اسی عرصہ مین ولایت کے اکثر مشاہیر سے ملنے اور پبلک معاملات کو بغور
مطالعہ کرنیکا خوب موقع ملا۔ بعد حصول ڈگری اکثر ممالک یورپ اور بلاد اسلامی کا سفر کیا جس سے
معلومات مین اضافہ اور خیالات مین بہت کچھ ترقی ہوئی۔ ہندوستان واپس آکر پہلے دہلی مین کام
شروع کیا تھا مگر دو برس بعد لاہور آگئے۔ ۱۹۱۱ء مین لائل پور مین سرکاری وکیل اور پبلک پراسیکیوٹر
مقرر ہوئے ۱۹۲۰ء مین یہ عہدہ ترک کرکے لاہور مین پھر بیرسٹری شروع کی اور اب ان کا شمار
درجۂ اول کے بیرسٹرون مین ہونیلگا۔ ۱۹۲۱ء مین ہائی کورٹ کے جج عارضی طور پر ہوئے اور پھر ایک
سال تک اڈیشنل جج بھی رہے۔ ۱۹۲۳ء مین لیجسلیٹو کونسل پنجاب کے ممبر منتخب ہوے اور پھر
ڈپٹی پریسیڈنٹ اور پریسیڈنٹ بھی ہوگئے۔ ۱۹۲۵ء مین پنجاب کے وزیر تعلیمات مقرر ہوئے اور
۱۹۲۶ء مین لیگ اقوام کے ساتوین اجلاس مقام جنیوا مین ہندوستان کی طرف سے بحیثیت
ڈیلیگیٹ شریک ہوئے۔ ان مناصب جلیلہ اور ادبی خدمات سے صاف ظاہر ہے کہ جسقدر امیدین
آپکے کامیاب زمانہ تعلیم مین آپکی ذات سے وابستہ تھین وہ سب پوری ہوئین۔

شیخ صاحب کو زبان اردو کے ساتھ ایک خاص عشق ہے جب آپ انڈر گریجویٹ تھے
تو آپنے اسی زمانہ مین ایک سلسلہ لکچر زبان انگریزی مین زمانہ حال کے اردو شعرا اور نثارون پر دینا شروع
کیا تھا جو ۱۸۹۸ء مین کتاب کی صورت مین شایع ہوا اور پبلک مین بہت مقبول ہوا۔ پنڈت بشن نراین در

آنجہانی نے بھی اُس کی بڑی تعریف کی تھی گو کہ اُسکے بعض نتایج اور رایون سے انکو اختلاف بھی تھا۔

سنہ ۱۹۰۱ء مین اُردو کا مشہور و معروف ماہواری رسالہ "مخزن" جاری ہوا جس نے ادب اُردو کی نہایت بیش بہا اور قابل قدر خدمات انجام دین اور فی الحقیقت ہماری زبان پر اُسنے اپنا سکہ جما دیا اس رسالہ کے اکثر مضمون نگارون کو خاص شہرت حاصل ہوئی سنہ ۱۹۱۱ء تک شیخ صاحب ہی اُسکے ایڈیٹر تھے بلکہ سنہ ۱۹۲۰ء تک وہی اُسکے آنریری اڈیٹر رہے۔ اس رسالہ کی یہ خصوصیت تھی کہ اس کے اکثر مضامین اس قدر مشہور و مقبول ہوے کہ کتاب کی صورت مین شایع ہو کر داخل کورس ہوے۔

سنہ ۱۹۱۰ء مین شیخ صاحب نے "اردو کانفرنس" کے اجلاس کلکتہ مین صدارت کی تھی اور بالفعل آپ "انجمن ارباب علم لاہور" کے صدر ہین۔

پنڈت منوہر لال زتشی پنڈت صاحب سنہ ۱۸۷۰ء مین بمقام فیض آباد پیدا ہوے جہان آپ کے والد پنڈت کنہیا لال زتشی پبلک ورکس ڈپارٹمنٹ مین ملازم تھے۔ آپ کے والد کا انتقال سنہ ۱۸۸۰ء مین ہو گیا سنہ ۱۸۹۴ء مین آپ نے بی اے کی ڈگری کیننگ کالج لکھنؤ سے حاصل کر کے سنہ ۱۸۹۷ء مین امتحان ٹریننگ نہایت عزت کے ساتھ پاس کیا۔ پہلے کسی اسکول مین ٹیچر ہوے پھر سنہ ۱۹۰۲ء مین امتحان ایم اے سے فراغت کر کے (جس مین آپ اول ہوے تھے) سنہ ۱۹۰۲ء سے سنہ ۱۹۱۰ء تک ٹریننگ کالج الہ آباد کے پروفیسر رہے اور اسی عرصہ مین آپ اکثر مضامین انگریزی ہندوستان ریویو کو اور اردو مضامین زمانہ، ادیب، اور کشمیری درپن کو بھیجتے رہے سنہ ۱۹۱۶ء مین ہیڈ ماسٹری کے بعد انسپکٹر مدارس ہوے ایک سال رجسٹرار بنارس یونیورسٹی اور ایک سال پرنسپل ٹریننگ کالج الہ آباد بھی آپ رہ چکے ہین سنہ ۱۹۱۹ء مین لوکل گورنمنٹ کے انڈر سکرٹری اور سنہ ۱۹۲۱ء مین ایک سال کیواسطے قایم مقام اسسٹنٹ ڈائرکٹر صیغۂ تعلیم رہے۔ بالفعل آپ جوبلی کالج لکھنؤ کے پرنسپل ہین۔ گلدستہ ادب" اور "ایجوکیشن ان برٹش انڈیا" (تعلیم برٹش انڈیا مین) آپ کی تصانیف سے ہین۔ اسکے علاوہ آپنے مرزا غالب اور چکبست وغیرہ پر نہایت فاضلانہ مضامین بھی لکھے ہین اور اکثر ادبی مباحثون مین نہایت ذوق و شوق سے حصہ لیا ہے آپ کو

کتب بینی کا بیحد شوق ہے اور ناقد بھی آپ اعلیٰ درجہ کے ہین - آپ کے ریویو نہایت منصفانہ اور غیر جانبدارانہ ہوتے ہین کبھی کبھی آپ نظم اردو کے پُرانے رنگ سے ناراض ہو کر زمانۂ حال کے زبردستی کے شاعرون کی خوب خبر لیتے ہین -

---

منشی دیا نرائن نگم | دنیائے جریدہ نگاری مین منشی دیا نرائن نگم کے نام سے کون ناواقف ہے - ۱۸۸۲ء مین بمقام کان پور ایک معزز کایستھ خاندان مین آپ پیدا ہوے - آپ کے دادا منشی شیو سہائے صاحب اک مشہور وکیل اور وایس چیرمین ڈسٹرکٹ بورڈ تھے نگم صاحب ۱۸۹۹ء مین کرائسٹ چرچ کالج کانپور مین داخل ہوئے اور ۱۹۰۳ء مین بی اے کی ڈگری حاصل کی - اور اسی سال اپنا مشہور پرچہ "زمانہ" نکالا جو اب تک بفضلہ نہایت کامیابی سے جاری ہے - ۱۹۱۲ء مین "آزاد" جاری کیا جو چند روز روزانہ رہکر اب ہفتہ وار ہوگیا ہے - ۱۹۱۵ء مین آپ آنریری مجسٹریٹ ہوئے -

بالفعل آپ مختلف مصروفیتون کے مرکز ہین جسمین معاشرتی سیاسی، علمی، ادبی، تعلیمی، اخباری، غرضکہ ہر قسم کے مشاغل اور مصروفیتین شامل ہین - سوشل رفارم (اصلاح معاشرت) کے معاملات مین آپ نہایت روشن ضمیر اور آزاد خیال - اور سیاسیات مین آپ اعتدال پسند ہین تعلیمی اور ادبی مشاغل مین خاصکر آپ کو توغل ہے اور بحیثیت اک مدیر اور جریدہ نگار کے تو آپ ہمارے نوجوانون کے لئے خضر طریقت ہین کہ وہ آپ کی مثال کو دیکھین اور آپ کی کامیابی سے سبق حاصل کرین - آپ نے اپنی پوری عمر اپنے پیارے "زمانہ" کی بہبودی اور ترقی مین صرف کر دی اسی وجہ سے وہ عرصہ زائد بیس سال سے اس نمایان کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے "زمانہ" ہمارے صوبہ کا بہت پُرانا ماہوار رسالہ ہے اور اس کا شمار اردو کے ان مخصوص چند پرچون مین ہے جو فی الواقع زبان کی سچی خدمت کرتے ہین - اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس مین قابل ہندو اور مسلمان دونون بلا تفریق مذہب و ملت مضامین لکھتے ہین اسکی تنقیدین نہایت اعلیٰ درجہ کی ہوتی ہین اور اس مین معاشرتی اور سیاسی مضامین پر ایسے اہل قلم کے مضامین درج ہوتے ہین جو اپنے اصابت رائے

کیواسطے مشہور ہین۔خود منشی صاحب کے مضامین جب کبھی نکلتے ہین نہایت بچے تلے اور غیر جانبدارانہ ہوتے ہین مگر ہمکو افسوس اور شکایت ہے کہ اُنکے مضامین سے پرچہ زیادہ تر فیضیاب نہین ہوتا۔منشی صاحب ہندوستانی اکاڈیمی کے ایک پُرجوش اور سرگرم ممبر بھی ہین۔

لالہ سری رام دہلوی۔ایم۔اے لالہ سری رام صاحب اک مشہور خاندان سے تعلق رکھتے ہین جسکی شہرت اور عظمت کیواسطے یہ کیا کم ہے کہ اُس کا سلسلہ جا کے اکبر کے مشہور وزیر راجہ ٹوڈرمل سے ملجاتا ہے لالہ صاحب کے آبا و اجداد سلاطین مغلیہ کے عہد مین ہمیشہ معزز و ممتاز رہے ہین۔آپ کے پدر گرامی آنریبل رائے بہادر مدن گوپال صاحب۔ایم۔اے۔بیرسٹرایٹ لا کے اسم گرامی سے دلّی اور لاہور کا بچہ بچہ واقف ہے اور آپ کے عم نامدار رائے بہادر ماسٹر پیارے لال صاحب آشوب کو کون نہین جانتا کہ اک مشہور و معروف اُستاد اور ماہر فن تعلیم صوبہ پنجاب مین گذرے ہین اور خواجہ الطاف حسین حالی اور مولوی محمد حسین آزاد کے معاصر اور دوست تھے لالہ صاحب موصوف ۱۸۷۵ء مین دلی مین پیدا ہوئے اور وہین ابتدائی تعلیم سے فراغت کرکے بارہ برس کی عمر مین والد کے ہمراہ لاہور گئے ۱۸۹۵ء مین۔بی۔اے کی ڈگری حاصل کی اور ۱۸۹۸ء مین۔ایم۔اے۔اور منصفی کا امتحان پاس کرکے منصف مقرر ہوے اور لاہور امرتسر دلّی وغیرہ کی کرسی منصفی کو چند سال تک زینت دیتے رہے مگر دمہ کے موذی مرض مین مبتلا ہوجانیسے ۱۹۰۸ء مین سرکاری ملازمت ترک کرنا پڑی اور علمی شاغل اور اپنی وسیع ریاست کے اہتمام و انتظام مین ہمہ تن مصروف ہوگئے۔آپ اک اعلی درجہ کی علمی قابلیت رکھنے کے علاوہ نہایت خوش تقریر خلیق اور ملنسار واقع ہوئے ہین اور آپ کا خاندان ہمیشہ سے علم و فضل امارت و سخاوت اور پبلک خدمات کیواسطے ضرب المثل ہے اور اسپر مولانا جامی کا یہ شعر پورے طرح صادق آتا ہے ؎

این سلسلہ از طلاے ناب است | این خانہ تمام آفتاب است

تذکرۂ ہزار داستان المعروف بہ خمخانۂ جاوید

لالہ سری رام صاحب اس عدیم المثال تذکرہ کے مصنف ہین جو افسوس ہے کہ آپ اتمام کو نہین پہونچا یعنی اس کی چار ضخیم جلدین چھپ گئی ہین اور تقریباً چار ابھی باقی ہین۔ یہ شعرا اردو کے حالات کا خزانہ اور ان کے منتخب کلام کا مجموعہ ہے اور اسکو بالاستیعاب مطالعہ کرنیسے سمجھ مین آسکتا ہے کہ اس کے ترتیب اور تدوین مین کسقدر وقت اور روپیہ صرف ہوا ہوگا اور کس قدر تحقیق و تلاش اور کس قدر محنت کرنا پڑی ہوگی۔ اس کی ابتدا کے حالات فاضل مصنف نے جلد اول کے دیباچہ مین منفصل طور پر بیان کئے ہین۔ اسکی چار جلدین سنین ذیل مین شایع ہوئین یعنی جلد اوّل سنہ ۱۹۰۶ء جلد دوم سنہ ۱۹۱۱ء جلد سوم سنہ ۱۹۱۵ء اور جلد چہارم سنہ ۱۹۲۶ء مین اس لاجواب تذکرہ کو اگر معلومات کی کان کہین تو بجا ہے اور اگر اسکو تاریخ الشعرا کی جان سمجھین تو زیبا ہے۔ اس نے صدہا بھولے بھٹکے شاعرون کو روشناس خلق کیا جس مین بعض ایسے بھی ضرور ہین کہ جن کا کلام ہم تک نہ پہونچتا تو کوئی زیادہ حرج نہ تھا۔ انداز بیان اس کا اس قدر متین اور مہذب ہے کہ اچھون کا تو ذکر کیا بُرون کو بھی اچھا کر دکھایا ہے۔ بعض جگہ کچھ غلط بیانیان بھی ہوگئی ہین مثلاً شاہ ولی اللہ صاحب کو شاعر دکھایا ہے اور ان کا تخلص اشتیاق بتایا ہے جسکی غلطی سے مولانا حالی نے متنبہ کر دیا۔ اسی طرح تعشق کو انس کا بیٹا بتایا اور اس غلطی کو منشی حسن مرزا اثر لکھنوی نے اپنی فاضلانہ تقریظ مین درست کر دیا۔ مگر انسان انسان ہے اور "الانسان مرکب من الخطاء والنسیان" مشہور ہے۔ فاضل مصنف نے انتخاب کلام مین واقعی کمال دکھایا ہے کہ ہر شاعر کے صرف چوٹی کے اشعار منتخب کئے جو فی الواقع بڑی سلامتی مذاق اور صابت رائے کی دلیل ہے۔ عبارت اسقدر سلیس اور بامحاورہ فصیح و بلیغ کہ چشم بد دور کہنے کو جی چاہتا ہے اور مضامین اس درجہ اعلیٰ و ارفع کہ نور علیٰ نور کہنے کو جی چاہتا ہے۔ تمام و اختتام کے بعد یہ تذکرہ بے نظیر و بے عدیل الحق ہوگا اور نظم اردو کا انسائیکلوپیڈیا یعنی قاموس الاعظم کہلائے جانیکا بے شک مستحق ہوگا اور کیون نہ ہو یہ قابل مصنف لالہ سری رام صاحب کی عمر بھر کی محنت اور ہمارے عہد کی بہترین ادبی خدمت ہے۔ تمام تذکرہ نویس اس زمانہ کے اس کے مرہون منت اور خوشہ چین ہین اور سب سے بڑھکر مولف کتاب ہذا بالیقین ہے۔ اگر کسی کو تقریظون کی بہار اور ریویو کے لائی آبدار دیکھنا ہون

تو وہ اس کی جلدون کے آخری صفحات پڑھے اور دیکھے کہ کن کن لوگون نے کس کس انداز اور کس کس ادا سے نظم و نثر دونون مین کیا کیا گلفشانیان اور سحر بیانیان کی ہین - ہمارے نزدیک اتنی کثرت سے اور اتنے اعلیٰ درجہ کے ریویو کسی ایک کتاب پر ہرگز نہوے ہونگے - لالہ سری رام صاحب نے ۱۸۹۸ء مین دیوان انور اور ۱۹۰۲ء مین مہتاب داغ اور ضمیمہ یادگار داغ بھی نہایت عمدگی سے شایع کیا تھا ظاہر ہے کہ ایسے جامع تذکرہ کی فراہمی کیواسطے کتنی کتابین کتنے صرف کثیر سے جمع کرنی پڑی ہونگی ع درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا - اسی وجہ سے موصوف کا کتب خانہ جسمین اکثر نادر قلمی کتابین اور تصاویر بھی ہین دیکھنے کے قابل ہے - اور آپ بالفعل اسی ادبی فضا مین بکمال فراغت ایک قابل رشک زندگی بسر کرتے ہین - اور خواجہ حافظ کے اس شعر کے کم از کم دوسرے مصرع کے ضرور مصداق ہین[1]؎

دو یار زیرک و از بادۂ کہن دو منے　　فراغتے و کتابے و گوشۂ چمنے

دیگر نثاران اُردو

موجودہ زمانہ مین اُردو نثارون اور ناقدان سخن کی اتنی کثرت ہے کہ ان تمام اصحاب کے مختصر حالات لکھنا بھی تطویل کا باعث ہوگا - لہذا یہان بعض ارباب ادب کے صرف نام بتائے جاتے ہین - اُنکے مفصل حالات معہ موجودہ شعرا کے ذکر کے ایک دوسری کتاب مین جو ہم تیار کر رہے ہین انشاء اللہ ضرور جگہ پائینگے -

(۱) پنڈت بشن نراین در آنجہانی - اُردو کے بڑے مبصر ہونیکے علاوہ شاعر شیرین سخن بھی تھے اُردو ادب پر اُردو اور انگریزی دونون مین نہایت فاضلانہ تنقیدی مضامین لکھتے رہتے تھے - علی الخصوص وہ مضامین جو سرشار کے متعلق ہین - اور شیخ عبدالقادر کی کتاب "نیو اسکول آف اُردو لٹریچر" (جدید ادب اُردو) پر جو فاضلانہ تقریظ لکھی ہے نہایت دلچسپ و معلومات سے پُر ہے -

(۲) مرزا جعفر علیخان صاحب اثر لکھنوی ڈپٹی کلکٹر زمانہ حال کے نہایت خوشگو شاعر اور قابل سخن سنج ہین - اُنکے مضامین میر و سودا سے ہم نے بھی بہت کچھ فائدہ اٹھایا - کلام نہایت سلیس صاف اور زور دار ہوتا ہے -

(۳) احسن مارہروی فن تنقید مین بلند مرتبہ رکھتے ہین دیوان ولی کو نہایت قابلیت سے اڈیٹ کیا

[1] نہایت افسوس سے سنا جاتا ہے کہ تھوڑے عرصہ سے لالہ سری رام صاحب سخت علیل ہین خدا انکو صحت جلد عنایت کرے -

شیخ عبدالقادر بی-اے-پی-ایچ-ڈی

لالہ سری رام صاحب ایم-اے-مؤلف خمخانۂ جاوید

کتاب "اُردو لشکر" بھی انکی تصنیف ہے جسمین نظم اردو کی درجہ بدرجہ ترقی کو نہایت خوبی سے دکھایا ہے خیالات آزاد اور زبان زوردار ہوتی ہے مگر بعض اوقات ذاتیات کی بحث سے بدمزگی پیدا ہوجاتی ہے جس سے ہمارے نزدیک احتراز کرنا چاہئے۔

(۴) حامداللہ آفسر رشید احمد صدیقی۔ سید مسعود حسن رضوی۔ اور جلیل احمد قدوائی یہ سب زبان اُردو کے اعلیٰ درجہ کے ادیب اور ناقد ہین۔

(۵) اسی طرح پروفیسر نامی۔ پروفیسر ضامن علی الہ آباد یونیورسٹی کے لکچرار اردو بھی ادب اُردو مین بڑی بصیرت رکھتے ہین۔

(۶) حسرت موہانی۔ نظم اُردو اور فن تنقید کے ایک استوار ستون ہین۔ مضامین گو کہ مختصر لکھتے ہین مگر اور تخیل اور بہت طبیعت داری کے ہوتے ہین۔

(۷) خان بہادر مرزا سلطان احمد صاحب کثیر التصانیف ہین مختلف مضامین پر صفائی اور سلاست سے مگر عام رنگ مین لکھتے ہین۔

(۸) سلطان حیدر جوش ایک مخصوص رنگ کے نہایت عمدہ لکھنے والے ہین جنکے مضامین سے النا ظر کے صفحات کو زیب و زینت ہوتی ہے۔

(۹) سید سجاد حیدر یلدرم۔ نثر افسانہ نما بہت خوب لکھتے ہین۔ عبارت بہت دلفریب اور اُسمین ایک خاص نشتریت ہوتی ہے۔ ترکی جانتے ہین۔ اور ایک ترکی ناول اور ایک ترکی ڈرامہ موسوم بہ خوارزم شاہ کا اُردو مین ترجمہ بھی کیا ہے۔ انکا مجموعۂ مضامین "خیالستان" مشہور ہے۔

(۱۰) مولانا ظفر علیخان ادبی اور اخبار نویسی کی دنیا مین خاص شہرت رکھتے ہین۔ زبردست مضمون نگار اور محسن زبان ہین۔ انکے کئی تصانیف انجمن ترقی اُردو کے ذریعہ سے چھپ چکی ہین۔ سیاسی مضامین لکھنے کا ایک خاص انداز ہوتا ہے۔

(۱۱) مولانا ہاشمی فریدآبادی۔ ادبائے دکن مین خاص طور سے ممتاز ہین۔ تصانیف بہ کثرت رکھتے ہین

(۱۲) مہدی حسن بہت اچھے نفظی مصور اور صاحب طرز تھے۔ اُنکی کتاب افادات مہدی مشہور ہے

افسوس کہ نوجوانی کی موت نے اُنکی ہونہار زندگی کو قطع کر کے آئندہ امیدون کا خاتمہ کر دیا ۔

جدید نثر اُردو کے دو طرز

زمانۂ حال مین نثر اُردو اتنی کثیر الاشکال ہے اور ادیبون نے اسقدر علیحدہ علیحدہ طرز انشا اختیار کیے ہین کہ اُن سب کا استقصا اور انپر رائے زنی کرنا دشوار ہے لہذا ہم یہان صرف دو طرزون کا مختصراً ذکر کرتے ہین ۔

پہلا طرز۔ عربی اُردو اور اُسکے مقابلہ مین بھاشا آمیز اُردو

اکثر لوگون کا میلان طبع اس طرف ہے کہ عبارت مین مشکل اور غیر مانوس فارسی عربی الفاظ بالقصد استعمال کیے جائین۔ تاکہ عبارت شاندار اور وقیع معلوم ہو۔ ممکن ہے کہ اس طرز کی ابتدا اسطرح ہوئی ہو کہ سر سید اور انکے رفقا اور مقلدین اُنکی تقلید مین نہایت سیدھی سادی مگر زور دار عبارت لکھنے کے عادی ہو گئے تھے۔ بعد کو بعض جدت پسند طبایع کو جب وہ روکھی پھیکی بدمزہ معلوم ہونے لگی تو اُسمین رنگینیت اور علمیت کی چاشنی پیدا کرنیکے لئے عربی فارسی الفاظ کا بکثرت استعمال کیا جانا ضروری سمجھا گیا۔ گویا اس طرز کو سر سید مرحوم کے طرز کا ردّ عمل کہنا چاہئے ۔ ہمارے خیال مین اس طرز کے مخترع مولانا ابو الکلام آزاد ہین جنہون نے اپنے مشہور اخبار الہلال مین اسکو بہت برتا۔ مولانائے موصوف مذہب اور سیاسیات پر بڑے زبردست لکھنے والون مین ہین۔ اور خود اُنکے تحریرون مین اس قسم کی خرابیان اور لغزشین مطلق نہین ہوتین جو انکے مقلدین کے یہان بکثرت پائی جاتی ہین جنکی عبارتین سوائے تسلسل الفاظ کے کوئی خوبی نہین رکھتین ۔ یہ طرز تحریر اُس جماعت کو نہایت پسند آیا جو چاہتے ہین کہ اہل اسلام کے مختص علوم مثلاً فقہ تفسیر حدیث وغیرہ کی نشر و اشاعت ہو اور اس ذریعہ سے لوگون مین مذہبی جذبات پیدا ہون۔ اس کے بالمقابل اور اُسی کے جواب مین ایک فرقہ نے سنسکرت اور ہندی کے الفاظ بکثرت استعمال کرنا شروع کیے۔ مگر غنیمت ہے کہ اس قسم کی تحریرین خواہ وہ کیسی ہی نیک نیتی پر محمول ہون ایک مختصر جماعت تک محدود ہین۔ اور بہی خواہان اردو نے اس بدعت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ہے ۔

دوسرا طرز۔ خیالی یعنے ٹیگوری اُردو

طرز مذکورۂ بالا کے ساتھ ساتھ ایک دوسرا طرز بھی مروج ہے جو خیالی اُردو کہا جا سکتا ہے۔ اُسکو ٹیگوری اُردو بھی کہہ سکتے ہین اسوجہ سے کہ یہ رابندر ناتھ ٹیگور کے اس طرز کا

تتبع ہے جو اُنھون نے اپنی تصانیف گیتان جلی وغیرہ مین اختیار کیا ہے - سچ پوچھئے تو ٹیگور اور بعض
مشہور انگریزی انشاپردازون کا حقیقی تتبع نہین بلکہ اُنکے کلام کی محض نقل ہے جسمین اُن لوگون کے محاسن
کلام مطلق نہین پائے جاتے - یہ نقال نہ تو اصلی تصوف سے واقف ہین اور نہ اُن مین حقیقی تخیل
کی روح ہے ایسے لوگون کی انشاپردازی سوائے چند مستثنیات کے عام طور پر بالکل خام ہوتی ہے - اسمین
کسی قسم کا ادبی حُسن نہین ہوتا بلکہ زیادہ تر مبالغہ آمیز اور مطلق العنان اور سطحی ہوتی ہے - اور بعض اوقات
تو وہ مجذوب کی بڑ سے زیادہ وقعت نہین رکھتی - اِن غیر مسلک پوتون کو بسا اوقات انکے صناع
قیمتی سچے موتی خیال کرتے ہین - بعض وقت اس قسم کی تحریرین غیر مہذب بلکہ فحش درجہ تک پہونچ
جاتی ہین - اس قسم کی نثر کی ابتدا افسانہ نویسی سے ہوئی - اس سے لوگون کو بہت لطف آنے لگا
اور نئی معلومات کے راستے کھل گئے - مضامین مین وسعت اور تنوع اور عبارت مین ایک خاص شان
اور رنگینی اُس سے پیدا ہوئی - صاحب تحریر بے تکلف صاحب طرز بن بیٹھے اور اپنے مفروضہ شاعرانہ
خیالات اور شاعرانہ انداز کو بلا عروض کے جھنجھٹ کے نثر کی صورت مین اکڑ اکڑ کر دکھانے لگے تاکہ
لوگ اُن کو نثار شاعر سمجھنے لگین - اور یہ اسطرح ہوا کہ کبھی تو عبارت عربی الفاظ اور ترکیبون کا مجموعہ بنگئی کبھی
جدت کے واسطے نئے نئے الفاظ اور ترکیبین تراشی گئین اور کبھی ایک خاص زور اور انداز پیدا کرنیکے
واسطے معمولی صرفی نحوی ترکیبین الٹ پلٹ کر عبارت ایک طرفہ معجون بنائی گئی - مضامین مین بھی
علیٰ ہذالقیاس عجیب و غریب تغیرات ہوئے کبھی انمین جدت اور رنگینی پیدا کرنے کیواسطے مشرقی اور
مغربی (رومی اور یونانی) دیومالا چھائی گئی کبھی نیچر کی بیجان چیزین جاندار تصور کرکے اسقدر جوش و خروش
اور ایسے مصنوعی شاعرانہ جذبات کے ساتھ اُنسے تخاطب کیا گیا کہ بعض اوقات اُسکو پڑھکر یا سنکر
بے اختیار ہنسی آتی ہے اور وہ ایک جھوٹی نمایش اور شعبدہ بازی سے زیادہ وقعت نہین رکھتی ایسے
مضامین اور ایسی عبارت البتہ ایک استاد کے قلم سے تو فی الواقع رنگ و حسن و موسیقیت کا جلوہ زار
بن سکتی ہے مگر نوآموزون کے ہاتھ مین وہ محض اک گھروندا بنکر رہجاتی ہے جسمین سوائے الفاظ
کے معنی کا کہین پتہ نہین ملتا -

پُرانی اخباری دُنیا

سنہ ۱۸۳۶ء مین پریس کو آزادی ملی سنہ ۱۸۳۶ء مین مولوی محمد حسین آزاد کے والد مولوی باقر حسین نے اردو اخبار دلی سے جاری کیا جو حقیقت مین اخبار یعنی خبرون کا مجموعہ نہین ہوتا تھا بلکہ ایک ادبی پرچہ تھا جسمین اکثر اوقات ذوق و غالب و مومن اور دیگر معاصر شعرا کی غزلین اور کبھی کبھی مطرح غزلین بھی درج ہوتی تھین۔ کبھی اسمین زبان اور محاورات کی بحث ہوتی تھی ذوق کی وفات کی تاریخین اور شہیدی کی شاعری پر مباحثہ بھی اسی مین چھپا تھا۔ گورنمنٹ اسکی سرپرستی کرتی تھی سنہ ۱۸۵۰ء مین منشی ہرسکھ رائے نے جو ایک بھٹ نگری کایستھ تھے لاہور سے کوہ نور نکالا۔ یہ پرچہ برٹش انڈیا اور دیسی ریاستین دونون مین بہت مقبول تھا مہاراجگان کشمیر و پٹیالہ اس پرچہ کی اور نیز اس کے مالک کی بڑی قدر کرتے تھے۔ پہلے وہ ہفتہ وار تھا مگر بعد کو ہفتہ مین دو مرتبہ اور پھر تین مرتبہ نکلنے لگا۔ آخر مین اسکا زوال ہوگیا اور اُنہین لوگون کے ہاتھون ہوا جنھون نے اسمین کام سیکھ سیکھ کر اُسکے رقیب دوسرے پرچے نکالنا شروع کئے۔ منشی نولکشور صاحب بھی اسکے اسٹاف مین کام کرتے تھے۔ پھر شعلۂ طور اور مطلع نور کانپور سے۔ پنجابی اخبار اور انجم الاخبار لاہور سے۔ اشرف الاخبار دلّی سے۔ وکٹوریہ اخبار سیالکوٹ سے۔ قاسم الاخبار بنگلور سے۔ کشف الاخبار بمبئی سے۔ کارنامہ لکھنؤ سے اور جریدۂ روزگار مدراس سے نکلے اور چند دنون کے بعد اکثر انمین سے بند ہوگئے۔ اودھ اخبار جسکو منشی نولکشور صاحب نے سنہ ۱۸۵۸ء مین جاری کیا تھا اب بھی نکلتا ہے۔ بلکہ اُس کا شمار ہمارے صوبے کے اعلیٰ درجہ کے اور مشہور روزانہ اخبارون مین ہے۔ شروع مین جب منشی صاحب موصوف کے زمانہ مین یہ اخبار نکلتا تھا تو یہ زیادہ تر اُن خبرون کا مجموعہ ہوتا تھا جو انگریزی اخبارون کے تارون یا نوٹون سے ترجمہ کرکے چھاپی جاتی تھین اور اسکی کوئی معینہ پالسی بھی نہ تھی سوائے اس کے کہ سیاسی شورش کے یہ ہمیشہ خلاف تھا۔ پہلے یہ ہفتہ وار تھا اُسکے بعد روزانہ ہوا۔ اس کا ساز و سامان اور اسٹاف اعلیٰ درجہ کا تھا۔ اسی کا ہم عصر شمس الاخبار تھا جو مدراس سے نکلتا تھا اور زیادہ تر مسلمانون کیواسطے مخصوص تھا یہ کوئی مشہور پرچہ نہ تھا اور تھوڑے عرصہ کے بعد بند ہوگیا۔ ایک دوسرا مشہور پرچہ اخبار عام لاہور سے ہے جسکو پنڈت مکند رام نے نکالا تھا جو کوہ نور مین ملازم تھے اور ایک پنشن یافتہ

سرکاری عہدہ دار اُسکے معاون تھے۔ یہ ایک خاص خبرون کا پرچہ تھا اور نہایت ارزان تھا۔ کچھ دنون گورنمنٹ اسکی سرپرست رہی اور ہر اسکول مین اس کے پرچے جاتے تھے مگر یہ سرپرستی اب موقوف ہوگئی۔ پہلے یہ بھی ہفتہ وار تھا اسکے بعد سہ روزہ اور دوروزہ ہوا۔ اسکی زبان اخباری زبان تھی یعنے اسمین کوئی ادبی خصوصیت نہ تھی۔ مگر یہ بات قابل تعریف ضرور ہے کہ اسکی ارزانی قیمت نے لوگون کے دلمین اخبار بینی کا شوق پیدا کردیا۔ اودھ پنچ لکھنؤ ۱۸۷۷ء مین وجود مین آیا یہ ایک ظرافت کا پرچہ تھا اور اپنے عنفوان شباب مین نہایت کامیاب۔ لوگونکو اسکا انداز اسقدر پسند آیا کہ ملک مین اس کے اکثر نقال پیدا ہوگئے۔ اسکی خاص خوبیان یہ تھین کہ آزادی سے لکھتا تھا ظریفانہ رنگ مین لکھتا تھا جسکی ملک مین بڑی ضرورت تھی۔ انشا پردازی اعلی درجہ کی ہوتی تھی اور سب سے بڑھکر یہ کہ کسی خاص فرقہ یا جماعت یا کسی خاص مذہب کا طرفدار یا مخالف نہ تھا۔ منشی سجاد حسین مرحوم اسکے قابل اڈیٹر تھے اور اکثر اس عہد کے قابل ظریف الطبع صحاب اسکے نامہ نگار تھے۔ ہندوستانی کی ابتدا لکھنؤ مین ۱۸۸۳ء مین ہوئی یہ سب سے پہلا اردو پرچہ تھا جسنے سیاسیات اور واقعات حاضرہ پر بالاستیعاب بحث کی۔ یہ ایک اعلی درجہ کا پرچہ تھا اور کبھی چھوٹی چھوٹی باتون اور جزئی مناقشون مین اپنا وقت ضایع نہین کرتا تھا۔ پہلے ہفتہ وار تھا پھر سہ روزہ ہوگیا۔ اسکی زبان مین ادبیت نہ تھی ممکن ہے کہ ترجمہ وغیرہ کی جلدی اس کا باعث ہو اسی شان کا پرچہ رفیق ہند تھا جو لاہور سے نکلتا تھا۔ پیسہ اخبار ۱۸۸۷ء مین نکلا منشی محبوب عالم صاحب اس کے اڈیٹر تھے۔ اسکی ارزان قیمت اور مضامین کی عمدگی سے لوگ اس کو بہت زیادہ پڑھتے تھے اور اسی وجہ سے اسمین اشتہارات بکثرت نکلتے تھے۔

ادبی اُردو رسالے

اس قسم کے رسالون مین مولانا شرر مرحوم کا دلگداز بہت پرانا رسالہ ہے جو اب بھی نکل رہا ہے۔ زمانہ کانپور کا ذکر منشی دیا نراین صاحب نگم کے ذکر مین گزر چکا۔ ادیب الہ آباد بھی نہایت عمدہ رسالہ تھا مگر افسوس ہے کہ تھوڑے دنون مین اسکی عمر ختم ہوگئی۔ الناظر جسکے قابل اڈیٹر مولنا ظفر الملک صاحب علوی ہین نہایت آزاد خیال اور بڑی قابلیت کا پرچہ ہے۔

ہزار داستان لاہور مین صرف چھوٹے افسانے اور ناول نکلتے ہین - ہمایون لاہور اور شباب اُردو لاہور بھی اپنی صنف مین عمدہ پرچے ہین - نگار لکھنؤ (جو پہلے بھوپال سے نکلتا تھا) ایک اعلیٰ درجہ کا ادبی پرچہ ہے اور اپنے "فاضل ایڈیٹر نیاز فتحپوری کی شخصیت کا پتا دیتا ہے - معارف اعظم گڈہ اور اردو اورنگ آباد یہ دونون زمانۂ موجودہ کے بہترین ادبی رسالے ہین جنکے اکثر مضامین نہایت اعلیٰ درجہ کے ہوتے ہین - سہیل علی گڈہ گو کہ حال ہی مین طلوع ہوا نہایت ہونہار رسالہ ہے اسکے مقاصد بہت اعلےٰ ہین اور اگر ترقی کرتا رہا تو اسکا شمار بہترین اردو رسایل مین ہو جایگا - مولانا حسرت موہانی کا اردوے معلیٰ ایک زمانہ مین بہت مشہور تھا مگر اب ویسا نہین ہے - مرقع لکھنؤ اور اکبر الہ آباد سے نکلتے ہین مخزن نے ادب اردو کی بہت بیش بہا خدمات انجام دی ہین مختصر یہ کہ سب رسایل کو نام بنام گنوانا بہت مشکل ہے - مگر اُن پرچون مین جو ایک زمانہ مین شہرت رکھتے تھے اور اب بند ہوگئے دکن ریویو حسن اور العصر قابل ذکر ہین -

اکثر اخبار نویسون کے حالات اُنکے نام کے تحت مین درج کئے گئے ہین مولانا ظفر الملک علوی بشیر احمد ایڈیٹر البشیر - اور تاجور نجیب آبادی خاص طور پر قابل ذکر ہین اس وجہ سے کہ یہ حضرات ادب اردو کی بہت قیمتی خدمات انجام دے رہے ہین - اگر کسیکو اردو روزانہ اخبارون کے ایڈیٹرون کے نام دیکھنا ہون تو ایک مختصر کتاب "اخبار نویسون کے حالات" مولفہ محمد الدین فوق ایڈیٹر کشمیری میگزین کا مطالعہ کرین -

١٧

باب

اُردو ناول کی ابتدا

شرر اور سرشار کا زمانہ

اُردو کے پُرانے قصے "افسانہ گوئی کا شوق دنیا مین بہت قدیم اور انسان کے دل مین اس کا بہت گہرا اثر ہے" - پُرانے اُردو قصے یا تو فارسی سے ترجمہ ہوئے یا سنسکرت سے بذریعہ فارسی تراجم کے لئے گئے

یا انہین دونون چیزونکو گھٹا بڑھا کر کچھ نئے قصے گڑھ لئے گئے تھے - یہ سب اپنی نوعیت مین مختلف ہین بعض ہمت و شجاعت کے قصے ہین - بعض مین دیوون اور پریون کا ذکر ہے - بعض اخلاقی ہین اور بعض نہایت مخرب اخلاق - انداز بیان سب کا وہی لگا بندھا معمولی ہے - واقعات کا بیان قریب قریب یکسان ہے جنکو بار بار پڑھکر طبیعت اکتا جاتی ہے - عجائب و غرائب کا ذکر عام ہے - انسان دیوون اور پریون کے ساتھ بے تکلف ملتے جلتے ہین - طلسم سحر جادو ہر قصے مین کسی نہ کسی صورت سے موجود ہے بلکہ اکثر اسی پر قصے کا دارومدار ہوتا ہے - انداز بیان عام طور پر سادہ اور سبق آموز ہوتا ہے مگر کیرکٹر نویسی کا کسی مین پتہ نہین - اور نہ کوئی داخلی دلچسپی نہ کسی پلاٹ کی تعمیر ہوتی ہے - زیادہ تر حسن و عشق کے حالات' ساحرون اور جادوگرون کی لڑائیان' جادوگرون کے شاہزادونسے مقابلے' اور آدمیون کا جانورون کی صورتین بدل جانا دکھایا جاتا ہے یہ سب کچھ ہے مگر روزمرہ کے واقعات سے وہ خالی ہین -

اقسام قصص — خاص اقسام قصص حسب ذیل ہین (۱) الف لیلہ (۲) بوستان خیال (۳) داستان امیر حمزہ معہ اُسکے فروعات طلسم ہوشربا وغیرہ کے (۴) قصہ حاتم طائی رباغ و بہار وغیرہ (۵) ہندوستانی قصے جیسے بیتال پچیسی - کلیلہ منہ - سنگھاسن بتیسی - گل بکاؤلی طوطا کہانی وغیرہ -

مطبع منشی نولکشور لکھنؤ — اکثر اس قسم کے قصے مطبع منشی نولکشور مین چھپے ہین جسکے بانی خود منشی نولکشور صاحب سی - آئی - ای تھے - اس مطبع نے زبان اردو کی بڑی خدمت کی اور اُسکی ترقی پر بہت بڑا اثر ڈالا اور نادر قدیم کتابون کی اشاعت' مشہور کتب فارسی و عربی کے تراجم جدید کتابون کی پبلک مذاق کے موافق تیاری - اور نیز اسکولی کتابونکی تیاری سے ادب اردو پر بہت بڑا احسان کیا - منشی صاحب موصوف ۱۸۳۶ء مین بستوئی ضلع علی گڈھ مین پیدا ہوئے اُنکے دادا منشی بالمکند آگرہ مین سرکاری خزانچی تھے اور والد منشی جمنا داس بھی کاروبار کرتے تھے - منشی نولکشور ایک خود ساختہ آدمی تھے اور بچپنے ہی سے تجارت کی اعلی قابلیت رکھتے تھے انکو اخبارات سے بڑا شوق تھا منشی ہرسکھ رائے کی ماتحتی مین اخبار کوہ نور لاہور مین کچھ عرصہ تک رہے جہان اُنکو چھاپہ خانہ وغیرہ

کے حالات کا بہت وسیع تجربہ ہوگیا۔ غدر کے بعد ملازمت ترک کر کے لکھنؤ آگئے جہان ۱۸۵۸ء مین سر رابرٹ منٹگمری اور کرنل ایبٹ کی سرپرستی مین اپنا مطبع کھولا۔ تقدیر نے یاوری کی اور انکے کام کو روز افزون ترقی ہوتی گئی۔ اُنکی قابلیت اُنکی دیانتداری اُنکی پابندی اصول سے یہ مطبع تھوڑے ہی عرصہ مین ہندوستان کیا بلکہ ایشیا کے سب سے بڑے مطابع مین شمار کیا جانے لگا۔ منشی صاحب نے زر کثیر قیمتی نادر قلمی کتابون کی خرید مین صرف کیا جنمین سے اکثر کو شایع کر کے پبلک کو بہت بڑا فائدہ پہونچایا۔ اس مطبع سے ہزارہا عربی فارسی سنسکرت اردو ہندی کتابین بڑے صرف اور بڑے تکلف سے چھپکر شایع ہوئین۔ مختلف قسم اور مختلف قیمتون کے قرآن شریف شایع ہوئے جنسے اہل اسلام کو بہت بڑا نفع پہونچا۔ اودھ اخبار بھی ۱۸۵۸ء مین اُنھون نے جاری کیا تھا جیسا کہ اخبارات کے ذکر مین بیان ہوا۔ اُنکی موت ۱۸۹۵ء مین واقع ہوئی اور وفات کے وقت اُنھون نے تقریباً ایک کروڑ روپیہ کی جائداد اور کاروبار چھوڑا۔ انکے بعد انکے لایق فرزند رائے بہادر منشی پراگ نرائن صاحب آنجہانی نے ادب اردو و ہندی کی بڑی خدمت کی۔ اور اب اُنکے ہونہار فرزند منشی بشن نراین صاحب بھارگو اپنے والد کے قدم بقدم چل رہے ہین۔ اور نولکشور پریس آپ کی کوششون سے نہایت کامیابی سے ترقی کر رہا ہے۔

داستان امیر حمزہ صاحبقران ایک حجیم اور ضخیم کتاب متعدد جلدون مین ہے۔ اصل کتاب فارسی مین شیخ ابو الفیض فیضی نے اکبر کی تفریح طبع کے واسطے تیار کی تھی اس کے آٹھ دفتر ہین اور ہر دفتر مین سدہا صفحات کی کئی کئی جلدین ہین جنکی مجموعی تعداد سترہ اور تعداد صفحات سترہ اٹھارہ ہزار سے کم نہو گی سب سے مشہور دفتر اوّل مسمّے بہ نوشیروان نامہ دو جلدون مین اور دفتر پنجم موسوم بہ طلسم ہوشربا سات جلدون مین ہے اور مؤخر الذکر بہت مقبول عام ہے طلسم ہوشربا کی اول چار جلدون کا ترجمہ میر محمد حسین جاہ اور آخر تین جلدون کا ترجمہ احمد حسین قمر کا ہے۔ ایک منظوم ترجمہ طوطا رام شایان نے بھی کیا تھا۔ نوشیروان نامہ کا ترجمہ منشی نولکشور صاحب کی فرمایش سے شیخ تصدق حسین وطن ستان گر نے کیا تھا۔ اس کتاب مین ایک فرضی طویل افسانہ امیر حمزہ کا ہے جو پیغمبر اسلام صلواۃ اللہ علیہ والسلام
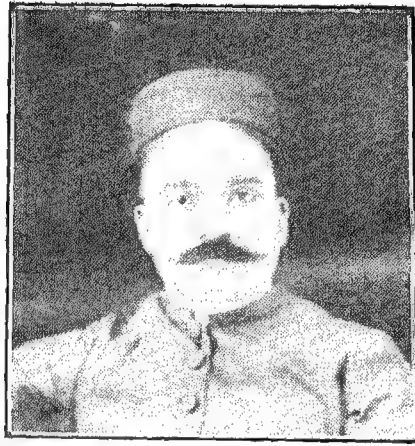
منشي نول كشور
(سي - آئي - اي)

کے علم بزرگوار تھے جس مین ایک قصہ سے سیکڑون قصے پیدا ہوتے چلے گئے ہین۔

بوستان خیال اس کی نو ضخیم جلدین ہین اور اس کے مصنف میر تقی خیال سمجھے جاتے ہین جو اصل مین گجرات کے رہنے والے تھے مگر آخر مین دلی مین آ گئے تھے۔ یہ قصہ مصنف نے اپنی معشوقہ کی دلچسپی کے لئے داستان امیر حمزہ کے رنگ مین تصنیف کیا تھا۔ اس کتاب کو محمد شاہ رنگیلے نے بہت پسند کیا اور وہ انہین کے زمانہ مین اور انہین کے حکم سے اختتام کو پہونچی۔ اسکے تقریباً چار ہزار صفحات ہین۔ پانچ جلدون کا ترجمہ اردو مین خواجہ بدرالدین معروف بہ خواجہ امان دہلوی نے اور دو جلدون کا ترجمہ لکھنؤ مین چھوٹے آغا نے کیا اور پوری کتاب پر نظر ثانی بھی کی۔

اِن سب کتابون مین بڑا عیب یہ ہے کہ صحیح جذبات نگاری اور کیرکٹر نویسی ان مین مفقود ہے۔ کوئی معین پلاٹ بھی نہین ہے۔ چند مشہور لوگون کے بعید از قیاس افسانے ہین جنمین جنات اور دیوزادون سے لڑائی اور ساحرون سے مقابلہ کا ذکر ہے۔ کبھی کبھی وہ سحر و طلسم مین پھنس بھی جاتے ہین مگر آخر مین فتحیاب نکلتے ہین اور اپنی محبوبہ کو ظالمون کے پنجہ سے نجات دلاتے ہین قصہ کے تمام واقعات مین ایسی یکسانی ہے کہ جی اکتا جاتا ہے کوئی تنوع اور جدت نہین اور روزانہ واقعات زندگی کا تو کہین ذکر نہین ہے۔ اکثر یہ قصے فورٹ ولیم کالج کلکتہ سے شایع ہوئے اور اب منشی نولکشور کے مطبع مین بڑے آب و تاب سے شایع ہوتے رہتے ہین۔

افسانہ اور ناول کی بیچ کی کڑی مرزا رجب علی بیگ سرور نے ناول کی آفرینش مین بہت کچھ مدد دی یعنے اپنی مشہور کتاب فسانۂ عجائب کی تصنیف سے لوگون کے دلونمین افسانہ کا شوق پیدا کر دیا یہ ضرور ہے کہ اسکی مصنوعی مقفٰے اور مسجع عبارت نے کہین کہین مطلب کو گنجلک کر دیا۔ اور تسلسل بیان مین فرق ڈالدیا ہے۔ واقعات معمولی اور زبان نہایت پر تصنع اور پیچیدہ ہے۔

البتہ مولوی نذیر احمد صاحب کے بعض قصے موجودہ ناول کی حدود تک پہونچ جاتے ہین گو کہ انہین بھی موجودہ اصول ناول نویسی کی پوری پیروی نہین پائی جاتی۔ وہ اوّل سے آخر تک نصیحت آمیز ہین اور کسی معاشرتی یا تعلیمی مضمون یا کسی مذہبی مسئلہ پر ایک زبردست وعظ کی حیثیت رکھتے ہین

رویائے صادقہ توبۃ النصوح مرأۃ العروس وغیرہ کی تہ مین کوئی نہ کوئی اخلاقی سبق ضرور ہے جو بہت زور کے ساتھ سکھایا گیا ہے۔ بیشک مولوی صاحب نے یہ بہت بڑا کمال کیا کہ فوق العادت اور حیرت انگیز چیزون کو اپنی تصانیف سے ایک قلم خارج کردیا اور معمولی واقعات زندگی کو ایک منظم پلاٹ کی صورت مین دلچسپی سے بیان کیا۔ اُنکی قابل قدر تصانیف جو اُس زمانہ کے رسم و رواج اور طرق و عادات کی جیتی جاگتی تصویرین ہین آئمین شک نہین کہ انکی قوت استدلال ومشاہدہ کے شاہد عادل ہین۔ زبان پر اُنکو پوری طرح قدرت حاصل ہے اور گو کہ اُنمین کہین کہین ثقالت پیدا ہو جاتی ہے مگر پھر بھی سلاست وروانی انکے ناولون کی خاص مابہ الامتیاز چیز ہے سلسلۂ واقعات بھی وہ خوب قایم رکھتے ہین گو کہ کہین کہین اس قاعدہ کی خلاف ورزی سے قصہ کے تناسب مین فرق پڑجاتا ہے۔ کیرکٹر دلچسپ مگر ضرورت سے زیادہ ادب آموز ہین۔

اودھ پنچ اور اُسکی ادبی خدمات

منشی سجاد حسین مرحوم نے لکھنؤ سے ۱۸۷۷ء مین اودھ پنچ نکالکر ہندوستانی اخبار نویسی اور ادب اردو پر احسان عظیم کیا نثر کی ایک خاص شان پیدا کی مذاق وظرافت جس سے اب تک ہمارا ادب خالی تھا داخل نثر ہوئے۔ زبان مین بلیغ الفاظ شامل کرکے گرانقدری پیدا کی پرزور طریقہ سے کتابون کی تنقید کی۔ ناول نویسی مین ترقی کی۔ اودھ پنچ سب سے پہلا اخبار ہے جسنے ایک مقرراور متین پالیسی اختیار کی۔ وہ محض خبر رسانی نہین کرتا تھا بلکہ پبلک معاملات مین اپنی آزادانہ رائے رکھتا اور قومی حقوق کا تحفظ کرتا تھا اور ہندوستانی رُوسا کا ناصح اور محتسب بھی تھا وہ اصول کانگرس کا حامی، ہندو مسلم اتحاد مین ساعی، البرٹ بل کی تحریک و ایکٹ انکم ٹیکس کے پاس ہونے کا سخت مخالف تھا لیکن اسی کے ساتھ سوشل معاملات مین بہت قدامت پرست سرسید اور انکی تجاویز کا دشمن اور تعلیم نسوان اور پردہ کے توڑنے کا بھی سخت مخالف تھا۔ غرض کہ اس اعتبار سے جدید و قدیم رنگ کا ایک عجیب مجموعہ تھا اُسکے اکثر نامہ نگار نہایت قابل اور فاضل لوگ تھے مثلاً علاوہ خود منشی سجاد حسین مرحوم کے مرزا مچھو بیگ عاشق (جو ستم ظریف کے نام سے اودھ پنچ مین مضامین لکھتے تھے) تربھون ناتھ ہجر منشی جوالا پرشاد برق۔ احمد علی کسمنڈوی

خواجہ بدرالدین خان عرف خواجہ امان مترجم بوستان خیال

اکبرالٰہ آبادی۔ نواب سید محمد آزاد جنمین سے بعض کے کچھ حالات علیحدہ بھی لکھے جائینگے۔

اودھ[له] پنچ یون تو اک ظریفانہ موقر اخبار تھا مگر کبھی کبھی اسکی ظرافت کا رنگ بدل جاتا تھا اور وہ طعن وتشنیع اور ذاتی حملو نپر اُتر آتا تھا۔ بعض مضامین کے پڑھنے سے مثلاً وہ جو فسانہ آزاد حالی۔ داغ۔ گلزار نسیم وغیرہ کے متعلق لکھے گئے ہین معلوم ہوتا ہے کہ اودھ پنچ کے صفحات مہذب اور سنجیدہ ظرافت سے گزر کر جھگڑے کا ایک میدان بنگئے ہین مگر اقسام ذیل کے مضامین نہایت قابلیت

له اس زمانہ مین لوگ اسقدر ٹھس ہوگئے ہین اور مذاق وظرافت کا اُن مین اسقدر فقدان اور اس شئے لطیف کی اُنمین اتنی کمی ہوگئی ہے کہ اودھ پنچ ایسا مبتل ہنسنے ہنسانے والا پرچہ جو مذاق کے پیرایہ مین نصیحت اور ظرافت کے ساتھ عبرت سکھاتا اور انشا پردازی کا بھی بہترین نمونہ سمجھا جاتا تھا اپنے سابق اڈیٹر منشی سجاد حسین صاحب کے ساتھ خود بھی مرگیا تھا۔ مگر خدا بھلا کرے حکیم ممتاز حسین عثمانی موجودہ اڈیٹر کا کہ اُنھون نے اُسکو زندہ کیا اور اسکے تن بیجان مین نئے سرے سے جان ڈالی۔ ایک معنی مین تو ہم حکیم صاحب موصوف کو منشی سجاد حسین مرحوم پر ترجیح دینگے اسوجہ سے کہ منشی صاحب مرحوم کے وقت مین تو بہت سے قابل اہل سخن انکے ہم مذاق اور یار ومددگار موجود اور انکا ہاتھ بٹانے کو ہر وقت تیار رہتے پبلک بھی قدردان تھی۔ حساس تھی۔ باحمیت تھی۔ اودھ پنچ کے تازیانہ ظرافت سے لوگ اسیطرح ڈرتے تھے جیسے شوخ۔ لڑکے ڈنڈے باز مولوی سے ڈرتے ہین۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ ایک بدکردار شخص جب اپنا بدنما چہرہ صفحات اودھ پنچ کے مجلے آئینہ مین دیکھتا تو اپنی ڈراونی صورت سے ڈرکر بُرے افعال سے توبہ کرلیتا اور اودھ پنچ کا خریدار بنجاتا تھا اسطرح ہم خرما ہم ثواب کے اصول پر خود اودھ پنچ کا بھی فائدہ ہوتا اور دوسرون کے اخلاق بھی درست ہوجاتے تھے۔ ع وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا۔ مگر اب وہ باتین نہین رہین لوگون کے اخلاق بدل گئے اطوار متغیر ہوگئے۔ ظرافت کے قدردان اور اس سے فائدہ اُٹھانے والے باقی نرہے۔ لوگون سے حس اور اثر پذیری کا مادہ جاتا رہا۔ اور ظرافت کا انداز بھی بدل گیا۔ مگر پھر بھی بری بھلی جیسی ہے ایسی ہے کہ اسوقت ہندوستان مین اودھ پنچ کا نظیر وعدیل نہین۔ وہ اپنی آپ مثال اور قلمرو ظرافت مین حاکم علے الاطلاق ہے۔ ہزار آفرین ہے اُسکے فاضل اڈیٹر کو کہ انھون نے اسکی روایات قدیمہ کو قایم رکھا بلکہ زمانہ حال اور ضروریات کے مطابق مضامین

اور شستگی کے ساتھ اسکے صفحات مین درج ہوتے رہے ہین۔ لکھنؤ کی معاشرتی زندگی کی جیتی
جاگتی تصویرین۔ محرم۔ چہلم۔ عید بقرعید۔ شبرات۔ ہولی دیوالی۔ بسنت۔ عیش باغ کے میلے۔
ناچ رنگ کے جلسے اور دعوتین۔ مشاعرے۔ اجلاسہائے عدالت۔ مرغ و بٹیر کی پالیان۔ الکشن
کے مقابلے وغیرہ۔

کا معیار بلند کر دیا۔ پورا پرچہ پیارے تن تنہا نکالتے ہین اور ٹھیک وقت پر نکالتے ہین جو ہفتہ وار اور ماہوار
رسالون کے لئے قابل فخر اور قابل تقلید بات ہے۔

اس موقع پر ہم ایک بات اپنے مکرم فاضل دوست سے ضرور گزارش کرینگے۔ وہ یہ کہ وہ اپنے پرچہ سے "پرانصیبن"
کا ذکر بغیر اور انکی بات چیت کا انداز ذرا کم کر دین بلکہ اگر بالکل خارج کر دین تو اور بھی اچھا ہے۔ یہ سچ ہے کہ بعض مقامات
پر انکی بھی ضرورت پڑتی ہے اور اس جنس کی بھی مانگ ہوتی ہے۔ ایکمرتبہ مولانا سابق مسٹر محمد علی اپنی ترکی ٹوپی
قبا اور عمامہ۔ دارم چرا نچو شم کے قاعدے سے سپنکر اسمبلی کے اجلاس مین تشریف لے گئے۔ پنڈت مدن موہن
مالوی انکی اس نئی دہج کو دیکھکر کہنے لگے۔ کہ آقا مولانا محمد علی ہین ہم تو سمجھے تھے کہ بیگم صاحب بھوپال آ رہی ہین۔
مولانا نے جواب دیا کہ اس جگہ جہان عورتین ہی عورتین ہین اگر آپ مجھکو بیگم صاحب سمجھے تو مجھے حیرت کی کیا بات ہے
بہرطور یہ اصول کہ اودھ پنچ کے بعض ناظرین عورتون کم یا زیادہ مرتبہ نہین رکھتے لہذا انسے ہمکلام ہونے کے لئے بھی
"پرانصیبن" کی ضرورت پڑتی ہے ایک حد تک تو ضرور صحیح اور قابل تسلیم ہے۔ مگر جب اسمین تجاوز ہو جاتا ہے اور
سیاسی علمی و معاشرتی جملہ معاملات مین جا و بیجا پرانصیبن یا انکی سہیل منشی آرائیگی دریائے لطافت کی بی نورن کی طرح
آن کر و دیرتی تھیا اور دلیرسے نانا ارون سے لیکر شیخ حبیب اللہ صاحب تک سے سیاسی اور علمی مسایل مین اپنے خاص
انداز مین ہمکلام ہونے لگتی ہین تو سمجھ مین نہین آتا کہ یا اشرافی باتون کے واسطے کیا کوئی مرد دستیاب نہین ہوتا تھا
کہ عورتون کی طرف سے اور انکی زبان مین یہ مطالب ادا کئے گئے۔ اور اس سے نفس مسئلہ اور اخبار کے ظریفانہ انداز
مین کیا اضافہ ہوا۔ ہمارے ملک مین تعلیم نسوان ابھی اس درجہ کو نہین پہونچی کہ ایسی عورتین پیدا ہو گئی ہون جو سیاسی اور
علمی معاملات مین کوئی صائب رائے رکھتی یا اسکا اظہار کر سکتی ہون۔ پھر اس تنی انچ سے اور اخبار پر تنکی ختود کا الزام
عاید کرنے سے کیا فائدہ؟

منشی سجاد حسین ایڈیٹر اودھ پنچ

منشی سجاد حسین مرحوم منشی منصور علی ڈپٹی کلکٹر کے بیٹے تھے جو گورنمنٹ سے پنشن لیکر حیدر آباد دکن گئے اور وہان سول جج ہو گئے تھے۔ منشی سجاد حسین سنہ ۱۸۵۶ع مین کاکوری مین پیدا ہوئے۔ انٹرنس کا امتحان کیننگ کالج سے پاس کر کے اور کچھ دنون مختلف ملازمتین کر کے سنہ ۱۸۷۷ع مین اپنا مشہور اخبار "اودھ پنچ" نکالا۔ اُنکی ذاتی قابلیت طبیعت داری اور وسیع الاخلاقی سے اُنکے بہت سے دوست ہم مذاق وہم مشرب پیدا ہو گئے تھے۔ کچھ عرصہ تک پنڈت رتن ناتھ سرشار بھی اُنکے اخبار مین مضمون نگاری کرتے تھے۔ مگر جب سے کہ وہ خود اودھ اخبار کے ایڈیٹر ہوے اودھ پنچ کی نامہ نگاری چھوڑ دی جسکا ذکر کسیقدر تفصیل سے آگے آئیگا منشی سجاد حسین پہلے شخص ہین جنھون نے ہندوستان مین ایک ظریفانہ رنگ کا اردو اخبار نکالا جسنے کہ ملک اور زبان دونون کی معقول خدمت انجام دی۔ منشی صاحب نہایت نیکدل صاف باطن اور غیر متعصب شخص تھے اور کبھی مذہبی رنگ کے مضامین کو اپنے اخبار مین جگہ نہین دیتے تھے۔ اُنکی تحریر کا ایک خاص انداز تھا جسمین واقفیت اور معلومات کے ساتھ مذاق وظرافت اور لطائف وظرائف بکثرت ہوتے تھے عبارت مین بیساختگی اور شستگی بہت نمایان تھی۔ انکے وہ فرضی خطوط جو ہندوستانی رؤسا کے نام ہین ایک عجیب انداز کے ہین اور انمین ایک خاص طریقہ سے نصیحت کی گئی ہے۔ منشی صاحب ایک زبردست ناول نگار بھی تھے چنانچہ انکے ناول حاجی بغلول۔ طرحدار لونڈی۔ پیاری دنیا۔ احمق الذین۔ میٹھی چھری۔ کایا پلٹ۔ حیات شیخ چلّی مشہور ہین اور اِن سب کی عبارت نہایت بلیغ اور دلچسپ ظریفانہ انداز مین ہے سنہ ۱۹۱۰ع مین مرض فالج مین مبتلا ہوے اور ایک عرصہ دراز تک جسمانی تکالیف اور آلام ومصائب مین مبتلا رہکر سنہ ۱۹۱۵ع مین انتقال کیا۔ اور اودھ پنچ سابق سنہ ۱۹۱۲ع مین انکی زندگی مین بند ہو گیا تھا۔

مرزا مچھو بیگ عاشق

مرزا محمد مرتضیٰ عرف مرزا مچھو بیگ عاشق تخلص مرزا اصغر علی بیگ کے بیٹے شرفاء لکھنو مین ایک ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ بچپنے مین ورزش کا بڑا شوق تھا اور بانک پٹا وغیرہ اپنے نانا سے سیکھا تھا۔ شاعری کا شوق فطری تھا۔ نسیم دہلوی سے تلمذ تھا۔ بہت خوشگو اور رنگین طبع

شاعر تھے - مگر نظم سے زیادہ نثر مین اُنکو شہرت حاصل ہوئی جسمین وہ صفائی زبان صحت محاورہ اور بذلہ سنجی کے لئے مشہور تھے - آخر عمر تک "ستم ظریف" کے لقب سے اودھ پنچ مین مضمون نگاری کرتے رہے اُنکے مضامین پڑھنے کے قابل ہین اور محاورہ اور صفائی زبان کے لئے اپنی آپ مثال ہین - مطبوعہ تصانیف نظم و نثر حسب ذیل ہین گلزار نجات - میلاد شریف (منظوم) آفتاب قیامت (الکچر کے انداز مین ایک ظریفانہ نظم جو آگرہ آباد مین پڑھی گئی تھی) بہار ہند (اردو محاورات کی ایک ناتمام لغت) مثنوی نیرنگ خیال بعض مضامین جو اودھ پنچ مین نکل چکے تھے اور "چشم بصیرت" کے نام سے علیحدہ شایع ہوے ہین - انکا اردو دیوان اُنکے صاحبزادہ مرزا محمد صدیق کے پاس ہے جو ہنوز شایع نہین ہوا منشی بالمکند گپتا سابق ایڈیٹر بھارت مترکلکتہ اُنکے ایک مشہور شاگرد تھے - مرزا صاحب نہایت ہشاش بشاش خلیق و متواضع اور وسیع الاحباب تھے - مزاج مین ظرافت اور بذلہ سنجی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی - خودداری اور آزادی یہانتک تھی کہ ملازمت سے ہمیشہ کنارہ کش رہا سوجہ سے کہ اسمین پابندی عاید ہوتی تھی - سیاسیات سے بھی شوق تھا چنانچہ اکثر بہ انڈین نیشنل کانگریس کے ڈیلیگیٹ کی حیثیت سے کانگرس مین شریک ہوئے تھے - مختصر یہ کہ صفائی زبان اور بذلہ سنجی آپکے خاص جوہر ہین -

تربھون ناتھ ہجر پنڈت تربھون ناتھ سپرو تخلص ہجر پنڈت شمبر ناتھ سپرو کے بیٹے تھے - سنہ ۱۸۵۳ء مین پیدا ہوے - کیننگ کالج لکھنؤ مین تعلیم انگریزی سے فراغت کرکے اخبار نویسی کا مشغلہ اختیار کیا کچھ دنون تک لکھنؤ مین وکالت بھی کی تھی - نہایت شریف الطبع ملنسار اور ہر دلعزیز تھے -

نواب سید محمد آزاد نواب سید محمد آزاد آئی - ایس - او ۱۸۴۸ء مین بمقام ڈھاکہ پیدا ہوے - مشرقی بنگال کے ایک معزز اور دولتمند خاندان سے آپ کا تعلق تھا - ابتدائی تعلیم آغا احمد علی اصفہانی سے حاصل کی اور یہ وہی شخص ہین جن سے مرزا غالب "برہان قاطع" کے بارہ مین معرکے رہے ہین - انگریزی گوکہ پرائیوٹ طور پر پڑھی تھی مگر اس زبان مین اُنکو مہارت کامل حاصل تھی - ابتدائے ملازمت سب رجسٹراری سے ہوئی اور اسی لائن مین ترقی کرتے کرتے انسپکٹر جنرل رجسٹری کے معزز عہدہ تک پہونچے - بنگال کونسل مین دو دفعہ کرسی ممبری کو زینت بخشی اور امپیریل سروس آرڈر (آئی - ایس - او) کا نشان اعزازی آپ کو

منشی سید محمد سجاد حسین مرحوم ایڈیٹر اودھ پنچ
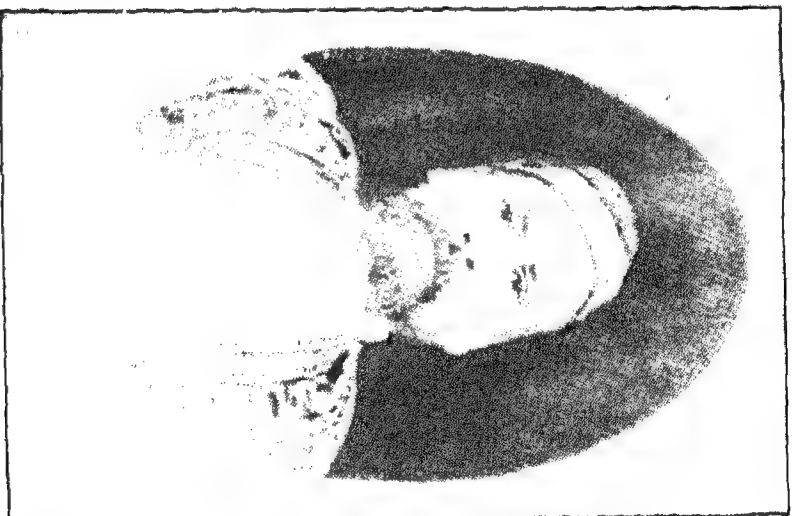
عطا ہوا ۱۹۱۲ء مین سرکاری ملازمت سے کنارہ کش ہوے - پہلے آپ ایک فارسی اخبار "دوربین" مین بزبان فارسی مضامین لکھتے تھے مگر اُس کے بعد اودھ اخبار اودہ پنچ "آگرہ اخبار" وغیرہ مختلف اخبارات و رسائل مین زبان اردو مین لکھتے رہے ۱۸۷۸ء مین انکا ناول "نوابی دربار" نکلا جس مین کہ مذاق کے پیرایہ مین پُرانے رنگ کے فاقہ مست نوابون کا خوب خاکہ اُڑایا گیا تھا اور بہت مقبول عام ہوا - آپ انگلستان بھی گئے تھے اور وہان سے جو خطوط بھیجے ہین وہ نہایت دلچسپ ہین - آپ کی کتاب موسوم بہ "نئی لغت" ظریفانہ رنگ کی مقفیٰ نہایت دلچسپ کتاب ہے -

جوالا پرشاد برق

منشی جوالا پرشاد متخلص بہ برق اک نہایت ذہین اور قابل شاعر و نثار دونون تھے ۱۸۶۳ء مین بمقام سیتاپور پیدا ہوے - انٹرنس کا امتحان کھیری سے پاس کرکے ۱۸۷۸ء مین کیننگ کالج لکھنؤ مین داخل ہوے ۱۸۸۲ء مین بی اے اور ۱۸۸۳ء مین قانون کی ڈگری حاصل کی ۱۸۸۵ء تک وکالت کرکے منصف ہو گئے جنمین ترقی کرتے کرتے قائم مقام ڈسٹرکٹ و سشن جج کے درجے تک پہونچے ۱۹۰۹ء مین گریفن کمیٹی کے ممبر مقرر ہوے ۱۹۱۱ء مین بعارضہ پلیگ اس دار فانی سے کوچ کیا - نہایت طبیعت دار اور ذہین شخص تھے - فسانہ آزاد کی عبارت کے اسقدر دلدادہ تھے کہ خود بھی وہی طرز اک حد تک اختیار کیا آپ کی مثنوی بہار اک نہایت اعلیٰ درجہ کی تصنیف ہے جو سر سید مرحوم کو بہت پسند تھی برق علاوہ شاعر خوشگو ہونیکے مترجم بھی اعلیٰ درجہ کے تھے بنکم چندر چٹرجی کے اکثر مشہور ناولون کے ترجمے آپ کے قلم سے نکلے ہین مثلاً بنگالی دولہن، پرتاب، روہنی، مرنالنی مار آستین وغیرہ - آپ کا ترجمہ اس قدر صاف سلیس بامحاورہ اور شیرین ہوتا ہے کہ مطلق ترجمہ نہین معلوم ہوتا - کتب مذکورہ بالا بہترین اردو ناول خیال کیے جاتے ہین انکے علاوہ شیکسپیر کے بعض ڈرامون کا بھی ترجمہ آپنے کیا تھا مگر افسوس کہ انمین سے اکثر شایع نہو سکے -

احمد علی شوق

منشی احمد علی شوق قدوائی اسیر مرحوم کے معزز شاگردون مین تھے - غزل اور مثنوی خوب کہتے تھے - چند ناٹک نثر و نظم بھی آپکی یادگار ہین جس مین "قاسم و زہرہ" اور "ہیکفرسن و لوسی" زیادہ مشہور ہین - مثنویان آپ کی بہت اعلیٰ درجہ کی ہوتی ہین علی الخصوص "عالم خیال" جس کی زبان نہایت لطیف و

شیرین ہے بیحد مقبول ہوئی یہ کتاب ایک ستم رسیدہ عورت کی دکھ بھری داستان ہے جو اپنے بچھڑے ہوئے شوہر کی واپسی کا انتظار بڑے شوق و ذوق سے کر رہی ہے۔ اسکی عبارت فارسی ضافتون سے خالی ہے، دیوان بھی آپ کا شایع ہوگیا ہے اور نہایت اعلیٰ درجہ کا ہے۔ آپ فن عروض اور نکات ادبیہ سے پوری طرح واقف تھے اور نثر کے مضامین مین بھی صفائی اور صحت زبان کا بہت خیال رکھتے تھے آخر عمر مین ریاست رام پور سے تعلق ہوگیا تھا۔ آپکی وفات حسرت آیات سے ممتاز شعراے اردو کی صف مین ایک جگہ خالی ہوگئی جسکی خانہ پری مشکل ہے۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار

پنڈت رتن ناتھ در تخلص بہ سرشار گذشتہ صدی کے آخر مین ایک عجیب زندہ دل باکمال شخص گزرے ہین۔ اک معزز کشمیری خاندان سے تھے سنہ ۱۸۴۶ یا ۱۸۴۷ء مین لکھنؤ مین پیدا ہوئے صرف چار برس کے تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھگیا۔ اُنکے چھوٹے بھائی پنڈت بشمبر ناتھ در ڈپٹی کلکٹر تھے جنکے بیٹے ریاست بلرام پور مین ملازم ہین۔ سرشار کے صاحبزادے پنڈت نرنجن ناتھ در سرکاری خزانہ مین ملازم تھے مگر جوانی مین انتقال کرگئے۔ سرشار عربی فارسی انگریزی تینون زبانون سے واقف تھے انگریزی اُنھون نے کیننگ کالج لکھنؤ مین پڑھی تھی مگر اسمین کوئی ڈگری نہین حاصل کی۔ سب سے پہلے ضلع سکول کھیری مین ٹیچر ہوے اور یہین سے "مراسلہ کشمیری" مین جو اس زمانہ مین کشمیری پنڈتون کا ایک ماہوار رسالہ نکلا کرتا تھا اور "اودھ پنچ" مین اپنے مضامین بھیجا کرتے تھے۔ یہ آرٹیکل گو کہ کوئی خصوصیت نہین رکھتے تھے مگر پھر بھی اُنکی آیندہ تصانیف اور شہرت کے ایک سنگ بنیاد ضرور تھے۔ سرشار ترجمہ مین بھی بڑی مہارت رکھتے تھے اور وہ اپنا اس قسم کا کام سررشتہ تعلیم کے کسی رسالہ مین بھیجا کرتے جہان وہ بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم اسکو بہت پسند کرتے اور اُن کی قابلیت کی داد دیتے تھے سرشار کبھی کبھی "مراۃ الہند" اور "ریاض الاخبار" مین بھی اپنے مضامین بھیجتے سنہ ۱۸۷۸ء مین اُنھون نے ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ کیا اور اُس کا نام "شمس الضحیٰ" رکھا۔ اس مین اُنھون نے اکثر سائینس کی اصطلاحات کا ترجمہ عمدہ اور سلیس اردو مین کیا ہے۔ اسی سال وہ اودھ اخبار کے اڈیٹر مقرر ہوے اور یہ اس طور پر ہوا کہ ڈاکٹر گریفتھہ ڈایرکٹر سررشتۂ تعلیم نے اُن کا تعارف منشی نولکشور صاحب مالک اخبار

نواب سید محمد خان بہادر آزاد آئی-ایس-او

ہے کرایا جن کو اسوقت اخبار کے لئے اک قابل آدمی کی ضرورت تھی سرشار نے اپنی مشہور و معروف تصنیف فسانہ آزاد کا سلسلہ اسی اودھ اخبار مین شروع کر دیا جو دسمبر ۱۸۷۹ء تک قائم رہا اور سنہ ۱۸۸۰ء مین "فسانہ آزاد" بصورت اک علیحدہ کتاب کے چھپا اور بہت مقبول ہوا۔ اسی عرصہ مین اودھ پنچ اور اودھ اخبار مین وہ مشہور معرکہ شروع ہوا جو عرصہ دراز تک قایم رہا۔ اودھ پنچ اودھ اخبار اور اسکے اڈیٹر کو اپنے ظریفانہ انداز مین سیکڑون صلواتین سناتا تھا اور اس کا جواب بھی کلہ بکلہ آتا تھا آخر بعض دوستون کی کوشش سے مصالحت ہوگئی اور معاملہ رفع دفع ہوگیا سرشار دو اور مباحثون مین بھی شریک ہوئے تھے ایک بیان یزدانی میرٹھی اڈیٹر "طوطی ہند" اور دوسرا خواجہ الطاف حسین حالی کے ساتھ له۔

سرشار کی تصانیف سیر کہسار، جام سرشار، کامنی، اور خدائی فوجدار بہت مشہور ہین آخرالذکر ایک انگریزی ناول ڈان کوئی زٹ کا ترجمہ ہے۔ سنہ ۱۸۹۳ء مین اُنھون نے ایک سلسلہ موسوم بہ "خمکدہ سرشار" شروع کیا تھا اور اسی زمانہ مین اُن کے ناول گزم و سم، بچھڑی دولھن، طوفان بے تمیزی، پی کہان، اور ہشو بھی شایع ہوے مگر ان مین اُن کا زور بیان کم ہے۔ حیدرآباد جانے سے قبل کچھ دنون وہ الہ آباد ہائی کورٹ مین مترجم بھی ہوگئے تھے مگر قواعد دفتر کی سختی کے وہ متحمل نہو سکے اور تھوڑے ہی دنون مین ملازمت ترک کردی۔ سنہ ۱۸۹۵ء مین وہ حیدرآباد گئے۔ اپنے قیام حیدرآباد کا حال اک خط مین جو "کشمیری درپن" مارچ سنہ ۱۸۹۹ء مین شایع ہوا تھا اور جس کا ایک حصہ پنڈت برج نرائن چکبست صاحب نے اسی سے نقل کیا ہے اس طرح بیان کرتے ہین:۔

تقریباً چار برس ہوے کہ مین ممبر کانگریس کی حیثیت سے مدراس آیا تھا۔ میری خوش نصیبی مجھکو حیدرآباد لائی جہان ہندو مسلمان امیر غریب سب نے نہایت گرمجوشی سے مجھکو لیا اور میرے اوپر

له۔ ہمکو یاد پڑتا ہے کہ یہ مباحثہ سرشار سے نہین بلکہ اودھ پنچ سے ہوئے تھے کیونکہ اودھ پنچ مین ایک سلسلہ اعتراضات حالی پر ایک عرصہ دراز تک اس سرخی سے چھپا رہا "اے ابتر ہمارے حملون سے حالی کا حال ہے۔ میدان پانی پت کی طرح پائمال ہے" اور آخر مین کچھ مضامین حالی کی تعریف مین بھی اس سرخی سے نکلے تھے "عیب حالی کے بہت تم نے گنائے اے پنچ + اشک شوئی کو دو چار ہنر بھی کہہ دو"۔

بڑی عنایتین کین۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد نے اپنے کلام نظم و نثر کی اصلاح کے لئے دو سو روپیہ ماہوار مقرر کر دیا ہے اسکے علاوہ خلعت خوشنودی اور فی شعر جو پسند خاطر ہو جاتا ہے ایک اشرفی عنایت فرماتے ہین حضور نظام مجھسے پہلے ہی سے واقف تھے پہلے دن جب مین حاضر خدمت ہوا تو نظر گذرانی اور اپنی کچھ کتابین بھی پیشکش کین اعلیٰ حضرت نے ذرہ نوازی کی کہ اک ٹکڑا دربار کے بیان کا سیر سے سیر کہسار سے اور ایک مقام جام سرشار سے سماعت فرمایا۔ مین نے ایک تاریخ شاہزادہ کی ولادت کی مبارکباد مین بندگان عالی کی خدمت مین پیش کی جسکو اعلیٰحضرت نے بہت پسند فرمایا۔ میرا نام معزز درباریون کی فہرست مین شامل ہو گیا ہے اور کوشش کیجا رہی ہے کہ منصب بھی ملے۔ اگر خدا نے چاہا تو میرا جدید ناول "گور غریبان" اک ہفتہ کے عرصہ مین شایع ہو جائیگا۔

کچھ عرصہ تک سرشار دبدبۂ آصفیہ کی ادارت کرتے رہے۔ اُن کا ناول چنچل اسی اخبار مین نکلتا تھا مگر پورا نہین ہوا۔ "گور غریبان" جس کا ذکر انکے خط مین ہے شایع نہو سکا اور چنچل کوئی باوقعت تصنیف نہین ہے۔ آخر عمر مین سرشار نے مے نوشی کی بڑی کثرت کر دی تھی اور یہی اُن کی قبل از وقت موت کا باعث ہوئی چنانچہ انکا انتقال حیدرآباد ہی مین سنہ ۱۹۰۲ء مین ہوا۔

سرشار نہایت خوشگو شاعر تھے اسیر کے شاگرد تھے اور خوب کہتے تھے سنہ ۱۸۹۶ء مین انہون نے اپنا ایک قصیدہ کشمیری کانفرنس مین پڑھا تھا اور ایک مثنوی تحفۂ سرشار بھی لکھی ہو جو اُس موقع پر لکھی گئی تھی جبکہ پنڈت بشن نراین در کی واپسی انگلستان پر پرانے خیال کے کشمیری پنڈتون مین اک قسم کی برہمی پیدا ہو گئی تھی۔ یہ کتاب بہت مقبول ہوئی اور اسکی معقول باتون سے لوگون کی برہمی سفر ولایت کی نسبت اک حد تک رفع ہو گئی۔

عام عادات و اخلاق

سرشار حقیقی معنے مین آزاد مزاج تھے۔ قوت حافظہ بہت قوی پائی تھی اور تعصب اور مذہبیت سے بالکل بری تھے۔ باتین بہت دلچسپ اور مزے کی کیا کرتے تھے اور طبعًا ظریف واقع ہوئے تھے۔ شراب خواری نے اُنکے ساتھ بھی وہی کیا جو درگا سہائے سرور کے ساتھ کیا تھا یعنے ایک ہونہار زندگی کا بلد خاتمہ کر دیا۔ اردو ناول کو انگریزی طرز پہ لکھنے کا فخر اُنہین کو

پنڈت رتن ناتھ سرشار
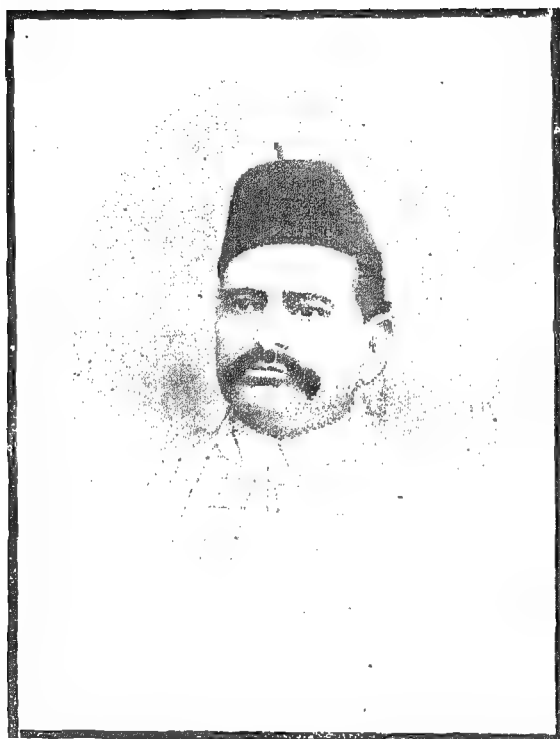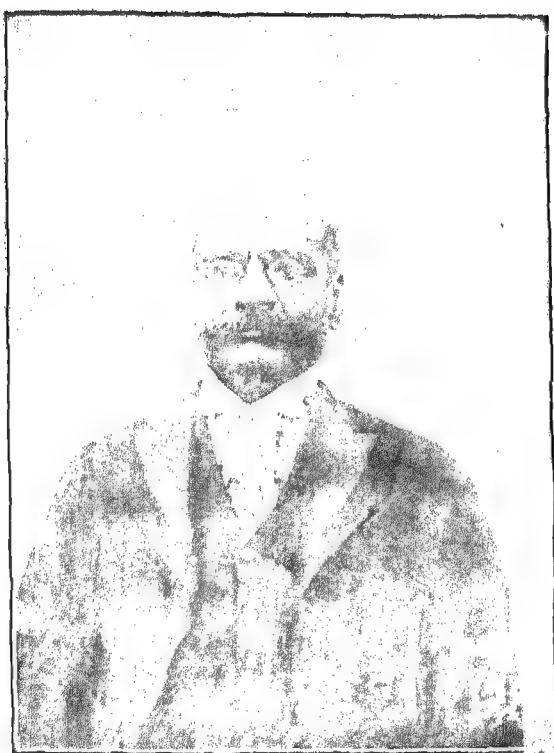
حاصل ہے اور اسی کے ساتھ وہ ایک زبردست جرنلسٹ ایک مشہور مصنف اردو کے زبردست زباندان ظریف اور بذلہ سنج اور ایک طرز خاص کے موجد بھی تھے۔ مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ انکی شہرت کو کچھ تو گوگونکے تعصب نے اور کچھ انکی ذاتی بے پروائی اور لاأبالی پن نے کم کر دیا۔ انکی فسانہ آزاد اور دیگر تصانیف مین اکثر جگہ جو رطب و یابس اور درجہ سے گری ہوئی باتین پائی جاتی ہین اسکی وجہ زیادہ تر انکے مزاج کی جلد بازی اور بے پروائی کہی جاسکتی ہے۔ انکی شراب نوشی کبھی انکے تخیل مین پر لگادیتی اور کبھی اسکے خمار سے انکا دماغ معطل اور بیکار ہوجاتا تھا۔ انہین وجوہ سے نہ وہ کبھی اپنے مسودہ پر نظر ثانی کرتے ... کبھی پروف پڑھنے کے عادی تھے۔ ہمیشہ برجستہ اور قلم برداشتہ لکھتے اور اگر کسی وقت پر قلم نہ ملتا تو تنکے سے کام نکال لیتے تھے۔ اسی بے پروائی اور بے اصولی سے انکے قایم کئے ہوے پلاٹ انکے دکھاے ہوئے کیرکٹر انکے بیان کئے ہوئے واقعات مین اکثر جگہ حد درجہ بے ربطی اور عدم تسلسل پایا جاتا ہے۔ جب کبھی اُنسے کوئی مضمون لکھوانا ہوتا تو مالک مطبع شراب کی ایک بوتل پیش کرتے اور وہ اُس مضمون کو فوراً لکھ ڈالتے۔ مگر اس طبعی کمزوری کے ساتھ انہین خودداری اور آزادہ روی بھی اتنی تھی کہ کبھی کسی امیر و رئیس کی خوشامد نہین کی، اور اپنی شہرت کے واسطے کسی دوسرے کے شرمندۂ احسان نہین ہوئے خود انکی قابلیت اور طباعی اور ذہانت انکی شہرت کا حقیقی باعث تھی۔ آخر عمر مین البتہ وہ زمانہ کے ہاتھ سے تنگ آکر حیدر آباد گئے تاکہ دولت آصفیہ کے زیر سایہ کچھ دلون بفراغت زندگی بسر کرین۔ مگر بدنصیبی نے پرانی عادتوں کی طرح وہان بھی انکا ساتھ نچھوڑا اور آخر کار وہین ہوند خاک ہوئے اور غالب کے اس قطعہ کے مصداق ہوئے۔

رہیے اب ایسی جگہ چلکر جہان کوئی نہو ۔۔۔ ہم سخن کوئی نہو اور ہمزبان کوئی نہو

پڑئیے گر بیمار تو کوئی نہو تیمار دار ۔۔۔ اور اگر مرجائیے تو نوحہ خوان کوئی نہو

تصانیف اُنکے حسب ذیل تصانیف بہت مشہور ہین۔ فسانۂ آزاد۔ سیر کوہسار۔ جام سرشار۔ کامنی خدائی فوجدار۔ کڑم دہم۔ بچھڑی دلھن۔ ہشو۔ طوفان بے تمیزی۔ رنگے سیار۔ پی کہان۔ شمس الضحی

والیس[۱] کی کتاب رشیا کا ترجمہ اردو میں۔ لارڈ ڈفرن کی کتاب "لیٹرز فرام ہائی لیٹی ٹوڈس" کا ترجمہ اُردو میں۔

فسانۂ آزاد — جیسا کہ اوپر بیان ہوا فسانۂ آزاد شروع میں اودھ اخبار کے کالموں میں نکلتا تھا۔ اس کی اشاعت نے دنیائے اُردو میں ایک عجیب ہل چل ڈال دی۔ جب یہ اخبار میں نکلتا تھا تو لوگوں کو اتنا اشتیاق ہوتا تھا کہ دوسرے پرچہ کے لئے بیتاب رہتے تھے۔ پنڈت بشن نارائن در آنجہانی اس کتاب کی نسبت یوں رقمطراز ہیں:۔

> قصہ کا پلاٹ تو بہت سادہ بلکہ حد درجہ بے مزہ ہے مگر ڈھائی ہزار صفحے پڑھتے چلے جایئے ذرا بد مزہ نہیں ہو جیے گا بلکہ سطر سطر پر اشتیاق بڑھتا جائیگا۔ بعض اس وجہ سے کہ عبارت آرائی غضب کی ہے۔ طرز ادا نہایت بے تکلف اور آسان، تازہ اور نیچرل، تمثیلی اور واضح۔ پھر اسکے ساتھ جا بجا پر لطف ظرافت۔ پھڑکتے ہوئے فقرے۔ مزیدار شوخیاں۔ ترکی بہ ترکی جواب۔ حماقت آمیز مضحک باتیں جنکو پڑھکر ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جائینگے۔ آزاد اصل قصہ کا ہیرو ایک دولتمند نوجوان دنیا دار شخص ہے۔ حسین اور طرحدار، تعلیم یافتہ، کئی زبان سے واقف۔ سپاہی پیشہ، ظریف۔ شاعر، عاشق مزاج۔ اچھے داؤ پیچ کرنے والا، اور ہر بھی صورت پر مرنے والا۔ ایکطرف اعلیٰ سوسائٹی کی زیب و زینت۔ دوسری طرف ایک بھٹیاری کا عاشق جانباختہ۔ بیگمات کو بھی للچائی ہوئی نظروں سے گھورنے والا۔ اتفاقاً یہ میاں آزاد ایک حسین دولتمند حسن آرا نام پر لٹو ہوتے ہیں۔ اس سے عشقبازیاں کرتے ہیں۔ آخر وہ اُنکے ساتھ اس شرط پر عقد کرنیکے لئے راضی ہوتی ہے کہ پہلے وہ ٹرکی جائیں۔ لشکر اسلام میں نام لکھائیں۔ روسیوں سے نبرد آزمائی کریں۔ آزاد اپنی معشوقہ کے احکام کی بجا آوری خوشی خوشی

---

[۱] سر ڈونلڈ مکنزی والیس۔ لارڈ ڈفرن اور مارکوئیس آف لینسڈون کے پرائیوٹ سکرٹری نہایت قابل اور صاحب تصنیف اور بڑے سیاح تھے۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانکا کی دسویں اڈیشن کے ڈائرکٹر رہ چکے ہیں۔

شوق قدوائی

کرتے ہین - اور بقول شخصے بندھا خوب مار کھاتا ہے ہل ہانکنے کو دون بھاگنکے تڑکی جاتے ہین روسیون سے لڑتے ہین اور مظفر و منصور واپس آتے ہین - اپنی جانبازیون کے بدلے اپنی معشوقہ سے ایفائے وعدہ چاہتے ہین اور اپنے مقصد مین کامیاب ہوتے ہین - یہ ہے اصل قصہ اور جہانتک قصہ کے پلاٹ کا تعلق ہے - اس سے بدتر اور بیہودہ تر شاید ہی کوئی قصہ انسانی دماغ سے نکلا ہوگا - مگر اسی قصہ کو رتن ناتھ در کی زبان سے سنیے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم ایک نگارخانہ چین مین چلے جارہے ہین جسکی دلکش جیتی جاگتی تصویرین الفاظ کا جادو تخیل کی کثرت - مناظر کی چونچالی ایسی ہے کہ جب اس آئینہ خانہ سے گزرتے ہین تو کچھ یقین کچھ شک کرتے ہوئے ایک طلسم کدہ ہماری نظرون کے سامنے آجاتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی زبردست بازیگر نے اپنے کرتبی ڈنڈے سے پہار اسمان ہمارے سامنے کھینچ دیا ہے -

مندرجہ بالا ریویو لفظاً لفظاً صحیح ہے - فسانۂ آزاد کو پلاٹ کے تناسب کیرکٹر نگاری کے اسلوب اور قصہ کی تدریجی ترقی اور دلچسپی کے لحاظ سے نہ پڑھنا چاہیئے - اصل قصہ کو اک کھونٹی سمجھنا چاہیئے جس پر ہزارون واقعات ٹنگے ہوئے ہین اور انہین علیحدہ علیحدہ واقعات کے پڑھنے میں سارا لطف آتا ہے - وہ اُن کا مذاق و ظرافت، وہ دلچسپ کیرکٹر وہ شوخیان اور حاضر جوابیان یہی سب باتین کتاب کی جان ہین - فسانۂ آزاد مین مثل ڈوما[1] کے ناولون کے ساری عمدگی اور دلچسپی اشخاص قصہ کی باتون مین ہے نہ کہ نفس قصہ کے بیان مین - سرشار مکالمہ کے استاد ہین اور کیرکٹر نگاری کی خوبیان طول طویل بیان سے نہین بلکہ خود اُن اشخاص کی گفتگو سے نہایت کامیابی سے دکھلاتے ہین -

سرشار کی مرقع نگاری سرشار مثل مرزا رجب علی بیگ سرور کے پر تکلف اور مقفٰی عبارت نہین

[1] اس نام کے دو ناولسٹ باپ اور بیٹے فرانس مین گزشتہ صدی مین بہت مشہور و معروف گذرے ہین ان کے اکثر ناول نہایت دلچسپ ہین ۱۲-

پسند کرتے نہ وہ برائیون کو چھپاتے اور اچھائیون کو چمکاتے ہین بلکہ ہو بہو تصویرین کھینچتے ہین اور علی الخصوص اشخاص لکھنؤ اعلیٰ و ادنےٰ امیر و غریب سب کے سب بے تکلف مرقعے اپنے اس لاجواب کتاب مین کھینچ دیے ہین۔ اُن کے اشخاص قصہ سایہ کی طرح ہماری آنکھون کے سامنے نہین گذرتے، بلکہ وہ ہمارے آپ کی طرح گوشت و پوست کے بنے ہوے چلتے پھرتے جیتے جاگتے معلوم ہوتے ہین۔ پنڈت بشن نراین در اسکی نسبت لکھتے ہین :-

"اگر تم لٹ لگے مجبوسنگے اندر جاؤ - غل غپاڑے والے طوفان بے تمیزی کے مجمعے - تو تمکو بڑی احتیاط سے جانا ہوگا کہین ایسا نہو کہ لوگون کی دھکم دھکی سے تم خود نہ گر پڑو اور اس کی احتیاط کرنا ہوگی کہ تمہاری گھڑی یا کوئی اور چیز جو تمہاری جیب مین ہے کہین نکل نہ جائے۔ یہی حال اُنکے محرم کے جلوس اور عیش باغ کے میلون کا ہے کہ تم وہان اپنے تئین ایک عجیب بھیڑ مین پاتے ہو جسمین شہر باز۔ پتنگ باز۔ افیمی۔ زرق برق نواب معہ اپنے ڈیڑھ گنے زردرو مصاحبون کے۔ رنڈیان گاڑیون مین سوار کسی بڈھے فیل سوار تماشبین سے آنکھین لڑا رہی ہین۔ فقیر گاڑیون کے پیچھے دوڑتے دعائین دیتے جا رہے ہین اور اگر کچھ نہین ملتا ہے تو چپکے چپکے سیکڑون صلواتین سناتے ہین۔ فاقہ مست عاشق۔ رنگیلے بیکار۔ عورتین خوبصورت بدصورت۔ کوئی اپنے کھوئے ہوئے بچے کو آواز دے رہی ہے۔ کوئی اپنے یار سے لڑ رہی ہے۔ کوئی کسی نواب کے مصاحب خاص سے ناز و انداز کی باتین کر رہی ہے۔ پولیس کانسٹبل۔ چور۔ اُچکے۔ جنگی کے گھڑ۔ ریلوے بابو۔ ٹھاکر صاحب کسی قریب کے گاؤن سے میلا دیکھنے آئے ہین۔ لالہ بھائی کسی تنبولی یا تنبولن سے فارسی لغت چھانٹ رہے ہین۔ انگریزنما گریجویٹ سگرٹ منھ مین دبا ہوا یونیفیشن کے مسلمان ترکی ٹوپی ڈالے۔ بنگالی بابو مہین نرم دھوتیان ہوا مین اڑاتے ہوئے۔ یہ ہے وہ مجمع جسکی سرشار تمکو سیر کراتے ہین جسمین ہزارون مختلف آوازین تمھارے کانون مین آ رہی ہین اور چارون طرف زندہ چلتے پھرتے باتین کرتے غل مچاتے انسانون کا ایک سمندر موجزن ہے اور پھر ان سب پر طرہ یہ کہ اس عظیم الشان مجمع مین ہر آدمی کو اُسکی بات چیت اور اُسکے حرکات و سکنات سے تم بخوبی پہچان سکتے ہو۔"

فسانۂ آزاد بلکہ سرشار کی اکثر ناولون کی خاص خصوصیات یہ دو چیزین ہین یعنی (۱) لکھنؤ کی اس زمانہ کی سوسائٹی کی ہو بہو تصویرین کھینچنا اور (۲) شوخی و ظرافت۔ ہمارے نزدیک کسی شاعر یا ناثر نے اس سے قبل لکھنؤ کے آخری دور تمدن اور سوسائٹی کی صحیح تصویرین اسقدر جزئیات کے ساتھ کبھی نہ کھینچی ہونگی۔ سرشار پرانے رنگ کے نوابون اُنکے افعال و اشغال انکے مصاحبون اور ہم جلیسون کے سچے نقشے کھینچنے مین کمال رکھتے ہین اور باوصف اس کے کہ وہ ہندو تھے مگر سخت حیرت[1] ہے کہ مسلمانون کے بڑے گھرانون کے اندرونی حالات اور بیگمات کی طرز معاشرت اور بول چال سے وہ اسطرح واقف ہین کہ کوئی مسلمان بھی اُنسے بہتر نہین جان سکتا۔ اُنھون نے ہماری آنکھون کے سامنے سے پردہ اٹھا دیا ہے اور ہم ہندو اور مسلمان حرمسراؤن کے اندرونی حالات نہایت صفائی سے بالکل بے پردہ دیکھتے ہین۔ انکو مختلف پیشہ ورون کی خاص خاص اصطلاحین مختلف جماعتون کے خاص خاص بولیان اور اُن کا طرز ادا، دیہاتی بولی۔ بیگمات اور انکی مغلانیون اور بیشخدمتون کی بات چیت، بھٹیارے اور بھٹیاری، افیمی چنڈو باز، شرابی چوپا چکون کی زبان، دیہاتی گوسکھے ٹھاکرون اور پڑھے لکھے لالہ بھائیون کا طرز تکلم۔ اِن سب پر اُنکو کامل عبور حاصل ہے۔

سرشار کی شوخی اور ظرافت

انکا مذاق کامل، مہذب اور آزادانہ ہے۔ البتہ اسمین غالب کی سی لطافت اور نمکینی نہین ہوتی اور الفاظ کی رو مین اور محاکات کے شوق مین کبھی وہ اسقدر بڑھ جاتے ہین اور اُنکا سمند طبع اسقدر بے قابو ہو جاتا ہے کہ وہ فحش سے بھی پرہیز نہین کرتے۔ مگر باوجود اسکے اس خاص چیز یعنی شوخی اور ظرافت مین کوئی اِن کے قریب تک نہین پہونچتا۔ مکالمات لکھنے مین وہ کمال رکھتے ہین علی الخصوص ادنیٰ طبقہ کی بول چال اُنکے ٹکسے بندھے فقرے اُنکے ضلع جگت کو وہ من وعن ادا کر دیتے ہین

[1] یہ کوئی حیرت کا مقام نہین۔ یہ اُس زمانہ کے ہندوون اور مسلمانون کے میل جول اور دلی اتحاد کا بین ثبوت ہے دوسری مثال اس کی نظیر اکبرآبادی کی ہے جنہون نے ہندوون کے تہوار میلے ٹھیلے یہانتک کہ اُنکے مذہبی معتقدات تک کو کس قدر واقفیت اور تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اب جبکہ دونون قومون کے درمیان نفسانیت اور تعصب کی ایک آہنی دیوار قائم ہے تو یہی باتین تعجب اور حیرت کی معلوم ہوتی ہین۔

اِسس رنگ زمانہ کو بے نقاب کرنے کی نسبت پنڈت بشن نراین درؔ نے اُسی مضمون مین جس سے بعض مقامات اوپر نقل کیے گئے اسطرح رقمطراز ہین۔

"بے ادبی و گستاخی، پرانے رسوم و خیالات کا استیصال، دنیاوی لذتون سے تمتع۔ موجودہ چیزون کی ناپسندیدگی یہی سب خیالات اُنکے زمانہ مین لوگون کے دلون کو مسخر کیے ہوئے تھے اور وہ خود بھی یہی خیالات رکھتے تھے۔ پس کوئی شخص انکی سچائی اور راست بیانی پر اعتراض نہین کرسکتا جبکہ وہ اپنے کلام کو اس رنگ مین ڈبوتے ہین اور اسکو طرح طرح کی خوبیون سے آراستہ بھی کرتے جاتے ہین۔ مگر اسی کے ساتھ وُہ اُس آزادانہ تحریک کے بڑے حامی ہین کہ جو پرانے خیالات اور قدیم رسم و رواج کو توڑنا چاہتی تھی۔ ہر سوسائٹی کے منازل ارتقا مین ایک ایسا درجہ ضرور آتا ہے کہ جب عیوب اور غلطیون کی اصلاح کے واسطے ظرافت اور استہزا مثل وعظ و نصیحت کے مفید ہوتا ہے بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ۔ اور جب بدکاری کی بُرائی دکھانیکا یہی بہترین طریقہ ہے کہ وہ عُریان کرکے دکھائی جائے۔ بہت سی غلطیان جو وعظ و نصیحت سے اصلاح نہین پاسکتین اکثر دیکھا گیا ہے کہ وہ ایک مذاقیہ جملہ سے بالکل دہل جاتی ہین اور ایک طنز آمیز قہقہہ کی گولی عیوب کی تیز پرواز چڑیا کو فوراً گرادیتی ہے۔ رتن ناتھ سے جب کسی اخلاق آموز واعظ یا مولوی سے کسی پرانے خیال کے چھوت چھات ماننے والے سے کسی دولت پر گھمنڈ کرنے والے یا حسب و نسب پر فخر کرنے والے سے مڈبھیڑ ہوتی ہے۔ اور وہ انکی پند و نصیحت کو انکی ڈینگون اور شیخی کی باتون کو سنتے ہین تو وہ اُن سے بحث و مباحثہ نہین کرتے نہ کبھی اُن سے لڑنا جھگڑنا چاہتے ہین بلکہ صرف ان کا مذاق آڑانے لگتے ہین۔ اور گو کہ متانت پسند لوگ انکی اس ادا کو ناپسند کرین مگر باقی اور لوگ جو اس تماشے کو دیکھتے اور اُنکی باتون کو سنتے ہین ہنسی کے مارے لوٹ جاتے ہین جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسخرہ نے اپنی باتون سے اُنکے دلون کو موہ لیا اور اسکے بعد سے وہ لوگ جو مسخرہ کے ساتھ ہنس چکے پھر کسی واعظ کی تعلیم و تلقین پر نہین رہ سکتے۔ پس رتن ناتھ کی نصیحت کا یہی طریقہ ہے۔ وہ مسخرہ کرتے ہین ہنستے ہین اور فتح پاتے ہین۔ اسی وجہ سے ہم اُنکو سوسائٹی کی برائیون کا اک بہت بڑا مصلح سمجھتے ہین اگر وہ کسی خاص اصلاحی تحریک سے تعلق نہین رکھتے اُنہون نے کسی پیغمبر یا مصلح قوم کی طبیعت نہین

پائی تھی وہ دل سے مسخرے اور ہنسی میں امداد دینے والے تھے"

سرشار کی کیرکٹر نگاری

سرشار کیرکٹر نگاری کے استاد ہین مگر وہ ہو بہو نقشے نہین کھینچتے بلکہ اصلیت کے ساتھ مبالغے سے بھی کام لیتے ہین اسی وجہ سے اُنکے کیرکٹرون مین ڈکنس اور تھیکرے[۱] دونون کا مجموعی رنگ پایا جاتا ہے۔ وہ اپنے تمام کیرکٹرون مین جو خاص اور ممیز باتین ہوتی ہین اُن کو چُن لیتے ہین اور انہین مین وہ وہ شگوفے پیدا کرتے ہین جنکو پڑھکر آدمی ہنستے ہنستے لوٹ جاتا ہے۔ اِن کے کیرکٹرون کو اس نظر سے نہ دیکھو کہ وہ بالکل نیچر کے مطابق ہین بس اُنکو پڑھو اور ہنسو اور یہی کافی ہے۔

خوجی

خواجہ بدیع الزمان معروف بہ خواجہ بدیعا مخفف خوجی[۲]۔ وہ پُرانا بے وقوف، مسخرہ، آزاد کا ہمزاد و یار غار، کمزور دنکو دبانیوالا، رنگیلا، عیاش، رنڈیبا، بدمعاش، جسمانی اور دماغی کمزوریون کا پوٹ، بونا جو اپنے تئین ہرگز بونا نہین سمجھتا بلکہ بونا کہنے سے سخت بُرا مانتا ہے اپنے گذشتہ کارنامون پر جو سراسر لغو اور جھوٹ ہین ڈینگین مارنیوالا، جہان جائے لوگ اُسپر آوازے کسین اور پھبتیان اُڑائین، ہمیشہ اس خیال مین کہ دنیا جان بوجھکر اُسکی بڑائیون اور خوبیون پر خاک ڈالتی ہے اُسکا مسخراپن، اُسکی دل لگیان، اُسکی آزاد کے ساتھ محبت و وفاداری، اُس کا اپنے چھوٹی سی تلوار لیکر بیرے بدلنا، اُس کا بات بات پر قسم کھانا اُسکی اپنی بزدلی چھپانیکی ترکیبین، انہین سب باتون سے وہ لوگون کے دلون مین گھر کئے ہوئے ہے اُسکے

---

[۱] انگلستان کے گذشتہ صدی کے دو مشہور ناولسٹ گذرے ہین۔

[۲] دنیائے افسانہ کے اس عجیب و غریب کیرکٹر کا سرشار نے جو خاکہ اپنے خاص رنگ مین کھینچا ہے حسب ذیل ہے "گیدیون کے قبلہ گاہ پدیون کے پشت و پناہ گادیون کی جان، بلکہ روح روان۔ دیوار حماقت کے پشتیبان، چھٹے پہلوان میان خواجہ بدیع الزمان صاحب بدیع (آنجہانی) عزیق بحر نادانی نہایت حیرانی اور غایت پریشانی سے دل ہی دل مین ...... ٹھنڈی سانسین بھرتے شتہ گام جانے لگے اور چونکہ ماشاء اللہ ڈنڈپیل جوان اور کامل فن پہلوان تھے یہ کیفیت ہوئی کہ دس قدم چلے اور تیورانے لگے۔ اللہ ری طاقت۔ اول تو پستہ قامت۔ ماشہ بھر کا قد۔ دوسرے قطع شریف از بس موزون اونٹ کی طرح کوئی کل درست نہین۔ اُسپر طرہ یہ کہ مدت کے بعد اک چوبی قرولی جو کسی استاد نجار نے پیر مرد کو بطریق نذر دی تھی زیب دست تھی یہ مثل مشہور ہے "اوچھے کے گھر تیتر۔ باہر رہے نہ بھیتر" کبھی داہنے ہاتھ مین لی بازار والون کی طرف

اکثر فقرے اور جملے اُردو مین ضرب المثل ہو گئے ہین[لہ]۔ اس عجیب غریب کیرکٹر کی آفرینش سے سرشار ہمیشہ یادرہینگے۔ تمام ادب اُردو اُس کا مدمقابل اب تک پیدا نہین کرسکا۔ وہ ادب ظریفانہ کی سب سے زیادہ اور مکمل اور سب سے زیادہ عجیب مخلوق ہے۔

دیکھکر جھکائی۔ کبھی بائین ہاتھ مین لی اور اکڑ کے چلنے لگے۔ اب زمین پر قدم ہی نہین رکھتے۔ دماغ فلک الافلاک پر ہے اللہ ری نخوت۔ اور کیون نہو خدا نے حسن دیا تو گلوسوز۔ نور عطا کیا تو عالم افروز۔ ایک تو گران ڈیل جوان دوسرے فن سپہگری مین طاق کشتی کے پہلوان۔ بانک۔ پٹے۔ بانے۔ بنوٹ مین مشاق۔ اور خانہ جنگی مین شہرۂ آفاق اور سب صفتون سے بڑھکر یہ صفت جناب باری نے عطا کی تھی کہ میدان جنگ مین بھاگنون کے مقدمۃ الجیش۔ سپہ سالار نامدار بنتے تھے۔ کوئی اور بھاگے یا نہ بھاگے یہ سب کے پہلے میدان چھوڑنے کی فکر کرتے تھے اللہ ری بہادری۔ بازار مین اس عجیب الخلقت پر جسکی نظر پڑتی بے اختیار ہنس دیتا تھا کہ واہ ماشاء اللہ کیا قطع ہے اور اس بوتے پر یہ اکڑنا اور تن تن کر چلنا اور اینڈنا اور ہنگامہ مچانا اور مصنوعی قرولی سے سیر کو بنانا اور بھی لطف دیتا تھا۔ فقرہ باز آپ جانیئے زمانہ بھر کے بے فکرے انکو شگوفہ ہاتھ آیا جس گلی کوچے کی طرف سے خوجی نکلجاتے تھے لوگ انگلیان اُٹھاتے تھے اور پھبتیون کے پھرے چلے جاتے تھے۔

(۱) ذرا سنبھلے ہوئے حضرت دیکھئے کہین ٹھوکر نہ لگے۔

(۲) آدمی کیا بیگم کا رُنگُن ہے کیا گھٹ پٹ جارہا ہے۔

(۳) ہمکو تو چینڈول معلوم ہوتا ہے (قہقہہ لگاکر)۔

(۴) کلجگ کے باون اوتار کے ذریات مین سے ہے۔

(۵) اکڑتے تو بہت جاتے ہو کہین ایسا نہ ہو کہ کوئی چپت دے قرولی وردی چھین لے۔

(۶) ہاتھ پاؤن ماشاء اللہ کتنے سڈول ہین۔

(۷) ارے میان بھین ذری ادھر تو دیکھو یہ بھیڑیے کے بھٹ سے نکالے گئے ہین سنا ابھی تک آدمی کی بولی نہین بول سکتے۔

[لہ] خوجی کے جملے ضرب المثل نہین ہوئے بلکہ وہ خود ضلع جگت کی طرح شلیں بھی بولنے کا بہت شایق ہے ۱۲۔

سرشار نے اپنے ناولون سے ان نیچرل چیزون کو خارج کر دیا

ایک خاص صفت انکی تصانیف کی یہ ہے کہ انہون نے غیر فطری جزو کو اپنے ناولون سے خارج کر کے انسانی زندگی کے معمولی معمولی واقعات مین ایک غیر معمولی دلچسپی پیدا کر دی۔ مولوی نذیر احمد کا بھی یہی خصیصہ ہے۔ مگر اُنمین اور سرشار مین یہ فرق ہے کہ اُنکے قصے صرف اخلاقی اور نصیحت آموز ہین جنکی غرض صرف یہی معلوم ہوتی ہے کہ انکو عورتین پڑہین اور انسے فائدہ اُٹھائین۔ اور اسیوجہ سے اُنمین دلچسپی اور حیرت انگیزی کم ہے۔ ہماری راے مین سرشار سب سے پہلے شخص ہین جنہون نے زندگی کے معمولی معمولی واقعات کو قصہ کے پیرایہ مین دل بہلانے کی غرض سے لکھا جو زمانہ حال کی ناولون کی اصلی اور صحیح غرض ہے۔

نقایص کلام

سرشار کے قصون مین مندرجہ ذیل نقایص بتائے جاتے ہین (۱) پلاٹ مربوط اور منتظم نہین ہوتے۔ فسانۂ آزاد ایک باقاعدہ پلاٹ کا قصہ نہین لہذا مصنف جب واقعات مین ایک ترتیب و نظام قایم کرنیکی کوشش کرتے ہین تو ناکام رہتے ہیں وہ تمام متفرق واقعات کو کبھی یکجا نہ کر سکے اور اُن سے کبھی باقاعدہ اور مرتب پلاٹ نہ تیار کر سکے۔ یہی کمزوری اُنکے دوسرے ناولون مین بھی نمایان ہے۔ اسکی وجہ بظاہر انکی بے پروائی اور بیقاعدگی معلوم ہوتی ہے جسکی وجہ سے وہ کوئی چیز مستقل باقاعدہ طور پر نہین کر سکتے تھے۔ وہ ایک سچے آرٹسٹ کی محنت اور شوق کیساتھ کام کرنے سے گھبراتے تھے۔ اور اخبار کی اڈیٹری یا اُسکے واسطے قصے تیار کرنا اُنکو ایک بار گران معلوم ہوتا تھا۔ افسوس ہے کہ ایسے طباع اور ذہین آدمی نے بوجہ اپنے وارفتگی مزاج اور پابندی قواعد سے گھبرانے کے اپنی خلقی طباعی و ذہانت سے پوری طرح کام نہین لیا اور اسکی قدر نہین کی۔ (۲) یہی سبب اُن کے واقعات مین عدم تسلسل اور ابواب مین بیربطی کا بھی ہے اور شاید اسی وجہ سے اُنکے کیرکٹرون مین ہمواری اور یکرنگی نہین ہے جو قصے کے سلسلے مین سیکڑون رنگ بدلتے رہتے ہین۔ وہ وقتی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہین اور کیرکٹرون کے خصایص اُنکے دماغ مین قایم نہین رہتے اسیوجہ سے وہ انکو نباہ نہین سکتے۔ فطری بےصبری اور جلد بازی کی وجہ سے اُنکا قلم سرپٹ گھوڑے کی طرح دوڑنے لگتا ہے۔ وہ لکھتے رہتے ہین خواہ طبیعت حاضر ہو یا نہو جسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب اُنکی فکر مین قوت پرواز نہین

اکثر فقرے اور جملے اردو مین ضرب المثل ہو گئے ہین[1]۔ اس عجیب غریب کیرکٹر کی آفرینش سے سرشار ہمیشہ یاد رہینگے۔ تمام ادب اردو اُس کا مد مقابل اب تک پیدا نہین کر سکا۔ وہ ادب ظریفانہ کی سب سے زیادہ اڈرنجبل اور سب سے زیادہ عجیب مخلوق ہے ۔

دیکھکر چمکائی۔ کبھی بلیٔن ہاتھ مین لی اور اکڑ کے چلنے لگے۔ اب زمین پر قدم ہی نہین رکھتے۔ دماغ فلک الافلاک پر ہے۔ اللہ ری نخوت۔ اور کیون نہو خدا نے حسن دیا تو گلو سوز۔ نور عطا کیا تو عالم افروز۔ ایک تو گران ڈیل جوان دوسرے فن سپہگری مین طاق کشتی کے پہلوان۔ بانک، پٹے، بانے، بنوٹ مین مشاق۔ اور خانہ جنگی مین شہرہ آفاق اور سب فنون سے بڑھکر یہ صفت جناب باری نے عطا کی تھی کہ میدان جنگ مین بھاگنے کے مقدمۃ الجیش۔ سپہ سالار نامدار بنتے تھے۔ کوئی اور بھاگے یا نہ بھاگے یہ سب کے پہلے میدان چھوڑنے کی فکر کرتے تھے اللہ ری بہادری۔ بازار مین اس عجیب الخلقت پر جسکی نظر پڑتی بے اختیار ہنس دیتا تھا کہ واہ ماشاء اللہ کیا قطع ہے اور ایسے پن پر اکڑنا اور تن تن کر چلنا اور اینٹھنا اور شہگام جانا اور مصنوعی قرولی سے عبیر کو ستانا اور بھی لطف دیتا تھا۔ فقرہ باز آپ جانیٔے زمانہ بھر کے بے فکرے انکو شگوفہ ہاتھ آیا جس گلی کوچے کی طرف سے خوجی نکلتے تھے لوگ انگلیاں اٹھاتے تھے اور پھبتیون کے چھرے چلتے جاتے تھے ۔

(۱) ذرا سنبھلے ہوئے حضرت الجھنے کہین ٹھوکر نہ لگے ۔

(۲) آدمی کیا بٹیر کا ٹھگن ہے کیا کھٹ پٹ جارہا ہے ۔

(۳) ہمکو تو چنڈول معلوم ہوتا ہے (قہقہہ لگا کر) ۔

(۴) ٹکلجگ کے باون اونا کے ذریات مین سے ہے ۔

(۵) اکڑو تے تو بہت جاتے ہو کہین ایسا نہ ہو کہ کوئی چپت دے قرولی ورولی چھین لے ۔

(۶) ہاتھ پاؤن ماشاء اللہ کتنے سڈول ہین ۔

(۷) ارے میان چھین ذری ادھر تو دیکھو یہ بھیڑیے کے بھٹ سے نکالے گئے ہین سنا ابھی تک آدمی کی بولی نہین بول سکتے ۔

---

[1] خوجی کے جملے ضرب المثل نہین ہوئے بلکہ وہ خود ضلع جگت کی طرح شلین بھی بولنے کا بہت شایق ہے ۱۲۔

سرشار نے اپنے ناولون سے ان غیر اصل چیزون کو خارج کر دیا

ایک خاص صفت انکی تصانیف کی یہ ہے کہ انہون نے غیر فطری جزو کو اپنے ناولون سے خارج کر کے انسانی زندگی کے معمولی معمولی واقعات مین ایک غیر معمولی دلچسپی پیدا کر دی - مولوی نذیر احمد کا بھی یہی خصیصہ ہے - مگر اُنمین اور سرشار مین یہ فرق ہے کہ اُنکے قصے صرف اخلاقی اور نصیحت آموز ہین جنکی غرض صرف یہی معلوم ہوتی ہے کہ انکو عورتین پڑہین اور انسے فائدہ اُٹھائین - اور اسیوجہسے اُنمین دلچسپی اور حیرت انگیزی کم ہے - ہماری راے مین سرشار سب سے پہلے شخص ہین جنہون نے زندگی کے معمولی معمولی واقعات کو قصہ کے پیرایہ مین دل بہلانے کی غرض سے لکھا جو زمانہ حال کی ناولون کی اصلی اور صحیح غرض ہے -

نقایص کلام

سرشار کے قصون مین مندرجہ ذیل نقایص تباے جاتے ہین (۱) پلاٹ مربوط اور منتظم نہین ہوتے - فسانۂ آزاد ایک باقاعدہ پلاٹ کا قصہ نہین لہذا مصنف جب واقعات مین ایک ترتیب و نظام قایم کرنیکی کوشش کرتے ہین تو ناکام رہتے ہیں وہ تمام متفرق واقعات کو کبھی یکجا نہ کر سکے اور اُن سے کبھی باقاعدہ اور مرتب پلاٹ نہ تیار کر سکے - یہی کمزوری اُنکے دوسرے ناولون مین بھی نمایان ہے - اسکی وجہ بظاہر انکی بے پروائی اور بیقاعدگی معلوم ہوتی ہے جسکی وجہ سے وہ کوئی چیز مستقل باقاعدہ طور پر نہین کر سکتے تھے - وہ ایک سچے آرٹسٹ کی محنت اور شوق کیساتھ کام کرنے سے گھبراتے تھے - اور اخبار کی ایڈیٹری یا اُسکے واسطے قصے تیار کرنا اُنکو ایک بار گران معلوم ہوتا تھا افسوس ہے کہ ایسے طباع اور ذہین آدمی نے بوجہ اپنے وارفتگی مزاج اور پابندی قواعد سے گھبرانے کے اپنی خلقی طباعی و ذہانت سے پوری طرح کام نہین لیا اور اسکی قدر نہین کی - (۲) یہی سبب اُن کے واقعات مین عدم تسلسل اور ابواب مین بیربطی کا بھی ہے اور شاید اسی وجہ سے اُنکے کیرکٹرون مین ہمواری اور یکرنگی نہین ہے جو قصے کے سلسلے مین سیکڑون رنگ بدلتے رہتے ہین - وہ وقتی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہین اور کیرکٹرونکے خصایص اُنکے دماغ مین قایم نہین رہتے اسیوجہسے وہ انکو نباہ نہین سکتے - فطری بےصبری اور جلد بازی کی وجہ سے اُنکا قلم سرپٹ گھوڑے کی طرح دوڑنے لگتا ہے - وہ لکھتے رہتے ہین خواہ طبیعت حاضر ہو یا نہو جسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب اُنکی فکر مین قوت پرواز نہین

رہتی تر دہ زمین پر پھسلنے لگتے ہین (۳) اُنمین فلسفیت اور اخلاق آموزی کی کمی ہے۔ اسیوجہ سے فسانۂ آزاد کی آخری جلد اور ہشو کے بھی آخری ابواب جنمین تعلیم نسوان، تہیاسوفی اور ترک منوشی وغیرہ کے متعلق وعظ نما تقریرین ہین نہایت بمزہ اور بے اثر ہین جب وہ اس کوچے مین قدم رکھتے ہین تو پھر وہ سرشار نہین رہتے (۴) اُنمین جذبات کی بھی کمی ہے اسیوجہ سے اُنکی تصانیف مین تصادیر درد و غم کا پتہ نہین۔ انکی جذبات نگاری جہان کہین ہوتی ہے مصنوعی معلوم ہوتی ہے۔ اور ادہر اُدہر کے اقوال و اشعار سے اس کمی کو وہ پورا کرنا چاہتے ہین (۵) بعض جگہ اخلاق سے گری ہوئی اور غیر مہذب باتون کا بھی اُنپر الزام لگایا جاتا ہے اور فی الحقیقت اُنھون نے بعض جگہ غیر مہذب اور سوقیانہ الفاظ استعمال کئے ہین جنسے ہمارے اخلاقی احساسات کو ضرور صدمہ پہونچتا ہے۔ مگر اسکے جواب مین انکی طرف سے دو عذر پیش ہو سکتے ہین۔ ایک یہ کہ اُس زمانہ کا جس مین وہ تھے رنگ ہی یہ تھا۔ دوسرے یہ کہ کسی عیب کی خرابی صرف اُسیوقت بخوبی ظاہر ہو سکتی ہے جبکہ اسکو عریان کر کے دکھایا جائے ورنہ لوگ اسکی اصلی حقیقت سے متاثر نہون گے (۶) اُنکے قصون مین کیرکٹرون یعنے اشخاص قصہ کی اتنی کثرت ہے کہ اُنکے کھینچے ہوے مرقعے اکثر گڈمڈ ہو گئے ہین اور واقعات کی بھی اتنی کثرت ہے کہ تناسب قایم نہین رہا اور پڑھنے والے کی طبیعت مین وفور واقعات سے پریشانی پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر سچ پوچھئے تو یہ سب اعتراضات اگر صحیح بھی مان لئے جائین تو اُس عظیم الشان خدمت کے مقابلہ مین ہیچ ہین جو انھون نے اپنی تصانیف سے ادب اُردو اور سوسائٹی کی انجام دی۔ اور اُن کے جزوی نقایص سے ہمکو اغماض کرنا لازم ہے۔

سرشار بحیثیت ایک صاحب طرز کے

سرشار کا بہ حیثیت ایک ماہر زبان اور ایک صاحب طرز کے بہت بڑا مرتبہ ہے صاف سلیس، بامحاورہ۔ اور زوردار عبارت لکھنے مین انکو اپنے ہمعصرون پر فوقیت حاصل ہے اور بہ حیثیت ایک صاحب طرز کے گو وہ آزاد سے دوسرے نمبر پر ہون مگر ادرسے وہ ضرور بڑھے ہوے ہین۔ اُنھون نے ایک ایسا طرز اختیار کیا تھا جو افسانہ نویسی کے واسطے نہایت موزون تھا اور اُنکی تصانیف مین لوگ نفس قصہ سے زیادہ عبارت سے دلچسپی لیتے ہین۔ ہرچند کہ بعض آدمیون

نے انکی زبان اور محاورات پر بھی اعتراض کئے مگر اس قسم کے اکثر اعتراضات غیر منصفانہ اور حسد و تعصب پر مبنی معلوم ہوتے ہین - زبان مین وہ ضرور بے روک ٹوک ہین اور کبھی ضرورت سے زیادہ صرف محاورات و اصطلاحات کرتے ہین مگر اسکی وجہ فور خیالات اور قدرت زبان کہی جا سکتی ہے -

سرشار اور سرور کا مقابلہ

مرزا رجب علی بیگ سرور کے یہان تکلف اور آورد بہت ہے اور سرشار کی عبارت واضح بے تکلف اور نیچرل ہوتی ہے - سرور چیزون کا بیان کرتے ہین اور سرشار آدمیون کا - سرور آئیڈیل (خیالی) تصویرین کھینچتے ہین اور تصویرون کے محاسن کو ابھارتے اور معایب کو چھپاتے ہین - برخلاف اسکے سرشار کی تصویرین بالکل سچی اور ہو بہو ہوتی ہین - اور اچھائیان اور برائیان سب وہ بے تکلف ظاہر کردیتے ہین - سرور کے یہان یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم ایک باغ مین کھڑے ہوئے ہین - اسکے بیچون بیچ مین ایک خوبصورت نہر جاری ہے جسمین صاف سوتی سا پانی بہتا ہے اور اُس کے کنارون پر گلاب در ترشا دے کے پھول مہک رہے ہین سرشار ہمکو ایک عظیم الشان دریا کے پاس کھڑا کردیتے ہین جسمین ہوا کے زور سے لہرین اُٹھ رہی ہین اور دریا کے قریب آس پاس کے جنگل سے سناٹے کی آوازین آرہی ہین کبھی کبھی دریا کے صاف پانی پر کوئی نجس اور خراب چیز بھی بہتی ہوئی چلی آرہی ہے - سرور کے مُرقعے سوجہ سے دلچسپ اور حسین ہین کہ وہ اُن چیزون سے جنکو وہ بیان کرتے تھے خود بڑی محبت رکھتے تھے اور انہین کوئی عیب نہین دکھتے تھے سرشار برخلاف اسکے جس سوسائٹی کا خاکہ کھینچتے ہین اوسکو پسند نہین کرتے بلکہ اکثر موقعون پر تو اس سے نفرت ظاہر کرتے ہین - اور اس نفرت و ناراضی کو وہ کہین چھپاتے نہین - پس کہا جا سکتا ہے کہ سرور قدامت پسند ہین اور زمانہ قدیم سے تعلق رکھتے ہین اور سرشار اس نئی تحریک کے حامی ہین کہ جو فنون لطیفہ کو تکلف اور قدامت پسندی کے پنجہ سے چھڑا کر آزاد کرنا اور اسکو نیچر کا متبع دیکھنا چاہتی ہے اور اسیوجہ سے وہ زمانہ حال اور مستقبل دونون سے تعلق رکھتے ہین -

اس مضمون کے اختتام پر ہم منشی سجاد حسین مرحوم اڈیٹر اودھ پنچ اور پنڈت رتن ناتھ سرشار کی عبارت کے نمونے پیش کرتے ہین تاکہ ناظرین کو دونون کے رنگ طبیعت سے آگاہی حاصل ہو منشی سجاد حسین کے مشہور ناول حاجی بغلول سے وہ مقام لیا جاتا ہے جہان "حاجی صاحب" اپنی

معشوقہ کنڈے والی کو یاد کر کے اُسکے تصور سے اپنے دل ہی دل مین باتین کر رہے ہین۔ اور فسانہ آزاد جلد چہارم سے اسکے قریب قریب وہ مضمون نقل کیا جاتا ہے جسمین خوجی بمبئی پہنچنے سے کچھ پہلے جہاز پر اپنی معشوقہ شتاب جان وزرن سے ملنے کے خیال مین بےچین ہو رہے ہین اور اسکے متعلق آزاد سے باتین ہو رہی ہین۔

(ماخوذ از حاجی بغلول) ناظرین ذرا چلئے اسوقت تنہائی مین حاجی صاحب بڑے کراہ رہے ہین کان لگا کر سنئے تو کیا کہہ رہے ہین۔ مگر دیکھئے دور ہی سےئے نزدیک گئے اور سارا کھیل بگڑ گیا۔ آپ کہہ رہے ہین۔

اے نیک بخت افسوس تجھکو خبر نہین کہ کوئی حاجی جان دیتا ہے۔ یون دم توڑتا ہے۔ آپ تو کھیتی باڑی مین جی بہلاتی ہوگی یا گھر کے چکی چولھے مین پڑی ہوگی (اسے تو بہ مصروف ہوگی) یا ایلیان پیاری پیاری بناتی ہوگی۔ مگر یہان سوکھ سوکھ کر عشق کی دھوپ مین ہم کنڈا ہوے جاتے ہین تمکو کیا نام کرجانا چاہیے ہم نبو اکنڈے جسکی آنچ ایسی تیز ہوتی ہے کہ تپال جنتر مین عرق اور تیل اُسی سے نکل سکتا ہے۔ کیمیا کے نسخے اسی سے تیار ہوتے ہین۔ ہائے افسوس۔ کیا نام کہ حضور کی محبت مین کیسے کیسے مخمصے اُٹھاے۔ لگو بکار ہر کے کھیت مین لیجانا۔ گھوڑے پر سے گرنا عل خوانی مین گرا ہی سہنا (یہ سب وہ واقعات ہین جنکا ناول مین ذکر ہے) اگر حاجی عاشق صادق ہے جو تسلیم ورضا کی سپر لگائے سب چوٹ مین کھاتا ہے۔ ورنہ کیا نام کہ مجال تھی کسکی انگلی تو دکھائے مارے چربون کے سہراُڑ کر دیا ہوتا۔ مگر نہین عاشقی کے ضابطہ کے خلاف یہ بات تھی جس گاؤن کو تم اپنے جلوہ سے رشک ارم بناؤ۔ وہان کا گدھا اور سور براق اور دُنبہ ہے اور آدمی تو ہماری آنکھ مین حور اور غلمان ہین۔ دم بھر کو کوئی سسرال جاتا ہے جو چوتھی کھیل جاتی ہے۔ بھلا ہے کوئی مرد آج اس میدان مین جو عشق بازی مین آپکے حاجی کا مقابلہ کر سکے۔ ہائے مین آج کو کرا ہوتا اور جہان تم ہوتین وہان ٹھیکے تا اُون تا اُون کی صدا تا۔ تم ہنکانے اٹھتین اور ہم تمھارے سر پر آبیٹھتے۔ ہائے تمنا ہے کہ ہم تمہارا گائے بھینس ہوتے اور کیا نام کہ تم ہمارے گلے مین رسی باندھکر چرانے لیجاتین۔ ٹھوسنہر تمہارے تارک

ہاتھ پھیرتے۔ تم دودھ دہی ہوتین اور ہم تمکو چاٹتے ہوتے۔ کیا نام کاگر کہو تو بمبئی چلین اب تو ہم آپ کے عاشقون مین ہو گئے۔ آج تک کبھی یہ چوٹ نہین اٹھائی۔ مگر قسمت کا لکھا ہوا۔ اب تو ہم دنیا مین تمہارے عاشق مشہور ہو گئے۔ سب پر بھید کھل گیا ؎ میرے دل کے مونڈھے پہ بیٹھو صنم تم۔ تن زار گھٹکر ٹھٹیرا ہوا ہے۔ آہ یہ کمر کا درد۔ تمہارے عشق کی چوٹ ہے جو سارے جسم و جان مین پھیلی ہوئی ہے افسوس۔

سوختیم و سوزش ما لیائم کہ کسی پر ظاہر نشد
چون چراغان شب مہتاب بیجا سوختیم

ہائے سینہ مین الاؤ لگا ہوا ہے۔ بھس کی آگ کی طرح اندر ہی اندر سلگ رہا ہے

(ماخوذ از فسانۂ آزاد جلد دوم) اتنے مین ملاحون نے کہا اب بمبئی سامنے سے نظر آتی ہے سنتے ہی خوجی کی باچھین کھل گئین۔ چلا کر کہا یار ذرا دیکھنا بی شتاب جان صاحب کی فنس تو نہین آئی ہے۔ کرم بخش نامے مہری ساتھ ہو گی۔ اطلس کا چھکا ہے اور کہار رونگی پگڑیان وردی رنگی ہوئی ہین۔ پھلیان ضرور لٹک رہی ہونگی۔ بی شتاب جان ہوت۔ اے شتاب جان صاحب آزاد پاشا آواز آئی ارے یار آواز آئی ہو تو خدا کا واسطہ بتا دو۔ بی شتاب جان۔ اے کرم بخش مہری مہری کیا بہری ہے۔

لوگون نے سمجھایا کہ صاحب ابھی بندرگاہ تو آنے دیجئے بی شتاب جان اور کرم بخش یہانسے کیونکر سن لینگی۔ کہا اجی ہٹو بھی تم کیا جانو کبھی کسی پر دل آیا ہو تو سمجھو۔ ارے نادان عشق کے کان دو کوس تک کی خبر لاتے ہین۔ اور کون کوس کڑی منزل کے کوس۔ کیا شتاب جان نے آواز نہ سنی ہوگی واہ بھلا کوئی بات ہے۔ مگر جواب کیون نہ دیا۔ یہ پوچھو اسمین اک لم ہے پوچھو وہ کیا وہ یہ کرع معشوق پن نہین اگر اتنی کچی نہو۔ اگر آواز کے ساتھ ہی آواز کا جواب دین تو بندے کی نظرونسے گر جائین۔ مزا جب ہے کہ ہم بوکھلائے ہوئے ادھر ادھر ڈھونڈتے اور آوازین دیتے ہون کہ بی شتاب جان صاحب اجی بی صاحب اور وہ بخیری مین پیچھے سے ایک دھول جمائین اور تنک کر کہین

مونڈی کاٹا آنکھون کا اندھا امام مین سکہ غل مچاتا پھرتا ہے۔ شتاب جان شتاب جان اے بی صاحب تیری بی کو کیا کہون۔ موئی کہین چرخہ کات رہی ہوگی۔ اور ہم دہول کھاکر کہین کہ دیکھئے سرکار ایکی دہول لگائی تو خیر جواب دہول لگائی نہ تو بگڑ جائیگی۔ بس کہدیا ہے۔ اور وہ جھلا کر ایک دو جمائین کہ اینجانب کی ٹوپی گہورے پر جا گرے۔ اور ساتھ ہی اس گھٹی ہوئی کھوپڑی پر تڑاتڑ دو چار اور جمادین۔ تب ہنسکر کہون۔ جانمن خدا گواہ ہے اسوقت پیٹ بھرا ہے ورنہ مارے بھوک کے آنتین قل ہو اللہ پڑھ رہی تھین۔ سفر اور پردیس مین ایسی چاند تارہ سہ پارہ کہان ملتی جو بیدھڑک دہول پر دہول جماتی۔ اور ابھی کیا ہے پیاری ذرا تندرست ہو کر بیٹھین تو پھر دو ایک جوتے ضرور لگانا۔ ہان بے پاپوش کاری کے طبیعت بے چین رہتی ہے۔

آزاد۔ بالفعل کہئے تو خاکسار ہی لگا دے۔

خوجی۔ (مسکرا کر) اے نہین حضرت آپکو تکلیف ہوگی۔

آزاد۔ واللہ کس مردود کو اپنے حساب تکلیف ہو۔ وہ جوتون مین آپ اس درجہ کو پہنچ جائین کہ پھر عمر بھر آرام سے سوئیے۔ ع نے غم دزد نے غم کالا۔ یا کہئے فقط سنگھا ہی دون۔ گو تکلیف ہو کچھ پروا نہین۔ اسکا کہان تک خیال کرون گا۔

خوجی۔ میان پہلے منھ دہو آؤ۔ دل لگی نہین ہے۔ ان کھوپڑیون کے سہلانے کے لئے پریون کے ہاتھ چاہئے نہ کہ تم ایسے دیوزادون کے۔

آزاد۔ خدا کرے جسوقت آپ پر پاپوش کاری کرین اسوقت ہم بھی ہون۔ کہتا جاؤن کہ ہمارے خاطر ایک اور بھی پڑے۔ اب کی زنجک چاٹ گئی۔ اب کے خوب چٹاخے سے آواز آئی۔ ہان ذرا ایک اور اور ذرا دور تک آواز جائے ؎

ناصح کے سر پہ ایک جمائی چٹاخ سے ۔۔۔۔ پھر ہاتھ مل رہے ہین کہ اچھی پڑی نہین

اتنے مین ساحل بحر نظر آیا۔ تو خواجہ صاحب نے غل مچایا شتاب جان صاحب ابھی حضور کا غلام فرزندانہ آداب عرض۔ اسقدر کہہ چکے تھے کہ لوگون نے قہقہہ لگایا۔ اور خوجی متحیر ہوئے کہ یہ کیا

اسرار ہے۔ آزاد سے پوچھا اس خندہ بے محل کا کیا سبب۔ آزاد بولے آپکی حماقت اس کا سبب ہے
گدھا پن خود کرتے ہو اور اوپر سے ہمسے پوچھتے ہو کر اس کا کیا سبب ہے۔ کیا فقرہ کہا تھا آپنے ذرا پھر فرمایئے گا
خواجہ صاحب نے طیش کھاکر پھر وہی فقرہ سنایا۔ اجی حضور غلام فرزندانہ آداب عرض کرتا ہے۔
آزاد۔ تو آپ شتاب جان کے صاحبزادہ فرزند دلبند ہین۔
خوجی۔ یہ کاہے سے۔ صاحبزادہ ہین یا میان ہین شوہر خاص۔
آزاد۔ پھر یہ فرزندانہ آداب کیسا ہوتا ہے۔ جو روکو کوئی فرزندانہ آداب عرض کرتا ہے تو آپ کی بیوی
کیا آپ کی والدہ شریفہ ٹھیرین؟
خوجی۔ (گالو پہ چپیڑ مار کر) ارررر اغضب ہو گیا برا ہوا واللہ ستم ہو گیا سخت مصیبت مین گرفتار
ہو گئے۔ ایسے خفیف ہوے کہ توبہ ہی بھلی۔ اے ہے خفت سی خفت ہے۔ مگر جم جڑے کی زبان پھسل گئی
لیکن تشفی یہ ہے کہ بدحواسی کے وقت ایسا کلمہ زبان سے نکلا۔ اور وہ بھی اپنی پیاری شتاب جان کی نسبت
جی۔ پھر درین چہ مضایقہ باشد۔ اب صاف صاف نظر آتی ہے وہ دیکھئے ہوا سے زلف درہم
و برہم ہوئی جاتی ہے۔

سمجھکر چھیڑا او مشاطہ اسکی زلف پُرخم کو
خدا کے واسطے برہم نکر اسباب عالم کو

وہ مہری سامنے ڈٹی کھڑی ہے۔ آخاہ اب تو بی کرم بخش بھی بارہ پرین۔ سرو قامت رشک شمشاد
اس حور کردار کی مہری بھی پریزاد ہے۔ وہ ہنسی اُہو ہو ہو۔ دُر دندان نے مار ڈالا کیا پیارے
دانت ہین۔ ؎

چمک لعل بدخشان کی مٹا دے
ترے ہونٹو نپہ ایسا رنگ پان ہے

یاران مژدہ باد کہ عروس ماذرس من دنگار گلعذار من وصبیہ من بی شتاب جان دامت حسنہ
از جھروکہ زرنگار مرامی بیند ومی گوید ؎ یار نام خدا ہے کشتی مین۔ ناخدا آج پار بیڑا ہے۔

آزاد - یار عمر بھر مین برجستہ شعر آج ہی مُناسب حال -

خوجی - درست اور وہ شعر جو کانسل کے نام ہمنے لکھا تھا -

لے قبائے بادشاہی راست بر بالائے تو

(مصرع ثانی خذف شد) والا سے تو

آزاد - مگر ایک غضب پھر کھایا - پہلے نشاب جان کو اپنی مادر مہربان بنایا - ابکے ایک ایسا کلمہ کہا کہ پھر چھیپ جاؤگے زبانسے لینا ہی نہین -

خوجی - کیا طاقت ہمنے کہا کیا تھا - یہی کہا تھا نہ - کہ عروس من دلگار من وصبیہ من بی نشاب جان پھر کیا عروس نہین یا صبیہ نہین ہے -

آزاد - اسے لعنت خدا - ارے کمبخت - عربی مین صبیہ لڑکی کو کہتے ہین - سے اب سر پیٹو - کبھی مان بناتا ہے کبھی لڑکی - اور پھر اوپر سے غُرّاتا ہے -

خوجی - (سر پیٹ کر) زبان تراش ڈالنے کے قابل ہے - لیکن خیر گذشتہ را صلوٰۃ آئندہ را احتیاط

آزاد - یار وہ دیکھو سامنے کیا نور کا بکا نظر آیا -

خوجی - یہی ہماری نشاب جان ہین - کیا صورت ہے ؎

چہرۂ گلگون ہے گلشن قامتِ موزون ہے سرو

گوش نازک ہین گُل تر غنچۂ گل ناک ہے

جلوہ گر خال سیہ ہے روے آتشناک پر

چشمۂ خورشید مین زنگی مگر تیراک ہے

مولوی عبد الحلیم شرر

ایک دوسری زبردست ہستی جسنے اُردو ناول کی اشاعت وترقی مین بڑی اعانت کی مولوی عبد الحلیم شرر ہین - اُنھون نے سب سے پہلے اُردو مین تاریخی ناول لکھے قصہ کے پلاٹ اور کیرکٹر نگاری کی ترقی پر توجہ کی اور نیز اپنے طرز تحریر سے ثابت کردیا کہ صاف بے ساختہ اور سلیس کی ہوئی زبان ہی ناول نویسی کے واسطے نہایت موزون ہے - اُنھون نے ناول کو غیر مہذب اور سخیف الفاظ ومضامین سے
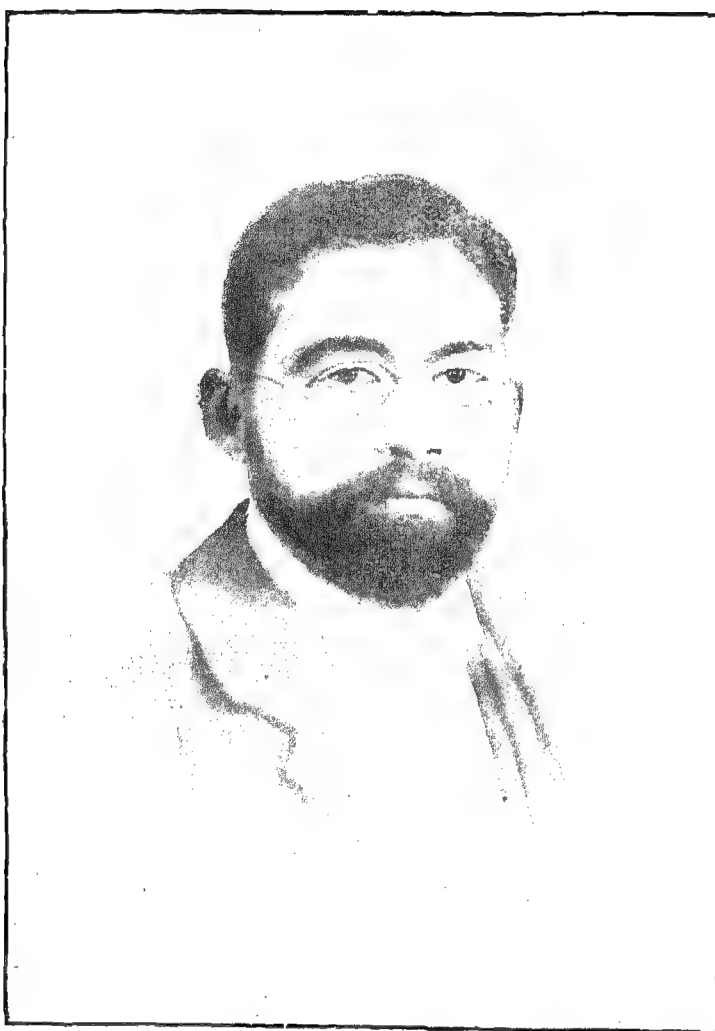
مولانا عبدالحلیم شرر

پاک کیا اور اپنی وسیع معلومات سے وہ مواد فراہم کیا جو اُنکی تصانیف کے کام آیا۔ وہ صرف ناولسٹ ہی نہ تھے بلکہ مورخ ڈراما نگار ادیب، اور ایک زبردست جرنلسٹ بھی تھے۔

[یہانسے صفحہ ۱۵۳ تک خود مولانا شرر صاحب مرحوم کے بیان کردہ حالات زندگی جو انہون نے بعد نظر ثانی بغرض اشاعت مجھکو عنایت فرمائے تھے اور میرے پاس موجود ہین درج کیے جاتے ہین۔ چونکہ یہی حالات کم و بیش مختلف عنوانات سے مصنف صاحب نے بھی اس کتاب مین بیان کیے ہین لہذا اصل مضمون کتاب کے بجائے اسی پر اکتفا کی گئی۔ مترجم]

جمعہ کے دن ۲۰۔ جمادی الثانی سنہ ۱۲۷۶ھ کو غدر سنہ ۵۷ء کے تین سال بعد لکھنؤ مین پیدا ہوئے نانا چونکہ دربار اودھ مین رسوخ اور معزز حیثیت رکھتے۔ تھے لہذا اودھ کے شاہی خاندان کے ساتھ انگلستان گئے اور وہان سے واپس آکے مٹیا برج کلکتہ مین قیام پذیر ہو گئے۔ عام خاندان کو چونکہ اگلے شاہی دربار سے وابستگی تھی لہذا مولانا کے دیگر بزرگ اور والد بھی انھین رسیون مین بندھے ہوئے مٹیا برج کلکتہ پہونچے۔ مولانا کے والد حکیم تفضل حسین صاحب عربی و فارسی مین کامل بصیرت رکھنے کے ساتھ ایک پختہ مغز طبیب تھے سنہ ۱۲۸۵ھ مین جب کہ ۹ سال کی عمر تھی کلکتہ گئے۔ اور اسی وقت سے گویا تعلیم شروع ہو گئی گو ایک ناقص طریقے پر لکھنؤ مین بھی ابتدائی تعلیم ہوتی رہی تھی۔

مٹیا برج مین ابتداءً اپنے والد صاحب سے اور چند اور اساتذہ سے ابتدائی کتب فارسی و عربی پڑھین۔ مولوی سید علی حیدر صاحب اور مولوی محمد حیدر صاحب سے کچھ معقولی و ادبی کتابین پڑھین مولوی مرزا محمد علی صاحب مجتہد سے چند اوپر کی منطقی کتابین پڑھین حکیم محمد مسیح صاحب سے بعض کتب طبیہ پڑھین۔ کچھ انگریزی بھی پڑھی مگر پرائیوٹ طور پر اور بالکل ناقص۔ اخبارات کا ذوق اسی زمانے سے پیدا ہو گیا تھا۔ کیونکہ ان دنون اودھ اخبار مین بہ حیثیت کارسپانڈنٹ خبرین لکھ لکھ کے بھیجا کرتے تھے۔

اُنیس ۱۹ سال کی عمر مین کلکتہ سے تعلق ترک کر کے لکھنؤ کی سکونت اختیار کی۔ اور مولوی محمد عبدالحی صاحب مرحوم سے کتب درسیہ عربی ختم کین۔ بیس ۲۰ برس کی عمر مین مامون کی بیٹی سے

شادی ہوئی۔ اور شادی کے بعد ہی حدیث کا شوق ایسا غالب ہوا کہ دہلی چلے گئے اور مولوی
محمد نذیر حسین صاحب محدث دہلوی کی خدمت مین حاضر ہوکے اور اُن کے مدرسہ مین رہ کے
حدیث کی تعلیم تکمیل کو پہونچائی۔ اب اس کے بعد اُنھین انگریزی کا شوق ہوا۔ اور انگریزی جاننے
کی ضرورت محسوس ہوئی۔ خانگی طور پر بے انتہا محنت شروع کی اور چند روز مین بقدر ضرورت دستگاہ
پیدا کر لی۔

اسی زمانے مین اُنھین منشی احمد علی کسمنڈوی مرحوم سے صحبت ہوئی جو بعض اخبارات
اور خصوص اودھ پنچ مین مضامین لکھا کرتے تھے۔ اور اُن کا فارسیت کا مذاق بہت بڑھا ہوا تھا۔
اُن کے شوق دلانے سے بعض اخبارات مین مضامین لکھنے لگے۔ جن مین بجائے با شکر مین کہہ
ہونے کے انشاپردازی کا مذاق بڑھا ہوا تھا۔ چنانچہ ۱۸۹۰ء مین منشی نول کشور صاحب نے
اُنھین اودھ اخبار کے ایڈیٹوریل اسٹاف مین لے لیا۔ یہ نوعمری کا زمانہ تھا طبیعت زورون پر تھی
اعلے خیال آفرینی کے ساتھ فلسفیانہ معنی آفرینی اور لٹریری مذاق بڑھا ہوا تھا۔ اسی رنگ کے مضامین
اس زور شور سے لکھنا شروع کیے کہ ہر جگہ شہرت ہوگئی اور ایسی شہرت ہوئی کہ حیدرآباد مین اور بعض
اور چھوٹی ریاستون مین طلب کیے گئے۔ مگر نا پسند کیا۔ سرسید سے گو شناسائی نہ تھی مگر اُنھون نے
روح " کے سبجکٹ پر مولانا کا ایک مضمون اس قدر پسند کیا کہ منشی نول کشور کو لکھا "مین اس مضمون مین
سے کچھ اخذ کرنا چاہتا ہون۔ لہذا صاحب مضمون سے اس کی اجازت چاہتا ہون "۔

اسی زمانے مین اُنھون نے اپنے ایک دوست مولوی عبد الباسط کے نام سے محشر نام ایک
ہفتہ وار رسالہ نکالا جس کا رنگ عبارت اسقدر دلکش اور دلفریب تھا کہ ہر طرف دھوم پڑگئی۔
اس مین اٹھارہ انیس نمبرون مین اُنھون نے سلسل صبح کا سمان دکھایا تھا جس نے تمام صاحب
ذوق لوگون کو حیرت مین ڈال دیا۔ یہ رنگ اُردو مین کبھی نہین دیکھا گیا۔ اُس مین فارسی کے تشبیہات
و استعارات تھے مگر بندشین انگریزی تھین۔ گویا انگریزی عروس سخن کو فارسی و اُردو کا لباس پہنا دیا
گیا تھا۔ اسی ضرورت سے قافیہ بندی اور رعایت لفظی بالکل چھوڑ دی۔ اور اس سے بہت پرہیز کیا

نیاز فتحپوری مدیر رسالہ نگار
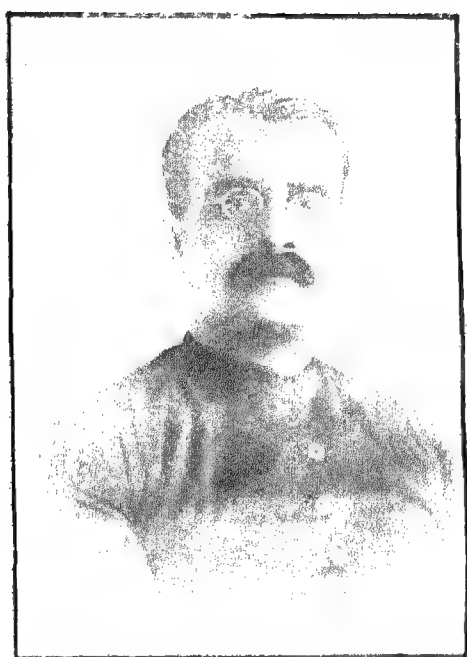
کہ نثر میں جا بجا اشعار شامل کیے جائیں۔ ابتداءً اس رنگ کے نباہنے میں اکثر جگہ عبارت اُلجھ جاتی تھی جس کی کچھ تو یہ وجہ تھی کہ اُردو نثر میں انگریزی کی طرح علامات اوقاف (پنکچویشن مارکس) نہیں ہیں۔ اور کچھ یہ کہ مولٰنا کا ایجاد کیا ہوا رنگ ابھی پختگی کو نہیں پہونچا تھا۔ مگر چند ہی روز کے بعد ایسا اعتدال پیدا ہوا کہ اُن کی عبارت نے خاص رنگ پکڑ لیا۔ اور ایسا مقبول رنگ کہ یہی طرز عبارت آج ساری اُردو انشا پردازی اور اخبارات کی عام زبان پر حکومت کر رہا ہے۔

یہ ایسی عبارت کی شان تھی کہ جس نے ایک دفعہ دیکھا بے انتہا گرویدہ ہو گیا۔ اور فوراً اس کو اختیار کر لیا۔ افسوس کہ شرر کے وہ اودھ اخبار اور محشر کے مضامین کسی نے علٰحدہ نہیں چھاپے اور وہ اصل پرچے کہیں دستیاب نہیں ہوتے۔ ورنہ شاید اب ہندوستان بہ نسبت سابق کے اُن کی زیادہ قدر کرتا۔ ۱۸۸۵ء میں منشی نولکشور کے تعلق کو چھوڑ دیا جس کا سبب یہ تھا کہ مطبع اودھ اخبار نے اسپشل کارسپانڈنٹ بنا کے حیدرآباد بھیجا تھا۔ مولٰنا گئے مگر چھ مہینے رہکر واپس آنا چاہا۔ مطبع نے اس کی اجازت نہ دی۔ اور آپ خود ہی چلے آئے۔

اس زمانے میں اُنھوں نے اپنا سب سے پہلا ناول "دلچسپ" لکھا جسمیں دقتوں اور حالتوں کا ایسا سماں دکھایا ہے کہ اُردو زبان میں بالکل نیا اور حیرت انگیز ہے۔ مگر چونکہ اس رنگ کا پورا ڈولپمنٹ (رواج) ہنوز نہیں ہوا تھا لہذا جا بجا اُلجھا ہوا اور پیچیدہ ہے اور اخلاق پسندی کی شان دکھاتا ہے۔ وہ ایک ہندوستانی معاشرت کا ناول ہے جس میں عشق کی دلچسپی کے ساتھ دکھایا گیا ہے کہ ہندوستانی خاندان زیادہ تر کن اسباب سے تباہ ہوتے ہیں۔ سال بھر بعد اس کا دوسرا حصہ شایع ہوا جو انشا پردازی کے اُس نقص سے پاک تھا جو پہلے حصہ میں ہے۔ اس میں نہایت پختگی حاصل ہو گئی ہے۔

اس کے دو سال بعد مولٰنا نے بنکم چندر چٹرجی کے ناول درگیش نندنی کو اُس کے انگریزی ترجمہ سے اُردو میں ترجمہ کر کے شایع کیا۔ اور اُس کے دیکھنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ایک اچھا انشا پرداز ترجمہ کرے تو اُس میں کیسی خوبیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔

اب پبلک مولانا کے کلام کی بے انتہا مشتاق تھی - ہر طرف زبردست شوق پھیلا ہوا تھا کہ مولوی بشیر الدین صاحب ایڈیٹر البشیر اور منشی نثار حسین صاحب نثار مالک پیام یار کے اصرار سے ۱۸۸۷ء مین مولانا نے اپنا مشہور رسالہ دلگداز جاری کیا - اُس کے شایع ہوتے ہی شوق نے سارے ہندوستان مین ایک سرگرمی پیدا کر دی اور اُس کی اشاعت ہزار سے زیادہ ہو گئی - اِسمین خاص قسم کے ایسے مضامین تھے جن کے نمونے اگر کوئی ڈھونڈھے تو صرف انگریزی اعلیٰ لٹریچر مین مل سکتے ہین - اُردو کا خزانہ اُس وقت تک اُس سے خالی تھا - کسی خیال کو موثر بنانا اور بغیر تشبیہ و استعارہ کے اور بغیر قافیہ بندی کے کسی مطلب کو دلکش و دل فریب بنا دینا دلگداز کے سحر نگار ایڈیٹر کا خاص حصہ تھا - اس کے مضامین اسقدر پسندیدہ اور ایسے دلکش رنگ مین ڈوبے ہوئے تھے کہ سر رشتہ تعلیم کو بھی بغیر اس کے کہ مولانا کو اس محکمے سے کوئی بھی لگاؤ ہو آپ کے مضامین لینے پڑے - اور اب ہندوستان مین اُردو کا کوئی کورس نہین ہے جس مین دو ایک مضامین شرر کے نہ ہون -

۱۸۸۸ء مین دلگداز مین ناول نویسی کا سلسلہ شروع کیا گیا - اور اُس وقت سے مسلسل وہ ناول شایع ہونے لگے جن کے نام ملک العزیز ورجنا - حسن انجلنا - منصور موہنا وغیرہ ہین جن مین مورخانہ شان سے قدیم دلچسپ واقعات کو اعلےٰ لٹریچر کا لباس پہنایا گیا ہے - یہ ناول اس قدر مقبول ہوئے کہ اس وقت تک ان کے بیسیون ایڈیشن شایع ہو چکے ہین - اور مانگ ویسی ہی باقی ہے - بلکہ زیادہ ہے -

شرر کے ناولون اور نیز مضامین کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اُنھون نے تاریخ کو اور خصوصاً اسلامی تاریخ کو حد سے زیادہ اسٹڈی کیا ہے - اور اسی وجہ سے مضمونون اور ناولون مین روز بروز خیال آرائی کا رنگ چڑھتا گیا - اور تحقیق و تدقیق کے ساتھ صرف سادے الفاظ مین جوش پیدا کرنے اور واقعات کو انتہا سے زیادہ دلکش بنا دینے کی شان بڑھتی گئی - ان کے آخری ناولون مین ایک ایام عرب ہے جس مین جاہلیت عرب کی زندہ سوسائٹی ایسی عمدگی و خوب صورتی سے دکھائی گئی ہے کہ زبان حیرت کرتا ہے - فلورا فلورنڈا - اور فتح اندلس وغیرہ مین اسپین کے اسلامی دور کو ایسی خوش اسلوبی سے دکھایا

ہے کہ لوگ بار بار پڑھتے ہین اور جی نہین بھرتا۔

انہین آخری ناولون مین ناول "فردوس برین" بھی ہے اس کا پلاٹ ایران مین اور اُس زمانے
مین دکھایا گیا ہے جب کہ جبال طالقان اور التموت مین باطینون (حسیسین لوگون) کا زور تھا۔ اور ہزارہا
بندگان خدا اُن کے خنجر سے مارے جاتے تھے۔ اُن کے بادشاہ نے پہاڑون مین ایک جنت بنا رکھی
تھی جس مین وہ سب سامان فراہم کیا تھا جو مسلمانون کے خیال مین جنت مین ہونا چاہیے۔ اس ناول
مین عجیب حیرت ناک طریقے سے دکھایا گیا ہے کہ وہ لوگ کیونکر لوگون کو فریب دے کے اپنا گرویدہ
بناتے اور اپنی فلسفیانہ تقریرون سے انسان کو کیونکر اپنا فریفتہ کر لیتے تھے۔

تاریخی مذاق کے بڑھنے کا ایک یہ نتیجہ تھا کہ مولنا شرر نے ۱۸۹۰ء مین مہذب نام ایک اخبار جاری
کیا جس مین مسلسل علمائے اسلام کے سوانح عمری ہوا کرتے تھے۔ اس پرچے کی اشاعت بڑھتی جاتی تھی اور
مسلمانون مین نہایت مقبول تھا کہ یکایک ۱۸۹۱ء مین انہون نے دلگداز اور مہذب دونون کو بند کر کے
حیدرآباد کا سفر کیا۔ اور وہان ریاست مین دو سو روپیہ ماہوار کا تعلق پیدا کر لیا جس کی وجہ سے ایک
مدت تک وہ ملک کی نظر سے غائب رہے۔ اتفاقاً نواب وقار الامرا بہادر سابق مدار المہام مرحوم
کے چھوٹے صاحبزادے نواب ولی الدین خان انگلستان مین ایٹن کالج مین تعلیم پاتے تھے اور چونکہ بچپن
سے بھیجے گئے تھے لہذا مذہب سے بالکل آشنا نہ تھے۔ مولنا شرر کو وقار الامرا بہادر نے اس خدمت کے
لیے منتخب کیا۔ اور ۱۸۹۵ء مین وہ انگلستان گئے۔ جہان چودہ پندرہ مہینے قیام رہا۔ اور موسیو کورین نام
ایک فرانسیسی محقق سے فرنچ زبان شروع کی جس مین اتنی دستگاہ ہے کہ ڈکشنری کی مدد سے ترجمہ
کر سکتے ہین ۱۸۹۶ء کے آخر مین ہندوستان واپس آئے۔

۱۸۹۸ء مین آپ نے حیدرآباد سے دلگداز کو از سر نو جاری کیا۔ مگر گیارہ ہی مہینہ تک جاری
رکھ کے خود ہی بند کر دیا جس کی وجہ یہ ہوئی کہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی صاحبزادی جناب سکینہ
کی لائف آپ نے شایع کرنا شروع کی تھی۔ اُس مین چونکہ تاریخی تحقیقات کر کے اصلی واقعات لکھے تھے
وہ عام مسلمانون مین اور خاصۃً شیعہ لوگون کے خلاف ہوئے۔ اور ایک قسم کی شورش پیدا ہوئی۔

بعض عہدہ داران گورنمنٹ نظام نے پرائیوٹ طور پر آپ کو ہدایت کی کہ اس مضمون کا سلسلہ بند کر دین مگر آپ نے جب یہ رنگ دیکھا تو بجائے اس مضمون کے خود پرچہ بند کر دیا۔ اور اُسے سنہ ۱۹ء مین پھر لکھنؤ آکے جاری کیا جس مین سب کے پہلا مسٹی سکینہ بنت حسین کی لائف کا بقیہ تھا۔

اس زمانے مین ریاست دکن کے تعلقات قایم تھے صرف مدارالمہام مرحوم کی فیاضی اور سابق ہوم سکرٹری مولوی محمد عزیز مرزا صاحب کی کوشش سے آپ کو لکھنؤ مین رہنے کی اجازت مل گئی تھی سنہ ۱۹۰۱ء کے درمیان مین آپ واپس طلب کیے گئے نتیجہ یہ ہوا کہ دلگداز بند کر کے آپ پھر حیدرآباد گئے۔ اس مرتبہ جانے مین یکایک ایسے انقلابات ہو گئے کہ آپ کے تعلقات ریاست کو نقصان پہونچا۔ وقارالامرا بہادر وزارت سے علٰحدہ ہوئے اور چند روز بعد انتقال بھی کر گئے۔ مولوی عزیز مرزا صاحب جن کو آپ سے خاص ہمدردی تھی اضلاع مین ڈپٹی کمشنری کی خدمت پر بھیج دیے گئے۔ نئے مدارالمہام مہاراجہ کشن پرشاد بہادر کو آپ سے کوئی خاص ہمدردی نہ تھی۔ اور مسٹر واکر جو فنانس کا انتظام کرنے کے لئے آئے تھے اُن کے نزدیک ریاست کو مولانا کی ضرورت نہ تھی۔ غرض ریاست سے جو تعلق تھا جاتا رہا۔ اور جو تعلق وقارالامرا بہادر کے صاحبزادے نواب سلطان الملک بہادر کی سرکار سے تھا اُسے آپنے خود ہی چھوڑ دیا۔ اور سنہ ۱۹ء مین لکھنؤ واپس آ کے پھر پبلک کی خدمت شروع کر دی۔ جب سے دلگداز پھر جاری ہوا اور اس وقت تک جاری ہے۔

مولانا کا رنگ عبارت اسٹڈی کیا جائے اور اُس مین خاص حیثیت سے انسان منہمک ہو تو پتہ چلتا ہے کہ آپ نے اردو مین کیا چیز پیدا کی ہے۔ اُردو کے پُرانے نمونے دو وضع کے تھے۔ ایک تو میر امن دہلوی کی سادی عبارت۔ اور دوسری مرزا رجب علی بیگ سُرور کی فارسی مذاق کی رنگین اور مسجع و مقفّیٰ عبارت۔ اس کے بعد جو اُردو کے نئے مجدد پیدا ہوئے وہ حسب ذیل ہین سر سید احمد خان۔ مولوی محمد حسین آزاد۔ مولانا نذیر احمد صاحب۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار۔ اور مولانا محمد عبدالحلیم شرر۔ سر سید نے سادگی اور وہ شان اختیار کی جو کبھی مولانا شاہ اسماعیل کے قلم نے دکھائی تھی۔ یعنے ہر مضمون اس طرح ادا کیا جائے کہ عامی سے عامی شخص اُس کو سمجھ جائے۔ مولوی محمد حسین کی شان یہ تھی کہ زبان مین بے تکلفی و روانی ہو

اور روانی کے ساتھ شاعرانہ تشبیہات و استعارات بھی بہت ہی معتدل حد تک ہون۔ مولوی نذیر احمد صاحب
صرف روانی چاہتے تھے اور بے تکلفی مین اس قدر حد سے بڑھ گئے ہین کہ زبان کو جب ہتین بنانا چاہتے ہین
تو سوا اس کے کہ عربی یا انگریزی جملے اور لغات داخل کردین اُن کا کچھ زور نہین چلتا۔ بندشین وہی رہتی ہین
اور عبارت بھی وہی باقی رہتی ہے۔ پنڈت رتن ناتھ مین کوئی ایجادی مادہ نہین ہے۔ اور اگر ہے
تو صرف اتنا کہ اُن مین ظرافت کا مادہ بڑھا ہوا ہے۔ اُن کی عبارت دو طرح کی رہتی ہے۔ ایک تو
وہ جہان وہ خود کوئی سمان کھینچنا چاہتے ہین یا کسی کیفیت کو بیان کرتے ہین وہان اُن کی عبارت مین
اور سرور کی عبارت مین کوئی فرق نہین۔ وہی قافیہ پیمائی ہے۔ وہی مبالغے ہین۔ وہی پُرانی تشبیہات
و استعارات ہین۔ اور وہی جا بیجا اور ضرورت و بے ضرورت اشعار کا بھرتی کرنا ہے۔ بلکہ الفاظ بھی وہی
پُرانے فارسی نثارون کے ہین۔ دوسری عبارت وہ جہان عورتون کی زبان سے وہ اُن کے خیالات
ادا کرتے ہین۔ اس مین سوا خاص خاص لغزشون کے وہ لکھنؤ کی عورتون کی زبان اچھی اور بے تکلف
لکھتے ہین۔ خلاصہ یہ کہ سرشار کی زبان مین کوئی جدّت نہ تھی سوا اس کے کہ خلاف قیاس مضامین
کو چھوڑ دیا پُرانی عبارت اور اُن کی عبارت مین کوئی فرق نہ تھا۔ شرر نے ان سب لوگون سے علیحدہ
ہو کے یہ کمال دکھایا کہ انگریزی انشا پردازی کی خوب صورت بندشون کو اردو مین داخل کیا۔ مگر تشبیہات
و استعارات وہی پُرانے ایشیائی رکھے۔ اُنھون نے خیالی مضامین کو لیا۔ اور اُن مین بالکل انگریزی
جادو نگارون کی سی خیال آفرینیان کین اور عجب خوب صورتی کے ساتھ اُنھین اُردو مین کھپا دیا۔
اُردو پبلک مین ابتدائً یہ نیا رنگ تھا۔ انگریزی والون کو اُردو مین وہ چیز مل گئی جسے وہ ڈھونڈھ
رہے تھے۔ اور صرف اُردو جاننے والون کو تھوڑی وحشت کے بعد جب اُس کی چاٹ پڑی تو اُن کے
نزدیک اُس سے زیادہ دلچسپ کوئی رنگ عبارت تھا ہی نہین۔ سرشار کا رنگ اُن کے چند
ابتدائی نادلون پر محدود رہے اور وہ بھی جن مین پلاٹ نہین۔ بخلاف اس کے شرر کا رنگ زیادہ تر
اُن کے مضامین مین نظر آتا ہے جو اپنا جواب نہین رکھتے۔ اور جن کے سامنے کسی کو قلم اُٹھانے کی
جرات نہین ہوسکتی۔ شرر ہی نے درحقیقت وہ زبان شروع کی جس کی نسبت سب کو اتفاق ہے۔ کہ

وہی جدید اُردو ہے اور وہ زبان ہے جو فی الحال ملکی لٹریچر پر حکومت کر رہی ہے - اور جو جو یہ رنگ چمکتا اور اُبھرتا جائے گا اُسی قدر زیادہ نمایاں طور پر شرر کا سکہ اُردو لٹریچر پر نظر آتا جائے گا۔ سادی حیثیت مین وہ ستین محققانہ بلکہ فلسفیانہ ہے - شاعرانہ خیال آفرینی کی حیثیت مین وہ شاعری کے رنگ مین انتہا سے زیادہ ڈوبی ہوئی ہے - وہ جس چیز کی تصویر کھینچتے ہین اُسے اسکاٹ کی طرح ناظرین کی نظر کے سامنے لا کے کھڑا کر دیتے ہین - انسانی جذبات پر اس طرح اور اتنا تصرف کرتے ہین کہ جس قسم کے جذبات چاہتے ہین اپنے ناول پڑھنے والے کے دل مین پیدا کر دیتے ہین - اپنا زورِ طبع دکھانے کے لیے اُنھون نے ایسے ایسے سبجکٹ لیے جن پر اُن سے پیشتر کسی نے قلم نہین اٹھایا تھا - مثلاً "غریب کا چراغ" "صحبت بر ہم" "نہین" "ہان" "لالہ خود رو" "یاد رنگان" "دیہات کی لڑکی" "خواب دوشین" وغیرہ وغیرہ - ایسے مضامین کو اُردو مین پہلے پہل اُنھین نے انٹروڈیوس کیا - اور سچ یہ ہے کہ آج تک اُن سے بہتر کوئی نہین لکھ سکا - آخر سچ یہ ہے کہ اُردو لٹریچر کی دُنیا مین ایک جابکدست مصور ہین - اور جذبات انسانی پر حکومت کرنے والے بادشاہ -

تاریخی ذوق پڑھنے کی بدولت مولانا اوّل سے ایک مورخ بن گئے - آپ نے دلگداز مین جو تاریخی مضامین لکھے ہین اُن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف مسائل تاریخی اور اکثر نامورانِ سلف کی سوانح عمری لکھ کے آپ نے ہندوستانی پبلک کی واقفیت بہت بڑھا دی ہے - مگر ان کے علاوہ آپ نے دو تاریخین بھی لکھی ہین جو بہت بڑے پیمانے پر ہین - ایک تاریخ سندھ جس مین آپ نے اسلامی عہد کو عام مسلمات کے خلاف کچھ اور ہی ثابت کر دیا ہے اور اُس کی تکمیل کے لیے عربی اور انگریزی تاریخون کی بہت ورق گردانی کی ہے - دوسری تاریخ ارضِ مقدس ہے جس مین یہود کے ابتدائی زمانے سے رسول آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک کے حالات بڑی تنقیح و تحقیق سے لکھے ہین -

مولانا کا کیرکٹر یہ ہے کہ رسم و رواج کے اکثر خلاف رہتے ہین - اور تحقیق و تنقید کی دُھن ہے - تقلید سے گریز - اور اہلِ حدیث کے اصول مذہب کی طرف رجحان ہے - اگرچہ بعض مسائل مین

مولانا عبدالحلیم شرر

اپنی تحقیق کی بنا پر اہل حدیث سے بھی علیحدہ ہو جاتے ہین - آزادی کا خیال غالب ہے - اور جو چیز صحیح ثابت ہو جاے اُس کے تسلیم کرنے اور علانیہ اُس کا اعتراف کر دینے مین باک نہین کرتے۔ علماے زمانہ کی اکثر شکایت کرتے ہین - انھین اسباب سے اکثر عوام الناس اُن سے سخت مخالفت رکھتے ہین - پہلی ناراضی لوگون کو اُن سے یہ تھی کہ مستند تاریخون سے نقل کر کے شایع کر دیا کہ حضرت شہر بانو کا عقد جناب امام حسین کی وفات کے بعد آپ کے صاحبزادے امام زین العابدین نے اپنے غلام زبید سے کر دیا۔ دوسری مخالفت وہی سکینہ بنت حسین کی لائف کی بنیاد پر تھی مگر سب سے زیادہ اختلاف اُس وقت ہوا جب آپ نے سنہ ۱۹۰۱ء مین پردہ عصمت نام ایک رسالہ لکھنؤ سے شایع کیا جس کی غرض یہ تھی کہ مسلمانون مین سے پردے کا رسم اٹھا دیا جائے۔ آپ کا دعوے تھا کہ پردہ اسلام مین صرف ایک ساتر اور مہذب لباس کا نام ہے نہ گھر کی چار دیواری مین بند کر دینے کا - یہ رسالہ برس دن تک نکلا۔ ہر جگہ سخت اختلاف ہوا۔ مگر اُس نے اپنا کام پورا کر دیا - اس لیے کہ اُس وقت تک اس مسئلہ کو علانیہ کوئی بیان نہین کر سکتا تھا - اور اب ہر جگہ ایک جماعت اس کی طرفدار ہے اور پردے کے توڑنے کی کوشش کر رہی ہے -

اپریل سنہ ۱۹۲۰ء سے آپ نے ایک نیا پندرہ روزہ رسالہ جاری کرنا شروع کیا جس کا نام "اتحاد" رکھا اور اس کی غرض یہ تھی کہ ہندو مسلمانون کے باہمی تعلقات صاف کیے جائین۔

مولانا کے آخر عمر یعنی تقریبًا سنہ ۱۹۲۰ء سے سنہ ۱۹۲۶ء اُنکے سال وفات تک کے مزید حالات مختصرًا اس طرح پر تقسیم ہو سکتے ہین (۱) دلگداز اس زمانہ مین کئی دفعہ بند ہوا اور پھر جاری ہوا اور بالفعل اُن کے صاحبزادہ مولوی محمد صدیق حسن صاحب منیجر انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن کی اڈیٹری مین لکھنؤ سے نکلتا ہے (۲) جب مولانا محمد علی سنہ ۱۹۱۲ء مین اخبار "ہمدرد" دہلی سے نکالنے والے تھے تو سب سے پہلے اُنھون نے اُسکی ادارت کیواسطے مولانا کو دو سو روپیہ ماہوار پر مقرر کیا تھا مگر بعض وجوہ سے مولانا چند ماہ دہلی مین قیام کر کے قبل اخبار نکلنے کے لکھنؤ چلے آئے اور اخبار

مذکور سے کوئی تعلق نہین رکھا (۳) سنہ ۱۹۱۸ء [?] مین حضور نظام فرمانروائے دکن خلد اللہ ملکہ نے مولانا کو طلب کرکے انکو اپنی سوانح عمری تیار کرنیکا حکم دیا تھا مگر بعد کو یہ خیال ترک کیا گیا اور بجائے اُس کے مولانا "تاریخ اسلام" لکھنے پر مامور کیے گئے جسکے واسطے ایک معتد بہ رقم ماہوار انکو لکھنؤ گھر بیٹھے ملتی تھی۔ یہ کتاب تین جلدون مین تیار ہوئی جسکی پہلی جلد شایع ہو گئی اور عثمانیہ یونیورسٹی کے نصاب تعلیم مین داخل ہے۔

مولانا کے چھوٹی اور بڑی تصانیف اتنی کثرت سے ہین کہ وہ اس خاص صفت مین اپنے تمام معاصرین پر گوئے سبقت لے گئے تھے اور اُن کی اس کثرت تصانیف سے وہ زمانہ قرون اولیٰ کا یاد آجاتا ہے جبکہ تصانیف کی کثرت مختلف طریقون سے کتب تاریخ و سیر مین بیان کی جاتی تھی مثلاً کسی مصنف کے تراشہ قلم سے اُسکے غسل میت کیواسطے پانی گرم کیا جانا۔ یا کسی شخص کی مصنفہ کتب کا بار کئی کئی اونٹون پر ایک مقام سے دوسرے مقام تک لیجایا جانا وغیرہ۔ غرضکہ مولانا کی تمام تصانیف کی اسم نویسی اس جگہ تحصیل حاصل ہے اسکے واسطے کوئی فہرست کتب یا دلگداز کے آخری اشتہاری صفحات دیکھنا چاہئے۔ یہان پر ہم اُنکے جاری کردہ اخبارات ورسائل اور اُنکی تصانیف کی مجموعی تعداد باعتبار اُن کے مضامین کے بتا دینا کافی سمجھتے ہین۔

اخبارات و رسائل

(۱) محشر ہفتہ وار — سنہ ۱۸۸۲ء [?] لغایت ۱۸۸۳ء [?]
(۲) دلگداز ماہوار — ۱۸۸۷ء
(۳) مہذب ہفتہ وار
(۴) پردۂ عصمت پندرہ روزہ
(۵) اتحاد "
(۶) العرفان ماہوار

(۷) دل افروز ماہوار

(۸) ظریف ہفتہ وار

آخر مین چند سال ہوے ایک ماہوار پرچہ "مورخ" کے نام سے بھی نکالا تھا۔

تصانیف

سوانح عمریان مثلاً "ابوبکر شبلی" جنید بغدادی، وغیرہ	۲۱
تاریخی ناول مثلاً ایام عرب، بابک خرمی وغیرہ	۲۸
خیالی ناول حسن کا ڈاکو، غیب دان دولہن وغیرہ	۱۴
تاریخ مثلاً تاریخ سندھ، عصر قدیم وغیرہ	۱۵
نظم و ڈراما مثلاً شہید وفا، شب غم، شب وصل وغیرہ	۶
متفرق	۱۸
کل	۱۰۲

مولانا کے مضامین جو "دلگداز" مین چھپے ہین سید مبارک علی شاہ تاجر کتب لاہور نے آٹھ جلدون مین "مضامین شرر" کے نام سے حال ہی مین شایع کیے ہین یہ سب کتابین نہایت دلچسپ اور پڑہنے کے لائق ہین مگر علی الخصوص وہ جلد جس مین قدیم لکھنؤ کے حالات جو ہندوستان مین مشرقی تمدن کا آخری نمونہ" کے نام سے دلگداز مین چھپتے رہے دیکھنے کے لایق ہی اور اُن لوگون کے لیے جو لکھنؤ کی پرانی تاریخ اور دلچسپیون کے جویا ہین نہایت مفید اور پرُاز معلومات ہے۔

مرزا محمد ہادی رُسوا

مرزا محمد ہادی بی۔اے۔پی ایچ۔ڈی متخلص بمرزا ورسوا فن شعر مین مرزا دبیر مرحوم کے شاگرد ہین۔ مرزا صاحب جوانی مین مرزا غالب کے رنگ کو بہت پسند کرتے تھے اور دیوان غالب انکو قریب قریب کل حفظ تہا۔ مگر اب غالب کی نازک خیالیان اور عبارت آرائی انکو زیادہ مرغوب نہین بلکہ کلام نہایت صاف سادہ اور لطیف تخیل سے معمور ہوتا ہے۔ اس صفائی اور سادگی مین وہ مومن کے متبع البتہ کہے جا سکتے ہین۔ مرزا صاحب کی معرکہ آرا تصنیف

انکا ناول امراؤ جان ادا ہے جسکو لکھے ہوئے تقریباً پچیس تیس برس ہوے ہونگے۔ یہ نہایت اعلیٰ درجہ کا ناول ہے اور اسکی عبارت نہایت اعلےٰ درجہ کی ہے۔ سب سے بڑی صفت اسمین یہ ہے جو اردو کے بہت کم ناولون مین پائی جاتی ہے کہ اس کا پلاٹ یعنی ترتیب قصہ نہایت باقاعدہ اور منظم اور اسکے کیرکٹر (اشخاص قصہ) صاف واضح طور پر نظر آتے ہین۔ ہم نے کسی ناول مین اتنی دلچسپی اتنی کثرت واقعات اور فطرت انسانی کی اتنی صحیح تصویر نہین دیکھی۔ اسمین اُس زمانہ کی طرز معاشرت اور سوسائٹی کے ہو بہو نقشے کھینچے گئے ہین جنمین کسی قسم کا مبالغہ یا آورد نہین ہے۔ مرزا صاحب کی دیگر تصانیف۔ انکے مثنوی نو بہار۔ صبح امید۔ مرقع لیلی مجنون (ڈراما) اور ذات شریف (ناول) وغیرہ ہین۔ مرزا صاحب بالفعل عثمانیہ یونیورسٹی کے دار الترجمہ مین ملازم ہین۔

حکیم محمد علی حکیم محمد علی تخلص طبیب جنکا تھوڑا عرصہ ہوا کہ انتقال ہو گیا ایک مشہور ناول نگار تھے۔ مندرجۂ ذیل ناول انکی تصنیف سے ہین۔ عبرت۔ حسن سرور۔ دیول دیوی۔ گرداب۔ رام پیاری۔ جعفر و عباسہ۔ اختر حسینہ۔ وغیرہ بعض ناول انگریزی کتابون کے ترجمے ہین۔ مثلاً نیل کا سانپ جو مائڈر ہیگرڈ کی کلیوپیٹرا کا ترجمہ ہے۔ اور دیول دیوی اور جعفر و عباسہ تاریخی ناول ہین۔ حکیم صاحب گو اپنے اقران و امثال مین ممتاز تھے مگر اعلی درجہ کے ناول نگار نہین کہے جا سکتے اسوجہ سے کہ وہ زمانہ کے رنگ سے بیخبر تھے اور نہ وہ اُس زمانہ یا اس سوسائٹی کے حالات سے واقف تھے جسکی وہ تصویرین کھینچتے تھے۔ فطرت انسانی سے وہ پوری طرح باخبر نہین اور لطیف جذبات کے بھی ماہر نہ تھے۔ عبارت مین یکرنگی ہے اور پند و نصائح سے اوبھی اُسے غیر دلچسپ اثر کرتے ہین

راشد الخیری ناول نویسی مین مولانا نذیر احمد صاحب کے صحیح جانشین کہے جاتے ہین۔ انکی توجہ زیادہ تر عورتون کی تعلیم و ترقی اور انکے مصائب زندگی پر مبذول ہے۔ چونکہ عبارت نہایت درد انگیز اور تاثیر سے لبریز ہوتی ہے لہذا مصور غم کے لقب سے مشہور ہین۔ کثیر التصانیف ہین۔ بعض مشہور تصانیف کے نام حسب ذیل ہین۔ صبح زندگی۔ شام زندگی۔ نوحہ زندگی۔ عروس کربلا۔ زہرۂ مغرب وغیرہ۔

نیاز فتحپوری — اُردو کے مشہور و مشاق ادیب و جرنلسٹ نیاز محمد خان نیاز فتحپوری۔ وطن فتحپور (یو۔پی) سال ولادت ۱۸۸۴ء۔ ابتدائی تعلیم فارسی و عربی گھر پر ہوئی پھر مدرسہ اسلامیہ فتحپور مدرسہ عالیہ رام پور اور ندوۃ العلماء کے دار العلوم مین فراغت حاصل کر کے حدیث مولانا عین القضاہ صاحب لکھنوی سے پڑھی انگریزی تعلیم ایف اے تک پرایوٹ طور پر حاصل کی اور ترکی زبان ایک ترک سے پڑھی مختلف روزانہ اخبارات مین کام کیا اب سات سال سے "نگار" ایک ادبی علمی رسالہ جاری کیا ہے جو پہلے بھوپال اور اب لکھنؤ سے جاری ہے۔

تصانیف۔ صحابیات گہوارہ تمدن نگارستان، (بعض ادبی مضامین کا مجموعہ ہے) جذبات بھاشا، شہاب کی سرگزشت، شاعر کا انجام، الشلتہ الشرقیہ، عرض نغمہ (ترجمہ گیتان جلی)۔

طرز تحریر — آپ کا طرز تحریر سب سے علیحدہ ہے اور آپ معمولی سیدھی سادی عبارت سے نظم نما نثر کو زیادہ پسند کرتے ہین مگر بعض موقعون پر جب یہ رنگ حد اعتدال سے بڑھ جاتا ہے تو عبارت باتکلف اور بے لطف معلوم ہونے لگتی ہے۔ عبارت اور مضمون مین چولی دامن کا ساتھ ہے لہذا اس قسم کی عبارت کو صرف اُنھین مضامین پر صرف کرنا چاہئے جو اُسکے متحمل ہوسکین مگر یہ بات ضرور قابل قدر ہے کہ آپ نے قدیم طرز انشا پردازی کو چھوڑ کر اپنے واسطے ایک نئی شاہراہ قایم کی ہے۔ آپ نے ٹیگور کی گیتان جلی کا اردو مین ترجمہ کیا ہے اور رومی اور یونانی علم الاصنام سے بھی آپ کبھی کبھی فائدہ اُٹھاتے ہین "کیوپڈ اور سائیکی" اور "مرکیٹی سیاح کی ڈائری" انگریزی کے ترجمے معلوم[ا] ہوتے ہین آپ کی بعض کتابین مثلاً "شاعر کا انجام" اور "گہوارہ تمدن" جس مین ترقی تمدن مین عورتون کے حصہ لینے کی بحث ہے نہایت عمدہ اور دلچسپ کتابین ہین۔ آپ کا رسالہ "نگار" ایک نہایت ممتاز ادبی رسالہ ہے جسکے اکثر مضامین جو آپکے زور قلم کا نتیجہ ہوتے ہین نہایت اعلیٰ درجہ کے اور پڑھنے کے قابل ہوتے ہین۔

خواجہ حسن نظامی — خواجہ حسن نظامی دلی مین ۱۲۹۶ھ مین پیدا ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ آپکی ولادت

[ا] یہ ترجمے نہین ہین بلکہ طبعزاد مضامین ہین ۱۲۔

درگاہ فلک بارگاہ حضرت نظام الدین اولیاء مین ہوئی - خواجہ صاحب ابتدائے عمر ہی سے اخبارات مین
مضامین لکھا کرتے تھے - کچھ عرصہ تک گورنمنٹ انکو بنظر شک دیکھتی رہی اور پولیس انکی نگرانی کرتی تھی -
وہ بوجہ اپنے مرتبہ اور نیز بوجہ جوشی صافی ہونیکے بہت باا ثر شخص ہین - پچاس سے زیادہ کتب اور رسایل کے
مصنف ہین جنمین سے بعض بہت اچھی ہین - آپکی خصوصیت ہے کہ معمولی معمولی مضامین اور خیالات
کو نہایت دلکش اور موثر طریقے سے ادا کرتے ہین اور الفاظ نئے نئے اور عجیب وضع کرتے ہین - آپکی عبارت
نہایت سادہ سلیس اور دلکش ہوتی ہے مگر خیالات مین گہرائی نہین ہوتی - آپنے تقریباً دس کتابین
غدر کے بارہ مین شایع کی ہین جنمین سے بعض ترجمہ ہین اور بعض مین معزول شاہ دہلی کی اولاد کی پریشان
گردیون کے افسوسناک اور عبرتناک حالات ہین - آپکی کتاب کرشن بیتی کو اہل اسلام اور خصوصاً ارباب
تصوف بہت پسند کرتے ہین - بعض دیگر تصانیف حسب ذیل ہین - میلاد نامہ - محرم نامہ - یزید نامہ - بیوی
کی تعلیم - اولاد کی شادی - جگ بیتی - کہانیان وغیرہ -

پریم چند میدان قصہ گوئی کے مشہور شہسوار ہین - اصلی نام دہنپت رائے ہے - پریم چند کے
لقب سے مشہور ہین - ۱۹۳۷ء سمبت سن ولادت ہے - آپکے والد منشی عجائب لال بنارس کے قریب
موضع پانڈے پور کے رہنے والے تھے - فارسی کی تعلیم تقریباً سات آٹھ برس حاصل کر کے انگریزی
شروع کی اور بنارس کالجیٹ اسکول مین داخل ہوئے جہانسے انٹرنس کا امتحان پاس کیا - سولہ برس
کی عمر مین ان کا اور پندرہ برس کی عمر مین باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا - شروع مین آپ نے صیغہ تعلیم
مین ملازمت کرلی تھی مگر درس و تدریس کا سلسلہ اسکے بعد بھی جاری رہا - آپ کی ادبی زندگی ۱۹۰۱ء
سے شروع ہوتی ہے جب سے کہ آپنے زمانہ مین مضامین لکھنا شروع کیے - ۱۹۰۲ء مین ایک ہندی
ناول "پریما" لکھا جو انڈین پریس الہ آباد سے شایع ہوا - ۱۹۰۴ء مین "جلوہ ایثار" اور ۱۹۰۵ء مین "بازار حسن"
ہر دو قصہ تصنیف کیے - مثل اردو کے آپکو ہندی مین بھی کمال حاصل ہے چنانچہ سیوا سدن، پریم آشرم
رنگ بھوم اور کایا کلپ آپ کے مشہور ناول ہین جنکے اردو ترجمے[1] بھی سنا گیا ہے کہ عنقریب شایع ہونگے

[1] سیوا سدن کا ترجمہ بازار حسن کے نام سے شایع ہو گیا ہے - رنگ بھوم کے ترجمہ کا پہلا حصہ چوگان ہستی کے نام سے شایع ہوا ہے دوسرا حصہ بھی عنقریب شایع ہو گا -

رنگ بھوم علی الخصوص ایک نہایت دلکش ناول ہے - آپکا تاریخی ڈراما کربلا رسالہ زمانہ مین بہ اقساط نکلتا رہا منشی صاحب موصوف چھوٹے چھوٹے قصے لکھنے مین ید طولیٰ رکھتے ہین - اور حق یہ ہے کہ آپکے اس قسم کے فسانے اس زمانہ کے کثیر التعداد نام نہاد ناولون کے ساتھ وہی نسبت رکھتے ہین جو سچے نگینون کو جھوٹے پتھرون کے ساتھ ہوتی ہے - آپکو دیگر ناول نگارون پر یہ فوقیت حاصل ہے کہ آپنے ہندوستانی دیہات کے ہو بہو نقشے اور یہان کے کسانونکے سچے سچے واقعات نہایت عمدہ طریق سے اپنے ناولون مین بیان کئے ہین - آپ کبھی مبالغے کو اپنی تصانیف مین پاس نہین آنے دیتے اور نہ کبھی حق اور سچائی سے انحراف کرتے ہین آپکی عبارت مین بےجا آمد اور زور معلوم ہوتا ہے لطیف استعارات اور تشبیہون سے عبارت کی خوبی اور بڑھ جاتی ہے - جیسا کہ اوپر لکھا گیا آپکو اردو و ہندی دونون زبانون پر عبور حاصل ہے اور ساتھ ہی اسکے جذبات و نفسیات انسانی کے بھی پورے ماہر ہین آپکے کلام مین کہین ظرافت اور کہین درد وہی رنگ دکھاتا ہے جیسے کہ دھوپ اور چھاؤن - آپکے کیرکیٹر نہایت مخصوص جیتی جاگتی تصویرین ہوتی ہین - آپ کا ناول بازار حسن جو دو جلدون مین ہے ایک طویل کتاب ہے مگر دلچسپی مین کم نہین ہے - اگر آپکے اس قسم کے ادبی اشغال جاری رہے تو کچھ عرصہ مین آپ بڑی ترقی حاصل کرینگے - تھوڑے عرصہ سے بوجہ اردو کی ناقدری کے آپ ہندی کی طرف زیادہ توجہ فرما رہے ہین - آپ کے خیالات سوشل اور پولٹیکل معاملات مین بہت اعلےٰ و ارفع ہین - آپ کے مضامین ہندو مسلم اتحاد اور دور جدید جو زمانہ مین نکلے تھے خاص طور پر پڑھنے کے قابل ہین - آپکی تصانیف علاوہ کتب مذکورۂ بالا کے پریم پچیسی حصہ اول و دوم اور پریم بتیسی حصہ اول و دوم چھوٹے چھوٹے قصون کا مجموعہ ہین - خواب و خیال ابھی حال مین پنجاب سے شایع ہوا اور فردوس خیال انڈین پریس شایع کر رہا ہے -

سدرشن | آپ بھی ایک مشہور افسانہ نگار ہین اور پنجاب سے تعلق رکھتے ہین منشی پریم چند کی بعض خصوصیات آپ مین بھی موجود ہین مگر اُنسے کم درجہ پر - آپ مین وہ استادی اور فنی کمال نہین ہے اور نہ عبارت مین اسقدر ادبیت اور صحت ہے - آپکی تصانیف حسب ذیل ہین - (۱) محبت کا انتقام

ایک انعامی رسالہ جسپر پنجاب گورنمنٹ نے پانچسو روپیہ انعام دیا۔ پہلے ہندی مین لکھا تھا اُسکے بعد اُس کا ترجمہ اُردو مین ہوا (۲) چندن اسپر خواجہ حسن نظامی نے دیباچہ لکھا ہے۔ پندرہ چھوٹے چھوٹے قصون کا مجموعہ ہے (۳) بہارستان اسپر منشی پریم چند نے دیباچہ لکھا ہے۔ یہ بھی چھوٹے چھوٹے قصون کا مجموعہ ہے (۴) و (۵) تہذیب کے تازیانے اور زہریلا آب حیات بنکم چندر چٹرجی کے بعض مضامین اور ناول کے ترجمے ہین۔ (۶) عورت کی محبت ایک بنگالی مصنف کی کتاب کا ترجمہ ہے (۷) بیگناہ مجرم بنگالی اور فرنچ کتابون سے لیا گیا ہے (۸) سدا بہار پھول مختصر قصون کا مجموعہ ہے۔

دیگر ناول نویس | فی زمانہ نا ناول نگارون اور چھوٹے چھوٹے قصے لکھنے والونکی اتنی کثرت ہوگئی ہے کہ اُن سب کے نام بتانا بھی ایک امر محال معلوم ہوتا ہے۔ بہر طور اصحاب ذیل ان سب کو بین زیادہ مشہور و ممتاز ہین۔ (۱) حامد اللہ افسر میرٹھی۔ جو علاوہ ایک عمدہ شاعر اور نقاد ہونے کے افسانے لکھنے مین بھی بڑی مہارت رکھتے ہین۔ انکی اکثر کتابین سررشتہ تعلیم مین بھی داخل ہین۔ ایک مجموعہ قصص جسمین ڈالی کا جوگ اور دیگر قصص شامل ہین تیار ہو رہا ہے۔ (۲) مجنون گورکھپوری (۳) احمد حسین خان ایڈیٹر شباب اُردو (۴) سید عابد علی (۵) حکیم شجاع الدین (۶) مولوی ظفر عمر صاحب سپرنٹنڈنٹ پولیس ممالک متحدہ۔ جاسوسی کے قصے لکھنے مین خاص مہارت رکھتے ہین۔ آپ کے ناول نیلی چھتری بہرام کی گرفتاری بہت مشہور و مقبول ہین۔ ان کے علاوہ بعض قابل خواتین نے بھی اس فن کی طرف توجہ کی ہے اور صوبہ پنجاب سے بعض بہت دلچسپ قصے عورتون کے لکھے ہوئے شایع ہوئے ہین۔

اُردو ڈراما

اُردو ڈراما | اُردو ڈراما ایک غیر ملکی پودا ہے جو سرزمین اُردو پر انیسوین صدی کے وسط مین منتقل کیا

گیا اور اب خوب جڑ پکڑ گیا اور نہایت تندرست اور تنومند معلوم ہوتا ہے -

ڈراما کی عمومیت

محاکات یعنی نقالی کا شوق ہر قوم مین فطری ہے عام اس سے کہ وہ قوم ترقی کی معراج پر ہو یا بربریت اور گمراہی کے گڑھے مین پڑی ہو - نقالی انسانی فطرت مین داخل ہے - البتہ بعض ممالک مین یہ فطری جوشس دبا دیا گیا اور بدعت کہلایا - اہل اسلام اسی چیز یعنی نقالی کو جس مین ڈراما بت تراشی تصویر کشی رقص اور موسیقی سب داخل ہین ممنوع سمجھتے ہین - پس اُنکے ممالک مین فنون لطیفہ کی نشو و نما اور ترقی کو گویا بدعت یا انحراف سنت کی تاریخ سمجھنا چاہیے - اسی وجہ سے فارسی سے اس قسم کے کوئی نمونے اردو کو نہین ملے مگر خود فارسی اس نقالی کے جذبے سے محفوظ نہ رہ سکی وہان ڈراما نے پیش پلے (مرثیہ) کی صورت اختیار کر لی جسمین میدان کربلا مین حضرت امام حسین کی شہادت پر اظہار رنج و غم کیا جانے لگا - مذہب جو زمانہ قدیم مین عنصر غالب تھا اب ڈراما اور دیگر اصناف ادب کو ذریعہ تبلیغ قرار دینے لگا - اہل یورپ اور اہل انگلستان کے مریکل پلے (ایسے سین جسمین معجزات دکھائے جاتے ہین) اور مسٹری پلے (ایسے سین جسمین اسرار دکھاے جاتے ہین) جو قدیم کلیسائے مسیحی کے رسوم اور طریقہ عبادت کے مظہر ہین اسیطرح سنسکرت اور ہندی کے مذہبی ڈراما جو پرانون اور دیگر مذہبی کتب ہنود سے اخذ کیے گئے ہین اور اوبرامرگو[1] کے پیشن پلے ان سب کا ماخذ وہی قدیم مذہبی اعتقادات ہین - ہندوستان مین ابتک مذہب کا بہت بڑا اثر ڈراما پر ہے - پران اور دیگر مذہبی کتب کے قصے ڈراما کی صورت مین آکر اپنے خوبصورت پردون اپنی دلچسپ موسیقی اور اخلاقی نتائج سے اب بھی ہزارون آدمیون کے دلکشی اور تفریح کا باعث ہوتے ہین -

سنسکرت اور ہندی ڈراما نے اردو پر کیون نہین اثر کیا

ہندوستان مین ڈراما درجہ کمال تک پہونچ گیا تھا پس قدیم سنسکرت ڈراما کو جو اپنے عروج تک پہونچگیا تھا اردو ڈراما پر کچھ نہ کچھ ضرور اثر

---

[1] اوبرامرگو جرمنی مین ایک مقام ہے جہان مقررہ اوقات پر حضرت مسیح کے حالات زندگی ناٹک کی صورت مین اسیطرح دکھائے جاتے تھے جسطرح ہمارے یہان رام لیلا ہوتی ہے - ہزارون آدمی اس مذہبی تماشے کے دیکھنے کو دور دور سے آتے تھے - معلوم نہین کہ اس تہذیب و تمدن کے زمانہ مین بھی اس قسم کا اجتماع ہوتا ہے یا نہین -

کرنا چاہئے تھا۔ مگر نہایت افسوس ہے کہ جسطرح اُردو فن نظم سنسکرت کے اثر سے محفوظ رہا اسیطرح
فن ڈراما پر بھی اُسکا کوئی اثر نہ پڑا۔ سنسکرت کے ان دونون خزانون سے اُردو سنے کوئی فائدہ نہ اٹھایا
جنکی وہ حقیقی وارث تھی۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ سنسکرت ڈراما کا زرین دور گزر چکا تھا اور اب وہ ایک
تن بیجان اور محض کتابون مین محفوظ تھا۔ اسکے شاہکار ہندوستان کی دیسی زبانون مین منقود تھے
اسکا کھیل (ایکٹنگ) ابھی موقوف ہو چکا تھا۔ شروع مین بودھ مت اور جینی ڈراما کو ناپسند کرتے تھے
مگر اسکا یہ فائدہ دیکھکر کہ وہ انکے دینی مسایل کے پھیلانے کا ایک اچھا ذریعہ ہے وہ بھی اسکی قدر
کرنے لگے۔ اور بودھ مت کا ڈراما تو راجہ ہرش اور اشوک کے زمانہ مین بڑی ترقی کر گیا تھا جب بودھ
مت کو زوال اور برہمنون کی ترقی ہوئی تو ڈراما اپنا پرانا عروج حاصل نہ کر سکا اسوجہ سے کہ غیر اقوام
کے حملون اور قوم کی مفلسی سے ملک مین ایک بے اطمینانی کی حالت پھیل گئی تھی۔ اب ڈراما کی طرف
لوگون کی توجہ کم ہو گئی اور وہ اسکی پرانی شان و شوکت جاتی رہی۔ اور جب ادنے درجہ کے لوگون نے
ناٹک کی کمپنیان کھول لین تو ڈراما کی رہی سہی عزت جاتی رہی۔ ایکٹر لوگ قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھے
جاتے تھے اور مضمون بھی ادنی درجہ کے بعض وقت فحش کی حد تک پہونچ جاتے تھے۔ اس زمانے
مین اُردو اپنا چہرہ لے رہی تھی سنسکرت ڈراما محض ایک کتابی چیز رہ گیا تھا اور ہندی ڈراما ادنے درجہ
کا اور ذلیل ہو گیا تھا۔ اسکے علاوہ اردو زبان ابتدا ہی سے فارسی کے آغوش محبت مین آگئی تھی اُسکی
سوتیلی مان نے سگی مان کو کونے مین بٹھا دیا تھا۔ فارسی روایات فارسی محاورے فارسی تخیل اردو پر غالب
تھے فارسی ادیب اس نوزائیدہ بچہ کو پیار کرتے تھے اور وہ فارسی تہذیب تمدن کے سرچشمہ سے سیراب
ہوتا تھا۔ سنسکرت ادیبوں کی غفلت اور بے توجہی کے سبب سے طفل زبان مسلمانون ہی کی گود مین
پلنے لگا فارسی زباندان سنسکرت سے ناواقف تھے اسوجہ سے سنسکرت ڈراما اور فن نظم دونون
بے اثر رہے۔ اگر یہ لوگ بھاشا اور سنسکرت کی قدر کرتے یا اگر پنڈت لوگ اردو کی پرورش زیادہ
محبت سے کرتے تو آج یہ حالت نہ ہوتی۔ اور اُردو زبان اپنے اکثر نکتہ چینون کو دندان شکن جواب دیتی

[illegible]

مسٹر عبد اللہ یوسف علی آئی۔ سی۔ ایس۔ نے ایک فاضلانہ مضمون مین۔

منشی پریم چند

اُسکے رنگا عناصر ترکیبی حسب ذیل قایم کیے ہین۔(۱) قدیم سنسکرت ڈراما (۲) اہل ہنود کے خالص مذہبی ناٹک یا مرکل پلے اور دیوتاؤن اور دیویون کے حالات (۳) وہ چیزین جو ادنیٰ درجہ کے لوگون مین جاری ہین۔ مثلاً سوانگ نوٹنکی نقلین وغیرہ (۴) اسلامی نظمین اور قدیم روایات۔(۵) زمانہ موجودہ کا انگریزی ڈراما اور یورپ مین اسٹیج کی ترقیان۔

سنسکرت ڈراما — ہرچند کہ قدیم سنسکرت ڈراما کا اُردو ڈراما پر بہت کم اثر پڑا مگر پھر بھی بعض مشہور ناٹکون کا ترجمہ اردو مین ہوگیا ہے اور وہ کھیلنے کے قابل کردیے گئے ہین۔ تھوڑے عرصہ سے ڈراما کے پرانے قواعد بھی استعمال مین آرہے ہین خاصکر وہ جو ابتدائی سین کے متعلق ہین مثلاً ناٹک شروع ہونیسے پہلے ایک شخص جو سوتردھار کہلاتا ہے مع اپنی بیوی کے اسٹیج پر آتا ہے اور تماشہ کے تمام واقعات کو مختصر طور پر بتلا دیتا ہے اور لوگون کو آگاہ کردیتا ہے کہ اب اصلی کھیل شروع ہونیوالا ہے۔ بدوشک یعنی مسخرہ کا پاٹ بھی ضرور ہوتا ہے مگر اچھے تماشون مین یہ بالکل علیحدہ رہتا ہے اور تماشہ کے اصل واقعات سے اسکو تعلق نہین ہوتا۔

ہندو مرکل پلے وغیرہ — اس قسم کے ناٹکون نے بھی موجودہ اُردو ڈراما کے واسطے بہت کچھ مواد فراہم کردیا ہے۔ انکی نسبت اُردو ڈراما کے ساتھ وہی ہے جو ہالنشڈ[ؔ۱] اور ہال[۱] کے پرانے قصون اور مورخ پلوٹارک[ؔ۲] کی قدیم یونانی مشہور لوگون کی سوانح عمریون کی شیکسپیر کے ناٹکون کے ساتھ ہے اگر غور سے دیکھا جائے تو اُردو ڈراما کی ابتدا ہی اس قسم کی ہندی چیزون سے ہوئی تھی۔ قدیم زمانہ سے ہندو لوگ رام اور کرشن کے مشہور واقعات زندگی کو تیوہارون کے موقع پر مندرون مین ناٹک کی صورت مین لوگون کو دکھایا کرتے تھے تاکہ وہ اپنے مذہبی روایات سے واقف ہون اُن سے

ؔ۱ یہ دونون انگلستان کے قدیم مورخ سولہوین صدی عیسوی مین گذرے ہین انکے تاریخی قصون سے جنکو کرانیکل کہتے ہین شیکسپیر نے اپنے تاریخی ڈرامون مین بہت مدد لی ہے۔ ؔ۲ مشہور یونانی مورخ جو ظالم شہنشاہ نیرو کا معاصر تھا۔ تقریباً ۵۰ئ؁ مین پیدا ہوا۔ اسکی کتاب "لائوز" سوانح عمریان زمانہ قدیم کی اک مشہور اور مستند تاریخ سمجھی جاتی ہے جس مین چھیالیس بڑے بڑے یونانی اور رومی مشاہیر کے حالات بالمقابلہ نہایت وضاحت سے لکھے گئے ہین اسکی دوسری کتاب موریلیا کئی رسالون کا مجموعہ ہے ۱۲۔

جی اچھی باتین سیکھین اور اپنے دیوتاؤن اور سورماؤن کے واقعات زندگی سے مفید
رامائن کے واقعات دسہرہ کے زمانہ مین جبکہ رامچندرجی اپنے حریف راون پر فتح پاکر بھارت ورس
مین واپس آئے تھے اسی قسم کی ہین اور آجکل ایسے ناٹک رام ناٹک اور رامائن کے نام سے مشہور ہین اور
مذہبی لوگون اور علی الخصوص عورتون کو بہت پسند آتے ہین - اسی طرح کرشن جی کے عاشقانہ گیت
بھی اردو ڈراما کا جز ہین سچ پوچھیے تو جس قدر عاشقانہ اور جذباتی شاعری ہندی اور بنگالی مین بالفعل
ہے اسکا زیادہ تر حصہ کرشن اور رادہا کے عشق پر مبنی ہے - بہت سی دیسی کمپنیان جو منڈلی کہلاتی ہین
متھرا اور بندرابن وغیرہ متبرک مقامون سے چلکر راستہ مین اپنے مذہبی گانون اور تماشون سے لوگون کے
دلون کو محظوظ کرتی ہین - ناچ اور گانا ان تماشون کی جان ہے - اس قسم کی کمپنیان دولتمند اور تعلیم یافتہ
لوگون کے لیے نہین بلکہ عوام الناس کی دلچسپی کے لئے ہین - یہ لوگ جگہ جگہ کی سیر کرتے پھرتے ہین جہان
پہونچتے ہی فوراً ایک اسٹیج تیار کر لیتے اور کپڑے ادہر ادہر سے مانگ جانچ کر مہیا کر لیتے ہین اپنے چہرہ رنگو
رنگتے اور چراغون یا مشعلون کی روشنی مین اپنے تماشے دکھاتے ہین اور آخر مین دو دو چار چار پیسے لوگون
سے وصول کرتے ہین - ملا غنیمت کشمیری نے اپنی مشہور مثنوی "نیرنگ عشق" مین ان جماعتون کا جگ
دھگت بازگتے مین خوب خاکہ اڑایا ہے - غالباً انہین جماعتون سے واجد علیشاہ نے جو اپنے
عیش پرستیون کے لیے مشہور تھے ناٹک کا پہلا سبق سیکھا ہوگا - اور وہ انکو بہت پسند آیا ہوگا
پھر انھون نے ناٹک اور رہس خود قائم کر لیے جسمین وہ خود کنھیا اور اُن کے محل کی عورتین نہایت
قیمتی اور زرق برق لباس مین گوپیان بنا کرتی تھین - ہمارے نزدیک یہ ناچ اور گانا جو اردو
ڈراما کا جزو لاینفک ہے انہین رہس منڈلیون سے لیا گیا ہے اور ممکن ہے کہ فرنچ اوپرا کا بھی اس پر
کچھ اثر ہو کیونکہ واجد علیشاہ کے عہد مین انکے یورپین دوستون کی وجہ سے یہ مذاق مروج ہو گیا تھا

سوانگ نقلین وغیرہ

سوانگ کی ہندوستان مین وہی حیثیت ہے جو "پیجنٹ" کی انگریزی ڈراما
کی ترقی سے پیشتر انگلستان مین تھی - سوانگ ہندو تہوارون کے موقعہ پر جلوس اور باجون کے ساتھ نکلتے
ہین - انکو ابتدائی بھدی نقالی سمجھنا چاہیے مگر عنصر ظرافت (کامک) انمین ضرور پایا جاتا ہے -

پُرانے زمانہ کے نقال یا مسخرے امیر لوگون کی صحبت یا ملازمت مین رہتے تھے اور اپنی ظریفانہ باتون اور نقلون سے اپنے مالکون کا دل خوش کیا کرتے تھے۔ نقالی اس زمانہ مین ایک مشکل فن تھا جو خاص تربیت اور محنت سے آتا تھا اور اسکی تکمیل کے واسطے گانا ناچنا بھی ضروری سمجھا جاتا تھا۔ نقالون کی وہی حیثیت تھی جو انگلستان مین ملکہ ایلزبتھ کے زمانہ مین اُمرائے دربار کے مصاحبین اور ملازمون کی تھی جو جماعتون مین نکلا کرتے تھے اور اپنے گانے بجانے اور مسخرے پن سے لوگون کو خوش کرتے تھے۔ لوگون کا خیال ہے کہ یہی پھرنے والی نقال کمپنیان عہد الیزبتھ کے ترقی یافتہ ڈراما کی اصلی پیشرو تھین۔ ہندوستان مین نقالون کی جماعتین طایفہ کے نام سے مشہور ہین جو شادی بیاہ کے موقعون پر بہ اجرت بلائے جاتے ہین اور اپنے ناچ گانے اور مذاق کی باتون سے سامعین کو محظوظ کرتے ہین۔ انھین پرانے زمانے کی نقلونسے آجکل کے تماشون کے کامک اور نقلین ماخوذ ہین۔

اسلامی نظمین اور روایات — یہ اُردو ڈراما کا عنصر غالب ہین نظارکرد عاشقانہ رنگ اور ڈراما نگاری کے لئے ایک خاص استعداد اور موزونیت رکھتی ہے۔ قدیم ڈراما نہایت مؤثر پُردرد اور نچلے سُر کی عاشقانہ نظمون مین ہوتے تھے۔ اُنکی نثر مقفےٰ اور شعر دونون مؤثر ہین۔ زبان اُردو بڑی زوردار چیز ہے اُسکا طرز ادا اُسکے صنایع بدایع نہایت دلکش اور قابل تعریف ہین۔ وہ رزم و بزم دونون موقعون کے لئے موزون اور جذبات نگاری کے لئے بھی پوری طرح مناسب ہے۔

انگریزی اسٹیج — اس کا اثر زمانۂ حال کے اُردو ڈراما پر سب سے زیادہ ہے۔ اُردو اسٹیج آجکل انگریزی ناٹکون کے ترجمون سے بھری ہوئی ہے۔ اسٹیج کی وضع تھیٹر کی ساخت پردے لباس نشستونکا طریقہ، تماشہ کے تقسیم سین پارٹون کا انتظام یہ سب بالکل انگریزی اصول کے مطابق اور اُسی کے زیر اثر ہین۔

اُردو ڈراما کے اقسام — اُردو ڈراما مستقل تصانیف اور تراجم پر مشتمل ہے۔ اول لذکر کی تعداد نسبتہً کم ہے اور جو ہین وہ کسی پولٹیکل یا سوشیل مبحث پر مبنی ہین۔ تراجم کے ماخذ حسب ذیل ہین۔

(۱) سنسکرت (۲) انگریزی یا اور کوئی یورپی زبان بذریعہ ترجمہ انگریزی (۳) فارسی قصے

(۴) دیسی زبانین علے الخصوص بنگلہ، مرہٹی اور زیادہ تر ہندی۔

قصون کے مضامین حسب ذیل چیزون سے ماخوذ ہین۔

(۱) پوران اور ہندو دیومالا (۲) فارسی اور عربی قصے (۳) ہندوستان کے مشہور قدیمی روایتین اور قصے (۴) انگریزی قصے (۵) مسائل حاضرہ یعنی کوئی پولیٹکل مسئلہ یا سوشیل خرابیان۔

اردو ڈراما پر شاہی درباروں کا اثر

سب سے پہلا اردو ڈراما اندر سبھا ہے جسکو امانت شاگرد ناسخ نے تصنیف کیا تھا جو عہد واجد علی شاہ مین دربار شاہی سے تعلق رکھتے تھے اور مشہور ہے کہ یہ کتاب بادشاہی کے حکم سے تیار کی گئی تھی[۱]۔ ایک ہندی شاعر نواز نامی نے فرخ سیر بادشاہ دہلی کے عہد مین مشہور و معروف شکنتلا ناٹک کا زبان برج بھاشہ مین ترجمہ کیا تھا مگر خود اس ترجمہ کو ڈراما سمجھنا غلطی ہے اسوجہ سے کہ نہ تو یہ ترجمہ ایک صحیح ترجمہ ہے کیونکہ وہ دوہونکی صورت مین ہے اور نہ اسمین ڈراما کی شان باقی رہی کیونکہ اشخاص قصہ جسطرح کہ ڈراما مین دستور ہے آتے جاتے نہین اور نہ اس مین کیرکٹر اور ایکشن کا کہین پتہ ہے اس وجہ سے نہ تو وہ ڈراما ہے اور نہ اُس کا تعلق اردو سے ہو سکتا ہے۔ جیسا اوپر مذکور ہوا زمانہ شاہی مین نقالون اور بہروپیون کا بڑا رواج تھا انکی نقلون سے لوگ خوش ہو کر ان کو انعام و اکرام سے مالامال کرتے تھے۔ مشہور ہے کہ محمد شاہ بادشاہ دہلی جو اپنے ناچ رنگ اور عشرت پرستیون کیوجہ سے محمد شاہ رنگیلے کے نام سے مشہور ہین اپنے اسی قسم کے اشغال مین مصروف تھے کہ نادر شاہ کا حملہ دلی پر ہوا۔ صحبت شاہی مین مخل ہونیکے ڈر سے کوئی شخص اس بری خبر کو اپنے منھ سے نہین نکال سکتا تھا مجبوراً ایک نقال کے ذریعہ سے یہ خبر بادشاہ کو پہونچائی گئی۔ نقلون کی کوئی کتاب مرتب نہین ہوتی تھی بلکہ وہ حسب موقع فی البدیہہ یا فرمایش سے فوراً تیار کرلی جاتی تھین۔ لکھنؤ جو بادشاہان اودھ کا دارالسلطنت تھا عیش و عشرت کا مرکز بنا ہوا تھا اور علی الخصوص واجد علیشاہ کا زمانہ تو دولت ثروت شوکت و عشرت کا بہترین دور تھا۔ اس زمانہ کی ان الفاظ مین کیا اچھی تصویر کھینچی گئی ہے "وہان دولت خوشحالی فارغ البالی ناچ رنگ گانے

[۱] دیکھو نوٹ صفحہ ۵۰۔

بجانے کے ہر طرف چلسے تھے عاشق مزاج خوش رو جوانون اور حسین مہ جبین نازنینون کے جمگھٹے تھے۔ زندگی اس مزہ سے گذرتی تھی جس طرح پھولون کے تختہ پر باد بہاری چلتی ہے۔ ہر طرف سریلی آوازون سے کان لطف اندوز ہوتے تھے۔ وہ خیالی پرستان جسکو کوہ قاف کہتے ہین اس سچ مچ کے پرستان کے آگے جہان ہزار دن لاکھون آدمی اپنی زندگی نہایت بیفکری اور عیش و عشرت مین گذارتے تھے مات تھا۔ شاہزادے اور رؤسا و امرا جو شادمانی اور کامرانی کے مجسم تصویرین تھے اُنکو دیکھکر دنیا کی جاہ و جلال اور مال و منال کا صحیح نقشہ آنکھون کے سامنے پھر جاتا تھا۔ اسی دربار مین اردو ڈراما نے جنم لیا۔ بادشاہ اور اُنکے وزرا اور مصاحبین اپنی مسرت اندوزیون کے نت نئے طریقے سوچا کرتے تھے چنانچہ ایک فرانسیسی نے جو دربار شاہی سے متوسل تھا اوپرا کی تجویز پیش کی جس کا اس زمانہ مین یورپ مین عروج ہو رہا تھا جو فوراً منظور کر لی گئی اس وجہ سے کہ اسمین صدہا حسین و مہ جبین گائیون کے لئے جن سے دربار بھرا ہوا تھا ایک اچھا مشغلہ نکل آیا اور امانت کو اسی قسم کا ایک تماشہ لکھنے کا حکم ہوا۔

اندرسبھا امانت امانت نے سنہ ۱۲۷۰ھ (مطابق سنہ ۱۸۵۳ء) مین اپنی کتاب اندرسبھا تیار کی جو کامیڈی ہے اور چونکہ اسمین گانا اور ناچ بھی شامل ہے لہذا موسیقی دار کامیڈی ہے جو اوپرا کی ایک قسم ہے۔ جونہی یہ کتاب تیار ہوئی۔ اسکے واسطے لکھنؤ کے مشہور محل قیصر باغ مین ایک اسٹیج آراستہ کیا گیا۔ مشہور ہے کہ بادشاہ خود تماشہ مین شریک ہوتے اور راجہ اندر بنتے تھے اور پریون کا پارٹ خوبصورت حسین عورتین کرتی تھین جو پُر تکلف اور قیمتی لباس اور جواہرات سے آراستہ ہوتی تھین۔ ان تماشون مین کسی غیر آدمی کے جانیکی اجازت نہ تھی۔ یہ مسئلہ کہ آیا اُردو ڈراما کی ترقی مین یورپین لوگون نے کوئی حصہ لیا یا نہین ہنوز مابہ النزاع ہے مولوی عبد الحلیم شرر مرحوم اسکو نہین مانتے تھے اُن کا خیال تھا کہ کسی یورپین نے اُردو ڈراما کی ترقی مین کوئی حصہ نہین لیا۔ یہ معاملہ تاریکی مین چھپا ہوا ہے اور اُس زمانہ کی کوئی معتبر تاریخ ایسی نہین ملتی جس سے اُسپر کافی روشنی پڑ سکے مگر اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ یورپین لوگون نے اردو ڈراما کو زمانۂ حال کے مطابق بنانے اور اسٹیج کے ساز و سامان اور تیاری

مین کچھ نہ کچھ حصہ ضرور لیا ہوگا۔ نور الٰہی اور محمد عمر صاحبان نے اپنی کتاب ناٹک ساگر مین بہت سے دلایل مولانا شرر مرحوم کے جواب مین پیش کیے ہین مثلاً واجد علیشاہ کے دربار مین یورپین لوگون کی موجودگی خود واجد علیشاہ کو نئی چیزون کا شوق اندر سبھا کی اندرونی شہادت وغیرہ وغیرہ اور اس کے علاوہ خورشید جی بالی والا جو اس زمانہ مین ایک مشہور ایکٹر تھے اونکا قول بھی اسکی تائید مین نقل کیا ہے۔ مگر حق یہ ہے کہ بالیقین یہ نہین کہا جا سکتا کہ واجد علیشاہ تماشہ مین کچھ حصہ لیتے تھے یا کہ اندر سبھا کا تماشا قیصر باغ مین ہوا تھا یا امانت نے یہ کتاب بادشاہ کے حکم سے لکھی تھی یا نہین[1]۔

اندر سبھا کا پلاٹ بہت معمولی ہے۔ کتاب راجہ اندر کی سبھا یعنی دربار کے سین سے شروع ہوتی ہے۔ اور قصہ اسقدر مشہور ہے کہ اوسکے یہان لکھنے کی ضرورت نہین۔ وہ شائع ہوتے ہی بہت مقبول ہوئی اور اوسکی مقبولیت کا سبب ظاہر ہے یعنی یہ کہ ابتدائے دھنین اوسکی شعرون اور گیتون کی بڑے بڑے استادون نے قایم کی تھین اور اسکا سامان ظاہری یعنی پردے لباس وغیرہ نہایت پر تکلف تھا

[1] مکرمی سید مسعود حسن صاحب رضوی ایم۔ اے اردو لکچرار لکھنؤ یونیورسٹی نے اپنے ایک فاضلانہ مضمون مین جو رسالہ "اردو" مین چھپ چکا ہے یہ ثابت کیا ہے کہ اندر سبھا نہ تو واجد علی شاہ کے حکم سے لکھی گئی نہ اس کا کھیل کبھی قیصر باغ مین ہوا اور نہ بادشاہ کبھی اس مین شریک ہوئے۔ وہ لکھتے ہین کہ امانت نے اس کتاب کی شرح مین (جو انکے پاس موجود ہے) یہ لکھا ہے کہ یہ کتاب انکے (امانت کے) ایک شاگرد کے کہنے سے لکھی گئی اور اس کے کھیلنے کا طریقہ نہایت دلچسپ اور مفصل طریقہ سے بیان کیا ہے۔ بادشاہ کا راجہ اندر بننا بالکل بے اصل ہے اس وجہ سے کہ بادشاہ کو رہس کا بڑا شوق تھا چنانچہ انکی تصانیف مین اس طرح کی چیزین بکثرت پائی جاتی ہین جن مین وہ مختلف پارٹ مختلف لوگون کو تقسیم کر دیتے تھے جنکے نام بھی بتا دیے گئے ہین مگر یہ بات خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ رہسون مین کنہیا کا پارٹ بجائے مرد کے ہمیشہ وہ کسی عورت کو دیتے تھے اور خود کبھی نہین بنتے تھے۔ جب رہس مین کنہیا کا پارٹ خود انہون نے کبھی نہین لیا تو یہ بعید از عقل ہے کہ وہ راجہ اندر بنتے ہون۔

اندر سبھا پر یورپین اثر کے متعلق مولانا شرر مرحوم اور سید مسعود حسن صاحب دونون کی قطعی رائے ہے کہ فرانسیسیون نے اسمین کچھ نہین کیا۔ اگر لفظ پردہ سے اسکا ثبوت دیا جائے تو تصویردار پردے جو سین کہلاتے ہین اور تھیٹرون مین مروج ہین اور جو بے شک یورپ کی نقل ہین وہ رہس یا اندر سبھا مین کبھی مستعمل نہ ہوتے تھے البتہ معمولی پردے چادرون کی وضع کے ڈال دیے جاتے تھے تاکہ تماشائیون اور تماشاگرون مین ایک قسم کا پردہ ہو جائے تو یہ بہت قدیم رسم ہے اسکو یورپین اثر سے کچھ تعلق نہین ۔ ۔ مترجم

اُسکی کامیابی دیکھکر مداری لال نے ایک دوسری اندر سبھا لکھی جو ادبی حیثیت سے تو امانت کی اندر سبھا کی برابر نہین ہے گو ڈراما کی حیثیت سے اُسکے برابر یا اس سے بڑھکر ہو۔ بعد کے زمانہ مین جب تھیٹریکل کمپنیون کا رواج ہوا تب بھی اندر سبھا کی مقبولیت مین کسی قسم کا فرق نہین آیا اور اسکو لوگ اور تماشون سے ہمیشہ بہتر سمجھتے تھے۔ اُس کی مقبولیت اس سے ظاہر ہے کہ وہ دیوناگری۔ گجراتی۔ گورمکھی اور اور مختلف زبانون مین ترجمہ کی گئی اور اُسکے کم سے کم چالیس ایڈیشن انڈیا آفس کے کتبخانہ مین موجود ہین اُس کا ترجمہ جرمن مین بھی ہوا جو بمقام لیپزگ سنہ ۱۸۹۲ء مین شایع ہوا۔ اب سنا جاتا ہے کہ ایک نہایت عمدہ اور تنقیدی اڈیشن اندر سبھا کا لاہور سے نکلنے والا ہے۔

اُردو ڈراما اور پارسی

ابتدا مین ہندو دیومالا کے قصے بطور تماشے کے دکھلائے جاتے تھے اُنکو دیکھکر چند پارسی نوجوانونکے دلمین خیال آیا کہ کچھ قدیم ایرانی قصے جسمین رستم و سہراب وغیرہ کا ذکر ہو عجلت کیساتھ تیار کیے جائین اور چھوٹ موٹ کے اسٹیج پر لوگونکو دکھائے جائین۔ اِن تماشون کو ایسے لوگون نے بھی دیکھا جو یورپی تھیٹر دیکھ چکے تھے اور اُنکی نسبت اچھی رائے ظاہر کی۔ چند امیر پارسیون نے جو کاروباری قابلیت رکھتے تھے اس کام کی اہمیت کو سمجھکر چند کمپنیان بڑے بڑے شہرون مین مثلاً دہلی۔ کلکتہ اور بمبئی مین انگریزی تھیٹر کی نقل مین قایم کین۔ سب سے پہلی کمپنی سیٹھ پسٹن جی فرام جی کی تھی جنکو اردو اسٹیج کا ابوالآبا سمجھنا چاہیے۔ یہ اردو خوب جانتے تھے بلکہ شعر بھی کہتے تھے رنگ اور پروین تخلص کرتے تھے اور نواب علی نفیس سے اصلاح لیتے تھے۔

اوریجنل تھیٹریکل کمپنی رونق بنارسی

انکی کمپنی کا نام اوریجنل تھیٹریکل کمپنی تھا جسمین یہ خود بھی بہت عمدہ ایکٹ کرتے تھے اور خورشید جی بالی والا کاؤس جی کھٹاؤ سہراب جی اور جہانگیر جی مشہور ایکٹر تھے۔ تماشونکی زبان اُردو تھی مگر لکھنؤ اور دہلی کی خالص اور ٹکسالی اردو نہین بلکہ ایسی زبان جو عام لوگونکی سمجھ مین آسکے۔ کمپنی چونکہ تاجرانہ غرض سے قایم ہوئی تھی لہذا تماشونمین وہی زبان استعمال کیجاتی تھی جو بمبئی گجرات بنگال غرضکہ تمام صوبہ جات ہندوستان مین بخوبی سمجھ مین آسکے۔ تماشے اندر سبھا کی تقلید مین نظم مین ہوتے تھے نیز اسوجہ سے کہ کانون کو خوش آیند معلوم دین اس زمانہ کے ڈراما نگار رونق بنارسی اور میان حسینی متخلص بہ ظریف تھے۔ رونق

بمبئی مین رہتے تھے اور انگریزی تماشون سے بھی ترجمہ کرتے تھے۔ انکا ایک تماشا "انصاف محمود شاہ" زبان گجراتی مین ۱۸۸۲ء مین بمبئی سے چھپ کر شایع ہوا تھا۔ ظریف کے بہت سے تماشے ہین جنمین نتیجہ عصمت۔ خدا دوست۔ چاند بی بی۔ بلبل بیمار وغیرہ زیادہ مشہور ہین۔ جب فرام جی بالی کمپنی کا انتقال ہوگیا تو بالی والہ اور کاؤس جی نے اپنی اپنی کمپنیان علحدہ قایم کرلین۔

وکٹوریہ ناٹک کمپنی طالب بنارسی یہ کمپنی خورشید جی بالی والہ کی قایم کردہ تھی اور اسکا تھیٹر ۱۸۷۷ء کے مشہور دربار دہلی کے موقع پر موجود تھا۔ خورشید جی خود ایک بہت بڑے مشہور ایکٹر تھے اور اس فن مین ان کو کمال حاصل تھا۔ اور کامک پارٹ علی الخصوص خوب کرتے تھے۔ انکی ایکٹنگ مین کسی قسم کا بازاری پن یا تکلف اور آورد نہین معلوم ہوتی تھی اور نہ انکو شرم اور جھجک تھی جس سے شیکسپیر بھی مرعوب ہوجاتا تھا انکو اسٹیج پر دیکھتے ہی لوگ ہنستے ہنستے لوٹ جاتے تھے۔ انکی کمپنی مین اور مشہور ایکٹریہ تھے۔ رستم جی۔ مس خورشید۔ مس مہتاب۔ اور ایک یوروپین مس میری فنٹن جو ہندوستانی چیزین بھی خوب گاتی تھی۔ یہ کمپنی ایک زمانہ مین انگلستان بھی گئی تھی مگر اس کا وہان بہت بڑا نقصان ہوا جو آخر مین بمبئی مین پورا کرلیا گیا۔

طالب بنارسی منشی ونایک پرشاد طالب بنارسی اسکے ڈراما نگار تھے۔ طالب شعر بھی کہتے تھے اور راسخ دہلوی کے شاگرد تھے انھون نے فن ڈراما کو ترقی دی اور اسکی زبان اور مضامین کو بھی درست کیا۔ انکا انتقال ۱۹۲۲ء مین ہوا۔ انکا ایک ڈراما لیل ونہار ہے جو لارڈ لٹن کی اسی نام کی ایک کتاب کا ترجمہ ہے اسمین مترجم نے اصل کتاب کی خوبصورتی کو بہت کچھ قایم رکھا ہے انکی دیگر تصانیف یہ ہین۔ وکرم ولاس۔ دلیر دل شیر۔ نازان۔ نگاہ غفلت۔ ہریشچندر۔ گوپی چند۔

الفرڈ تھیٹریکل کمپنی احسن لکھنوی وکٹوریہ کمپنی کے مقابلہ مین الفرڈ تھیٹریکل کمپنی قایم ہوئی جسکو کاؤس جی کھٹاؤ نے قایم کیا تھا۔ برخلاف خورشید جی کے جو ایک بڑے کامک ایکٹر تھے۔ کاؤس جی ایک مشہور ٹراجک ایکٹر تھے یعنی جذبات رنج وغم دکھانے کے استاد تھے۔ انکو لوگ ہندوستان کا ارونگ کہتے تھے جو حق بجانب ہے یہ شیکسپیر کے رومیو اور ہیملٹ کا پارٹ خوب کرتے تھے

اور مثل خورشید جی کے یہ بھی کامل الفن تھے۔ مرض ذیابیطس مین بمقام لاہور ۱۹۱۲ء مین انتقال کیا
انکی کمپنی کے مشہور ایکٹر منچیر شاہ۔ گلزار خان۔ مادھو رام۔ ماسٹر موہن ماسٹر منچیر جی۔ مس زہرہ اور
مس گوہر تھین۔ انکے انتقال کے بعد انکے بیٹے جہانگیر جی نے تھیٹر چار پانچ سال تک چلایا اور پھر
کلکتہ کے مشہور تاجر مسٹر میڈن کے ہاتھ فروخت کر ڈالا۔ میڈن کا انتقال ۱۹۲۳ء مین ہوا۔

احسن لکھنوی

الفرڈ کمپنی کے سب سے پہلے ڈراما نگار احسن لکھنوی تھے جنکا نام سید مہدی حسن ہے
اور حکیم نواب مرزا شوق مشہور مصنف زہر عشق و بہار عشق وغیرہ کے نواسے ہین۔ احسن صاحب نہ صرف ایک
کامل ڈراما نگار بلکہ اک شاعر خوش گو اور بہت اچھے موسیقی دان بھی ہین۔ انکی ڈراماؤن کی زبان نہایت
فصیح اور بامحاورہ ہوتی ہے اور کیون نہو کہ زبان دان ہین۔ انکی ایک مشہور تصنیف واقعات انیس
ہے جسمین میر انیس مرحوم کے حالات زندگی نہایت صحت اور عمدگی کے ساتھ بیان کئے گئے ہین ڈرامٹک
تصانیف یہ ہین۔ فیروز گلنار۔ چندراولی۔ دلفروش۔ بھول بھلیان۔ بکاولی۔ چلتا پرزہ۔

بیتاب دہلوی

احسن کے بعد الفرڈ کمپنی کی ڈراما نگاری کی خدمت پنڈت نراین پرشاد بیتاب
دہلوی کو سپرد ہوئی جو پنڈت ڈھلارلے کے بیٹے اور فن شعر مین سردار محمد خان طالب شاگرد غالب
کے شاگرد تھے۔ کبھی کبھی اپنا کلام نظر حسین سخا کو بھی دکھاتے تھے۔ یہ کمپنی مین باقاعدہ کام کرتے اور بمبئی مین
رہتے تھے۔ اک رسالہ موسوم بہ شیکسپیر نکالتے تھے جسمین استاد زمانہ کے مشہور ڈرامون کا ترجمہ چھپتا تھا۔
یہ اب بند ہوگیا ہے۔ تصانیف حسب ذیل ہین۔ قتل نظیر۔ مہابھارت۔ زہری سانپ۔ فریب محبت۔ رامائن
گورکھ دھندا۔ پتنی پرتاپ۔ کرشن سداما۔ "قتل نظیر" پہلا تماشہ تھا جو بیتاب نے کمپنی کے واسطے تیار کیا تھا
اسکی مقبولیت کی شاید یہ وجہ بھی ہوکہ اُس زمانہ مین دلی کی ایک رنڈی نظیر نامی مارڈالی گئی تھی جسکا چرچا
لوگون مین پھیلا ہوا تھا۔ "مہابھارت" کا تماشا سب سے پہلے ۱۹۱۳ء مین بمقام دہلی کھلایا گیا جو
بہت مقبول ہوا اور اب بھی لوگ اسکو بہت پسند کرتے ہین۔ بیتاب اس مین بڑی مہارت رکھتے ہین
کہ مہابھارت وغیرہ ہندوؤن کے مذہبی کتابون سے جو دلچسپ واقعات کا خزانہ ہین ضروری ضروری
دلچسپ واقعات چن لیتے ہین اور انکو نہایت عمدہ اور دلفریب طریقے سے ڈراما کا جامہ پہناتے ہین۔

انکو ہندی مین بھی بڑا عبور رہے اور انکے ہندی دوہے اور گیت نہایت شیرین اور موثر ہوتے ہین انہون نے متعدد تاریخی واقعات کو مثلاً دروپدی کا مہاراج سری کرشن جی کی خون بہتی انگلی باندھنے کیواسطے اپنی ساری پھاڑ ڈالنا اور سیوا اور چتیا چمار دن کا قصہ وغیرہ نہایت استادی اور حسن سے اپنے ڈرامون مین باندھا ہے۔ وہ سین جس مین ساری پھاڑنا دکھایا گیا ہے بعض نکتہ چین اسکو خلاف قواعد فن اور خلاف تہذیب خیال کرتے ہین مگر اس مین کوئی قباحت نہین بلکہ اس سے انتہا درجہ کا اعتقاد اور محبت اور سری مہاراج کی عظمت کا ثبوت بہم پہونچتا ہے۔ ایک اور اعتراض اُن کے تماشون پر یہ کیا جاتا ہے کہ جنت و دوزخ وغیرہ نہایت بھونڈے ہین اور دقیانوسی طریقہ پر دکھلائے جاتے ہین۔ اُنکے ڈرامون کے زبان بھی ایک حد تک ضرور قابل اصلاح و ترقی ہے۔ انکے یہان نثر مقفیٰ کی بہتات ہے جو بعض وقت بہت بری معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح ہندی اور سنسکرت الفاظ فارسی اور عربی الفاظ کے ساتھ بہت برے اور بے میل معلوم ہوتے ہین اور کانون پر گران گزرتے ہین اشعار بھی موقع وبے موقع مکالمے مین استعمال ہوتے ہین اور بعض وقت رنج وغصہ کے موقع پر بھی شعر ہی پڑھے جاتے ہین جو بالکل خلاف فطرت چیز ہے۔ مگر باوجود ان سب کمیون کے بیتاب نے ڈرامانگاری مین توسیع اور ترقی ضرور کی بعض مخالفین یہ بھی کہتے ہین کہ بیتاب چونکہ آریہ سماج سے تعلق رکھتے ہین ایسی باتین لکھ جاتے ہین جو سناتن دھرمیون کو ناگوار اور ناپسند ہوتی ہین مگر ہمارے نزدیک اس کی کچھ اصل نہین ہے۔ انکی تماشون کے شہرت زیادہ تر اس وجہ سے بھی ہوئی کہ مشہور حسین عورتین انمین تماشہ کرتی تھین خصوصاً بیتاب کے جذبات عمیق اور اُنکے کیرکٹر زبردست ہوتے ہین اور وہ اصول ڈراما کو خوب سمجھتے ہین۔

نیو الفریڈ کمپنی آغا حشر کاشمیری

ایک شخص محمد علی ناخدا نامی نے ایک دوسری کمپنی الفرڈ کمپنی کے طرز پر کھولی اور اسکا نام نیو الفریڈ رکھا۔ مشہور کامک ایکٹر سہراب جی اُسکے منیجر تھے جو بعد کو شریک بھی ہوگئے یہ کمپنی ادہر اُدہر پھرا کئے آخر کار احمد آباد مین مستقل طور سے قائم ہوگئی۔ عباس علی جو بعد کو جوبلی کمپنی مین چلا گیا اور امرت لال کیشو اُسکے مشہور ایکٹر تھے۔ امرت لال کا مسز گوہر کے ساتھ تعلق ہوگیا تھا

اور یہ دونوں آدمی آخر میں پارسی ناٹک منڈلی میں چلے گئے جسکے مالک فرام جی اپّو نے امرت لال کو اپنی کمپنی کا منیجر بنالیا اور امرت لال نے چند اور آدمیوں کی شرکت سے اپنا ڈراما امرت نکالا امرت لال کا انتقال اپنی بے اعتدالیوں کی وجہ سے عین جوانی میں ہوگیا ۔

آغا حشر کشمیری آغا حشر کشمیری الاصل ہیں۔ مگر عرصہ سے ان کا خاندان بنارس میں مقیم ہے اور شال کی تجارت ہوتی ہے ۔ حشر کی ولادت امرتسر میں ہوئی۔ وہ نہایت ذکی الطبع آدمی ہیں۔ اُنہوں نے بہت سے تماشے نیو الفریڈ کے واسطے تحریر کئے جنکے پلاٹ زیادہ تر یورپی ڈراموں سے لئے گئے اور کچھ ڈرامے انکی مستقل تصنیف بھی ہیں۔ نیو الفریڈ سے ترک تعلق کے بعد اُنھوں نے اپنی ذاتی کمپنی موسوم شیکسپیر تھیٹریکل کمپنی کھولی جو نقصان اُٹھاکر تھوڑے ہی دنوں میں بمقام سیالکوٹ بند ہوگئی ۔ اسکے بعد حشر کلکتہ چلے گئے اور میڈن کے یہاں ایک معقول تنخواہ پر ملازم ایکٹر ہوگئے ۔ مگر اب بھی وہ کبھی کبھی کچھ لکھتے رہتے ہیں ۔ بعض مشہور تصانیف حسب ذیل ہیں شہید ناز ۔ مرید شک ۔ اسیر حرص ۔ ترکی حور خوبصورت بلا سفید خون وغیرہ بعض ہندی ڈرامے بھی لکھے مثلاً سور داس ۔ سیتابن باس ۔ گنگا اترن وغیرہ

آغا حشر کو لوگ اُردو ڈراما کا مارلو کہتے ہیں کیونکہ اُنکے یہاں مارلو کا رنگ بہت ہے ۔ وہ اپنے کیرکٹروں میں دور جذبات دکھاتے ہیں انکا عشق بہت گہرا اور اُن کے جذبات بہت عمیق ہیں ۔ وہ نثر و نظم دونوں کے اُستاد ہیں اور اُن کا انداز بیان اُسجگہ خوب معلوم ہوتا ہے جب کہ دو کیرکٹر دن سے جو ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہیں آپس میں مکالمہ کراتے ہیں ۔ اس قسم کے سین آپ کو اسیر حرص ۔ خوبصورت بلا اور سور داس میں ملینگے ۔ آغا حشر کی ڈراما نگاری میں عیوب بھی وہی ہیں جو مارلو میں ہیں ۔ یعنی جذبات کی شدت نہ کہ لطافت ۔ اور ذوق البھڑک رنگ بجائے اسکے کہ رنگ ہلکے ہوں اور انمیں تال میل کا خیال ہو ۔ ان چیزوں کا اثر نازک اور حساس دماغ پر بہت پڑتا ہے علی الخصوص ایسے سین جنمیں قتل و غارتگری وغیرہ دکھائی جاتی ہے ۔ آغا حشر پر یہ بھی اعتراض ہے کہ ایک ہی تماشے میں دو مختلف پلاٹ قایم کرتے ہیں جس سے توجّہ منتشر ہوجاتی ہے اور خاتمہ میں کمزوری اور بیراہ روی پیدا ہوجاتی ہے ۔ اکثر جگہ شعر کو ایکشن پر ترجیح دیتے ہیں یا اشعار کو محض حسن بیان کے طور پر لکھتے ہیں

جو اصول ڈرامانگاری کے خلاف ہے۔ کبھی کبھی واہیات اور سوقیانہ دلگی اور مذاق شامل کیاجاتا ہے جس سے سین کا اثر جاتا رہتا ہے بعض اوقات بیان واقعات میں عجلت کیجاتی ہے جس سے ایکشن پر بڑا اثر پڑتا ہے۔ مگر باوجود ان تمام عیوب کے آغا صاحب ایک مشہور شخص ہین اور انکی تصانیف اُردو ڈراما مین اعلےٰ درجہ رکھتی ہین۔

دوسری کمپنیان مذکورہ بالا کمپنیون کے علاوہ جو کمپنیان قایم ہوئین انمین سے بعض مشہور کے نام ہم یہان لکھنے پر اکتفا کرتے ہین۔ (۱) اولڈ پارسی تھیٹریکل کمپنی۔ گذشتہ صدی کے آخر مین قایم ہوئی تھی سنہ ۱۹۰۱ء مین لاہور مین جل گئی۔ مگر اپنے مالک آردشیرجی کی قابلیت اور حسن انتظام کی وجہ سے پھر دوبارہ قایم ہوئی (۲) جوبلی کمپنی دہلی اسکو دلی کے ایک امیر آدمی نے عباس علی ایکٹر کے زیر اہتمام قایم کیا تھا۔ اسمین عباس علی گلرو زرینہ اور جام جہان نما مین پارٹ کرتے تھے۔ (۳)۔ بھارت ویاکل کمپنی میرٹھ اسمین بدھ بھگوان کا تماشا خوب ہوتا تھا تھوڑے عرصہ کے قیام کے بعد احمد آباد مین ختم ہو گئی (۴) امپریل کمپنی اور (۵) لایٹ آف انڈیا انمین حافظ محمد عبداللہ اور مرزا نظیر بیگ اکبرآبادی تماشہ کرتے تھے۔ حافظ عبداللہ کے بعض تماشون کے نام یہ ہین جشن پرستان انجام ستم۔ ستم ہامان وغیرہ۔ اور مرزا نظیر بیگ نے نل دمن بہار عشق۔ فسانۂ عجائب۔ ماہی گیر وغیرہ لکھے۔

ڈرامانویسون مین صدی کے مشہور ڈرامانویس علاوہ مذکورۂ بالا ڈرامانویسون کے اس زمانہ کے بعض ڈرامانویس جنکی تصانیف کتب خانہ انڈیا آفس مین بھی محفوظ ہین یہ ہین غلام حسین ظریف مصنف ... ... محمد عبدالوحید قیس جنہون نے نجی ... ... پرستان لکھا نظیر محمد ... مصنف ... ... مصنف بھول بھلیان ترجمہ شیکسپیر۔ ... مصنف ... میر کرامت ... میر عبدالماجد ومقصود علی۔ امداد علی مصنف البرٹ بل اردو مین سب سے پہلا سیاسی ڈراما وجہانگیر ترجمہ ہیملٹ۔

مخرب نویسون صدی کے بعض ڈرامانویس (۱) منشی غلام علی دیوانہ الگزنڈرا تھیٹریکل کمپنی مین مین تائید ...

اور مہر جبیا۔ انکے تماشے ہین۔ (۲) منشی محمد ابراہیم محشر انبالوی ۔حشر کے شاگرد ہین اور آتشین ناگ
نگاہ ناز خود پرست وغیرہ کے مصنف ہین (۳) منشی رحمت علی مصنف درد جگر باوفا قاتل وغیرہ
پہلے البرٹ تھیٹریکل کمپنی کے منیجر تھے۔ اب پارسی تھیٹریکل کمپنی کے ڈایرکٹر ہین (۴) دوارکا پرشاد
افق مصنف رام ناٹک جو ایک بہت طویل ڈراما ہے (۵) مرزا عباس مصنف نورجہان و شاہی فرمان
وغیرہ (۶) آغا شاعر دہلوی شاگرد داغ مصنف حور جنت (۷) و (۸) لالہ کشن چند زیبا و لالہ نانک چند
ناز۔ یہہ دونون پنجابی ہین اور اکثر ڈرامون کے مصنف ہین جنمین غیر مانوس ہندی الفاظ کی کثرت ہی
(۹) لالہ کنور سین ایم اے چیف جسٹس ہائیکورٹ کشمیر سابق پرنسپل لا کالج لاہور۔ ڈراما کے مشہور
نقاد ہین۔ انکا ڈراما برہمانڈ ناٹک بہت عمدہ ہے اسمین آسمانی ستارون کے کیرکٹر دکھائے گئے ہین۔
(۱۰) بشمبر سہائے بیاکل مصنف بدھ دیو جو بہت مقبول ہوا اسمین شانتی رس یعنی قلبی اطمینان کی بہترین
تصویر کھینچی ہے۔ یہ اُن عیوب سے پاک ہی جو اُردو کے اکثر ڈرامون مین پائے جاتے ہین۔ بیاکل بھارت بیاکل
کمپنی کے روح رواں تھے جو میرٹھ مین قایم ہوئی تھی اور ایک زمانہ مین شمالی ہندوستان کی کمپنیون مین
بہت مشہور تھی اور اسکی خصوصیت یہ تھی کہ اسکے اکثر ایکٹر پڑھے لکھے اور اچھے طبقہ کے لوگ تھے۔ علی اطہر
اس کمپنی کا ایک مشہور ایکٹر تھا۔ منشی جانیشر پرشاد مایل دہلوی ایڈیٹر رسالہ زبان نے اس کمپنی کیواسطے
دو تماشے چندر گپت اور تیغ ستم تیار کئے تھے۔ (۱۱) حکیم احمد شجاع بی اے اسسٹنٹ سکرٹری لیجسلیٹو کونسل
پنجاب و ایڈیٹر رسالہ ہزار داستان ایک اچھے افسانہ نگار اور ڈراما نویس ہین۔ باپ کا گناہ۔ بھارت کا لال۔
جانباز وغیرہ کے مصنف ہین۔ مگر ان کے ڈراما اسٹیج پر اچھے نہین معلوم ہوتے (۱۲) سید امتیاز علی بی اے
مصنف انارکلی و دلہن وغیرہ۔ بالفعل رسین کے الگزینڈر کا ترجمہ کر رہے ہین (۱۳) سید دلاور علی شاہ
مصنف پنجاب میل معمولی ڈراما ہے (۱۴) خان احمد حسین مصنف حُسن کا بازار وغیرہ (۱۵) رادھے شام
اکثر مذہبی ڈراما لکھتے ہین جو اہل ہنود مین بہت مقبول ہین (۱۶) سدرشن جنکا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔

ادبی، سیاسی، اور سوشل ڈراما

اردو مین ادبی ڈرامونکی بہت قلت ہے مگر پھر بھی حسب ذیل کتابین
قابل ذکر ہین میکفرسن اور لوسی۔ اور قاسم و زہرہ مولفہ شوق قدوائی۔ شہید وفا مولانا ظفر مرحوم

وکرم اروسی مترجمہ مولوی عزیز مرزا مرحوم - روس وجاپان مولفہ مولوی ظفر علیخان - تسخیر فرانس - شیکسپیر کے ہنری خامس کا ترجمہ ہے اور جولیس سیزر مترجمہ سید تفضل حسین - نظیر منشی جوالاپرشاد برق نے شیکسپیر کے اکثر ناٹکون کے ترجمے جسمین معشوقہ فرنگ رومیو جیولٹ کا منظوم ترجمہ ہے - بیداری مولفہ حکیم اظہر صاحب ایڈیٹر تحریک - ان کے علاوہ منشی محمد عمر صاحب مترجم ہائیکورٹ جمون کشمیر اور منشی نور الٰہی نے جو ناٹک ساگر کے مشہور مصنف ہین جو تمام ملکون کے ڈراما کی ایک مبسوط گو کسیقدر ناکمل تاریخ ہے اور اس سے اس باب مین بہت کچھ مدد لی گئی ہے - اکثر مفید اور دلچسپ ڈرامون کا ترجمہ اردو مین کیا ہے - انکی یہ کوشش نہایت قابل تعریف ہے اور ان دونون اصحاب کو اس فن مین خاص مہارت ہو گئی ہے - اور ہمکو امید ہے کہ زیادہ تجربے کے ساتھ یہ زبان پر پوری قدرت اور فن ڈراما نگاری مین عبور حاصل کر لینگے - انکی بعض تصانیف حسب ذیل ہین (۱) روح سیاست جسمین امریکہ کے مشہور پریسیڈنٹ ابراہام لنکن کی زندگی کے حالات اور مقصد نہایت خوبی سے ڈرامے کی صورت مین دکھائے گئے (۲) جان ظرافت فرانس کے مشہور ڈراما نویس مولیر کی ایک کتاب کا ترجمہ ہے جسمین کنجوسون کی بہت خبر لی گئی ہے (۳) قزاق - مشہور جرمن شاعر اور ڈراما نویس شلر کی کتاب کا ترجمہ (۴) بگڑے دل مولیر کی ایک دوسری کتاب کا ترجمہ (۵) ظفر کی موت - لیسنگ کے ایک ڈراما کا ترجمہ -

سوشل ڈرامون کے ذیل مین مولوی عبد الماجد صاحب دریا آبادی کا زود پشیمان جسمین کم عمری کی شادی کی تباہیان دکھائی ہین قابل ذکر ہے - پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی ایم - اے جو ایک خوش فکر شاعر اور بہت بڑے مضمون نگار ہین ڈرامہ سے بھی ایک خاص دلچسپی رکھتے ہین - بالفعل کشمیر مین اسسٹنٹ فارن سکریٹری کے عہدہ پر ممتاز ہین - راج دلاری اور مراری دادا آپ کی مشہور تصانیف ہین - راج دلاری پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے منظور ہو گئی ہے مسٹر گلورسین مشہور نقاد ڈراما ان دونون کتابون کی نسبت لکھتے ہین "یہ دونون نثر ڈرامے ہمارے موجودہ سوشل اور خانگی زندگی کے بہترین نمونے ہین انکے لکھنے کی غرض اصلاح معاشرت ہے اور تعلیم یافتہ ہندوستانیونکو چاہئے کہ ان کو پورا آئینہ اخلاق سمجھین ان مین طبقہ متوسط کے مردون اور عورتون دونون کے صحیح خیالات وجذبات اور

نیز اُن کے نقایص اور کمزوریان اور اُن کے عادات نہایت کامیابی سے دکھلائے ہین طرز تحریر بہت شوخ، زبان بامحاورہ، اور خیالات بہت پاک وصاف ہین انکو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جین آسٹن کے ناولون کو برنارڈ شا نے ڈراما کا جامہ پہنا دیا ہے البتہ لایق مصنف مین اتنی کمزوری ضرور ہے کہ اسنے آزاد خیالی کو اسکی منطقی حد تک نہین پہونچایا ہے"۔ مولانا شرر مرحوم نے میوہ تلخ پردہ کی سختی کی خرابیون پر لکھا۔ غرضکہ زمانۂ موجودہ مین متعدد ڈراما انہین معاشرتی مسایل پر لکھے جاتے ہین جنمین ضمناً یا صراحتاً مغربی تہذیب کی حد سے زیادہ تقلید کا خاکہ اُڑایا جاتا ہے۔

سیاسی صنف مین منشی امراؤ علی کا ڈراما البرٹ بل جو ۱۸۹۳ء مین بمقام لاہور شایع ہوا تھا یعنی اسوقت جبکہ مشہور البرٹ بل پر سخت مباحثہ ہو رہا تھا اور نیز ایک اور ڈراما جسمین انڈین نیشنل کانگرس کے مقاصد کو بیان کیا ہے سیاسی ڈرامے کہے جاسکتے ہین مگر یہ کوئی دلچسپ اور وقیع تصانیف نہین ہین۔ اسیطرح ترک موالات کے عروج کے زمانہ مین بہت سے نام نہاد ڈرامے سیاسی مسایل پر لکھے گئے اور ممنوع ہو گئے۔ اُنمین سے کوئی قابل ذکر نہین الا وہ جو منشی کشن چند زیبا نے زخمی پنجاب کے نام سے لکھا تھا۔

اُردو ڈراما کی ترقی مین مختلف لوگون نے کیا حصہ لیا

جیسا اوپر بیان ہوا اندر سبھا سے اُردو ڈراما کی بنیاد پڑی مگر یہ رہس کے طرز پر لکھی گئی نہ تو اسمین کوئی منتظم پلاٹ ہے اور نہ صحیح معنون مین کیرکٹر ہین۔ اُسکے بعد ظریف نے جدید رنگ کے ڈراما کی بنیاد ڈالی یا کم سے کم اسکی ترقی و اشاعت مین کوشش کی انکی تصانیف کیوجہ سے زبان ہندوستانی یعنی اُردو کی ہندوستان کے مختلف حصون مین جہان اُنکے ڈراما کھیلے گئے، شہرت ہوئی لیکن اگر غور سے دیکھا جاے تو ظریف کی غرض صرف دلچسپی اور تفریح تھی اُنکے ڈراما ادبی حیثیت سے ممتاز نہین انکے پلاٹ اور کیرکٹر بہت کمزور ہین اُنکی تحریر مین اُستادی نہین پائی جاتی نثر و نظم دونون ابتدائی رنگ کی اور ناقص ہین۔ حافظ عبد اللہ اور مرزا نظیر بیگ نے ظریف کی پیروی مین اپنے تماشون مین دو دو پلاٹ الگ الگ قایم کئے۔ اُنکے بعد طالب احسن نے اس فن کو ترقی دی اور زبان کو بھی ایک حد تک بہت درست کیا انہون نے دو پلاٹون کو ایک

کر دیا اور اُسی پلاٹ مین بعض کیرکٹرون سے مسخرہ کا کام لیا یعنی کومیڈی کو بھی اُسی قصہ مین شامل کیا
معمولی گفتگو مقفّٰی نثر مین ہوتی تھی اور نظم گیتون کے واسطے مخصوص کی گئی کبھی کبھی گفتگو مین بھی اسکو
زور دار اور مؤثر کرنے کے لئے شعر استعمال کئے گئے گیت زیادہ تر ہندی زبان مین ہوتے تھے اور
اب ڈراما اوپرا کی حد سے نکل کر صحیح ڈراما کی حد مین آگیا کیرکٹر سازی ایکشن اور اختتام قصہ پر زیادہ توجہ
کی گئی - طالب نے سب سے پہلے فارسی الفاظ کی ہندی مین آمیزش کی حشر نے پھر وہی طریقہ یعنے ایک قصہ
مین دو پلاٹون کا اختیار کیا انکے خصوصیات کا بیان ان کے حالات مین مختصر ہو چکا ہے - بیتاب کی
شہرت انکے دو مشہور ڈرامون مہابھارت اور رامائن سے ہوئی جسکے کیرکٹر مشہور سنسکرت شاعر بیاس سے
لئے گئے جنکی تصانیف اپنی مجموعیت اور رنگینیت سے بہترین ڈراما کہی جاسکتی ہین - بیتاب کے مقابل
کو بشمبر سہائے نے اپنے ڈراما بدھ دیو مین دور کیا اسکی زبان گو اعلیٰ درجہ کی بامحاورہ اردو نہین ہے مگر
پھر بھی بہت زور دار زبان ہے جسمین ہندی الفاظ کی کثرت ہے خیالات بہت پاکیزہ اور انداز بیان
بہت دلکش ہے - مسٹر کنورسین نے اپنی کتاب برہمانڈ ناٹک مین علم ہیئت یعنی ستارون سے
کام لیا اور واقعی بڑی اُستادی اور خوبی سے ترتیب دیا - کیفی صاحب نے سوشل مضامین پر ڈراما لکھے
"نو وطن" اور "اتفاق" بلاشبہ سیاسی ڈرامے ہین تاریخی ڈراما کا بھی اب رواج ہو چلا ہے اور یہ زیادہ تر
مشہور مشہور بنگالی ناٹکون کے ترجمے ہین انکے علاوہ ہندو دیوی مالا اور ہندوستانی تاریخ بھی بہت کچھ
مواد آجکل فراہم کر رہی ہے اور مغربی ڈرامون کے ترجمے بھی کثرت ہو رہے ہین - اسی بنا پر کہا جا سکتا ہے
کہ اُردو ڈراما بہت کچھ ترقی کر رہا ہے -

اُردو ڈراما کے دیر مین ظاہر ہونے کے اسباب ہم اوپر بیان کر آئے مین یعنے یہ کہ سنسکرت
اور ہندی ناٹک زوال مین آکر متروک ہو چکے تھے اسکے علاوہ سنسکرت ناٹکون کے جو ترجمے بڑے
بڑے قابل انگریزون مثلاً سر ولیم جونس - پروفیسر ولسن اور مونیر ولیمس نے کئے تھے وہ انگریزی زبان مین
ہونے کی وجہ سے اُن لوگون کی سمجھ سے باہر تھے جو اُردو ڈراما لکھتے تھے اور یہ لوگ انگریزی کے ساتھ
سنسکرت سے بھی ناواقف تھے اور نہ اُسکے جاننے کے خواہشمند تھے - لہٰذا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ

اُردو ڈراما کا صحیح وجود اُسوقت ہوا جب کہ اہل مغرب کا اثر اس ملک پر ہونے لگا۔ اُسکے بعد البتہ سنسکرت ڈراموں سے بذریعہ انگریزی تراجم فائدہ اٹھایا جانے لگا۔

ابتدائی ڈراموں کے نقائص

شروع مین ڈرامے کی بالکل ادبی حیثیت نہ تھی بلکہ وہ محض فائدے کی غرض سے کھیلے بھی جاتے تھے اور لکھے بھی جاتے تھے۔ پارسی لوگون نے جو تجارت کا خاص مذاق رکھتے ہین اس کام کو ایک کاروبار کی حیثیت سے اختیار کیا اور جب اُنکی کمپنیونکو کامیابی ہوئی تو تماشے بھی بکثرت لکھے جانے لگے جنکے ماخذ جیسا اوپر مذکور ہوچکا ہے ہندو دیو مالا۔ پُرانے قصے اور افسانے انگریزی ڈراموں کے ترجمے سبھی کچھ تھے۔ تماشے کی عمدگی اور تکمیل کا خیال مطلق نہین رکھا جاتا تھا کسی پُرانے قصہ کے واقعات کو توڑ مروڑ کر اور کچھ اشعار بطور گیت کے اور کچھ مذاق کی باتین اسمین جوڑ کر تماشا تیار کر لینا بس یہی کافی تھا۔ ڈراما نگار بھی اُسوقت کچھ زیادہ پڑھے لکھے نہین تھے زیادہ تر ایکٹرون مین سے یا ان لوگون مین سے جنکو اس قسم کے تماشے دیکھنے کا شوق ہوتا تھا یہ لوگ منتخب کر لئے جاتے تھے۔ کبھی کبھی ایسے لوگ رکھ لئے جاتے تھے جو منیجرون کی ہدایت کیموافق جلد جلد تماشے تیار کر دیا کرتے تھے۔ نفس ڈراما مین یہ خرابیان ہوتی تھین کہ اُنکے عبارت بہت سست ہوتی تھی اشخاص ڈراما بجائے معمولی طریقہ کے اشعار مین گفتگو کرتے تھے اور بعض اوقات غزلین کی غزلین اسی قسم کی گفتگو مین شامل ہوتی تھین اور اشعار بھی اعلیٰ درجے کے نہ ہوتے تھے بلکہ نہایت معمولی اور بیہودہ۔ نثر بھی انتہا درجہ کی مصنوعی اور غیر مکمل۔ پلاٹ اور کیرکٹر کا کہین پتہ نہین ایکشن نہایت ناہموار۔ سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ ٹریجڈی اور کامڈی جنکا کبھی میل نہین ہو سکتا ایک ہی پلاٹ مین شامل کر دی جاتی تھین۔ اخلاقی نقطۂ نظر سے بھی ڈرامے نہایت ہی ادنےٰ درجے کے ہوتے اور مہذب اور متین لوگونکے دیکھنے کے لایق ہرگز نہین ہوتے تھے۔ بوسہ بازی، گلے ملنا اور مخش گفتگو بے تکلف جائز تھی۔ بلکہ اس سے سستے ٹکٹ والے بہت خوش ہوتے تھے۔ ایکٹرس عورتین زیادہ تر ادنےٰ درجہ کی رنڈیاں ہوتین قتل و خونریزی کے سین بے تکلف اسٹیج پر دکھائے جاتے کامک پارٹ اور نقلین وغیرہ نہایت ادنےٰ درجہ کی ہوتی تھین غرضکہ فن ڈراما جن اعلےٰ عناصر سے مرکب ہے وہ بالکل ناپید تھے۔

کچھ عرصہ کے بعد انگریزی ڈرامون نے لوگون کو اپنی طرف متوجہ کیا اور شیکسپیر کے تماشے لوگون کو بہت پسند آئے انمین سے اکثر ترجمہ کے ذریعہ سے اسٹیج پر دکھائے جانے لگے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایک مین بھی اصلیت کی جھلک تک نہین معلوم ہوتی تھی۔ انکی مقبولیت اس درجہ ہوئی کہ بعض تماشون کے چار چار یا پانچ پانچ ترجمے کیے گئے جن مین سے اکثر کا ذکر انڈیا آفس لائبریری کی فہرست مین موجود ہے ان ترجمون مین اشخاص قصہ کے نام بدلکر ہندوستانی مناسبت سے کچھ اور رکھ لئے گئے ہین مگر اصلی کیرکٹر مترجمون کی سمجھ مین مطلق نہین آئے۔ مثلاً شیکسپیر کے مشہور تماشے ہیملٹ مین وہ سین جسمین ہیملٹ اپنے دل سے باتین کرتا ہے مترجم صاحب بوجہ انگریزی نجاننے کے اُسکا صحیح مطلب بالکل نہین سمجھ سکے مسٹر عبد اللہ یوسف علی فرماتے ہین انگریزی اسٹیج کا اثر ہندوستانی اسٹیج پر اسکی بناوٹ اسکے ساز و سامان اُسکے پردون وغیرہ سے پوری طرح ظاہر ہے۔ اردو ڈرامانے انگریزی ڈراما کی اندھا دھند تقلید دو طریقہ سے کی۔ پہلے یہ کہ ابتدا مین وہ انگریزی ڈراما "جو پولیٹیکل" کہلاتے تھے اور جنکی غرض اصلی یہ تھی کہ سوسائٹی کے تمام پرانے رسم و رواج اور اخلاق و عادات کا خوب خاکہ اوڑایا جائے انکی تقلید مین ابتدائی اردو ڈراما بھی اس معاملہ مین تمام پرانی چیزون کی نسبت بہت آزاد و بیباک ہوگیا۔ پس اس معاملہ مین انگریزی ڈرامانے اردو ڈراما کے ساتھ وہی کیا جو اٹالین ڈراما نے فرنچ ڈراما کے ساتھ اور فرنچ ڈرامانے عہد رسٹوریشن کے انگریزی ڈراما کے ساتھ کیا تھا۔ دوسرے بیجا اسی تقلید کیوجہ سے انگریزی دھنین ہندوستانی تھیٹرون مین رائج ہوگئین مگر نہایت بھونڈے طریقہ سے رائج ہوئین اور بڑی خرابی یہ ہوئی کہ اس قسم کی نئی دھنون کے واسطے معمولی شعرانے نظمین بھی اسی انداز کی لکھنا شروع کین جسکا نتیجہ نہایت مسخرانگیز ہوتا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص کسی اردو شعر کو انگریزی دھن مین گائے اور چونکہ اس کوشش مین الفاظ ضرور ٹوٹ پھوٹ جائینگے لہذا اُن کا مطلب کچھ سمجھ مین نہین آئے گا مسٹر گرین نے بھی اس خیال کی تائید کی ہے۔ مگر ہماری رائے مین خرابی انگریزی اثر کے علاوہ اور چیزون کا بھی نتیجہ ہے جنکا ذکر اوپر ہوچکا۔ جیسے ایکٹرون کا ادنے طبقہ سے تعلق رکھنا۔ ڈراما نویسون کی معمولی لیاقت۔ تماشائیون کا اچھے برے مین امتیاز نہ کرنا۔ اور مالکان

تھیٹر کا اپنے نفع کی غرض سے اُن لوگون کو خوش کرنا جن سے انہین زیادہ آمدنی ہوتی ہے دوسری
بات جو انگریزی دشمنون کے متعلق اوپر لکھی گئی یہ بالکل صحیح ہے اس سے واقعی ہندوستانی موسیقی
کو جو نہایت سائنٹفک اور اعلیٰ درجہ کی ہے بہت بڑا نقصان پہونچا۔

موجودہ ڈرامون مین اصلاح و ترقی

موجودہ زمانہ مین اردو ڈراما مین ایک نمایان تغیر و ترقی دیکھی جاتی
ہے۔ اُردو ڈراما بہت تیز رفتاری سے ترقی کر رہا ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے اُردو ڈراما پر
یورپین ڈراما اور سنسکرت ڈراما اور انگریزی اور فرنچ ڈرامون کی ترجمے نیز بنگالی گجراتی اور مرہٹی ناٹکون
کا بہت بڑا اثر پڑا۔ ایک شخص بنارس مین تھے جنکا نام بابو ہرشچندر تھا۔ یہ بھارت اندو کے لقب سے
مشہور تھے اور ہندی ناٹک لکھنے مین کمال رکھتے تھے۔ یہ سنسکرت سے پوری طرح واقف تھے
اور مشہور کالیداس اور بھاوبھوتی کے رنگ مین انکا کلام ڈوبا ہوا تھا۔ یہ اپنے قصون کے پلاٹ
زیادہ تر پورانون سے لیتے تھے جو دلچسپ قصون اور افسانون کا ایک عظیم الشان ذخیرہ ہین۔ اور اب یہ
سب کو مسلم ہے کہ پلاٹ کی درستی اور قصہ کو خوبصورت بنا دینے مین وہ عجب کمال رکھتے تھے۔
چونکہ یہ ہندی مین لکھتے تھے لہذا انکی تصانیف پر اس کتاب مین کوئی رائے زنی نہین کیجا سکتی
مگر اتنا ہم ضرور کہینگے کہ اُنکے تصانیف کا اثر مابعد کے اُردو ڈرامون پر بہت کچھ ہوا۔ مثلاً "راجہ ہرشچندر"
"رکمنی منگل"، "بلوا منگل" وغیرہ۔ بالفعل اُردو ڈراما کے مضامین مین بہت توسیع کیجا رہی ہے۔ علاوہ اُن
پرانے قصون کے جنکا رواج اب تک تھا اب نہایت دلچسپ دلچسپ قصے اسٹیج پر لائے جاتے ہین۔ پولیٹیکل
اور سوشل ڈراما بھی اب ترقی کر رہا ہے۔ قصون کی عمدگی اور اخلاق آموزی مین بھی بہت کچھ فرق ہے
عشق و عاشقی جو اسٹیج پر دکھائی جاتی ہے نیز وہ جذبات اور واردات قلبیہ جو ایکٹنگ کے ذریعہ سے
دکھلائے جاتے ہین بہت اعلیٰ ہوتے ہین۔ نفسیات کی طرف زیادہ توجہ ہے۔ ڈراما کے مضامین
اور مطمح نظر بہت وسیع ہو گئے ہین کیرکٹر اور پلاٹ مین بھی ترقی ہے۔ ایکٹرون کو اپنے افعال پر کافی
قابو ہوتا ہے اور اب وہ پہلا سا بے تکا پن انمین نہین ہے خیالات اور الفاظ دونون مین شستگی اور
متانت کا لحاظ رکھا جاتا ہے نتیجہ کی عمدگی پر بھی کافی توجہ کیجاتی ہے۔ نقلون اور کامک پارٹون مین

وہ پہلے کی سی بدتمیزی اور پھکڑ پن جو نفیس طبائع کو ہمیشہ ناپسند تھا اب نہیں ہے۔ مختصر یہ کہ قدیم اور جدید اردو ڈراموں میں اب زمین و آسمان کا فرق ہو گیا ہے۔

اصلاح و ترقی کی ضرورت

مگر بایں ہمہ اب بھی اصلاح و ترقی کی بہت کچھ ضرورت ہے خیالات اور زبان دونوں اب بھی بہت کچھ محتاج اصلاح ہیں۔ الفاظ میں ڈھنگ ہونا چاہئے بلکہ معنویت اور اصلیت کا زیادہ خیال رکھا جائے تکلف اور تصنع سے عبارت بالکل خالی ہو۔ گفتگو کے موقع پر مقفیٰ عبارت گو معین حافظہ سہی مگر بے جوڑ معلوم ہوتی ہے اسکی جگہ بے تکلف سیدھی سادی بات چیت سے کام لیا جائے جیسا کہ موقع و محل کا تقاضا ہو۔ پلاٹ کی ترتیب و تنظیم میں بھی ابھی بہت اصلاح کی گنجائش ہے اسکے واسطے بہت ہوشیار اور چابکدست قلم چاہئے تمسخر اور مذاق کے موقعوں پر فحش اور بھانڈپن سے بچنا چاہیے اور مذاق نہایت ستھرا اور شایستہ ہونا چاہئے۔ اصلاح زبان پر بھی توجہ کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔ اصلی فن ڈرامانگاری سے ہمارے ڈرامانویس ابھی آشنا نہیں ہیں اور ہماری رائے میں یہ بات اسیوقت نصیب ہوگی جب کہ اس کام کو وہی لوگ کرینگے جو اس کام کے اہل ہیں اور جنکا قدرتی میلان طبع اسطرف ہے۔ اردو ڈراما کی ترقی کا واحد طریقہ یہی ہے کہ اس کا میدان عمل وسیع کیا جائے اور قابل اور اہل لوگوں کی ہمت افزائی کیجائے۔ نیز یہ کہ بہترین یورپین اور انگریزی ڈرامے اور پرانے سنسکرت ناٹک ترجمہ کرائے جائیں۔ جنسے ہمارے اہل وطن کو اصلی ڈراما کی حقیقت اور اعلےٰ آئیڈیل کا حال معلوم ہوگا۔ وہ دیکھیں گے کہ یہ فن شریف گزشتہ زمانہ میں کس درجہ تک پہونچ چکا تھا اور آجکل کی زندہ قوموں اور ملکوں میں اسکی ترقی کی کیا حالت ہے۔ اسی میں سے انکو اپنے ملک والی سوسائٹی کے حسب حال جو چیزیں مناسب معلوم ہوں اخذ کرنا چاہئیں مگر یہ ضرور ہے کہ ترجموں کی کثرت سے طبعزاد تصانیف دب نہ جائیں۔ زمانہ حال کی خرابیوں کی اصلاح کے واسطے دلچسپ اور سوشل تماشے مرتب کئے جاویں اور سوسائٹی ہی سے اس قسم کے مضامین اخذ کئے جائیں۔ اس فن کو بنظر حقارت نہ دیکھا جائے اور ہمارے علما و فضلا اسکی تضحیک و تذلیل کے درپے نہ ہوں ایکٹروں پر بھی ذلت کی نگاہیں نہ ڈالی جائیں۔ ان کاموں کے واسطے زیادہ ہمت اور زیادہ

سرپرستی کی ضرورت ہے پردہ کی موجودگی سے ہمارے ناولون اور ڈرامامین جو بعض رکیک اور ذلیل باتین پائی جاتی ہین وہ یقیناً رسم پردہ اُٹھنے کے ساتھ دور ہوسکتی ہین کیونکہ موجودہ صورت مین سچے جذبات عشق کا اظہار ناممکن ہے۔ اگر کوئی شخص ایکٹری کا پیشہ اختیار کرے تو وہ ذات برادری سے خارج نہ کیا جائے۔ اسی طرح ڈرامانویس اور ایکٹر بھی اپنے اپنے پیشون اور کامون کو معزز سمجھین۔

اردو ڈراما کا مستقبل

ہر چند کہ پیشین گوئیاں سچی نہین سمجھی جاتے اور انکی رائے کو معتبر نہین مانا جاتا مگر باایں ہمہ ہم یہ کہنے کے لئے تیار ہین کہ اردو ڈراما اپنے لئے ایک روشن مستقبل رکھتا ہے جسطرح اس باب کی ابتدا مسٹر عبداللہ یوسف علی کے فاضلانہ مضمون سے کی گئی تھی اسی طرح اس کا اختتام بھی انہین کے الفاظ مین کیا جاتا ہے۔ وہ فرماتے ہین کہ "اردو ڈراما بہت زور دار ترقی کے آثار پیدا کرچکا ہے تعلیم یافتہ اور ذی وجاہت لوگ یقیناً اسمین ایک زبردست وسیلہ قومی ترقی کا دیکھتے ہین اور اسکی آئندہ منزل ترقی ہماری رائے مین وہی ہوگی جو ایران ایسے ملک مین ہوئی کہ جہان صحیح فن ڈراما سے کوئی واقف نہ تھا یعنی تاریخی اور سیاسی ڈرامانگاری۔ مگر یہ ضرور ہے کہ ایسے شاہکار جو شیکسپیر نے لکھے ہین انکی تصنیف کے واسطے ابھی اک زمانہ درکار ہے اور یہ یاد رکھنا چاہیے کہ انہین کی سچی تقلید سے ہندوستانین صحیح ڈرامانگاری کا مادہ پیدا ہوگا اور اسی وقت اردو ڈراما دنیا کے بہترین ڈرامون کی صف مین ایک ممتاز جگہ پانے کا مستحق ہوگا"

۱۹

زبان اُردو کی خاص خوبیان اور اُسکے متعلق بعض اہل الرائے لوگون کی قیمتی رائین

پورے ادب اُردو کا ایک خاکہ ابواب مذکورہ بالا مین کھینچا گیا اس باب مین زیادہ تر زبان اردو سے بحث ہوگی نیز

یہ کہ ادب اُردو کا بمقابلہ دوسری دیسی زبانون کے کیا مرتبہ ہے۔ اِس باب کی ترتیب مین مولوی
عبدالمجید صاحب کے اُس فاضلانہ مضمون سے بہت مدد لی گئی ہے جو ماڈرن ریویو مین شایع ہوا ہے۔

اُردو ایک فصیح اور شیرین زبان ہے

اُردو بالاتفاق ایک ایسی زبان ہے جو فصاحت و بلاغت شیرینی
اور اظہار مطلب کے لئے بڑی شہرت رکھتی ہے یہ تہذیب تمدن کی زبان ہے اور اسمین خیالات
اور حسیات کے نازک نازک فرق ادا ہو سکتے ہین۔ چونکہ اسمین اکثر دوسری زبانون کے مخصوص
الفاظ و حروف شامل ہین مثلاً عربی فارسی ترکی سنسکرت وغیرہ لہذا یہ بہ نسبت دوسری دیسی
زبانون کے ذریعہ تعلیم بننے ادبی خیالات کو اچھی طرح ظاہر کرنے اور تمدن و شایستگی کی ضروریات پوری
کرنے کے لئے زیادہ تر موزون ہے۔

ہندو مسلم اتحاد کی علامت ہے

ہندو اور مسلمان دونون نے اپنی اپنی قومی اور ملکی زبانون کو چھوڑ کر اور
ایک تیسری زبان اختیار کر کے ایثار و اتحاد کی ایک بین مثال پیش کی اور یہ زبان گو کہ ہندوستان مین
پیدا ہوئی مگر غیر ملکی ذرایع اسکی ترقی اور نشو و نما کے باعث ہوئے لہذا اس سے بہتر عملی مورد اتحاد کا بین ثبوت
نہ کوئی اسوقت تھا اور نہ اب ہے۔

ہندوستان کی زبان عام ہے

اُردو صحیح معنون مین ہندوستان بھر کی لنگوا فرینکا یعنے زبان عام ہے کیونکہ
اُن مقامات مین بھی جہان یہ بولی نہین جاتی بخوبی سمجھی جاتی ہے۔ اور زبانون کا یہ حال ہے کہ صرف اپنے اپنے ملک
یا دیس مین بولی اور سمجھی جاتی ہین مگر دوسری جگہ اُنکو سمجھنا دشوار ہے۔ مثلاً کشمیر مین اگر مرہٹی بولی جائے بہار مین
گجراتی یا اور سندھ مین تامل تو بھلا انکو کون سمجھے گا۔ مگر وہ زبان جسکو ہندوستانی یا اُردو کہتے ہین ہر شخص اپنے
ذاتی تجربہ سے بتلا سکتا ہے کہ ہندوستان کے گوشہ گوشہ اور چپے چپے مین بلکہ دور دراز ملک اُس سے
باہر بھی مثلاً عدن بندر سعید وغیرہ تک مین یہ بے تکلف سمجھی جاتی ہے۔ ہم اپنے برادران وطن سے
معافی کے خواستگار ہین اور کسی دیسی زبان کی توہین یا برائی نہین کرنا چاہتے مگر اصل یہ ہے کہ تمام
دیگر دیسی زبانین زیادہ سے زیادہ کسی ایک صوبہ کی مخصوص زبان کہی جا سکتی ہین اور اردو ایک
بین الاقوامی اور ہر صوبہ کی زبان مانی جائیگی۔ اور چونکہ تمام دیسی زبانون مین بہت سے اردو الفاظ

شامل ہین اور اب اور زیادہ ہوتے جاتے ہین لہذا اُن مقامات کے رہنے والونکو بھی جہان اُردو عام طور پر نہین بولی جاتی اسکے سمجھنے مین کوئی تکلف نہین ہوتا۔

ایک وسیع زبان ہے

اردو ایک نہایت وسیع زبان ہے اور اسمین متعدد زبانون کے الفاظ بہ کثرت شامل ہو گئے ہین جس سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ نئے الفاظ و اصطلاحات کے بنانے مین آسانی ہوتی ہے۔ مثلاً آجکل کے اُردو لکھنے والے اگر مغربی سائنس پر کچھ لکھنا چاہین تو وہ عربی فارسی سنسکرت اور انگلش وغیرہ سے بے تکلف الفاظ لے سکتے ہین اور انکو ایک ضروری تغیر اور مناسبت زبان کے ساتھ اپنا کر سکتے ہین۔ مگر افسوس ہے کہ آجکل عربی سے زیادہ استعارہ کیا جا رہا ہے جس سے کسیقدر زبان اُردو مورد الزام اور غیر مطبوع ہوتی جاتی ہے۔

بعض یورپین محققین کی رائین

جے بمیس صاحب مصنف "انڈین فلالوجی" حسب ذیل رائے دیتے ہین "مین اُردو کو ایک نہایت ترقی کرنے والی اور شائستہ صورت اُس بڑی اور وسیع زبان کی سمجھتا ہون جو ہندوستان مین رایج ہے۔ اردو نہ صرف ایک وسیع فصیح معنی خیز اور جامع زبان ہے بلکہ یہی صرف ایک صورت ہے کہ جسمین دریائے گنگ کے قریب کی رہنے والی قومین اپنی زبان کی ترقی ایک صحیح طور پر دکھلا سکتی نھین" (دیکھو جرنل بنگال ایشیاٹک سوسائٹی جلد ۳ متعلق ۱۸۶۶ء صفحہ ۱)

مشہور فرنچ مستشرق گارسن ڈی ٹاسی "لکھتے ہین "اُردو کی ہندوستان بھر مین وہی پوزیشن ہے جو فرنچ (فرانسیسی زبان) کی یورپ مین ہے۔ یہی وہ زبان ہے جو ملک مین بکثرت مستعمل ہے عدالتون مین اور شہرون مین جاری ہے ارباب ادب اپنی تصانیف اسی زبان مین لکھتے ہین، موسیقی دان اپنے راگ رگنیان اسی زبان مین تصنیف کرتے ہین، اور اہل یورپ سے گفتگو بھی اسی مین کیجاتی ہے بعضون کا خیال ہے کہ اُردو کو ہر مقام کے ہندو لوگ نہین سمجھ سکتے مگر یہی حالت ہر ملک مین ہر زبان کی ہے مثلاً برٹنی کے کسان، عام اس سے کہ پرووانس یا السیس کے ہون اصلی فرنچ نہین سمجھ سکتے۔ پس کیا یہ وجہ معقول ہو سکتی ہے کہ اردو عدالتون اور سرکاری دفترون سے اٹھا دی جائے؟"

جارج کیمبل مصنف "انڈیا ایز اِٹ مائٹ بی" تحریر کرتے ہین "میرے نزدیک یہ بہت مناسب ہے

کہ تمام سرکاری اسکولوں میں ہندوستانی زبان ایک عام زبان کردیجائے اور دیسی زبانیں بھی بشرط ضرورت رکھی جائیں۔ میں اسکو بالکل ناممکن سمجھتا ہوں کہ کوئی عام زبان کا ذریعہ کیے بغیر کام چلایا جاسکتا ہے اور چونکہ انگریزی کو ہندوستان کی زبان عام بنانا محال معلوم ہوتا ہے لہذا ہندوستانی ہی کو یہ فخر ملنا چاہیے جیسا کہ اوپر لکھا جاچکا اُردو ہندوستان بھر کی زبان عام (لنگوا فرینکا) کہی جانیکی مستحق ہے کیونکہ یہی وہ زبان ہے جسکو ادنیٰ و اعلیٰ اور یہانکے انگریز بھی بولتے ہیں اسمیں ایک خاص خوبی یہ ہے جو کسی دوسری زبان میں نہیں پائی جاتی کہ دوسری زبانوں کے الفاظ بلاکسی تغیر کے یا خفیف تغیر کے ساتھ اپنے میں جذب کرلیتی ہے اور پھر وہ لفظ اُسی کے ہوجاتے ہیں"۔

مسٹر ونسنٹ اسمتھ مصنف ہسٹری آف انڈیا اپنی کتاب کے آخر باب میں لکھتے ہیں "زبان اُردو جو ہماری زبان انگریزی سے باعتبار اپنی سادگی اور قواعد صرف و نحو کی نرمی اور کثرت الفاظ کے بہت مشابہ ہے ضرور اس قابل ہے کہ تمام مطالب عام اس سے کہ وہ ادبی ہوں یا فلسفیانہ یا سائنٹفک اسمیں ادا کیے جائیں"۔

اُردو کی نام نہاد کم مائگی یہ عام طور پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ زبان اُردو کوئی ایسا سرمایہ ادب اپنے پاس نہیں رکھتی جسپر فی الحقیقت اسکو ناز ہو نہ اپنے ارتقا و ترقی کی کوئی خاص تاریخ رکھتی ہے۔ یورپین محققین اسکی طرف کم متوجہ ہوئے اور ہندوستانی اگرچہ بھی کہ بعض لوگوں کے نزدیک اسمیں کوئی چیز قدر و قیمت کی نہیں پائی جاتی اور جب اس کا مقابلہ کلاسکل (قدیم) اور متمدن مغربی زبانوں کے ساتھ کیا جاتا ہے تو اسکی بے حقیقتی پوری طرح معلوم ہوجاتی ہے۔ ان اعتراضات کے دو جواب دیے جاسکتے ہیں ایک یہ کہ جہانتک اُردو ادب کا تعلق ہے وہ کوئی قدیم چیز نہیں ہے کسی جدید ادب سے یہ توقع رکھنا کہ وہ قدیم زبانوں کیطرح بیش بہا ادبی خزانوں سے معمور ہو خلاف عقل ہے۔ اسکی ادبی زندگی فارسی سے علیحدہ ہوکر بہت کم گزری ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ بہت ہونہار زبان ہے اور اگر یہی رفتار ترقی رہی تو تھوڑے ہی عرصہ میں یہ ایک ایسے ادب سے مالامال ہوجائے گی جو دنیا کے بہترین ادبوں سے مقابلہ کرسکیگا اور اب بھی ہندوستان کی اور مروجہ زبانوں میں اسکا کوئی مقابل نہیں ہے۔

اقسام ادب اُردو ادب دو بڑی قسموں پر منقسم ہو سکتا ہے (۱) مستقل تصانیف (۲) تراجم۔ ترجمے زیادہ تر زبانِ انگریزی فارسی عربی اور شاذونادر ہندی اور سنسکرت سے اور دیسی زبانوں مین بنگالی مرہٹی اور گجراتی سے بھی کئے جاتے ہین۔

تصانیف مستقل تصانیف نظم، نثر، ناول، ڈراما پر مشتمل ہین۔ نظم اُردو مختلف اقسام کی ہے اور نہایت ہی پرلطف اور مزیدار ہے۔ اسمین پند و نصائح اخلاق حسن و عشق کے افسانے مرثیے حمد و نعت، بادشاہ وقت کی تعریف ہجو ظرافت، اور زمانہ حال کی نیچرل نظمین مختلف مضامین پر سب کچھ موجود ہین مشہور شعراے اُردو ماضی و حال میر، سودا، درد، ناسخ آتش ذوق، غالب، اسیر، داغ حالی اقبال حسرت و اکبر کے نام نامی نہایت فخر کے ساتھ پیش کئے جا سکتے ہین جنکے کلام کے سمجھنے کے لئے ایک خاص ذوق سلیم اور مناسبت طبیعت کی ضرورت ہے۔ باتفصیل نظم اُردو کا بہترین انتخاب مولوی محمد الیاس برنی پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن نے ایک جدید اسلوب سے تین حصون مین کیا ہے اور ہر حصہ (سٹ) کا علحدہ نام رکھا ہے یعنے (۱) معارف ملت (۲) جذبات فطرت (۳) مناظر قدرت۔ یہ تینون حصے یا سٹ بارہ جلدون پر مشتمل ہین۔ مولف نے ارادہ کیا ہے کہ اسمین نظم اُردو کے صرف بہترین انتخابات پیش کئے جائین اور اس غرض سے اکثر شعراے اُردو قدیم و جدید کا بہترین کلام باعتبار مضمون منتخب کیا ہے۔ بہرطور یہ ایک اعلےٰ درجہ کا مفید مجموعہ ہے اور کیا اچھا ہو گا اسمین وقتاً فوقتاً اضافہ ہوتا رہے۔ مشہور نثارونمین مرزا رجب علی بیگ سرور۔ سرسید مولوی نذیر احمد مولانا شبلی مولانا آزاد پروفیسر ذکاءاللہ۔ مولانا حالی کے نام گنائے جا سکتے ہین اور سرشار۔ شرر۔ مرزا رسوا۔ راشدالخیری اور پریم چند سے دنیائے افسانہ نویسی مین کون ایسا شخص ہے جو واقف نہو گا۔

تراجم ترجمے کے ذیل مین بھی زبان اُردو بہت مایہ دار ہے۔ دنیا کی اکثر مشہور مشہور کتابین نظم اور ڈراما کی اردو مین ترجمہ ہو گئی ہین۔ مثلاً ہومر کی الیاڈ، مہا بھارت، راماین، شکنتلا، سکھ دوت وکرم اروسی، رتو سنگھار، ملٹن کی پیراڈائیز لاسٹ۔ ٹیگور کی گیتان جلی، چترا مالی اسیطرح شیکسپیر کے

اکثر ڈراموں سے اردو دان پبلک بذریعہ ترجمہ کے خوب واقف ہے۔ شیریڈن کے بعض ڈرامے
اور ڈیفنی گرنٹے، لانگ فیلو، سدرے، شیلی، بائرن، ورڈسورتھ اور ٹینیسن کی بھی اکثر مشہور نظموں
نے اردو کا جامہ پہن لیا ہے۔ افسانوں اور ناولوں میں رینالڈس، اسکاٹ، میری کاریلی، اور کانن ڈائل
کی تصانیف کو لوگ بہت پسند کرتے ہیں۔ بنکم چندر چٹرجی کے قریب قریب سب ناول اور ٹیگور کے بھی
بہت سے قصے اردو میں آگئے ہیں۔ ابھی تھوڑے عرصہ سے اسٹیونسن، رائیڈر ہیگرڈ، آسکر وائلڈ
برنارڈ شا، اور ایچ جی ویلس کو بھی لوگ پسند کرنے لگے ہیں۔ شاعروں میں مکالے، کارلائل، سمائیلس
اور لیک کی مشہور تصانیف ترجمہ ہو گئے ہیں۔ فلسفہ اور نفسیات میں افلاطون و ارسطو کی اکثر کتابیں جاکیا
کے اقوال، سنیکا کے فلسفیانہ خیالات، برکلے کے مکالمات، اسی طرح بیکن، ہیوم، کینٹ، مل، اسپنسر، جیمس
اور راشڈال کی بھی بعض تصانیف اردو میں موجود ہیں۔ تاریخ اور سوانح عمریوں میں پلوٹارک کی مشہور
یونانیوں اور رومیوں کی سوانح عمریاں، ایلن کی تاریخ یونان، بیری کی تاریخ یونان، ڈوزی کا اسپین اہل
اسلام کی حکومت میں، والیس کی تاریخ روس، ایبٹ کی سوانح عمری نپولین بوناپارٹ، گرین کی تاریخ انگلستان
ونسنٹ اسمتھ کی تاریخ ہندوستان قدیم، الفنسٹن کی تاریخ ہندوستان، مالکم کی تاریخ ایران اور گبن کی
تاریخ زوال سلطنت روم، اور اسی طرح اور بھی مشہور مشہور کتابیں اردو میں موجود ہیں۔ سیاسیات اور
معاشیات میں حسب ذیل کتابیں قابل ذکر ہیں۔ ارسطو کی پولیٹکس، مل کا رسالہ لبرٹی اور پولیٹکل
اکانومی، فیرویل کے قوانین دولت، مورلی کا میکیاولی، لارڈ کرزن کا پرشیا، مزینی کا فرائض انسان،
لشوستر کا اختناق ایران، بنٹ کا مستقبل اسلام، اسی طرح سیلی، ولسن، بانک، ہبوک، جیونس، مارشل
اور ہارسیس کی بھی بعض بعض کتابیں۔ سیاسیات کے علاوہ بعض فلسفیانہ تاریخیں بھی ترجمہ ہو گئی ہیں
مثلاً گیزو کی تاریخ تمدن، بکل کی تاریخ تمدن انگلستان، لیبان کی تمدن عرب اور تمدن ہند، لیکی کی
تاریخ اخلاق یورپ، ڈریپر کی تاریخ ارتقائے یورپ، دت کی تاریخ قدیم تمدن ہند۔ فلسفہ تعلیم میں بھی
اردو داں تھانڈائیک کی تصانیف سے ناواقف نہیں ہے۔ اسپنسر، بین، فروبیل، اسٹالوزی
ہربرٹ، مانٹیسوری۔ سائنس میں ڈریپر کی معرکۂ مذہب و سائنس، ڈارون، ہیکل، ہکسلی، لائل

گیکی۔ ٹنڈل۔ بوس۔ کیلون میکسول۔ کروک۔ اور سر آلیور لاج کی جدید تحقیقاتین اردو مین آچکی ہین قانون اور طب کا ذکر بیکار ہے اسوجہ سے کہ اسکی اکثر کتابین بضرورت ترجمہ ہوگئی ہین۔

مذہبی لٹریچر

اہل عرب و فارس کا پورا اسلامی ادب اور سنسکرت و ہندی کا ایک معتد بہ حصہ ترجمہ ہوگیا ہے۔ مذہبی کتابون مین قرآن شریف۔ گیتا۔ پران۔ مہابھارت رامائن کے ایک نہین بلکہ متعدد ترجمے موجود ہین۔ اسیطرح اکابر دین مثلاً پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عیسیٰ علیہ السلام سری کرشن۔ سری رام چندر۔ گوتم بدھ گرو نانک اور کبیر کے بھی مفصل حالات زندگی۔ نیز مقتدایان دین اور بڑے بڑے اہل دل صوفی اور رشی اور حکمار و شعرا اور نامی مورخین کے بھی حالات موجود ہین مثلاً جوگیون مین بشسٹ متصوفین مین مولانا روم اور حافظ اخلاق فلاسفہ مین غزالی اور سعدی شعرا مین فردوسی حکما مین بو علی سینا۔ مورخین مین ابن خلکان اور فرشتہ وغیرہ۔

ادب اُردو کے سرچشمے

بالفعل ایسے سرچشمے جن سے ادب اُردو کا ہرا بھرا باغ سیراب ہو رہا ہے حسب ذیل ہین (۱) عثمانیہ یونیورسٹی جسمین دار الترجمہ قایم ہے (۲) انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن (۳) دار المصنفین اعظم گڈھ ان تینون جماعتون کے حالات اپنی اپنی جگہ پر لکھے جا چکے ہین اور یہان انکے اعادہ کی ضرورت نہین ہے۔ انکے علاوہ بہت سی چھوٹی چھوٹی انجمنین اور سوسائٹیان ادب اُردو کی اشاعت و ترقی کیواسطے دلّی لکھنؤ اور لاہور مین قایم ہین۔

ہندوستانی اکیڈمی قایم شدہ ۱۹۲۷ء

گورنمنٹ ممالک متحدہ نے صوبہ کی کونسل کی دلچسپیون سے مطمئن ہوکر اپنے صوبہ مین ایک ہندوستانی اکیڈمی قایم کی ہے تاکہ اردو و ہندی ادب کو اکتسابان ترقی کرنے کا موقع مل سکے۔ اسی اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے اور اسی پر کاربند ہوکر اکیڈمی نے جو اغراض و مقاصد اپنے واسطے منضبط کیے ہین انمین سے بعض حسب ذیل ہین۔

(۱) خاص خاص مفید مضامین پر بہترین کتابون کے واسطے مقابلہ کے انعامات تجویز کرنا۔

(۲) اچھی اچھی اور فائدہ مند اُردو و ہندی کتابون کا ترجمہ اپنے تنخواہ دار مترجمون سے کرانا اور انکو اپنی طرف سے چھپوانا اور شایع کرنا۔

(۳) اُردو و ہندی کی ترقی کی غرض سے عمدہ تصانیف اور تراجم کے واسطے ہندوستانی یونیورسٹیون اور ادبی انجمنون یا دیگر مستحق اور قابل اشخاص کو مالی امداد دینا۔

(۴) قابل قابل اہل قلم کو اکیڈمی کی فیلوشپ (اعزازی ممبری) کیواسطے منتخب کرنا۔

اکیڈمی کے موجودہ نظام مین ایک کونسل اور اکزیکیٹو کمیٹی داخل ہین لیکن اصلی اختیارات فیلودن کے ہاتھ مین رہینگے جن کا انتخاب کونسل سے ہوا کرے گا۔ کونسل مین داخل ایک پریسیڈنٹ چھ اکس افیشیو ممبر اور تیس معمولی ممبر شامل ہین (انہین جنرل سکریٹری داخل ہے) جنکو شروع مین گورنمنٹ نے نامزد کیا تھا۔ اور گورنمنٹ سے ابتدا مین مبلغ پچیس ہزار روپیہ بطور امداد کے اکیڈمی کو عنایت ہوا تھا۔ اور گورنمنٹ ہی نے سر تیج بہادر سپرو کے۔ سی۔ ایس۔ آئی کو اکیڈمی کا پریسیڈنٹ اور ڈاکٹر تاراچند۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کو اسکا سکریٹری مقرر کیا تھا۔

اکیڈمی کا قیام سچ پوچھئے تو اُس عہد کے گورنر صوبہ مشہور اسکالر اور نقاد ہز اکسلنسی سر ولیم ایسرس کی خاص ادبی دلچسپی اور ہمدردی۔ اور اُن کے روشن خیال جوان ہمت اور موقع شناس وزیر تعلیم آنربیل رائے راجیشوربلی صاحب کی ان تھک کوششون اور جسٹس سینیون اور منشی دیانرائن صاحب نگم کی سعی بلیغ کا معقول نتیجہ ہے کہ یہ مبارک اسکیم انہین حضرات کی محنت و جانفشانی اور حقیقی دلچسپی کیوجہ سے درجۂ تکمیل کو پہونچی۔ اور انہین کی آبیاری سے یہ تخم سرسبز ہوا۔ اکیڈمی اپنے وحید العصر خلیق و متواضع پریسیڈنٹ اور اپنے فاضل سکریٹری و نیز اپنے قابل ممبرون کی کوششون اور گورنمنٹ صوبہ کی نظر عنایت سے ضرور ایک درخشان مستقبل اور ایک بارونق مطمح نظر اپنے سامنے رکھتی ہے۔

اردو رسم الخط — سنا ہے کہ اورنگ آباد و حیدرآباد دکن مین اُردو کے رسم الخط کی درستی اور ترمیم کے واسطے بڑی کوششین ہو رہی ہین۔ اس غرض سے کئی کمیٹیان قایم ہوئی ہین جنہون نے اپنی تجاویز پبلک کے سامنے پیش بھی کی ہین مگر سنا جاتا ہے کہ یہ جدید رسم الخط نو آموزون کیواسطے نہایت پیچیدہ و مشکل و پریشان کن ہے۔ اور اس سے غلط پڑھنے اور غلط لکھنے دونون کا قوی احتمال ہے۔ ممکن ہے کہ بعض اس قسم کے نقایص کے اظہار مین غلط بیانی یا غلط فہمی ہوئی ہو لیکن ضرور صحیح معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ طریقہ تحریر مین جو نقایص و مشکلات ہین اگر ماہرین فن کی توجہ ضرور مبذول ہوئی تو یقیناً اس قسم کی خرابیان کبھی نہ کبھی ضرور رفع ہو جائینگی۔

انڈکس حصۂ نظم

نمبروں سے صفحات مراد ہیں

(نمبروں سے صفحے مراد ہیں)

نمبروں سے صفحات مراد ہیں

نمبروں سے صفحات مراد ہیں

نمبروں سے صفحات مراد ہیں

نمبروں سے صفحات مراد ہیں

نمبروں سے صفحات مراد ہیں

نمبروں سے صفحات مراد ہیں

نمبروں سے صفحات مراد ہیں

نمبروں سے صفحات مراد ہیں

نمبروں سے صفحات مراد ہیں

نمبروں سے صفحات مراد ہیں

نمبر ... صفحے درج ہیں

نمبروں سے صفحات مراد ہیں

نمبروں سے صفحات مراد ہیں

انڈکس حصۂ نثر

نمبروں سے صفحات مراد ہیں

نمبر ... سے صفحات مراد ہیں

نمبروں سے صفحات مراد ہیں

نمبروں سے صفحات مراد ہیں

نمبروں سے صفحات مراد ہیں

نمبروں سے صفحات مراد ہیں

نمبروں سے صفحات مراد ہیں

نمبروں سے صفحات مراد ہیں

ہندوستان سے محفوظ مواد ہیں

ہسٹری آف اُردو لٹریچر کی بابت بعض موقر اور معزز اصحاب کی قیمتی رائیں

(۱) ہز اکسلینسی سر ولیم میرس۔ کے۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ کے۔ سی۔ آئی۔ ای۔ گورنر ممالک متحدہ

"میں آپ کو آپ کے کامیاب کارنامے پر مبارکباد دیتا ہوں"

(۲) ہز ہائنس نواب سر سیّد محمد حامد علی خان بہادر جی۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ جی۔ سی۔ آئی۔ ای۔ جی۔ سی۔ وی۔ او۔ فرمانروائے رامپور ممالک متحدہ

"بڑی مسرت سے لکھا جاتا ہے کہ ہسٹری آف اُردو لٹریچر مصنفہٗ مسٹر رام بابو سکسینہ ایک عمیق مطالعہ کا پتا دیتی ہے۔ اور اس قابل ہے کہ اوسکا شمار ملک کی بہترین اور اعلیٰ ترین تصانیف میں کیا جائے"

(۳) سر تیج بہادر سپرو کے۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ ایل۔ ایل۔ ڈی

"قابل مصنف کی اس بارہ میں ضرور داد دینا پڑتی ہے کہ کیسے مسلسل اور مربوط طریقے سے اُنھوں نے زبان اور ادب اُردو کی ترقی اور نشو و نما کا حال قدیم زمانہ سے لیکر

زمانۂ حال تک کا کس عمدگی سے لکھا ہے .... وہ اپنی رائے قائم کرنے میں نہایت آزاد اور اپنے اظہار خیال میں بے خوف ہیں ...... مختصر یہ کہ کتاب نہایت اعلیٰ درجے کی ہے" (ماخوذ از تقریظ جناب موصوف)

(۴) سر شیخ عبدالقادر بی۔اے۔ نائٹ ریونیو ممبر گورنمنٹ پنجاب لاہور

"نہایت اعلیٰ درجہ کی کتاب ہے"

(۵) سر شیخ محمد اقبال نائٹ۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ ایم۔ ایل سی۔ لاہور

"آپ نے اس کتاب کے لکھنے میں یقیناً بڑی محنت کی ہے جو اس طرح بار آور ہوئی کہ تاریخ ادب اردو میں ایک بہترین کتاب کا اضافہ ہو گیا"

(۶) ڈاکٹر ٹی گریہم بیلی۔ ڈی لٹ۔ آئی۔ سی۔ ایس۔ ڈائرکٹر آف اسکول آف اورینٹیل اسٹڈیز لندن۔

"میں نے پوری کتاب پڑھی اور بہت لطف اٹھایا آپ نے کثیر معلومات کو عجیب و غریب طریقہ سے ایک جگہ جمع کر دیا میں آپ کو اس تصنیف پر دلی مبارکباد دیتا ہوں۔ آپ کی کتاب نہایت قابل قدر نہایت صحیح اور نہایت دلچسپ ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ آپ انگلستان آکر پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کی ڈگری حاصل کرنے کی ضرور کوشش کرینگے۔ اور اس میں شک نہیں کہ آپ اسکے

(۷) ڈاکٹر سید محمد سلیمان ایکٹنگ چیف جسٹس الہ آباد ہائی کورٹ

"کتاب نہایت قابل قدر اور دلچسپ ہے"

(۸) مسٹر ای۔ ایف۔ اوپن ہیم آئی۔ سی۔ ایس کمشنر بنارس

"میں نے آپ کی کتاب جسقدر پڑھی مجھکو نہایت دلچسپ معلوم ہوئی۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اپنے اس مضموں کا نہایت عمیق مطالعہ کیا ہوگا۔ اور ایک خاص قسم کی ریسرچ میں جو بہت مشکل ہے بہت وقت صرف کیا ہوگا کتاب نہایت دلچسپ دل افروز ہے۔ جسکی میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں میرے نزدیک ہر شخص جسکو ادب اردو سے لگاؤ ہے اسکی بڑی قدر کریگا"

(۹) مسٹر اے مکنزی سی۔ آئی۔ ای۔ آئی۔ ای۔ ایس۔

ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم ممالک متحدہ

"میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں کہ آپ نے کس عمدہ طریقہ سے ادب اردو کی نشو ونما اور ترقی کا حال لکھا ہے۔ آپ کی کتاب فی الحقیقت ایک اصلی ضرورت پوری کرتی ہے اور وہ ضرور اس قابل ہے کہ اسکو ہر اسکول اور لائبریری میں جگہہ ملے"

(۱۰) ڈاکٹر تاراچند ایم۔ اے۔ ڈاکٹر آف فلاسفی (کنٹیب)

الہ آباد یونیورسٹی

"آپ کی ہسٹری آف اُردو لٹریچر ایک ایسی کتاب ہے جس سے آپ کے عمیق مطالعہ جدوجہد کی کاوش۔ اور علمی قابلیت کا پتہ چلتا ہے۔ اس قسم کی کوئی کتاب ابتک

انگریزی میں تصنیف نہیں ہوئی۔ میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں کہ آپ نے اردو شعرا اور انشا پردازوں کے متعلق معلومات جمع کرنے میں بہت کامیابی حاصل کی اور نیز ان کے متعلق جو رائیں قائم کی ہیں وہ بہت منصفانہ ہیں۔ ایسی کتاب زمانہ حال کے لئے بہت ضروری تھی اور میں امید کرتا ہوں کہ وہ صاحبان تنقید سے خراج تحسین ضرور حاصل کرے گی جس کی وہ پوری طرح مستحق ہے۔"

(۱۱) مسٹر جے۔سی۔ ایو الڈ فالس مصنف "بدر البدر" وغیرہ جرمنی

"میں نے آپ کی عجیب و غریب کتاب ہسٹری آف اردو لٹریچر کا غور سے مطالعہ کیا اور اب اسکو زبان جرمن میں ترجمہ کا ارادہ رکھتا ہوں۔ مہربانی کرکے اسکی اجازت عنایت فرمائیے۔"

(۱۲) لالہ سری رام ایم۔ اے۔ مصنف خمخانہ جاوید

"اس مضمون پر یہ پہلی کتاب ہے۔ آپ ایسے قابل اور مشہور آدمی کے قلم سے اسکا نکلنا ہی اسکی عمدگی کی بیّن دلیل ہے۔ میرے نزدیک اسکا طرز عبارت نہایت عمدہ ہے اور اسکے علاوہ اس میں بہت سی خوبیاں ہیں۔ آپ کی تنقیدیں بہت مکمل و منصفانہ اور آپ کی رائیں نہایت صائب ہوتی ہیں۔"

(۱۳) منشی پریم چند بی۔ اے۔ لکھنؤ

"ہسٹری آف اُردو لٹریچر مصنفہ مسٹر رام بابو سکسینہ ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ ایک ایسی کتاب ہے جسپر جسقدر فخر و ناز کیا جائے بجا ہے۔ اسکے مضامین کی ترتیب اسکی تنقیدیں اس کی تحقیق و تلاش اور سب سے بڑھکر اسکی سلیس عبارت

نہایت عمدہ ہے۔ اس قسم کی بعض کتابیں اُردو میں پہلے سے موجود ہیں مگر اُن میں اکثر ایک رُخی ہیں۔ مصنفین اکثر تعریف و تحسین یا مذمت و عیب جوئی کے انبار لگا دیتے ہیں جن کی بالکل ضرورت نہیں ہوتی۔ مسٹر سکسینہ برخلاف اسکے کسی خاص اسکول کے مؤید اور کسی خاص شاعر کے طرفدار نہیں ان کی رائیں غیر جانب دارانہ جچی تلی اور بے لاگ ہوتی ہیں۔ بلکہ اگر سچ پوچھئے تو یہی صاف گوئی اس کتاب کا بہت بڑا جوہر ہے مصنف نے اسکو انگریزی میں لکھکر فی الحقیقت اُردو پر بہت بڑا احسان کیا اسکا اردو ترجمہ بالفعل تیار ہو رہا ہے اور جب شائع ہوگا تو ادب اردو میں ایک قابل قدر اضافہ ہوگا"

(۱۴) سید سجاد حیدر بی۔ اے۔ رجسٹرار مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

"مجھکو حیرت ہے کہ آپ نے کتنی عظیم الشان محنت اسکی تیاری میں کی ہوگی یہ یقیناً اس مضمون پر بہترین کتاب ہے"

(۱۵) منشی دیا نرائن نگم۔ ایڈیٹر "زمانہ" کانپور

"میں آپ کو اس تصنیف پر مبارکباد دیتا ہوں۔ یہ فی الحقیقت اپنی قسم کی پہلی کتاب ہے اور آپ کا فخر و ناز اسپر بالکل بجا ہے۔ جسطریقہ سے آپ نے اپنے اس منتخب کردہ کام کو انجام دیا میں اسکی دل سے قدر کرتا ہوں"

(۱۶) آنریبل راجہ اودھ نرائن بسریا۔ اگزیکٹیو کونسلر ریاست بھوپال

"آپ کی اس منفرد تصنیف پر میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں"

(۱۷) مسٹر حامد اللہ افسر بی۔ اے۔ لکھنؤ

"نہایت پر مغز اور عالمانہ تصنیف ہے مضمون کتاب مصنف کی وسیع النظری کا پتہ دیتا ہے اسٹایل نہایت اعلےٰ درجہ کی ہے۔"

(۱۸) مسٹر جمیل احمد قدوائی بی۔ اے۔ علیگڈھ

"میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں کہ بڑی کامیابی سے آپ نے یہ کتاب تصنیف کی۔"

(۱۹) مرزا احسان احمد بی۔ اے ایل۔ ایل۔ بی۔ اعظم گڈھ

"کتاب نہایت عمدہ ہے۔ بلکہ اکثر اپنی نوع کی کتابوں سے بہتر ہے نہایت قابل قدر تصنیف اور ادب اُردو کے لیے بہترین سرمایہ ہے۔"

(۲۰) مولوی عبدالحق بی۔ اے۔ ایڈیٹر اردو۔ اورنگ آباد دکن

"اس کتاب میں فاضل مصنف نے ادب اردو کے نشو و نما کی تاریخ شروع سے لیکر زمانۂ حال تک کی نہایت شرح و بسط سے لکھی ہے اور ادب کی کوئی شاخ باقی نہیں رکھی جسپر کہ کافی بحث کر کے مکمل روشنی نہ ڈالی گئی ہو۔ مضمون پر بڑی قدرت معلوم ہوتی ہے۔ اور عبارت نہایت سلیس ہے بلکہ اکثر جگہ نہایت فصیح پُر جوش اور مؤثر ہو گئی ہے۔ مصنف صاحب کو ان تمام کتب اور رسائل پر جو اس مضمون پر نکل چکے ہیں کافی عبور معلوم ہوتا ہے جسقدر کہ ادب اردو پر لکھا جا چکا ہے اس میں وہ سب کچھ موجود ہے۔ اور یہ تمام اصناف ادب پر حاوی ہے۔ لائق مصنف نے نہایت ناقدانہ اور عالمانہ طریق پر جس مصنف مترجم ناثر شاعر پر

بحث کی ہے اُسکے تمام محاسن و معائب کو پوری طرح دکھایا ہے نہایت قابل تحسین طریقہ سے اُس دور اور اُس سوسائٹی کا بھی حال لکھا ہے کہ جس میں وہ شخص تھا اور نیز یہ کہ کن کن اثرات سے اسکی تصنیف متاثر ہوئی۔ انھیں وجوہ سے یہ کتاب نہایت مفید اور قابل قدر ہے۔ اسکی عبارت بھی نہایت شستہ ہے اور فاضل مصنف نے نہایت عمدگی سے ثابت کر دیا کہ زبان اور ادب اردو ہندو مسلم اتحاد کی بہت بڑی دلیل ہے۔ اسکو واقعات کا ایک خزانہ سمجھنا چاہیے کیونکہ کوئی شخص عام اس سے کہ وہ زمانہ گزشتہ کا ہو یا زمانۂ حال کا اور نظم نثر یا ڈراما سے اُس کا تعلق ہو اس کتاب میں اُسکا ذکر فروگذاشت نہیں ہوا پس اسکی جسقدر تعریف و تحسین کیجائے کم ہے"

مذکورۂ بالا رایوں کے علاوہ ذیل کے اخبارات و رسائل نے بھی نہایت عمدہ اور قیمتی رائیں اس کتاب کی نسبت ظاہر کی ہیں؛

(۱) ادبی ضمیمہ ٹائمز لندن۔

(۲) مسلم ریویو کلکتہ۔

(۳) لیڈر۔ الہ آباد

(۴) اردو۔ اورنگ آباد دکن۔

(۵) زمانہ کانپور۔

(۶) شمع آگرہ۔

(۷) الناظر لکھنؤ۔

(۸) جام جمشید بمبئی وغیرہ۔